وِکاس کا یہ کاروبار اور آدی واسی سماج

وکاس ایک طرح سے مقدس الفاظ بن گیا ہے جس کے نام پر کچھ بھی کیا جا سکتا ہے مگر مین اسٹریم کبھی اس بات پر بحث نہیں کرتا کہ وکاس ہوتا کیا ہے؟

ابھے کمار

بھارت کی سیاست میں وکاس یا ترقی کی بات تقریباً ہر سیاست داں کرتا ہے۔ ہر لیڈر خود کو وکاس کا سب سے بڑا چمپئن کہتے نہیں تھکتا۔ فسادات میں ملوث لیڈر بھی وکاس کا نام لے لے کر اپنی داغدار شبیہ کو دھونے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ آپ کسی بھی ریاست میں چلے جایئے، ایک چیز آپ کو یکساں دیکھنے کو مل جائے گی۔ ہر طرف حکمراں خود کو وکاس کا دوسرا نام بتا کر پیش کرتے ہیں۔ لیڈروں کے نزدیک وکاس ایک جادو کی چھڑی سی ہے۔ مگر وکاس کیا ہوتا ہے؟ وکاس کسے کہتے ہیں؟ مین اسٹریم میڈیا اور برسر اقتدار لیڈر، جو بڑی حد تک رائے عامہ کو کنٹرول کرتے ہیں، پر بات کرنے سے بھاگتے ہیں اُن کے نزدیک وکاس کا مطلب کارخانہ، سڑک، فلائی اوور، برج، بجلی، انٹرنیٹ ہوتا ہے۔ نقل و حمل اور مواصلات کے حلقے میں ہوئی کامیابی کو وکاس کا نام دیا جاتا ہے۔

مین اسٹریم کا کہنا ہے کہ جن علاقوں میں سڑک، فیکٹری، پول ہیں، وہ علاقے ترقی یافتہ ہیں۔ مگر وہ کبھی یہ نہیں کہتے کہ ان سڑکوں کو مال کی آمد و رفت کے لیے بنایا گیا ہے۔ کان کنی کے بعد نکلی معدنیات کو ڈھونے کے لئے بنایا گیا ہے، جس کا فائدہ کچھ ہی مٹھی بھر بڑے امیر لوگوں کو ہوگا۔ اس میں غریب کو کیا ملا؟ وکاس کے ماڈل سیاہ پہلو کو اگر آپ کو سمجھنا ہے تو آپ کو آدی واسی سماج کے پاس جانا ہوگا۔ آدی واسی سماج کا تجربہ مین اسٹریم سے کافی جدا ہے۔ جن لوگوں کو نام نہاد مہذب سماج نے غیر مہذب کہہ کر اپنے سے کمتر اور پسماندہ سمجھا، اُن سے مہذب سماج کو بہت کچھ سیکھنے کو ہے۔ کچھ دنوں پہلے میری ملاقات بہت سارے آدی واسی جدوجہد کرنے والوں سے دہلی میں ہوئی۔ ان کا تعلق جھارکھنڈ، چھتیس گڑھ، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش اور اڈیشہ سے ہے۔ گفتگو کے دوران جل، جنگل، زمین اور عزت کی لڑائی لڑ رہے ان جدوجہد کرنے والوں نے بے چین کر دینے والی داستان سنائیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ مین اسٹریم میڈیا اور پالیسی سازوں کو ان کی بات سُننے کا ذرا بھی وقت نہیں ہے۔ آدی واسیوں کے حقوق کی جنگ لڑنے والوں کی باتوں کا نچوڑ یہ ہے کہ وکاس کے نام پر ملک میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ کسی بھی طرح سے آدی واسیوں کے مفاد میں نہیں ہے۔ آج وکاس کے نام پر ان کو انہی کے گھروں سے اجاڑا جا رہا ہے۔ منافع کی خاطر جل، جنگل اور زمین کو لوٹا جا رہا ہے۔ کان کنی کے دوران بڑی تعداد میں ماحولیات کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے اور نہ صرف انسان بلکہ پرندے اور جانوروں کو بھی ان کے گھروں سے بے گھر کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ آدی واسی علاقوں میں وسائل کی لوٹ مار لمبے وقت سے چل رہی ہے، مگر حال کے سالوں میں استحصال کی رفتار کافی تیز ہو گئی ہے۔ مین اسٹریم کا ماننا ہے کہ ملک کی ترقی ہر حال میں ہونی چاہیے۔ وکاس ایک طرح سے مقدس الفاظ بن گیا ہے۔ وکاس کے نام پر کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مگر مین اسٹریم کبھی اس بات پر بحث نہیں کرتا کہ وکاس ہوتا کیا ہے؟ کیا چند بڑے سرمایہ داروں کی جیب بھر دینا ہی وکاس ہے؟ کیا کان کنی کا ٹھیکا کسی بڑے سرمایہ دار کو کوڑے کے دام میں دے دینے سے ملک کا وکاس ہو جاتا ہے؟

آج آدی واسی علاقوں میں جنگ جیسی صورت حال بنی ہوئی ہے۔ آدی واسی علاقوں میں سڑکیں تو بن رہی ہیں، مگر وہاں اسکول اور اسپتال کا فقدان ہے۔ آدی واسی علاقوں میں آپ کو سرکاری ٹیچر اور ڈاکٹر نظر نہیں آئیں گے، مگر ہر جگہ ہزاروں اور لاکھوں کی قیمت کی خطرناک بندوقیں لیے سیکورٹی فورسز دکھ جائیں گی۔ جو سرکار کتاب، کاپی، ادویات کے لیے پیسہ خرچ نہیں کرتی اور بجٹ کا رونا روتی ہے، اس کے پاس بندوق خریدنے کے لئے پیسے کہاں سے آجاتے ہیں؟ آپ کو یہ بات نہیں بتائی جا رہی ہے کہ آج بڑی تعداد میں سیکورٹی

آج آدی واسی کو ترقی کا دشمن اور نکسلی کہہ کر مارا جا رہا ہے کیونکہ وہ وسائل کی لوٹ کے خلاف بول رہے ہیں۔ کل جب اُن کے وسائل ختم ہو جائیں گے تو کبھی پیٹ نہ بھرنے والی سرمایہ داری اور مسلسل منافع کمانے والی لالچی آنکھیں دیگر علاقوں کو بھی اپنی زد میں لیں گی۔ اس لیے آج آدی واسی سماج کا ساتھ دینا ہماری انسانی اور آئینی ذمہ داری بھی ہے۔ ہم سب بھارت کی پیاری سر زمین سے محبت کرتے ہیں اور یہاں کی مشترکہ تہذیب پر ہم سب کو فخر ہے۔ اس لیے کثرت میں وحدت کے لیے تنوع کا احترام کرنا لازمی ہے۔

فورسز سینٹرل انڈیا کے آدی واسی علاقوں میں کھڑے کیے گئے ہیں۔ کیا کوئی یہ بات سرکار سے پوچھ سکتا ہے کہ ان آدی واسی علاقوں میں پولیس اور نیم فوجی دستے کیا کر رہے ہیں؟ کیا ان فوجی جوانوں کو وہاں تعینات کرنے کا مطالبہ آدی واسی سماج نے کیا تھا؟ اگر نہیں تو بھی بغیر کسی مطالبے کے وہاں فوج بھیجنے کا فیصلہ کس نے لیا تھا؟ ستم ظریفی دیکھیے کہ جن چیزوں کا مطالبہ آدی واسی کرتے ہیں، انہیں سرکار پورا نہیں کرتی اور جن کا انہوں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا اس اذیت کو اُن کے گھر کے سامنے لا کھڑی کر دی گئی ہے۔

آدی واسی لوگوں کا کہنا ہے کہ فوجی اُن کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں۔ جن جنگلوں، پہاڑوں اور کھلے ماحول میں انہوں نے صدیوں سے زندگی گزاری ہے، وہاں اب انہیں جانے سے روکا جا رہا ہے۔ بات بات پر آدی واسی کو پکڑ کر اُن سے باز پرس کی جاتی ہے اور ان سے آدھار کارڈ دکھانے کو کہا جاتا ہے۔ سوچیے جن علاقوں میں آپ سالوں سے رہ رہے ہیں، وہاں کوئی اجنبی آپ سے ہی آپ کی شناخت پوچھے اور آپ کو مشکوک شخص کہہ کر پریشان کرے تو آپ پر کیا گزرے گی؟ یاد رکھیے پریشانی، تعصب، امتیاز صرف مسلمان ہی نہیں جھیل رہے ہیں، بلکہ آدی واسی، دلت، پسماندہ ذات بھی اس سے دوچار ہیں۔ تبھی تو محکوموں کے درمیان اتحاد کی اشد ضرورت ہے۔

آج ترقی کے جتنے بھی پیمانے ہیں اُن سب میں آدی واسی سب سے نیچے ہیں۔ نہ اُن کی آج کوئی مضبوط سیاسی پارٹی ہے اور نہ ہی ان کے لوگ میڈیا یا سول سوسائٹی میں نظر آتے ہیں۔ ریزرویشن کا جو تھوڑا بہت فائدہ اُن کے ایک چھوٹے سے طبقہ کو ملا تھا وہ بھی اب کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دانستہ طور پر سرکاری نوکریوں کو ختم کیا جا رہا ہے۔ چونکہ پرائیویٹ نوکریوں میں کوئی ریزرویشن نہیں ہے، اس لیے محکوم طبقات کو ریزرویشن ختم ہونے کی صورت میں نوکری پانا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ اعلیٰ ذات کے لوگوں نے نہرو کے دور میں پبلک سیکٹر کا فائدہ اٹھایا اور جب محکوم طبقات نے سرکاری اداروں میں اپنی دعویداری پیش کی تو اب یہی اعلیٰ ذات کے لوگ نجکاری کے کٹر حامی بن گئے اور فلاحی منصوبے کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آئین اور قانون کی کتاب میں یہ بھی درج ہے کہ جو آدی واسی علاقے ہیں، وہاں کی ڈیموگرافی، ثقافت اور زمین کی حفاظت کی جائے گی اور اس کی پوری کوشش ہوگی کہ آدی واسیوں کی زمین غیر آدی واسی ہڑپ نہ لے۔ مگر قانون کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہے اور آدی واسی علاقوں کے وسائل اور زمین کو لوٹا جا رہا ہے اور مزاحمت کرنے والے آدی واسیوں کو مارا اور پیٹا جا رہا ہے۔ آج آدی واسی علاقوں میں حقوق انسانی کی زبردست پامالی ہو رہی ہے۔ لوٹ مار کا جو دور انگریزوں نے شروع کیا تھا آج بھی وہی چل رہا ہے۔ سامراجیت جبکہ ختم ہو گئی، مگر لوگوں کی سامراجی سوچ ختم ہوتے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ ایک سوال کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ جب آدی واسی پیٹے جا رہے ہیں، تو ہمارا کیا؟ اگر آپ غیر آدی واسی ہیں، تب بھی آپ کی ذمہ داری کم نہیں ہو جاتی ہے۔ یاد رکھیے آدی واسی ماحولیات اور انسان کے بیچ ہم آہنگی کا دوسرا نام ہے، جبکہ نام نہاد وکاس کا ماڈل غیر برابری اور ماحولیاتی تباہی کا خوفناک منظر ہے۔ آج آدی واسی علاقوں میں فوج ہے اور ہم شہری اور میدانی حلقوں میں رہنے والے، خاموش ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب یہ فوجی میدانی علاقوں میں بھی تعینات کیے جائیں گے اور ان کی بندوقیں ہمارے خلاف ہوں گے۔ آج آدی واسی کو ترقی کا دشمن اور نکسلی کہہ کر مارا جا رہا ہے کیونکہ وہ وسائل کی لوٹ کے خلاف بول رہے ہیں۔ کل جب اُن کے وسائل ختم ہو جائیں گے تو کبھی پیٹ نہ بھرنے والی سرمایہ داری اور مسلسل منافع کمانے والی لالچی آنکھیں دیگر علاقوں کو بھی اپنی زد میں لیں گی۔ اس لیے آج آدی واسی سماج کا ساتھ دینا ہماری انسانی اور آئینی ذمہ داری بھی ہے۔ ہم سب بھارت کی پیاری سرزمین سے محبت کرتے ہیں اور یہاں کی مشترکہ تہذیب پر ہم سب کو فخر ہے۔ اس لیے کثرت میں وحدت کے لیے تنوع کا احترام کرنا لازمی ہے۔ منافع خوری اور سب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش آج دیش کے سامنے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ تبھی تو آدی واسی سماج کے اوپر ہو رہے ظلم کے خلاف بولنا پورے معاشرے اور ملک کی بقا سے بھی جڑا ہوا ہے۔ ■

قومی سلامتی سے زیادہ اہم انسانی حقوق ہیں

یہ سمجھنا کہ عوام کو زیادہ اختیار دے دینے سے ملک کی سلامتی کو خطرہ ہوجائے گا، سراسر غلط ہے

ابھے کمار

آج کل ناگالینڈ سمیت ملک کے مختلف حصوں سے آرمڈ فورسیز اسپیشل پاور ایکٹ یعنی آفسپا کے خلاف آوازیں اُٹھ رہی ہیں۔ ہفتہ کو ناگالینڈ کی دارالحکومت کوہیما میں مظاہرین نے آفسپا کو منسوخ کرنے کا پھر مطالبہ کیا۔ لوگوں میں اس بات سے ناراضگی ہے کہ انسانی خون کو قومی سلامتی کے نام پر پانی کی طرح بہایا جارہا ہے اور سیکورٹی فورسز کو لامحدود اختیارات دے دیے گئے ہیں۔ ناگالینڈ سمیت ملک کی دیگر شمال مشرقی ریاستوں سے مسلسل انسانی حقوق کی پامالی ہورہی ہے، مگر مین اسٹریم میڈیا اور قومی سیاسی جماعتوں نے اکثر ان مسائل پر توجہ نہیں دی اور نہ کبھی اس پر کھل کر بحث ہوئی اور نہ کبھی یہ انتخابی ایشوز بنا۔ مگر ناگالینڈ کے مون ضلع میں اس بار تو بہت ہی برا ہوا۔ انتہا پسندوں کو مارنے کے نام پر سیکورٹی فورسز نے معصوم شہریوں کی جانیں لے لیں۔ گزشتہ ہفتے رونما ہوئی ایک مڈبھیڑ کے دوران سیکورٹی فورسیز نے معصوم لوگوں پر گولی چلادی۔ اس واقعہ کے بعد پھر تشدد بھڑکا۔ ان ساری وارداتوں میں ۱۴؍بے قصور شہری کے مارے گئے، جبکہ ایک فوجی جوان بھی ہلاک ہوگیا۔ پولیس کی گولی سے زخمی ۲۳؍سالہ ایک نوجوان، جس کا علاج آسام کے ڈبروگڑھ ہسپتال میں ہورہا ہے، نے میڈیا کو بتلایا کہ سیکورٹی فورسز نے گولی چلانے سے پہلے ان کو خبردار نہیں کیا۔

غلطی صرف کچھ فوجی جوان یا پھر بعض فوجی افسروں کی بھی نہیں۔ جب قومی سلامتی کو ہی انسانی حقوق سے زیادہ اہم اور مقدس تصور کرلیا جاتا ہے تب ایسی بیماری وجود میں آ جاتی ہے۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں ماڈرن اسٹیٹ کو تاریخی اور سماجی طور پر سمجھنا ہوگا۔ علم عمرانیات کے بانی مفکر میکس ویبر نے کہا تھا کہ ریاست کے پاس ہی تشدد کی کارروائی انجام دینے کا واحد قانونی اختیار ہے۔ جرمن مفکر ویبر سے الگ ولادیمیر لینن نے کہا کہ ریاست کا وجود طبقاتی نظام کے ساتھ جوڑ کر ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو حکمراں طبقہ اپنی بالادستی کو بنائے رکھنے کے لیے ریاست جیسے ادارہ کا سہارا لیتا ہے اور محنت کش طبقہ کے پر اپنا تسلط بنا کر رکھتا ہے اور ان کا استحصال کرتا ہے۔ حالانکہ بائیں بازوں کے نظریہ کے حامل مفکر ریاست کی سلامتی کو سب سے اہم مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ملک کی سلامتی میں ہی سب کی سلامتی ہے۔ محکوموں، محروموں، مظلوموں، دبے کچلوں اور عام لوگوں کے حقوق کو قومی سلامتی کے نام پر قربان کردینے میں ان کو زیادہ دیر نہیں لگتی۔ لوگوں کی آزادی کو اکثر قومی سلامتی کے نام پر غصب کرلیا جاتا ہے۔ اسی قومی سلامتی کے نام پر ان دنوں مذہبی اقلیتوں کے حقوق کو بھی ہڑپ لیا جاتا ہے۔ مدرسوں کو دہشت گردی سے جوڑنا، ان پر چھاپہ ماری کرنا، مدرسہ میں پڑھنے والے طالب علموں کی گرفتاری، دین اسلام کی دعوت اور تبلیغ کرنے والی دینی شخصیتوں کے خلاف مقدمہ اور گرفتاری کو اسی قومی سلامتی کے نام پر واجب ٹھہرایا جاتا ہے۔ قومی سلامتی کے نام پر عام لوگوں کی نجی زندگی میں بھی سرکار دخل اندازی کرتی ہے۔ حزب اختلاف کے لیڈروں کے فون ٹیپ کیے جاتے ہیں۔ پولیس، فوج اور دیگر سیکورٹی ایجنسی کو مقدم مان لیا گیا ہے، کہ وہاں کام کرنے والا عملہ اور افسر کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتے۔ یا پھر وہ کبھی تعصب سے کام ہی نہیں لیتے!

> ”
> اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بھارت کے آئین میں شہریوں کو آزادی اور مساوات کے بنیادی حقوق دیے گئے ہیں۔ قانون کی نظر میں بھارت کے کسی بھی حصہ میں رہنے والا شخص، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عورت ہو یا مرد، غریب ہو یا امیر، کالا ہو یا گورا، برابر ہے۔ مگر یہ بھی بات صحیح ہے کہ بھارت کے زیادہ تر شہری جو دلت، پسماندہ، آدی واسی، مذہبی اقلیت ہیں، ان کو برابری نہیں مل پائی ہے۔

دراصل سارے مسائل کے لیے ایک مخصوص سوچ ذمہ دار ہے۔ یہ سمجھنا کہ عوام کو زیادہ اختیار دے دینے سے ریاست کی سلامتی کو خطرہ ہوجائے گا، یہ بات سراسر غلط ہے اور اس سوچ کو ملک کے حکمراں جتنی جلدی ہوسکے اپنے دماغ سے نکال دیں تو بہتر ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بھارت کے آئین میں شہریوں کو آزادی اور مساوات کے بنیادی حقوق دیے گئے ہیں۔ قانون کی نظر میں بھارت کے کسی بھی حصہ میں رہنے والا شخص، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عورت ہو یا مرد، غریب ہو یا امیر، کالا ہو یا گورا، برابر ہے۔ مگر یہ بھی بات صحیح ہے کہ بھارت کے زیادہ تر شہری جو دلت، پسماندہ، آدی واسی، مذہبی اقلیت ہیں، ان کو برابری نہیں مل پائی ہے۔ آخر کیوں ہمیں کشمیر کی زمین اور وہاں کے قدرتی وسائل سے محبت ہے، مگر ملک کا ارباب اقتدار زیادہ تر کشمیری مسلمان کو امکانی طور پر دہشت گرد تصور کرتے ہیں! آخر کیوں ملک کے مسلمان، عیسائی، دلت اور آدی واسی کو اہم عہدوں پر بٹھانے سے پہلے ارباب اقتدار سو بار سوچتے ہیں؟ کیا یہ صرف محض اتفاق ہے کہ ملک کے زیادہ تر وزیراعظم ایک خاص ذات سے تعلق رکھتے ہیں، جبکہ دلت، آدی واسی، مسلمان اور عیسائی سماج، جن کی تعداد اَپر کاسٹ کی کل آبادی سے کہیں زیادہ ہے، ابھی تک وزیراعظم کے منصب کے قریب نہیں پہنچ پائے ہیں۔ ناگالینڈ کے ساتھ بھی ظلم وستم کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ارباب اقتدار نے ناگالینڈ کی زمین کو تو ملک کا حصہ بنالیا، مگر ناگالینڈ کے عوام کو کبھی اپنا نہیں سکے۔ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں کہ وہاں کی بڑی آبادی عیسائی ہے؟ کیا یہ اس لیے تو نہیں کہ وہ شمالی بھارت کے اعلیٰ ذات سے الگ نظر آتے ہیں؟ ان کا کھان پان، ان کی زبان اور ان کے رسم ورواج اور عقیدہ بھی مین لینڈ سے الگ ہے، کیا اس وجہ سے تو ان کے ساتھ تفریق نہیں برتی جارہی ہے؟

آفسپا جیسے کالے قانون کا استعمال سب سے پہلے انگریزوں نے بھارت چھوڑو تحریک کے دوران ہندوستانیوں کے خلاف کیا۔ مگر آزاد بھارت کی سرکار نے اسے ترک کرنے کے بجائے اسے اپنایا اور اس کا استعمال خود اپنے ہی شہروں کے خلاف کر رہی ہے۔ یہ قانون ۱۹۵۸ء میں پاس کیا گیا اور تب یہ دلیل دی گئی کہ اس کا استعمال وقتی ہے اور یہ ملک کی سالمیت اور ایکتا کو بنانے کے لیے ضروری ہے۔ آج اس قانون کو بنے ہوئے ۶۰؍سال سے بھی زیادہ ہوگئے۔ یہ قانون واپس لینے کے بجائے اسے ملک کے دیگر حصوں میں نافذ کیا گیا ہے۔ اس قانون کی جگہ کسی بھی جمہورت میں نہیں ہوسکتی ہے کیونکہ اس میں سیکورٹی فورسز کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بغیر معمولی طریقہ کار سے گزرے کسی بھی شہری کے گھر پر چھاپہ ماری کرسکتے ہیں، اس کی گرفتاری کرسکتے ہیں اور اس پر گولی بھی چلاسکتے ہیں! دراصل آفسپا کا استعمال کرکے ارباب عوام کو ڈرا کر ان کو خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ اروم شرمیلا نام کی ایک بہادرر خاتون نے ۱۶؍سال تک بھوک ہڑتال کرکے آفسپا کو ختم کرنے کی مانگ کی۔ جیون ریڈی کمیشن نے بھی آفسپا کو رد کرنے کی تجویز پیش کی۔ سرکار تب بھی ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ لامحدود طاقت کے نشے میں سیکورٹی فورسز عوام پر زیادتی کرتے ہیں اور پھر عوام کے سڑکوں پر اترنے اور اسے دبانے کے لیے اور طاقت کا استعمال کرنے سے حالات اور خراب ہوجاتے ہیں۔ اب تک یہی دیکھا گیا ہے کہ مرکزی سرکار خود ہی سارے فیصلہ لیتی ہے اور صوبہ کی سرکار یا پھر مقامی لوگوں کی زیادہ نہیں سنتی۔ یہ سب قومی سلامتی کے نام پر دہلی میں بیٹھی حکمراں جماعت درست قرار دیتی ہے، مگر اس کو کون سمجھائے کہ انسان کی جان سے بڑھ کر زیادہ اہم پوری دنیا پر حکمرانی بھی نہیں ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

ادبستان

بک ریویو: بھارت کے راج نیتا: علی انور

ابھے کمار • 03/12/2017 • COMMENT 1

ذات پات کے سوال پر اگر آپ سوچتے ہیں تو آپ کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے اور علی انور کی دیگر تحریر و تقریر سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔
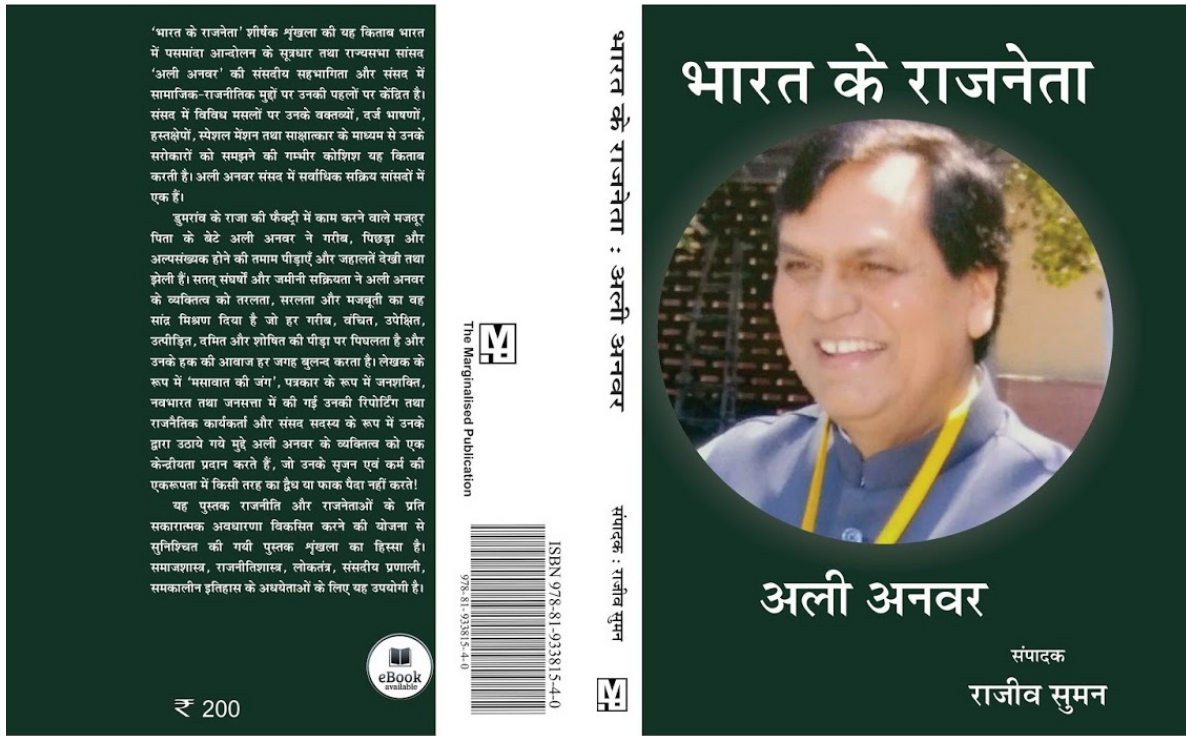
علی انور بہار سے راجیہ سبھا کے ایم پی ہیں مگر عام لوگ انہیں پسماندہ تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے جانتے ہیں۔ سماجی تحریک اور سیاست میں قدم رکھنے سے قبل علی انور ہندی زبان کے ایک جانے مانے صحافی تھے۔ انھوں نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی (سی پی آئی) کے جن شکتی اخبار سے کیا۔ بعد کے دنوں میں وہ نو بھارت ٹائمس اور جن ستا جیسے بڑے قومی اخبار سے بھی وابستہ رہے۔ بطور صحافی علی انور نے ذات پات کے تعصب پر کئی ساری رپورٹ لکھیں۔ سال 2002 میں ان کی مطبوعہ کتاب "مساوات کی جنگ" نے لوگوں کو مسلم سماج کو دیکھنے کا ایک نیا زاویہ عطا کیا۔ زیر تبصرہ کتاب بھارت کے

راج نیتا: علی انور (مرتبہ، راجیو سمن) کی خدمات کے اعتراف میں شائع کی گئی ہے۔ جس میں پارلیامنٹ میں کی گئی ان کی تقریروں کے ساتھ ان کا ایک طویل انٹرویو شامل ہے۔

علی انور کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے پسماندہ اصطلاح کو مقبول بنایا جو کہ ایک فارسی لفظ ہے۔ مساوات کی جنگ میں علی انور نے واضح کیا ہے کہ اس لفظ کا مطلب ہے پیچھے چھوٹے ہوئے۔ چند پسماندہ ذاتیاں ہیں-لال بیگی، حلال خور، موچی، بھٹیارہ، پمریا، نٹ، بکھو، ڈفالی، دھوبی، سائیں، رنگ ریز، چک، مرسیقار و درزی، اگر ہم عام زبان میں کہیں تو پسماندہ شودر وہ دلت ہیں جن کے اسلاف نے صدیوں پہلے ذات پر مبنی ظلم و ستم سے نجات پانے کے لیے اسلام میں داخل ہوئے۔ مگر مذہب بدلنے سے ان کے ساتھ ہو رہے تعصب اور غیر مساوی سلوک پوری طرح سے ختم نہیں ہوا۔ اصولاً اسلام مساوات اور بھائی چارے کا حامی ہے مگر مسلم معاشرے میں اونچ نیچ پائی جاتی ہے۔ اونچ نیچ کی کھائی اتنی گہری اور خطرناک ہے کہ کبھی کبھی اشرف مسلمان مسجدوں اور قبرستانوں میں دلت مسلمانوں کو داخل نہیں ہونے دیتے۔ مسلمانوں میں شرفا برادری کے لوگ پسماندہ مسلمانوں کے یہاں شادی بیاہ کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ ان تمام مسئلوں کو علی انور نے پورے زور و شور کے ساتھ پارلیامنٹ میں اٹھایا۔ 11 اگست 2006 کو راجیہ سبھا میں بولتے ہوئے علی انور نے کہا؛

"میں کہنا چاہتا ہوں کہ تین الفاظ ہیں اشراف، اجلاف، ارذال ۔ محترم یہ اردو کے الفاظ نہیں ہیں یہ فارسی کے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ خالص عربی کے الفاظ ہیں۔ اس لیے ان کے سماج میں جب اس طرح کی بیماری نہیں تھی تو یہ ان کی لغت میں کہاں سے آئے۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے کہ ہمارے پیغمبر ہمارے آخری نبی نے اس کی لڑائی لڑی۔ ان کا آخری خطبہ حجۃ الوداع کا خطبہ ہے۔ مولانا عبیداللہ خاں اعظمی صاحب یہاں نہیں ہیں ہم ان کو بتانا چاہتے تھے کہ ہمارے آخری نبی نے یہ ہدایت دی تھی کہ نہ گورے کو کالے پر، نہ کالے کو گورے پر، نہ عرب کو عجمی پر، نہ عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ ص: 76"۔

علی انور کی اس دلیل سے پہلے ماہر عمرانیات امتیاز احمد نے بھی مانا ہے کہ مسلمانوں میں ذات پات کے لیے صرف ہندو مذہب کو ذمہ دار ٹھہرانا پوری حقیقت نہیں ہے۔ ان کے مطابق مسلم سماج میں اگر ذات پات ابھی بھی جڑ جمائی ہوئی ہے تو اس کے پیچھے مسلمانوں کے اندر نسل اور شجرہ کو لے کر پائے جا رہے احساس برتری کا رول ہے۔ تبھی تو علی انور تمام مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سماجی اور تعلیمی طور پر پچھڑے ہی اس کے مستحق ہیں اور مذہب کی بنیاد پر ریزرویشن نہیں ملنا چاہیے۔ ان کی اس رائے کی مخالفت میں جو دلیل دی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اشرف مسلم بھی مسلم ہونے کی وجہ سے تعصب کے شکار ہیں۔ علی انور جہاں مذہب کی بنیاد پر پوری مسلم آبادی کو ریزرویشن دینے کی مخالفت کرتے ہیں وہیں دوسری جانب مذہب کی بنیاد پر دلت مسلمانوں اور دلت عیسائیوں کو ایس سی درجے سے باہر رکھنے کے حکومتی فرمان سے بھی نالاں ہیں۔

ویڈیو: علی انور انصاری کے ساتھ جے ڈی یو میں بٹوارہ ،بہار کی سیاسی صورت حال ، گجرات انتخابات اور ہندوستان میں پسماندہ مسلم تحریک کے متعلق دی وائر اردو کی بات چیت

o: Ali Anwar Ansari on the split in JDU, Pasmanda movement and more

واضح رہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا 1935 ایکٹ میں دلت مسلم اور دلت عیسائی کو ریزرویشن ملتا تھا جس کو آزادی کے بعد ختم کر دیا گیا۔ 1950 کے صدارتی فرمان کے تحت دلت عیسائی اور دلت مسلم کو یکایک شیڈول کاسٹ زمرے سے باہر کر دیا گیا۔ اس فرمان میں صاف طور پر لکھا گیا جو ہندو مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کو مانتا ہے وہ شیڈول کاسٹ زمرے میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ بعد میں اس فرمان میں ترمیم کیا گیا اور سکھ اور بدھ مذہب کے ماننے والے لوگوں کو ایس سی زمرے میں شامل کیا گیا۔ اس کے پیچھے جو دلیل دی گئی وہ یہ تھی کہ چھوا چھوت اور ذات پر مبنی تعصب صرف ہندو مذہب کا حصہ ہے اور جنھوں نے ہندو مذہب چھوڑ کر اسلام اور عیسائیت قبول کر لی وہ اس طرح کے ریزرویشن کے مستحق نہیں ہیں۔ مگر علی انور اس طرح کی دلیلوں کو پوری طرح خارج کرتے ہیں او ان کا ماننا ہے کہ دلت چاہے ہندو ہو، مسلم ہو، عیسائی ہو یا دیگر مذہب کا ہو اسے ہر روز تعصب اور ظلم جھیلنا پڑتا ہے اس لیے دلت عیسائی اور دلت مسلمان کو بھی دلت ہندوؤں، بدھوں اور سکھوں کے مواقف ایس سی کا درجہ ملنا چاہیے تاکہ وہ تعلیم، نوکری اور اقتدار میں اپنی حصہ داری حاصل کر سکیں۔ پارلیامنٹ میں دلت مسلمان اور دلت عیسائی کے مسئلوں نے علی انور نے اکثر اٹھایا ہے اور آگے کہتے ہیں کہ؛

> ”یہ تعصب صرف مسلمان سماج کی بیماری نہیں ہے یہ عیسائی سماج میں جو دلت عیسائی ہے ان کے بھی چرچ الگ الگ ہیں۔ ان کے بھی قبرستان الگ الگ ہیں۔ اس لیے نام بھی ملتا جلتا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ادھر ایک مسلم دھوبی ہے تو ادھر ہندو دھوبی شیڈول کاسٹ ہے، تو مسلمان دھوبی شیڈول کاسٹ کیوں نہیں ہوگا۔ کپڑا وہ بھی دھوتا ہے، کپڑا وہ بھی دھوتا ہے، ان کا نام شیام رجک ہے، وہ منتری بنتا ہے یہاں رحمان رجک ہے جو دھوبی گھاٹ پر گدھے کے ساتھ کپڑا دھوتے دھوتے وہیں مرجاتا ہے۔ ص: 74)“

ذات پات کے سوال پر اگر آپ سوچتے ہیں تو آپ کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے اور علی انور کی دیگر تحریر و تقریر سے بھی آشنا ہونا چاہیے۔ کتاب میں ٹائپنگ اور پروف کی بیشمار غلطیاں رہ گئی ہیں جنہیں دوسرے ایڈیشن میں ضرور دور کیا جائے۔ کتاب کے مدیر نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ اور بہتر ہو سکتا تھا۔ ان نقائص کے باوجود اس طرح کی کتاب منظر عام پر آنی چاہئے جو سماج کے حاشیے میں چل رہے بحث و مباحثہ کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے۔

Related

جھارکھنڈ میں مہاگٹھ بندھن نے کسی اقلیت کو ٹکٹ کیوں نہیں دیا؟

جھارکھنڈ میں مہاگٹھ بندھن نے کسی اقلیت کو ٹکٹ کیوں نہیں دیا؟

ان دنوں : مسلمانوں کو مائنوریٹی سنڈروم سے نکلنا چاہیے:علی انور انصاری

ان دنوں : مسلمانوں کو مائنوریٹی سنڈروم سے نکلنا چاہیے:علی انور انصاری

موجودہ حالات پر شتروگھن سنہا کا تبصرہ؛'بولنا بھی ہے منع سچ بولنا تو درکنار'

موجودہ حالات پر شتروگھن سنہا کا تبصرہ؛'بولنا بھی ہے منع سچ بولنا تو درکنار'

ہندوستانی سیاست میں ڈاکٹر امبیڈکر

بھگوا جماعتیں امبیڈکر کو مسلم مخالف رہنما کے طور پر پیش کرنے کی سازش کر رہی ہیں

ابھے کمار

ان دنوں برسر اقتدار بی جے پی کو حزب اختلاف اور ڈاکٹر امبیڈکر کے حامیوں کے غصے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ حالانکہ اس مصیبت کو دعوت دینے والے اور کوئی نہیں، بلکہ بھگوا سیاسی جماعت کے سرکردہ لیڈر اور وزیر داخلہ امت شاہ ہیں۔ گزشتہ دنوں پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے شاہ نے محکوموں کے مسیحا بابا صاحب سے متعلق ایک انتہائی متنازعہ بیان دیا، جس میں کہا کہ امبیڈکر کا نام لینا آج کل ایک 'فیشن' بن گیا ہے۔ بی جے پی کے سابق صدر نے مزید کہا کہ اگر لوگ امبیڈکر کی جگہ اتنی بار بھگوان کا نام لیتے، تو انہیں سات جنموں تک 'سورگ' مل جاتا۔ انتخابی سیاست کی گہری سمجھ رکھنے والے شاہ کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں رہا کہ انہوں نے خود ہی بکھری ہوئی اپوزیشن کو متحد ہونے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ تاہم، بی جے پی اپوزیشن کی بات ماننے اور معافی مانگنے کے بجائے جارحانہ رویہ اپنائے ہوئے ہے اور پلٹ وار کرتے ہوئے اپوزیشن، بالخصوص کانگریس اور ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو پر امبیڈکر کی تذلیل کرنے کا الزام لگا رہی ہے۔ دونوں فریقین خود کو امبیڈکر کا سب سے بڑا پیروکار اور دوسرے کو امبیڈکر مخالف ثابت کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

لیکن جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھتے ہیں اور بابا صاحب کی تحریروں کو پڑھتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ امبیڈکر اور محکوم طبقات کے ساتھ ذات پات میں یقین رکھنے والی سیاسی جماعتوں نے انصاف نہیں کیا ہے۔ حالانکہ جس وقت ڈاکٹر امبیڈکر سیاست میں سرگرم تھے، اس وقت بی جے پی کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ مگر بی جے پی جن بھگوا تنظیموں کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے، ان کے نظریات اور سیاست کے امبیڈکر بڑے مخالف تھے۔ چاہے وہ ہندو مہاسبھا ہو، آر ایس ایس یا جن سنگھ ہو، امبیڈکر نے کبھی بھی ان جماعتوں کو اپنے قریب نہیں آنے دیا۔ امبیڈکر کو بخوبی معلوم تھا کہ یہ رجعت پسند جماعتیں ہیں، جو دلت مخالف نظریات رکھتی ہیں۔ بھگوا تنظیموں سے امبیڈکر کی دوری کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوتوا پارٹیاں مذہب پر مبنی فرقہ وارانہ سیاست کرتی رہی ہیں، جبکہ امبیڈکر نے آزادی، مساوات اور اخوت پر مبنی جمہوریت کی بات کی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود بی جے پی اور ان کی نظریاتی بھگوا جماعتیں دلتوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے خود کو امبیڈکر حامی ہونے کا ڈھونگ رچاتی رہی ہیں۔ مگر تاریخ گواہ ہے کہ آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا نے کبھی بھی امبیڈکر کی ذات پات کی غیر برابری کے خلاف تحریکوں کی حمایت نہیں کی۔ جہاں امبیڈکر دلتوں، آدی واسیوں، پسماندہ ذاتوں اور اقلیتوں جیسے کمزور طبقات کو ان کے حقوق دلانے کے لیے لڑ رہے تھے، وہیں بھگوا جماعتیں ملک کو ہندو بمقابلہ مسلمان کے نام پر تقسیم کرنے کی سیاست میں مصروف تھیں۔ یہی رجحان آج بھی بی جے پی کے دور حکومت میں جاری ہے، جہاں مندر اور مسجد کے مصنوعی تنازعات میں ملک کی توانائی کو ضائع کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اس بات سے بھی خبردار رہنا ہوگا کہ بھگوا جماعتیں امبیڈکر کو مسلم مخالف رہنما کے طور پر پیش کرنے کی سازش کر رہی ہیں۔ لیکن عوام کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ مساوات اور اقلیتوں کے حقوق کے لیے لڑنے والا کوئی شخص مسلم مخالف کیسے ہو سکتا ہے؟

جب ہم تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھتے ہیں اور بابا صاحب کی تحریروں کو پڑھتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ امبیڈکر اور محکوم طبقات کے ساتھ ذات پات میں یقین رکھنے والی سیاسی جماعتوں نے انصاف نہیں کیا ہے۔ حالانکہ جس وقت ڈاکٹر امبیڈکر سیاست میں سرگرم تھے، اس وقت بی جے پی کا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ مگر بی جے پی جن بھگوا تنظیموں کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے، ان کے نظریات اور سیاست کے امبیڈکر بڑے مخالف تھے۔

سیاسی فائدے کے لیے امبیڈکر کی وراثت پر دعویٰ کرنے والی ہندو مہاسبھا، آر ایس ایس، جن سنگھ اور ان کی کوکھ سے جنمی بی جے پی نے کمزور طبقات کو سماجی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق دینے اور سماج سے تفریق و توہم پرستی کے خاتمے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی ہے۔ بھگوا تنظیموں نے عدم مساوات پر مبنی بھارتی سماج میں مثبت تبدیلیوں کو ناکام کرنے کی ہمیشہ سازشیں کی ہیں۔ آج بھی بی جے پی اور آر ایس ایس نے اپنی حکمت عملی تبدیل نہیں کی ہے۔ ہندو راشٹر کے قیام کے اپنے پروگرام کو نہ تو انہوں نے ترک کیا ہے اور نہ ہی سچے دل سے ملک کے آئین کو قبول کیا ہے، جسے تیار کرنے میں بابا صاحب نے برسوں محنت کی تھی۔ طاقتور ذاتوں کی ترجمان بھگوا جماعت آئین کے بننے کے بعد سے ہی اس کی مخالفت کرتی رہی ہے اور بابا صاحب کے آئین کی خامیاں نکالتے ہوئے منوسمرتی کی تعریف کرتی رہی ہے۔ اسی منوسمرتی کو بابا صاحب نے غیر مساوات کو فروغ دینے والی کتاب قرار دیا تھا اور عوام کے سامنے اسے جلایا تھا۔ لیکن بی جے پی کی دوہری سیاست یہ ہے کہ وہ بابا صاحب کا نام اپنے منہ پر رکھتی ہے، جبکہ منوسمرتی اس کے دل میں بسی ہوئی ہے۔ جہاں بھگوا جماعت اکثریتی بالادستی پر یقین رکھتی ہے اور اقلیتوں کی حب الوطنی پر سوال اٹھاتی رہتی ہے، وہیں بابا صاحب نے جمہوریت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ کامیاب جمہوریت وہی ہے جہاں اقلیتوں کو موثر اور متناسب نمائندگی ملے اور ان کے مفادات کا تحفظ یقینی ہو۔ جہاں امبیڈکر جمہوری راستے پر چلتے ہوئے سماج میں پرامن طریقے سے معاشی اور سماجی تبدیلیاں لانا چاہتے تھے اور ایک فلاحی و سوشلسٹ ریاست کے حامی تھے، وہیں بھگوا جماعت سرمایہ داروں اور زمینداروں کی نمائندگی کرتی ہے اور غریبوں کو بازار کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر ایک سیکولر اور فلاحی ریاست کے حامی تھے، جبکہ بھگوا جماعت ایک ہندو راشٹر بنانا چاہتی ہے، جہاں اقلیتوں، دلتوں، آدی واسیوں، پسماندہ ذاتوں اور خواتین کے مساوی حقوق چھین لیے جائیں۔

تاہم، ڈاکٹر امبیڈکر کے ساتھ انصاف کرنے میں اس وقت کی نہرو حکومت بھی ناکام رہی تھی۔ ہندو کوڈ بل کو بابا صاحب امبیڈکر پاس کرانا چاہتے تھے، لیکن رجعت پسند طاقتیں، جو کانگریس کے اندر موجود تھیں، اس کی سخت مخالفت کر رہی تھیں۔ کانگریس کی دائیں بازو کی طاقتوں کو خوش رکھنے کے لیے نہرو نے امبیڈکر کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مایوس ہو کر امبیڈکر نے نہرو کی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور ۱۹۵۲ء کے عام انتخابات سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ اتحاد کر کے لڑے۔ ہندو کوڈ بل کے موضوع پر کانگریس کی دائیں بازو کی طاقتیں اور بھگوا جماعتیں متحد تھیں۔ دونوں نے مل کر امبیڈکر کو نشانہ بنایا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ نہرو حکومت دلتوں اور محکوم طبقات کے مفادات میں کام کرنے میں ناکام رہی اور اس نے نہ ہی غربت اور بدعنوانی کے خاتمے کی سنجیدہ کوشش کی۔ نہرو کے دور میں اپوزیشن پارٹیوں کو جگہ نہیں دی گئی اور حزب اختلاف کے لیڈر کی پوزیشن خالی رہی۔ خود امبیڈکر نے اس بات پر غم و غصے کا اظہار کیا کہ انہیں وہ وزارت نہیں دی گئی جس کا وزیر اعظم نے وعدہ کیا تھا۔ کئی بار کابینہ کی میٹنگز میں امبیڈکر کو شامل نہیں کیا گیا۔ امبیڈکر کو یہ شکایت بھی تھی کہ کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے دلت لیڈروں کو بولنے کے معقول مواقع فراہم نہیں کیے جا رہے تھے اور ان دلت لیڈروں کو امبیڈکر کی تنقید کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ ان تلخ تجربات نے امبیڈکر کے اس خدشے کو تقویت دی کہ اعلیٰ ذاتوں کی پارٹیاں محکوم طبقات کے مفادات کا تحفظ نہیں کر سکتیں اور محکوموں کو قیادت اپنے ہاتھ میں لینی ہوگی۔ امبیڈکر کو ہڑپنے کے لیے طاقتور جماعتیں آج بھی گھڑیالی آنسو بہا رہی ہیں، لیکن بابا صاحب کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے عملی اقدامات کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں ان خطرات سے خبردار رہنا ہوگا اور محکوم طبقات کے درمیان اتحاد قائم کرنے کے لیے سنجیدگی سے کام کرنا ہوگا۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)
debatingissues@gmail.com

جمہوریت، اقلیتی حقوق اور بھیم راؤ امبیڈکر

آئین کے مطابق کوئی بھی قانون یا پالیسی نافذ نہیں کی جائے گی جب تک کہ اس میں اقلیتوں کی برابر کی شرکت اور رضامندی شامل نہ ہو

ابھے کمار

آج بھارت اور دنیا کے مختلف حصوں میں بابا صاحب بھیم راو امبیڈکر کا ۱۳۴واں یومِ ولادت منایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے افکار محکوم طبقات کے لیے مشعلِ راہ ہیں، جو انہیں زندگی کے ہر راستے اور موڑ پر رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ آج ہم یہاں امبیڈکر کے تصورِ اقلیتی حقوق پر گفتگو کریں گے، جو جمہوریت کی بقا اور سماجی انصاف کے اہداف سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ امبیڈکر ایک سچے جمہوریت پسند انسان تھے، جو آمرانہ طرزِ حکومت کے سخت مخالف تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ کسی ایک فرد، جماعت، ذات یا طبقے کو تمام اختیارات سونپ دینا ایک خطرناک عمل ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ کوئی بھی واحد فریق تمام طبقات کے مفادات کا مؤثر تحفظ نہیں کر سکتا۔ امبیڈکر پر برطانوی سامراج کی حمایت کا الزام لگایا گیا، جو کسی بھی پہلو سے جائز نہیں تھا۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بابا صاحب ہندوستان کی آزادی کے قطعی مخالف نہیں تھے۔ جہاں اعلیٰ ذاتوں نے محض اقتدار کی منتقلی کو سوراج کی تکمیل سمجھا، وہیں امبیڈکر نے قومی رہنماؤں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ آزادی کے بعد ہندوستان میں اقلیتوں کو دیے جانے والے حقوق اور تحفظات کو واضح طور پر بیان کریں۔ اعلیٰ ذات کے رہنما، اگرچہ برطانوی راج پر اپنی سیاسی تنقید میں بظاہر انقلابی نظر آتے تھے، لیکن جب دلتوں، آدیواسیوں، نچلی ذاتوں اور مذہبی اقلیتوں کے مسائل پر گفتگو کی بات آتی، تو ان کا رویہ اکثر قدامت پسند اور رجعت پسند ہوتا۔

امبیڈکر نے غالب قوم پرستی پر سماجی انصاف کے نقطۂ نظر سے بھرپور تنقید کی۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران، وہ مسلسل ذات پر مبنی عدم مساوات کے مسئلے کو اجاگر کرتے رہے اور دبے کچلے اور کمزور طبقات کی آواز بلند کرنے کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ ذات پر مبنی سماجی ڈھانچہ ہندوستانیوں کے درمیان اخوت اور اتحاد کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک ذات کے مسئلے کو حل نہیں کیا جاتا، قوم کی تعمیر کا عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس، اعلیٰ ذاتوں کے رہنما اور ہندوتوا کیمپ سے وابستہ ان کے اتحادی اکثر قوم پرستی کا ایک فرقہ وارانہ نظریہ پیش کرتے رہے، جس میں یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ ہندوستانی قوم کا وجود ہزاروں سال پرانا ہے۔ قوم کو قدیم دور سے جوڑ کر، ہندو انتہا پسند نظریہ سازوں نے اکثریتی طبقے کو اصلی قوم قرار دیا، جبکہ غیر ہندوؤں کی حب الوطنی پر سوالیہ نشان کھڑا کیا۔ امبیڈکر ان مذہبی اور فرقہ وارانہ تشریحات کے خطرات سے بخوبی آگاہ تھے، جو قوم پرستی اور شہریت کے تصورات سے متعلق تھیں۔ اسی وجہ سے وہ فرقہ وارانہ اکثریت کی تشکیل کی تمام کوششوں کے سخت مخالف تھے۔ امبیڈکر کے نزدیک جمہوریت کے لیے سب سے بڑا خطرہ فرقہ پرستی کی سیاست اور آمرانہ طرزِ حکومت ہے۔ ان کے نزدیک جمہوریت کا اصل مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں پُرامن طریقے سے انقلابی سماجی اور اقتصادی تبدیلی لائی جائے، تاکہ مساوات کو فروغ دیا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقلیتوں کو اقتدار میں برابر کا شریک بنایا جائے اور ان کے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے مخصوص اقدامات، بشمول تحفظات، فراہم کیے جائیں۔ یہ بات یاد رکھنا نہایت اہم ہے کہ امبیڈکر نے گول میز کانفرنس کے دوران دلت طبقے کے لیے علیحدہ انتخابی حلقوں کا پُرزور مطالبہ کیا تھا، جسے بعد میں برطانوی حکومت نے تسلیم بھی کر لیا تھا۔ تاہم، مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کے بعد، امبیڈکر کو اپنے اس مطالبے سے دستبردار ہونا پڑا۔ امبیڈکر نے مشاہدہ کیا تھا کہ دلتوں کی مستند اور حقیقی آواز کو نہ تو مرکزی سیاسی جماعتوں کی جانب سے مناسب حمایت حاصل ہوتی ہے، اور نہ ہی ذات پر مبنی ہندو ووٹران کی حمایت کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں دلت طبقات کو مسلسل سیاسی، سماجی اور اقتصادی حاشیے پر دھکیلا جاتا رہا۔ امبیڈکر کے نزدیک اقلیت کی اصطلاح صرف مذہبی اقلیتوں تک محدود نہیں تھی۔ انہوں نے اقلیتوں کو ایک وسیع تر مفہوم میں سماجی طور پر محروم اور پسماندہ طبقات کے طور پر بیان کیا۔ ان کے مطابق، اقلیت کی درجہ بندی نہ صرف مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، بدھ مت کے ماننے والوں، جین مت کے پیروکاروں اور پارسیوں پر صادق آتی ہے، بلکہ دلت اور آدی واسی برادریوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بعد کے دور میں کئی سیاسی ماہرین نے اقلیتوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا، جیسے مذہبی، لسانی، ذات پر مبنی اور قبائلی (آدی واسی) اقلیتیں۔

امبیڈکر نے غالب قوم پرستی پر سماجی انصاف کے نقطۂ نظر سے بھرپور تنقید کی۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران، وہ مسلسل ذات پر مبنی عدم مساوات کے مسئلے کو اجاگر کرتے رہے اور دبے کچلے اور کمزور طبقات کی آواز بلند کرنے کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ ذات پر مبنی سماجی ڈھانچہ ہندوستانیوں کے درمیان اخوت اور اتحاد کے فروغ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

امبیڈکر کا ماننا تھا کہ کسی بھی کامیاب جمہوریت کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ اپنی اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا کس حد تک تحفظ کرتی ہے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ جمہوری نظام میں حکومت اکثریتی حمایت سے قائم ہوتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اقلیتوں کو پالیسی سازی سے باہر رکھا جائے یا ان کے مفادات کو نظر انداز کیا جائے۔ آج بابا صاحب کی پیش گوئی کردہ خطرات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکے ہیں۔ مسلم اقلیت کو "غیر" بنا کر پیش کرنا اور دانستہ طور پر فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دینا ایک ایسی حکمتِ عملی بن چکی ہے جس کا مقصد اکثریتی برادری کو مذہبی شناخت کی بنیاد پر متحد کر کے ایک فرقہ وارانہ اکثریت کی تشکیل ہے۔ ان خطرات کو بھانپتے ہوئے امبیڈکر نے واضح طور پر کہا تھا کہ اکثریتی ووٹوں سے قائم ہونے والی حکومت کو مقدس یا ناقابلِ تنقید نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ ۶ مئی ۱۹۴۵ کو بمبئی میں آل انڈیا شیڈولڈ کاسٹ فیڈریشن کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے امبیڈکر نے کہا کہ اکثریت پر مبنی حکومت نہ تو نظریاتی طور پر قابلِ قبول ہے، نہ ہی عملی طور پر جائز۔ کسی اکثریتی برادری کو نسبتاً زیادہ نمائندگی دی جا سکتی ہے، لیکن وہ کبھی بھی مکمل اکثریت کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

امبیڈکر نے کئی مواقع پر اقلیتوں کے لیے تناسبی اور مؤثر نمائندگی، دونوں کا پُرزور مطالبہ کیا۔ یہاں یہ بات سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ اگرچہ تناسبی نمائندگی لازمی ہے، لیکن صرف اسی پر انحصار کافی نہیں۔ امبیڈکر کے تصورِ تحفظِ حقوقِ اقلیت میں مؤثر نمائندگی کی اصطلاح کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک بار جب مؤثر نمائندگی کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اقلیتوں کو ایک طرح کی ویٹو پاور حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ویٹو پاور اس بات کی ضمانت ہے کہ اقلیتوں کو اکثریتی حکمرانی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ کوئی بھی قانون اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی کوئی پالیسی نافذ کی جائے گی جب تک کہ اقلیتوں کی برابر کی شرکت اور رضامندی شامل نہ ہو۔ امبیڈکر کا مؤقف تھا کہ اگرچہ حکومت اکثریتی حمایت سے قائم ہو سکتی ہے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اقلیتوں کی رضامندی کو ہر حال میں شامل رکھے۔ اسی بنیاد پر انہوں نے ہر اس قانون سازی کی مخالفت کی جو اقلیتوں کی منظوری کے بغیر نافذ کی جائے، اور انہوں نے تنبیہ کی کہ اس طرح کی فرقہ پرستانہ پالیسیوں کا نتیجہ بغاوت کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ آج نریندر مودی کی قیادت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت ایک کے بعد ایک ایسے قوانین نافذ کر رہی ہے، جو اقلیتوں، خاص طور پر مسلم اقلیت کو براہِ راست متاثر کرتے ہیں اور یہ سب اقلیتوں کی رضامندی کے بغیر کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں منظور کیا گیا وقف ترمیمی بل بڑے پیمانے پر اقلیتی حقوق پر اکثریتی حملے کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ ■

(مضمون نگار جدید تاریخ میں جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

deabtingisues@gmail.com

دی وائر

فکر و نظر

اقلیت پر اکثریتی تسلط کے سخت مخالف تھے بابا صاحب امبیڈکر

ابھے کمار 14/04/2021

سیاست داں اور ارباب اقتدار جہاں ایک طرف اپنے آپ کو امبیڈکر کا سچا 'مقلد' بتاتے ہیں وہیں دوسری طرف اقلیتی طبقات کی حق تلفی کرنے سے بھی وہ گریز نہیں کرتے۔

فوٹو: پی ٹی آئی

محکوموں اور مظلوموں کے مسیحا بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر آج ہی کے دن یعنی 14/ اپریل 1891 کو بمبئی صوبے کے ایک اچھوت مہار ذات میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے خود بھی اپنی زندگی میں طرح طرح کے تعصب، ظلم و ستم برداشت کیے۔

اچھوت ہونے کی وجہ سے اعلیٰ ذات کے لوگوں نے ان کے ساتھ زندگی کے ہر موڑ پر بھید بھاؤ کیا۔ اعلیٰ ذات ہندوؤں کو امبیڈکر کی اس بات سے 'چڑھ' تھی کہ وہ ذات پات اور چھوا چھوت پر مبنی بھید بھاؤ کے مسئلے کو قومی سیاست کے مرکز میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہیں دوسری طرف قومی تحریک سے وابستہ اعلیٰ ذات پر مبنی قیادت ان سوالوں کو دبا کر اقتدار کی کمان انگریزوں سے اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی تھی۔

امبیڈکر بھی ہندوستان کی آزادی کے پیروکار تھے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی قیادت خود ہندوستانیوں کے پاس ہو مگر امبیڈکر اس بات سے بھی فکر مند تھے کہ اگر ہندوستان آزاد ہوتا ہے تو یہاں کے محکوموں اور مظلوموں کو کیا کیا حقوق دیئے جائیں گے۔

ان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ آزاد ہندوستان میں محکوم اور مظلوم طبقات کو اقتدار میں واجب حصہ داری مل پائے گی بھی یا نہیں۔ وہ اس بات سے بھی فکر مند تھے کہ آزاد ہندوستان میں اقلیتی طبقات پر اکثریتی طبقات اپنی تعداد کی بنیاد پر غالب نہ ہو جائے اور اپنے مفادات ان پر نہ تھوپے۔ ان کے نزدیک اگر اقلیتوں پر اکثریتی طبقے کا تسلط تھوپ دیا جائے گا تو یہ جمہوری اقدار کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔

جن خدشات اور سوالات کو لے کر امبیڈکر آزادی کے وقت پریشان تھے، آج بھی وہ سوالات جوں کے توں قائم ہیں، جو بات امبیڈکر نے 80-70 سال پہلے کہی تھی اس کی اہمیت اور معنویت آج اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرکز اور ملک کی بیشتر ریاستوں میں ہندو شدت پسند جماعتیں برسر اقتدا،

ہیں۔

افسوس اس بات کا نہیں ہے کہ آر ایس ایس کی سیاسی جماعت بی جے پی انتخابات در انتخابات فتح یاب ہوتی جا رہی ہے بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ وہ اپنی جیت کے نشے میں جمہوری اقدار سے بھٹک گئی ہے۔ امبیڈکر نے جس بات کی طرف اشارہ کیا تھا وہ آج کھل کر سامنے آگئی ہے۔

کس طرح اکثریتی طبقہ اپنی بات اور اپنے مفاد اقلیتی طبقات کے اوپر تھوپ رہی ہے اور ان کے جذبات اور ان کی نمائندگی کو لے کر غیر سنجیدہ اور بے حس ہے۔

یہ بھی پڑھیں: امبیڈکر سے محبت کا دعویٰ کرنے والے روہت ویمولا کے نام سے کیوں گھبراتے ہیں؟ (http://thewireurdu.com/22597/remembering-rohith-vemula-and-his-legacy/)

جمہوریت کیا ہے؟ اس کا جواب اکثر لوگ کچھ اس طرح دیتے ہیں کہ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جہاں عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کے لیے، عوام کے ذریعے تشکیل دی جاتی ہے۔ مگر امبیڈکر صاحب نے جمہوریت کی جو تشریح کی ہے وہ اس سے ایک قدم آگے ہے، ان کا ماننا ہے کہ جمہوریت میں

حکومت سازی کا عمل اکثریتی ووٹ سے ہی طے ہوتا ہے مگر اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ اکثریتی حکومت اقلیتی طبقات کے مفادات اور اقتدار میں ان کی حصہ داری کو نظر انداز کردے۔

جدید ہندوستان کے معمار اور آئین ساز ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی ان ساری باتوں کو آج فراموش کردیا گیا ہے۔ سیاست داں اور ارباب اقتدار جہاں ایک طرف اپنے آپ کو امبیڈکر کا سچا 'مقلد' بتاتے ہیں وہیں دوسری طرف اقلیتی طبقات کی حق تلفی کرنے سے بھی وہ گریز نہیں کرتے۔

حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ پارلیامنٹ میں مسلم اراکین کی تعداد آج 1957 کے بعد سب سے کم ہے۔ برسر اقتدار بی جے پی مسلمانوں کو الیکشن میں ٹکٹ نہ دینے کی غیر اعلانیہ پالیسی اپنا رہی ہے اور اسے یہ کہنے میں 'شرم' محسوس نہیں ہوتی کہ بی جے پی ہندوؤں کی پارٹی ہے اور اس کی حریف کانگریس مسلمانوں کی۔

اس سے بی جے پی کا یہ ایجنڈا کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ ووٹروں کو مذہب کی بنیاد پر گول بند کیا جائے اور خود کو اکثریتی طبقے سے جوڑ دیا جائے تاکہ اس کی سیاسی اکثریت فرقہ وارانہ اکثریت میں تبدیل ہوجائے۔ اس طرح وہ ہندوستانی سیاست میں ناقابل شکست پارٹی کی حیثیت اختیار کرلے گی جو کہ امبیڈکر کی نظر میں جمہوریت کے لیے نہایت ہی مہلک اور خطرناک ہے۔

اترپردیش اسمبلی الیکشن کو ہی لے لیجئے جس میں بی جے پی نے ایک بھی ٹکٹ کسی مسلم کو نہیں دیا اور اپنی حریف بی ایس پی کی جم کر اس بات پر تنقید کی کہ اس نے مسلمانوں کو 90 سیٹ پر اتار کر مسلمانوں کی منہ بھرائی کی ہے۔

جمہوری اقدار کی دھجیاں کچھ اس طرح اڑی کہ مسلمانوں کو پوری طرح سے نظر انداز کرنے کے باوجود اس جماعت نے اسمبلی انتخابات میں غالب اکثریت حاصل کی۔ آج بی جے پی کے پاس تقریباً چودہ سو اراکین اسمبلی اور تین سو سے زائد اراکین پارلیامنٹ (بشمول راجیہ سبھا) ہیں مگر وہاں بھی مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

اقتدار میں حصہ داری کی کون کہے، جب پالیسی اور اسکیم بنانی ہوتی ہے تو وہاں بھی بی جے پی مسلمانوں کے جذبات اور مفادات کا خیال نہیں رکھ رہی ہے۔ مثال کے طور پر بی جے پی طلاق ثلاثہ پر لوک سبھا میں ایک بل لائی اور اس مسئلے پر لمبی بحث بھی ہوئی مگر سرکار نے کبھی بھی مسلمانوں کے معتبر قائد اور ملی رہنماؤں سے گفتگو نہیں کی اور کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آخر کار مسلم سماج اس مسئلے کو کس طرح سے دیکھتا ہے۔

مسلمانوں کے نام پر بی جے پی نے ایسے لیڈروں کو آگے بڑھایا جن کی پکڑ مسلم سماج میں ڈھیلی ہے جو مسلمانوں کے زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔

یہ بھی پڑھیں: ابیڈکر سے مودی اور سنگھ کے پیار کی حقیقت (http://thewireurdu.com/20980/rss-bjp-appropriating-ambedkar-opinion/)

بی جے پی کے علاوہ دوسری سیکولر پارٹیوں کا ریکارڈ بھی اس سمت میں قابل اطمینان نہیں ہے۔ سیکولر پارٹی ہونے کا دعویٰ کرنے والی کانگریس بھی مسلم مسائل پر زبان کھولنے سے گریز کر رہی ہے۔ اس کو اس بات کا 'خوف' ہے کہ کہیں بی جے پی اس کی مسلم دوستی کو طول نہ دے دے اور اکثریتی طبقے سے اسے مزید دور نہ کردے۔

غیربی جے پی اور غیر کانگریسی پارٹیاں جو مختلف صوبوں میں برسراقتدار ہیں انھوں نے بھی مسلمانوں کے ووٹ تو لیے مگر ان سے کیے وعدوں کو پورا کرنے میں سنجیدگی نہیں دکھا رہی ہیں۔ یہ سبھی سیاسی جماعتیں ابیڈکر نوازی میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہی ہیں مگر جب بات ان کے پیغامات اور ان کے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی ہو تو وہ دور دور تک کہیں نظر نہیں آتیں۔

ابیڈکر نے اپنی تحریر اور اپنی سیاسی سرگرمیوں کے ذریعے ان مسائل کو مرکز میں رکھا جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ ابیڈکر چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں سبھی طبقے کو ان کا واجب حق اور ان کی صحیح نمائندگی ملے۔ 6 مئی 1945 کو بمبئی میں واقع آل انڈیا ایس سی فیڈریشن کی سالانہ تقریب میں بولتے ہوئے ابیڈکر نے کہا کہ کسی بھی صورت میں ایک طبقہ دوسرے طبقے پر اپنا تسلط نہ جمائے۔

انھوں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے مزید کہا کہ تعداد کی بنیاد پر اکثریتی طبقہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اقلیتی طبقے پر اپنی رائے تھوپے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اکثریت پر بنی حکومت اصولاً درست نہیں ہے اور ایسی حکومت عملاً بھی صحیح نہیں ہے مگر اکثریت پر بنی حکومت اس معنی میں قابل قبول ہو سکتی ہے جب وہ نسبتی (relative) ہو۔ ایسی حکومت جو مطلق (absolute) بن جائے وہ قابل قبول ہرگز نہیں ہے۔

امبیڈکر کے مذکورہ بالا جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اکثریتی ووٹ حکومت سازی میں کلیدی رول ادا کرتا ہے اور صرف اقلیتی ووٹ کی بنیاد پر کبھی بھی حکومت نہیں بن سکتی مگر اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ اکثریتی طبقہ اپنے ووٹ اور اپنی تعداد کی بنیاد پر ایک مطلق العنان حکومت قائم کرے اور اقلیتی طبقات کی حصہ داری اور ان کے واجب نمائندگی کو نظر انداز کردے۔ سے ت

بھی تو امبیڈکر نے ہندوؤں کو متنبہ کیا کہ انھیں کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اکثریت پر بنی حکومت 'مقدس' (sacrosanct) ہے اور اس پر کوئی سوال نہیں اٹھا سکتا۔

آزادی کے وقت ہندو مسلم مسائل کو وہ اسی سیاق میں دیکھتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ ملک کی تقسیم روکی جا سکتی ہے اگر ایک ایسی حکومت تشکیل دی جائے جہاں اقلیتی طبقات کے مفادات کو پس پشت نہ ڈالا جائے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ امبیڈکر کی اس تدبیر کو نہ اس وقت مانا گیا اور نہ آج کے ارباب اقتدار اسے ماننے پر راضی ہیں۔

لیکن جب بات امبیڈکر سے اپنا رشتہ جوڑنے کی ہو اور دلت ووٹروں کو اپنی طرف راغب کرنے کی ہو تو سبھی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے مقابلہ کرتی نظر آ رہی ہیں۔

یہ مضمون پہلی بار 14 اپریل 2018 کو شائع کیا گیا تھا۔

Related

دی وائر

فکر و نظر

امبیڈکر سے مودی اور سنگھ کے پیار کی حقیقت

ابھے کمار 14/04/2021

ابیڈکر نے کہا تھا؛' اصل میں دنیا میں دو ذات ہے، پہلا امیر اور دوسرا غریب '۔ مودی حکومت کی نوٹ بندی، جی ایس ٹی، فلاحی کاموں سے سرکار کی کنارہ کشی اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لئے ہر روز نئی پالیسی کا نفاذ کسی بھی طرح سے ابیڈکر کے نظریات سے میل نہیں کھاتے۔

7دسمبر کے روز دہلی میں واقع ڈاکٹر بی آر ابیڈکر انٹرنیشنل سینٹر(اے آئی سی) کا افتتاح کرتے ہوئے، وزیر اعظم نریندر مودی نے گاندھی نہرو خاندان پر بابا صاحب کو نظر انداز کرنے کا الزام لگایا- حالانکہ انہوں نے اپنی پوری تقریر میں گاندھی نہرو خاندان کا براہ راست نام نہیں لیا، پھر بھی وہاں موجود لوگ آسانی سے سمجھ گئے کہ ان کا اشارہ کس طرف تھا۔

ابیڈکر کو نظر انداز کرنے کا وزیر اعظم کا الزام نیا نہیں ہے۔ گزشتہ کچھ سالوں سے ، بھگوا تنظیم آر ایس ایس اور اس کی معاون جماعتیں، ابیڈکر کو اپنا "دیوتا" اور خود کو ان کا "سچا" مقلد بنانے کی کوشش کر رہی ہیں ۔ اس کے پیچھے ان کا بڑا مقصد ہے یہ ہے کہ دلتوں کے بیچ جگہ بنائی جائے اور انہیں ہندوتو کا "فوٹ سولزر" (پیدل سپاہی) بنایا جائے۔

بھگوا تنظیم کی یہ سازش اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک دلتوں کے تعلقات سیکولر طاقتوں، روشن خیالوں اور اقلیتی طبقات بالخصوص مسلمانوں، سے استوار ہیں۔ دلتوں کو اپنی طرف راغب کرنے لئے آر ایس ایس اور اس کی معاون تنظیمیں خود کو بابا صاحب کا پیروکار اور مقلد بتاتی رہی ہیں وہیں دوسری جانب وہ اپنے حریفوں پر بابا صاحب سے دغا کرنے کا الزام لگا رہی ہیں۔

اے آئی سی کو قائم کرنے کا مقصد ابیڈکر کے نظریہ، فلسفہ اور ان کے تعلیمات کو فروغ دینا ہے۔ عالمی طور پر ابیڈکر تحریک سے وابستہ سرگرمیوں کے فروغ سے لے کر آپسی تال میل بنانے کی سمت میں کام کرے گا۔ ثقافتی امور کے علاوہ ، عدم مساوات کے خلاف لڑائی اور انسانی حقوق کی پامالی پر روک تھام اس ادارہ کے اہم مقاصد میں شامل ہیں۔

مگر بہت سارے ابیڈکر کے ماننے والوں کا خدشہ ہے کہ کہیں یہ ادارہ بھی، ابیڈکر کے نام پر بننے والے دیگر اداروں کی طرح، بے توجہی کا شکار نہ ہو جائے۔

مودی کی مذکورہ تقریر کو اسی سیاق اور پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے۔ وزیر اعظم نے اس تقریر کا زیادتر حصہ حریفوں کی تنقید اور مرکزی حکومت کی حصولیابی پر اپنی پیٹھ تھپتھپانے میں صرف کیا۔ اپنی بات شروع کرنے کے کچھ ہی منٹ کے اندر وہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ پائے اور نہرو گاندھی پر برس پڑے۔

انہوں نے اس بات کی بھی قطعی پروانہیں کہ وہ آر ایس ایس کے "پرچارک" نہیں بلکہ بحیثیت ملک کے وزیر اعظم بول رہے تھے: 'ان (امبیڈکر) کے جانے بعد سالوں تک ان کے افکار کو دبانے کی کوشش ہوئی۔ ملک کی تعمیر میں ان کی خدمات کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔

لیکن بابا صاحب کے افکار کو ایسے لوگ ہندوستانی عوام کے تخیل سے قطعی ہٹا نہیں پائیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ جس خاندان کے لئے یہ سب کچھ کیا گیا اس خاندان سے زیادہ لوگ آج بابا صاحب سے متاثر ہیں، تو میری یہ بات غلط نہیں ہوگی۔

مودی کا یہ الزام پوری حقیقت کو بیان نہیں کرسکا۔ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا ہے کہ جنگ آزادی کے دوران امبیڈکر کا کانگریسی رہنماؤں، جس کی قیادت مہاتما گاندھی کر رہے تھے، سے اختلاف تھا۔ بار بار امبیڈکر ذات پات اور دلتوں کے حقوق کے سوال کو قومی تحریک کے مرکز میں لا رہے تھے، جبکہ کانگریسی قیادت انگریزوں سے پہلے اقتدار حاصل کرنے کے نام پر، ان سوالوں کو ٹال رہے تھے۔

جہاں امبیڈکی دلیل تھی کہ سماجی اصلاحات کے بغیر سیاسی آزادی کے کوئی معنی نہیں ہیں اور ذات پات کی لعنت کو دور کئے بغیر آزادی کا کوئی مطلب نہیں ہے، وہیں کانگریسی قیادت ، جس میں اعلیٰ ذات اور بڑے سرمایہ داروں کا غلبہ تھا، اس سوال سے بچ رہے تھے ۔

تبھی تو کئی موقع پر امبیڈکر اور کانگریسی پارٹی کے راستے الگ ہوگئے۔ سائمن کمیشن کی مخالفت ، گول میز کانفرنس ، پونا پیکٹ اور بھارت چھوڑو تحریک نے امبیڈکر اور کانگریس کو دو طرف لا کر کھڑا کر دیا۔

Photo: bjp.org

ان اختلافات کے باوجود، ابیڈکر اور گاندھی کے مابین ڈائیلاگ بھی ہوا، جس کو سمجھے بغیر جدید ہندوستان کی تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے۔ آزاد ہندستان کی آئین سازی میں بابا صاحب نے اپنا کلیدی رول ادا کیا اور پھر وہ نہرو حکومت میں بطور (پہلے) وزیر قانون شامل ہوئے ۔ لیکن انہوں نے جلد ہی ہندو کوڈبل کے سوال پر نہرو حکومت سے استفیٰ دے دیا۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ آزاد بھارت میں، باباصاحب کو وہ مقام تب تک نہیں ملا جب تک دلت سماج سیاسی طور پر بیدار نہیں ہوا اور دلتوں کی سیاسی پارٹی بر سر اقتدار نہ آئی۔ اگر اس کوتاہی کے لئے نہروگاندھی خاندان قصوروار ہے تو، آر ایس ایس، جن سنگھ اور بی جے پی کیوں نہیں ہے؟ آر ایس ایس تو 1925 سے سرگرم ہے، اس نے ابیڈکے لیے کیا کیا؟

دوسروں پر انگلی اٹھانے والے مودی ، عوام کو یہ بھی بتانے کی ہمت رکھتے ہیں کہ آر آیس ایس نے امبیڈکر کے افکار اور نظریات کے فروغ اور ان کے خواب کو پورا کرنے کے لئے ابھی تک کیا کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آر ایس ایس ہمیشہ سے امبیڈکر اور ان کے افکار کی مخالف رہی ہے۔

ان کی نام نہاد امبیڈکر نوازی آج ان کی مجبوری بن گئی ہے۔ آر ایس ایس نے جنگ آزادی میں نہ تو حصہ لیا اور نہ ہی اس کے رضاکار انگریزی سلطنت سے بھڑے۔ ان کا اصل کام فرقہ وارانہ کشیدگی کو بڑھا کر ، عوامی اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرنا تھا۔یہی وجہ ہے کہ امبیڈکر، یا کسی بھی قدآور مجاہد آزادی کا ، آر ایس ایس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ آج آر ایس ایس امبیڈکر کو لے کر جو بھی دعوی کر رہی ہے، وہ سب اس نے حال فی الحال میں گڑھا ہے۔

بابا صاحب کے 125ویں یوم ولادت کے موقع پر، آر ایس ایس نے اپنے ترجمان ''پانچ جنیہ'' کا ایک پورہ شمارہ ابیڈکر کے اوپر شائع کیا تھا جس میں اس نے ابیڈکر کے حوالے سے ایسی ایسی بات کہی تھی جن سے ان کا دور دور تک کوئی رشتہ نہیں ہے:

ابیڈکر نے ہندو دھرم کو دنیا کا سب سے بہتر مذہب بتایا؛ ابیڈکر اسلام اور عیسائی مذہب کو ہندوستانی نہیں باہری ملک کا مذہب مانتے تھے؛ ابیڈکر اگر آج زندہ ہوتے تو آر ایس ایس کی خدمات دیکھ کر بہت خوش ہوتے؛ ابیڈکر کا موازنہ سوامی وویکانند اور سردار پٹیل سے کیا گیا؛ ابیڈکر نے ملک کی

بڑی خدمت کی کیوں کہ انہوں نے دلتوں کو کمیونسٹ ہونے سے روکا وغیرہ۔

امبیڈکر نوازی کا دعویٰ کرنے والی بھگوا تنظیم کل تک امبیڈکر اور ان کے افکار کے خلاف کھل کر بولتی تھی۔ آر ایس ایس کے نظریہ ساز گولولکر نے "منواسمرتی" کی تعریف کی تھی، جس کی بابا صاحب نے اپنی پوری زندگی تنقید کی اور اسے دلتوں اور دیگر پسماندہ ذات کی غلامی کے لئے ذمہ دار مانا۔ آر ایس ایس کے ترجمان "آرگنائزر" نے سال 1949 کے شمارہ میں منواسمرتی پر ایک اداریہ لکھا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ آئین ساز کونسل کے ممبران منواسمرتی کی اہمیت پر غور نہیں کر رہے ہیں۔

سال 1990 میں آر ایس کی ایک معاون تنظیم وی ایچ پی، جس نے رام مندر، بابری مسجد کا فتنہ کھڑا کیا تھا جس کی زد میں آکر سینکڑوں افراد ہلاک ہو گئے، نے "دھرم سنسد" کا انعقاد کیا تھا اور کہا تھا کہ بھارت کا آئین ہندو مخالف ہے کیونکہ وہ ہندو مذہب کی کتابوں پر مبنی نہیں ہے۔ پس، آر ایس ایس جہاں اپنے آپ کو ہندو دھرم کا محافظ مانتا ہے اسے بابا صاحب نے پوری طرح سے خارج کیا۔

دوسروں کو کوسنے والے مودی یہ نہیں سمجھتے کہ خود وہ اور ان کی وراثتی تنظیم آر ایس ایس امبیڈکر کے نظریات سے کتنے دور ہیں۔ مودی "پوجا-پاٹ" اور توہم پرستی میں یقین رکھتے ہیں وہیں امبیڈکر اپنی پوری زندگی اس کی تنقید کرتے رہے۔ بابا صاحب نے پوری زندگی منطقی اور سائنٹفک نظریات کی بات کی، مگر مودی قدیم ہندستان میں پلاسٹک سرجری کے رواج کی بات کرتے ہیں۔

ابیڈکر کے نزدیک اقلیتی حقوق جمہوریت کا اہم حصہ ہے۔ اگر سماج کے سارے طبقوں کی نمائندگی کو یقینی نہیں بنایا جائے گا تو ایک طبقہ دوسرے گروپ پر اس قدر مغلوب ہو جائے گا کہ وہ اس کی حق تلفی کرلے گا۔ مودی کے اقتدار میں آنے کے بعد مسلمانوں کو الیکشن میں ٹکٹ نہیں دیا جا رہا ہے اور پورا کا پورا الیکشن ہندو-بنام مسلم لڑا جارہا ہے۔ کیا یہ سب بابا صاحب کے افکار کو نظرانداز کرنا نہیں ہے؟

گاندھی نہرو خاندان پر برسنے کے بعد، مودی نے تقریر کا بقیہ حصہ اپنی حکومت اور اس کے منصوبوں کی تعریف میں وقف کیا۔ سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی سرکار کی معاشی پالیسی کو ابیڈکر کے سماجی جمہوریت کے افکار و نظریات سے وابستہ کرڈالا!

یہ بات کسے معلوم نہیں کہ ابیڈکر اسٹیٹ سوشلزم (State Socialism) کے پیروکار تھے، جس کا سیدھا مطلب ہوتا ہے ریاست عوام کے فلاحی اور رفاہی پالیسی پر عمل کرے گی اور سماج کے غریب و محروم طبقات کو آگے لانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے گی۔

ابیڈکر فیبئن (Fabian) سوشلزم سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے 1936 میں انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی کی تشکیل دی تھی اور یہاں تک کہا تھا کہ 'اصل میں دنیا میں دو ذات ہے، پہلا امیر اور دوسرا غریب'۔ نوٹ بندی، جی ایس ٹی، فلاحی کاموں سے سرکار کی کنارہ کشی اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لئے ہر روز نئی پالیسی کا نفاذ کسی بھی طرح سے ابیڈکر کے نظریات سے میل نہیں کھاتے۔

اگر مودی صحیح معنی میں امبیڈکر کی تقلید کرتے ہیں تو ان کو خود احتسابی کرنی چاہیے اور اپنی تنقید آر ایس ایس سے شروع کرنی چاہیئے۔ نہرو-گاندھی خاندان کی غلطیوں کی نشاندہی کے لئے کوئی امبیڈکر کے ماننے والے آئے تو بات مثبت سمت میں بڑھے گی۔

یہ مضمون 21 دسمبر 2017 کو شائع کیا گیا تھا۔

Related

افسوس کی بات ہے کہ 81 کروڑ سے زیادہ لوگ سرکاری اناج کے محتاج بنا دیے گئے ہیں: مایاوتی
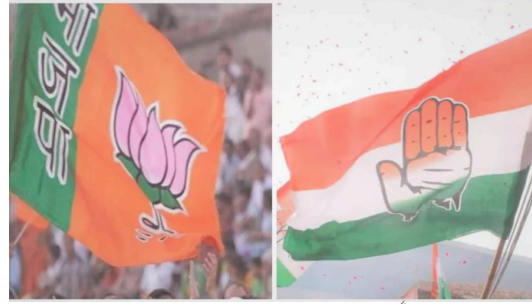
بی جے پی اور کانگریس نے شروع کی 2024 کی انتخابی مہم

لالو یادو نے مودی اور بی جے پی کو بنایا نشانہ، کہا - اکھاڑ کے پھینک دیں گے

Categories: فکر و نظر (https://thewireurdu.com/category/commentary-and-analysis/)

Tagged as: Ambedkar (https://thewireurdu.com/tag/ambedkar/), Baba Sahab (https://thewireurdu.com/tag/baba-sahab/), Baba Sahab Ambedkar (https://thewireurdu.com/tag/baba-sahab-ambedkar/), Backward Cast (https://thewireurdu.com/tag/backward-cast/), Bahujan (https://thewireurdu.com/tag/bahujan/), Bala Saheb Devras (https://thewireurdu.com/tag/bala-saheb-devras/), Bheem Sena (https://thewireurdu.com/tag/bheem-sena/), BJP (https://thewireurdu.com/tag/bjp/), Congress (https://thewireurdu.com/tag/congress/), Dalit (https://thewireurdu.com/tag/dalit/), Freedom Movement (https://thewireurdu.com/tag/freedom-movement/), Narendra Modi

ڈاکٹر بھیم راو امبیڈکر اور محکوم طبقات کے حقوق

سماجی انصاف کے بغیر بہتر بھارت کی تعمیر ممکن نہیں

ابھے کمار

دنیا بھر میں ۲۰ فروری کا دن عالمی یوم سماجی انصاف کے طور پر منایا گیا۔ اس سال بھی اقوام متحدہ سے لے کر مختلف تنظیموں نے ایک بہتر اور مساوی معاشرہ تشکیل دینے کے عہد کو دہرایا ہے۔ اس موقع پر سوشل میڈیا پر بہت سارے ایسے پوسٹ دیکھے گئے جن میں غربت، تعصب، غیر مساوی نظام، بے روزگاری اور انسانی حقوق کی پامالی پر تشویش ظاہر کی گئی ہے۔ یہ بات بے حد افسوسناک ہے کہ دنیا نے گزشتہ دو سو سالوں میں ترقی کے سارے سابقہ ریکارڈ تو توڑ دیے لیکن اسی دنیا میں آج بھی کروڑوں لوگوں کو ہر روز بھوکے پیٹ سونا پڑتا ہے۔ مایوسی کے اس عالم میں ڈاکٹر

ڈاکٹر امبیڈکر کا ایقان تھا کہ اگر اچھا قانون بن بھی جائے اور اسے نافذ کرنے والی عاملہ کا تعلق محکوم طبقات سے نہ ہو تو انصاف ملنے کی امید کم ہو جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر امبیڈکر نے محکوم طبقات کو پالیسی سازی اور اس کی تکمیل کے طریقہ کار میں حصہ داری دینے کی بات پر زور دیا۔ یہ ان کی لڑائی اور اس زمانہ کی ذات مخالف تحریک ہی کا زور تھا کہ آزاد بھارت میں ایس سی اور ایس ٹی کے لیے سرکاری نوکریوں، تعلیمی اداروں اور قانون ساز اسمبلیوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن دیا گیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر یہ بھی کہتے تھے کہ جمہوریت میں اقلیتوں کے حقوق کا احترام کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرکار بھلے ہی اکثریتی ووٹ کی بنیاد پر بن جائے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرکار اقلیتوں کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور اپنی مرضی کو سب پر تھوپے۔

بھیم راؤ امبیڈکر کی زندگی اور ان کے افکار ہمیں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی پیدائش ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ میں مہو میں ہوئی تھی جو اس وقت مدھیہ پردیش میں ہے۔ وہ اپنے والدین کی ۱۴ ویں اولاد تھے۔ ان کے والد برطانوی فوج میں ملازم تھے۔ بعد میں وہ بامبے ہجرت کر گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امبیڈکر کو بہتر تعلیم فراہم دلانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں ایلفنسٹون کالج بامبے سے گریجویشن مکمل کیا۔ پھر انہوں نے کولمبیا اور لندن سے پی ایچ ڈی اور ڈی ایس سی کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں امبیڈکر اپنی پڑھائی پوری کر کے بھارت لوٹ آئے اور دھیرے دھیرے اچھوتوں کے مسائل کو اٹھانا شروع کیا۔ اچھوتوں کے لیے مختلف اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں، جیسے ڈپریسڈ کلاسیز، اَن ٹچیبل، ہریجن اور دلت وغیرہ۔ ابتدائی دنوں میں امبیڈکر نے اپنی لڑائی اچھوتوں کے لیے تالاب سے پانی پینے کے حقوق کے لیے لڑی۔ انہوں نے اچھوتوں کو مندر میں داخلے کی اجازت نہ دینے کے معاملے میں بھی مزاحمت کی۔ لوگ بھی بڑی تعداد میں ان کا ساتھ دینے کے لیے آگے آئے، مگر انہیں بہت زیادہ کامیابی نہیں ملی۔ اس کی وجہ یہ تھی کی اعلیٰ ذات کی لابی بڑی مضبوط تھی اور انگریز بھی اعلیٰ ذاتوں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جلد ہی امبیڈکر کو یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ ہندو دھرم کے اندر تبدیلی لانا اور اس میں دلتوں کے لیے برابری کے حقوق حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں انہوں نے سر عام یہ اعلان کیا کہ وہ ہندو تو پیدا ہوئے ہیں مگر وہ بطور ہندو اس دنیا کو الوداع نہیں کہیں گے۔ امبیڈکر کی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ہندو اَپر کاسٹ اس بات سے پریشان تھے کہ اگر دلت ہندو دھرم کو چھوڑ کر مسلمان اور عیسائی بن گئے تو ان کا سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اس بات کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جمہوریت میں حکومت سازی وہی کرتا ہے جس کے پاس تعداد ہوتی ہے۔ در اصل ہندو سماج میں قائد کی کرسی پر قبضہ جمائے ہوئے اپر کاسٹ کا موقف آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ہندو معاشرے میں اکثریتی آبادی دلت اور پسماندہ ذاتوں کی ہے۔ جن لوگوں کو ہم آج ہندو سماج کہتے ہیں وہ در اصل ذات برادری میں بکھرے ہوئے مختلف سماجی گروپ ہیں جن کے مابین اخوت کے جذبہ کا فقدان ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس بکھراو کو کم کرنے اور ذات برادریوں کو دھرم کے نام پر ایک کرنے کی کی کوشش نو آبادیاتی دور میں بڑی تیزی سے ہوئی تھی۔ اپر کاسٹ کے ہندو لیڈر اس بات کو سمجھ چکے تھے کہ اگر ان کو انگریزوں کے بعد بھارت کی حکومت کو اپنی جھولی میں ڈالنا ہے تو ان کو بکھری ہوئی ذات برادریوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہوگا اور ان کو اکثریتی قوم بنا کر پیش کرنا ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ بکھری ہوئی ذاتوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے میں ہندو سماج کے اعلیٰ ذات کے لیڈر ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو غیر کہہ کر ہندو سماج میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی دوران فرقہ پرستی کی مذموم آئیڈیالوجی ابھر کا سامنے آئی جو آج تک بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر اس پورے کھیل کو سمجھتے تھے اور ان کو بخوبی علم تھا کہ ملک کے زیادہ تر قومی لیڈر ذات پات کی لعنت اور غیر مساوی نظام کو ختم کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا ہدف یہ تھا کہ کسی طرح سے انگریزوں کے ہاتھوں سے اقتدار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا جائے۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں ڈاکٹر امبیڈکر نے سمجھ لیا کہ اعلیٰ ذات پر مبنی کانگریس اور گاندھی جی کی لیڈر شپ اچھوتوں کے مسائل کے تئیں سنجیدہ نہیں ہے۔ تضاد دیکھیے کہ کل تک اچھوت کے گھروں سے

گزرتے وقت اعلیٰ ذات کے لوگوں کو بڑی مشکل ہوتی تھی اور اچھوتوں کو تالاب سے پانی پینے نہیں دیا جاتا تھا اور ان کے مندر میں داخل ہونے سے مندر ناپاک ہو جاتا تھا لیکن آج اچانک اعلیٰ ذات کے لوگ اچھوتوں کو ہندو دھرم کا حصہ کہنے لگے۔

وزیر اعظم کی اہم ترین کرسی سے لے کر بھارت رتنا ایوارڈ تک، اعلیٰ ذات بالخصوص برہمنوں کی بالادستی دیکھی جاتی ہے۔ بھارت میں اگر میرٹ کی بنیاد پر واجب حق دیا گیا ہوتا تو آج کالج اور یونیورسٹی سے لے کے پارلیمنٹ تک محکوم طبقات کے لوگ اپنا حق حاصل کر چکے ہوتے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی بات کی تشریح دیگر مقامات پر کرتے ہوئے کہا کہ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی نابرابری پائی جاتی ہے لیکن وہاں کی مذہبی کتابیں اس نابرابری کو کبھی درست نہیں ٹھہراتیں مگر ہندو دھرم کی کتابوں میں نابرابری کو ہی مثالی نظام بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام ہندو بھی بقول امبیڈکر، ذات پات میں یقین رکھتا ہے۔

ذات پات کے اس شیطانی نظام سے نجات پانے کے لیے ڈاکٹر امبیڈکر نے تعلیم حاصل کرنے، اتحاد بنانے اور اپنے حقوق کے لیے احتجاج کرنے پر زور دیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنا ڈاکٹر امبیڈکر کے افکار میں بڑا اہم رول ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اپنی پوری زندگی پڑھائی میں گزاری اور انہوں نے بہت ساری کتابیں پڑھیں اور تمام مسائل پر قلم اُٹھایا۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا ایقان تھا کہ اگر اچھا قانون بن بھی جائے اور اسے نافذ کرنے والی عاملہ کا تعلق محکوم طبقات سے نہ ہو تو انصاف ملنے کی امید کم ہو جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر ڈاکٹر امبیڈکر نے محکوم طبقات کو پالیسی سازی اور اس کی تکمیل کے طریقہ کار میں حصہ داری دینے کی بات پر زور دیا۔ یہ ان کی لڑائی اور اس زمانہ کی ذات مخالف تحریک ہی کا زور تھا کہ آزاد بھارت میں ایس سی اور ایس ٹی کے لیے سرکاری نوکریوں، تعلیمی اداروں اور قانون ساز اسمبلیوں میں ان کی آبادی کے تناسب سے ریزرویشن دیا گیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر یہ بھی کہتے تھے کہ جمہوریت میں اقلیتوں کے حقوق کا احترام کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرکار بھلے ہی اکثریتی ووٹ کی بنیاد پر بن جائے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرکار اقلیتوں کے مفاد کا خیال نہ رکھے اور اپنی مرضی کو سب پر تھوپے۔ تضاد دیکھیے کہ ڈاکٹر امبیڈکر کی تصویر پر گلپوشی کرنے میں بھگوا طاقتیں دوسروں سے بازی لے جاتی ہیں، مگر ان کی اصل بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا احترام ہی جمہوریت کا دوسرا نام ہے۔ امبیڈکر کی تعلیمات کے برعکس برسر اقتدار بھگوا حکومت اقلیتوں کی اصل لیڈر شپ کو نظر انداز کر کے ہی فیصلہ لیتی ہے اور یوں وہ جمہوریت کو پوری طرح کمزور کر رہی ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی وفات سے کچھ ہی مہینوں قبل بدھ مت کو اپنا لیا تھا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ بودھ مت کے اندر جو اصل پیغام ہے وہ ایشور کی پوجا، توہم پرستی اور رسم و رواج نہیں ہیں بلکہ اخوت اور منطقی فکر ہے۔ بھارت کے اندر اچھوت رواج کے لیے انہوں نے قدیم زمانہ میں بدھ مت کے ماننے والوں کے خلاف کیے گئے برہمنی ظلم وستم کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بدھ مت کے ماننے والوں کو بعد میں برہمنی طاقتوں نے ہی اچھوت بنا دیا اور اس طرح سے ان کو ذات پات کے نظام کے ساتھ بغاوت کرنے کی سزا دی گئی۔ کہیں پر بھی ڈاکٹر امبیڈکر نے ذات پات اور اچھوت رواج کے لیے مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں کو قصور وار نہیں مانا۔ نیز انہوں نے بھارت کی خواتین کی غلامی اور بدحالی کے لیے ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں جیسے منوسمرتی کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ بابا صاحب کی باتوں سے کوسوں دور، بھگوا طاقتیں دن رات یہ پروپیگنڈا پھیلاتی ہیں کہ بھارت میں عورتوں کی بدحالی کے لیے مسلم حملہ آوار ذمہ دار ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے افکار کو غور سے پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ ایسا کرنے سے ہمارا سماج ایک بہتر سمت میں بڑھے گا۔ آج بھی بھارت میں سماجی انصاف کی لڑائی ادھوری ہے لہذا ضرورت ہے کہ عالمی یوم سماجی انصاف کے موقع پر اس عہد کو دہرایا جائے کہ ہم سب مل کر بابا صاحب کی آزادی، مساوات اور اخوت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے کام کریں گے اور ایک بہتر بھارت بنانے کے لیے جد وجہد کریں گے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

***

تب بابری مسجد مسمار ہوئی تھی اور اب انصاف۔۔۔!

سیکولر طاقتوں کے سامنے فسطائیت کے بڑھتے قدموں کو روکنے کا چیلنج

ابھے کمار، دلی

بابری مسجد انہدام کیس کی کئی دہائیوں سے سماعت کرنے والی ملک کی ممتاز جانچ ایجنسی سی بی آئی کی ایک خصوصی عدالت نے ۳۰ ستمبر کو لکھنؤ میں ایک ایسا فیصلہ سنایا جس نے عوام کو بری طرح مایوس کیا ہے۔ تقریباً ۳۰ سال پرانے فوجداری مقدمے پر فیصلہ سناتے ہوئے، سی بی آئی کے خصوصی جج ایس کے یادو نے تمام ۳۲ ملزموں کو بری کر دیا ہے۔ عدالت نے کہا کہ اس کے پاس ایسے شواہد موجود نہیں تھے جن کی بنیاد پر مسجد کو منہدم کرنے والے قصورواروں کی شناخت کی جا سکے۔ ۳۲ ملزموں کی فہرست میں بی جے پی کے سابق صدر اور مندر تحریک کے بڑے لیڈر لال کرشن اڈوانی، سابق مرکزی وزرا مرلی منوہر جوشی اور اوما بھارتی اور سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ شامل ہیں۔ سب سے مایوس کن بات یہ ہے کہ دن کے اُجالے میں ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں مسمار کی گئی بابری مسجد کے بارے میں کورٹ نے کہا کہ یہ عمل پہلے سے منصوبہ بند نہیں تھا۔ یہ بات کسے نہیں معلوم کہ جب مسجد کو توڑا جا رہا تھا، تب سینکڑوں کی تعداد میں مقامی، قومی اور بین الاقوامی صحافی جائے واردات پر موجود تھے۔ کچھ میڈیا نے اس کی رپورٹنگ براہ راست بھی کی اور اس پورے واقعہ کی ویڈیو بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ یہی نہیں ۶ دسمبر اور اس کے آس پاس کے اخباروں کے اوراق چیخ چیخ کر گواہی دے رہے ہیں کہ بابری مسجد کا انہدام ایک بڑی سازش کا حصہ تھا۔ پھر بھی عدالت یہ کہ رہی ہے کہ اس کے پاس اس بات کے پختہ ثبوت نہیں ہیں کہ انہدام کا مرتکب کون ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ عدالت جہاں ایک طرف یہ کہ رہی ہے کہ مسجد گرانے کا عمل "سماج دشمن عناصر" نے انجام دیا، وہیں وہ یہ بھی بتلانے سے قاصر ہے کہ وہ عناصر کون ہیں۔ یہی نہیں بلکہ کورٹ نے یہ بھی کہا کہ ملزمین ہجوم کو روک رہے تھے نہ کہ انہیں مشتعل کر رہے تھے۔

عدالت کے فیصلے کو سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسجد بھلے ہی ۲۸ سال قبل شہید کی گئی تھی مگر اب انصاف کا قتل ہوا ہے۔ اس فیصلے کے بعد عوام میں عدلیہ کے تئیں اعتماد کم ہو گیا ہے۔ سوشل میڈیا پر کچھ لوگوں نے اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ آئین اور جمہوریت کا قتل ہے۔ ملک کی سیکولر جماعت میں اس بات کا شدید غصہ ہے کہ عدالت اس بات قبول کرتی ہے کہ بابری مسجد کو مسمار کرنا ایک مجرمانہ کارروائی تھی لیکن یہ بتلانے سے پیچھے ہٹ گئی کہ اس شدید جرم کا مجرم کون ہے۔ جب معمولی سے معمولی کام کو انجام دینے کے لیے ایک پلاننگ کی ضرورت ہوتی ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہو گیا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے روز ایودھیا میں ہزاروں کی تعداد میں ہجوم یوں ہی اکٹھا ہو گیا ہو۔ یہ بات تو قابل قبول نہیں ہے کہ اتنا بڑا واقعہ اچانک رونما ہو گیا۔ جس چیز سے ہمیں اچانک سابقہ پیش آتا ہے اس کے بھی تار سابقہ واقعات سے جڑے ہوتے ہیں۔ اگر کسی درخت کی جڑیں ہمیں زمین پر نظر نہیں آتیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ درخت بغیر جڑوں کے کھڑا ہے؟ یہ بات بہت سارے صحافیوں نے اپنے ذاتی تجربات سے کہی ہے کہ بابری مسجد انہدام کے لیے ایک لمبے وقت سے تیاری چل رہی تھی۔ جس دن بابری مسجد کو گرایا جا رہا تھا اس دن صحافیوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بی جے پی، آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے لیڈر "ایک دھکہ اور دو بابری مسجد توڑ دو" جیسے نعرے لگاتے ہوئے ہجوم کو مسجد توڑنے کے لیے اُکسا رہے تھے۔ اگر یہ سب کچھ اچانک ہوا تو کیسے کارسیوک اسلحہ کے ساتھ وہاں پہنچے تھے؟ کیا بابری مسجد جیسی بڑی مضبوط عمارت کو توڑنا بچوں کا کھیل تھا؟ ہرگز نہیں۔

کورٹ کے فیصلے کے اگلے روز، ہندی میڈیا انصاف کی بات کرنے کے بجائے ہندوتوا کے ایجنڈے کے تحت ملزمین کی حمایت میں آ گیا اور سیکولر جماعتوں کو نشانہ بنانے لگا۔ ایک بڑے ہندی اخبار نے تو سارے صحافتی ضابطوں کو طاق پر رکھتے ہوئے 'جے شری رام' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا۔ ایک دوسرے بڑے ہندی کے اخبار نے نہ صرف ملزمین کا دفاع کیا بلکہ سیکولر جماعتوں کو برا بھلا کہا کہ وہ کیسے بھگوان رام کی جائے ولادت پر سوال کھڑا کر سکتے ہیں۔ اس اداریہ میں اپوزیشن پارٹی کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ جو بات ان اخباروں کے صفحات سے غائب ہے وہ یہ ہے کہ کیسے کچھ لوگوں نے مندر مسجد کا جذباتی سوال اٹھا کر ملک کو فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں جھونکنے کا کام کیا۔ ہندی میڈیا کے کوریج کو دیکھ کر ایسا گمان ہوتا ہے کہ ملک کی جمہوری نظام پر خطرے کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔

کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ عدالت اور ہندی میڈیا کو بابری مسجد کو مسمار کرنے والے مجرموں کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں جبکہ بھگوا لیڈر خود پریس کے سامنے آ کر یہ قبول کر رہے ہیں کہ انہوں نے بابری مسجد توڑی اور اس عمل پر انہیں 'فخر' ہے۔ پچھلے سال بی جے پی کی رکن پارلیمنٹ پرگیا سنگھ ٹھاکر نے خود قبول کیا ہے کہ وہ خود ۶ دسمبر کے روز ایودھیا میں موجود تھی اور مسجد کے انہدام میں حصہ لیا تھا۔ گزشتہ سال ہوئے عام انتخابات کے دوران ۱۳ ایک انٹرویو دیتے ہوئے ٹھاکر نے کہا تھا کہ "ہم رام مندر بنائیں گے اور عالیشان بنائیں گے ہم مسجد توڑنے گئے تھے میں نے خود چڑھ کر اسے توڑا تھا اور اس پر مجھے زبردست فخر ہے۔۔۔ مجھے ایشور نے طاقت دی تھی کہ ہمیں ملک کی لعنت مٹانا ہے"۔ اس بیان کے بعد الیکشن کمیشن نے انہیں انتخابی ضابطہ اخلاق کی خلاف ورزی کے لیے نوٹس بھیجا مگر اس کے بعد بھی وہ خاموش نہیں رہیں اور کہا "میں اپنے بیان سے پیچھے نہیں ہٹ رہی ہوں۔ ڈھانچہ کو توڑا گیا جہاں ایک عالیشان مندر تعمیر کی جائے گی۔ کوئی مجھے رام مندر بنانے سے روک نہیں سکتا"

تضاد دیکھیے کہ سی اے اے کے خلاف پُرامن طریقے سے احتجاج کرنے والے جہد کاروں کے خلاف ثبوت اکٹھا کرنے میں سیکوریٹی ایجنسی کو تھوڑا بھی وقت نہیں لگتا۔ حکومت وقت کی پالیسی پر تنقید کرنے والے سیکڑوں سماجی اور سیاسی کارکنانوں کو ملک مخالف اور دہشت گردی سے متعلق دفعات میں ملزم بنایا جاتا ہے اور بہت سے لوگوں کو جیل میں بھی ڈال دیا جاتا ہے۔ حکومت پر تنقید کو ملک مخالف اور دہشت گردی سے جوڑنے میں پولیس اور دیگر جانچ ایجینسیاں کافی سرگرم ہیں۔ اگر کوئی مسلمان نوجوان گرفتار کر لیا جاتا ہے تو کچھ ہی گھنٹوں میں پولیس اس کے خلاف تمام ثبوت جمع کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ مگر ۲۸ سال پرانے بابری مسجد انہدام کیس میں سی بی آئی پختہ ثبوت اکٹھا نہیں کر پائی۔ جس بابری مسجد کی شہادت پوری دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہوئی اس کارروائی کا ثبوت ملک کی 'ممتاز' جانچ ایجنسی کو ۲۸ سال کی محنت کے باوجود نہیں ملا۔ کیا سی بی آئی عدالت پرگیا سنگھ ٹھاکر کا بیان بابری مسجد کیس میں ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کر سکتی تھی؟

سی بی آئی عدالت کے ذریعے بری کیے جانے والے ملزمین میں جے بھگوان گویل بھی شامل ہیں۔ ۶۲ سالہ گویل پہلے شیو سینا میں تھے مگر بعد میں وہ بی جے پی میں چلے گیے۔ عدالت کے فیصلے کے فوراً بعد، گویل نے نیوز چینل سے بات کرتے ہوئے کہا کہ ان کی کوشش ہمیشہ سے تھی کہ بابری مسجد کو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو منہدم کر دیا جائے۔ گویل کے مطابق مسجد توڑنے کی پہلی کوشش ۱۹۹۰ میں کی گئی تھی مگر اسے اس وقت کے اتر پردیش کے وزیر علیٰ ملایم سنگھ نے ناکام کر دیا تھا۔ گویل نے مزید کہا کہ عزم مصمم کے ساتھ انہوں نے آخر کار ۱۹۹۲ میں کامیابی پالی۔ اتنا ہی نہیں گویل نے یہ بھی کہا کہ آنے والے دنوں میں کاشی میں واقع مسجد توڑی جائے گی اور متھرا میں شاہی عید گاہ کو بھی مسمار کیا جائے گا۔ ونے کٹیار نے بھی جن کو ۳۲ ملزموں کے ساتھ بابری مسجد کیس میں بری کیا گیا ہے، کہا ہے کہ ہندو سنتوں کے ساتھ مشورہ کر کے متھرا میں بھی رام مندر کے طرز پر ایک تحریک چھیڑی جائے گی۔ ملک کے عدالتی نظام کے لیے اس سے بڑی شرمناک بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ملزم خود پریس کے سامنے آ کر بڑے فخر کے ساتھ یہ کہ رہا ہے کہ مسجد اسی نے ڈھائی ہے اور ایسا قدم آگے بھی اٹھایا جائے گا۔ مگر کورٹ کو نہیں معلوم کہ مسجد کے انہدام کے مجرم کون ہیں۔

اگر مندر تحریک کی مدد سے ہندتوا طاقتوں نے لوگوں کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا ہوتا تو بھگوا سیاسی جماعت شاید دلی کے اقتدار تک نہیں پہنچ پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ بھگوا طاقتیں مندر مسجد کے مسئلے کو حل کرنے سے زیادہ سیاست کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا بابری مسجد کا تجربہ اب بنارس اور متھرا میں دہرایا جا سکتا ہے۔

جسٹس منموہن سنگھ لبراہن نے جن کی قیادت میں سال ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کیس کی تفتیش کے لیے ایک جانچ ٹیم تشکیل دی گئی تھی، صاف طور پر کہا تھا کہ بابری مسجد انہدام ایک منصوبہ بند کارروائی تھی۔ "میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ (بابری مسجد انہدام) ایک شہری سازش تھی۔ میں اس بات پر اب بھی یقین کرتا ہوں۔ میرے سامنے جو شواہد پیش کیے گیے اس سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ بابری مسجد کا انہدام باریک طریقے سے کی گئی منصوبہ بندی تھی۔ مجھے یاد ہے اوما بھارتی نے صاف طور پر اس کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ مسجد کا انہدام غیبی طاقتوں نے نہیں کیا تھا، بلکہ اسے انسانوں نے انجام دیا تھا (انڈین ایکسپریس، یکم اکتوبر، ۲۰۲۰)۔ غور طلب ہے کہ لبراہن کمیشن کی تشکیل بابری مسجد انہدام کیس کی جانچ کرنے کے لیے سال ۱۹۹۲ میں کی گئی تھی ۲۷ سال کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ پچھلے سال جمع کی تھی جس میں اس نے سینئر آر ایس ایس اور بے جے پی لیڈروں کو ملوث بتایا تھا۔ اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی اور تب کی کلیان سنگھ کی قیادت والی اتر پردیش کی بی جے پی حکومت کے رول کے بارے میں لبراہن کمیشن نے کہا کہ "انہوں نے فعال اور غیر فعال دونوں طریقوں سے انہدام کی حمایت کی تھی۔ لبراہن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں یہ بھی کہا تھا کہ کارسیوکوں کا ہجوم اچانک سے جمع نہیں ہو گیا تھا اور نہ رضا کارانہ طور پر لوگ جمع ہو گئے تھے اس کے پیچھے منصوبہ بندی کی گئی تھی۔ لبراہن کمیشن کی رپورٹ میں ۶۰ افراد کو نامزد کیا گیا تھا جن میں اڈوانی، جوشی، بھارتی کے علاوہ سابق وزیر اعظم اٹل بہاری باجپئی، آر ایس ایس اور وی ایچ پی کے رہنما اور نوکر شاہ شامل ہیں۔ کمیشن نے کہا کہ ان لوگوں نے "ملک کو فرقہ وارانہ غیر ہم آہنگی کے دہانے پر پہنچا دیا تھا" جسٹس لبراہن نے سی بی آئی عدالت کے فیصلے پر تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا لیکن یہ بات تسلیم کی کہ "اڈوانی، واجپئی سبھی میرے سامنے حاضر ہوئے۔ اوما بھارتی نے صاف طور سے اس کی ذمہ داری لی۔۔۔ اب اگر عدالت کہتی ہے کہ وہ اس کے لیے ذمہ دار نہیں ہے تو اس میں میں کیا کر سکتا ہوں" (انڈین ایکسپریس، یکم اکتوبر ۲۰۲۰)۔

جس دن بابری مسجد توڑی جا رہی تھی اس دن جائے واردات پر سینئر صحافی سیما چشتی، مارک ٹلی، پروین جین، روچرا گپتا اور سعید نقوی بھی موجود تھے۔ پچھلے سال دلی میں ایک پریس کانفرنس میں اپنی بات رکھتے ہوئے ان صحافیوں نے صاف طور پر کہا کہ مسجد گرانے کا منصوبہ پہلے ہی بن چکا تھا۔ بابری مسجد انہدام کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے ان صحافیوں نے کہا کہ جب وہ مسجد توڑ رہے کارسیوکوں کی تصویر لے رہے تھے تو ان پر حملے کیے گئے اور کچھ کے کیمرے بھی توڑ دیے گئے۔ ان صحافیوں نے یہ بھی کہا کہ جب انہوں نے موقع پر موجود اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی سے اس کے بارے میں شکایت کی تو انہوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔

بی بی سی کے لیے کام کرنے والے ممتاز مارک ٹلی نے اس سیاہ دن کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ "بڑی تعداد میں نام نہاد کارسیوک آ پہنچے اور صحافیوں پر حملہ کر دیا۔ ان کے کیمرے توڑ دیے گئے۔۔۔ اچانک میں نے دیکھا کہ بڑی تعداد میں لوگ مسجد کی طرف بڑھنے لگے، پولیس کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں کی گئی۔۔۔ جو بات خاص طور سے ذلت آمیز تھی وہ یہ کہ اس دن انتظامیہ اور حکومت پوری طرح سے گر پڑی تھی۔ در اصل اس دن کوئی حکومت وجود میں نہیں تھی"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہاں موجود مرکزی سیکورٹی فورسیز نے بھی ہجوم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ یہی نہیں مسلمانوں کے خلاف فحش نعرے بھی لگائے گئے (دی وائرے دسمبر، ۲۰۲۰)۔

۶ دسمبر کے سیاہ دن صحافی سعید نقوی بھی ایودھیا میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ جائے واردات پر مسلم اور پاکستان مخالف نعرے لگائے جا رہے تھے۔ 'اب یہ پرچم لہرائے گا پاکستان پر'، 'بم گرے گا پاکستان پر'، 'ابھی ہمیں راولپنڈی جانا ہے، ابھی ہمیں لاہور جانا ہے'۔ نقوی نے کہا کہ اس دن بھگوان رام کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔ سب کچھ پاکستان کے بارے میں تھا۔ کارسیوک ایسا محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے مغلوں کو ہرا دیا ہے جیسا کہ نریندر مودی نے ہزار سال کی غلامی کی بات کہی ہے۔ اس وقت 'ورلڈ رپورٹ' کے لیے کام کرنے والے نقوی نے بابری مسجد انہدام کے لیے کانگریس کو بھی ذمہ دار قرار دیا۔ ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے نقوی نے کہا کہ مسجد منہدم ہونے سے قبل جب وہ سابق کانگریس لیڈر اور مرکزی وزیر ارجن سنگھ سے ملے تو انہوں نے کہا تھا کہ مسجد منہدم کی جا سکتی ہے۔ ارجن سنگھ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ان کی پارٹی اس لیے کچھ نہیں کر پائی کیونکہ اس مسئلے پر پارٹی کے اندر زبردست اختلاف تھا۔ نامور فوٹو جرنلسٹ پروین جین بابری مسجد گرائے جانے کے ایک روز پہلے وی ایچ پی کے ذریعے منعقد 'ڈریس ریہرسل' کو اپنے کیمرے میں قید کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پروین جین وی ایچ پی کے ایک لیڈر کی مدد سے اندر داخل ہوئے اور وہاں جو کچھ انہوں نے دیکھا وہ ان سارے دلائل کو خارج کر دیتا ہے کہ بابری مسجد انہدام ایک غیر منصوبہ بند عمل تھا۔ جین اس دن کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "وی ایچ پی لیڈر بی ایل شرما پریم نے مجھے ریہرسل کو دیکھنے کا موقع دیا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے مجھے وی ایچ پی کا شناختی کارڈ دیا گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگوں کو مسجد گرانے کے لیے پیشہ وارانہ طریقے سے تربیت دی جا رہی تھی۔ ان کے پاس مشین اور ہتھیار بھی تھے۔ وہاں گنبد کی شکل کا ایک ڈھانچہ بھی کھڑا کیا گیا تھا اور لوگوں کو رسی کی مدد سے اور مختلف آلات تھامے ہوئے چڑھنے کی ٹریننگ بھی دی جا رہی تھی۔ بعد میں پریم نے مجھ سے کہا کہ اسی طریقے سے مسجد گرائی جائے گی۔ میڈیا میں اس وقت کسی نے بھی میری باتوں پر یقین نہیں کیا تھا۔ پروین جین نے کہا کہ اس دن ہندوتوا قوتوں نے فوٹو جرنلسٹ کو خاص کر نشانہ بنایا۔ بلڈنگ کے اوپر سے ان لوگوں نے ہمارے کیمروں کو چھین لیا۔ جب میرے اوپر حملہ کیا گیا تب میں اڈوانی کے پاس پہنچا اور ان سے مدد مانگی مگر انہوں نے مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سارے لیڈران اس وقت منہدم کی جا رہی مسجد کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ان لوگوں نے ہجوم سے کہا کہ وہ سپریم کورٹ کی ہدایت کا احترام کریں، مگر ان کے ان الفاظ کا کوئی اثر نہیں ہوا اور لوگ ہنس پڑے" (دی وائرے دسمبر، ۲۰۲۰)۔

سلسلہ صفحہ نمبر ۹

ملک کے مستقبل کا سوال ہے۔۔!

اگر عدالت انصاف کرتی تو ایودھیا میں رام مندر نہیں بنتا
چشم دید گواہوں سے ہفت روزہ دعوت کی بات چیت

افروز عالم ساحل

جس منصوبہ بند سانحہ کو ملک کے ماتھے کا کلنک کہا گیا، جس مسجد کی عمارت کی تحفظ کا وعدہ حکومت ہند نے سپریم کورٹ میں حلف نامہ دے کر کیا تھا، اسی عبادت گاہ کو دن دہاڑے سورج کی روشنی میں لاکھوں کے ہجوم کے درمیان میڈیا کے کیمروں کے سامنے ڈھا دیا گیا۔ اب جب کہ ۳۰/ستمبر کو اس معاملے میں پورے ۲۸ سالوں کے انتظار کے بعد عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا تو جج صاحب کا کہنا ہے کہ مسجد کو ملزمین میں سے کسی نے نہیں توڑا۔

انصاف کی گہرائی کا اندازہ اسی سے لگائیے کہ جن لوگوں پر اس مسجد کے انہدام کا الزام تھا، ان کے بارے میں اسپیشل سی بی آئی جج ایس کے یادو صاحب نے صاف صاف کہہ دیا کہ اڈوانی اور جوشی سمیت تمام سینئر رہنماؤں نے ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے دن ہجوم کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ جج

آچاریہ ستیندر داس

صاحب یہیں نہیں رکے بلکہ آگے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھ ڈالا کہ وشو ہندو پریشد کے مہان نیتا اشوک سنگھل اس ڈھانچے کو بچانا چاہتے تھے کیونکہ اندر رام کے بت موجود تھے۔ اگر سنگھل آج زندہ ہوتے تو اس نرالی منطق پر یقیناً خوشی سے جھوم اٹھتے۔

اس سانحہ کے بعد مسلمانوں کے یہاں یہ تاثر پایا جارہا ہے کہ کیا اس ملک میں اقلیت کے لیے عدالتوں سے فیصلے کے پیمانے یہی ہوں گے؟ اسی سوال پر ہفت روزہ دعوت نے ملک کے ان لوگوں سے بات چیت کی جو کسی نہ کسی طور سے بابری مسجد انہدام معاملے کے چشم دید گواہ رہے ہیں یا پھر اس پورے معاملے کو ۱۹۹۲ یا اس سے پہلے سے دیکھتے آرہے ہیں۔

ہفت روزہ دعوت کے ساتھ خاص بات چیت میں رام مندر کے صدر پجاری آچاریہ ستیندر داس (۸۳ سال) کہتے ہیں "عدالت جو کرتی ہے، صحیح کرتی ہے۔ عدالت نے تمام ثبوتوں اور پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہی یہ فیصلہ دیا ہے"

کیا آپ کو لگتا ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے دن جو کچھ ہوا تھا وہ اچانک ہوا تھا؟ اس سوال پر وہ کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ ۶ دسمبر کی تاریخ پہلے سے طے تھی۔ میرے سامنے منچ لگا تھا، لاؤڈ اسپیکر لگا تھا۔ منچ پر اڈوانی، جوشی سمیت تمام لیڈر موجود تھے اور تقریریں کر رہے تھے نوجوان پرجوش ہو گئے آگے جو ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

وہیں ایودھیا کے سریو کنج رام جانکی مندر کے مہنت یُگل کشور شاستری (۷۱ سال) لکھنؤ کی خصوصی عدالت کے اس فیصلے سے کافی ناراض نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "اصل مسئلہ یہ ہے کہ جب مقدمہ چل رہا ہوتا ہے تو مسلمان سوتا رہتا ہے فیصلہ آنے کے بعد ہی وہ جاگتا ہے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں تو گواہ کو ہی خرید لیا گیا" شاستری جی کا الزام ہے کہ بکنے والوں میں زیادہ تر گواہ مسلمان تھے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ "ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ملک کی عدالتوں میں جج کون لوگ ہیں۔ جب ایک ہی ذات کے لوگ جج ہوں گے تو کیا ہوگا۔ اس ملک میں مسلمان، دلت، آدیواسی اور او بی سی کو انصاف کبھی نہیں ملے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہماری عدالتیں انصاف نہیں کر رہی ہیں، اگر انصاف کرتیں تو ایودھیا میں رام مندر نہیں بنتا بلکہ وہاں پھر سے مسجد ہوتی" واضح ہو کہ یُگل کشور شاستری بھی اس مقدمے میں ایک گواہ تھے۔ بقول ان کے آج سے ۱۲ سال پہلے سی بی آئی نے سال ۲۰۰۸ میں ان کی گواہی درج کی تھی۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی گواہی میں کئی ثبوت پیش کی تھے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے دن جو کچھ ہوا، سازش کے تحت ہوا تھا۔ لیکن فیصلہ میرے گواہی کے بالکل الٹ ہے۔ بابری مسجد کی زمین سے متعلق مقدمے میں مدعی رہے اقبال انصاری اس فیصلے پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں "ہم مسلمان ہیں اور ہم نے ہمیشہ آئین، قانون اور عدالتوں کا احترام کیا ہے، اور آج بھی کریں گے۔ ہم نے اس مسئلے کو ۹ نومبر ۲۰۱۹ کو ہی ختم کر دیا تھا جو کچھ ہونا تھا اس دن ہو چکا ہے اب یہ معاملہ یہیں ختم ہو جانا چاہیئے۔ کم سے کم اس بہانے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اب دراڑ ختم ہو۔

اقبال انصاری

ہفت روزہ دعوت کے ساتھ خاص بات چیت میں فیض آباد سے تعلق رکھنے والے سینئر صحافی مدھوکر اپادھیائے کا کہنا ہے "اس فیصلے پر میں بالکل بھی حیران نہیں ہوں۔ اور اس پر کسی کو حیرانی ہونی بھی نہیں چاہیے۔ ہاں! اس کے الٹ کچھ اس معاملے میں فیصلہ آتا تو حیرانی ضرور ہوتی"

ایسا کیوں؟ اس سوال پر وہ کہتے ہیں کہ ملک میں اس وقت جس طرح کا ماحول ہے یا عدالتیں جس طرح کے فیصلے ان دنوں دے رہی ہیں، اس میں اس طرح کے فیصلوں کی ہی امید کی جاسکتی ہے۔ اس سے الگ کیا فیصلہ ہوسکتا ہے؟

ایودھیا سے نکلنے والے 'جن مورچہ' اخبار کی سینئر صحافی سومن گپتا بھی یہی باتیں دہراتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "مجھے کبھی نہیں لگا اس سے الگ کوئی فیصلہ آسکتا ہے بلکہ سچ کہوں تو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو میں نے جو کچھ بھی ایودھیا میں دیکھا تھا پولیس اور انتظامیہ پر سے یقین اسی دن ختم ہو گیا تھا۔ یہ صرف ایک فیصلے کا سوال نہیں ہے بلکہ ملک کے مستقبل کا سوال ہے۔ اور یہ واقعہ دن کی روشنی میں میں پیش آیا، پوری دنیا اس دن کے سچ سے روبرو ہے"

واضح رہے کہ ایک ایف آئی آر سومن گپتا نے بھی درج کرائی تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو ان پر بھی حملہ ہوا تھا، ان کے کیمرے اور تمام چیزیں چھین لی گئی تھیں۔ ان کی کہانی کافی زیادہ درد بھری ہے، لیکن سومن اب اس فیصلہ کے بعد ایک برا خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی ہیں۔ وہ بتاتی ہیں کہ "مجھے کئی بار بلایا گیا اور میں نے اپنی گواہی دی۔ ایک دن میں گواہی کے لیے نہیں جا پائی تو جج نے میرے خلاف وارنٹ جاری کر دیا" پھر کیا ہوا؟ اس پر وہ بتاتی ہیں کہ "اگلی سماعت میں جج سے معذرت کرتے ہوئے نہ آپانے کی وجہ بتائی تو انہوں نے وارنٹ واپس لے لیا" سومن مزید کہتی ہیں "اب یہ دیکھنا دلچسپ ہے کہ اس فیصلے کے خلاف سی بی آئی کیا کرتی ہے اور باقی لوگ کیا کریں گے۔ عدالتیں ثبوت کے بنیاد پر فیصلہ دیتی ہیں، اگر عدالت کو یہی فیصلہ کرنا تھا، تو پھر ان ثبوتوں کا کیا ہوا، جو گواہوں نے سی بی آئی کو پیش کی تھیں"

بابری مسجد انہدام مقدمے کی سماعت میں ۳۵۱ افراد نے گواہی دی تھی، جس میں پولیس افسر، سرکاری عہدیدار اور سینئر صحافی موجود تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کی گواہی کا کیا ہوا؟ کیا تمام عینی شاہدین نے جھوٹ بولا ہے؟ یہاں یہ بھی بتا دیں کہ ۲۳۰۰ صفحات کے فیصلے میں کسی بھی میڈیا یا اخبار یا ویڈیو کیسٹ کو بطور ثبوت قبول نہیں کیا گیا ہے اور نہ ہی اس پر غور کیا گیا ہے۔

ہفت روزہ دعوت نے اس سلسلے میں 'جن مورچہ' اخبار کے بانی شیتلا سنگھ سے بھی بات کرنے کی کوشش کی، لیکن ان دنوں ان کی طبیعت تھوڑی ناساز ہے، جس کی وجہ سے بات چیت نہیں ہو سکی۔ شیتلا سنگھ کی سال ۲۰۱۹ میں 'رام جنم بھومی بابری مسجد کا سچ' نامی کتاب فاروس میڈیا نے شائع کی ہے۔

شیتلا سنگھ نے اس کتاب میں متعدد ثبوت پیش کیے ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے دن سب کچھ منصوبہ بند طریقے سے ہوا تھا۔ وہ اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں، ۲۷ نومبر ۱۹۹۲ کے دن ہاتھ سے ایک خط لکھا اور اسے وزیر اعظم اور ارجن سنگھ کو ان کی رہائش گاہوں کے فیکس پر بھیج دیا اور فیکس ملنے کی تصدیق بھی کرلی۔ میں نے اس فیکس میں لکھا کہ بابری مسجد کا انہدام یقینی ہے۔ اسے منہدم کرنے کے لیے سامان، اوزار و ہتھیار نئے تعمیر شدہ شیش اوتار مندر میں رکھے گئے ہیں جہاں کارسیوکوں کا پہرا ہے۔ کارسیوکوں کے لیے ٹریننگ کا کام بھی ایکوائر شدہ خطے کے کارسیوک کیمپ میں چل رہا ہے۔ میں نے دوسرے دن بھی فون سے وزیر اعظم اور ارجن سنگھ کو فیکس ملنے کی تصدیق کرلی۔

شیتلا سنگھ

بتایا گیا کہ اسے متعلقہ لوگوں کو بھیجا جا چکا ہے۔ اس کے بعد ایودھیا میں کیا ہو رہا ہے، خاص تبدیلیوں اور وارداتوں کی اطلاع میری طرف سے انہیں دی جاتی رہی۔۔۔ لیکن وزیر اعظم نے کوئی کارروائی نہیں ہونے دی جس کے نتیجے میں انہدام کا افسوسناک سانحہ ہوا۔

ایودھیا کے غفران خان کہتے ہیں "اس فیصلے سے نقصان اس ملک کے اقلیتوں کا نہی ہوا ہے بلکہ اصل میں اس ملک کی عدلیہ اور جمہوریت کا ہوا ہے۔ آنے والے دنوں میں ملک کی اقلیتوں کے لیے عدالتوں سے آنے والے فیصلوں کے پیمانے اگر یہی رہے تو یقیناً ملک کے تمام انصاف پسند باشندوں کا عدالتوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھروسہ ختم ہو جائے گا، جو کسی بھی معنی میں اس ملک کے مستقبل کے لیے مناسب نہیں ہے"

تب بابری مسجد مسمار ہوئی تھی اور اب انصاف۔۔!

بسلسلہ صفحہ نمبر ۳

صحافی روچرا گپتا بھی اس وقت جائے واردات پر موجود تھیں۔ تب ان کے اوپر جنسی حملے ہوئے۔ "اُس وقت کے سارے نعرے زہریلے، مردانہ فخر کے جذبات سے نکل رہے تھے، جو جارحیت کی علامت تھے۔ سادھوی رتھمبرا اور اوما بھارتی مختلف اوقات میں مردوں سے یہ پوچھ رہی تھیں کہ کیا انہوں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں مسجد کے اندر جاؤں گی۔ مسجد کے اندر ہندتوا کے کارکنان بھرے پڑے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے ان کے درمیان سے نکلنے کی کوشش کی، تبھی کسی نے میری طرف دیکھتے ہوئے 'مسلمان' کہہ کر چلایا۔ موت سے میں بالکل کچھ ہی پل دور تھی۔ اسی دوران کچھ لوگ زبردستی میرے بدن کو چھونے لگے۔ انہوں نے میری چھاتی اور کمر میں انگلی گھسائی۔ وہ سب کچھ بہت ڈراؤنا تھا۔ اس دوران میں زور زور سے چیختی رہی کہ میں ہندو ہوں"۔ روچرا گپتا نے کہا کہ جس شخص کا انہوں نے ایک روز قبل انٹرویو لیا تھا اس نے ان کو بچایا اور اڈوانی تک پہنچانے میں مدد کی" جب اس پریشان حالت میں میں نے اڈوانی سے کہا کہ وہ لوگوں کو منع کریں کہ وہ صحافیوں پر حملہ نہ کریں تو اڈوانی نے کہا 'آپ کے ساتھ جو ہوا اسے بھول جاؤ دیکھو کہ کتنا تاریخی دن ہے۔۔۔ آپ کچھ میٹھا کھاؤ'۔ پھر ان کے ایک سکیوریٹی گارڈ نے میری طرف چینی بڑھائی اور اڈوانی نے اپنا دوربین مجھے تھما دیا۔ جب میں نے کہا کہ میں ابھی کچھ نہیں دیکھنا چاہتی تب انہوں نے کہا "دیکھو! مسلمان خود اپنے گھروں کو معاوضہ پانے کے لیے جلا رہے ہیں" (دی وائر، ۷ دسمبر، ۲۰۲۰)۔

بابری مسجد انہدام کے اگلے روز اخباروں نے بھی انہدام کی زبردست تنقید کی اور شک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ مثال کے طور پر ۷ دسمبر، ۱۹۹۲ کے روز 'نا قابل معافی' کے عنوان سے 'دی ہندو' نے ایک اداریہ لکھا اور کہا کہ "اتر پردیش کی بی جے پی حکومت کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اقتدار میں رہے کیونکہ اس نے بڑی بے شرمی سے اپنی آئینی ذمہ داری کو نبھانے سے کوتاہی برتی"۔

اگر ہم سیاست اور صحافت سے دور ہٹ کر بھی اس پورے معاملہ کو دیکھیں تب بھی یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ بابری مسجد انہدام اور اسی مقام پر رام مندر کی تعمیر کا ایجنڈا ایک سیاسی عمل تھا۔ بغیر منصوبہ بندی اور سازش کے اتنی بڑی عمارت نہیں گرائی جاسکتی تھی۔ بغیر حکومت اور انتظامیہ اور پولیس کی مدد سے لاکھوں لوگوں کو وہاں جمع نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس بات کی طرف کوئی اور نہیں بلکہ ایودھیا کا ایک ہندو پجاری لال داس اشارہ کرتا ہے۔ "آج تک جو پورے ہندوستان کے اندر فرقہ وارانہ دنگے پھیلائے گئے، وہ پیسے اور کرسی کے لیے پھیلائے گئے۔ میں تو رام کا پجاری ہوں، میں بالکل حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ آج تک وشو ہندو پریشد کے لوگوں نے وہاں گل پوشی بھی نہیں کی ہے۔ بھگوان کی پوجا تک نہیں کروائی۔۔ اس دوران کچھ کرایہ کے سادھو خریدے گئے اور رام مندر کی اینٹیں گھمائی گئیں اور ان اینٹوں سے انہوں نے اپنا کمرہ اور مکان بنانا شروع کیا۔ انہوں نے عوام کے جذبات کا استحصال کر کے بڑی بڑی عمارتیں بنالیں۔ انہوں نے کروڑوں روپیے اکھٹا کیے اور مختلف بینکوں میں جمع کروایا اور لاکھوں روپیے انہوں نے اپنے نجی اکاونٹ میں ڈالے۔ لوگوں کا قتل ہو جائے اس سے ان کو کوئی مطلب نہیں۔ انہیں فقط پیسہ اور کرسی چاہیے۔ یہاں جو لوگ ہندو راشٹر کی بات کرتے ہیں، رام کے نام پر کشیدگی پھیلاتے ہیں، تشدد کرتے ہیں، یہ سبھی اعلیٰ ذات کے لوگ ہیں اور سب کے سب آرام پسند ہیں، ان میں تیاگ اور عوام کی بھلائی کا جذبہ نہیں ہے۔ یہ صرف مذہبی جذبات کو ابھار کر خود کے لیے سُکھ اور سہولتیں پانا چاہتے ہیں۔ یہ عوام کی فلاح کی بات کر ہی نہیں سکتے" (حوالہ: آنند پٹوردھن کی ڈاکومنٹری 'رام کی نام سے')۔ ایک سال بعد پجاری لال داس کا قتل ہو جاتا ہے اور وی اچ پی کے ایک بڑے ناقد کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جاتا ہے۔ مگر جو بات پجاری لال داس نے سالوں پہلے کہی تھی وہ سو فی صد آج بھی صحیح ثابت ہوئی ہے۔ اگر مندر تحریک کی مدد سے ہندتوا طاقتوں نے لوگوں کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا ہوتا تو بھگوا سیاسی جماعت شاید دلی کے اقتدار تک نہیں پہنچ پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ بھگوا طاقتیں مندر مسجد کے مسئلے کو حل کرنے سے زیادہ سیاست کرنا چاہتی تھیں۔ ان کا بابری مسجد کا تجربہ اب بنارس اور متھرا میں دہرایا جاسکتا ہے۔ بھگوا طاقتوں کو یہ سب کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ حکومت کے پاس گرتی معیشت اور بے روزگاری کا کوئی حل نہیں ہے۔ کاشی اور متھرا میں مندر مسجد کا نیا جھگڑا پیدا کر کے ہندوتوا طاقتیں نہ صرف روزی روٹی کے سوالات سے عوام کا دھیان ہٹانا چاہتی ہیں، بلکہ اپنی سیاسی زمین بھی بڑھانا چاہتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہوگا کہ سیکولر طاقتیں اس کا مقابلہ کیسے کرتی ہیں؟

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔ وہ اقلیتی حقوق اور سماجی انصاف سے متعلق مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

تشدد: بھگت سنگھ اور گاندھی کے باہمی اختلافات

گاندھی جی عدم تشدد میں یقین رکھتے تھے، ان کا ماننا تھا کہ تشدد کی راہ پر چل کر حاصل کی گئی آزادی انہیں قابل قبول نہیں ہے

ابھے کمار

کیا آپ کو معلوم ہے کہ شہید اعظم بھگت سنگھ اور بابائے قوم مہاتما گاندھی کا یوم ولادت کچھ ہی دنوں میں آنے والا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ بھگت سنگھ گاندھی جی کی ولادت سے چار دن پہلے پیدا ہوئے تھے۔ حالانکہ گاندھی جی عمر میں بھگت سنگھ سے ۳۸ سال بڑے تھے مگر شہید اعظم گاندھی جی سے کافی پہلے اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ بھی بہت دُکھ کی بات ہے کہ دونوں کا قتل کیا گیا۔ جہاں بھگت سنگھ کو برطانوی حکومت نے پھانسی دے دی، وہیں گاندھی جی کو ایک فرقہ پرست نے گولی مار کر ہلاک کر ڈالا۔ حالانکہ بھگت سنگھ اور گاندھی جی دونوں ملک کو آزاد کرانے کے لیے جدو جہد کر رہے تھے، مگر دونوں کے راستے اور نظریے میں کافی فرق تھا۔

گاندھی جی عدم تشدد میں یقین رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ تشدد کی راہ پر چل کر حاصل کی گئی آزادی انہیں قابل قبول نہیں ہے۔ ۲۰ مئی ۱۹۲۶ کو 'ینگ انڈیا' میں لکھتے ہوئے، گاندھی جی نے کہا کہ اگر کسی فرد، قوم یا دنیا کو آزادی حاصل کرنی ہے تو اسے عدم تشدد کو اسی تناسب میں حاصل کرنا ہوگا۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے جو بھی صرف اور صرف عدم تشدد کے طریقۂ کار میں یقین رکھتے ہیں، ان کو چاہیے کہ اس مشکل بھرے دور میں عدم تشدد کی شمع کو جلائے رکھیں۔ سال ۱۹۲۹ میں گاندھی جی نے تب کے وائسرائے لارڈ اِروِن کی ٹرین پر دھماکہ کی کوشش کے لیے بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی بڑی تنقید کی۔ باپو نے بم کے مسلک، کے عنوان سے ۲ جنوری ۱۹۳۰ کو ایک مضمون لکھا، جس میں انہوں نے انقلابیوں کو جم کر نشانہ بنایا اور کہا کہ تشدد کا راستہ خودکشی کرنے کے مترادف ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر انقلابی ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہیں تو انہیں فرنگیوں کو ڈرانا نہیں چاہیے بلکہ ہندوستانیوں کو جا کر یہ بتانا چاہیے کہ وہ خوف کو ترک کر دیں۔ گاندھی جی کا ماننا تھا کہ جب انقلابی تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو اس کو دبانے کے لیے برطانوی حکومت اسلحہ پر اور بھی زیادہ خرچ کرتی ہے اور اس طرح عوام سرکاری عتاب کا مزید شکار بنتے ہیں۔ انہوں نے عدم تشدد کی کامیابی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جیسے ہی کانگریس نے اس نظریہ کو پارٹی پروگرام میں اپنایا ویسے ہی وہ ایک عوامی جماعت بن گئی۔ گاندھی جی نے کہا کہ عدم تشدد کے طریقۂ کار کو اپنائے جانے کے بعد عوام بھی اپنے اندر اعتماد محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ اگر چورا چوری میں تشدد نہیں ہوا ہوتا تو ملک کو ایک سال کے اندر ہی آزادی مل گئی ہوتی۔ اپنی بات کو مضبوط کرنے کے لیے گاندھی جی نے انسانی نفسیات کا بھی سہارا لیا اور کہا کہ فطری طور پر انسان عدم تشدد میں یقین رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو انسانی ذات کب کی آپس میں کٹ مر کر ختم ہو گئی ہوتی۔ آخر میں گاندھی جی نے عوام سے یہ اپیل کی کہ وہ انقلابیوں کی حمایت نہ کریں۔

بھگت سنگھ کے ساتھیوں نے گاندھی جی کا جواب دینے کے لیے ایک مضمون قلم بند کیا۔ بم کا فلسفہ، کے عنوان سے یہ منظر عام پر آیا۔ اس کے مصنف بھگوتی چرن ووہرا تھے، مگر پرچہ شائع ہونے سے پہلے بھگت سنگھ اور دیگر انقلابیوں نے اس پر جم کر بات کی اور اپنی رائے بھی دی۔ آخر میں یہ پرچہ کرتار سنگھ، جو ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن کے صدر تھے، کے نام سے چھاپا گیا۔ اپنے دفاع میں انقلابیوں کا کہنا تھا کہ وہ تشدد نہیں کرتے ہیں، بلکہ عوام کے

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا ماننا تھا بغیر ٹیررازم، کے انقلاب حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹیررازم کی وجہ سے جو ظالم ہیں ان کے دلوں میں خوف بھر جاتا ہے، وہیں جو مظلوم ہیں ان کے اندر میں خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ ٹیررازم کی وجہ سے قوم کے اندر میں آزادی حاصل کرنے کی بھوک پیدا ہوتی ہے۔ انقلابیوں نے کانگریس کے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ کی قرارداد سے بھی نا اتفاقی ظاہر کی اور لارڈ اِروین کے اوپر حملے کی کوشش کی مذمت کی گئی تھی۔

حقوق کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی قربانی دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ انقلابی یوں ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کا ایک خواب بھی ہے۔ انقلابی ایک نئے معاشرہ کی تعمیر کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان کا مقصد نوآبادی حکومت کو ختم کرنا ہے، ان کا منشا انگریزوں کے جو مقامی حامی ہیں ان کو استحصال کرنے سے روکنا ہے۔ وہ سرمایہ داری اور استحصال کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی جگہ پر وہ پرولتاریت ڈکٹیٹرشپ، چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ بھارت کو مذہبی توہم پرستی سے بھی پاک ہونے کی ضرورت ہے۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا ماننا تھا بغیر ٹیررازم، کے انقلاب حاصل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹیررازم کی وجہ سے جو ظالم ہیں ان کے دلوں میں خوف بھر جاتا ہے، وہیں جو مظلوم ہیں ان کے اندر میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ ٹیررازم کی وجہ سے قوم کے اندر میں آزادی حاصل کرنے کی بھوک پیدا ہوتی ہے۔ انقلابیوں نے کانگریس کے ۲۳ دسمبر ۱۹۲۹ کی قرارداد سے بھی نا اتفاقی ظاہر کی اور لارڈ اِروین کے اوپر حملے کی کوشش کی مذمت کی گئی تھی۔ انہوں نے گاندھی جی کو بھی ہدف تنقید بناتے ہوئے کہا کہ اس قرارداد کے پیچھے گاندھی تھے، جس کو انہوں نے خود ڈرافٹ کیا تھا اور اسے پاس بھی کروایا تھا۔ انقلابیوں نے گاندھی جی کے موقف کی جم کر تنقید کی اور کہا کہ برطانوی حکومت کے خلاف جنگ چھیڑنے کے بجائے وہ انقلابیوں کے خلاف ہی جنگ لڑ رہے ہیں۔ گاندھی جی کے عدم تشدد کے عقیدہ پر سوال اٹھاتے ہوئے انقلابیوں نے یہ سوال پوچھا کہ کتنے بھارت کے دشمنوں کو گاندھی جی نے عدم تشدد کا راستہ اختیار کر کے دوست بنایا ہے۔ انقلابیوں نے جہاں ایک طرف لارڈ اردین کے خلاف حملہ کی کوشش کو صحیح ٹھہرایا اور کہا کہ اچھا ہوتا اگر وہ اس میں ہلاک ہو جاتا، وہیں انہوں نے گاندھی جی کی لارڈ اردین کے دروازہ پر دستک دینے کو جم کر کوسا۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آزادی کی لڑائی میں کوئی ایک راستہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی ایک لیڈر یا پارٹی کی وجہ سے ملک کو آزادی ملی۔ جہاں تک بات تشدد اور عدم تشدد کی ہے تو اس کو بھی کسی ایک شخص کے ساتھ منسوب کرنا بالکل غلط ہے۔ مثال کے طور پر کچھ مؤرخین نے گاندھی جی کے عدم تشدد کے قول اور فعل میں بھی تضاد پایا ہے اور کہا ہے کہ انہوں نے اس کا احترام ہر وقت نہیں کیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۲ میں جب گاندھی جی نے بھارت چھوڑو تحریک کا نعرہ دیا تو ملک بھر میں انگریزی سرکار کے خلاف جم کر مظاہرے ہوئے۔ بہت سی جگہوں اور آفس کو مجاہد آزادی نے گھیرا اور سرکاری املاک کو بھی نقصان پہنچایا۔ مگر ان پر تشدد کاروائیوں کی گاندھی جی نے مذمت نہیں کی اور کہا کہ عوام کا ردعمل برطانوی ریاست کے تشدد کے مقابلہ میں کافی کم تھا۔ دوسری طرف جب ہندوستانی فوج کشمیر جا رہی تھی وہاں طاقت کا استعمال کر رہی تھی تب گاندھی جی باحیات تھے اور کچھ نہیں بولے۔

دوسری طرف یہ کہنا کہ بھگت سنگھ صرف تشدد میں یقین رکھتے تھے یہ بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ میں ملحد کیوں ہوں کے عنوان سے لکھے گئے پرچہ میں بھگت سنگھ نے صاف الفاظ میں کہا کہ تشدد کے طریقۂ کار کے اپنے حدود ہیں اور انہوں نے سابقہ انقلابیوں سے خود کو دور کیا جو یہ مانتے تھے کہ تشدد کے راستہ سے ہی صرف بدلاؤ ممکن ہے۔ اس کے برعکس، بھگت سنگھ نے صاف طور سے کہا کہ جہاں تشدد کیے بغیر کام نہیں چلتا وہاں تو اسے اختیار کیا جاسکتا ہے، مگر باقی سارے معاملوں میں عدم تشدد کی راہ پر چل کر ہی عوامی تحریک چھیڑی جاسکتی ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

بھگت سنگھ کی انقلابی وراثت

ظلم، زیادتی، استحصال اور عدم مساوات کے خلاف لڑنے میں بھگت سنگھ کے افکار و نظریات کل کی طرح آج بھی اتنے ہی کارگر ہیں

ابھے کمار

۲۳؍مارچ ۱۹۳۱ کے دن ۲۳؍سال کی عمر میں بھگت سنگھ کو پھانسی دے دی گئی۔ برطانوی حکومت نے جہاں ان کو جان سے مارا، وہیں آزاد ملک کے موقع پرست ارباب اقتدار نے ان کی انقلابی وراثت پر پردہ ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بھگت سنگھ کے انقلابی نظریات لوگوں تک پہنچے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ ظالم اور طاقتور چمن کو اجاڑ سکتا ہے، مگر بہار کو آنے سے نہیں روک سکتا۔ آج بھگت سنگھ لاکھوں کروڑوں لوگوں کے دلوں کی دھڑکن ہیں۔ ان کی زندگی اور ان کے خیالات کسانوں، مزدوروں اور نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ جب بھگت سنگھ کے انقلابی نظریات دنیا میں نہ دبے اور اس کی مقبولیت اور کہیں بڑھنے لگی تو حکمرانوں نے بھی اپنا رخ بدلا اور ان کی تصویر کے سامنے بناوٹی دو پھول چڑھانا شروع کر دیا اور بھگت سنگھ کو ایک مقدس دیوتا بنا دیا۔ حالانکہ ان سب کے پیچھے چال یہ تھی کہ بھگت سنگھ کے نظریاتی روح کو ختم کیا جائے۔ کچھ ایسا ہی آج کل بھی ہو رہا ہے۔ برسر اقتدار جماعت سے جڑے ہوئے بہت سارے لوگوں نے کل بھگت سنگھ کے نام کی خوب دہائی دی اور ان کی تعریف میں ساری حدوں کو پار کر لیا۔ مگر جو بات سب سے اہم ہے کہ ان کے بتائے گئے راستے پر چلا جائے، ان سے وہ کوسوں دور بنے رہے۔

سال ۱۹۰۷ میں بھگت سنگھ لائل پور کے بنگا گاؤں (پاکستان) میں پیدا ہوئے تھے، مگر ان کے 'انقلاب زندہ باد' کے نعرے آج بھی گونجتے ہیں۔ ظلم، زیادتی، استحصال اور عدم مساوات کے خلاف لڑنے میں بھگت سنگھ کے افکار و نظریات کل کی طرح آج بھی اتنے ہی کارگر ہیں کیوں کہ انسانوں کے ذریعے، انسانی استحصال کا یہ نظام ابھی تک ختم بھی تو نہیں ہوا ہے۔ بھگت سنگھ نے بہت کم عمر کے دوران خوب پڑھائی کی۔ مگر ان کی تحریر ذات پات اور چھوت چھات کے اوپر بہت ہی انقلابی ہے۔ 'کرتی جریدہ' میں ایک مضمون شائع کرتے ہوئے انہوں نے ذات پات کے نظام اور چھوت چھات پر زبردست غصہ اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ وہ بے چین تھے کہ ہندوستان کا ہر پانچواں آدمی، جو دلت ہے، غیر انسانی سلوک کا شکار ہے۔ اگر دلتوں نے کنویں سے پانی نکال لیا تو کنواں بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ ان کے بدن کو کوئی چھو بھی لے تو اس کا دھرم ناپاک ہو جاتا ہے اور یہاں تک کہ دیوتا بھی ان کے مندر میں داخل ہونے پر ناراض ہو جاتے ہیں۔

بھگت سنگھ اس بات کو سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ کس طرح چھوت روایت بیسویں صدی میں بھی دیکھنے کو مل سکتی ہے اور لوگوں کا یقین اس طرح کے ظالمانہ نظام میں کیسے ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد چھوا چھوت کو قانوناً کالعدم کر دیا گیا مگر آج بھی چھوا چھوت پر مبنی تعصب کھلے طور پر یا ڈھکے چھپے برتا جاتا ہے۔ حالیہ انڈین ہیومن ڈیولپمنٹ سروے کے مطابق، ہر چار میں سے ایک ہندوستانی چھوا چھوت میں یقین رکھتا ہے اور ملک کا کوئی دھرم، ذات، قبیلہ یا علاقہ اس سماجی برائی سے محفوظ نہیں ہے۔

ذات پات اور چھوا چھوت کی بات بھگت سنگھ کے علاوہ اس زمانے کے دوسرے بڑے سیاسی رہنماؤں اور مذہبی مصلحین نے بھی کی تھی۔ گاندھی اور مدن موہن مالویہ جیسے بڑے

اقتدار میں قابض جو لوگ بھی آج بھگت سنگھ کے نام کا سہارا لے کر لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھگت سنگھ کی باتوں کو فراموش کر چکے ہیں۔ ان کے لیے بھگت سنگھ سے پریم صرف ایک دکھاوا ہے۔ اس لیے وقت کی ضرورت ہے کہ آج بھگت سنگھ کی باتوں کو ملک کے ہر کونے میں پہنچائی جائے۔ بھگت سنگھ کو کسی بھی ایک خانہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بھگت سنگھ نے جتنی بہادری کے ساتھ برٹش سامراج سے لوہا لیا، اسی طرح انہوں نے سماج کے اندر پیوست برائیوں کے خلاف بھی بولا اور لکھا۔

کانگریسی لیڈر اچھوت مسئلے کا حل اس لیے چاہتے تھے کیونکہ یہ ان کی سیاسی مجبوری بن گئی تھی۔ جب تعداد کی بنیاد پر انگریزی حکومت نے اپنی پالیسی بنانا شروع کی تو ہر قوم کو اپنی قوم کی تعداد اور طاقت بڑھانے کی فکر ہوئی۔ اسی پس منظر میں دلتوں کو اپنی قوم میں لانے اور ان کو اپنے مذہب میں شامل کرنے کی دوڑ لگ گئی اور اس مسابقے میں کئی بار ہنگامے اور تشدد بھی رونما ہوئے۔

مگر ان سب سے دور بھگت سنگھ نے ایک سچے سماجی ناقد کے بطور قومی رہنماؤں کو انتباہ کیا کہ اگر دلتوں کے ساتھ انھوں نے اچھا سلوک نہیں کیا تو ان کو انگریزی حکومت سے سیاسی حقوق مانگنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ 'جب تم'، بھگت سنگھ نے کہا 'ایک انسان کو پینے کے لیے پانی دینے سے بھی انکار کرتے ہو، جب تم انھیں اسکول میں بھی پڑھنے نہیں دیتے ہو تو تمھیں کیا حق ہے کہ اپنے لیے مزید حقوق کا مطالبہ کرو؟' (ص:226)

جیسا کہ بھگت سنگھ کی تحریر سے ظاہر ہے کہ وہ سیاسی حقوق کی حصولیابی تک سماجی حقوق ٹھنڈے بستے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے، کانگریس کے اعلیٰ ذات کے رہنما سماجی اصلاح کے ایجنڈے کو قطعی فروغ نہیں دینا چاہتے تھے کیوں کہ اس سے ان کے مفاد پر سیدھا حملہ ہوتا تھا۔ ان کی چالاکی اس میں تھی کہ سیاسی لڑائی کے شور کو تیز کیا جائے اور قومیت کے جذبات کو بھڑکایا جائے تاکہ دلتوں اور ذات کے سوال خود بخود غائب ہو جائیں۔ مگر بھگت سنگھ ایک سچے انقلابی ہونے کے ناطے برطانوی استعماری طاقت کی تنقید کے ساتھ ساتھ سماجی تعصب، غیر مساوی نظام اور بھید بھاؤ پر مبنی ہندوستانی سماج پر ایک ساتھ چوٹ کرتے تھے۔

اچھوت مسئلے کا حل کیا تھا؟ بھگت سنگھ نے اس سوال پر کافی آگے تک سوچا۔ ان کے مطابق دلت فرقے اصل میں پرولتاریہ (Proletariat) ہیں اور انھیں ضرورت ہے کہ وہ متحد ہوں اور سیاسی اور معاشی آزادی کے لیے یلغار کریں۔ 'تم اصل میں پرولتاریہ ہو۔ متحد ہو جاؤ'، بھگت سنگھ نے کہا، 'تمہارا کچھ نقصان نہیں ہوگا، بس غلامی کی زنجیریں کٹ جائیں گی۔ اٹھو، اور موجودہ نظام کے خلاف بغاوت کھڑی کر دو۔ دھیرے دھیرے ہونے والی اصلاح سے کچھ نہیں بن سکے گا۔ سماجی تحریک سے انقلاب کر دو اور سیاسی اور معاشی انقلاب کے لیے کمر کس لو۔' (ص:229)

آزاد ہندستان میں دلتوں کے لیے نوکریوں، تعلیمی اداروں اور پارلیمنٹ اور اسمبلی میں ریزرویشن دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ایک بڑی تعداد میں دلت پہلی بار اسکول، کالج، یونیورسٹی اور سرکاری محکموں میں آئے ہیں اور سیاسی عہدوں پر قابض ہوئے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی حالت ابھی بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ انسانی حقوق کے اعداد و شمار اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ غریبی، تعصب اور چھوا چھوت جیسے مسائل سے انھیں ابھی تک نجات نہیں مل سکی ہے۔ اقتدار میں قابض جو لوگ بھی آج بھگت سنگھ کے نام کا سہارا لے کر لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ بھگت سنگھ کی باتوں کو فراموش کر چکے ہیں۔ ان کے لیے بھگت سنگھ سے پریم صرف ایک دکھاوا ہے۔ اس لیے وقت کی ضرورت ہے کہ آج بھگت سنگھ کی باتوں کو ملک کے ہر کونے میں پہنچائی جائے۔ بھگت سنگھ کو کسی بھی ایک خانہ میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بھگت سنگھ نے جتنی بہادری کے ساتھ برٹش سامراج سے لوہا لیا، اسی طرح انہوں نے سماج کے اندر پیوست برائیوں کے خلاف بھی بولا اور لکھا۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام محکوم طبقات کے لوگ بھگت سنگھ کے نظریہ کی تکمیل کرنے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر آ جائیں۔ ایسا کیے بغیر فرقہ پرست طاقتوں سے نجات نہیں مل سکتی ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

برسا منڈا اور بھارت کے آدی واسی

برسا کی پیدائش اسی دور میں ہوئی جب آدی واسی اپنے وجود کے لیے لڑ کٹ رہے تھے

آدی واسی سماج کے حقوق کے لیے لڑنے والے مجاہد برسا منڈا کا یوم پیدائش اگلے ہفتہ ہے۔ حالانکہ مورخین کے درمیان اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ برسا کب پیدا ہوئے۔ مگر ایک بڑی رائے یہ ہے کہ ان کا جنم ۱۵؍ نومبر ۱۸۷۵ء کو اُلی ہاتو میں جمعرات کو ہوا۔ یہ مقام جھارکھنڈ کے ضلع کھونٹی میں واقع ہے۔ انگریزوں کے دور میں آج کا جھارکھنڈ چھوٹا ناگپور ڈویژن کے اندر آتا تھا۔ برسا کا یوم پیدائش جھارکھنڈ ریاست کے یوم تاسیس کے طور پر بھی منایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے استحصال کے خلاف آدی واسیوں کی طویل جدوجہد، ان کے جل، جنگل اور زمین کی لڑائی اور جھارکھنڈ تحریک کے دوران برسا ایک بڑی علامت رہے ہیں۔ سرکاری زبان میں آدی واسیوں کو درج فہرست قبائل کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے شیڈولڈ ٹرائب یا ایس ٹی کہا جاتا ہے۔ ٹرائب کا معنی قبیلہ ہوتا ہے۔ مگر آدی واسی سماج ٹرائب کی جگہ آدی واسی لفظ پسند کرتا ہے۔ آخر کیوں آدی واسی سماج کے اندر سے ایک بڑا طبقہ خود کو آدی واسی، جس کے لیے انگریزی میں اِنڈِجنس لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے، کہنا زیادہ پسند کرتا ہے؟ کیوں اسے ٹرائب اِصطلاح پسند نہیں ہے؟ ان سوالوں کے جواب پانے کے لیے ہمیں برسا کے دور میں لوٹنا ہوگا۔

ابھے کمار

برسا کی پیدائش سے پہلے وسطی ہندوستان کا آدی واسی علاقہ نوآبادیاتی نظام کے ماتحت آچکا تھا۔ آدی واسیوں کی دوسری بڑی آبادی شمال مشرقی ریاستوں میں بستی ہے، وہاں بھی سامراجی حکومت نے اپنے پاؤں پسارنے شروع کر دئے تھے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے، آدی واسی بہت حد تک اپنی زندگی اپنے طریقہ سے جیتے تھے۔ ان کی معاشرتی زندگی میں دوسروں کے ذریعہ مرتب شدہ رسم و رواج کی دخل اندازی کم پائی جاتی تھی۔ ان کے اندر ذات پات کی بنیاد پر مبنی تفریق نہیں پائی جاتی تھی۔ آدی واسی سماج کے سارے ارکان کے پاس یکساں حقوق ہوتے تھے۔ ان کے اندر جو عقیدہ پایا جاتا تھا، اسے ماہر بشریات نے اینیمزم کہا، جس کا آسان لفظوں میں یہ مطلب ہوتا ہے کہ ساری قدرتی چیزوں، جیسے پیڑ، پودے، پہاڑ، اور جانور، کے اندر روح ہوتی ہے۔ آدی واسیوں کا عقیدہ ہے کہ یہ روح انسانی واقعات کو اثر انداز کرتی ہے۔

انگریزوں کی آمد کے وقت، وسطی بھارت کے آدیواسیوں کی زندگی بہت حد تک جنگل پر منحصر تھی۔ وہ جنگل میں نہ صرف شکار کرتے تھے، بلکہ پھل، پھول، جڑی بوٹی اور دیگر اشیا کو چُنتے تھے۔ اسی جنگل میں وہ جھوم کاشت کاری بھی کرتے تھے۔ جھوم کاشت کاری کے تحت آدی واسی جنگل کے ایک حصہ کا انتخاب کرتے تھے۔ پھر وہ وہاں موجود درخت کے بالائی حصوں کو کاٹ کر صاف کر دیتے تھے تاکہ سورج کی روشنی نیچے تک پہنچ سکے۔ وہ کھیتی کے دوران ہل کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ بیج کو وہ کھیتوں میں ڈال دیا کرتے تھے۔ فصل تیار ہو جانے کے بعد جھوم کاشت کار کسی نئی جگہ کی تلاش میں نکل جاتے۔ دوسرے آدی واسی مویشی بھی پالا کرتے تھے۔ کچھ آدیواسیوں نے ایک ہی جگہ پر زراعت اختیار کر لی تھی۔ ان نے نقل مکانی کو چھوڑ کر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس طرح آدیواسیوں کے اندر کچھ لوگوں کو زمین پر ملکیت کا حق مل گیا تھا۔ ان کے اندر سے سردار بھی نکلنے لگے تھے، جنہوں نے اپنی زمین پر خود کھیتی نہ کر دوسروں کو کرایہ پر دیتے تھے۔ تبھی تو جب انگریزوں نے انتظامیہ کی کمان سنبھالی تو ان کی نظروں میں گونڈ اور سنتھال، جو سکونت پزیر گروپ تھے، دوسرے آداؤں کے مقابلہ میں زیادہ مہذب تھے۔

> آج سے ۱۲۰؍ سال قبل رانچی کے جنوبی خطوں میں آدی واسیوں نے اپنے سردار برسا منڈا کی قیادت میں نوآبادکاروں کے خلاف لڑائی لڑی تھی۔ مورخوں کا ماننا ہے کہ نوآبادکاروں کے خلاف جتنی پرتشدد مزاحمت آدیواسیوں نے کی اتنی کسی اور کمیونٹی نے نہیں کی تھی۔

سچ ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے آدی واسی سماج میں سب کچھ بہتر نہیں تھا۔ ان کے اندر طاقتوار اور کمزور پائے جاتے تھے۔ کچھ حد تک ان کے اندر بھی طبقاتی نظام پنپ چکا تھا۔ آدی واسی معاشرہ دیگر علاقوں سے پوری طرح کٹا ہوا نہیں تھا۔ آدیواسی بہت ساری چیزیں باہر سے خریدتے تھے۔ اسی طرح اپنی اشیا کو باہر لے جا کر فروخت کرتے تھے۔ انگریزوں کے دور سے پہلے ہی ان کے علاقوں میں غیر آدی واسی پہنچنے لگے تھے۔ مگر انگریزی حکومت سابقہ سارے تجربات سے جدا تھی۔ نوآبادیاتی نظام سابقہ حکومتوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور تھی اور اس کے پاس تمام جدید وسائل اور ہتھیار تھے۔ نوآبادیاتی نظریہ سرمایہ دارانہ تھا۔ انگریزوں کا مقصد بھارت جیسی کالونی کے اندر سے وسائل کو لوٹنا تھا۔ ان کو عوام کے اوپر زیادہ سے زیادہ ٹیکس اور لگان تھوپنا تھا۔ انگریزوں کی یہ بھی کوشش تھی کہ نظام کو اس طرح سے بدل دیا جائے تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ ملے۔ تبھی تو برطانوی حکومت نے اچانک جنگل کو ریاست کی نجی ملکیت قرار دے دیا اور آدی واسیوں کو وہاں جانے سے روک دیا۔ اتنا ہی نہیں زمین پر ٹیکس لاد دیے گئے اور زمین کی خرید فروخت کو آسان کیا گیا۔ ان کو جنگل میں جھوم کھیتی کرنے سے منع کیا گیا۔

زمیندار، مہاجن اور ساہوکار انہیں قرض کے دام میں پھانس کر ان سے ان کی زمین ہڑپنے لگے۔ ان کو پھر چائے باغان اور کانوں میں مزدوری کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اس کے علاوہ نوآبادیاتی اہل کاروں اور ماہر بشریات نے آدی واسیوں کو غیر مہذب کہا۔ آدی واسیوں کے لیے ٹرائب یا قبیلہ لفظ کا انتخاب ان کے تئیں انگریزوں کے تعصب کی ایک مثال تھی۔

اپنی زندگی پر ہو رہے ایک کے بعد ایک حملہ اور اپنی شبیہ کے ساتھ کھلواڑ کو دیکھ کر آدی واسی سماج انگریزی حکومت اور غیر آدی واسی زمیندار ار مہاجن، جنہیں وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں دیکو یعنی بیرونی لوگ کہہ کر پکارتے تھے، کے خلاف سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ جب ملک کے مجاہد آزادی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے آدی واسیوں نے بغاوت کا پرچم اٹھایا۔ کول آدی واسیوں نے ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۱ء کے درمیان انگریزوں سے لوہا لیا۔ وہیں سال ۱۸۵۵ء میں سنتھال بغاوت رونما ہوئی۔ برسا کی پیدائش اسی دور میں ہوئی جب آدی واسی اپنے وجود کے لیے لڑ کٹ رہے تھے۔ آج سے ۱۲۰؍ سال قبل رانچی کے جنوبی خطوں میں آدی واسیوں نے اپنے سردار برسا منڈا کی قیادت میں نوآبادکاروں کے خلاف لڑائی لڑی تھی۔ مورخوں کا ماننا ہے کہ نو آبادکاروں کے خلاف جتنی پرتشدد مزاحمت آدیواسیوں نے کی اتنی کسی اور کمیونٹی نے نہیں کی تھی۔

برسا کی پیدائش ایک غریب آدی واسی منڈا کے گھر ہوئی تھی، مگر ان کے پیروکار اوراؤں اور سنتھالی آدیواسی بھی تھے۔ بچپن میں وہ بھیڑ چراتے تھے اور بانسری بجاتے تھے۔ وہ آنکھڑوں میں رقص بھی کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو یہ کہنا شروع کیا کہ ان انہیں انگریزوں اور دیکو کے استحصال کو ختم کر دوبارہ سے اپنے سنہرے دور کو قائم کرنا ہے، جن میں آدی واسیوں کی زندگی پر کوئی پابندی نہیں ہوگی اور ان کو ان کے موروثی حقوق مل جائیں گے۔ ان کی تحریک کی مقبولیت دیکھ کر انگریزوں نے انہیں فساد کرنے کے جرم میں سال ۱۸۹۵ء میں دو سال کے لیے قید کر لیا۔ سال ۱۸۹۷ء میں قید سے نکلنے کے بعد بھی انہوں نے عوام کے درمیان کام کرنا جاری رکھا۔ ان کی موت ۱۹۰۰ء میں ہو گئی۔ حالانکہ انہوں نے بہت چھوٹی عمر پائی مگر ان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی اور بعد کے دنوں میں انگریزی حکومت کو ایسے قانون بنانے پڑے جس سے آدی واسیوں کو زمین کو پہلے کی طرح ہڑپنا آسان نہیں رہا۔ تب سے لے کر آج بھی برسا آدی واسیوں اور انصاف پسند لوگوں کے لیے مشعل راہ بنے ہوئے ہیں۔ بھارت کے ۱۰۴؍ کروڑ آدی واسی، جو آبادی کے تناسب سے ۸؍ فیصد سے تھوڑا زیادہ ہیں، بھارت میں سب سے پسماندہ طبقہ ہے۔ ترقی اور ملک کی تعمیر کے نام پر ان کو ان کے ہی گھر سے اجاڑا جا رہا ہے۔ اس لیے برسا کی معنویت پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

بلڈوزر دہشت گردی اب اور نہیں

جب بلڈوزر سے کسی مظلوم کا گھر ٹوٹتا ہے، تو اس کے پیچھے اصل مقصد مظلوموں کے دلوں میں دہشت بٹھانا ہوتا ہے

ابھے کمار

ان دنوں سپریم کورٹ بلڈوزر کے ذریعے کی جارہی انہدامی کارروائیوں کے خلاف دائر عرضیوں پر سماعت کر رہا ہے۔ عرضی گزاروں کا الزام ہے کہ مسلمانوں کے مکانات اور ان کی عبادت گاہوں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ ان کے املاک کو سب سے زیادہ نقصان ان ریاستوں میں ہورہا ہے جہاں بی جے پی زیر اقتدار ہے۔ یکم اکتوبر کو ان دلائل پر غور کرتے ہوئے، جسٹس بی آر گوائی اور وی کے وی وشواناتھن کی بنچ نے سخت الفاظ میں کہا کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے، اور یہاں مذہب کی بنیاد پر کسی کے املاک کو توڑا نہیں جاسکتا۔ عدالت نے یہ بھی واضح کر دیا کہ کسی ملزم یا مجرم کے گھر کو توڑنے کی بھی ملک کا قانون اجازت نہیں دیتا۔ عرضی گزاروں کی تجاویز سننے کے بعد سپریم کورٹ نے کہا کہ وہ جلد ہی پورے ملک کے لیے رہنما اصول جاری کرے گی تاکہ کسی کے مکان کو غیر قانونی طریقے سے نہ توڑا جائے۔ عدالت نے یہ بھی واضح کیا کہ اس کے اس فیصلے سے غیر مجاز تعمیرات اور عوامی تجاوزات کو تحفظ فراہم نہیں ہوگا۔

حالانکہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا جارہا ہے، لیکن ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مانتا ہے کہ عدالت کو بلڈوزر کارروائی کے خلاف ازخود نوٹس بہت پہلے ہی لے لینا چاہیے تھا۔ ایسا اس لیے کہ مظلوموں کی نظر میں بلڈوزر دہشت اور ناانصافی کی علامت بن چکا ہے۔ دنیا کی کسی بھی جمہوریت میں کسی ملزم کے گھر کو توڑنے کی مثال نہیں ملتی۔ بی جے پی کے زیر اقتدار ریاستوں میں جس طریقے سے اقلیتوں اور دیگر محکوم طبقات کے مکانات منہدم کیے گئے، وہ اس بات پر سوال کھڑا کرتا ہے کہ کیا واقعی اس ملک میں قانون کی حکمرانی قائم ہے۔ خود ملک کا آئین اور سپریم کورٹ یہ کہتا ہے کہ شہریوں کو حکومت کی غلط پالیسیوں کے خلاف پُرامن طریقے سے احتجاج کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر سی اے اے اور این آر سی کے خلاف جن مسلمانوں نے پُرامن اور جمہوری طریقے سے احتجاج کیا، ان میں سے بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا گیا، ان پر مقدمے چلائے گئے، اور پھر ان کے گھروں کو بلڈوزر کی مدد سے زمین بوس کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گھر والوں کو سڑکوں پر سونے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ کسی بھی انسان کی بہت ساری یادیں اور جذبات اس کے گھر سے جڑے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی انسان یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا آشیانہ اس کی آنکھوں کے سامنے بکھر جائے۔ مگر جس درد کو دل برداشت نہیں کر سکتا، ویسا ہی درد اتر پردیش، آسام، گجرات، مدھیہ پردیش اور بی جے پی کی دیگر ریاستوں میں بے گناہ مسلمانوں کو دیا جارہا ہے۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بی جے پی کی حکومت والی ریاستوں میں قانون کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کو بے گھر کیا جارہا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے حقوق کے لیے مظاہرہ کرتا ہے، تو چند ہی گھنٹوں میں اس کے گھر کو بلڈوزر کی مدد سے مسمار کر دیا جاتا ہے۔ بہت سے معاملات میں نہ تو عدالت سے اجازت لی جاتی ہے اور نہ ہی ملزموں کے خلاف کوئی نوٹس جاری کیا جاتا ہے۔ اگر نوٹس دیا بھی جاتا ہے تو اپیل کرنے یا قانونی چارہ جوئی کے لیے مناسب وقت نہیں دیا جاتا۔ اکثر غیر قانونی تعمیرات اور تجاوزات کا بہانہ بنا کر مسلمانوں کے گھروں کو گرایا جاتا ہے۔ یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ جیسے ہی کوئی مسلمان کسی جرم میں ملزم قرار پاتا ہے، ویسے ہی پولیس اور انتظامیہ کو اس کے گھر کی غیر قانونی تعمیرات کے ٹھوس ثبوت فوراً مل جاتے ہیں، اور پھر اسے توڑنے کی کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔ کئی معاملات میں بلڈوزر دہشت گردی نے انسانی حقوق کی پامالی کی تمام حدیں پار کر لی ہیں۔ جب لوگوں نے اپنے ٹوٹتے گھروں کے خلاف احتجاج کیا، تو انہیں پولیس کی گالی اور مار پیٹ کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ خواتین اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔

"خود ملک کا آئین اور سپریم کورٹ یہ کہتا ہے کہ شہریوں کو حکومت کی غلط پالیسیوں کے خلاف پُرامن طریقے سے احتجاج کرنے کا حق حاصل ہے۔ مگر سی اے اے اور این آر سی کے خلاف جن مسلمانوں نے پُرامن اور جمہوری طریقے سے احتجاج کیا، ان میں سے بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا گیا، ان پر مقدمے چلائے گئے، اور پھر ان کے گھروں کو بلڈوزر کی مدد سے زمین بوس کر دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گھر والوں کو سڑکوں پر سونے کے لیے مجبور کر دیا گیا۔ کسی بھی انسان کی بہت ساری یادیں اور جذبات اس کے گھر سے جڑے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی انسان یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا آشیانہ اس کی آنکھوں کے سامنے بکھر جائے۔ مگر جس درد کو دل برداشت نہیں کر سکتا، ویسا ہی درد اتر پردیش، آسام، گجرات، مدھیہ پردیش اور بی جے پی کی دیگر ریاستوں میں بے گناہ مسلمانوں کو دیا جارہا ہے۔"

مظلوم عوام کے ساتھ کھڑے ہوئے کی بجائے، قومی میڈیا بلڈوزر دہشت گردی کی حمایت کرتا نظر آیا، اور مین اسٹریم صحافیوں نے انتہائی غیر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہدامی کارروائیوں کو بلڈوزر کے قریب جا کر سنسنی خیز انداز میں رپورٹ کیا۔ انہوں نے وہی دکھایا جو حکمراں جماعت چاہتی تھی۔ دنیا کی نامور انسانی حقوق کی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھارت میں حالیہ بلڈوزر کارروائیوں کے خلاف دو رپورٹیں شائع کی ہیں، جو کوئی بھی ان کی ویب سائٹ پر جا کر پڑھ سکتا ہے۔ یہ دستاویزات بلڈوزر دہشت گردی کے ظلم اور زیادتی کی داستان ہیں۔

بلڈوزر کی مدد سے جس طرح مسلمانوں اور دیگر مظلوم طبقات کے گھروں کو نشانہ بنایا گیا، وہ فرقہ پرست طاقتوں کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ جب بلڈوزر سے کسی مظلوم کا گھر ٹوٹتا ہے، تو اس کے پیچھے اصل مقصد مظلوموں کے دلوں میں دہشت بٹھانا ہوتا ہے۔ ہندوستان کا آئین قانون کی حکمرانی اور سب کو یکساں حقوق فراہم کرنے کی بات کرتا ہے، لیکن جب تمام قانونی طریقہ کار کو بالائے طاق رکھ کر کسی مسلمان کا گھر توڑا جاتا ہے، تو پورے مسلم طبقے کو یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ وہ اس ملک میں دوسرے درجے کے شہری بن چکے ہیں۔ گھر چاہے چند لوگوں کا ٹوٹتا ہو، لیکن خوف اور دہشت کا سایہ پورے علاقے میں پھیل جاتا ہے۔ ماہرین دہشت گردی کی تشریح کرتے وقت اسے صرف تشدد تک محدود نہیں کرتے ہیں۔ دہشت گردی کا اثر ذہنی طور پر بھی ہوتا ہے، جہاں کوئی براہ راست تشدد کا شکار نہ ہو، لیکن پھر بھی وہ اس کے منفی اثرات سے محفوظ نہیں رہ پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ پرست حکومتیں بلڈوزر کا استعمال نہ صرف اقلیتوں کے مکانوں کو گرانے کے لیے کر رہی ہیں، بلکہ بھگوا طاقتیں اپنی ریلیوں میں بھی بلڈوزر یا اس کی علامت کا استعمال کر رہی ہیں۔ معاشرے میں فرقہ پرستی کا زہر اس حد تک پھیل چکا ہے کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ، جن کے دور اقتدار میں بے شمار بے گناہ مسلمانوں کے گھر منہدم کیے گئے، کو 'بلڈوزر بابا' کے نام سے پکارا جارہا ہے۔ یوٹیوب پر موجود متعدد ویڈیوز میں یوگی کو ایک مضبوط ہندو لیڈر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جو مجرموں کو فوری سزا دینے پر یقین رکھتا ہے اور ریاست سے جرائم کا خاتمہ کرنے کے لیے دن رات کام کر رہا ہے۔ کئی ویڈیوز میں گلوکار یوگی کی بلڈوزر پالیسی کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان ویڈیوز کو دیکھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مجرموں کا تعلق کس مذہب سے جڑا ہوا ہے۔ ایسے گانے اور ویڈیوز مسلمانوں کو ملک کے لیے خطرہ بنا کر پیش کر رہے ہیں اور اکثریتی طبقے میں ان کا خوف پیدا کر رہے ہیں۔ یہ رجحانات جمہوریت کے لیے شدید خطرناک ہیں۔ امید ہے کہ سپریم کورٹ رہنما اصول بناتے ہوئے اس معاملے پر وسیع تر نقطہ نظر اپنائے گی۔ عدالت نہ صرف مظلوموں کو انصاف دلانے کا حکم جاری کرے گی بلکہ قصوروار افسران کے خلاف بھی کارروائی کرے گی تاکہ ایسی مذموم کارروائیاں دوبارہ نہ دہرائی جائیں۔■

debatingissues@gmail.com

شہری آزادی پر بڑھتے یہ حملے۔۔۔

اقتدار کے نشے میں چور یہ سرکار اکثر بھول جاتی ہے کہ سرکار کی پالیسی کی تنقید کرنا ہمارا جمہوری حق ہے

ابھے کمار

آج صبح چائے کی دکان پر جیسے ہی پہنچا، میرے ایک وکیل دوست نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ کیا میں نے آج کا دی ہندو، اخبار پڑھا ہے۔ جب میں نے نہ کہا تو وہ خود ہی بتلانے لگے کہ آج مذکورہ اخبار کے صفحہ اول پر ایک بڑی سیاہ خبر شائع ہوئی ہے۔ ان کے مطابق یہ خبر ملک کی جمہوریت کی بیمار حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ خبر ملک کے حکمرانوں کے آمرانہ رویہ کی بھی دلیل ہے۔ یہ خبر شہری آزادی، جسے انگریزی میں سول رائٹس کہتے ہیں، پر ہو رہے مسلسل حملے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ یہ خبر ان چاپلوس اور موقع پرست صحافی، مصنف اور جہد کار کی فریب کاریوں پر سے پردہ اٹھاتی ہے، جو دن رات سرکار کی تعریف کرتے رہتے ہیں۔

یہ سب سُن کر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے پوچھا کہ آخر یہ کون سی خبر ہے؟ وکیل صاحب نے بڑی تفصیل کے ساتھ بتلایا کہ خبر یہ آئی ہے کہ بھارت میں پچھلے سال، یعنی ۲۰۱۹ میں، انسداد دہشت گردی کے قانون یو اے پی اے، کے کیس میں ۲۷ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے مزید بتلایا کہ پچھلے سال ۱۹۴۸ لوگوں کو ۱۲۲۶ یو اے پی اے کے معاملوں میں ملزم بنا کر گرفتار کیا گیا ہے۔ سب سے خوفناک بات یہ ہے کہ سال ۲۰۱۵ سے یو اے پی اے کیس مسلسل درج ہو رہے ہیں اور لوگوں کی گرفتاری بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وکیل صاحب کی یہ بات سُن کر میرا یقین اور پختہ ہونے لگا کہ بھگوا جماعت جب سے اقتدار میں قابض ہوئی ہے، تب سے لوگوں میں ڈر اور خوف زیادہ بڑھا ہے اور لوگوں کی گرفتاریاں بھی زیادہ ہوئی ہیں۔ بات چیت اور مفاہمت کے بدلے، پولیس اور طاقت کا زیادہ استعمال ہوا ہے۔

وکیل صاحب نے 'دی ہندو' کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سال ۲۰۱۵ میں ۸۹۷ یو اے پی اے کے معاملے درج کیے گیے، جو سال ۲۰۱۶ میں یہ بڑھ کر ۹۲۲ ہو گئے۔ سال ۲۰۱۷ اور ۲۰۱۸ میں کیس کی تعداد بالترتیب ۱۹۰۱ اور ۱۱۸۲ تھی۔ اسی طرح سال ۲۰۱۵، ۲۰۱۶، ۲۰۱۷، اور ۲۰۱۸ میں یو اے پی اے کے تحت گرفتار شدگان کی تعداد بالترتیب ۱۱۲۸، ۹۹۹، ۱۵۵۴ اور ۱۴۲۱ ہے۔ جن ریاستوں میں سب سے زیادہ یو اے پی اے کے کیس درج کیے گیے ہیں وہ ہیں، منی پور، تمل ناڈو، جموں اور کشمیر، جھارکھنڈ اور آسام۔ جو لوگ اتر پردیش میں لا اینڈ آڈر، بہتر ہونے کا ڈھنڈھورا پیٹ رہے ہیں، وہ اپنی اصلاح کر لیں۔ یو اے پی اے کے تحت سب سے زیادہ لوگ اتر پردیش میں گرفتار ہوئے ہیں۔ ۴۹۸ لوگوں کو سال ۲۰۱۹ میں اتر پردیش سے یو اے پی اے کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔

وکیل صاحب کی پوری بات سن کر میں بڑا پریشان ہوا اور سوچنے لگا کہ کیسے یو اے پی اے جیسا کالا قانون جمہوریت میں قابل قبول ہو سکتا ہے؟ حکمراں اس طرح کے کالے قانون ریاست کی سکوریٹی کے لیے جائز بتلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے دہشت گردی کا خاتمہ ہوگا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے برسر اقتدار جماعت اس کا استعمال اپنے ناقدین کو خاموش کرانے کے لیے کرنے لگی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو یو اے پی اے کیس پولیس بات بات پر درج نہ کرتی۔ اگر آپ نے کوئی نعرہ لگا دیا، کوئی تقریر کر دی، سرکار کی کسی بھی

یاد کیجیے سال 1919 کا رولٹ ایکٹ۔ نام نہاد انارکی اور انقلابی جرائم کو ختم کرنے کے لیے رولٹ ایکٹ لایا گیا تھا، مگر اس کا استعمال مجاہد آزادی کے خلاف کیا گیا۔ اس قانون میں محض شک اور شبہ کی بنیاد پر کسی بھی ہندوستانی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس دوران ملک کی آزادی کی حمایت کرنے والے بہت سارے صحافیوں کو بھی اندر کیا گیا۔ مگر اس ظلم اور زیادتی نے ملک کی آزادی کی لڑائی کو اور تیز کر دیا اور سامراجی برطانوی حکومت کے خلاف زبردست احتجاج ہوا۔ آج رولٹ ایکٹ اپنی شکل بدل کر آزاد بھارت میں کام کر رہا ہے اور اسے استعمال کرنے والے انگریز نہیں بلکہ ہم میں سے اپنے ہیں۔

پالیسی کی تنقید کر دی، تو آپ کے خلاف یو اے پی اے لگ سکتا ہے۔ اگر اس قانون کا اصل مقصد عوام کی زندگی کی حفاظت کرنا ہوتا، تو اس قانون کی زد میں کیسے محکوم طبقات کے لوگ اور غریب عوام آ جاتی، وہیں فرقہ وارانہ تقریر اور فساد کرنے والے لوگوں پر کوئی کاروائی نہیں کی جا رہی ہے؟

اس دوران میری آنکھوں کے سامنے شرجیل امام، میران حیدر، عمر خالد اور دیگر چہرے بھی گھومنے لگے۔ ان کے خلاف بھی تو یو اے پی اے لگا ہے۔ یو اے پی اے کی زد میں مزدور، صحافی، جہد کار بھی آئیں ہیں، جو کسی ایک مخصوص مذہب میں ہی پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ اس قانون نے نوجوان سے لے کر بوڑھوں تک کو نہیں چھوڑا۔ چلنے پھرنے والوں سے لے کر چل پھر نہ سکنے والے لوگوں کو بھی دبوچ لیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسر سے لے کر طالب علم تک اس کے شکار ہیں۔ ان لوگوں کا صرف اتنا قصور تھا کہ یہ حکومت کی پالیسی کے ناقد ہیں۔ اقتدار کے نشے میں چور یہ سرکار اکثر بھول جاتی ہے کہ سرکار کی پالیسی کی تنقید کرنا ہمارا جمہوری حق ہے۔

اسی دوران مجھے ان ماہرین انسانی حقوق کی یو اے پی اے کے متعلق اعتراضات یاد آنے لگے۔ ان کا ماننا ہے کہ یو اے پی اے انصاف کی روح کے خلاف ہے۔ جب تک کوئی ملزم کا جرم ثابت نہیں ہو جاتا، تب تک اسے ہرگز بھی قصوروار نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ مگر یو اے پی اے ایسی لعنت ہے، جس میں اُلٹا ملزم پر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی ذمہ داری عائد کر دی جاتی ہے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ یو اے پی اے کے تحت پولیس کے سامنے دیے گیے بیان کو بھی ثبوت مان لیا جاتا ہے۔ اکثر یہ سنا جاتا ہے کہ پولیس اپنی تحویل میں گرفتار شدہ شخص کے ساتھ بڑا برا سلوک کرتی ہے اور اپنے مطابق ان سے بیان حاصل کر لیتی ہے۔ ہمیں یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ پولیس اکثر سیاسی دباؤ میں کام کرتی ہے، اس لیے اس کے جج کے سامنے دیے گیے بیان ہی قابل قبول ہو سکتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہ جب پولیس ٹارچر کرنے لگتی ہے تو بڑا سے بڑا انسان بھی ٹوٹ جاتا ہے اور پھر وہی کہتا ہے جو پولیس چاہتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں کہیں تو یو اے پی اے جیسے قانون کا بننا اور اس کے تحت لوگوں کو گرفتار کرنا شہری آزادی کے سراسر خلاف ہے۔ یاد رکھیے کہ شہری آزادی کے بغیر کوئی جمہوریت ٹک نہیں سکتی۔ چائے کی دوکان پر وکیل صاحب کی بات سن کر بڑا افسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے حکمراں ایک آزاد اور جمہوری ملک میں وہی سب دوہرا رہے ہیں جو کبھی استعماری طاقتیں بھارت میں کیا کرتی تھیں، یاد کیجیے سال 1919 کا رولٹ ایکٹ۔ نام نہاد انارکی اور انقلابی جرائم کو ختم کرنے کے لیے رولٹ ایکٹ لایا گیا تھا، مگر اس کا استعمال مجاہد آزادی کے خلاف کیا گیا۔ اس قانون میں محض شک اور شبہ کی بنیاد پر کسی بھی ہندوستانی کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اس دوران ملک کی آزادی کی حمایت کرنے والے بہت سارے صحافیوں کو بھی اندر کیا گیا۔ مگر اس ظلم اور زیادتی نے ملک کی آزادی کی لڑائی کو اور تیز کر دیا اور سامراجی برطانوی حکومت کے خلاف زبردست احتجاج ہوا۔ آج رولٹ ایکٹ اپنی شکل بدل کر آزاد بھارت میں کام کر رہا ہے اور اسے استعمال کرنے والے انگریز نہیں بلکہ ہم میں سے اپنے ہیں۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

یہ نفرت کہیں ملک کو جلا نہ دے

غربت زمینی حقیقت ہے، مگر ہندو بنام مسلمان کو اصلی لڑائی بنا کر پیش کیا جارہا ہے

ابھے کمار

ان دنوں ملک کے مختلف حصوں سے بڑی ہی خوفناک خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ جہاں قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے مسلمانوں کے گھروں پر بلڈوزر چلا کر مسمار کیا جا رہا ہے، وہیں مذہب کی آڑ میں دائیں بازو کے عناصر فرقہ وارانہ تشدد کو انجام دے رہے ہیں۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلح شرپسندوں کے جلوس مسلم علاقوں سے نکالے جارہے ہیں۔ بعض اوقات مسلمانوں کے مذہبی مقامات پر بھی حملہ کیا گیا ہے اور وہاں زبردستی بھگوا پرچم لہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ فرقہ پرستوں کی یہ غنڈہ گردی ملک کی راجدھانی دہلی سمیت مختلف علاقوں میں دیکھی گئی ہے، مگر ابھی تک اسے روکنے اور شرپسندوں کو پکڑنے کی کوئی موثر کوشش نہیں ہوئی ہے۔ پولیس اور انتظامیہ کی نا اہلی اور ارباب اقتدار کی خاموشی کے بیچ، حزب اختلاف نے اس ایشو پر ایک مشترکہ بیان جاری کیا ہے۔ اپوزیشن کی بات درست ہے کہ ان شرپسندوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ بات بات پر ٹیوٹ کرنے والے وزیر اعظم نریندر مودی ابھی تک ان حملوں کے حوالے سے خاموش ہیں۔ الیکشن کے دوران سب کا ساتھ اور سب کا وِکاس کا نعرہ تو وہ خوب دیتے ہیں، مگر جب اس پر عمل کرنے کا موقع آتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ ملک کے اندر فرقہ پرست عناصر بے لگام ہو چکے ہیں۔ ان کو نہ تو پولیس کا ڈر ہے اور نہ ہی ان کے دلوں میں قانوں کا کوئی احترام ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب سرکردہ قیادت کی سرپرستی انہیں حاصل ہے تو نیچے بیٹھے سپاہی اور عملہ کے لوگ ان کا کچھ بگاڑ نہیں پائیں گے؟ بے حد افسوس کی بات ہے کہ ارباب اقتدار نے ان خطرات کو نہ صرف نظر انداز کیا ہے، بلکہ الٹے یہ بھی افواہ پھیلائی ہے کہ ایسی بات کہنے والے ملک کے دشمن ہیں جو سرکار کو جان بوجھ کر بدنام کر رہے ہیں۔ جب سُلگتی ہوئی آگ کو بجھانے کے بجائے آگ کے وجود سے ہی انکار کیا جائے، تو سمجھ لیجیے کہ ملک کو تباہ ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا ہے۔ ہزاروں سالوں سے ملک میں ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہتے آئے ہیں، مگر جب سے ہندو مہاسبھا، آر ایس ایس اور بی جے پی وجود میں آئی، تب سے ہندوؤں کے لیے مسلمان خطرہ بن گئے! کوئی یہ سوال بھگوا لیڈروں سے پوچھے کہ جب ۱۰۰ سال پہلے زعفرانی تنظیم نہیں تھی، تب ہندوؤں کی حفاظت کون کر رہا تھا؟ جس ملک میں ۸۰ فیصد ہندو ہیں اس ملک میں ۱۴ فیصد مسلمان کیسے خطرہ بن سکتے ہیں؟

سچ پوچھیے تو ملک کے حالات کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہو رہی ہے۔ بھگوا طاقتیں خود کو ملک اور ہندو سماج کا سب سے بڑا محافظ کہتے نہیں تھک رہی ہیں۔ مگر جتنا انہوں نے دیش اور عوام کو نقصان پہنچایا ہے، شاید کسی اور نے۔ ان کے راج میں پریشان صرف مسلمان ہی نہیں ہیں، بلکہ زیادہ تر لوگ، جو غریب اور محکوم ہیں، تڑپ رہے ہیں۔ عوام کے مسائل کو دور کرنے کے بجائے، ارباب اقتدار نے نفرت پھیلانے والوں کی ایک فوج تیار کر لی ہے۔ جنتا کے دماغ میں زہر گھولنے کے لیے انہوں نے سوشل میڈیا اور ٹی وی چینل اور بڑے اخبار کو خرید لیا ہے۔ فلاحی کاموں کا پیسہ اشتہار پر خرچ ہو رہا ہے۔ سرکار اور سرمایہ داروں کا پیسہ کھانے والا میڈیا دن رات ہندو بنام مسلمان پر بحث کرتا ہے۔ پاکستان میں اگر کسی کو سردی بھی لگ جائے تو مین اسٹریم میڈیا اسے بڑی خبر بنا کر پیش کرتا ہے، جبکہ بھارت میں مہنگائی، بے روزگاری اور فاقہ کشی پر بات کرنے والا ان کو اینٹی نیشنل دکھتا ہے۔ آج ملک کے اندر ماحول خراب کرنے والے فسادی اور صحافی پیش پیش ہیں۔ خاص کر ٹی وی چینل کے اینکرس دن رات زہر اُگل رہے ہیں۔ ملک میں پریس کونسل نام کا ادارہ مرا پڑا ہے اور عدلیہ سست پڑی ہے۔ بغیر فیکٹ کے ذمہ دار شخص بھی کچھ بھی کہہ رہا ہے اور اس سے ذمہ داری کے فرائض کے بارے میں کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔

”

یہ سچ ہے کہ ملک کے اندر فرقہ پرست عناصر بے لگام ہو چکے ہیں۔ ان کو نہ تو پولیس کا ڈر ہے اور نہ ہی ان کے دلوں میں قانوں کا کوئی احترام ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب سرکردہ قیادت کی سرپرستی انہیں حاصل ہے تو نیچے بیٹھے سپاہی اور عملہ کے لوگ ان کا کچھ بگاڑ نہیں پائیں گے؟ بے حد افسوس کی بات ہے کہ ارباب اقتدار نے ان خطرات کو نہ صرف نظر انداز کیا ہے، بلکہ الٹے یہ بھی افواہ پھیلائی ہے کہ ایسی بات کہنے والے ملک کے دشمن ہیں جو سرکار کو جان بوجھ کر بدنام کر رہے ہیں۔

سب سے زیادہ پریشانی اس بات سے ہے کہ ہندو سماج کے اندر بہت ساری افواہیں پھیلائی جا رہی ہے۔ ان دنوں مجھ سے میرے بہار کے ایک رشتہ دار نے پوچھا کہ آخر جے این یو میں ہندوؤں کو پوجا کرنے سے کیوں روکا جا رہا ہے؟ جواب دیتے ہوئے میں نے کہا کہ جے این یو میں کسی کو کبھی بھی پوجا کرنے سے نہیں روکا گیا ہے۔ میں نے جے این یو میں نو سال گزارے ہیں اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ کیمپس کے اندر سرسوتی، دُرگا اور کالی پوجا سالوں سے ہوتی ہے۔ مگر پہلے کبھی کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا۔ کچھ لوگ جان بوجھ کر دھرم کے نام پر ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں اور نفرت کی آگ میں تیل ڈال رہے ہیں۔ انہیں لوگوں نے جان بوجھ کر گوشت کا تنازع کھڑا کیا اور مار پیٹ بھی کی۔ مگر میری بات کو بیچ سے کاٹتے ہوئے انہوں نے کہا کہ جے این یو کے طلبہ کو جے شری رام سے بہت دقت ہے مگر انہیں اللہ اکبر کا نعرہ دینے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی! یہ بات سُن کر میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ کئی گھنٹوں تک میں سوچتا رہا کہ ملک کہاں جا رہا ہے؟ جے این یو کے بارے میں کیا کیا افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں؟ جے این یو، لیفٹ، کانگریس کو مسلمان سے جوڑ کر بدنام کیا جا رہا ہے۔ حال کے دنوں میں پروپیگنڈہ پر مبنی فلم 'کشمیر فائلز' میں بھی جے این یو، اپوزیشن اور مسلمان کو نشانہ بنایا گیا ہے۔

۲۰۲۲ کے عام انتخابات اور آئندہ اسمبلی انتخابات کے مدنظر بھگوا طاقتیں پوری کوشش کر رہی ہیں کہ نفرت کی یہ آگ سلگتی رہے۔ وہ دن رات مسلمانوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں تاکہ وہ کچھ کریں اور پھر ان کو مزید سختی کرنے کے لیے موقع مل جائے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تک زبردست صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ جس طرح کھان پان، حجاب، اذان کو لے کر ہر روز واویلا مچایا جا رہا ہے وہ سب ملک کی صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ آر ایس ایس اور بی جے پی کو لگتا ہے کہ ان کی حکمت عملی ہمیشہ کامیاب ہوتی رہے گی۔ اکثریتی طبقہ کا ووٹ لینے کے لیے اقلیتوں کو کھلنائک بنا کر پیش کرنے میں، بی جے پی ابھی تک کامیاب رہی ہے، مگر وہ یہ بھول جا رہی ہے کہ ان کی سیاسی جیت نے بھارت کا بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ صرف مسلمان ہی نہیں، آج دلت بھی پریشان ہیں۔ آدی واسی کے جل، جنگل اور زمین کو چھینا جا رہا ہے۔ پسماندہ طبقات کو دو وقت کی روٹی کے لیے دن رات کام کرنا پڑ رہا ہے۔ مزدور کی مزدوری کم ہو رہی ہے، جبکہ ان کے کام بڑھ رہے ہیں۔ کسان کی حالت اتنی خراب ہے کہ جتنا پیسہ وہ زراعت میں خرچ کرتے ہیں، اتنا بھی کئی دفعہ وہ نکال نہیں پاتے ہیں۔ سچ ہے کہ اعلیٰ ذات کے لوگ اداروں پر قابض ہیں، مگر بڑی سچائی یہ ہے کہ اعلیٰ ذات کی ایک بڑی آبادی غربت کے دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔ کچھ ہی دن پہلے جب میں گاؤں سے دہلی لوٹ رہا تھا تو میں نے اپنی ایک بوڑھی چچی کو سلام کیا، تو دعا دینے کے بعد انہوں نے مجھ سے سر میں لگانے والا ایک بوتل ٹھنڈا تیل خریدنے کو کہا۔ چچی ذات کی سیڑی پر سب سے اوپر بیٹھی ہوئی ہیں، پھر بھی تیل خریدنے کے پیسے نہیں ہیں۔ گاؤں کے نوجوان تعلیم پانے کے لیے ہر مشکلوں سے گزر رہے ہیں۔ غربت زمینی حقیقت ہے، مگر ہندو بنام مسلمان کو اصلی لڑائی بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

سچ یہ ہے کہ بھگوا اشتعال انگیزی کا نشانہ مسلمان ہیں۔ مگر مسلمان یہ نہ سمجھے کہ غیر مسلموں کی حالت اچھی ہے۔ زیادہ تر لوگ سرکار کی پالیسی سے پریشان ہیں۔ پیٹرول اور ڈیزل کی قیمت بڑھنے سے کرایہ سے لے کر ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔ معیشت بیمار ہے، مگر اس کا صحیح علاج کرنے کے بجائے، بی جے پی حکومت ہندو بنام مسلمان کا کھیل کھیل کر توجہ ہٹا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہو رہے حملوں کے خلاف غیر مسلمان آگے آئیں۔ مسلمان کو بھی یہ سمجھنا ہوگا کہ ان کے حالات دیگر محکوم طبقات کے حالات سے جدا نہیں ہیں۔ اگر یہ بات ہم سمجھ لیں تو بھگوا فرقہ پرستوں کی ایک نہیں چلے گی۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

فرقہ پرستی، تاریخ نگاری اور مسلمان

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تاریخ کو مسخ کرنا انسانی جسم کو زخمی کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے

ابھے کمار

بی جے پی کو بخوبی معلوم ہے کہ اگر لمبے وقت تک راج کرنا ہے، تو اسے عوام کے دل و دماغ کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی توجہ انتخابات جیتنے اور جتنا مال لیڈروں، افسروں اور صحافیوں کی خریدنے پر خرچ کرتی ہے، اتنی ہی توانائی وہ اپنے پروپیگنڈے کو پھیلانے میں بھی صرف کرتی ہے۔ دراصل اس کی ایک بڑی ترجیح لوگوں کی ذہنیت کو اپنے رنگ میں رنگنا ہے۔ یہ کام اس کے ادارے بخوبی کررہے ہیں۔ اس کی طاقت اس کی تنظیمیں ہیں، جو زندگی کے ہر شعبہ میں سرگرم عمل ہیں۔ اس کا آئی ٹی سیل دن رات کام کررہا ہے۔ پورا میڈیا اس کی جیب میں ہے۔ طویل مدت سے اور بڑی ہی پابندی کے ساتھ، اس کے ترجمان اخبارات اور جرائد مذہبی تعصب کو بڑھاوا دے رہے ہیں اور ہندوؤں کے سامنے مسلمان، عیسائی اور سیکولر طاقتوں کو دشمن بنا کر پیش کررہے ہیں۔ وہیں دوسری طرف سیکولر جماعت اپنی آئیڈیالوجی کو لے کر تذبذب میں ہے۔ ایک طرف اس کا انتخابی منشور سیکولر ہے، وہیں دوسری طرف بعض اوقات وہ فرقہ پرستی کا بھی سہارا لیتی ہے۔ سیکولر سیاسی جماعت کی غیر سنجیدگی دیکھیے کہ عوامی مسائل کی جگہ پارٹی کے ٹاپ لیڈر کی تصاویر اور قصیدے اس کے اخبارات پر چھائے ہوئے رہتے ہیں۔

حالیہ کچھ سالوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ بھگوا طاقتیں بھارت کی تاریخ کو اپنے موقف اور اپنے ذاتی مفاد کے مطابق بری طرح سے بدل رہی ہیں۔ چونکہ وہ اقتدار پر قابض ہے، اس لیے وہ جو چاہ رہی ہیں وہ پورا ہورہا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ نگاری کے اصول کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ یہ سمجھنے کو تیار نہیں کہ تاریخ نگاری کے اپنے اصول ہیں۔ کسی واقعہ کو تاریخی ماننے سے پہلے، ایک پیشہ ور اور ایماندار مورخ اس سے جڑے ہوئے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرتا ہے۔ وہ تمام مآخذ کو عقل اور دلیل کے ترازو پر تولتا ہے۔ تعصب اور ذاتی مفاد کے کھول سے نکل کر، وہ سائنٹفک طریقۂ کار کا استعمال کرتا ہے۔ فیصلے لینے سے پہلے، وہ تمام باتوں کو ٹھنڈے دماغ سے سوچتا ہے۔ مگر یہ بے حد افسوس کی بات ہے کہ تاریخ کی ان باریکیوں کی پرواہ نہیں کررہی ہے۔ مآخذ دیکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے سے پہلے ہی، بھگوا جماعت کو نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ تصور کیجیے کہ کوئی جج بغیر ایف آئی آر پڑھے اور وکیلوں اور گواہوں کی باتوں کو سُنے بغیر، فیصلہ دینے لگے اور کس کو بری کردے اور کس کو سزا دے دے، تو پھر معاشرہ میں کس قدر بے چینی پھیلے گی! ٹھیک اسی طرح ایک خاص سیاسی مفاد کو پورا کرنے کے لیے تاریخ کے اوراق کو بھگوا رنگ میں رنگا جارہا ہے اور ملک کو کمزور کیا جارہا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ تاریخ کو مسخ کرنا انسانی جسم کو زخمی کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ تاریخ اگر مسخ کردی گی اور عوام کے دماغ میں فرقہ وارانہ اور نفرت انگیز باتوں کو بھر دیا گیا تو سمجھ لیجیے کہ پورا معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔ بندوق کی گولی سے بھی زیادہ چوٹ فرقہ پرست مورخ کا قلم کرسکتا ہے۔ گولی صرف ایک انسان کی جان لے سکتی ہے، مگر فرقہ پرستی پورے معاشرہ اور ملک کو جلا سکتی ہے۔

فرقہ پرست جماعت کی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ یہ ملک صرف اور صرف ہندوؤں کا ہے۔ وہ یہ جھوٹ سب پر تھوپنا چاہتی ہے کہ اس ملک کی ہزاروں سالوں کی تہذیب اور ثقافت صرف ہندوانہ رہی ہے۔ وہ ہندو نسل کو ہی قومیت کا علم بردار سمجھتی ہے اور ہندو ہی ان کی نظروں میں سچا محب وطن ہے۔ حالانکہ ہندوتوا نظریہ کے بانی بی ڈی ساورکر نے سیاسی باریکیوں کو دیکھتے ہوئے ہندو کے زمرے میں دلتوں، سکھ، بدھ اور جین مت کے ماننے والوں کو شامل کرلیا اور سب کو مسلمان اور عیسائی کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ آج بھی یہی ہندو بنام مسلمان کی

> ”
> فرقہ پرست جماعت کی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ یہ ملک صرف اور صرف ہندوؤں کا ہے۔ وہ یہ جھوٹ سب پر تھوپنا چاہتی ہے کہ اس ملک کی ہزاروں سالوں کی تہذیب اور ثقافت صرف ہندوانہ رہی ہے۔ وہ ہندو نسل کو ہی قومیت کا علم بردار سمجھتی ہے اور ہندو ہی ان کی نظروں میں سچا محب وطن ہے۔ حالانکہ ہندوتوا نظریہ کے بانی بی ڈی ساورکر نے سیاسی باریکیوں کو دیکھتے ہوئے ہندو کے زمرے میں دلتوں، سکھ، بدھ اور جین مت کے ماننے والوں کو شامل کرلیا اور سب کو مسلمان اور عیسائی کے خلاف کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ آج بھی یہی ہندو بنام مسلمان کی سیاست چل رہی ہے۔ غیر مسلم اور غیر عیسائی آدی واسیوں کو بی جے پی میں لانے کی پوری کوشش ہورہی ہے۔

سیاست چل رہی ہے۔ غیر مسلم اور غیر عیسائی آدی واسیوں کو بی جے پی میں لانے کی پوری کوشش ہورہی ہے۔ مگر ہندو اتحاد کی قیادت اور حکومت کی کمان آج بھی اعلیٰ ذاتوں کے ہاتھوں میں ہی ہے۔ اسی فرقہ پرست سیاست کا سہارا لے کر بی جے پی اقتدار تک پہنچی ہے اور اسے وہ آگے بھی جاری رکھنا چاہتی ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہوگا جب لوگوں کو ہمیشہ مذہبی بنیاد پر لڑایا جائے۔ تبھی تو بھاجپا بڑی تیزی سے درسی نصاب اور تاریخ کی کتابوں میں مسلم، عیسائی سماج اور سیکولر جماعت کے خلاف زہر بھرا مواد پیش کررہی ہے۔ اپنے حریف کو بھارت کی تہذیب اور ثقافت کا دشمن بنا کر بی جے پی ہمیشہ کے لیے راج کرنا چاہتی ہے۔ خاص کر مسلمان کو ان کے ہی ملک میں باہری حملہ آور کہہ کر مسلسل گالی دی جاتی ہیں۔ ہندوؤں کو ڈرایا جارہا ہے کہ اگر مسلمان اور عیسائی ترقی کرتے رہے تو ملک اور ہندو سماج کمزور ہو جائے گا۔ یہ بات وہ بعض اوقات کھلے عام کہی رہی ہے کہ جہاں بھی ہندوؤں کی تعداد گھٹی وہاں ملک کی سالمیت پر خطرات بڑھ جائیں گے۔

بھاجپا اس تاریخی حقیقت کو ماننے کو تیار نہیں ہے کہ مذہب وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ہندو دھرم بھی تبدیلیوں کے دور سے گزرا ہے۔ یہاں تک کی ہندو مت کی دیوی اور دیوتاؤں کی مقبولیت بھی گھٹتی اور بڑھتی رہی ہے۔ ویدک زمانہ میں جن دیوی اور دیوتا کی پوجا ہوتی تھی اور جن رسم و رواج کا چلن تھا، ان میں بہت بدلاؤ ہو چکے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ نئے دیوتا اور دیوی مقبول ہوئے۔ اس لیے ایک اچھا مورخ وہی ہے جو تاریخ کی تبدیلی اور اس زمانہ کے سیاق کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ لیتا ہے۔ مگر فرقہ پرست مورخ تاریخ کو ایسا پیش کرتے ہیں کہ ہزاروں سالوں سے ایک ہی مقام پر تاریخ ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ بات بھی بھگوا طاقت چھپانا چاہتی ہے کہ بُدھ اور جین دھرم سے جڑے ہوئے مجسمے ملک کے ہر خطے سے پائے گئے ہیں۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس ملک کو ایک خاص مذہب سے جوڑنا پوری طرح سے بے ایمانی ہے؟ اسلام کو فرقہ پرست ایک ہی رنگ میں رنگ کر پیش کرتے ہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کو خون خرابہ، بت شکنی، ہندو کشی سے جوڑ کر محدود کردی جاتی ہے۔ مگر سچائی نہیں بتائی جاتی ہے کہ جب ایک مسلمان بادشاہ کسی ہندو راجا سے لڑا ہوگا تو اس کے پیچھے ہمیشہ مذہبی فیکٹر کام نہیں کرتا۔ دراصل یہ لڑائی اکثر سیاسی ہوتی ہے جو مال و دولت اور اقتدار کے لیے لڑی جاتی ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مسلمان بادشاہ کی طرف سے لڑنے والے بہت سارے سپاہی ہندو تھے اور ہندو راجا کی طرف سے جنگ کرنے والے بہت سارے فوجی مسلمان تھے؟ حکمراں خواہ ہندو ہو یا مسلمان اس نے کسانوں سے کب ٹیکس لینا بند کیا؟ مزدوروں اور گاریگروں کا استحصال کس دور میں رُک گیا؟

یہ بات بی جے پی دبا دینا چاہتی ہے کہ قدیم بھارت میں ذات پات اور جنسی استحصال کا بھی چلن تھا۔ دلتوں پر کافی ظلم ہوئے، وہیں اسلام کے چراغ نے بھارت کے اندر مساوات اور اخوت کی روشنی جلائی۔ جس قدیم بھارت کو فرقہ پرست عناصر ہندو بنا کر پیش کرتی ہے، وہ دور بدھ مت اور جین مت کا بھی تھا۔ ایک زمانہ تک بدھ مت پورے بھارت میں پھیل گیا تھا۔ بھگوا جماعت اس پر بات نہیں کرنا چاہتی ہے کہ کیسے بدھ مت کو اپنے ہی ملک میں ختم کردیا گیا۔ تشدد کو اسلام سے جوڑنے والے کبھی اس بات پر منہ نہیں کھولتے کہ بدھ مت کے پیروکار کو کن لوگوں نے تشدد کی آگ کا ایندھن بنایا؟ بھگوا جماعت یہ کہتے نہیں تھکتی کہ اسلام کا رشتہ صرف حملہ آوروں سے ہے، مگر وہ اس تاریخی حقیقت کو بتانے سے بھاگتی ہے کہ محمد بن قاسم سے بہت پہلے بھارت کے ساحلی علاقوں میں عرب کے مسلم تاجروں کا ہندوستانیوں سے تجارتی، ثقافتی اور خونی رشتہ تھا۔ عرب کے تاجروں نے ہندوستانیوں سے شادیاں کیں اور اسی وطن کے ہوگئے۔ مگر بھاجپا مشترکہ تہذیب کی جگہ تاریخ کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کو کوشش کررہے ہیں۔ بھارت کو بچانے کے لیے ہمیں ان تخریب کاروں کا علمی جواب دینا ہی ہوگا۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

فکر و نظر

کیا کانگریس واقعی ایک مسلم پرست پارٹی ہے؟

ابھے کمار 12/03/2018 • COMMENTS 2

جن لوگوں کو بھی لگتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں کی پارٹی ہے یا پھر اس نے ہندوؤں کے مفاد کو نظر انداز کیا ، وہ ذرا مسلمانوں کے موجودہ سماجی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی حالات کے سرکاری اعداد و شمار کو بھی جان لیں۔

علامتی تصویر/پی ٹی آئی

جمعرات کے روز ممبئی میں منعقد "انڈیا ٹوڈے کانکلیو" میں بولتے ہوئے کانگریس کی سابق صدر اور یو پی اے چیئرمین سونیا گاندھی نے افسوس ظاہر کیا کہ عوام کے بیچ بی جے پی نے کانگریس کی شبیہ ایک "مسلم" پارٹی کی بنا دی ہے، حالانکہ اگلے ہی جملہ میں انہوں نے اس بات کا اعتراف بھی کیا کہ کانگریس میں مسلمان موجود تو ہیں، مگر پارٹی میں اکثریت ہندوؤں کی ہے، اس طرح کا پروپگینڈہ پھیلانے کے پیچھے حریف بی جے پی کا اصل مقصد کانگریس کو اکثریتی ہندو طبقہ کی نظر میں بدنام کرنا ہے کہ وہ خود کو ان کا واحد اور واجب نمائندہ باور کرانا چاہتی ہے، کانگریس نے بھی اپنی شبیہ کو "دُرست" کرنے کے لئے، اپنے سرکردہ لیڈروں کو مندر بھیجنا شروع کر دیا ہے، مگر جو اصل سوال ہے اس سے عموماً گریز کیا جا رہا ہے:کانگریس واقعی ایک "مسلم" پارٹی ہے؟

اگر کانگریس مسلمانوں کی پارٹی ہوتی تو کیا ان کی حالت اس قدر خراب ہوتی ؛ کیوں کہ کانگریس نے آزاد ہندوستان کی سیاست میں سب سے زیادہ وقت تک راج کیا ہے اور اس کا تسلط ہر طرح محسوس کیا گیا، وہیں دوسری طرف جب ہم مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان کے مابین فرقہ وارانہ تشدد، غربت، نا خواندگی، بےروزگاری اور مسلسل گرتی سیاسی نمائندگی کا خوفناک منظر دکھائی دیتا ہے؟ اگر کانگریس مسلم پرست ہوتی یا پھر اس نے کم از کم مسلمانوں کی منہ بھرائی (تُشٹی کرن) اب تک کی ہوتی تو پھر مسلمانوں کی حالت کیا اس قدر خراب ہوتی؟

ان سارے پروپگینڈے سے دور حقیقت یہ ہے کہ بھگوا عناصر نے مسلمانوں سے کھلی نفرت اور دشمنی کر اپنی سیاست کھڑی کی ہے، اور کانگریس نے بیشتر اوقات مسلمانوں سے کئے گئے وعدے کو پورا نہیں کیا ہے اور اس طرح سے اس نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ انتخاب در انتخاب کانگریس مسلمانوں سے وعدہ کرتی رہی اور ان کے ووٹ سے اقتدار میں آتی رہی، مگر ان کے مسائل کو لے کر اس نے کبھی سنجیدگی نہیں برتی۔

سال 1885 سے ہی، جب کانگریس پارٹی کا قیام عمل میں آیا، مسلمانوں کو لے کر کانگریس پارٹی میں ایک رائے نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس اپنے پروگرام اور نظریہ کے اعتبار سے سیکولر تھی اور اب بھی ہے، مگر شروع کے دن سے ہی پارٹی کے اندر ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگ بھی تھے جو ہندوستان کو ہندو سے منسوب کر کے دیکھتے تھے، ان کی قومیت کے تصور میں مسلمان ہندوستانی معاشرہ میں "غیر" (Other) کی حیثیت سے دیکھا گیا۔

تحریک آزادی کے دوران کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں نے (ہندو) مذہب اور سیکولر سیاست کو جان بوجھ کر ملانا شروع کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں کانگریس کو لے کر بہت سارے شک و شبہات پیدا ہونے شروع ہونے لگے۔ حالات اس قدر بگڑے کہ خود کانگریس کے لیڈران انسدادِ گئو کشی تحریک کے نام پر ان کو نشانہ بنایا۔ اس طرح کے کئی معاملات بہار میں پیش آئے اور مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے اور ان کی کانگریس سے ناراضگی اور علاحدہ پسندی کا فائدہ آگے چل کر مسلم لیگ نے اُٹھایا۔ یہاں اس بات کو واضح کرنا ضروری ہے کہ کانگریس کی قیادت اعلیٰ سطح پر عموماً سیکولر ازم اور ہندو مسلم اتحاد کی بات کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے مگر مقامی سطح پر کانگریسی کارکنان اور ہندو فرقہ پرست عناصر میں بسا اوقات فرق کرنا بےحد مشکل امر ہو جاتا ہے۔

1935 کے گورمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے بعد متعدد شعبوں میں بنی کانگریس کی سرکار بھی مسلمانوں کے توقعات پر کھری نہیں اُتری اور لیڈرشپ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ان کے مذہب کی وجہ سے بھید بھاو برتا گیا۔ مثال کے طور پر 1937 میں جب کانگریس نے بہار میں حکومت بنائی اس وقت اس نے مسلم انڈی پنڈنٹ پارٹی کے ساتھ اقتدار ساجھا نہیں کیا اور جب بات وزیر اعلیٰ بنانے کی ہوئی تب بھی اس نے سید محمود جیسے مستحق سینئر لیڈر کو نظر انداز کر شری کرشن سنگھ کو فوقیت دی، کانگریس کی مسلمانوں کے ساتھ اقتدار ساجھا نہ کرنے کی رویہ نے ہی کچھ ہی سال کے اندر انتہائی کمزور ہو چکی جناح کی مسلم لیگ کو ایک نئی جان دی اور ہندستانی تاریخ کا شاید سب سے بڑا المیہ تقسیم ملک وجود میں آیا جس میں لاکھوں لوگ ہلاک ہوئے اور نہ جانے کتنے بے گھر۔

آزادی کے بعد سیکولر قومیت کے نام پر کانگریس نے مسلمانوں کو مل رہے ریزرویشن اور سپیرٹ الیکٹوریٹ (Separate Electorate) کو ختم تو کر دیا مگر اس کی بھرپائی کیسے ہو اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ دلت مسلمانوں کو درج فہرست ذات کے زمرے سے نکال دیا گیا کیوں کہ وہ "ہندو" نہیں ہیں۔ یہ کون سی منطق تھی کہ ایک ہندو دلت کو ایسی ریزویشن تو مل سکتا ہے مگر اسی جیسی حالت والے ایک مسلم یا عیسائی دھوبی کو اس فہرست سے دور رکھا گیا ہے؟

مسلمانوں اور دیگر اقلیتی طبقوں کے مذہبی اور ثقافتی حق کی ضمانت تو ہندوستانی آئین میں مل گئی اور اس کے لئے کانگریس مبارک بادکی مستحق ہے، مگر ریزرویشن یا دیگر منصوبوں کے فقدان میں مسلمانوں کی سرکاری نوکریوں میں شرح بڑی تیزی سے گرنی شروع ہو گئی، سٹون آئی ولکنسون (Steven I Wilkinson) نے کئی سارے اعداد و شمار پیش کئے ہیں جن میں انہوں نے دکھایا ہے کہ 1970، 1960 اور 1980 کے دہوں تک آتے آتے مرکزی حکومت کے اندر کام کر رہے محکموں میں مسلمانوں کی کی شرح 2 سے 3 فیصد ہو گئی، جو آزادی کے وقت پائی جانے والی شرح سے کافی کم ہے۔ مثال کے طور پر 1947 میں مسلمانوں کی سول سروسمیں شرح 25 فیصد تھی۔ ان کی نمائندگی اسی طرح فوج اور پولیس محکموں میں بھی بڑی تیزی سے گری۔

آزاد ملک میں سیکولر حکومت ہونے کے باوجود بھی فرقہ واریت اور اس سے وابستہ تشدد کبھی بھی پوری طرح سے نہیں تھما، اب تک ہزاروں کی تعداد میں ایسے فسادات ہوئے ہیں، جس میں مسلمانوں کی طرح نقصان کسی نے نہیں جھیلا ہے۔ تشدد کی آگ میں جو مسلمان جلے یا جو املاک تباہ ہوئے وہ تو ہے ہی مگر اس سے بھی زیادہ نقصان اس نے لوگوں کے نفس کو پہونچایا، جو لوگ ہر وقت عدم تحفظ میں مبتلا رہیں گے وہ اپنی ترقی کے بارے میں بھلا کیا کر پائیں گے، یہی وجہ ہے کہ آج مسلمانوں کے حالات کئی شعبوں میں دلتوں سے بھی زیادہ خراب ہیں، مگر ستم ظریفی دیکھئے کہ ہندستانی سیاست میں فرقہ پرست پارٹی سے یہ کون کہے۔ نام نہاد سیکولر پارٹی بھی ان کے لئے انصاف کی بات کرنے سے ڈرتی ہے اور مسلمانوں کے نام پر نافذ کئے گئے سارے منصوبے اُونٹ کے منہ میں زیرا کے برابر ہیں۔

جن لوگوں کو بھی لگتا ہے کہ کانگریس مسلمانوں کی پارٹی ہے یا پھر اس نے ہندووں کے مفاد کو نظر انداز کیا، وہ ذرا مسلمانوں کے موجودہ سماجی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی حالات کے سرکاری اعداد و شمار کو بھی جان لیں۔ سماجی علوم کے نامور اسکالر کرسٹوفر جفرلوٹ (Jaffrelot Christophe) نے مختلف معتبر آنکڑوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ مسلمان تقریباً ہر شعبوں میں دیگر مذہبی گروپ سے پچھڑ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی نمائندگی سرکاری محکموں میں ان کی آبادی سے بہت ہی کم ہے، وہیں انفارمل سیکٹر میں جہاں کسی بھی طرح کی سماجی تحفظات موجود نہیں ہیں،

وہاں ان کا شرح بہت ہی زیادہ ہے، سچر کمیشن کا حوالہ دے کر جفرلوت کہتے ہیں کہ جب بات مسلمانوں کی آمدنی کا ہے وہاں بھی وہ دیگر مذہبی گروپ کے مقابلے کافی کم ہے، خط افلاس کے نیچے زندگی بسر کرنے والے مسلمانوں کی حالت تقریبا دًلت کے برابر ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی شرح خواندگی دوسرے مذہبی گروپ سے کم ہے وہیں ان کے درمیان ڈراپ آوٹ بہت ہی زیادہ ہے، سیاست کے میدان میں بھی ان کی حالت انتہائی کمزور ہو چکی ہے، بی جے پی کے پاس اس وقت تقریبا 1400 رکن اسمبلی ہے جس میں مسلمانوں کی صرف 4 ہے۔

اترپردیش جیسی بڑی ریاست میں جہاں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہے وہاں بی جے پی نے ایک بھی ٹکٹ مسلم کو نہیں دیا اسی طرح پارلیامنٹ میں بھگوا پارٹی کو واضح اکثریت ہے مگر اس کے بینر سے ایک بھی مسلم امیدوار منتخب ہو کر نہیں آیا۔ تبھی تو مسلمانوں کی نمائندگی آج پارلیامنٹ میں 4فیصد ہو گئی ہے جو 1957 سے سب سے کم ہے جہاں فرقہ پرست طاقتیں ان کو کھلے عام ٹکٹ دینے سے انکار کر رہی ہے اور سار انتخابی تشہیر مسلم مخالف ایجنڈے پر لڑ رہی ہے وہیں کانگریس اور دیگر سیاسی جماعت سیکولر راستہ اپنانے کے بجائے، اپنے آپ کو مسلم مسائل سے دور کر رہی ہے اور مسلمان لیڈروں کو نمائندگی دینے سے کترا رہی ہے۔ مگر اس کے برعکس مسلمانوں کے تعداد جیلوں میں ان کے آبادی سے کہیں زیاہ 19فیصد تک پہنچ گئی ہے۔

مذکورہ دلائل کے ساتھ میں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کانگریس کو مسلم پرست کہنا سراسر غلط ہے اور ایک انتہائی خطرناک پروپگنڈا ہے، جس کو پھیلا کر بی جے پی اور اس سے ڈر کر کانگریس مسلمان اور جمہوریت دونوں کا نقصان پہنچا رہی ہے۔ کانگریس کو چاہیے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سبق لیں اور مسلمانوں کو اس کا واجب حق دے۔ آخر میں پھر سے دوہرانا چاہوں گا کہ کانگریس کبھی بھی مسلمانوں کی پارٹی نہیں رہی ہے اور نہ کوئی مسلمان اسے مسلم پرست کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں، اس کے لئے اور ملک کے لئے بہتر یہ ہوگا کہ وہ اپنے سیکولر اور جمہوری اُصول کو سچے من سے اپنائے اور اس پر عمل پیرا ہو۔

Related

کیاپلواما حملے کے بعد مودی کی اقتدار میں واپسی آسان ہوگئی ہے؟
کیاپلواما حملے کے بعد مودی کی اقتدار میں واپسی آسان ہوگئی ہے؟

مسلم دانشوروں سے راہل گاندھی کی ملاقات : کانگریس کو ماضی کی سیاست سے سیکھ لینی چاہیے
مسلم دانشوروں سے راہل گاندھی کی ملاقات : کانگریس کو ماضی کی سیاست سے سیکھ لینی چاہیے

گجرات اسمبلی الیکشن : کانگریس کے مسلم امیدوار 2012 سے کم
گجرات اسمبلی الیکشن : کانگریس کے مسلم امیدوار 2012 سے کم

Categories : فکر و نظر(http://thewireurdu.com/category/commentary-and-analysis/)

بھارت کا آئین اور محروم طبقات

آئین کی روح یعنی اس کی تمہید بھارت کی شناخت ایک مقتدر، سوشلسٹ، سیکولر عوامی جمہوریہ کے طور پر کرتا ہے

ابھے کمار

آئین سازی کا عمل دسمبر ۱۹۴۷ سے دسمبر ۱۹۴۹ تک چلتا رہا۔ ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ کو قانون ساز اسمبلی نے آئین کو اپنا لیا، اور اسی دن کو ہم یوم آئین کے طور پر مناتے ہیں۔ آئین سازی کے لیے قانون ساز اسمبلی کی تشکیل دی گئی تھی، جس کے ارکان ملک کے مختلف حصوں سے منتخب ہوئے تھے۔ چونکہ ملک کا پہلا عام انتخابات ۱۹۵۲ میں عمل آیا، اس لیے قانون ساز اسمبلی کے ارکان کا انتخاب بالغوں کی حق رائے دہی کی بنیاد پر نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ قانون ساز اسمبلی کے زیادہ تر ارکان کا تعلق کانگریس پارٹی سے تھا۔ جہاں ۸۲ فیصد ارکان کانگریس کے تھے، وہیں سوشلسٹ، کمیونسٹ، مسلمان اور دیگر محروم طبقات کی نمائندگی بہت کم تھی۔ مگر محروم طبقات کی ایک بڑی امید ڈاکٹر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر تھے، جو آئین کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ امبیڈکر کے علاوہ، آئین سازی کے عمل میں قومی تحریک، گاندھی کے افکار اور لیفٹ نظریہ کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

ماہرین سیاسیات کا ماننا ہے کہ ہندوستانی آئین سماجی انقلاب کو فروغ دیتا ہے۔ ہندوستانی آئین کے موضوع پر مشہور کتاب 'انڈین کانسٹی ٹیوشن' کے مصنف گرین وِل آسٹن کا کہنا ہے کہ 'آئین کو بہت سے مقاصد کو فروغ دینا تھا۔ مگر ان میں سماجی انقلاب سب سے اہم تھا'۔ ملک کے آئین کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شہری کو بنیادی حقوق دیئے گئے ہیں، جس میں آزادی اور مساوات قابل ذکر ہیں۔ سابقہ قانون میں سب لوگ برابر نہیں تھے، دھرم، ذات اور جنس کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا اور مختلف ذاتوں کے لیے الگ الگ قانون تھے۔ مگر بھارت کا آئین سب کو اعتبار، حیثیت اور موقع کے حساب سے مساوی حقوق دیتا ہے۔ وہیں خیال، اظہار، عقیدہ، دین، عبادت کی آزادی بھی دیتا ہے۔ چاہے کوئی امیر ہو یا غریب، سب کو ووٹ دینے کا حق ہے اور انتخابات لڑنے کا بھی یکساں حق ہے۔ سب کے ووٹوں کی قیمت برابر ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، دلت، آدی واسی، پسماندہ ذات، خواتین، عقیدت مند، ملحد سب قانون کی نظر میں برابر ہیں۔ ہمارا آئین معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی انصاف پر زور دیتا ہے۔ وہ اخوت اور اجتماعی فلاح کے لیے ریاست کو کام کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ آئین کی روح یعنی اس کی تمہید بھارت کی شناخت ایک مقتدر، سوشلسٹ، سیکولر عوامی جمہوریہ کے طور پر کرتا ہے۔

تضاد دیکھیے کہ جو بھگوا طاقتیں آج اپنے حریف کو ملک مخالف اور آئین مخالف کہتی ہیں، وہ خود ایک لمبے وقت تک بھارت کے آئین کو قبول نہیں کر پائیں۔ ان کو اس بات کا دکھ تھا کہ آئین بھارتی اقدار پر مبنی نہیں ہے۔ جب بھگوا طاقتیں بھارتی اقدار کی بات کرتی ہیں تو ان کا مقصد ہندو دھرم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر آر ایس ایس کے ترجمان 'آرگنائزر' نے سال 1949 کے شمارہ میں منواسمرتی پر ایک اداریہ لکھا اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ آئین ساز کونسل کے ممبران منواسمرتی کی اہمیت پر غور نہیں کر رہے ہیں۔ آئین کی تنقید کرنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ 1990 میں آر ایس کی ایک معاون تنظیم وی ایچ پی نے 'دھرم سنسد' کا انعقاد کر کے کہا کہ بھارت کا آئین ہندو مخالف ہے کیونکہ وہ ہندو مذہب کی کتابوں پر مبنی نہیں ہے۔ یہ بھی بات لوگوں کے ذہن سے غائب نہیں ہوئی ہے کہ جب اٹل بہاری واجپئی کی حکومت بنی تھی تب بھی آئین کی نظر ثانی کی بات ہوئی تھی۔ لوگوں نے اس قدم کی زبردست مخالفت کی اور سرکار کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ محکوم طبقات کا یہ ڈر تھا کہ سرکار نظر ثانی کے نام پر آئین کے اندر موجود ترقی پسند اور غریب اور پسماندہ طبقات کے مفاد سے وابستہ دفعات کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی دلت سماج آئین کی حفاظت کے لیے کافی تحریک چلا رہا ہے۔ اسے اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں بھگوا طاقتیں آئین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کر دیں اور ان کو پھر سے ذات پات کی غیر برابری میں نہ دھکیل دیں۔

> ❞
>
> نفرت اور مذہب پر مبنی اقتصادی پالیسی سماج کے اندر منافرت پیدا کر رہی ہے اور اقلیتی طبقات اور دیگر محروم طبقات کے اندر خوف پیدا کر رہی ہے۔ سیاست میں پیسہ کا کھیل بڑھنے سے عام آدمی حکومت اور پالیسی سازی کے عمل سے دور ہوتا چلا جارہا ہے۔ قومی سلامتی کے نام پر آئے دن سخت ترین قوانین کا استعمال سرکار اپنے حریف بالخصوص اقلیتوں، دلتوں اور آدی واسیوں کے خلاف کر رہی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں انتخابات تو ہوتے ہیں، مگر زیادہ تر رائے دہندگان کو سیاسی اور اقتصادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔

حالانکہ آئین سازی کے دوران بہت سارے دیگر تنازعات بھی تھے۔ مثال کے طور پر قومی سلامتی کے لیے مرکزی حکومت کو ایمرجنسی کے اختیارات دے دیے گیے، جس کا سیاسی استعمال برسر اقتدار جماعت اپنی حریف پارٹیوں کے خلاف کرتی آئی ہے۔ ملک کی سالمیت اور اتحاد بنائے رکھنے کے نام پر آئین کے اندر بہت سارے سخت قوانین بھی ڈال دیے گیے، جس کا استعمال کئی بار غلط طریقے سے ہوتا رہا ہے اور اس کی زد میں سب سے زیادہ مظلوم طبقات رہا ہے۔ تبھی تو دلت، آدی واسی اور مسلمان کالے قوانین میں پھنسا کر سب سے زیادہ جیل کے اندر قید کر دیا گیا۔ وہیں بایاں محاذ نظریات کے حامل لیڈروں اور دانشوروں نے اس بات پر اعتراض جتایا کہ آئین کے اندر سیاسی اور شہری حقوق کو جس طرح سے تحفظات دیے گئے ہیں، اس طرح سے اقتصادی حقوق کو نہیں دیئے گئے ہے۔ وہ اس بات سے خوش نہیں تھے کہ اقتصادی حقوق کو بنیادی حقوق کا حصہ نہیں بنایا گیا اور انہیں ریاستی حکومت کے رہنما اصول میں ڈال دیا گیا۔

یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ آئین کے اندر جو قانون بنیادی حقوق کے زمرے میں ڈال دیا گیا، اس کی پامالی ہونے پر کوئی عدالت کے پاس جا کر مقدمہ درج کر سکتا ہے، مگر جو دعویٰ رہنما اصول کا حصہ ہے اسے پورا کروانے کے لیے عدالت کچھ ایکشن نہیں لے سکتی اور نہ ہی وہ سرکار سے ذمہ داری طلب کر سکتی ہے۔ آئین کے آرٹیکل چار میں مملکت کے لیے رہنما اصول دیے گیے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ مملکت عوام کی فلاح کے لیے سماجی نظام قائم کرے گی اور مزدوروں کے لیے گزارا اجرت کا انتظام بھی کرے گی اور ان کے لیے معیاری زندگی مہیا کرانے کی کوشش کرے گی۔ اس کے علاوہ صنعتی یونٹ میں مزدوروں کی حصہ داری طے کرنے کے لیے ریاست گیر سطح پر کام کرے گی۔ اتنا ہی نہیں ریاست بین الاقوامی سطح پر امن و سلامتی کو بھی فروغ دے گی۔ افسوس کی بات ہے کہ ابھی تک کوئی اس طرف قابل ذکر پہل ریاست کی طرف سے نہیں ہوئی ہے۔

یہ بہت ہی تشویشناک ہے کہ جہاں حکومت یوم آئین کی تقریبات کو منانے اور خود کو آئین کا سب سے بڑا محافظ کہنے میں آگے رہتی ہے، وہیں اس کی بہت ساری پالیسیاں آئین کی روح کے سراسر خلاف ہیں۔ مثال کے طور پر ملک میں چل رہی اقتصادی پالیسی امیر اور غریب کی کھائی کو مزید بڑھا رہی ہے۔ نفرت اور مذہب پر مبنی سیاست سماج کے اندر منافرت پیدا کر رہی ہے اور اقلیتی طبقات اور دیگر محروم طبقات کے اندر خوف پیدا کر رہی ہے۔ سیاست میں پیسہ کا کھیل بڑھنے سے عام آدمی حکومت اور پالیسی سازی کے عمل سے دور ہوتا چلا جارہا ہے۔ قومی سلامتی کے نام پر آئے دن سے سخت ترین قوانین کا استعمال سرکار اپنے حریف بالخصوص اقلیتوں، دلتوں اور آدی واسیوں کے خلاف کر رہی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں انتخابات تو ہوتے ہیں، مگر زیادہ تر رائے دہندگان کو سیاسی اور اقتصادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ تبھی تو آئین میں موجود سماجی اور اقتصادی بہتری کے لیے عوام، بالخصوص محروم طبقات کو تحریک چھیڑنی ہوگی۔ شاید یوم آئین کا جشن منانے اور آئین سازوں کو خراج عقیدت دینے کا اس سے بہتر طریقہ اور کچھ نہیں ہوگا۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

تبدیلی مذہب، گاندھی اور امبیڈکر

ہمارا آئین تمام لوگوں کو اس بات کی آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب پر چلنے اور اس کی تشہیر، تبلیغ اور اشاعت بھی کریں

ابھے کمار

گزشتہ نومبر کے مہینے میں اُتر پردیش لاکمیشن نے بی جے پی کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کو ایک رپورٹ پیش کی تھی، جس میں اس نے کہا تھا کہ موجودہ قانون جبراً تبدیلی مذہب کو روکنے کے لیے کافی نہیں ہے، لہٰذا ایک نیا قانون بنانے کی ضرورت ہے۔ میڈیا کو بیان دیتے ہوئے لاکمیشن کے سربراہ جسٹس آدتیہ ناتھ مِتّل نے کہا کہ موجودہ قانونی توضیحات تبدیلی مذہب کو روکنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ تبدیلی مذہب جیسے سنجیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک نئے قانون کی ضرورت ہے، جیسا کہ دیگر ۱۰ ریاستوں میں بنایا جاچکا ہے۔ میڈیا میں آئی خبروں کے مطابق مذکورہ کمیشن نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ جبراً مذہب تبدیل کرانے والوں کے لیے سزا پانچ سال تک بڑھا دی جائے۔ اگر کسی دلت (ایس سی) اور آدی واسی (ایس ٹی) کا جبراً مذہب تبدیل کرایا جاتا ہے تو اس میں ملوث افراد کے لیے قید بڑھا کر سات سال کرنے کی بھی سفارش کی گئی ہے۔ اُتر پردیش کی یوگی سرکار اس رپورٹ کا مطالعہ کر رہی ہے اور وہ جلد ہی وہ اس بات کا اعلان کرے گی کہ وہ لاکمیشن کی ساری سفارشات کو نافذ کرے گی یا پھر اس کا ایک حصہ ہی اسے قابل قبول ہوگا۔

لاکمیشن کی رپورٹ میں تبدیلی مذہب کے خلاف ظاہر بے چینی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہندو شدت پسند تنظیمیں آج بھی ہندوستان کے آئین میں دی گئی مذہبی آزادی کے بنیادی حقوق اور سیکولرازم کے اقدار کو دل سے قبول نہیں کر پائی ہیں۔ اپنے ناقدین پر وہ غدار وطن اور آئین کی بے حرمتی کرنے کا الزام دن و رات لگاتی رہی ہیں، مگر وہ خود اپنے گریبان میں نہیں جھانکتیں۔ بعض اوقات وہ خود آئین کی روح کے خلاف قانون بنانے کی وکالت کرتی رہی ہے۔ وہ خود آئین کی تمہید، آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت کے خلاف بیان دیتی رہی ہیں۔ اقلیتوں کی مذہبی آزادی کا احترام کرنے کے بجائے اس پر سیاست کرتی رہی ہیں۔ ہمارا آئین تمام لوگوں کو اس بات کی آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے مذہب پر چلنے اور اس کی تشہیر، تبلیغ اور اشاعت بھی کریں۔ یہ سیکولرازم کا ایک اہم ستون ہے۔ اگر لوگوں کو صرف مذہب پر چلنے کی آزادی دے دی جائے اور اس کی تبلیغ اور تشہیر کرنے کے حقوق نہ دیے جائیں، تو وہ سماج صحیح معنوں میں سیکولر نہیں کہا جاسکتا۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست خود کو معتدل، آزاد اور جمہوری کہتی ہے، تو اسے اپنے شہریوں کو اظہار رائے کی آزادی دینی ہوگی۔ مگر افسوس کہ ہندو شدت پسند عناصر اور فرقہ پرست خود تو دن رات تشہیر مذہب میں لگے رہتے ہیں، مگر دوسری طرف وہ اقلیتوں کو اپنے مذہب کی تشہیر پر ہنگامہ کھڑا کرتے ہیں، تاکہ وہ مایوس اور خوف زدہ ہو جائیں۔ بعض اوقات اقلیتوں کو جھوٹے مقدموں میں بھی پھسایا جاتا ہے اور کچھ کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ زور زبردستی آئین کی روح کے خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے؟ حالانکہ تبدیلی مذہب کو لے کر ہندو شدت پسند عناصر میں پائی جانے والی بے چینی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جنگ آزادی کے دوران بھی اس طرح کے مسئلے اٹھے تھے اور اس کو لے کر خون بھی بہایا گیا تھا۔ بعض شدت پسند لیڈروں کو یہ کو لگتا تھا کہ اسلام اور عیسائیت سے جڑے لوگ ہندوؤں کا زبردستی دھرم تبدیل کروا چکے تھے۔

گاندھی جی بھی تبدیلی مذہب کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ان کی رائے بابا صاحب امبیڈکر سے مختلف تھی۔ امبیڈکر تبدیلی مذہب کو دلتوں کے لیے ہندو مذہب سے 'نجات پانے' سے تصور کیا اور اپنی وفات سے کچھ ہی مہینوں پہلے اپنے لاکھوں پیروکاروں کے ساتھ ہندو مذہب کو ترک کیا اور بودھ دھرم قبول کر لیا۔ اس کے برعکس،

گاندھی جی بھی تبدیلی مذہب کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ان کی رائے بابا صاحب امبیڈکر سے مختلف تھی۔ امبیڈکر تبدیلی مذہب کو دلتوں کے لیے ہندو مذہب سے 'نجات پانے' سے تصور کیا اور اپنی وفات سے کچھ ہی مہینوں پہلے اپنے لاکھوں پیروکاروں کے ساتھ ہندو مذہب کو ترک کیا اور بودھ دھرم قبول کر لیا۔ اس کے برعکس، گاندھی کا کہنا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم ایک جیسی ہے، اس لیے تمام مذہب کا احترام ہونا چاہیے۔

گاندھی کا کہنا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم ایک جیسی ہے، اس لیے تمام مذہب کا احترام ہونا چاہیے۔ 'ہری جن' (۲۲ رمارچ ۱۹۳۵ء) میں لکھتے ہوئے، گاندھی نے تبدیلی مذہب کی مذمت کی اور کہا کہ تبدیلی مذہب بیماری کے ایک چھوٹے سے نتیجے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس بیماری کی وجہ ختم کر دیجیے، تبدیلی مذہب رک جائے گا اور سارے خراب نتیجے بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس سے قبل ۶ رجون ۱۹۲۵ء میں دارجلنگ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ آج کل ہم سب ایک مسابقہ دیکھ رہے، جس میں لوگ اپنے مذہب کے پیروکاروں کی تعداد بڑھانے میں لگے پڑے ہیں۔ میں یہ سب دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ جب میں لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنتا ہوں کہ انہوں نے بڑی تعداد میں لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے، تو میری رائے یہ ہے کہ یہ کوئی بڑی حصولیابی نہیں ہے۔ گاندھی تبدیلی مذہب کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کر گئے، کیوں کہ وہ اس پورے مسئلے کو اوپر سے دیکھ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات فرقہ پرست طاقتیں گاندھی کے کندھوں پر بندوق رکھ کر نشانہ لگاتی ہیں۔ گاندھی کے برعکس امبیڈکر تبدیلی مذہب پر بات کرتے وقت نیچے سے چیزوں کو دیکھتے ہیں، یعنی ایک اچھوت دلت کا چہرہ سامنے رکھ کر اپنی بات کہتے ہیں۔ امبیڈکر کا ماننا تھا کہ اچھوتوں پر چھوت چھات تھوپا گیا ہے اور اس ناانصافی کو دور کرنے کے بجائے ہندو مذہب اس کو واجب قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے نجات پانے کے لئے انہوں نے ہندو مذہب ترک کرنے کا اعلان کیا اور اپنے پیروکاروں سے بھی تبدیلی مذہب کے لیے اپیل کی۔ میں ایک ہندو نہیں مروں گا۔ امبیڈکر کے اس اعلان کے بعد ان کے ناقدین ان پر ٹوٹ پڑے۔ قدامت پسند سب سے زیادہ ناراض تھے اور اسے وہ ہندو سماج پر بڑا خطرہ مان رہے تھے۔ بہت سارے دلت بھی امبیڈکر کے اس فیصلہ سے نا اتفاق رکھتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ اچھوتوں کا مسئلہ ہندو سماج کے اندر ہی حل کیا جائے۔ گاندھی نے بھی امبیڈکر سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کی دلیل تھی کہ 'اچھوت پر تھا' اور اچھوتوں کے دیگر مسائل کا حل تبدیلی مذہب ہرگز نہیں ہے۔ مگر امبیڈکر نے مذہب بدلنے کا عزم کر رکھا تھا۔ ان کی پہلی دلیل تھی کہ مذہب کا اصل مقصد بھلائی ہوتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب بھلائی کی بات کرتے ہیں، تو پھر مذہب کیوں بدلے؟ یہی سوال گاندھی نے بھی امبیڈکر کے سامنے کھڑا کیا تھا۔ اس کا جواب امبیڈکر نے یہ کہہ کر دیا کہ بھلائی کی بات تو سب مذہب کرتے ہیں، لیکن بھلائی کیا ہے، اس پر سب متفق نہیں ہیں۔ امبیڈکر نے ہندو دھرم کی مثال دے کر سمجھایا کہ اس میں بھلائی کا تصور تو ہے، لیکن یہ بھلائی ذات پات، اونچ نیچ اور چھوت چھات کی مذمت کرنے کے بجائے، ان سب کا دفاع کرتا ہے۔ اس لیے اچھوتوں کے لئے ہندو دھرم میں رہنا غلامی کے مترادف ہے۔ ان کی دوسری دلیل یہ تھی کہ مذہب کا اصل مقصد سماجی زندگی سے جڑا ہوتا ہے، نہ کہ فوق الفطرت پہلوؤں سے اور جب انہوں نے ہندو دھرم کا موازنہ دیگر مذاہب سے کیا، تو پایا کہ یہاں تو اچھوتوں کے لئے ناانصافی ہی ناانصافی ہے۔ لہٰذا انہوں نے کہا کہ اچھوتوں کو اس استحصال شدہ زندگی سے نجات پانے کے لیے ہندو دھرم کو ترک کرنا ضروری ہے اور جو بھی مذہب سماجی مساوات اور اخوت کے نظریہ کو فروغ دیتا ہو، وہ اچھوتوں کے لئے مناسب ہے۔

مذہب کی تشہیر اور تبدیل کا مسئلہ آئین ساز اسمبلی میں بھی موضوع بحث تھا۔ اس وقت بھی کچھ ممبران نے تشہیر مذہب کو آئینی تحفظات فراہم نہ کرنے کی وکالت کی تھی۔ مگر دیگر ممبران نے اسے قبول نہیں کیا اور تشہیر مذہب کو سیکولرزم اور مذہبی آزادی کا حصہ مانا۔ جو لوگ تشہیر مذہب کی مخالفت کرتے ہیں ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ اگر کسی مذہبی فرقے میں غیر برابری ہوگی، تو یہ ممکن ہے کہ جو لوگ استحصال کے بوجھ تلے دبے ہیں اور ذلت کی زندگی جی رہے ہیں، وہ اس سماج اور مذہب کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھیں گے، جہاں مساوات، برابری اور وقار کی روشنی چمک رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو سماج کے بہت سارے کمزور اور محکوم طبقے کے لوگ تبدیلی مذہب کو اپنی غلامی سے آزادی حاصل کرنا تصور کرتے ہیں۔ ہندو شدت پسند تنظیم اگر صحیح معنوں میں انسانوں کی آزادی کی پیروکار ہے تو اسے مذہب کی تشہیر مذہب تبدیل کے خلاف سخت قانون بنانے کے بجائے لوگوں میں جذبہ اخوت پیدا کرنا چاہیے اور اس کی راہ میں پڑی رکاوٹ (جیسے ذات برادری اور طبقاتی نظام) کو ختم کرنا چاہیے۔

(مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں)

debatingissues@gmail.com

"اس شخص سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔" (قرآن)

ہفت روزہ دعوت नई दिल्ली दावत نئی دہلی

DAWAT, NEW DELHI

www.dawatweekly.com

کورونا سے بھی تیز فرقہ پرستی کا وائرس!

حکومت کے لیے مرکز نظام الدین ناقص حکمرانی کو چھپانے کی ڈھال بن گیا

مذہبی منافرت سے صحت عامہ اور تعلیم و روزگار کے مسائل مزید گہرے ہوں گے

ابھے کمار، دلی

آفت کے وقت اتحاد کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے مگر ملک کی بدقسمتی دیکھیے کہ بحران کے ان لمحات میں بھی بھگوا طاقتیں عوام کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرنے میں لگی ہوئی ہیں اور فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے سے باز نہیں آرہی ہیں۔ نتیجتاً ملک کو درپیش مصیبت کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ دنیا بھر میں ملک کی بدنامی ہو رہی ہے کہ بھارت کے لوگ وبا کو بھی فرقہ وارانہ زاویہ سے دیکھ رہے ہیں۔ کیا یہ شر پسندی کسی ناسمجھی، سادہ لوحی یا غلط فہمی کا نتیجہ ہے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو افہام و تفہیم سے اس کو دور کیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت یہ تخریب کاری ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ ہے۔ بھگوا فرقہ پرست عناصر نے ہر وقت یہ 'ماسٹر اسٹروک' کھیلا ہے کہ جب ان کی کمیاں اور خامیاں منکشف ہونے لگیں اور عوام ان سے جواب طلب کرنے لگے تو انہوں نے پورے معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی۔ اس طرح بحث کو غلط سمت میں موڑ دیا۔ یہ حکمت عملی انہوں نے حالیہ دہلی فسادات کے دوران بھی اپنائی تھی۔ جب ان کو یہ احساس ہونے لگا کہ پولیس اور انتظامیہ کھلے

اس خبر کو شائع کر کے صحافتی ضابطوں کو بڑا نقصان پہنچایا گیا ہے۔ خبر لکھتے وقت صحافی کو پولیس کے موقف کو پولیس کے حوالے سے لکھنا چاہیے تھا اور ساتھ ہی ملزم کے موقف کو بھی شامل کرنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ صحافیوں کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ تبلیغی جماعت کا موقف کیا ہے۔

طور پر فرقہ پرستوں کی پشت پناہی کر رہی ہے اور اس کی وجہ سے حکومت سے سوال پوچھا جا رہا ہے تو برسر اقتدار بھگوا جماعت نے اسے فرقہ وارانہ رنگ دے دیا اور اچانک ایک مسلمان کا چہرہ سامنے کر دیا اور کہا جانے لگا کہ اس نے اپنے گھر میں پٹرول بم سمیت ہتھیار جمع کر رکھا تھا اور حالات کو بگاڑنے میں اس کا اہم رول ہے پھر بحث اچانک سے بدل گئی اور دہلی فسادات کی زد میں آنے والے مسلمانوں کو ہی الٹا قصوروار قرار دے دیا گیا۔ کچھ ایسا ہی شاہین باغ تحریک کو دبانے کے لیے کیا گیا اور جے این یو کے ایک ذہین مسلم طالب علم شرجیل امام کو اس کا 'ماسٹر مائنڈ' کہا گیا اور یہ افواہ پھیلائی گئی کہ وہ بھارت کی سالمیت کے لیے خطرہ ہے۔ میڈیا نے پولیس اور حکومت کے اس موقف کو قبول کرنے سے پہلے یہ نہیں سوچا کہ ایک طالب علم کس طرح بھارت جیسے ایک مضبوط اسٹیٹ کے لیے خطرہ بن سکتا ہے؟

"کورونا پر قابو پا لیا گیا تھا مگر حالات تبلیغی جماعت کی وجہ سے بگڑ گئے ہیں"۔ مذکورہ ریمارک جے این یو ہاسٹل میس میں کام کرنے والے ایک ملازم نے کیا۔ ان سے میری ملاقات منگل کی شام کو دہلی میں ہوئی تھی جب وہ ضروری اشیا کی خریداری کے لئے باہر نکلے تھے۔ یہ ملازم بہار کے بکسر ضلع سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ایک سیدھے سادے انسان ہیں، مگر ان کے دل میں بھی تبلیغی جماعت کے خلاف تعصب بھر دیا گیا۔ یہ بات پھیلا دی گئی ہے کہ کورونا وبا کو مسلمانوں نے اپنی لاپروائی اور مذہبی توہم پرستی کی وجہ سے پھیلا دیا ہے اور وہ ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا کر رہے ہیں۔ دیگر مقامات پر بھی اسی طرح کے بیانیے سننے کو مل رہے ہیں۔ اسی دوران آندھرا پردیش میں مزدوری کرنے والے بہار کے میرے ایک دوست نے فون کر کے مجھ سے میری خیریت پوچھی اور اس نے بھی کہا کہ مسلمان ہی بیماری کو پھیلا رہے ہیں!

کمیونل کارڈ کا اثر دیکھیے کہ کل تک رائے عامہ میں یہ بحث چل رہی تھی کہ غریب اور مزدور لاک ڈاؤن کے دوران کیا کھائیں گے اور کیوں ہماری حکومتوں نے صحت عامہ پر توجہ نہیں دی۔ تشویش حکومت کی ناکامی پر ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں عوام کو درپیش پریشانیوں پر ماہرین کی رائے لی جا رہی تھی اور یہ سوال اٹھایا جا رہا تھا کہ حکومت نے بغیر کسی تیاری کے ملک گیر لاک ڈاؤن کا کس طرح اعلان کر دیا ہے۔ رپورٹیں آرہی تھیں کہ کس طرح مزدور اور غریب لوگ کورونا اور فاقہ کشی سے لڑ رہے ہیں۔ ویڈیوز وائرل ہو رہے تھے کہ رہنے اور کھانے کی دقت کی وجہ سے ہزاروں کی تعداد میں تارکین وطن مزدور پیدل ہی اپنے گھر کو نکل پڑے ہیں جس کی وجہ سے دہلی کے آنند وہار اسٹیشن پر بڑی بھیڑ جمع ہو گئی ہے جو لاک ڈاؤن کے مقصد کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ اس دوران یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی تھی کہ حکومت کے پاس مزدوروں اور غریبوں کو دینے کے لیے صرف جملے بازی کے سوا کچھ نہیں۔ اور جہاں تک

حکومت کی اصل پالیسی کا سوال ہے تو یہ صرف سرمایہ داروں اور امیروں کے مفاد میں بنائی جاتی رہی ہے۔ پولیس کی زیادتی کی بھی خبریں آرہی تھی اور پوری دنیا یہ جان کر حیران تھی کہ بھارت کی پولیس غریب عوام کی مدد کے بجائے ان پر ڈنڈے کیوں برسا رہی ہے اور بعض اوقات گولی بھی چلا رہی ہے۔ مجموعی طور پر مزدور کے متعلق سوالات سامنے آرہے تھے اور روزی روٹی کا مسئلہ بحث کا حصہ بن رہا تھا۔

ان سب سے سرکار گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی امیج پر بھی سوال اٹھ رہے تھے۔ عوام کا غصہ بھی حکومت کے خلاف بڑھ رہا تھا۔ طبقاتی شعور کی سطح بھی بڑھ رہی تھی۔ مودی سرکار کے بڑے بڑے منتری اور سنتری سب منظر سے غائب ہو گئے تھے۔ خود وزیر اعظم نریندر مودی کو جنتا سے معافی مانگنی پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب حکومت کچھ نہ کچھ مثبت قدم ضرور اٹھائے گی۔ سالوں سے بے توجہی کے شکار صحت عامہ، روزگار اور دیگر فلاحی کاموں پر حکومت سنجیدگی سے توجہ مرکوز کرے گی ورنہ برقرار نہیں رہ پاتی۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ایک بار پھر کمیونل کارڈ کھیل کر مزدوروں اور غریبوں کے سوال کو درکنار کر دیا گیا اور صحت عامہ کی پالیسی پر توجہ دینے سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی۔ برسر اقتدار جماعت نے ایک بار پھر مسلمان کو بلی کا بکرا بنایا۔ اس بار انہوں نے کورونا وائرس کو تبلیغی جماعت سے جوڑ دیا اور تبلیغی جماعت اور عام مسلمان کی شبیہ ایک بار پھر مسخ کرنے کی کوشش کی۔

پل بھر میں ڈیبیٹ بدل گیا۔ ۳۰ مارچ کے بعد مین سٹریم میڈیا سے یہ خبر آندھی کی رفتار سے عوام میں پھیلنے لگی کہ پولیس نے تبلیغی جماعت کے دہلی آفس پر دھاوا مارا ہے، جہاں کورونا کے سیکڑوں مشتبہ مریض پائے گئے ہیں۔ سوشل میڈیا پر منظر اور بھی خوفناک تھا۔ مسلمانوں کو گالیاں دی جانے لگیں۔ فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے اور اس بحران کے لیے مسلمان کو 'ولن' بنا دیا گیا۔ پھر ڈیبیٹ کا موضوع مسلمان اور اسلام سے درپیش 'خطرات' ہو گیا۔ مسلمان 'غافل' ہیں۔ وہ 'دقیانوس' ہیں۔ وہ 'شدت پسند' ہیں۔ وہ 'جہادی' ہیں۔ وہ 'ملک مخالف' ہیں۔ وہ 'دہشت گرد' ہیں۔ اس طرح کا پروپیگنڈا شروع ہو گیا، جو اب تک رُکا نہیں ہے۔ کہا گیا کہ اگر مسلمان وقت پر احتیاط کیے ہوتے تو صورت حال نہیں بگڑتی۔

کچھ نام نہاد سیکولر اور روشن خیال لوگوں نے بھی مسلم دشمنی کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مشہور بنگلہ دیشی مصنفہ تسلیمہ نسرین کا ۳۱ مارچ کو ایک ٹویٹ آیا جس میں انہوں نے کہ "تبلیغی جماعت کے بالواسطہ تعلقات دہشت گردوں سے ہیں!"۔ ٹی وی کے نیوز روم سے مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی شروع ہو گئی۔ دھاوے کے کچھ ہی گھنٹوں میں تبلیغی جماعت اور مسلمان کے خلاف 'میسج' پہنچا دیا گیا۔ فرقہ پرستی کا وائرس ملک میں کورونا سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے۔ مگر مطالعے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ کورونا وائرس کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی تیاری پہلے سے چل رہی تھی کیونکہ آر ایس ایس کے لٹریچر میں پہلے ہی مسلمانوں کو ٹارگیٹ کیا گیا تھا اور اس بیانیہ کو پر دینے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ مسلمان کورونا کے وائرس کو پھیلا رہے ہیں۔ مَیں اس وقت آر ایس ایس کے ہفت روزہ ہندی میگزین 'پنچ جنیہ' میں شائع شدہ ایک مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ ۲۹ مارچ کے شمارے میں یہ مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے 'کرونا کے مذہبی کاروبار'۔ اس میں یہ الزام لگایا گیا ہے کہ "ہندوستانی سرکار کورونا وائرس کو پھیلنے سے روکنے کے لیے تمام کوششیں کر رہی ہے، مگر اسلام کا حوالہ دے کر مسلمان نہ تو احتیاط ہی کر رہے ہیں اور نہ ٹیسٹ کرا رہے ہیں۔ مولوی اور پادری اپنی توہم پرستی کا دھندہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں"۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس مضمون میں عیسائی پادری کو بھی چپیٹ میں لیا گیا ہے، مگر مضمون میں اصل نشانہ مسلمان ہی ہیں۔ مسلمانوں کے حوالے سے اس طرح کے بیانات ماخوذ کیے گیے ہیں جن میں مسلمان یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ کسی طرح کی احتیاط نہیں کریں گے کیونکہ ان کا یقین سائنس میں نہیں ہیں۔ "اللہ چاہے گا تب ہی انفیکشن پھیلے گا۔ اس لیے احتیاط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے"۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مسلمان ایسا بیان دے سکتا ہے؟ اسلام کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ضرور ہے اللہ کی مرضی سے سب کچھ ہوتا ہے۔ مگر ان کے نزدیک اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان کوشش کرنا بند کر دے یا پھر عقل کا استعمال کرنا بند کر دے۔ عقیدت مند مسلمان یہ بار بار کہتے ہیں کہ کوشش کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔ سائنس کے حلقے میں بھی مسلمانوں کی کارکردگی کسی قوم سے کم نہیں رہی ہے۔ مگر پھر بھی اسلام کو جان بوجھ کر مسخ کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے اور یہ مواد پھیلا گیا ہے کہ مسلمان سائنس کے خلاف ہیں۔ اگر تصور بھی کر لیا جائے کہ ایسی باتیں کچھ مسلمانوں نے واقعی کی ہیں تو کیا یہ ناقص رائے پوری مسلم معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے؟ اگر ایسی بات تھی بھی تو کوشش یہ ہونی چاہیے تھی کی انتظامیہ خود مسلمانوں کے قائد اور ملی رہنما سے ملتی اور ان سے مداخلت کرنے کو کہتی۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا کیونکہ مسلمان کورونا سے لڑنے کے لیے کسی دوسرے سے پیچھے نہیں تھے۔ بہت پہلے سے ہی بھگوا شدت پسندوں کے دلوں میں کچھ اور ہی پک رہا تھا۔ ان کو مسائل کے حل کرنے میں کم اور مسلمانوں کو بدنام کرنے میں زیادہ دلچسپی تھی۔

جب حکومت کو یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ 'بیک فٹ' پر آگئی ہے، تو اس نے ایک بڑا دھماکا کرنے کی سوچی۔ میڈیا کی موجودگی میں ۳۰ مارچ کے روز تبلیغی جماعت کے دفتر پر ریڈ ڈالا گیا جو ان کے گیم پلان کا حصہ تھا۔ ۳۱ مارچ کے روز انگریزی اخبار 'ہندو' کی خبر کے مطابق، پولیس نے دہلی کی بستی نظام الدین میں واقع تبلیغی جماعت کے مرکزی آفس، جو خواجہ نظام الدین اولیا کی درگاہ سے صرف سو میٹر دوری پر ہے، کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لوگوں کی آمد و رفت بند کر دی۔ اس آپریشن میں ڈرون کا بھی استعمال کیا گیا۔ بعد میں ۱۵۰ لوگوں کو مرکز کے سے باہر نکالا گیا اور کورونا وائرس کی جانچ کے لیے انہیں مختلف اسپتالوں میں پہنچا دیا گیا۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ تقریباً ۸ ہزار مسلمان تبلیغی جماعت کے اجتماع میں حصہ لینے کے لیے دہلی آفس آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے بہت سارے اپنے ملک و وطن لوٹ گئے، مگر کچھ نہیں جا سکے۔

دھاوے کے فوری بعد دہلی کے وزیر اعلیٰ اروند کجریوال حرکت میں آگئے جو دہلی میں رونما ہوئے مسلم مخالف فسادات کے دوران خاموش رہے تھے جب سینکڑوں مسلمانوں کے جانی و مالی نقصانات ہو رہے تھے تب وہ محض ہندو فرقہ پرستوں کے ووٹوں کی خاطر مسلمانوں کی مدد کے لیے آگے نہیں آئے اور اب جب مسلمانوں کے خلاف سازش رچی گئی تو اس کا حصہ بننے کے لیے آگے آگئے تاکہ ہندو فرقہ پرست ووٹروں میں اپنا اعتماد برقرار رکھا جا سکے۔ انہوں نے تبلیغی جماعت کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کا حکم دے ڈالا، مگر یہ نہیں سوچا کہ کیا مرکز کی کوئی حرکت پولیس اور انتظاکہ سے پوشیدہ تھی؟

اس طرح تبلیغی جماعت اور مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرنے کے لیے ڈسکورس تیار کر دیا گیا۔ زیادہ تر اخبارات اور ٹی وی چینلوں نے پھر ایک بار مسلمانوں کو رلایا ہے۔ بے لگام سوشل میڈیا پر مسلمانوں کو جم کر گالیاں دی گئیں۔ فرقہ پرست اور موقع پرست سیاست دانوں نے بھی اس موقع کا فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کا خوب دل دکھایا اور بھائی چارے کی جو فضا بن رہی تھی اس کو مسموم کرنے کی ناپاک کوشش کی۔

دھاوے کے اگلے دن ہندی کے اخبارات حکومت کی ترجمانی کر رہے تھے۔ لوگوں میں کورونا سے زیادہ تبلیغی جماعت اور مسلمانوں کا خوف پیدا کیا گیا۔ یہ سلسلہ تب سے لے کر ابھی تک تھما نہیں ہے بلکہ جاری ہے۔ ۲ اپریل کے قومی ہندی اخبار 'دینک جاگرن (نیشنل) کو ہی لے لیجیے جس کے صفحہ اول کی خبر کی سرخی کچھ یوں تھی۔ مرکز میں پنپ رہا تھا دیش کی تباہی کا وائرس. نیچے متن میں یہ کہا گیا ہے کہ "تبلیغی مرکز میں قیام پذیر دیش و دیش کے مولاناؤں کو باہر نکالے جانے کے ساتھ ہی حیران کرنے والی معلومات سامنے آرہی ہے۔ ذرائع کا دعوی ہے کہ مرکز میں ٹھہرے لوگ نہ صرف ملک مخالف سرگرمیوں کو ہوا دے رہے تھے، بلکہ کورونا وائرس کو ہتھیار بنا کر ملک بھر میں تباہی پھیلانے کی منشا رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکز میں نہ صرف لوگوں کو چھپایا گیا، بلکہ پولیس جب باہر نکالنے کی کوشش کی، تو وہ حملہ آور ہو گئے۔ پولیس کے پہنچے سے پہلے ہی غیر ملکی شہریوں کو دارالحکومت کے کئی علاقوں میں چھپا دیا گیا۔ ٹورسٹ ویزا پر آئے ان لوگوں نے مذہب کی تبلیغ میں شامل ہو کر ویزا قانون کی پامالی کی۔ فی الحال کرائم برانچ نے پروگرام منعقد کرانے والوں کے خلاف کرمنل سازش کرنے کا دفعہ لگا کر کیس درج کر دیا ہے اور جانچ شروع کر دی گئی ہے۔ جلد ہی تفتیش میں این ائی اے بھی تعاون کرے گا"۔

اس خبر کو شائع کر کے صحافتی ضابطوں کو بڑا نقصان پہنچایا گیا ہے۔ خبر لکھتے وقت صحافی کو پولیس کے موقف کو پولیس کے حوالے سے لکھنا چاہیے تھا اور ساتھ ہی ملزم کے موقف کو بھی شامل کرنا چاہیے تھا۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ صحافیوں کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ تبلیغی جماعت کا موقف کیا ہے۔

اپنے دفاع میں تبلیغی جماعت نے ایک بیان جاری کیا لیکن کچھ اداروں کو چھوڑ کر باقی تمام میڈیا ہاؤسز نے اسے نظر انداز کیا۔ مگر ۳۱ مارچ کو نیوز ویب پورٹل 'جنتا کا رپورٹر نے تبلیغی جماعت کا پریس ریلیز شایع کیا جس میں جماعت نے اپنے اوپر لگائے گئے لاپروائی کے الزام کی تردید کی۔ تبلیغ کا یہ موقف ہے کہ جو لوگ بھی مرکز کے پروگرام میں حصہ لینے آئے تھے، ان میں سے کچھ اس وجہ سے اپنے ملک واپس نہیں جا پائے کیونکہ حکومت نے لاک ڈاون کو نافذ کر دیا تھا۔ حمل و نقل بند تھا جس کی وجہ سے لوگ مرکز میں رُکے رہ گئے اور وہ مرکز کے دفتر میں خود ہی قرونطینہ میں چلے گئے تھے۔ اس طرح مرکز کی طرف سے لاپروائی کی کوئی بات نہیں تھی۔ مزید کہا گیا کہ تبلیغی جماعت ایک بین الاقوامی تنظیم ہے اور اس کے پروگرام ہر سال منعقد ہوتے ہیں، جس میں پوری دنیا کے لوگ شرکت کرنے کے لیے آتے ہیں اور یہ سب کچھ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میڈیا کے الزام کو خارج کرتے ہوئے کہا گیا کہ تبلیغی جماعت کے ذمہ داروں نے کورونا وائرس وبا کے پیش نظر انتظامیہ کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ مثال کے طور پر، تبلیغ نے ۲۲ مارچ کے اعلان شدہ 'جنتا کرفیو کے بعد اپنی ساری سرگرمیاں منسوخ کر دیں۔ ۲۱ مارچ کے بعد ریل سرویسز کے بند ہو جانے کی وجہ سے کچھ لوگ اپنے گھر واپس نہیں جا سکے۔ پھر ۲۳ مارچ کو ملک گیر لاک ڈاؤن کا اعلان کر دیا گیا، جس کے بعد مرکز کے پاس مہمانوں کو واپس بھیجنے کا کوئی متبادل نہیں تھا۔

مگر چیزوں کو وسیع تناظر میں دیکھنے سمجھنے کا وقت کس کے پاس ہے؟ حالات کو بگاڑنے میں نیوز چینل سب سے آگے رہے ہیں۔ ہندی نیوز چینل نے تو ساری حدیں پار کر دی ہیں۔ مثال کے طور پر اے بی پی نیوز پر 'کورونا کی جنگ میں جماعت کا اگھات (چوٹ) پروگرام نشر کیا گیا۔ دیگر نیوز چینلز بھی اس سے پیچھے نہیں تھے۔

سلسلہ صفحہ نمبر ۳ پر

مسلمانوں کے خلاف یلغار

مقابلہ حکمت اور فراست کے ساتھ کریں

محمد رضی الاسلام ندوی، دلی

یوں تو ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف نفرت انگیز مہم وقفے وقفے سے اٹھتی رہتی ہے، لیکن گزشتہ ایک ہفتے سے اس میں بہت زیادہ تیزی آگئی ہے۔ اِس وقت دہلی کے علاقے بستی نظام الدین میں واقع تبلیغی جماعت کا مرکز نشانے پر ہے۔ تبلیغی جماعت کے وابستگان سے آگے بڑھ کر اب تمام مسلمانوں کو مطعون کیا جارہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ انھی کی وجہ سے ملک میں کوروناوائرس پھیل رہا ہے۔ کورونا کی دہشت نے ملک کے باشندوں کے دلوں میں مسلمانوں سے بغض ونفرت میں اضافہ کردیا ہے اور تمام طبقات ان پر لعنت وملامت کررہے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اہل ایمان کو مخاطب کرکے فرمایا: ”ایک زمانہ آئے گا جب قومیں تم پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔“ (ابو داؤد: ۴۲۹۷) ملک کا موجودہ منظرنامہ یہی تصویر پیش کررہا ہے۔ کوروناوائرس کا انکشاف چین کے شہر ووہان میں دسمبر ۲۰۱۹ء میں ہوا۔ وہاں سے یہ مختلف ممالک میں پھیلا۔ تمام ممالک کے حکم رانوں نے ابتدا میں لاپروائی برتی اور تساہل سے کام لیا۔ وہ اس وقت جاگے جب اموات سیکڑوں سے تجاوز کرکے ہزاروں میں پہنچ گئیں۔ اس غفلت کا مظاہرہ ہمارے ملک کے حکم رانوں کی جانب سے بھی کیا گیا۔ چنانچہ ۱۳/مارچ ۲۰۲۰ء تک وہ یہ یقین دہانی کراتے رہے کہ یہاں کسی ہیلتھ ایمرجنسی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے بعد بھی دیگر ممالک سے آنے والوں کی اسکریننگ کا کوئی نظم نہیں کیا گیا۔ جب کورونا متاثرین کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا تو اچانک بغیر کسی منصوبہ بندی کے ۲۵/مارچ سے ملکی سطح پر لاک ڈاؤن کا اعلان کردیا گیا اور جناب وزیر اعظم نے ہدایت کی کہ تمام لوگ اپنے گھروں میں محصور ہوجائیں۔ جو جہاں ہے وہیں ٹھہرا رہے۔ اس پر عمل کیا گیا۔ چنانچہ مزدوروں کی بڑی تعداد ملک کے مختلف حصوں میں پھنس کر رہ گئی۔ مندروں کے زائرین، سیّاح اور دیگر افراد جہاں تھے، وہیں رکے رہیں۔ اس وقت تبلیغی جماعت کے مرکز میں بھی دو ہزار سے زائد لوگ موجود تھے۔ انہیں دیگر مقامات پر منتقل کرنے کے لیے انتظامیہ اور پولیس سے برابر رابطہ کیا گیا، لیکن کہیں شنوائی نہیں ہوئی۔ اچانک ۳۱/مارچ کو پولیس فورس کے ذریعے مرکز خالی کرالیا گیا۔ وہاں موجود لوگوں کو مختلف اسپتالوں اور قرنطینہ مراکز میں منتقل کیا گیا۔ اسی وقت سے مرکز نظام الدین کے خلاف بھونچال آیا ہوا ہے۔ محکمۂ پولیس، مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت، سب وہاں کے ذمے داروں پر الزامات کی بارش کررہے ہیں اور وابستگانِ جماعت کو مطعون کررہے ہیں۔ مختلف ریاستوں میں تبلیغی جماعت کے وابستگان کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی ہے اور ان کے خلاف ایف آئی آر درج کی جارہی ہے۔ اس معاملے میں میڈیا کی شر انگیزی سب سے بڑھ کر ہے کہ وہ تبلیغی جماعت سے آگے بڑھ کر ملک کے تمام مسلمانوں کو موردِ الزام ٹھہرا رہا ہے۔ مختلف چینلوں پر اینکرس انتہائی زہریلی زبان استعمال کررہے ہیں۔ کورونا جہاد اور کورونا بم جیسی اصطلاحات انھوں نے ایجاد کرلی ہیں۔ وہ یہ تاثر دے رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی حماقت سے پورے ملک میں کوروناوائرس پھیلا دیا ہے۔ وہ ملک کے لیے خطرہ ہیں۔ میڈیا کی اس شر انگیزی کا اثر غیر مسلم عوام پر پڑ رہا ہے اور وہ ان کو الگ تھلگ کرنے کی باتیں کررہے ہیں۔

یہ صورت حال مسلمانوں کے صبر کا امتحان ہے۔ انہیں پوری پامردی، حکمت اور فراست کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ بات صحیح ہے اور

کورونا ایک مہلک اور خطرناک مرض ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہوگئے ہیں وہ نفرت کے نہیں، بلکہ ہم دردی کے مستحق ہیں۔ یہ الزام تراشی کا موقع نہیں کہ کس نے اس مرض کو پھیلایا؟ اور کون قصوروار ہے؟ بلکہ سب کو مل کر اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جن لوگوں کے بارے میں اندیشہ ہو کہ کسی پروگرام میں شرکت کے نتیجے میں ان میں یہ وائرس پایا جاسکتا ہے انہیں خود آگے بڑھ کر اپنا چیک اپ کروانا چاہیے اور ضرورت ہو تو متعینہ مدت تک قرنطینہ میں رہنا چاہیے۔ اسے چھپانا دینی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے اور ملکی قانون کے اعتبار سے بھی جرم ہے۔

ہمیں کھلے دل کے ساتھ اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ تبلیغی بھائیوں سے اس موقع پر کچھ چوک ہوئی ہے۔ جب گزشتہ سال دسمبر ہی سے کورونا وائرس کے پھیلنے کی خبریں آنے لگی تھیں اور رواں سال فروری کے اواخر میں ملیشیا کے تبلیغی اجتماع کے بعض شرکا اس سے متاثر پائے گئے تھے تو انہیں فوراً اپنے یہاں کے تمام پروگرام خود سے کینسل کردینے چاہیے تھے۔ لیکن اس معاملے میں مرکزی حکومت کے مختلف محکمے، بالخصوص وزارت داخلہ بھی کم قصوروار نہیں ہے کہ اس نے اپنی ذمے داری ادا نہیں کی اور معاملات کو صحیح طریقے سے منظّم نہیں کیا۔ اس موقع پر مسلمانوں کے لیے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ ان کی جانب سے کسی طرح کی اشتعال انگیزی کا مظاہرہ نہ ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ کی حیات طیبہ سے ہمیں اس معاملے میں بھرپور رہ نمائی ملتی ہے۔ مکی دور میں آپ ﷺ پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے، آپ ﷺ کو شاعر، کاہن اور ساحر جیسے القاب سے نوازا گیا، لیکن آپ ﷺ نے پلٹ کر کوئی جواب نہ دیا، بلکہ خاموشی کے ساتھ اپنے مشن میں لگے رہے۔ قرآن مجید میں یہ تو کہا گیا ہے کہ آپ ﷺ کے بارے میں کہی جانے والی یہ تمام باتیں درست نہیں ہیں، لیکن آپ کی طرف سے اور آپ ﷺ کے اصحاب کی طرف سے اس پر کسی سخت ردّ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ مدنی دور میں منافقوں کی سازشیں عروج پر تھیں۔ ایک موقع پر تو رسول اللہ ﷺ کی زوجہ مطہّرہ امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی الزام تراشی سے نہیں بخشا گیا، مسلمان سخت ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہوگئے، لیکن اس موقع پر بھی انھوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

کورونا ایک مہلک اور خطرناک مرض ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہوگئے ہیں وہ نفرت کے نہیں، بلکہ ہم دردی کے مستحق ہیں۔ یہ الزام تراشی کا موقع نہیں کہ کس نے اس مرض کو پھیلایا اور کون قصوروار ہے بلکہ سب کو مل کر اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جن لوگوں کے بارے میں اندیشہ ہو کہ کسی پروگرام میں شرکت کے نتیجے میں ان میں یہ وائرس پایا جاسکتا ہے انہیں خود آگے بڑھ کر اپنا چیک اپ کروانا چاہیے اور ضرورت ہو تو متعینہ مدت تک قرنطینہ میں رہنا چاہیے۔ اسے چھپانا دینی اعتبار سے بھی درست نہیں ہے اور ملکی قانون کے اعتبار سے بھی جرم ہے۔ کورونا سے تحفّظ کے لیے جس بے تدبیری کے ساتھ لاک ڈاؤن کا اعلان کیا گیا ہے اس سے ہزاروں خاندان بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔ جو لوگ مختلف مقامات پر پھنس گئے تھے وہ دانے دانے کو محتاج ہیں۔ جن

اس ملک کو ہینڈ سینیٹائزرس سے زیادہ برین سینیٹائزرس کی ضرورت ہے۔

مزدوری پیشہ لوگوں کے گھروں کا چولہا روزانہ کمانے سے جلتا تھا ان کا ایک ایک دن سخت پریشانی کے عالم میں گزر رہا ہے۔ ان میں مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ اس موقع پر اگر مسلمانوں کی دینی جماعتیں اور تنظیمیں بڑے پیمانے پر منظّم انداز میں رفاہی کام کریں، حسب سہولت راشن اور پکا ہوا کھانا بلا تفریق مذہب وملّت ضرورت مندوں بستیوں میں اور افراد کے درمیان تقسیم کریں تو وہ دینی فریضہ سے بھی سبکدوش ہوں گے اور اس سے بڑھی ہوئی منافرت کو بھی کم کرنے میں مدد ملے گی۔ خدمتِ خلق وہ موئثر ذریعہ ہے جس سے دلوں کو رام کیا جاسکتا ہے اور ان میں محبت وعقیدت پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ دیکھ کر اطمینان اور مسرّت ہوتی ہے کہ اس معاملے میں مسلمانوں اور خاص طور پر مسلم نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

کوروناوائرس کو قابو میں کرنے کا کارگر طریقہ 'سماجی فاصلہ' (Social distancing) ہے۔ اسی وجہ سے لاک ڈاؤن کا اعلان کیا گیا ہے کہ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں محدود رہیں اور دوسرے لوگوں سے میل جول نہ رکھیں۔ یہاں تک کہ مذہبی عبادت گاہیں بھی بند کردی گئی ہیں۔ مسلمانوں نے اس حکومتی فیصلے کو دل پر پتھر رکھ کر قبول کیا ہے۔ مسجدوں سے انہیں غیر معمولی عقیدت ہے۔ ان کے نزدیک روزانہ پانچ مرتبہ جماعت سے نماز ادا کرنے کے لیے مسجدوں کی حاضری ضروری ہے۔ جمعہ کی نماز اور بھی اہمیت رکھتی ہے، اس لیے اس میں وہ بڑی تعداد میں مسجدوں میں حاضر ہوتے ہیں۔ لاک ڈاؤن کے نتیجے میں جماعت اور جمعہ سے محرومی مسلمانوں پر بہت شاق گزر رہی ہے اور وہ اپنے گھروں میں نماز پڑھنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ ان اوقات کو انہیں اپنے ذاتی تزکیہ، روحانی ارتقا، قربِ الٰہی، توبہ واستغفار اور دعاومناجات میں زیادہ سے زیادہ استعمال کرنا چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل مصر میں سخت ترین حالات سے گزر رہے تھے۔ فرعون اور اس کے کارندوں کی جانب سے سخت مظالم کا شکار تھے۔ اجتماعی زندگی میں دین پر چلنا ان کے لیے ناممکن ہوگیا تھا۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا: ”اپنے گھروں کو قبلہ رو کرلو اور نماز قائم کرو۔“ (یونس: ۸۷) اس ارشاد الٰہی میں ہر زمانے کے مسلمانوں کے لیے رہ نمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق کسی بھی صورت میں کم زور اور مضمحل نہیں ہونا چاہیے۔ کسی وجہ سے اگر مسجدوں میں ان کی حاضری نہ ہوپائے تو ہر گھر کو مسجد بن جانا چاہیے۔ آج کل زندگی اتنی مصروف ہوگئی ہے کہ انسان کو اپنے قریب ترین عزیزوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا موقع نہیں مل پاتا۔ بچے بڑوں کی شفقتوں سے محروم رہتے ہیں، جس کی بنا پر صحیح طریقے سے ان کی دینی واخلاقی تربیت نہیں ہوپاتی۔ لاک ڈاؤن نے اس کا زرّیں موقع فراہم کیا ہے کہ مسلمان اپنے اہل خانہ پر توجہ دیں، ان کی دینی نشوونما کی فکر کریں، ان کی دینی معلومات میں اضافہ کی تدبیر کریں، انھیں کچھ پڑھ کر سنائیں، انہیں قرآن کی سورتیں اور روز مرّہ کام آنے والی دعائیں یاد کرائیں، انہیں سچّا پکّا مسلمان بنانے کی کوشش کریں۔

ملک کے موجودہ حالات عام انسانوں کے لیے سخت ہیں اور مسلمانوں کے لیے خاص طور پر مزید سخت بنادیے گئے ہیں۔ ان کا مقابلہ انہیں ہمّت اور حوصلہ کے ساتھ کرنا ہے۔ ایک حدیث میں مومن کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: ”اگر اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے، چنانچہ اس میں اس کے لیے خیر ہوتا ہے۔“ (مسلم: ۲۹۹۹) اہل ایمان کو مایوسی سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں۔ (الزمر: ۵۳) اس لیے کہ اس کی رحمت سے مایوس ہونے والے گم کردہ راہ ہوتے ہیں۔ (الحجر: ۵۶) جن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب ان کے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو مایوس ہونے لگتے ہیں۔ (الروم: ۳۶) جب کہ اہل ایمان اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے تمام معاملات اس کے حوالے کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں۔ قرآن نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر تنگی کے بعد کشادگی ضرور آتی ہے۔ (الانشراح: ۵،۶) انہیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان شاء اللہ پریشانیوں کے یہ بادل ضرور چھٹیں گے اور راحت ورحمت کی ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی۔

(مضمون نگار جماعت اسلامی ہند کے سکریٹری برائے شعبۂ اسلامی معاشرہ ہیں)

بسلسلہ صفحہ نمبر ۲

ذرا آپ ان پروگروں کی سرخیوں پر غور کیجیے: 'دھرم کے نام پر جان لیوا (مہلک) آدھرم (نیوز ۱۸ اینڈیا)، 'نظام الدین کا ولن کون (اے بی پی نیوز)، 'کرونا جہاد سے دیش بچاؤ (سدرشن ٹی وی)۔ ایسے پروگرام نے عام لوگوں کے دماغوں میں مسلمانوں کے خلاف بارود بھرنے کا کام کیا ہے۔ ایک صحافی کس قدر بے حس ہوسکتا ہے اور سرکار کا ترجمان ہوسکتا ہے یہ کوئی ریپبلک ٹی وی کے سربراہ ارنب گوسوامی سے جانے۔ انہوں نے اپنے شو میں زبان سے آگ اگلی اور ایک مسلمان گیسٹ کو اسٹوڈیو میں بلا کر ذلیل کیا! ایک نیوز اینکر نے تو تبلیغی جماعت کو جان بوجھ کر 'طالبانی جماعت کہا۔ یہی نہیں جانے مانے عالم دین مولانا سجاد نعمانی کی بھی کردار کشی کی گئی۔ یہ سارے مواد انٹرنیت پر موجود ہیں۔ ان سب کو آپ دیکھ سکتے ہیں۔ وقت آگیا ہے کہ ملی رہنما اور سیکولر اور جمہوری طاقتوں آگ اگلنے والے صحافیوں سے نپٹنے کے لیے تدبیر تلاش کریں۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ملک کی ہم آہنگی، سیکولرازم اور رواداری کو زیادہ دنوں تک محفوظ نہیں رکھا جاسکتا۔

نیوز ایجنسی اے این ائی نے بھی تبلیغی جماعت کے 'دہشت گرد' تنظیم ہونے سے متعلق ایک غیر مستند خبر ۲ اپریل کو شائع کی۔ نیوز ایجنسی کی چالاکی دیکھیے کہ خبر کے آخر میں اس نے ایک نوٹ بھی چلایا ہے، جس میں کہا گیا کہ خبر میں جو خیالات ظاہر کیے گیے ہیں ان سے ایجنسی کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

غرض حالات اس قدر خراب ہو رہے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف تشدد کرنے کی وکالت کی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر دہلی اقلیتی کمیشن نے ایک ایسے ہی مسلم مخالف سوشل میڈیا پوسٹ پر اعتراض ظاہر کیا ہے جس میں مسلمانوں کو گیس چیمبر میں ڈالنے کی بات کہی گئی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ایسی نفرت انگیز بات دہلی یونیورسٹی کے ایک استاذ نے کہی ہے۔ کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے دہلی وائس چانسلر کو ایک نوٹس بھیج کر کہا ہے کہ اس معاملے کی جانچ کی جائے۔ ابھی تک وائس چانسلر نے زہر افشانی کرنے والے ٹیچر کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی ہے۔ اسی دوران مہاراشٹر نونرمان کے صدر راج ٹھاکرے نے انتہائی مذموم بیان جاری کیا ہے اور کہا ہے کہ مرکز جیسے پروگرام میں شامل ہونے والوں کو گولی مارنی چاہیے" اور یہ بھی سوال کیا ہے کہ جو اس میں شامل ہوئے ہیں ان کا علاج کیوں ہو رہا ہے!“۔

یہ رجحانات کسی بھی وقت کے لیے انتہائی خطرناک ہیں آفت کے لمحات میں کسی شخص کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے اندر رمق برابر بھی انسانیت باقی نہیں ہے حکمرانوں، صحافیوں، سیاست دانوں اور اثرورسوخ رکھنے والوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ آج پوری انسانیت پر بحران کے بادل چھائے ہوئے ہیں کوئی نہیں جانتا کہ کورونا کی وبا کو قابو کرنے میں کتنا وقت لگے گا اور اس کے لیے کتنی قربانی دینی ہوں گی، ایسے وقت میں بھی اگر انسانیت نہیں جاگی تو آخر کب جاگے گی؟ اگر بالفرض محال یہ تصور بھی کر لیا جائے کہ تبلیغی جماعت سے لاپروائی ہوئی تب بھی اس کو فرقہ وارانہ رنگ دینا کہاں تک صحیح ہے؟ خبریں تو یہ بھی آئی ہیں کہ غیر مسلم بھی اپنے مذہبی مقامات پر جمع تھے تو کیا ہم کسی بھی فرقے کو اس کے لیے قصوروار قرار دے سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر تبلیغی جماعت قصوروار تھی تو حکومت اور پولیس اتنے دنوں سے کیا کر رہی تھی؟ کس کی اجازت سے یہ لوگ مرکز کے دفتر میں قیام پزیر تھے؟ کیا حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی بھی بیرون ملک کا شہری بھارت آسکتا ہے؟ کیا پولیس باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی سرگرمیوں سے نا واقف رہ سکتی ہے؟ اگر تبلیغی جماعت کی وجہ سے وبا پھیل رہی ہے تو پھر ان سیاسی جلسوں کو کیا کہا جائے جو خود بی جے پی کے کارکنان نے منعقد کیے ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب پوری دنیا وبا سے لڑ رہی تھی تو مرکزی حکومت اس کے خطرات کو ٹالتی رہی اور آخری وقت پر متحرک ہوئی؟ کیا یہ بھی حقیقت نہیں ہے کہ جس وقت کورونا کے خلاف جنگ شروع کر دینی چاہیے تھی اس وقت بی جے پی، مدھیہ پردیش میں کانگریس کی حکومت کو گرانے میں لگی ہوئی تھی؟ سوال یہ بھی تو اٹھتا ہے کہ جو لوگ غریب اور بھوکے ہیں ان کو قرونطینہ میں بھیجنے کی بات کرنا بے ایمانی نہیں ہے؟ جن کو گھر بھی میسر نہیں ہیں وہ گھر کے اندر کیسے رہ سکتے ہیں؟ آج ہر روز ہزاروں کی تعداد میں تارکین وطن مزدور پیدل یا پھر سائیکل پر سوار ہو کر دہلی سے دور اپنے گھر کو لوٹ رہے ہیں۔ کچھ تو پہنچ گئے ہیں، کچھ راستے میں ہیں اور بعض دم توڑ چکے ہیں۔ کیا ان کو بے سہارا چھوڑ کر کورونا سے جنگ جیتی جا سکتی ہے؟ حکومت نے اگر ان کو بے سہارا چھوڑ دیا ہے تو اس سے بڑھ کر اور کیا لاپروائی ہو سکتی ہے؟ افسوس کہ حکومت ان سارے سوالات سے بھاگ رہی ہے کیونکہ وہ رفاہی کاموں کو انجام نہیں دینا چاہتی تبھی تو وہ کورونا کو بھی فرقہ وارنہ رنگ دے کر بچنا چاہتی ہے۔ اب غور کرنے والی بات یہ ہے کہ حکومت کو پھر سے صحت عامہ، روزگار اور تعلیم کے بنیادی سوال پر کیسے واپس لایا جائے؟

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

کورونا کا غم اور عید کی خوشی

قدرت نے دینے میں کوئی کنجوسی نہیں کی ہے، مگر انسانوں نے ایسا معاشرتی نظام کھڑا کردیا ہے کہ کچھ لوگ سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھا رہے ہیں جبکہ کچھ بچے دودھ کے لیے بلک رہے ہیں

ابھے کمار

عید کا مطلب 'خوشی' ہوتا ہے۔ رمضان کے پاک مہینے میں عقیدتمند روزہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مالک کو یاد کرتے ہیں اور اس کا شکر ادا کرتے ہیں۔ اپنے گناہوں سے وہ توبہ بھی کرتے ہیں۔ مہینے کے آخر میں، عید کا تیوہار منایا جاتا ہے۔ اس دن لوگ نماز ادا کرتے ہیں، ایک دوسرے کے گلے ملتے ہیں اور ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرتے ہیں۔

دین اسلام کے بارے میں میرا علم بہت تھوڑا ہے۔ پھر بھی اتنا تو کہہ ہی سکتا ہوں کہ اسلام نے نماز کے ساتھ ساتھ ،مساوات، انصاف، صداقت، اچھے اخلاق اور عوامی فلاح پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن میں بھی نماز پڑھنے کے ساتھ ہی زکوۃ دینے کا بھی ذکر آیا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ عبادت کو عوامی فلاح سے قطعی الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہیں دوسری طرف، غلط طریقوں سے جمع دولت کو بہت برا کہا گیا ہے۔ لاچار اور مسکین سے منہ موڑنے، خود کو سب سے بڑا سمجھنے، معصوموں پر ظلم کرنے، کسی کا خون بہانے کو برا گناہ کہا گیا ہے، جس کے لیے سخت عذاب دینے کی وعیدیں ہیں۔

مگر یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ بہت سارے مواقع پر، اسلام کی ان اچھی باتوں پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مُنافع کمانے اور خود کو دولت مند اور مشہور بنانے کے لئے کچھ بھی کر گزرنے اور حدود پار کرنے سے نہیں روکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں غربت اور فتنہ کم ہونے کے بجائے شاید بڑھ رہا ہے۔ قدرت نے دینے میں کوئی کنجوسی نہیں کی ہے، مگر انسانوں نے ایسا معاشرتی نظام کھڑا کر دیا ہے، جس میں کچھ لوگ سونے اور چاندی کے برتنوں میں کھا رہے ہیں، وہیں چھوٹے بچے دودھ کے لیے بلک رہا ہے۔

عوامی پریشانی کورونا وبا کے دوران کافی بڑھ گئی ہے۔ پچھلے سال بھی، کورونا نے تباہی مچائی تھی، مگر اس بار حالات اور بھی زیادہ خراب ہیں۔ بہت سارے لوگوں کے گھر میں کھانے پینے کی اشیا ختم ہوگئی ہیں۔ وبا کے ڈر سے لوگوں میں میل جول بھی کافی کم ہوگیا ہے۔ وبا تو پچھلے سال بھی تھی، مگر اس سال خوف کافی بڑھا ہوا ہے۔ پچھلے سال کچھ دوست دہلی میں واقع میرے کمرے پر آئے اور ہم نے بہت سارے پکوان بنائے تھے۔ روح افزا کے ساتھ لسی بھی بنانا شروعات ہوئی۔ پھر چکن بریانی اور دھنیا کی ہری چٹنی بھی تھی۔ پچھلے سال میں ایک یا دو دن پر کمرے سے باہر نکلتا تھا اور خوردنی اشیا، ساگ سبزی اور دودھ خرید کر لاتا تھا۔ مگر اس بار حالات اتنے خراب ہیں کہ ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی گھر سے باہر نکلنے کا دل نہیں کرتا۔

وبا کی وجہ سے اس بار دوستوں کے ساتھ عید نہیں منا سکا۔ کچھ دوست اس قدر مایوس ہوئے کہ انہوں نے فون پر شکایت کی کہ 'اگر میل جول سے اتنا ہی پرہیز تھا تو کھانا بنا کر آپ روم کے باہر رکھ دیتے، ہم وہیں سے اٹھا لیتے'۔ مجھے بھی ان سے ملنے اور ساتھ کھانے کی بڑی آرزو تھی، مگر میں نے خود کو ملنے سے روکا۔ میری زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب عید خاموشی سے اور چہار دیواری کے اندر منائی گئی۔ لیکن یہ وقت کی ضرورت تھی۔ اس وقت ہم سب کو احتیاط برتنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

> یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ بہت سارے مواقع پر، اسلام کی ان اچھی باتوں پر عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ مُنافع کمانے اور خود کو دولت مند اور مشہور بنانے کے لئے کچھ بھی کر گزرنے اور حدود پار کرنے سے نہیں روکتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں غربت اور فتنہ کم ہونے کے بجائے شاید بڑھ رہا ہے۔ جبکہ اسلام نے نماز کے ساتھ ساتھ ،مساوات، انصاف، صداقت، اچھے اخلاق اور عوامی فلاح پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن میں بھی نماز پڑھنے کے ساتھ ہی زکوۃ دینے کا بھی ذکر آیا ہے۔ مطلب صاف ہے کہ عبادت کو عوامی فلاح سے قطعی الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس بار بھی عید کا جشن کچھ کم رہا، مگر پھر بھی کورونا کے غم کو اس نے کافی کم کیا اور پریشان ذہن کو تھوڑا سکون ضرور دیا۔ بہت دنوں کے بعد عید کے روز، سوشل میڈیا پر اچھی پوسٹس نظر آئیں۔ نئے اور خوبصورت لباس میں چھوٹے بچے دھرتی پر اُترے فرشتوں کی طرح دکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے والدین اور دیگر بزرگ لوگ بھی خوش نظر آئیں۔ کچھ لوگوں نے لزید پکوانوں کی تصویریں بھی شیئر کیں، جسے دیکھ کر مُنہ میں پانی بھر آیا۔

لیکن میں نے بھی ہمت کی اور میرے کمرے میں جو کچھ تھا، اس کے ساتھ عید منانے سے پیچھے نہیں ہٹا۔ عید کو روز کمرے میں نہ تو مرغ تھا اور نہ ہی مٹن۔ نہ سیوئی تھی اور نہ دودھ۔ تھا۔ مگر پھر بھی عید منانے کا حوصلہ اور جذبہ کم نہ ہوا۔ غور سے کچن کو دیکھا تو وہاں صرف سیتا پھل کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ تھوڑی سی پیاز بھی مل گی۔ پیاز اور سیتا پھل کی سبزی بنائی۔ پیاز کی مدد سے چاول کا پلاؤ بنایا۔ تھوڑی املی تھی۔ لہسن اور مرچ کو آگ میں پکایا اور پھر اس میں ادرک اور نمک ڈال کر چٹنی بنائی۔

عید کے روز ہی میں نے بہار میں مقیم اپنے گھر والوں سے فون پر بات کی۔ اس دن میرے بھتیجے کا جنم دن تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جس دن ۱۹۹۹ کے ورڈ کپ کرکٹ کا افتتاح ہوا تھا اسی دن میرا بھتیجا پیدا ہوا تھا۔ اب وہ بڑا ہوا ہے، لیکن اس کا دل اب بھی چھوٹے بچے کی طرح ہے۔ میرے بڑے بھتیجے اس کے لئے پٹنہ سے کیک خرید کر لانے والا تھا۔ لیکن پولیس اور انتظامیہ نے اسے سفر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے کیک نہیں آ سکا۔ کیک کی عدم موجودگی میں، میرے بھتیجے بے بسکٹ کو کیک سمجھ کر اپنا ہیپی برتھ ڈے منایا۔

آج جب مین نے اپنے بھتیجے سے بات کی اور اس کو مبارکباد دی تو وہ خوش تھا۔ میں نے کہا کہ 'پریشان مت ہو۔ جب وقت اچھا ہوگا تو آپ کا جنم دن کیک کے ساتھ منایا جائے گا۔ کیک کے ساتھ مٹھائی بھی آئے گی اور بہت سے دوستوں کو بھی مدعو کیا جائے گا۔ بھتیجا نے مجھ سے اتفاق کیا اور کہا، ٹھیک ہے۔

بعد میں، میں نے اپنی بزرگ والدہ سے بھی فون پر بات کی۔ وہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور انہیں باہر کی دنیا کے بارے میں بھی زیادہ معلوم نہیں ہے۔ وہ سوشل میڈیا اور ٹی وی سے بھی بہت دور ہیں۔ یہ ان کے لئے راحت کی بات ہے۔ لیکن وہ یہ ضرور جانتی ہیں کہ یہ کوئی بڑی بیماری دنیا میں پھیل چکی ہے اور یہ ایک انسان سے دوسرے انسان میں پھیل رہی ہے۔ میں نے اتنا برا وقت کبھی نہیں سنا تھا اور نہ ہی دیکھا تھا۔ انہوں نے یہ بات مایوسی کے ساتھ کہی۔

ماتا جی کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ پچھلے سو سالوں میں ایسا برا وقت شاید کبھی نہیں آیا تھا۔ لیکن ہمیں اس سے لڑنا ہوگا۔ ہمیں اس مصیبت کے دوران جو بھی موقع خوشی کے مواقع ملیں، اسے لپکنے کے لئے یتار رہنا چاہیے۔ مگر وبا کے خلاف جنگ میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ جس طرح میرے بھتیجے نے بسکٹ کو کیک بنا کر اپنا جنم دن منایا ویسے ہی ہم سب کو خوشی منانے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ میرے بھتیجے کی طرح، میں نے برے حالات میں بھی عید کی خوشی منائی۔ سچ ہے کہ کورونا وبا کے درمیاں عید نے کروڑوں لوگوں کے چہروں پر خوشی لائی اور دلوں میں سکون بھر دیا۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

denbatingissues@gmail.com

دعوت هفت روزه
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatweekly.com

خود کشی کی نفسیات

ذہن اور جذبات کی تربیت ضروری

عبید احمد آخون، سرینگر

جب اسلام نے موت کی دعا کرنے کی ممانعت کی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مصائب و مشکلات اور بیماری وغیرہ سے دوچار ہونے کے بعد انسان کو خود کشی کی اجازت دے۔ اگر کوئی شخص خود کشی کرتا ہے تو وہ فعل حرام کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کی سزا بڑی سخت ہوگی۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ساتھ شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، کسی نفس کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم کھانا کبیرہ گناہوں میں سے ہیں۔ انسان کتنا ہی متقی اور پرہیز گار کیوں نہ اور کتنی ہی نیکیاں کیوں نہ کمائی ہوں اور بھلائی کے کام کیے ہو، اگر وہ دنیوی پریشانیوں اور ناکامیوں سے دوچار ہو کر یہ اقدام کرتا ہے تو اس کے سارے اچھے اعمال رائیگاں ہو جائیں گے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ ذہن کی اصلاح، عمل کی اصلاح ہے اور ذہن کی تعمیر زندگی کی تعمیر۔ اقوام متحدہ کے دستور میں جو باتیں درج ہیں ان میں سے ایک اہم بات یہ ہے کہ "جنگوں کی ابتدا چونکہ ذہن سے ہوتی ہے اس لیے یہ دراصل لوگوں کے ذہن ہیں جہاں قیامِ امن کا مورچہ بنایا جائے"۔

ذہنی ارتکاز کسی بھی کام میں اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ فطرت نے دماغ کی صورت میں انسان کو حیرت انگیز طاقت دی ہے۔ دماغ کو استعمال کر کے آدمی اپنی ہر کمی کی تلافی کر سکتا ہے انسان کے ذہن میں منفی خیالات ہمیشہ رد عمل کے طور پر پیدا ہوتے ہیں ناپختہ ذہن کے لوگ ایسی صورت حال پیش آنے پر چیخ اٹھتے ہے غلط فیصلے لیتے ہے اور پختہ ذہن کے لوگوں کو جب ایسی صورت حال پیش آتی ہے تو وہ اس سے موافقت کر لیتے ہیں تا کہ ان کا سفر حیات کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے۔ خودکشی کا اقدام مشکلات سے فرار کا راستہ ہے۔ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ ہر وقت اور ہر منزل پر آدمی کا واسطہ نئے نئے مسائل سے پڑتا ہے اور وہی شخص اس میں کامیاب ہے جو ہر طرح کی پریشانیوں کا جم کر مقابلہ کرے اور زندگی کی آخری منزل تک پہنچ جائے۔ جو شخص شدائد و مشکلات میں صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور جلد بازی و بے صبری میں متاع حیات ہی کو ختم کر دے وہ موت کے بعد جو اس کی دوسری زندگی شروع ہونے والی تھی اس کو اپنے ہی کرتوتوں سے درہم برہم کر دے گا۔ اس دوسری زندگی میں بھی وہی شخص کامران ہوگا اور اس کا لطف اٹھائے گا جس نے اس دنیا میں نازک ترین لمحات میں بھی خدا کا بندہ ہونے کا ثبوت دیا اور زندگی کی آخری سانس تک وہ اس پر قائم رہا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس دنیا کو آنے والی دوسری دنیا کا ضمیمہ قرار دیا ہے۔ یہاں جو عمل اچھا یا برا کیا جائے گا اس کا بدلہ اسے دوسری زندگی میں مل کر رہے گا۔

خود کشی ایک غلط اور ناپسندیدہ عمل ہے جس سے آدمی کی آخرت خراب ہو گی۔ فقہ اسلامی میں یہ اصول موجود ہے کہ المشقۃ تجلب التیسیر... مشقت اپنے ساتھ سہولت لاتی ہے۔ اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ "اس دنیا میں انسان کی ساری حالتیں مشقت کی ہیں، حتیٰ کہ کھانا پینا بھی مشقت سے خالی نہیں ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی قدرت و طاقت دی ہے کہ وہ ان مشقتوں پر حاوی ہے نہ کہ مشقتیں انسان پر حاوی ہیں؟ خود کشی کرنے والے کے ساتھ نہ صرف خدا کا معاملہ دردناک ہو گا بلکہ دنیا میں بھی ایسے لوگوں کی کوئی وقعت نہیں ہوتی اور اس کے برے نتائج سے اس کے گھر والے اور عزیز و اقارب دوچار ہوتے ہیں اور سماج کی ہمدردی سے بھی وہ محروم ہو جاتا ہے۔ خود کشی کرنے والا تو دنیا سے چلا جاتا ہے مگر اس کے اس غلط عمل سے ان کے احباب کو کتنا نقصان پہنچتا ہے اس کا اندازہ اگر اسے خود کشی کرنے سے پہلے ہو جائے تو وہ اس فعل حرام کا مرتکب نہیں ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ جب نبی ﷺ کو ایک مسلمان کے خود کشی کرنے کی خبر ملی تو آپ برہم ہو گئے اور فرمایا کہ میں اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھوں گا۔ آپ نے فرمایا "تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے۔" حکم نبوی واضح طور پر اپنے جسم و جان اور تمام اعضاء کی حفاظت اور ان کے حقوق ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ آپ نے خود کشی جیسے بھیانک اور حرام فعل کے مرتکب کو فِی نَارِ جَهَنَّمَ يَتَرَدَّى فِيهِ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا (وہ دوزخ میں جائے گا، ہمیشہ اس میں گرتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ وہیں رہے گا) فرما کر دردناک عذاب کا مستحق قرار دیا ہے۔ شریعت کے اصولوں کو اگر انسان اپنے ذہن میں جگہ دے تو وہ زندگی بھر کے مشکلات، مصائب اور تکالیف کو بآسانی جھیل لے گا لیکن خود کشی نہیں کرے گا۔ حیرانی کی بات ہے کہ اسلام میں خود کشی کے بارے میں اتنی واضح تصریحات کے باوجود آج ہمارے معاشرے میں یہ بہت عام ہو گئی ہے۔ معاشرے میں مسائل اور پریشانیاں ضرور بڑھ گئی ہیں لیکن ایک مسلمان کو اللہ سے مدد طلب کرتے ہوئے ہمت و حوصلے سے ان کا مقابلہ کرے نہ کہ ہمت ہار کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے اور پسماندگان کو مزید پریشانیوں کا شکار بنا دے۔ بقول علامہ اقبال

موت کو سمجھے ہیں غافل اِختتامِ زندگی
ہیں یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

خود کشی کے اسباب کا حساب لگانا آسان نہیں ہے کیونکہ انسانی سوچ ہر فرد کی جدا گانہ ہوتی ہے۔ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں آئے دن خود کشیوں کی خبریں ہم سُنتے ہے اگر ان خود کشیوں کے وجوہات کو ہم اسباب مان کر چلیں تو کچھ یوں ہو سکتی ہیں:

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ ہر وقت اور ہر منزل پر آدمی کا واسطہ نئے نئے مسائل سے پڑتا ہے اور وہی شخص اس میں کامیاب ہے جو ہر طرح کی پریشانیوں کا جم کر مقابلہ کرے اور زندگی کی آخری منزل تک پہنچ جائے۔ جو شخص شدائد و مشکلات میں صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے اور جلد بازی و بے صبری میں متاع حیات ہی کو ختم کر دے وہ موت کے بعد جو اس کی دوسری زندگی شروع ہونے والی تھی اس کو اپنے ہی کرتوتوں سے درہم برہم کر دے گا۔ اس دوسری زندگی میں بھی وہی شخص کامران ہو گا اور اس کا لطف اٹھائے گا جس نے اس دنیا میں نازک ترین لحات میں بھی خدا کا بندہ ہونے کا ثبوت دیا ہو

۱- والدین کی ازدواجی زندگیوں میں تناو کا اثر بچوں کے ذہن پر پڑتا ہے جو آگے بڑھ کر خود کشی کا سبب بھی بنتا ہے۔ والدین پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچوں کے نشوونما میں اپنا کردار ادا کریں اور اپنے ذاتی تنازعات خوش اسلوبی سے حل کریں

۲- غمِ روزگار پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان سرکاری نوکریوں کی آس میں اور اچھے پوسٹ کی تمنا دل میں لیے ہوئے جب مسلسل ناکام ہوتے ہے تو زندگی کو الوداع کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ کوئی کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا نوجوانوں کو چاہیے کہ سرکاری نوکریوں کو حاصل کرنے کی چاہ میں اپنے وقت کا زیاں نہ کریں بلکہ پرائیویٹ سیکٹر میں روزگار کے مواقع تلاش کریں یا خود کا کوئی چھوٹا موٹا بزنس شروع کریں۔ اس سلسلے میں بہت ساری سرکاری اسکیموں سے استفادہ کر سکتے ہیں،

۳- کاہل سماج میں بہت سارے ایسے افراد بھی موجود ہیں جو بغیر کچھ کیے من وسلویٰ کی چاہت رکھتے ہے محنت کیے بغیر سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جب انہیں ایسی زندگی نہیں ملتی تو ذہنی امراض کا شکار ہو کر خود کشی بھی کرتے ہیں۔ والدین کو چاہیے کہ بچوں میں کام کرنے کا جذبہ بچپن سے ہی پیدا کریں نہ کہ انہیں اتنا لاڈ پیار دیں کہ وہ نکمے ناکارہ ہو کر سماج پر بوجھ بن جائی۔

۴- تعلیمی کونسلنگ کی کمی: کچھ بچے دسویں جماعت کے بعد subjects اور stream کا انتخاب کرتے وقت جلد بازی کرتے ہیں اور جب آگے جا کر اُن streams میں اُنہیں کامیابی نہیں ملتی یا دلچسپی نہیں رہتی تو ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو کر خود کشی کو ہی اپنا سبجکٹ بناتے ہیں۔ کشمیر میں کونسلنگ کی بہت زیادہ کمی ہے، طالبِ علم کون سے مضامین وقت کی ضرورت کے حساب سے Choose کرے اس پر نہ تو والدین سوچتے ہیں اور نہ subjectcouncelors سے مشورہ لیتے ہے بس دیکھا دیکھی وہی subjects بچوں پر تھوپتے ہیں تا کہ اپنے خاندان میں اور قریبی رفقاء میں اپنی جھوٹی انا قائم رکھیں اور کچھ معاملوں میں بچے ہی غلط فیصلے لینے پر والدین کو مجبور کرتے ہیں۔ ایک اچھا subject کونسلر ہی دونوں معاملوں رہنمائی کر سکتا ہے۔

۵- منشیات کی لت میں آج کشمیر سر فہرست ریاست بن گئی ہے۔ تمباکو نوشی، شراب نوشی و دیگر نشہ آور منشیات میں نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اپنی زندگیوں کا خاتمہ خود کشی کر کے یا مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو کر انجام دیتی ہے۔ والدین پر ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں اور اُنہیں نقدی دیتے اور لیتے وقت حساب مانگیں تا کہ پیسوں کا استعمال صحیح جگہ پر ہو اور بچوں کا کن کن دوستوں سے مراسم ہے اس کی بھی خبر رکھیں اور بچوں کو وہ ماحول مُہیا کرائیں جو بے حیائی، بے شرمی، ظلم و جبر، قتل و خون، رشوت خوری اور غرض غلط کاموں سے پاک ہو۔ آج معاشرے میں اگر اسلامی تعلیمات عام ہوں تو خود کشی کے رجحان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ آج ہمارا معاشرہ انتشار کا شکار ہے اور ہر طرف نفسا نفسی کا عالم ہے، جس کی وجہ سے پریشان حال لوگ مایوس ہو کر خود کشی جیسے گناہ کا ارتکاب کرنے لگے ہیں۔ ہمیں اللہ کی رحمت سے بالکل مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے حکمرانوں کو بھی چاہیے کہ وہ اب منہ گائی، بے روزگاری اور دہشت گردی کا خاتمہ کریں تا کہ لوگ اپنی قیمتی جانوں کو خود کشی کر کے ضائع نہ کریں۔ اللہ ہمیں اپنی حفظ و امان میں رکھے اور ہمیں اپنے نبی ﷺ کی سچی محبت سے سرفراز فرما کر ہماری انفرادی و اجتماعی مشکلات کو آسان کرے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے۔

akhoon.aubaid@gmail.com

ملک اور ہندو سماج کا سب سے بڑا دشمن کون؟

کورونا سے متاثر ایک ہندو عقیدت مند کا جواب

ابھئے کمار، دلی

زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ اتنا کم ہو جائے گا یہ کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔ کل تک جن کے ساتھ چائے پی تھی اور سیاسی معاملات پر بحث و مباحثہ کیا تھا ان میں سے ایک کے اچانک بیمار ہو جانے کی خبر ملی۔

کچھ دن پہلے ایک منحوس کال آئی تھی۔ "بھائی میں کرونا پازیٹیو ہو گیا ہوں بدن میں بہت تکلیف ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے پیٹھ پر سو لاٹھیاں ماری ہوں۔ زبان کا ذائقہ بالکل ختم ہو گیا ہے قوت شامہ یعنی سونگھنے کی طاقت بھی ختم ہو گئی ہے اور ابھی بھی جسم تیز بخار سے جل رہا ہے"

بیمار شخص مجھے "بھائی" کہہ رہا تھا کیونکہ میں ان سے عمر میں بڑا ہوں۔ ہم دونوں کا تعلق ریاست بہار سے ہے۔

بھائی کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دوران بحث میری بات نہ کاٹتا ہو یا سماجی انصاف کے مسائل پر میرا ہم خیال ہو اور بائیں بازو کے نظریہ کو درست سمجھتا ہو بلکہ ان سب معاملات میں میرا اس سے شدید اختلاف رہتا تھا۔ بار بار اس نے مجھ پر یادو کی "غنڈہ گردی" پر اور سماجی انصاف کی پارٹی کے ذریعہ کی جانے والی "بدعنوانی" پر خاموشی اختیار کرنے کا الزام لگایا۔

وہ دوران گفتگو میری بات کاٹ کر کہا کرتا تھا کہ "بھائی! آپ معاشرتی انصاف پسند جماعتوں کے خلاف بات نہیں کریں گے کیونکہ اس سے آپ کا کاروبار خراب ہوتا ہے۔ آپ صرف پنڈتوں اور اعلیٰ ذات کے لوگوں کے خلاف زہر اگلتے ہیں کیونکہ اس سے آپ کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ سچائی بولنے کی ہمت کیجیے۔"

میری دلیل یہ ہوتی کہ سماجی انصاف کی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں میں بہت سی کوتاہیاں ہیں، لیکن کوئی چیز مذہب اور نفرت کی سیاست کا متبادل کبھی نہیں ہو سکتی۔

لیکن محترم میری بات نہیں مانتے اور مسلمانوں کے خلاف خوب بولتے رہتے۔ انہوں نے دفعہ ۳۷۰ کے خاتمے کا جشن منایا۔ مندر کی بھی حمایت کی اور آخری بار بھی صاحب کو ووٹ دیا۔ بہار انتخابات کے دوران لالٹین بجھانے میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کئی بار دلت بہوجن حامیوں سے مار کھاتے کھاتے بچے۔ انہوں نے مذہب اور نفرت کی سیاست پر عمل پیرا پارٹی کی طلبہ تنظیم کے رہنماؤں کے ساتھ بھی دوستی نبھائی اور جہاں موقع ملا وہاں خوب فائدہ اٹھایا۔

لیکن جب محترم کورونا سے متاثر ہوئے سب نے نظریاتی اختلافات بھلا کر ان کی مدد کی۔ ہمارے ایک دوست نے ان کے

وہ کہتا رہا "بھائی میں نے قسم کھائی ہے کہ جو غلطی میں نے پچھلے بار کی وہ اب نہیں کروں گا۔ میں نے جن لوگوں کو ووٹ دیا تھا انہوں نے مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کوئی بستر نہیں تھا، کوئی اسپتال نہیں۔ اقتدار میں رہنے والے لوگوں کو غریبوں کی زندگی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کیا اس ملک میں مندروں کی کمی ہے جو ایک اور مندر تعمیر کیا جا رہا ہے؟

پاس کھانا بھی پہنچایا۔ خوشی کی بات ہے کہ اب وہ کورونا سے شفایاب ہو گئے ہیں۔

کل رات وہ فون کر کے شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا شکریہ کی کوئی بات نہیں میں نے آپ کے لیے کچھ نہیں کیا۔

"نہیں بھائی! آپ نے بہت کچھ کیا، میری حوصلہ افزائی کی، پچھلے اٹھارہ دن میں کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میں تنہا ہوں"۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے بھائی اپنا خیال رکھیں کمرے میں ہی رہیں آرام کریں اور اچھی غذا کھائیں۔"

اس نے جواب دیا "میں ابھی آرام کر رہا ہوں لیکن کورونا بہت خطرناک ہے۔ لوگوں کو اسے ہلکے میں نہیں لینا چاہیے۔ یہ معمولی بخار نہیں بلکہ کمر توڑ بخار ہے"

اتنا کہنے کے بعد وہ کچھ اور بولا جس کی مجھے توقع نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا اس پریشانی کو جھیلنا ہے۔ شاید آج کرونا وائرس کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ سے مذہب اور نفرت کی سیاست کا وائرس بھی نکل گیا ہے۔

وہ کہتا رہا "بھائی میں نے قسم کھائی ہے کہ جو غلطی میں نے پچھلے بار کی وہ اب نہیں کروں گا۔ میں نے جن لوگوں کو ووٹ دیا تھا انہوں نے مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ کوئی بستر نہیں تھا، کوئی اسپتال نہیں۔ اقتدار میں رہنے والے لوگوں کو غریبوں کی زندگی سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ کیا اس ملک میں مندروں کی کمی ہے جو ایک اور مندر تعمیر کیا جا رہا ہے؟

مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ برا بھلا کہا جاتا ہے۔ میرے ایک مسلمان دوست نے اس مشکل گھڑی میں میرے لیے پھل بھیجے۔ مسلمانوں اور سکھ بھائیوں نے میری بہت مدد کی۔

میں نے ہندو مذہب کے ٹھیکیداروں کو ووٹ دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب کبھی دوبارہ یہ غلطی نہیں کروں گا۔ مجھے آج احساس ہوا کہ ہندو مذہب اور ملک کو کس چیز سے خطرہ ہے؟

دوسری طرف موبائل فون ہاتھ میں لیے میں اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔

کورونا: حقیقت پھر سامنے آ گئی

کورونا وبا کا خطرہ اب بھی ٹلا نہیں ہے اور چین میں کیس آچکے ہیں، کیا سرکار اب بھی صحت عامہ کو نظر انداز کرے گی؟

ابھے کمار

کچھ روز قبل عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) نے ایک رپورٹ جاری کرتے ہوئے کہا ہے کہ بھارت میں کورونا وبا سے ۴۷ لاکھ افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ اخبارات میں شائع خبروں کے مطابق، ڈبلیو ایچ او اور بھارت سرکار کے اعداد و شمار میں زبردست فرق نظر آرہا ہے۔ سرکار نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ سال ۲۰۲۱ کے آخر تک کورونا کی وجہ سے ۴ لاکھ ۸۱ ہزار جانیں گئیں، وہیں ڈبلیو ایچ او کا کہنا ہے کہ مرنے والوں کی اصل تعداد سرکاری اعداد و شمار سے دس گنا زیادہ ہے۔ صحت عامہ کے ماہرین کا ماننا ہے کہ ڈبلیو ایچ او کی بات حقیقت کے زیادہ قریب نظر آرہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کورونا وبا کے دوران سرکار نے لوگوں کو بے سہارا چھوڑ دیا تھا اور ملک بھر میں لوگ دوا، آکسیجن اور علاج کے لیے روتے رہے۔ پہلے بھی موجودہ حکومت پر یہ الزام لگتا رہا ہے کہ وہ اعداد و شمار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی ہے۔ اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے، وہ اعداد و شمار کو اپنے مطابق بدل کر پیش کرتی ہے۔ مگر سرکار اپنے موقف پر اڑی ہوئی ہے اور یہ کہہ رہی ہے کہ ڈبلیو ایچ او کی رپورٹ نے غلط طریقہ کار کا استعمال کیا ہے۔

سچ پوچھیے تو اعداد و شمار کی اپنی سیاست ہوتی ہے۔ نمبر سے دیکھنے والے لوگ اپنی بات کو منوانے کے لیے نمبر کو آسانی سے بدل دیتے ہیں۔ اس لیے میں یہاں ڈبلیو ایچ او بنام سرکار کے اعداد و شمار کے بارے میں بات کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ عام آدمی کو ٹھگنے کے لیے اعداد و شمار کا استعمال عیار لوگ لمبے عرصے سے کرتے آرہے ہیں۔ میں تو یہاں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اعداد و شمار سے بڑی بات انسان کے خود کے مشاہدات اور اس کے تجربات ہوتے ہیں۔ اپنی پریشانی اور اپنے حالات کو سامنے رکھ کر انسان یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ماہرین کی کون سی بات حقیقت پر مبنی ہے اور کون سی بات محض افسانہ۔ کوئی بھی پورے یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ بھارت جیسے بڑے ملک میں کورونا وبا سے کتنے لوگ ہلاک ہوئے۔ مگر جب بھی وبا کے دوران تباہ کن مناظر آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہیں تو یہ بات پورے اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ سرکاری اعداد و شمار نے اس پورے معاملے کی سنگینی کو بہت ہی ہلکا کر کے پیش کیا ہے۔

وبا کے دوران جہاں لوگ مر رہے تھے وہیں سرکار یہ بیان چلا رہی تھی کہ کورونا وائرس کو کنٹرول کرنے میں ملک کے وزیر اعظم نریندر مودی نے بے نظیر کام کیا ہے۔ حکومت کی پبلک ریلیشن ٹیم نے ان کو عالمی لیڈر بنا کر پیش کیا اور ان کے لیے بڑے سے بڑا انعام دینے کی وکالت کی۔ ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ہم سب کی خواہش ہے کہ ہمارے لیڈر کو دنیا بھر میں پزیرائی حاصل ہو، مگر اس کے لیے انہیں پہلے کام کرنا ہوگا۔ جب کوئی سرکار لوگوں کی فلاح کے لیے کام کرتی ہے تو اس کا اثر زمین پر نظر آتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ موجودہ سرکار کی یہ خام خیالی ہے کہ وہ پبلک ریلیشن ٹیم کی مدد سے دن کو رات اور رات کو دن ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ مگر بزرگوں نے کہا ہے کہ حقیقت پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے، مگر حقیقت کبھی نہ کبھی سامنے آ ہی جاتی ہے۔

کورونا وبا کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے دو سال پہلے پورے ملک میں لاک ڈاؤن لگا دیا گیا۔ اس کا اعلان خود وزیر اعظم نے کیا تھا۔ مگر تیاری کے نام پر کچھ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ ملک گیر لاک ڈاؤن کی وجہ سے لوگوں کی نوکریاں گئیں۔ جو جہاں تھے وہ وہاں پھنس گئے۔ جن کے پاس کھانے اور پینے کے لیے پیسہ نہیں تھا وہ بھوک

> ”
>
> پہلے بھی موجودہ حکومت پر یہ الزام لگتا رہا ہے کہ وہ اعداد و شمار کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی ہے۔ اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے، وہ اعداد و شمار کو اپنے مطابق بدل کر پیش کرتی ہے۔ مگر سرکار اپنے موقف پر اڑی ہوئی ہے اور یہ کہہ رہی ہے کہ ڈبلیو ایچ او کی رپورٹ نے غلط طریقہ کار کا استعمال کیا ہے۔

اور پیاس سے مرنے لگے۔ جن مزدوروں نے بڑے شہروں کو اپنے خون پسینے سے بنایا تھا، وہی شہر ان کے لیے اجنبی بن گئے۔ کرایہ نہ دینے کی وجہ سے مکان مالک انہیں گھر سے نکالنے لگے۔ پولیس فٹ پاتھ پر سبزی اور پھل بیچنے والوں کے سر پر ڈنڈے برسانے لگی۔ ماسک نہ پہننے کے نام پر داروغہ گیری شروع ہوئی، جو اب تک جاری ہے۔ جرمانہ کے نام پر غریبوں سے پیسے اینٹھے گئے۔ مگر دیش کا سب سے بڑا لیڈر لوگوں کو راحت دینے کے بجائے، ان سے تھالی بجواتا رہا۔ ان دنوں تو ہم پرستی بھی بڑھی اور کورونا کا علاج گوبر میں تلاش کیا جانے لگا۔ جسمانی دوری بنانے کی جگہ سماجی دوری بننے لگی۔ بڑے لوگ غریب اور پسماندہ ذاتوں کے ساتھ تعصب برتنے لگے۔

مزدوروں کی حالت اور بھی خراب تھی۔ جب کوئی سہارا نظر نہیں آیا تو وہ پیدل ہی اپنے اپنے گھروں کی طرف نکلنے لگے۔ بڑے شہروں میں کام کرنے والے زیادہ تر مہاجر مزدور بہار، جھارکھنڈ، اتر پردیش، اوڈیشہ، مدھیہ پردیش، بنگال سے آتے ہیں۔ ان مزدوروں میں زیادہ تر دلت، آدی واسی، پسماندہ طبقات اور مسلمان ہیں۔ بھوک، پیاس کی حالت میں مزدوروں کو ہزار میلوں کا سفر پیدل ہی طے کرنا پڑا۔ راہ میں ان کو پانی دینے کا بھی انتظام سرکار نے نہیں کیا تھا، مگر ان پر ڈنڈے برسانے کے لیے پولیس کو ضرور کھڑا کر دیا تھا۔ کچھ آدی واسی مزدور تو ریل کی پٹری پر کٹ کر مر گئے۔ کچھ بھوک اور پیاس سے راستہ میں گر پڑے۔ کچھ گھر جا کر بیمار ہو گئے۔ کچھ نے بیماری سے دم توڑ دیا۔ اس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے کہ وبا کے دوران مہاجر مزدوروں کی زندگی پر کس حد تک منفی اثر پڑا۔

یہ بات ذہن سے غائب نہیں ہوئی ہے کہ بھارت میں کورونا وبا کا مذہب تلاش کر لیا گیا۔ حکومت کے اشارہ پر میڈیا نے یہ افواہ پھیلائی کہ کورونا وبا کے لیے مسلمان ذمہ دار ہیں۔ دہلی واقع تبلیغی جماعت کے دفتر پر پولیس کا ریڈ پڑا۔ عقیدت مندوں کو جیل بھی جانا پڑا۔ دیش بھر میں اس بیان کو پھیلایا گیا کہ سرکار نے تو کورونا پر قابو پا لیا تھا، مگر تبلیغی جماعت کے کارکنان نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ انہوں نے احتیاط نہیں برتی، جس کی وجہ سے بیماری پھیل گئی ہے۔ ہندی میڈیا نے اس پورے معاملہ کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا اور کہا کہ مسلمان کورونا جہاد کر رہے ہیں۔ کچھ صحافیوں نے تو یہاں تک کہا کہ کورونا وبا میں مبتلا تبلیغی جماعت کے کارکنان اسپتال میں ڈاکٹر اور نرس کے ساتھ بدسلوکی کر رہے ہیں اور وہ کھانے میں مسالہ دار بریانی اور گوشت کی ضد کر رہے ہیں۔ کچھ ہی لمحات میں مسلمان، وبا، جہاد، جہالت، جہاد اور غیر ذمہ دارانہ اعمال کو ایک ساتھ جوڑ دیا گیا۔ مگر جھوٹ تو جھوٹ ہی ہے۔ بعد کے دنوں میں بامبے ہائی کورٹ نے کہا کہ تبلیغی جماعت کو بلی کا بکرا بنایا گیا تھا۔

سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ سرکار نے کبھی اپنی بد انتظامی اور ناکامی کو قبول نہیں کیا۔ نہ ہی اس نے اپنی غلطیوں سے کبھی کچھ سیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے کبھی بنیادی نظام اور خدمات کو ٹھیک کرنے کی سنجیدہ پہل نہیں کی۔ جب مارچ ۲۰۲۰ میں پہلا لاک ڈاؤن لگا تھا اس سے کچھ دن پہلے تک لیڈر بڑے بڑے جلسے کرتے رہے۔ فروری ۲۰۲۰ میں مودی نے گجرات کے ایک اسٹیڈیم میں لاکھوں کا ہجوم جمع کر کے تب کے امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کا استقبال کیا۔ جب سردی میں کورونا کے معاملات کم ہونے لگے، تب یہ پروپیگنڈہ پھیلایا گیا کہ مودی سرکار نے کورونا کو ہرا دیا ہے۔ مگر اگلے سال اپریل اور مئی میں کورونا اس قدر قہر بن کر آیا کہ لاشیں ندیوں میں تیرنے لگیں۔ قبرستانوں اور شمشانوں میں آخری رسوم کو انجام دینے کے لیے جگہ نہیں بچی تھی۔

سرکار کو یہ بات اب بھی سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ ایک فرد کی صحت دوسروں کی صحت سے جڑی ہوئی ہے۔ صحت عامہ تجارت کی چیز نہیں بنائی جا سکتی لیکن پرائیوٹ اسپتال کے دروازے عام انسانوں کے لیے بند ہیں۔ سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر فیس نہیں لیتے مگر ٹیسٹ کے نام پر ان سے موٹی رقم وصول کی جا رہی ہے۔ دوا اور سوئی کے لیے الگ سے پیسہ چاہیے۔ کوئی بھی ملک صحت عامہ پر توجہ دیے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

بدانتظامی نے المیہ کو مزید گہرا کر دیا

حکام کی بے حسی، پولس کی بدسلوکی اور غریب عوام کی بے بسی۔ ہزارہا غیر مقامی مزدور سڑکوں پر

لاک ڈاون کی کہانی: پیٹ میں غذا نہیں! ہاتھ میں پیسہ نہیں! اور مدد ابھی پہنچی نہیں!

ابھے کمار، دلی

کورونا وبا اور پولیس کی زیادتی کے درمیان عوام پھنسی ہوئی ہے۔ میڈیا میں مسلسل اس طرح کی خبریں آرہی ہیں کہ ملک گیر سطح پر پولیس لاک ڈاؤن توڑنے کے بہانے عام لوگوں پر ڈنڈے برسا رہی ہے۔ جہاں ایک طرف عوام ضروری اشیا کی قلت سے دوچار ہیں، وہیں دوسری طرف خریداری کے لیے اگر وہ باہر نکلیں تو اس بات کا خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں پولیس ان پر ڈنڈے نہ برسا دے۔ اس بھیانک صورت حال سے امیر لوگ ایک حد تک مقابلہ کر بھی سکتے ہیں مگر مزدور، غریب اور محکوم طبقات، جن کو ہر روز کنواں کھودنا اور پانی نکالنا ہوتا ہے، زندگی اور موت سے لڑ رہے ہیں۔

حکومت کا یہ کہنا بجا ہے کہ عوام زیادہ سے زیادہ وقت اپنے گھروں میں رہیں تاکہ کورونا کے وائرس مزید نہ پھیلے۔ مگر یہ پالیسی کتنی کامیاب ہوگی یہ کہنا مشکل ہے۔ کیوں کہ گھر کے اندر وہی رہ سکتے ہیں جن کے پاس گھر ہیں۔ حکومت سے کون پوچھے کہ بھارت میں لاکھوں لوگوں کو گھر میسر نہیں ہیں اور وہ کھلے آسمان کے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

> **پولیس اور انتظامیہ کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ خود مسلمانوں کی ملی اور مذہبی تنظیمیں لوگوں کو مسجد کے بجائے گھر سے نماز پڑھنے کی اپیل کر رہی ہیں۔ اگر کچھ لوگ ان باتوں سے نا واقف تھے تو ان کو سمجھانے کی ضرورت تھی نہ کہ ان کی جانوروں کی طرح پٹائی کرنے کی؟**

سڑک، فٹ پاتھ، زینہ، بڑے پائپ اور فلائی اوور کے نیچے سونے پر مجبور ہیں۔ ۲۰۱۱ کی مردم شماری کے مطابق، بھارت میں ۱۸ لاکھ لوگ بے گھر ہیں، جن میں ۵۲ فی صد شہروں میں رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ۷ کروڑ سے زیادہ خاندانوں کو صحیح طریقے کے گھر نصیب نہیں ہے۔ ان کے لیے چھت فراہم کرنا تو دور کی بات حکومت نے الٹا ۵۳ ہزار سے زائد گھروں کو سال ۲۰۱۷ میں منہدم کرا دیا، جس سے ۲ لاکھ اور ۶۰ ہزار سے زیادہ لوگ بے گھر ہو گئے۔ یہی نہیں آفت اور تشدد کے دیگر واقعات میں ۲۹ لاکھ لوگ اپنے مکانوں سے اجڑ گئے ہیں۔ گزشتہ دہائیوں میں نام نہاد تجاوزات اور شہر کو خوبصورت بنانے کے نام پر غریبوں کے گھروں کو بلڈوزر چلا کر ملبے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ایسی بہت سی بستیاں ابھی باقی ہیں جن کے اوپر 'ڈیمولیشن' (انہدام) کی تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ جھگی جھونپڑی میں رہنے والوں کے خون اور پسینے سے شہر کے کاروبار اور کارخانے چلتے ہیں، مگر ان کی جھگیوں کو شہر کی زمین پر تجاوزات (غیر ضروری) سمجھا جاتا ہے۔ مگر حکومت اس بات کا جواب نہیں دیتی کہ دہلی میں ۱۲ لاکھ سے زیادہ پرائیویٹ کاریں ہیں، کیا شہر کی زمین پر یہ کاریں encroachment نہیں ہیں؟ عوام کے نشیمن پر پہلے بجلیاں گرا کر، حکام اب کس منہ سے یہ فرمان جاری کر رہے ہیں کہ عوام اپنے گھروں میں بند ہو جائیں؟

اگر غریب اور مزدور لوگ گھروں کے اندر بند ہو بھی جائیں تو وہ کھائیں گے کیا؟ حکومت کو بخوبی معلوم ہے کہ ملک کے زیادہ تر مزدور 'غیر منظم شعبہ' میں کام کرتے ہیں جہاں ان کو کسی طرح کے سماجی تحفظات دستیاب نہیں ہیں۔ نہ صرف ان کو مزدوری کم ملتی ہے، بلکہ ان کے لیے رہائش گاہ، بچوں کے لیے تعلیم، صحت سے متعلق سہولتیں، پنشن وغیرہ کچھ نہیں ملتا۔ مالک کی مرضی سے ان کو نوکری پر رکھا جاتا ہے اور باہر کر دیا جاتا ہے۔ ان سے کام بھی آٹھ گھنٹوں سے کہیں زیادہ لیا جاتا ہے۔ اگر حکومت ان مزدوروں کو یہ ہدایت دے رہی ہے کہ وہ گھروں میں رہیں تو اسے ان کے کھانے کا بھی تو انتظام کرنا چاہیے۔ ورنہ کورونا وائرس سے پہلے ہی وہ بھوک سے مر جائیں گے۔ مگر ابھی بھی حکومت ان غریبوں کی مدد کے لیے سامنے نہیں آئی ہے۔ نام نہاد کچھ راحتی پیکیج کا اعلان کیا گیا ہے مگر اس کے فائدے زمین پر اترتے نہیں دکھائی دیتے۔ حکومت امدادی کاموں سے پیچھے چلی گئی ہے اور خاکی وردی والوں کو سامنے لا کر اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو چکی ہے۔ مگر پولیس بھی ان کی مدد کرنے کے بجائے ان پر قہر برپا رہی ہے۔

جو لوگ بڑے شہروں میں محنت اور مزدوری کرا کے اپنا پیٹ بھرتے تھے وہ آج روٹی کے لیے محتاج ہو گئے ہیں۔ جس شہر کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا اور اپنے خون پسینے سے سینچا تھا، آج وہ شہر ان کو اکیلا مرنے کے لیے چھوڑ چکا ہے۔ حالات کے ماروں کے پاس اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ اپنے وطن کو لوٹ جائیں۔ مگر ان کا وطن بھی تو بہت دور ہے۔ ریل بند ہو گئی ہے بسیں بند ہو گئی ہیں۔ اس پریشانی کے عالم میں بہت سارے لوگوں نے پیدل ہی سفر طے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو لوگ نکل پڑے وہ بھی راستے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پولیس الٹا ان پر ڈنڈے برسا رہی ہے۔ مزدوروں اور مسافروں پر پولیس زیادتی کی خبریں کئی ریاستوں سے آرہی ہیں۔ ہر طرف پولیس انہیں راستے میں روک کر مار رہی ہے اور ان کو آگے جانے سے منع کر رہی ہے۔

جو لوگ ابھی بھی شہر میں موجود ہیں ان کی حالت بھی بہت خراب ہے۔ ان کے سامنے فاقہ کشی منہ کھولے کھڑی ہے۔ ایسے لوگوں کو حکومت کی طرف سے مدد ملنی چاہیے تھی اور ان کے لیے کھانے کا انتظام ہونا چاہیے تھا۔ مگر ایسا کچھ بھی ہوتا نظر نہیں آرہا ہے۔ جب وہ کچھ خریدنے کے لیے باہر نکلتے ہیں تو الٹا پولیس ان پر زیادتی کرتی ہے اور ان کو مارتی پیٹتی ہے۔ ان کو کورونا وائرس کے خلاف چل رہے لاک ڈاؤن توڑنے کا قصوروار سمجھ کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ پولیس اور حکام کی یہ مزدور اور غریب مخالف ذہنیت دیکھیے کہ وہ ہر مزدور کو کورونا کے وائرس سے متاثرہ مریض سمجھتی ہے اور اسے سماج کے لیے خطرہ تصور کرتی ہے۔ مگر اس طرح کا رویہ وہ امیروں کے خلاف اختیار نہیں کرتی۔ حالانکہ یہ بیماری امیر اور غریب میں فرق نہیں کرتی اور آج اس کی زد میں سبھی آئے ہوئے ہیں۔ بہت سارے بڑے لوگ جو کورونا وائرس کی بیماری میں مبتلا بھی پائے گئے تھے انہوں نے بڑی پارٹیاں بھی کیں لیکن ان کے اوپر اس طرح کی کوئی پابندی نہیں دیکھی گئی، جس طرح کی پابندیاں مزدوروں کے اوپر لگائی جا رہی ہیں۔ یہ سب سماج میں موجود طبقاتی تعصب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہفتے بھر سے جاری اس لاک ڈاؤن میں مزدور اور مسافر کے علاوہ، ٹھیلا اور فٹ پاتھ پر دکان لگانے والے سبزی اور میوہ فروش بھی پولیس کے ڈنڈوں کے شکار بنے ہیں۔ پانی، ایل پی جی، خوردنی اشیا کی سپلائی کرنے والے لوگ، گوشت فروش بھی پولیس کے ظلم کا شکار بنے ہیں۔ رہائشی علاقوں میں جو لوگ غریب ہیں یا جن کے گھر شمال مشرقی ریاستوں میں ہیں ان کو بھی ٹارگیٹ کیا جا رہا ہے۔ پولیس رہائشی علاقوں کے باشندوں کے ساتھ برا سلوک کر رہی ہے۔ بعض اوقات مشتبہ مریضوں کے ساتھ بھی انتہائی غیر انسانی طریقوں سے سلوک کیا جا رہا ہے۔ یہ سب دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ملک کی پولیس اپنے قانونی فریضہ کو انجام دینے میں پھر ناکام ہو رہی ہے۔ ان کے اندر تعصب اس قدر بھرا ہوا ہے کہ ان کی نگاہ میں مزدور، غریب اور محکوم طبقے سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی حیثیت دوئم درجے کی شہریوں کی ہے۔ پولیس اصلاحات کی بات برسوں سے ہو رہی ہے مگر آج بھی یہ صرف کاغذوں اور کمیشن کی رپورٹوں تک کی محدود ہے۔ جمہوری ملک میں پولیس کا غیر جمہوری طرزِ عمل مناسب نہیں ہے۔ مزدوروں کے درمیان کام کرنے والی تنظیم مزدور بگل نے سرحد پر پھنسے اور پولیس کی زیادتی جھیل رہے کچھ مزدوروں کا حال ایک ویڈیو کے ذریعے سامنے لایا ہے۔ ۲۷ مارچ کو رات ۱۱ بجے بگل نے دو ویڈیوز مزدور کے فیس بک پیج پر پوسٹ کیے۔ ان میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ درجنوں مزدور دہلی اور اتر پردیش کی سرحد کالیندی کونج کے پاس پولیس کے ڈنڈوں سے چوٹ کھا کر وہیں رکے ہوئے تھے۔ بارش نے ان بے گھروں کے حالات کو مزید بگاڑ دیا۔ مزدوروں نے اپنی حال زار کچھ یوں بیان کی: "پولیس ڈنڈے سے مار رہی ہے اور ہمیں واپس کر رہی ہے"۔ مزدوروں نے یہ بھی کہا کہ وہ کئی گھنٹوں سے کچھ نہیں کھائے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ کسی طرح گھر لوٹ جائیں۔ ان میں ایک مزدور نے کہا کہ "پولیس بارڈر پار نہیں کرنے دے رہی ہے۔ پولیس والے مار رہے ہیں اور بھگا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آگے نہیں جانے دیں گے"۔ مزدوروں میں بھی سب سے زیادہ تشویشناک حالت خواتین اور بچوں کی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ خواتین مزدور سرحد پر روک لی گئی ہیں۔ "یہاں بھی پولیس بارڈر کراس کرنے نہیں دے رہی ہے"۔ خواتین مزدور کے پاس کھڑے ایک نوجوان مزدور سے جب یہ پوچھا گیا کہ بارش ہو رہی ہے آپ اس وقت کہاں جائیں گے؟ آپ بے گھروں کے لیے بنے شیلٹر میں کیوں نہیں گئے؟ تو ان کا جواب تھا "معلوم نہیں ہے۔ پولیس والوں نے کچھ نہیں بتلایا"۔ خواتین مزدور خاموشی کے ساتھ کھڑی تھیں اور سب کچھ سن رہی تھیں۔ ان کے پاس دو ننھے بچے ماسک لگائے کھڑے تھے۔ ان کے قریب کھڑی ایک اور خاتون اپنی جھنجھلاہٹ کو روک نہیں پائی اور بولی کہ "میرا راشن کارڈ یوپی کا ہے مجھے گروگرام میں راشن کیسے ملے گا؟"

اس طرح کی خبریں بھی آئی ہیں کہ پولیس نے سڑک سے گزر رہے غریب لوگوں کو سزا کے طور کہا کہ وہ اپنے بیگ کو پیٹھ پر رکھ کر مرغا اور مینڈک کی طرح کودتے رہیں۔ بعد میں بدایوں کے ایس ایس پی نے اس واقعے کی تفتیش کا حکم جاری کیا ہے۔

آسام میں بھی پولیس نے شہریوں کو بری طرح پیٹا۔ ۲۵ مارچ کے انڈیا ٹوڈے میں شائع شدہ ایک خبر کے مطابق کریم گنج، نلباری، کامروپ اور ناگاؤں میں پولیس نے امتناعی احکام کی خلاف ورزی کے الزام میں لاٹھی چارج کیا۔ بہت سارے لوگوں کو حراست میں بھی لیا گیا اور بعد میں چھوڑ دیا گیا۔ ۲۶ جنوری کے 'اکنامک ٹائمز' میں شائع ایک خبر میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ کرناٹک کے بلگام کی ایک مسجد میں پولیس نے نمازیوں کو ڈنڈے سے بری طرح پیٹا۔ اس خبر کے ساتھ اپ لوڈ کی گئی ایک ویڈیو میں پولیس کی زیادتی کھل کر سامنے آئی ہے۔ پولیس مسجد کی گیٹ پر ڈنڈے لے کر کھڑی تھی اور جیسے ہی نمازی باہر نکل رہے تھے وہ ان پر ڈنڈے برسا رہی تھی۔ لوگ افرا تفری میں بھاگ رہے ہیں۔ بہت کم ہی ایسے لوگ ہوں گے جنہوں نے پولیس کی مار نہ کھائی ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر لوگ لاک ڈاؤن کی ہدایت کے باوجود مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے گیے تھے تو اس کا حل ان کو مارنے اور پیٹنے سے تو نہیں نکل سکتا تھا۔ پولیس کو کون بتلائے کہ اس طرح کی زیادتی سے حالات اور خراب ہو سکتے تھے، اور بھگدڑ مچ سکتی تھی جس میں لوگوں کی جانیں جا سکتی تھیں۔ پولیس اور انتظامیہ کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ خود مسلمانوں کی ملی اور مذہبی تنظیمیں لوگوں کو مسجد کے بجائے گھر سے نماز پڑھنے کی اپیل کر رہی ہیں۔ اگر کچھ لوگ ان باتوں سے ناواقف تھے تو ان کو سمجھانے کی ضرورت تھی نہ کہ ان کی جانوروں کی طرح پٹائی کرنے کی؟۔ آج کل تو جانوروں کو بھی مارنے کے خلاف لوگوں کے اندر حساسیت پیدا کی جا رہی ہے۔ آندھرا پردیش سے بھی پولیس زیادتی کی خبر موصول ہوئی ہے۔ ۲۷ مارچ کے روز 'ہندو' اخبار نے وجے واڑہ سے ایک دردناک واقعہ منظر عام پر لایا ہے، جس میں پولیس والے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر لوگوں کا پیچھا کر رہے تھے اور انہیں بڑی بے رحمی سے پیٹ رہے تھے۔ اس سے متعلق ایک ویڈیو بھی سوشل میڈیا پر وائرل ہوا ہے جس کو دیکھ کر لوگوں میں اس بات کا غصہ ہے کہ بحران کے وقت بھی پولیس، لوگوں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آرہی ہے۔ اسی طرح ضلع کرنول میں بھی پولیس ایک نوجوان کا پیچھا کر رہی تھی۔ نوجوان پولیس کی مار سے بچنے کے دوران ایک گڑھے میں گر پڑا جس سے اس کی موت ہو گئی۔ بہت سارے وائرل ویڈیوز میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ لاٹھی پکڑی ہوئی پولیس کس طرح لوگوں کو پکڑ پکڑ کر مار رہی ہے۔ ان سب کو دیکھ کر عوام دہشت میں ہیں۔ یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ اعلی افسران پولیس کو ان زیادتیوں کو روکنے کے بجائے خود اپنے ہاتھوں سے عوام کو سرِ عام مار رہے ہیں۔ ایک ڈی ایس پی نے عوام کو اس وقت مارا جب وہ ضروری اشیا کی خریداری کرنے لیے سڑک پر نکلے تھے۔

ایک رپورٹ کے مطابق بہار میں پولیس نے ایک ٹرک ڈرائیور سونو شاہ کے پیر میں گولی مار دی۔ مقامی پولیس کی اس سے ناراضگی اس بات سے تھی کہ وہ ان کو رشوت نہیں دے رہا تھا۔ "مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنی گاڑی کو پولیس تھانے میں لے چلوں۔ پھر پولیس نے خود اشارہ کیا کہ اگر میں ۵ ہزار روپیے رشوت دے دوں تو معاملہ رفع دفع ہو جائے گا" شاہ نے کہا جو کہ اسپتال میں زیر علاج ہے۔ وہ پٹنہ میں آلو سپلائی کیا کرتا ہے۔ خبر ہے کہ اس کے پیر میں گولی مارنے والے پولیس کانسٹیبل کو معطل کر دیا گیا ہے۔ ۲۷/مارچ کے روز پونے سے آئی ایک اور خبر میں ایمبولینس چلا رہے ۴۹ سالہ ایک ڈرائیور کو پولیس نے اس قدر پیٹا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لا کر جمعہ کے روز دم توڑ گیا۔ پولیس کارروائی کے دفاع میں یہ کہا جا رہا ہے کہ پولیس کو یہ لگا کہ یہ ڈرائیور اپنی گاڑی میں مسافروں کو لے جا رہا تھا۔ اگر واقعی یہ بات درست ہے تب بھی کیا پولیس کا رویہ درست قرار پائے گا؟ اس واقعے کی جانچ کے احکام دے دیے گئے ہیں۔ دریں اثنا ہماچل پردیش کے شہر دھرم سالا سے بھی عوام نے پولیس زیادتی کی شکایت کی ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر کے مطابق ریاستی پولیس ہیڈ کوارٹرز میں ایک شکایت درج کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ پولیس نے ایک سماجی جہد کار کو 'کورونا کا مریض' کہہ کر اس کی بے عزتی کی۔ یہ واقعہ بدھ کے روز رنما ہوا جب ایک پولیس انسپکٹر (جوالا مکھی ٹمپل ٹاؤن پولیس تھانہ کا ملازم ہے) نے مذکورہ سوشل جہد کار کو کورونا وائرس کا مریض قرار دیتے ہوئے بری طرح سے دھمکایا۔ کورونا وبا کے بعد پولیس والے ہی نہیں بلکہ سماج میں بہت سارے ایسے لوگ جو چھوت چھات میں یقین رکھتے ہیں ان کو اپنی غیر انسانی اور غیر مساوی رواج کو جائز قرار دینے کا ایک بہانہ مل گیا ہے۔ بھگوا عناصر سے تعلق رکھنے والے بہت سارے چھوٹے اور بڑے لیڈر اس طرح کی افواہ پھیلا رہے ہیں کہ برہمنی نظام (جو چھوت چھات کو جائز ٹھہراتا ہے) بیماریوں کو روکنے کے لیے مصافحہ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کرنے کو درست سمجھتا ہے اور یہ نظام زیادہ سائنٹفک ہے جسے اب دینا تسلیم کر رہی ہے! اس طرح کی افواہیں آج کل بہت زیادہ سوشل میڈیا میں گشت کر رہی ہیں۔ مثلاً دار الحکومت دہلی میں شمال مشرقی ریاستوں سے آنے والے لوگوں کے خلاف نسلی تعصب کے واقعات کافی بڑھ گئے ہیں۔

سلسلہ صفحہ نمبر ۱۰

دفتر شاہی بھی ہوئی سوشل میڈیا کی رسیا!

آئی اے ایس۔ آئی پی ایس عہدیداروں میں عوام سے جڑنے کا رجحان بڑھ رہا ہے

میکس ویبر نے بیوروکریسی (افسر شاہی) کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیوروکریٹس (افسر) کی شخصیت پیچھے رہتی ہے اور اس کا کام آگے رہتا ہے۔ لیکن اب شخصیت پیچھے نہیں رہ سکتی کیوں کہ سوشیل میڈیا نے پرسنل اور پروفیشنل چیزوں کو تقریباً ایک مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔

سوشیل میڈیا پر نہ صرف وزیر اعظم نریندر مودی اور ملک کے تمام وزرائے اعلیٰ افعال رہتے ہیں بلکہ انتظامیہ کے عہدیدار بھی زبردست طریقے سے اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ نوکر شاہی کے سوشیل میڈیا پر ایکٹیو ہونے سے کئی طرح کے رد عمل سامنے آئے ہیں۔ ملک و دنیا کے بدلتے حالات میں افسر بھی لگاتار خود کو بدل رہے ہیں۔ حالاں کہ میکس ویبر نے بیوروکریسی (افسر شاہی) کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ بیوروکریٹس (افسر) کی شخصیت پیچھے رہتی ہے اور اس کا کام آگے رہتا ہے۔ لیکن اب شخصیت پیچھے نہیں رہ سکتی کیوں کہ سوشیل میڈیا نے پرسنل اور پروفیشنل چیزوں کو تقریباً ایک مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ نوکر شاہوں کو شخصیت کے تمام پہلو سوشیل میڈیا پر اجاگر ہونے سے ایک طریقے سے عوام جڑ بھی رہی ہے اور دوسرے طریقے سے نوکری کے سیاسی ہونے کا بھی ثبوت مل رہا ہے۔ جیسے وہ انسٹا گرام پر کسی با اثر افراد کی طرح کام کر رہے ہیں تو کسی ٹوئٹر پر ٹرول یا بے کار کی باتیں پھیلانے والے کی طرح ٹوئٹ کر رہے ہیں۔

"میم شیئر" کرنا یعنی خود کے بارے میں پوسٹ کرنا افسر شاہوں کا کام ہے یا آئی ٹی سیل کا؟

(میم یونانی لفظ می مے ما کا مخفف ہے جس کے معنی نقل کرنا ہے۔ سوشیل میڈیا میں خیالات اور روایات کو شیئر کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) کچھ دن پہلے ہریانہ کیڈر کے آئی پی ایس عہدیدار پنکج نین نے تحفظات کو لے کر ایک میم شیئر کیا تھا۔ اس ٹویٹ کو ۴۳ ہزار سے زیادہ لوگوں نے پسند کیا اور ۱۳ ہزار سے زیادہ لوگوں نے ریٹوئٹ کیا۔ اس ٹویٹ پر کچھ اس طرح کے تبصرے آئے۔ کیا آپ کوئی ٹرول ہیں؟ حالانکہ پنکج کی زیادہ تر پوسٹ معلوماتی ہوتی ہے لیکن کورونا وائرس کی وجہ سے لاک ڈاون کے دوران ان کے ایک اور پوسٹ پر بھی تنقید ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے ٹویٹ ڈیلیٹ کر دی۔

ایک دوسرے نوجوان عہدیدار پراون مہاراج اکثر حزب مخالف پارٹیوں سے متعلق معاملے کو سمجھاتے اور برسر اقتدار پارٹی سے وابستہ لوگوں کو ری ٹیویٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ حزب مخالف لیڈروں کو بھی جواب دیتے ہیں کہ کیسی سیاست نہیں کرنی چاہیے۔ عہدیداروں کے پوسٹ پر آئے تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بیورکریٹس کو ٹرول آرمی کے عہدیدار کی طرح دیکھتے ہیں۔

ملک کے باباؤں کے سوشیل میڈیا پر روابط کے تعلق سے ایک اعلیٰ افسر کہتے ہیں، عہدیداروں کو ہی وہ لائن کھینچنی پڑے گی جہاں وہ ٹرول آرمی کو ایک فوجی کی طرح نظر نہ آئے۔ ایسے واسطے کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا پڑے گا۔

سوشیل میڈیا پر اپنے خیالات رکھنے کے سوال پر ایک دوسرے عہدیدار بتاتے ہیں، یس بینک کے معاملے پر میں نے ایک ٹویٹ کیا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اسے ڈلیٹ کر دیا۔ میں سوچنے لگا کی کہیں اسے سیاسی رنگ نہ دیا جائے۔ بیوروکریٹس عوام اور دستور کے تئیں ذمہ دار ہیں۔ ہم ٹوئٹر جیسے رابطے کو تفریح کے لیے استعمال نہیں کر سکتے۔

چھتیس گڑھ کے بلاسپور ضلع کے آئی جی دپانشو کابرا کہتے ہیں، سوشیل میڈیا کے ذریعے آپ لائن میں کھڑے آخری شخص سے بھی جڑ سکتے ہیں۔ ٹوئٹر جیسا طاقتور ذریعہ معلومات حاصل کرنے اور دوسروں کو فراہم کرنے میں کتنا موثر ثابت ہو سکتا ہے، دپانشو اپنی خود کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں، کئی ضلعوں میں لوگوں نے ٹوئٹر آئی ڈی بنائی تاکہ وہ ہم تک میسیج آسانی سے پہنچا سکیں۔

دیپانشو اپنے ٹوئٹر پر اکثر فیلڈ ورک، گھر میں پوجا پاٹھ اور ضروری نوٹیفکیشن کی تصویریں شیئر کرتے ہیں۔ دپانشو کے ہی بیاچ کے دوسرے آئی پی ایس عہدیدار اربترا پچھلے سال ہی ٹوئٹر پر ایکٹیو ہوئے تھے۔ ان کے ٹویٹ اکثر وائرل ہوتے ہیں۔ وہ سال ۲۰۱۹ کے اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہوئے نظر آرہے ہیں کی ٹویٹر پر انٹلیکچویل بحث ہوتی ہے اور معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں ارون نے ایک ٹویٹ کیا جہاں وہ رپورٹرس کو کورونا وائرس کے مریضوں سے انٹرویو لینے کی بات کہہ رہے تھے۔ اس پوسٹ پر ایک خاتون صحافی نے انھیں بے وقوف کہا۔ اس پر ارون کہتے ہیں، ٹویٹر پر فوری لوگوں کو غلط سمجھا جا سکتا ہے۔ عہدیداروں کے لیے ٹوئٹر عوام سے جڑنے کا سب سے تیز ذریعہ ہے۔ اس کی مدد سے کچھ دن پہلے ایک بچے کی اسکول بس کا مسئلہ آدھے گھنٹے میں حل ہو گیا جو کہ عوام کو ناممکن لگ رہا تھا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ اگر آپ کے جوابات افواہ ہیں تو فالوورس بڑھ جاتے ہیں جو آپ کو کہیں بھی ٹیگ کرنے لگتے ہیں۔ میں ٹویٹر کو ایک پاورفل اور طاقتور پلیٹ فارم سمجھتا ہوں۔ میں نے ٹویٹر گورنرس پر ایک ٹاک بھی دیا ہے۔

ارون کے بیاچ کے ایک عہدیدار نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتاتے ہیں، ارون شروع سے ہی حاضر جواب رہے ہیں اور مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اس لیے کئی بار ان کی حاضر جوابی الٹی بھی پڑ جاتی ہے اور لوگ شبیہ بنا لیتے ہیں۔ یہ عہدیدار کہتے ہیں کہ ٹویٹر پر میم شیئر کرنے سے شروعات ہوتی ہے اور آپ ٹرولس کی ایک آرمی کے بیچ پھنس جاتے ہیں۔ وہ آپ کو یہ کہہ کر دھوکے میں رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے بہت بڑے فین ہیں گویا کہ آپ کوئی بڑے فلم اسٹار ہوں۔ لیکن سچائی یہ ہے کہ ہم سسٹم کی بیک بون یا ریڑھ کی ہڈی ہیں جو پردے کے پیچھے کام کرتے ہیں۔

(بشکریہ: دی پرنٹ)

☆☆☆

بد انتظامی نے المیہ کو مزید گہرا کر دیا

بسلسلہ صفحہ نمبر ۳ سے آگے

بدھ کے روز دہلی یونیورسٹی سے متصل وجے نگر علاقے میں ۴۰ سالہ عمر کے ایک شخص نے ایک شمال مشرقی ریاست کی خاتون کو دیکھ کر اسے کورونا وائرس کہا اور اس کے اوپر تھوکا بھی۔ بعد میں اس شخص کی گرفتاری کر لی گئی ہے۔ کٹک سے بھی پولیس کی زیادتی کی خبریں آرہی ہیں۔ مقامی لوگوں نے الزام لگایا ہے کہ پولیس ان کو اس وقت بھی پریشان کی تھی جب وہ ضروری اشیا خریدنے کے لیے اپنے گھر سے نکل رہے تھے۔ تاجروں نے بھی پولیس زیادتی کی شکایت کی ہے اور کہا ہے کہ ان کو اپنی دکان کھولنے کے دوران بھی ہراساں کیا جا رہا ہے۔

جہاں ایک طرف سرکار یہ کہہ رہی ہے کہ عوام کی ضرورت کی تمام اشیا مہیا کرائی جائیں گی اور کوئی بھی ذخیرہ اندوزی نہیں کرے گا وہیں دوسری طرف ان چیزوں کی سپلائی کرنے والوں نے قومی راجدھانی دہلی میں یہ الزام لگایا ہے کہ پولیس ان کے کام میں رکاوٹیں کھڑی کر رہی ہے۔ ۲۷ مارچ کے 'ہندوستان ٹائمز' میں شائع ایک خبر کے مطابق، ایل پی جی، پانی پہنچانے والے اور گوشت کے دکانداروں نے پولیس زیادتی کا الزام لگایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچانک مہنگائی بڑھ گئی ہے۔

گھروں والے تو جیسے تیسے گھروں میں بند رہ کر گزارا کر لیں گے لیکن ان کا کیا جن کے پاس نہ گھر ہے نہ آسرا؟

مثال کے طور پر دہلی میں ۲۰ روپے فی کیلو بکنے والا آلو پچاس روپے کیلو بک رہا ہے، جبکہ جار میں سپلائی کیا جانے والا پانی دکانوں میں دستیاب نہیں ہے جس سے عوام کافی پریشان ہے۔

کچھ اسی طرح نویڈا میں سبزی فروشوں کے اوپر پولیس قہر بن کر ٹوٹی ہے۔ ۲۸ مارچ کی 'بی بی سی' کی ایک رپورٹ کے مطابق، سریش شاہ اور ان کے بھائی رمیش شاہ، جو نویڈا کے آس پاس گزشتہ ۱۵ سالوں سے سبزی فروخت کر رہے ہیں، پولیس کی زیادتی کا شکار ہوئے۔ سریش کو اس قدر چوٹ آئی ہے کہ وہ اب بھی ٹھیک سے بیٹھ نہیں پا رہا ہے۔ جیسے ہی دونوں بھائیوں نے صبح صبح ٹھیلے گاڑی پر سبزی رکھی اور بیچنے کے لیے آگے بڑھے پولیس والوں نے ان کے پاس آکر گالیاں دینی شروع کیں۔ سریش اس سے پہلے کہ پولیس والوں کو کچھ سمجھا پاتا لاٹھی کی مار اس پر پڑ گئی۔ اسے پولیس والوں نے کئی بار ڈنڈے سے مارا اور اسے بھاگنے پر مجبور کیا۔ پولیس کی اس زیادتی کی وجہ سے وہ اپنی سبزی نہیں بیچ سکا اور اس کا اس دن ۳ ہزار روپے کا نقصان ہوا۔ "مجھے اس قدر بری طرح مارا گیا کہ آج مجھے بیٹھنے میں دقت ہو رہی ہے۔ اس سے بھی زیادہ میرے لیے نقصان دہ بات میرا کاروبار ہے جس سے میں ایک روز میں ۳۰۰ روپیے کما لیتا تھا" سریش نے کہا۔ صحافی بھی پولیس کی زیادتی کا شکار ہوئے ہیں، جس کے خلاف 'ایڈیٹر گلڈ' نے سخت برہمی کا اظہار کیا ہے۔ ۲۶ مارچ کو روز ایک بیان جاری کرتے ہوئے اس نے کہا کہ پولیس کی زیادتی کی وجہ سے صحافیوں کے کاموں میں خلل پڑ رہا ہے جو کورونا وائرس کے بارے میں رپورٹنگ کر رہے ہیں۔ آخر پولیس کی زیادتوں کی وجہ کیا ہے؟ اور کیسے پولیس کو انسانی حقوق کی پامالی سے روکا جا سکتا ہے؟ ماضی میں بہت ساری کمیشنوں کی رپورٹس کہاں ہیں جن میں پولیس اصلاحات کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا مگر آج تک ان پر عمل نہیں کیا گیا۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ پولیس کا رویہ حکومت بدلنے کے باوجود بھی نہیں بدلتا؟ کیرالا کے سابق ڈی جی پی این سی استھانا ان مسائل کے بارے میں دی وائر میں لکھتے ہیں کہ "یہ اور کچھ نہیں ہے بلکہ عہدوں کا غلط استعمال ہے"۔ انہوں نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ پولیس کی یہ عادت ہے کہ وہ ڈنڈے پہلے چلاتی ہے اور سوالات بعد میں پوچھتی ہے"۔ مگر ایسا بار بار کیوں کیوں ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب وہ کچھ یوں دیتے ہیں: "تاریخی طور پر دیکھا جائے تو ریاست حکمراں کے لیے بنی ہوتی ہے، نہ کہ رعایا کے لیے؟ اسی لیے ریاست کے جتنے بھی ادارے ہیں بالخصوص فوج اور پولیس، ان کا اصل مقصد عوام کو دبانا ہوتا ہے۔ عوام کو باہری خطرات اور جرائم پیشوں سے محفوظ رکھنا ان کی دوسری ترجیح ہوتی ہے"۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے ملک میں طرزِ نظام جمہوریت ضرور اپنایا گیا ہے مگر ملک کے بہت سارے ادارے، بالخصوص پولیس اور فوج آج بھی جمہوری اقدار سے میلوں دور ہیں۔ اگر ان اداروں کو عوام اور ملک کے آئین اور قانون کے سامنے جواب دہ نہیں بنایا گیا تو انسانی حقوق کی پامالی ختم نہیں ہوگی۔ اتر پردیش کے مختلف ضلعوں میں کام کر چکے پولس افسر وبھوتی نرائن رائے نے بھی اپنی کتاب "کمباٹینگ کمیونل کنفلکٹز (۱۹۹۹)" میں پولیس اور انتظامیہ سے اسی جواب دہی کا مطالبہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اکثر بڑے افسران، جن کے دائرے حلقہ میں ناانصافی برتی جاتی ہے، ان سے جواب دہی نہیں کی جاتی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر کوئی کارروائی ہوتی بھی ہے تو وہ نچلی سطح کے پولیس افسران پر ہوتی ہے۔ اکثر معاملوں میں زیادہ سے زیادہ ان کی معطلی ہوتی ہے، جو کچھ ہی دنوں کے بعد جبکہ رائے عامہ کسی اور ایشوز کی طرف مڑ جاتی ہے، رد کر دی جاتی ہے۔ یہی نہیں جو جانچ کمیشن بنتا ہے وہ بھی اپنی رپورٹ دینے میں لمبا وقت لگا دیتا ہے، جس کی وجہ سے عوام کا اعتماد ان کمیشنوں پر کم ہو گیا ہے۔ اس لیے رائے نے ۲۱ جون ۱۹۶۸ کو جاری کی گئی کمیٹی، جس کی تشکیل قومی یکجہتی کونسل نے کی تھی، کی سفارشات کی روشنی میں پولیس کی ناکامیوں کی جواب دہی ضلع کے بڑے افسران جیسے ڈی ایم اور ایس پی پر رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ غور طلب ہے کہ یہ سفارشات فرقہ وارانہ تشدد اور بگڑتے ہوئے نظم وضبط کے چیلنج سے نمٹنے کے غرض سے دی گئی تھیں، مگر ان کی معنویت دیگر معاملوں میں بھی ہے۔ کیا پولیس کی زیادتوں کے لیے بڑے حکام سے ذمہ داری طلب کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے؟

(ابھے کمار نے جے این یو سے پی ایچ ڈی کی ہے)
debatingissues@gmail.com

فکر و نظر

کاؤنٹر کرنٹس: اکیس سالوں سے جاری عوامی صحافت کا یہ سفر

ابھے کمار 19/04/2023

اس نیوز پورٹل کے مدیر اعلیٰ بینو میتھیو کی زندگی صحافتی برادری کے لیے ایک ایک سبق ہے کہ پیسہ، ترقی یا شہرت کبھی بھی اصولوں کا متبادل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ صحافی کو اقتدار کی گلیوں میں جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ عوام کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ادارتی آزادی کو کیسے بچائے رکھا جائے، یہ ان کی پہلی ترجیح ہے۔
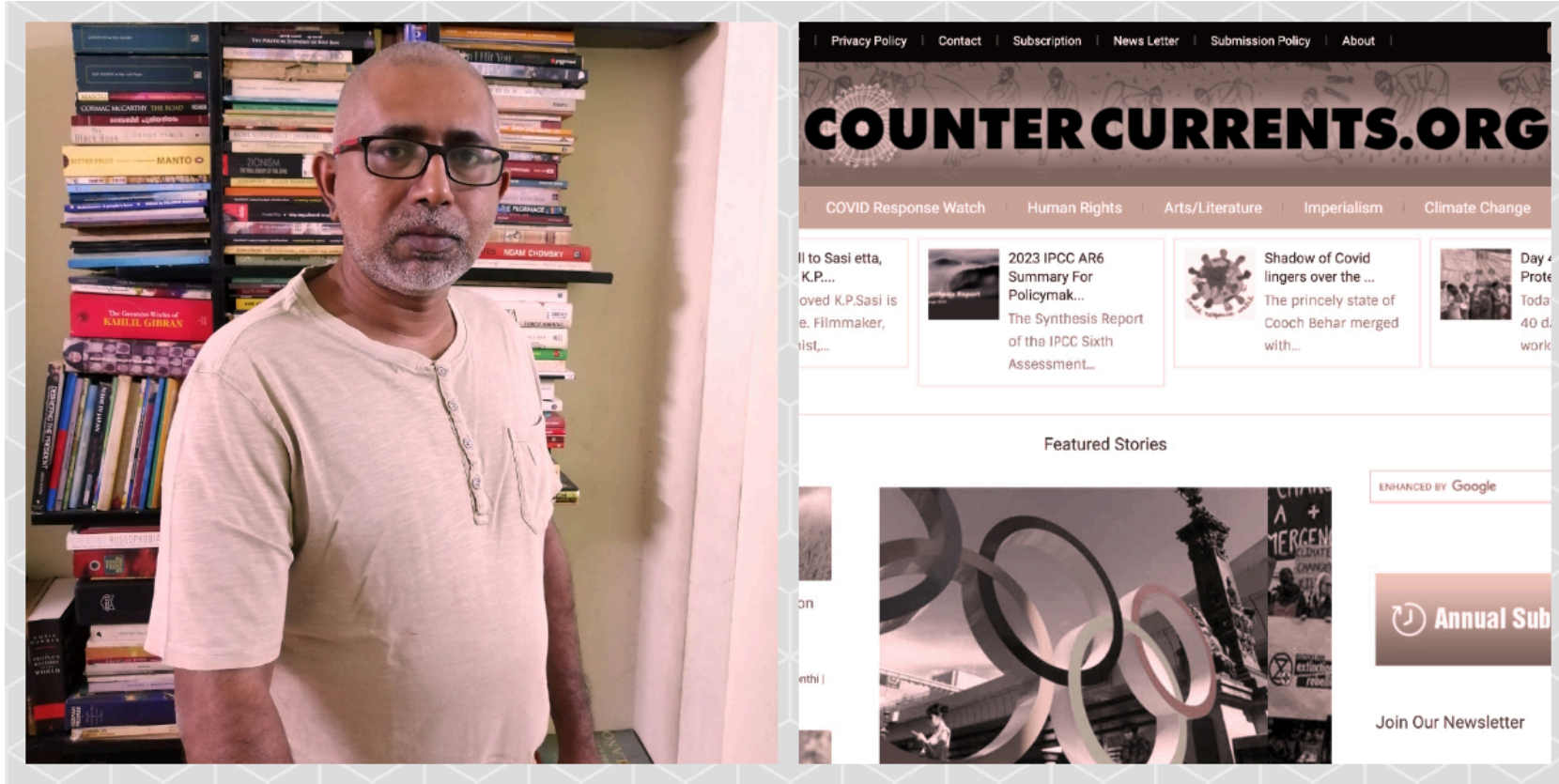
کاؤنٹر کرنٹس کا سرورق اور اس کے مدیر اعلیٰ بینو میتھیو۔

گزشتہ 27مارچ کو 'کاؤنٹر کرنٹس (https://countercurrents.org/)' نام کے ایک متبادل انگریزی نیوز پورٹل نے اپنے سفر کے اکیس سال پورے کیے ہیں۔ بہت سارے قارئین کاؤنٹر کرنٹس ڈاٹ او آر جی (https://countercurrents.org/about/) سے واقف ہوں گے۔ آج یہ نیوز پورٹل اعتماد اور مظلوم طبقات کی آواز بن چکا ہے۔ اس کے قارئین کی تعداد ملین میں ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس کو ہر روز پڑھتے ہیں۔

ہندوستان کے علاوہ، اس کے قاری یورپ، امریکہ، مغربی ایشیا، جنوبی ایشیا، آسٹریلیا اور دیگر ممالک میں موجود ہیں۔ اس ویب سائٹ پر ہزاروں کی تعداد میں خبریں شائع ہو چکی ہیں۔ کاؤنٹر کرنٹس پر شائع شدہ خبریں اور مقالے نہ صرف لوگوں کو معلومات بہم پہنچا رہے ہیں، بلکہ مستقبل کے مؤرخین کے لیے اہم ماخذ بھی محفوظ کر رہے ہیں۔

اس نیوز پورٹل سے بڑے بڑے سماجی کارکنان، ادبا اور صحافیوں کی جماعت جڑی ہوئی ہے۔ اس سفر کے میر کارواں بینو میتھیو ہیں، جو اس نیوز پورٹل کے مدیر اعلیٰ ہیں، ان کی زندگی متبادل میڈیا کی علامت بن چکی ہے۔

آج سے 53 سال پہلے کیرالہ کے پہاڑی اور پسماندہ ضلع اِڈکی میں بینو میتھیو کی پیدائش ایک شامی عیسائی خاندان میں ہوئی تھی۔ ان کے والدین کے 13 بچے تھے، جن میں چھ بیٹے اور سات بیٹیاں شامل ہیں۔ بینو کی ابتدائی تعلیم ملیالم میڈیم سے ہوئی تھی، حالانکہ انہوں نے انگریزی اور ہندی کا مطالعہ بطور دوسری اور تیسری زبان کیا۔

کالج میں بینو نے سائنس کا انتخاب کیا اور وہ بی اے کیمسٹری کے طالبعلم بنے۔ مگر بینو کی دلچسپی درسی کتابوں سے کہیں زیادہ، ادبی اور سماجی موضوعات کی کتابوں میں تھی۔ کالج کے دنوں میں بینو نے دنیا کے کلاسک لٹریچر کے ایک بڑے حصے کو پڑھ ڈالا۔

بینو نے امتحان تو پاس کر لیا، مگر ان کا شمار ایک 'مثالی' طالبعلم میں نہیں ہوتا تھا، کیوں کہ وہ غیر درسی کتابیں پڑھنے کے بڑے شائق تھے۔ ادب سے رغبت نے ان کو انگریزی لٹریچر کے قریب کیا۔ پھر انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔

اس بیچ گھر کے مالی حالات اچھے نہیں تھے، اس لیے گھر واپس لوٹنا پڑا، وہ کھیت میں کام کرنے لگے۔ صبح سے شام تک وہ کام کرتے اور رات کو جب بھی وقت ملتا، تو پڑھنے بیٹھ جاتے۔ انہی دنوں انہوں نے کیرالہ کے ایک مقامی اخبار میں نوکری سے متعلق اشتہار دیکھا اور درخواست ڈال دی۔ اخبار نے ان کو نوکری پر رکھ لیا۔ ان کو خبریں لکھنے کے علاوہ اخبار کے پیج بنانے کی ذمہ داری بھی دی گئی۔ تنخواہ ملنے کے بعد، مالی تنگی دور تو ہوئی، مگر وہ بطور صحافی مطمئن نہیں تھے۔

وہ دیش اور دنیا کے مسائل کو لے کر فکر مند تھے۔ وہ قلم کی طاقت سے دبی ہوئی آواز کو بلند کرنا چاہتے تھے۔ مگر اخبار ان کو خاطر خواہ جگہ فراہم نہیں کر رہا تھا۔ یہیں سے بینو کے دل میں متبادل میڈیا کھڑا کرنے کے آئیڈیا نے جنم لیا۔

یہ بات سن 2000 کے آس پاس کی ہے۔ تب ہندوستان کے کئی حصوں میں انٹرنیٹ پہنچ چکا تھا۔ بینو نے محسوس کیا کہ انٹرنیٹ ایک ایسا وسیلہ ہے، جو دنیا کے لوگوں کو آپس میں جوڑ سکتا ہے۔ ماہر لسانیات، فلسفی اور امریکی پالیسی کے بڑے ناقد نوم چومسکی کے بینو بڑے مداح تھے۔ انٹرنیٹ کی مدد سے اب بینو چومسکی کو براہ راست پڑھنے لگے۔

اسی انٹرنیٹ نے بینو کو دنیا میں رونما ہو رہے بڑے واقعات کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا، بالخصوص، فلسطین کی خبریں وہ انٹرنیت کی مدد سے کافی غور سے پڑھتے۔ انٹرنیٹ کا جادو بینو پر صاف نظر آ رہا تھا۔ بینو نے محسوس کیا کہ وہ بھی انٹرنیٹ کی مدد سے اپنی بات دنیا تک پہنچا سکتے ہیں۔

اسی اثنا میں گجرات میں مسلم مخالف فسادات رونما ہوئے۔ بینو اور ان کے دیگر ساتھی اقلیتوں کے اوپر ہو رہے حملے سے کافی مضطرب تھے۔ وہ اس ظلمت کے دور میں بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے؟ اس پس منظر میں، 27 مارچ 2002 کو کاؤنٹر کرنٹس نیوز پورٹل انٹرنیٹ پر لانچ ہوا۔

مگر اس کے لیے بینو نے بینک سے 42 ہزار روپے قرض لیے اور ایک کمپیوٹر خریدا۔ کاؤنٹر کرنٹس پر پہلی خبر گجرات فساد میں مارے گیے ایک حاملہ مسلم خاتون سے متعلق تھی۔ یہ مضمون ملیالم زبان میں پہلے شائع ہو چکی تھی۔ مشہور مصنفہ سارا جوزف کا یہ ایک ہلا کر رکھ دینے والا مضمون تھا۔

اس کا انگریزی ترجمہ ہوا اور کاؤنٹر کرنٹس پر اَپ لوڈ ہو گیا۔ یوں اپنے پہلے دن سے یہ پلیٹ فارم مزاحمت کی نشانی بن گیا اور فرقہ واریت کے بڑے مخالف کے طور پر ابھر کر سامنے آیا۔

آج جو اعتماد کاؤنٹر کرنٹس نے اپنے قارئین سے حاصل کیا ہے، اس میں مدیر اعلیٰ بینو میتھیو کا اہم کردار ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ سالوں تک وہ دن بھر نوکری کرتے تھے اور گھر واپس آ کر کاؤنٹر کرنٹس کی ذمہ داری اٹھاتے تھے۔ وقفہ وقفہ پر ان کو کئی جھٹکے بھی کھانے پڑے، مگر انہوں نے کبھی اپنے اصولوں کا سودا نہیں کیا۔

مثال کے طور پر، کچھ سال پہلے، ان کے اخبار کی مینجمنٹ نے یہ شرط عائد کر دی کہ وہ اپنی نوکری اور کاؤنٹر کرنٹس میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔ بینو کو فیصلہ لینے میں ذرا بھی وقت نہیں لگا۔ اب وہ صرف کاؤنٹر کرنٹس کی ہی ادارتی ذمہ داری سنبھال رہے ہیں۔

بینو کو ایک بار پولیس نے ڈرانے کی کوشش کی، مگر وہ ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ دراصل بابری مسجد پر سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد بینو نے ایک مضمون لکھا۔ مضمون شائع ہونے کے بعد ممبئی پولیس نے اسے کاؤنٹر کرنٹس ویٹ سائٹ سے ہٹانے کو کہا۔ مگر بینو نے نہ تو مضمون ہٹایا اور نہ ہی پولیس کو دوبارہ کوئی جواب دیا۔

بینو کی زندگی صحافتی برادری کے لیے ایک ایک سبق ہے کہ پیسہ، ترقی یا شہرت کبھی بھی اصولوں کا متبادل نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا کہ صحافی کو اقتدار کی گلیوں میں جگہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ عوام کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ادارتی آزادی کو کیسے بچائے رکھا جائے، یہ بینو کی پہلی ترجیح ہے۔ کاؤنٹر کرنٹس کسی قسم کا اشتہار قبول نہیں کرتا۔ نہ ہی وہ کسی ادارے کی فنڈنگ کا خواہشمند ہے۔

بینو کا کہنا ہے کہ جیسے ہی کوئی ادارہ یا تنظیم کسی میڈیا کی جیب میں پیسہ ڈالتی ہے، ویسے ہی میڈیا کی آواز خاموش ہونے لگتی ہے۔ جہاں تک سوال میڈیا کے اخراجات کا ہے، تو اس کے لیے بینو میتھیو عوامی تعاون پر منحصر ہیں۔

ملک کے مین اسٹریم میڈیا کی حالت کو دیکھ کر بینو میتھیو کافی افسردہ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بہت سارے صحافی اب کھلے طور پر نفرت پھیلا رہے ہیں۔ وہیں ملک کا لبرل طبقہ ان سے مقابلہ کرنے میں ناکام ہے، کیونکہ وہ بائیں بازو سے لے کر دائیں بازو کو خوش کرنے میں مصروف ہے۔ اس پس منظر میں آزاد اور خود مختار میڈیا کی بڑی ضرورت ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ ملک کے حالات تب ہی بہتر ہوں گے، جب ہزاروں کی تعداد میں کاونٹر کرنٹس جیسے پلیٹ فارم کام کریں گے۔ ان کا زور ہے کہ عوامی صحافت مختلف زبانوں اور مختلف خطوں سے شروع کی جائے۔ سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم پر سرگرم صحافیوں کے لیے بھی بینو کا پیغام یہ ہے کہ انہیں سستی شہرت کے لیے اپنے مشن سے دور نہیں جانا چاہیے۔

بینو کا کہنا ہے کہ کسی بھی صحافتی ادارہ کو اپنے صحافیوں اور قلم کاروں پر کسی خاص نظریہ کو نہیں تھوپنا چاہیے، بلکہ اسے مختلف آوازوں کو جگہ دینی چاہیے۔ بطور صحافی بینو کا ماننا ہے کہ دنیا کے مسائل آپس میں جڑے ہوئے ہیں، اس لیے ہر محاذ پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ سامراجیت اور گلوبلائزیشن کی مخالفت سے لے کر ماحولیاتی تبدیلی کے خطرات پر بات کرنی ضروری ہیں، مگر اسی کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت کی مخالفت نیز دلت اور دیگر محروم طبقات کے حقوق کے تحفظات بھی اہم ہیں۔

خواتین مخالف تشدد اور شہری و انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف آواز بلند کرنا بھی صحافیوں کی ذمہ داری ہے۔

بینو میتھیو اس بات کو لے کر بالکل فکر مند نہیں ہیں کہ ان کے بعد کاؤنٹر کرنٹس کی ذمہ داری کون اٹھائے گا۔ ان کو یقین ہے کہ نوجوان صحافیوں کا کارواں ان کے سفر کو آگے لے جائے گا۔

سچ کہیے تو بغیر وسائل کے جو کام کاؤنٹر کرنٹس نے انجام دیا ہے، وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے اور اس معاملے میں اگر یہ کہا جائے کہ کاؤنٹر کرنٹس محض ایک نیوز پورٹل کا نام نہیں بلکہ ایک عوامی صحافت اور تحریک کا نام ہے، تو غلط نہ ہوگا۔

فرقہ واریت کا کھیل تیز

دہلی کے انتخابات کے پیش نظر جیسے جیسے مقابلہ سخت ہوتا جارہا ہے، سیاسی جماعتیں گندی سیاست کے دلدل میں دھنستی جارہی ہیں

ابھے کمار

دہلی اسمبلی انتخابات کی تاریخ کا اعلان کسی بھی دن کیا جاسکتا ہے۔ توقع ہے کہ انتخابات فروری کی گلابی سردیوں میں ہوں گے، لیکن سیاسی درجۂ حرارت ابھی سے کافی بڑھ چکا ہے۔ سیاسی جماعتیں اپنے امیدواروں کے ناموں کا اعلان کر رہی ہیں اور دیگر تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ۷۰ / ارکان پر مشتمل دہلی اسمبلی کے انتخابات میں سہ رخی مقابلے کی امید ہے۔ عام آدمی پارٹی پوری کوشش کر رہی ہے کہ کسی بھی قیمت پر دہلی میں اپنی حکومت کو برقرار رکھے، جبکہ بی جے پی ان انتخابات کو اپنے وقار کا مسئلہ سمجھ کر میدان میں اتری ہے۔ دہلی میں بی جے پی کی آخری وزیر اعلیٰ آنجہانی سشما سوراج تھیں، اور پارٹی گزشتہ ۲۶ / سالوں سے دہلی کے اقتدار سے باہر ہے۔ دہلی اسمبلی انتخابات وزیر اعظم نریندر مودی کے لیے بھی ایک بڑا چیلنج ہیں۔ بی جے پی نے پچھلے دو اسمبلی انتخابات مودی کے چہرے کو سامنے رکھ کر لڑ چکی ہے لیکن دہلی کے عوام نے بھگوا جماعت کو کراری شکست دی۔ دہلی اسمبلی کے نتائج مودی کی مقبولیت پر بھی سوال اٹھاتے ہیں، کیونکہ قومی دارالحکومت، جہاں سے وہ گزشتہ دس سالوں سے ملک پر حکومت کر رہے ہیں، کے ووٹرز نے اسمبلی انتخابات کے دوران ان کی پارٹی کو مکمل طور پر مسترد کر دیا ہے۔ کانگریس کی طاقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ کانگریس کی پوری کوشش ہے کہ عام آدمی پارٹی سے ناراض رائے دہندگان کو اپنی طرف راغب کرے۔ پارٹی اقلیتوں اور دلتوں کے درمیان اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ آج کمزور نظر آنے والی کانگریس کبھی دہلی کی سب سے طاقتور پارٹی ہوا کرتی تھی، جس نے ۱۹۹۸ سے ۲۰۱۳ء تک دہلی پر حکمرانی کی۔ کانگریس کی کوشش ہے کہ آنجہانی شیلا دکشت کے ۱۵ / سالہ دور حکومت کو دوبارہ زندہ کیا جائے۔

دہلی اسمبلی انتخابات کی اپنی پیچیدگیاں بھی ہیں۔ ایک طرف، بی جے پی کے خلاف کانگریس اور عام آدمی پارٹی انڈیا اتحاد کا حصہ ہیں تو دوسری طرف، دہلی میں ان دونوں جماعتوں کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ جیسے جیسے مقابلہ سخت ہوتا جارہا ہے، سیاسی جماعتیں گندی سیاست کی دلدل میں دھنستی جارہی ہیں۔ عوام مخالف سیاست کی ایک واضح مثال بنگلہ دیشی اور روہنگیا مسلمانوں کی دراندازی کا مسئلہ ہے، جسے عام آدمی پارٹی اور بی جے پی دونوں شدت سے اچھال رہی ہیں اور ایک دوسرے پر سنگین الزامات لگا رہی ہیں۔ جہاں بی جے پی اپنی ہندوتوا سیاست کے لیے جانی جاتی ہے، وہیں عام آدمی پارٹی پوری کوشش کر رہی ہے کہ وہ بھی نرم ہندوتوا کا سہارا لے اور بی جے پی کو اس کے ہی کھیل میں مات دے۔ حالانکہ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ فرقہ واریت پر مبنی سیاست کا جواب سیکولرازم اور محکوموں کے درمیان اتحاد ہے۔ انہوں نے غیر بی جے پی پارٹیوں کو متنبہ کیا ہے کہ بی جے پی کو ان کی بچھائی گئی بساط پر شکست دینا ممکن نہیں ہے۔ تاہم عام آدمی پارٹی نے واضح کر دیا ہے کہ وہ دہلی اسمبلی انتخابات میں بنگلہ دیشی اور روہنگیا مسلمانوں کی دراندازی کا مسئلہ زور وشور سے اٹھائے گی اور اس بہانے بی جے پی کو ملک کی سیکورٹی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے الزام میں عوام کی عدالت میں لے جائے گی۔ دہلی میونسپل کارپوریشن، جہاں عام آدمی پارٹی نے اکثریت حاصل کی ہے، نے حال ہی میں ایک سرکلر جاری کیا ہے جس میں اسکولوں اور اسپتالوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ غیر قانونی بنگلہ دیشی تارکین وطن کے بچوں کو پیدائشی سرٹیفکیٹ جاری نہ کریں۔ دریں اثنا، مرکز میں برسر اقتدار بی جے پی نے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر کے توسط سے یہ حکم جاری کیا ہے کہ وہ دہلی کی مشکوک بستیوں میں چھاپے ماریں اور مشتبہ بنگلہ دیشی اور روہنگیا مسلمانوں کی شناخت کریں۔ میڈیا اور دیگر ذرائع سے موصولہ خبروں کے مطابق، جہاں ایم سی ڈی کے افسران اقلیتوں کو پریشان کر رہے ہیں، وہیں دہلی پولیس اقلیتی آبادی کی غریب جھگیوں اور بستیوں میں خصوصی مہم چلا رہی ہے اور کاغذ دکھانے کے نام پر عام آدمی کو ڈرا دھمکا رہی ہے۔ ایک طرف عوام انتظامیہ اور پولیس کی زیادتیوں کا شکار ہیں، تو دوسری طرف، عام آدمی پارٹی اور بی جے پی کے رہنما ایک دوسرے پر غیر قانونی تارکین وطن اور دراندازوں کو پناہ دینے کا الزام لگا رہے ہیں۔ بنگلہ دیشی اور روہنگیا مسلم دراندازی کا مسئلہ اس قدر میڈیا میں اچھالا گیا ہے کہ روزی روٹی اور صحت عامہ جیسے اہم مسائل دب کر رہ گئے ہیں۔ جس طرح عام آدمی پارٹی اور بی جے پی کمیونل کارڈ کا سہارا لے کر دہلی انتخابات جیتنے کی کوشش کر رہی ہیں، اس سے فرقہ وارانہ اور سیکولر سیاسی جماعتوں کے فرق کو بہت حد تک مٹا دیا گیا ہے۔ حالات اس قدر تشویشناک اور خوفناک ہو چکے ہیں کہ آج دہلی کا مسلمان نہیں جانتا کہ کب پولیس کا دستہ ان کے دروازے پر آکر انہیں اپنی شہریت ثابت کرنے پر مجبور کر دے۔

دہلی میں جہاں مسلمانوں اور دلتوں کی بستیاں ہیں، وہاں پانی، سڑک اور صفائی جیسے بنیادی مسائل موجود ہیں، مگر سیاسی جماعتیں ان مسائل کو حل کرنے کی بجائے دراندازی کا مصنوعی مسئلہ کھڑا کر رہی ہیں تاکہ اقلیتوں کا خوف دِکھا کر اکثریتی طبقے کا ووٹ حاصل کیا جاسکے۔ بی جے پی کافی عرصے سے بنگلہ دیشی دراندازی کا مسئلہ اچھال رہی ہے۔ حالیہ جھارکھنڈ انتخابات کے دوران بھی بنگلہ دیشی اور روہنگیا مسلمانوں کی دراندازی کا مسئلہ اٹھایا گیا تھا، اور یہ افواہ پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی کہ درانداز آدی واسیوں کی نہ صرف زمینیں ہڑپ رہے ہیں بلکہ ان کی خواتین سے نکاح کر کے ریاست کی ڈیموگرافی بھی تبدیل کر رہے ہیں۔ بی جے پی کا اصل مقصد یہ تھا کہ دراندازی کا مسئلہ اٹھا کر آدی واسیوں اور مسلمانوں کے اتحاد کو توڑا جائے، جو 'جھارکھنڈ مکتی مورچہ' کے مضبوط حمایتی رہے ہیں۔ اسی طرح، بی جے پی نے بنگلہ دیشی دراندازوں کا مسئلہ آسام اور مغربی بنگال میں بھی اچھالا تھا اور وہاں بھی انتخابات کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی تھی۔ دہلی کی تاریخ کو بھی دیکھا جائے تو یہاں بھی بی جے پی کافی عرصے سے بنگلہ دیشی دراندازی کا مسئلہ اٹھا رہی ہے۔ مثال کے طور پر، بی جے پی کے سابق وزیر اعلیٰ مدن لال کھورانا نے ۱۹۹۰ء کی دہائی میں بنگلہ دیشی دراندازی کا مسئلہ اٹھایا تھا، اور تب سے بی جے پی اپنی سہولت کے مطابق اقلیت مخالف کارڈ کھیلتی رہی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ سیکولر پارٹیاں بھی فرقہ پرست جماعتوں کی نقل کر رہی ہیں۔ تاہم، تمام انصاف پسند اور جمہوری اقدار پر یقین رکھنے والے لوگ اس بات سے پریشان ہیں کہ انتخابات جیتنے کے لیے کھلے عام اقلیت مخالف اور نفرت پر مبنی سیاست کھیلی جارہی ہے۔ اکثر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ کامیاب جمہوریت وہی ہوتی ہے جہاں اقلیتوں کے مفادات اور حقوق کو تحفظ فراہم کیا جائے، لیکن دُکھ کی بات یہ ہے کہ ملک کے سیاست داں اقلیتوں کو 'کھلنا ٹک' بنا کر انتخابات جیتنے سے گریز نہیں کر رہے ہیں۔ ووٹ دیتے وقت رائے دہندگان کو عوام مخالف سیاست کو اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہیے۔■

> تمام انصاف پسند اور جمہوری اقدار پر یقین رکھنے والے لوگ اس بات سے پریشان ہیں کہ انتخابات جیتنے کیلئے کھلے عام اقلیت مخالف اور نفرت پر مبنی سیاست کھیلی جارہی ہے۔ اکثر یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ کامیاب جمہوریت وہی ہوتی ہے جہاں اقلیتوں کے مفادات اور حقوق کو تحفظ فراہم کیا جائے، لیکن دُکھ کی بات یہ ہے کہ ملک کے سیاست دان اقلیتوں کو 'کھلنا ٹک' بنا کر انتخابات جیتنے سے گریز نہیں کر رہے ہیں۔

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)

debatingissues@gmail.com

दावत
ہفت روزہ دعوت نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatweekly.com

دلّی جلی یا جلائی گئی ہے؟

مخالف سی اے اے عوامی تحریک کو کچلنے کی سازش!

ابھے کمار، دلی

ملک کا دل اور قومی دار الحکومت دلّی سے کشیدگی ابھی بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ دلّی کو فرقہ وارانہ تشدد کی آگ نے بڑے پیمانے پر جان ومال کا نقصان پہنچایا ہے۔ اب تک ۴۰ سے زائد افراد ہلاک ہو چکے ہیں اور سینکڑوں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ بہت سارے لوگ اپنے گھروں سے بے گھر اور اپنے روز گار سے محروم ہو چکے ہیں۔ لوگ ڈر اور خوف کی وجہ سے دلّی سے ہجرت بھی کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ملک اور جمہوریت پر گہری چوٹ ہے۔ ملک کے عوام میں پائی جانے والی عدم تحفظ کی کیفیت جمہوریت کے لیے بے حد مضر ہے۔ تشدد سے ترقی بھی متاثر ہوتی ہے اور ملک بین الاقوامی سطح پر بدنام بھی ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ شرمناک بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ جس وقت ملک امریکی صدر کی میزبانی کر رہا تھا تب دلّی جل رہی تھی؟

فرقہ وارانہ تشدد دوبارہ رونما نہ ہو پائے اس کے لیے ضروری ہے کہ قصور واروں کی شناخت کی جائے اور انہیں سخت سزا دی جائے۔ مگر حقیقت میں ایسا کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ قومی میڈیا کا ایک بڑا حصہ بر سرِ اقتدار جماعت کے موقف کو اپنے پلیٹ فارم سے تقویت پہنچا رہا ہے اور اصل سوالوں کو دبا رہا ہے۔ ایک بار پھر بلوائیوں کو بچانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ غیر جانبدارانہ تفتیش کے بجائے اس بار بھی پورے مسئلے کو فرقہ وارانہ رنگ دیا جا رہا ہے۔ قصور واروں کی نشاندہی کرنے کے بجائے ایک مخصوص طبقے کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ سرکار، پولیس اور انتظامیہ سے ذمہ داری طلب کرنے سے زیادہ اقلیتی طبقے کے بعض لوگوں کو "ماسٹر مائنڈ" بنا کر پیش کرتے ہوئے اس معاملے کو ڈھانکنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں اس بیانیے کو آگے بڑھایا جا رہا ہے کہ کہ دلّی تشدد دو گروہوں کے درمیاں تصادم تھا۔ مگر اصل حقیقت پر بات نہیں ہو رہی ہے کہ پر امن طریقے سے مظاہرے کرنے والوں پر حملہ ایک سازش کا حصہ تھا۔ سی اے اے کے خلاف مظاہروں سے سرکار پریشان تھی اور وہ اسے کچلنے کے لیے ہر طرح کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک وقت کے بعد اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ جب تک سی اے اے مخالف مظاہروں کو نظم وضبط کے لیے خطرہ بنا کر پیش نہیں کیا جاتا تب تک عوام ان سے دور نہیں ہوں گی۔

اس بیانیہ کو پَر لگانے میں قومی میڈیا اور سوشل میڈیا کا بڑا رول رہا ہے۔ ایک طرفہ حملے کو سی اے اے مخالف اور سی اے اے حمایتی فرقے کے درمیان لڑائی بتلا کر پیش کیا گیا۔ در اصل یہ لڑائی سی اے اے حمایتی اور مخالف لوگوں کے درمیان ہے ہی نہیں۔ سی اے اے کی مخالفت میں مظاہرے کئی مہینوں سے چل رہے ہیں جو پوری طرح سے پر امن رہے ہیں۔ کسی بھی موقع پر مظاہرین نے عام لوگوں کو پریشان کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اگرچہ ان کے بعض مظاہرے سڑکوں پر چل رہے ہیں مگر اس سے عوام کی آمد ورفت بالکل بھی بند نہیں ہوئی تھی۔ دلّی انتخابات کے دوران بھی ان دھرنوں سے کسی کو کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ جب انتخابات سے ایک روز قبل انتخابی تشہیر بند کر دی گئی تھی تب مظاہرین نے بھی اپنے لاوڈ اسپیکرز بند رکھے تھے۔

مثال کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہر وقت رضاکار سڑکوں پر مسافروں کو آنے جانے میں مدد کرتے رہے ہیں اور وہ اس بات کا بھی پورا خیال رکھ رہے ہیں کہ آس پاس گندگی نہ پھیلے۔ وہ خود سڑکوں کی صفائی کرتے رہے ہیں۔ جو لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ان مظاہروں سے لوگوں کو دشواریاں ہوئی ہیں وہ یا تو ان مظاہروں کو قریب سے نہیں جانتے یا پھر جان بوجھ کر غلط بیانی کر رہے ہیں۔ پُر امن مظاہرے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ شاہین باغ دھرنے کے پاس لائبریری چلتی ہے، جہاں لوگ بیٹھ کر کتابیں پڑھتے ہیں۔ کیا کوئی یہ ثابت کر سکتا ہے کہ ان کے احتجاج سے عوامی زندگی مفلوج ہوئی ہے؟ کیا کبھی کسی بچے کو اسکول جانے اور کسی بیمار کو اسپتال جانے سے روکا گیا ہو؟ اگر شاہین باغ کے مظاہرین روڈ کے ایک حصے میں بیٹھے بھی ہیں تو اس سے لوگوں کا آنا جانا بند نہیں ہوا ہے۔ شاہین باغ میں اور بھی سڑکیں ہیں، جہاں سے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے کہ سی اے اے مخالف تحریک سے بہت لوگ اتفاق نہیں رکھتے ہیں؟ ہاں، بھگوا جماعتیں روز اول سے اس قانون کے حق میں رہی ہیں اور ان کے ہم خیال لوگ بھی اسے ہر حال میں نافذ ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر سی اے اے کی حمایت کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ اس کی مخالف میں ہیں ان کو "پاکستانی" اور دہشت گرد" کہا جائے اور ان پر حملے کیے جائیں۔ کسی کا سی اے اے حامی موقف کبھی اسے اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اس قانون کے خلاف چلنے والی تحریک کو ختم کرنے کے لیے قانون اپنے ہاتھوں میں لے۔ جن لوگوں کو ان مظاہروں سے اتفاق نہیں ہے وہ اس کی مخالفت جمہوری طریقے سے کر سکتے ہیں۔ ملک کا آئین اور قانون کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں میں ڈنڈے اور ہتھیار لے کر مظاہرین پر ٹوٹ پڑیں۔ یہ کام سرکار کا ہے کہ وہ مظاہرین سے بات کرے اور ان کے اعتراضات کو رفع کر کے تعطّل کو ختم کرے۔ یہ کام کوئی فرد یا گروپ اپنے ہاتھوں میں نہیں لے سکتا کہ وہ کسی بھی حال میں اس مظاہرے کو ختم کرے گا۔ عدالت عظمٰی بھی شاہین باغ کے معاملے پر سنوائی کر رہی ہے اور اس کے لیے اس نے اپنے مذاکرات کار بھی بھیجے ہیں۔ ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی پر امن طریقے سے جاری ان مظاہروں کو بنیادی حقوق کا جزو مانتی ہے۔

مگر ان باتوں کی بھگوا عناصر کو کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر ان کو پروا ہوتی تو ان کے لیڈر کپل مشرا سی اے اے مخالف مظاہرے کو ختم کرنے کے لیے سڑکوں پر نہیں اترتے اور نہ ہی قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیتے۔ انڈین ایکسپریس کی ایک رپورٹ کے مطابق ۲۳ فروری کو تصادم تب شروع ہوا جب کپل مشرا ایک ہجوم کی قیادت کرتے ہوئے مصطفٰی آباد دھرنے کے پاس جا پہنچے۔ وہاں سے دو کیلو میٹر دور موج پور بابر پور میٹرو اسٹیشن کے پاس کپل مشرا نے ۲۰۰ لوگوں پر مشتمل بھیڑ جمع کی تھی۔ اس کے بعد یہ بھیڑ ملک کے "غداروں" کو "گولی مارنے" کے نعرے دیتے ہوئے دھرنے کی طرف بڑھنے لگی۔ کپل مشرا اپنے نفرت انگیز بیانات کے لیے جانے جاتے ہیں۔ اس سے قبل بھی وہ شاہین باغ اور سی اے اے حمایتی مظاہروں کے خلاف زہر افشانی کر چکے ہیں۔ تضاد دیکھیے کہ جو پولیس اقلیتی طبقے کے لوگوں کو گرفتار کرنے میں برق رفتاری دکھاتی ہے وہی پولیس فسادات کے وقت معصوموں کو بچانے اور نظم وضبط کو بنائے رکھنے میں اس تیزی کا ایک حصہ بھی نہیں دکھاتی۔ اگر پولیس کو ذرا بھی لا اینڈ آرڈ کا خیال ہوتا تو وہ کپل مشرا کی ریلی کو مصطفٰی آباد پہنچنے سے پہلے ہی روک لیتی۔ پولیس کے اسی ناقص رول کی دلّی ہائی کورٹ نے سرزنش کی ہے۔ پولیس کی اسی سستی کی وجہ یہ تھی کہ وہ سیاسی دباؤ میں کام کر رہی تھی جس کے نتیجہ میں حالات بگڑتے چلے گئے۔ ۲۳ فروری کے بعد سے دلّی کا ماحول بگڑنا شروع ہو گیا تھا۔ سب سے خراب حالات شمالی مشرقی دلّی کی ہے۔ موج پور، کراول نگر، سیلم پور، بابر پور، گھونڈا، مصطفٰی آباد، گوکل پوری، جعفر آباد اور اشوک نگر فرقہ پرستوں کے خاص نشانے پر ہیں۔ بازار، دکانیں، گاڑیاں، مکانات جلائے گئے ہیں۔ مذہبی مقامات کو بھی نشانہ بنایا گیا ہے۔ معصوم لوگ ہی فرقہ وارانہ جنون کے شکار ہوئے ہیں۔ تباہی اس قدر ہوئی ہے کہ رات کے عالم میں بھی اقلیتوں اور محکوم طبقات کے دلوں میں ڈر اور خوف بیٹھا ہوا ہے۔ نظم وضبط کی جگہ بد امنی پھیلی ہوئی ہے۔ لوٹ مار، توڑ پھوڑ اور آگ زنی کے واقعات پیش آئے ہیں۔ راہ چلتے لوگوں سے ان کی مذہبی شناخت پوچھ کر مارا گیا۔ ان کے مذہبی عقائد کے خلاف ان سے نعرے لگوائے گیے۔ مذہبی مقامات کی بے حرمتی کی گئی۔ جب ملک کی راجدھانی شہریوں کو تحفظ دینے میں ناکام ثابت ہو رہی ہو تو ملک کے دیگر حصوں کا حال کیا ہوگا؟ عام آدمی کے ووٹ سے بننے والی سرکار بھی عام آدمی کی جان ومال کی حفاظت کرنے میں ناکام نظر آ رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اروند کیجریوال کچھ بھی ایسا نہیں کرنا چاہتے ہیں جس سے ان کا نرم ہندوتوا کا سوشل بیس کھسک جائے۔ ان کو بھی معلوم ہے کہ جو لوگ مودی کو پارلیمانی انتخابات میں ووٹ دیتے ہیں ان میں ایک بڑی تعداد اسمبلی انتخابات میں کیجریوال کو پسند کرتی ہے۔ دیگر سیاسی جماعتیں جو سیکولرازم اور ہندو مسلم اتحاد کے نام پر ووٹ مانگتی رہی ہیں وہ بھی ان نازک لمحات میں خاموش رہی ہیں۔ حالانکہ بدھ کے روز کانگریس صدر سونیا گاندھی نے امت شاہ کا استعفٰی کا مانگا تھا، مگر ان سے ان کے حمایتیوں کو اور بھی امیدیں تھی۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ جنہوں نے آئین کی قسمیں لے کر حکومت کی کمان سنبھالی تھی اور جن کے ہاتھوں میں پولیس اور انتظامیہ موجود ہیں، وہ بھی اپنی ذمہ داری سے منہ موڑ رہے ہیں۔ وزیر داخلہ کے ناک کے نیچے دلّی کئی دنوں سے جلتی رہی مگر ان کا کوئی رد عمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ اب بڑا سوال یہی ہے کہ جلتی ہوئی دلّی کے لیے ذمہ دار کون ہے؟ یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ سیکولر طاقتیں معصوموں کو بچانے میں اتنی ایماندار نہیں ہیں جتنی ان سے توقع کی جاتی ہے۔ لوگوں کا یہ سوال غلط نہیں ہے کہ جن علاقوں میں بے قصوروں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے وہاں سیکولر جماعتیں کیوں کیمپ نہیں کر رہی ہیں؟

> ہندوستانی سیاست کا رنگ ایسا بدل گیا ہے کہ فرقہ پرستی کے خلاف سیکولر پارٹیاں آواز بلند کرنے سے پہلے سو بار سوچتی ہیں کیونکہ ان کو اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی شبیہ اکثریتی طبقے میں خراب نہ ہو جائے

ہندوستانی سیاست کا رنگ ایسا بدل گیا ہے کہ فرقہ پرستی کے خلاف سیکولر پارٹیاں آنے سے پہلے سو بار سوچتی ہیں کیونکہ ان کو اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ان کی شبیہ اکثریت طبقے میں خراب نہ ہو جائے۔ کیا یہی وجہ تو نہیں ہے کہ سیکولر لیڈر متعلقہ علاقوں میں جانے کے بجائے راج گھاٹ سے امن کی اپیل کر رہے ہیں؟

مگر دلّی کے بگڑتے حالات کی "کرونولوجی" کو سامنے رکھا جائے تو اس میں شک کی زیادہ گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ سب کچھ اچانک سے پھوٹ پڑا ہے، بلکہ اس سب کے پیچھے ایک بڑی سازش رچی گئی تھی۔ عوامی تحریک سے شکست خوردہ بھگوا جماعتوں کے پاس دو ہی راستے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ مذہبی امتیاز پر مبنی سی اے اے کو واپس لیتے یا اس میں ترمیم کرتے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ تشدد کی کلہاڑی سے عوامی تحریک کو کاٹ کر ختم کر دیا جائے۔ بھگوا طاقتوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا ہے جو زور زبردستی، ہجومی تشدد اور لا قانونیت والا راستہ ہے۔ ایسا ہی کچھ انہوں نے جے این یو میں بھی کیا تھا جب فیس میں اضافے کے خلاف پر امن طریقے سے مظاہرے کرنے والے طلبہ پر حملہ کروایا گیا تھا۔ پولیس تب بھی خاموش تھی اور آج بھی خاموش ہے۔ اسی سازش کے تحت بھگوا عناصر مسلسل شاہین باغ کو "دہشت گردی" سے جوڑنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس سازش کے تحت مسلمانوں کے خلاف جھوٹ اور نفرت پھیلائی جا رہی تھی۔ مسلمانوں کو ملک اور اکثریتی ہندو فرقے کا دشمن بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ملک کے تئیں اُن کی محبت اور وفاداری پر سوالات اٹھائے جا رہے تھے۔ ان کے خلاف ملک مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا بے بنیاد الزام عائد کیا جا رہا ہے اور ان کی ذہنیت کو "جہادی" کہہ کر گالی دی جا رہی تھی۔ آر ایس ایس کے ترجمان میگزینس کے حالیہ کچھ شمارے ان پروپیگنڈوں اور نفرت انگیز مواد سے بھرے پڑے ہیں۔ اشتعال انگیز بیانات اوپر سے لے کر نیچے تک کے بھگوا لیڈران نے ہی دیے ہیں۔ سیاسی طور پر ملک کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش کے وزیر اعلٰی یوگی آدتیہ ناتھ نے دلّی اسمبلی انتخابات کے دوران یہ کہا تھا کہ جن لوگوں نے کشمیر کے دہشت گردوں کی حمایت کی تھی وہی لوگ شاہین باغ میں بھی مظاہرے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسی دوران مرکزی وزیر انوراگ ٹھاکر نے یہ نعرہ دیا کہ دیش کے "غداروں" کو "گولی" مارنا چاہیے اور رائے دہندگان سے اس بات پر ووٹ مانگا تھا کہ اگر بی جے پی دلّی میں سرکار بنا لیتی ہے تو وہ شاہین باغ کے مظاہرے کو صاف کر دے گی۔ خود وزیر داخلہ امت شاہ نے بابر پور کے ووٹروں سے کہا تھا کہ بی جے پی کو اگر وہ ووٹ دیتے ہیں تو اس سے دلّی اور ملک محفوظ ہو جائیں گے اور شاہین باغ جیسے مظاہرے کو روک دیا جائے گا۔ وہیں جواہر لال نہرو اسٹیڈیم کی ایک دوسری ریلی سے شاہ نے ووٹروں سے بی جے پی کو ووٹ ڈالنے کی اپیل کی اور کہا کہ وہ ای وی ایم مشین کو اس تیزی سے دبائیں کہ اس کا کرنٹ شاہین باغ تک پہنچے۔ کیرالا کے گورنر عارف محمد خان نے اپنے آئینی منصب کو طاق پر رکھتے ہوئے شاہین باغ مظاہرے کا خوف کھڑا کیا تھا۔ جب اوپر کے قائدین اشتعال انگیز بیانات دینے لگیں تو ذیلی سطح پر متحرک کارکنان اس کی نقل کرنے لگتے ہیں اور بعض اوقات وہ ساری حدیں پار کر جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ شر پسندی اور بد نظمی کے لیے ماحول تیار ہونے لگتا ہے۔ بی جے پی لیڈر کپل مشرا کی اشتعال انگیزی کو اسی سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے جس کے نتیجے میں دلّی جل رہی ہے۔

کپل مشرا نے جسے دلّی الیکشن میں عوام نے مسترد کر دیا تھا، بر سرِ عام پولیس کی موجودگی میں سی اے اے مخالفت مظاہروں کو جبراً خالی کرانے کی بات کہی تھی۔ اس انتباہ کے دو دن بعد اس کا ایک اور ٹوئٹ سامنے آیا جس میں اس نے دعوی کیا کہ "جعفر آباد خالی ہو چکا ہے۔ دلّی میں دوسرا شاہین باغ نہیں بنے گا"۔ اس سے قبل بھی وہ دلّی اسمبلی انتخابات کو ہندوستان اور پاکستان کا میچ کہہ چکا ہے جس کا سخت نوٹ لے کر الیکشن کمیشن نے تادیبی کارروائی کے تحت ۴۸ گھنٹوں کے لیے انتخابی تشہیر پر پابندی لگائی تھی۔ لیکن پولیس نے کپل مشرا کو روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا۔ قیاس یہ بھی ہے کہ شاید پولیس کپل مشرا کی مدد کرتی رہی ہے۔ جسٹس مرلی دھرن کی قیادت میں دلّی ہائی کورٹ کی دو ارکان پر مشتمل بینچ نے بھی پولیس کے رول پر سوال اٹھایا اور کہا کہ بی جے پی لیڈران کپل مشرا، انوراگ ٹھاکر اور پرویش ورما کی نفرت انگیز تقاریر کی جانچ کرے۔ کورٹ نے پولیس کو پھٹکار لگاتے ہوئے کہا کہ شہر تباہ ہو رہا ہے۔ آپ لوگ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟ کب آپ کارروائی کریں گے؟ دلّی ایل جی کو لکھے ایک خط میں دلّی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے کہا ہے کہ کپل مشرا ایک بھیڑ کے ساتھ پر امن مظاہرین پر حملے بول رہا ہے۔ اب ان ہی کی پارٹی کے لیڈر اور مشرقی دلّی سے ایم پی گوتم گمبھیر نے کپل مشرا کے خلاف کارروائی کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ بے حد افسوس کی بات ہے کہ بی جے پی کی قیادت والی مرکزی حکومت اپنا آئینی فرض ادا کرنے میں بری طرح ناکام رہی ہے اور دلّی میں نظم وضبط بنائے رکھنے کے بجائے بلوائیوں کی پردے کے پیچھے سے مدد کر رہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پولیس بلوائیوں کے خلاف اب تک کوئی موثر کارروائی ضرورت کی ہوتی۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو جسٹس مرلی دھر کا تبادلہ رات کے اندھیرے میں کیوں کر دیا جاتا، جنہوں نے چند گھنٹے قبل ہی پولیس کو فسادیوں پر کارروائی کرنے کا حکم دیا تھا؟

جن لوگوں کو لگتا ہے کہ دلّی جلا دینے سے لوگ ان کی بات قبول کر لیں گے وہ غلط فہمی میں ہیں۔ سیاسی سوالوں کا حل سیاسی ہی ہوتا ہے۔ زور زبردستی اور ظلم سے نقصان سب کا ہوتا ہے اور فائدہ کسی کا نہیں ہوتا ہے۔ ایک بار پھر یاد دلانا چاہوں گا کہ یہ سرکار کی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون توڑنے والوں کے خلاف سختی سے پیش آئے۔ جب فساد چند گھنٹوں میں نہ تھم جائے تو کہا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حکومت کے اشارے پر کیا جا رہا ہے۔ حکومت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ان کی باتوں کو سنے جو ان سے اتفاق نہیں رکھتے اور شہریت ترمیمی قانون کے اعتراضات کو دور کرنے کے لیے اسے اگے آنا چاہیے۔ مظاہرین پر ہونے والے حملوں پر وہ خاموشی اختیار کر کے ملک اور جمہوریت کا بڑا نقصان کر رہی ہے۔

(مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

قانون کے رکھوالوں کی سفاکیاں، انسانیت لہولہان

پولیس اصلاحات، ہر بار ابھر کر دَب جانے والا مسئلہ۔ مسلمانوں کو مناسب نمائندگی اور فرقہ وارانہ ذہنیت سے نمٹے بغیر اصلاح ممکن نہیں

ابھے کمار، دلی

پولیس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ملک کے قانون کے مطابق کام کرے۔ مگر دلی فسادات کے دوران پولیس نے پھر ایک بار عوام کو مایوس کیا ہے۔ کئی دنوں تک دلی کی سڑکوں پر قانون کی بالادستی کی جگہ نفرت کا راج قائم رہا۔ ایسی نفرت جس نے فسادیوں کے دلوں کو پتھر سے بھی سخت بنا ڈالا تھا۔ انسانیت اور اخوت کی جگہ درندگی ان کے سروں پر جنوں بن کر سوار تھی۔ جن علاقوں میں بے سہاروں کے گھر، دکان اور مذہبی مقام جلائے جا رہے تھے، وہاں پولیس جان بوجھ کر غائب تھی۔ لوگ مدد کے لیے چیخ رہے تھے پولیس کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔ مظلوموں اور بے سہاروں کی مدد کرنا تو دور کی بات ہے پولیس بعض اوقات مسلمانوں کو 'سبق سکھلانے' کے لیے سڑکوں پر اتری ہوئی تھی۔ یہ بات تو ثبوت کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ فسادیوں کو پکڑنے اور حالات کو قابو میں کرنے کے لیے دہلی پولیس نے کوئی موثر اقدامات نہیں اٹھائے۔ الٹے پولیس ان لوگوں کو پریشان کر رہی ہے جو فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے کے لیے سرگرم عمل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دلی پولیس نے عدالت عظمیٰ میں ایک حلف نامہ داخل کیا ہے اور مشہور و معروف سماجی جہد کار ہرش مندر کے خلاف نفرت انگیز تقریر کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہرش مندر سیکولرازم اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے عرصے سے کام کر رہے تھے۔ ان کی این جی او 'کاروان محبت' ہجومی تشدد اور منافرانہ جرائم کے متاثرین کے دکھ بانٹتی رہی ہے۔ یہ بات ارباب اقتدار کو پریشان کر رہی تھی اور وہ ہرش مندر پر کارروائی کرنے کا بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ اب حکومت پولیس کو استعمال کر کے ان کو ہراساں کرنا چاہتی ہے۔ پولیس کا اس قدر کسی خاص سیاسی جماعت کے مفاد کو پورا کرنا ہندوستانی جمہوریت کے لیے بے حد مضر ہے۔

اب جب کہ دہلی کے فسادات کی آگ بجھ چکی ہے، متاثرین سامنے آکر اپنی آپ بیتی بیان کر رہے ہیں اور انہوں نے میڈیا اور راحت اور باز آباد کاری میں سرگرم جہد کاروں کو بتلایا ہے کہ وہ مدد کے لیے چیختے چلاتے رہے لیکن پولیس ان کو بچانے کے لیے سامنے نہیں آئی۔ ۲۷ فروری کو ہفنگٹن پوسٹ میں مطبوعہ ایک خبر کے مطابق اشوک نگر کے باشندے محمد اکبر قریش کے گھر پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ اس وقت قریش نے مقامی پولیس کو مدد کے لیے فون کیا مگر کوئی اس کی مدد کے لیے نہیں آیا۔ "ہم پولیس کو بار بار فون کرتے رہے انہوں نے کہا کہ وہ دو منٹ میں آرہے ہیں۔ پھر ہم لوگوں نے انہیں ایک اور کال کیا اور کہا کہ وہ جلدی جائے وردات پر پہنچیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ پہنچ ہی رہے ہیں، مگر کوئی ہماری مدد کے لیے نہیں پہنچا"۔

قمر الدین نے بھی مصیبت کی حالت میں پولیس کو پکارا۔ فسادی ان کے گھر کو نذرِ آتش کر چکے تھے۔ قمر الدین اور ان کے خاندان والے کسی طرح اپنے پڑوسی کی چھت پر کود گئے۔ اسی بیچ انہوں نے اپنے ایک جاننے والے کی مدد سے پولیس تک اپنی بات پہنچائی۔ پولیس سے یہ کہا گیا کہ وہ مقامی جیوتی نگر پولیس کی ٹیم کو ان کی مدد کے لیے بھیجیں۔ مگر پولیس نے اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے بجائے یہ کہا کہ "ہم کیا کر سکتے ہیں؟" دہلی پولیس نہ صرف مظلوموں کی مدد کرنے اور فسادیوں کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی، بلکہ بعض اوقات وہ خود اقلیتوں کو ٹارگیٹ کر رہی تھی۔ چکن بیچنے والے نوجوان فیضان کا ہی دردناک واقعہ لے لیجیے۔ پولیس نے پہلے فیضان کو خوب مارا اور پھر ادھ مرا ہو جانے پر اس کو قومی ترانہ "جن گن من" گانے کے لیے مجبور کیا۔ پولیس کی اس بربریت اور فرقہ وارانہ ذہنیت کو ایک وائرل ہونے والے ویڈیو میں صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ۳ مارچ کے روز بی بی سی نیوز کی ایک ویڈیو رپورٹ میں یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ پولیس نہایت سفاکی سے فیضان کو مار رہی تھی۔ فیضان کا بھائی نعیم روتا بلکتا اپنے شہید بھائی کو یاد کر رہا ہے۔ نعیم نے اپنے بھائی کی تصویر موبائیل پر دیکھتے ہوئے کہا کہ پولیس نے اسے خوب مارا۔ اس کے ساتھ بڑی ناانصافی اور 'اتیاچار' (ظلم) ہوا ہے۔ ویڈیو میں یہ بھی دکھائی دے رہا ہے کہ سڑک پر چت پڑے نہتّوں پر پولیس ڈنڈے برسا رہی تھیں اور ان سے کہہ رہی تھی کہ وہ "جن گن من" گائیں۔

قومی شاعر ٹیگور نے کبھی یہ نہیں سوچا ہوگا کہ ان کے لکھے ہوئے ترانے کو اس طرح سے گوایا جائے گا۔ ان کے قلم سے نکلی نظمیں دو ملکوں کے قومی ترانے کی حیثیت رکھتی ہیں، ایسا اعزاز دنیا کے کسی دوسرے شاعر کو حاصل نہیں ہے، مگر ان کے نزدیک انسانیت کا درجہ قومیت کی تنگ نظری سے کہیں بڑا ہے۔ جب پولیس اس کو مار مار کر یہ کہہ رہی تھی کہ وہ "جن گن من" گائے، تو یہ مار نہ صرف فیضان پر پڑ رہی تھی بلکہ اس مار کا درد ٹیگور کو بھی ہوا ہوگا۔ اگر ٹیگور کو یہ معلوم ہوتا کہ قومیت کے نام نہاد پاسباں آگے چل کر اُن کے لکھے گئے ترانے کی دُھن بجا کر معصوموں کی جان لیں گے، تو وہ شاید اسے کبھی نہیں لکھتے۔

پولیس کی اسی بے حسی اور اپنے فریضہ کو انجام دینے میں ناکامی کی وجہ سے دہلی فساد میں ۴۰ سے زائد افراد مارے گئے ہیں اور ۲۰۰ سے زیادہ زخمی ہوئے ہیں۔ ہزاروں لوگ اپنے گھروں سے اجڑ گئے ہیں اور سب سے زیادہ نقصان یقیناً مسلمانوں کا ہوا ہے۔ پولیس کی لاپروائی اور نظم و ضبط کو بگڑنے سے روکنے میں ناکامی کو دہلی ہائی کورٹ نے بھی تسلیم کیا ہے اور اس کے لیے پولیس کی سرزنش بھی کی ہے۔ ۲۵ فروری کے روز دہلی ہائی کورٹ کے جج مرلی دھرن نے پولیس کی موجودگی میں بی جے پی کے لیڈران کپل مشرا، مرکزی وزیر انوراگ ٹھاکر، ایم پی پرویش ورما، ایم ایل اے ابھے ورما کی اشتعال انگیز تقریر کی کلپ سنی اور پولیس سے ان کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے کہا کہ وہ اور انتظار نہ کریں کیوں کہ بہت ساری جانیں جا چکی ہیں اور بہت کچھ برباد ہو چکا ہے۔ ۲۶ فروری کے روز 'دی وائر' میں ایک رپورٹ میں جسٹس مرلی دھرن کے بیان کا ایک اِقتباس شامل کیا گیا ہے، جس میں وہ پولیس کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں "ایف آئی آر درج کیجیے اور اس کی جانکاری اپنے کمشنر کو دیجیے۔ آئینی عدالت کو اس پر غصّہ ہے۔ آپ ان معاملوں

میں ایف آئی آر درج کرنے میں تیزی کیوں نہیں دکھاتے؟ ہم امن کی بحالی چاہتے ہیں۔ یہ شہر بہت زیادہ تشدد دیکھ چکا ہے۔ ہمیں ۱۹۸۴ کو نہیں دوہرانا چاہیے"۔

پولیس اس سے پہلے کہ ان معاملوں میں ایف آئی آر درج کر کے فسادیوں کو گرفتار کرتی، جسٹس مرلی دھرن کا تبادلہ اس فیصلے کے چند ہی گھنٹوں بعد کر دیا گیا۔ اس فیصلے کے خلاف قانون کے پیشے سے وابستہ لوگوں نے اعتراض ظاہر کیا ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ جب کسی جج کا تبادلہ کیا جاتا ہے تو ان کو ۱۵ دنوں کا وقت دیا جاتا ہے، جس کے دوران وہ باضابطہ طور پر اپنی ذمہ داری کسی دوسرے کو منتقل کرتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب کورٹ کے اپنا فریضہ انجام دینے سے پولیس کی فضیحت ہوئی تو حکومت پولیس کے دفاع میں سامنے آگئی۔ کسی بھی کامیاب جمہوریت کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ پولیس قانون کے مطابق راستے پر چلے۔ مگر یہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وہ برسرِ اقتدار جماعت کے اشاروں پر کام کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ پولیس ریاستی حکومت اور دہلی میں وزارت داخلہ کے ماتحت ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنا کام برسرِ اقتدار جماعت کے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر کرے۔ فساد اور دنگوں کے نازک لمحات میں پولیس کی پیشہ ورانہ مہارت کا سخت امتحان ہوتا ہے۔ اس کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ قانون کے مطابق کام کرے اور کسی کے ساتھ ذات برادری، مذہب، جنس اور علاقہ کے بنیاد پر فرق ہرگز نہ کرے۔

مگر ان باتوں کا اکثر پولیس خیال نہیں رکھتی۔ آزادی کے بعد سے پولیس کئی فسادات کے وقت برسرِ جماعت کے اشاروں پر کام کرتی رہی ہے۔ اس کا رویہ رویّہ اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے تئیں کافی منفی رہا ہے۔ یہ بات بہت سارے تحقیقاتی کمیشنس اور انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کی رپورٹس اور دانشوروں کے تحقیقی مقالوں میں کہی گئی ہے۔

پولیس سے متعلق دو سب سے بڑے مسائل ہیں ایک اس کا سیاسی دباو میں کام کرنا اور دوسرا اس کی فرقہ ورانہ ذہنیت۔ نازک لمحات میں وہ اپنا پیشہ وارانہ فرض ادا نہیں کر پاتی اور اکثر سیاسی دباؤ میں آجاتی ہے۔

مشہور تحقیقی ادارہ سینٹر فار پالیسی ریسرچ نے سال ۱۹۸۷ میں "کمیونل وائلمنس ان انڈیا" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس کے مصنف پی آر راج گوپال نے پولیس، سیاست داں اور جرائم پیشہ عناصر کے درمیان ملی بھگت پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے گجرات کے سابق پولس چیف جولیو ریبرو کے اس بیان کا ذکر کیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ "پولیس فورس بھاری سیاسی مداخلت کی وجہ سے برباد ہوگئی ہے۔ ہر تبادلہ سیاست دانوں کے کہنے پر ہوتا ہے۔ پولیس افسران کو دباو میں ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ سیاست دانوں کی کہی ہوئی بات مانیں۔ اس وجہ سے جرائم پیشوں کے مزے ہیں (ص ۱۰۸)"۔

اپنی کتاب "خاکی اینڈ اِتھنک وائلمنس ان انڈیا (۲۰۰۳)" میں دانشور عمر خالدی نے اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے۔ وہ بھی سیاسی مداخلت سے پریشان نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر سارے پولیس والوں اور نوکر شاہوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ قانون پر چلنے کو اولین ترجیح دیں گے اور سیاسی قیادت کی بات ماننے کو دوسری ترجیح دیں گے مگر سیاسی جوابی کارروائی کے تعلق سے مختلف تحفظات فرض کی ادائیگی میں حائل ہو جاتے ہیں۔ ریاست کو اس بات کا اختیار ہے کہ کسی بھی پولیس والے اور نوکر شاہ کا معمولی بات پر تبادلہ کر دے یا درجہ گھٹا دے۔ ریاست بعض انتہائی معاملوں میں اسے ملازمت سے معطل بھی کر سکتی ہے (ص۔۹۴)۔

یعنی سیاست داں اپنی طاقت کا بیجا استعمال کر کے پولیس والوں اور نوکر شاہوں کو اپنی بات منوانے کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ اگر افسران برسرِ اقتدار جماعت اور حکومت کی آواز میں آواز ملا کر کام کرتے ہیں تو ان کو

> **بد قسمتی سے آزاد بھارت کی سیکولر طاقتوں نے فرقہ پرستی سے مقابلہ کرنے میں ایمانداری نہیں دکھائی اور فرقہ پرستوں کے ساتھ سمجھوتا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ پرستی کا نظریہ ہمارے اداروں، خاص کر پولیس اور فوج میں پھیلتا چلا گیا اور آج حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ حکومت چاہے سیکولر جماعت کی ہو یا فرقہ پرست گروہ کی، پولیس عموماً غیر جانب دار نہیں رہتی**

پروموشن دیا جاتا ہے اور جو افسران ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتے ان کو طرح طرح سے پریشان کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بھاگلپور فسادات کے دوران مقامی ایس پی، کے ایس دویدی کا ٹرانسفر ہونے کے بعد بھگوا عناصر نے خوب شور مچایا اور ان کی بحالی کے لیے ۲۶ اکٹوبر ۱۹۸۶ کو وزیر اعظم راجیو گاندھی کا گھیراو بھی کیا۔ راجیو گاندھی دباو میں آگئے اور دویدی کی بحالی کروائی۔ اسی دویدی ایس پی کو جانچ رپورٹوں میں بھاگلپور فسادات کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔

ممتاز دانشور، مورخ اور ماہر آئین اے جی نورانی نے اپنے ایک مقالہ "کمیونل رائٹز اینڈ دی پولیس" جو اقبال نارائن کی مرتب شدہ کتاب "کمیونل رائٹز (۱۹۹۷)" میں ایک باب ہے، میں ۱۹۷۹ کے دوسرے قومی پولیس کمیشن کی سفارشات کا ذکر کیا ہے، جس میں اس موضوع پر کلام کیا گیا ہے کہ کیسے پولیس کو سیاسی مداخلت سے محفوظ رکھا جائے۔ اس رپورٹ میں ایک "ریاستی تحفظ کمیشن" بنانے کی بات کہی گئی ہے۔ ایس پی اور اس سے اوپر کے رینک کے پولیس افسران "بیجا" سیاسی مداخلت کے خلاف اس ادارے میں اپیل کر سکتے ہیں۔ اس کمیشن کے ارکان میں دو ایم ایل اے شامل ہوں گے۔ ایک برسر اقتدار جماعت سے ہوگا اور دوسرا جزب اختلاف کی نمائندگی کرے گا۔ اس کے علاوہ ہائی کورٹ کے چار دیگر ارکان میں سبکدوش جج صاحبان، سول سرویںٹ، اور اکیڈمیکس سے تعلق رکھنے والے لوگ شامل ہوں گے۔ پولیس محکمہ سے تعلق رکھنے والا وزیر اس کمیشن کا صدر ہوگا۔ پولیس کپتان اس کمیشن کا بہ حیثیت عہدہ سیکریٹری ہوگا۔ لیکن کیا یہ اس کمیشن کے بن جانے سے اس مسئلے کا حل نکل جائے گا؟ اس کا جواب نورانی نے یوں دیا ہے: "یہ اقدامات مدد گار ثابت ہوں گے، مگر ایک حد تک ہی (ص۔۱۱)"۔ ایک حد تک؟ آخر کیوں نورانی کو اس بات کا یقین نہیں ہے کہ ریاستی تحفظ کمیشن بن جانے کے بعد بھی اس مسئلے کا مکمل حل نہیں ہو پائے گا؟ اس کا جواب پولیس کی فرقہ وارانہ ذہنیت سے بندھا ہوا ہے۔ اس کے تار پولیس محکمے میں پائی جانے والی مسلمانوں کی گرتی نمائندگی سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔

جدید بھارت میں پولیس کا وجود ۱۸۶۱ میں لائے گئے پولیس ایکٹ کے ساتھ سامنے آیا۔ انگریزوں کے دور حکومت میں حکومت ان کا استعمال جنگ آزادی کے مجاہدوں کے خلاف کرتی تھی۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ اس زمانہ کی پولیس کسی ایک خاص مذہبی فرقے کے خلاف اس قدر فرقہ وارانہ سوچ نہیں رکھتی تھی۔ آزادی سے پہلے پولیس میں مسلمانوں کی شرح آج کے دور کے مقابلے میں کافی زیادہ تھی۔ مگر یہ بے حد افسوس کی بات ہے کہ آزاد بھارت میں جہاں ایک سیکولر آئین نافذ ہے اور ایک جمہوری نظام قائم ہے وہاں پولیس کا رویہ کافی فرقہ وارانہ رہا ہے۔ یہ بات بہت ساری رپورٹوں میں سامنے آچکی ہے۔ پولیس محکمہ کے اندر اصلاح کرنے کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ پولیس تھانوں کے اندر مندر بنایا جانے لگا اور کسی نے یہ سوال نہیں کیا کہ اس سیکولر محکمے میں کسی خاص مذہب کا بول بالا قائم کرنے کی اجازت کیوں کر دی جا سکتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد ملک کے مسلمانوں کو مسلسل شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ جان بوجھ کر انہیں پولیس محکمے سے دور رکھا گیا اور ان کے ساتھ امتیازی سکوک کیا گیا۔ بہت سارے خفیہ فرمان لائے گئے اور محکمہ پولیس میں مسلمانوں کی تقرری نہ کرنے کی سازش کی گئی۔ اس طرح کی فرقہ وارانہ سیاست کا مرکز اتر پردیش رہا۔ آزادی کے آس پاس اتر پردیش میں مسلمان پولیس میں اپنی آبادی سے بھی زیادہ تعداد میں نوکری کرتے تھے، مگر بعد کی حکومتوں نے ان کے ساتھ امتیاز برتا۔ ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کی دہائیوں میں وی پی سنگھ اور ملائم سنگھ یادو نے مسلمانوں کو پولیس میں ملازمت دینے کی کوشش کی مگر وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوئی۔

دلی کے صدر بازار علاقے میں سال ۱۹۷۳ میں ہوئے فساد کی جانچ کرنے والے ایک سول سروینٹ آر پرساد نے بھی اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی۔ "جہاں دہلی میں مسلمانوں کی آبادی ۶ فی صد ہے، وہیں پولیس میں ان کی نمائندگی ایک فی صد ہے۔ یہ نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے درست نہیں ہے"۔

رفتہ رفتہ پولیس کا رویہ مسلمانوں کے تئیں منفی بنایا گیا، جو بعض اوقات سامنے آجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس کے تئیں اقلیتوں کے دل میں ڈر اور خوف کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کا علاج تنوع اور تکثیریت ہے۔ اگر سماج کے اندر تنوع پایا جاتا ہے تو لازم ہے کہ اس کا عکس دیگر اداروں جیسے پولیس اور فوج میں بھی نظر آنا چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس سے فرقہ پرست سیاست دانوں کو پولیس پر دباو ڈال کر کام کروانا نسبتاً مشکل ہو جائے گا اور وہ پولیس کا استعمال کسی خاص گروپ کے خلاف کرنے سے پہلے کئی بار سوچیں گے۔ حالانکہ یہ ضروی نہیں ہے کہ جن ریاستوں میں اقلیتوں کا تناسب محکمہ پولیس میں کم ہے وہاں ان کو ہر حال میں نشانہ بنایا جائے گا۔ مثال کے طور پر مغربی بنگال اور بہار میں مسلمان اپنی آبادی سے بہت کم پولیس میں ہیں۔ مگر لیفٹ اور لالو پرساد یادو کی قیادت والی سرکاروں کے دوران مسلمان ان ریاستوں میں محفوظ رہے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بنگال کی سی پی ایم کی سرکار اور لالو پرساد یادو کی جنتا دل اور راشٹریہ جنتا دل کا سیاسی نظریہ سیکولرازم ہے اور ان کی سیاسی قیادت فساد روکنے کے لیے پر عزم رہتی ہے۔ یہ بات مشہور ماہر سیاسیات پال براس کی دلیل سے ملتی ہے کہ فسادات ہوتے نہیں، بلکہ کرائے جاتے ہیں۔ اتر پردیش کے مختلف ضلعوں میں کام کر چکے پولس افسر وبھوتی نرائن رائے نے بھی اپنی کتاب "کمباٹنگ کمیونل کنفلکٹز (۱۹۹۹)" میں مسلمانوں کی پولیس میں کم تعداد پر افسوس ظاہر کیا ہے۔ "پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کی شرح سے کافی کم ہے۔ بی پی آر اینڈ ڈی نے یہ دکھایا ہے کہ فرقہ وارنہ طور سے حساس ریاستوں میں ان کی آبادی ۵ فی صد سے کم ہے (ص۔۴۔۳)"۔

اسی کتاب میں رائے نے اس بات پر بھی مایوسی ظاہر کی ہے کہ خاکی وردی پہننے کے بعد بھی پولیس کے جوان ہندو اور مسلمان کی اصطلاح میں سوچتے ہیں اور اپنے مذہبی تشخص سے باہر نہیں نکل پاتے ہیں۔

سلسلہ صفحہ نمبر ۱۴

اسلام کو درپیش فکری و علمی چیلنج اور ہماری ضرورتیں

عصرِ حاضر میں اسلام: سوالات اور سوچ کے نئے پہلو

ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ کے زیر اہتمام سہ روزہ سمینار میں امیر جماعت اسلامی ہند جناب سید سعادت اللہ حسینی کلیدی خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں بائیں سے مولانا اشہد جمال ندوی سکریٹری ادارہ، مولانا محمد جرجیس کریمی کنوینر سمینار، سابق امیر جماعت و صدر ادارہ مولانا جلال الدین عمری، مولانا اشتیاق احمد ظلی نائب صدر ادارہ اور انجینئر نسیم احمد خان معاون سکریٹری بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

سید سعادت اللہ حسینی

امیر، جماعت اسلامی ہند

(علی گڑھ میں گزشتہ دنوں ایک موقر سیمینار کے افتتاح اور کلیدی خطبہ کی پیشکش کے تحت بعض اہم تجاویز اس مقالہ میں پیش گئی ہیں، قارئین دعوت کے ملاحظہ وافادیت کے لیے ان کے اجزا کو پیش کیا جارہا ہے۔ معزز قارئین اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کر سکتے ہیں۔)

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے دینی و علمی سرمائے میں ایک ہمہ تہذیبی سماج کے بہت سے مسائل ابھی بھی حل طلب ہیں۔

اس بحث کا سب سے اہم پہلو فکری اور تصوراتی ہے۔ ایک ہمہ تہذیبی سماج کو دیکھنے کا اسلامی زاویہ کیا ہو؟ اس کی اسلامی تھیوری کیا ہو سکتی ہے؟ ایسے سماج میں اسلامی مقصد و نصب العین کیا ہونا چاہیے؟ ریاست کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ سماج کی قدروں سے ہمارا رشتہ کیا ہونا چاہیے؟ ان سوالات کا ہندوستان کی اسلامی تحریک کو برسوں سے سامنا ہے۔ اور تحریک نے اپنے عمل سے ان کا جواب بھی فراہم کیا ہے لیکن جب تک یہ سوالات فکر اور نظریہ کی اونچی سطح پر ایڈریس نہیں ہوں گے الجھنیں باقی رہیں گی۔ ان الجھنوں کی سنگینی کا اندازہ ان مباحث سے ہوسکتا ہے جو گزشتہ کئی دہوں سے یورپ میں جاری ہیں اور جہاں ایک جداگانہ 'یورپی اسلام' (European Islam) کا تصور پیش کیا جارہا ہے۔ ہمارے ملک کی حالیہ احتجاجی مہمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ بحثیں ہمارے ملک کے نوجوانوں میں بھی چل پڑی ہیں۔ اگر ان سوالات کو فوری ایڈریس نہیں کیا گیا تو یورپی مسلمان جس فکری بحران سے گزرے ہیں اندازہ یہ ہے کہ وہ بحران ہمارے ملک میں بھی درآمد ہوگا۔

بحث کا ایک پہلو فقہی ہے۔ ہمارے فقہی سرمائے کا بیشتر حصہ مسلم اکثریتی علاقوں اور زمانوں میں اور مسلمان حکومتوں کے زیر سایہ وجود میں آیا ہے۔ ایک ہمہ تہذیبی معاشرے سے متعلق بہت سے سوالات کا اطمینان بخش اس سرمائے میں نہیں ملتا۔ اسی صورت حال نے فقہ الاقلیات جیسے مباحث کو جنم دیا ہے۔ ابھی بھی ہمارے ملک اور یہاں کے حالات کے تناظر میں یہ بحث بہت ابتدائی ہے۔ اس کو بہت کچھ آگے بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ہمارے ملک کی حالیہ احتجاجی مہمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ بحثیں ہمارے ملک کے نوجوانوں میں بھی چل پڑی ہیں۔ اگر ان سوالات کو فوری ایڈریس نہیں کیا گیا تو یورپی مسلمان جس فکری بحران سے گزرے ہیں اندازہ یہ ہے کہ وہ بحران ہمارے ملک میں بھی درآمد ہوگا۔

بحث کا تیسرا اہم پہلو سماجیاتی ہے۔ یعنی ایسے سماجوں کا اسلامی نقطہ نظر سے سماجیاتی مطالعہ، اسلامی نصوص اور سماجیات و اجتماعی نفسیات وغیرہ کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں ایسے سماجوں کا تحلیل و تجزیہ۔

نئے بیانیہ اور نئے اپروچ کی ضرورت

ان سب حالات کی وجہ سے اس بات کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اسلامی فکر کا بدلے ہوئے حالات سے مطابقت رکھنے والا نیا بیانیہ تشکیل پائے۔ یہ بیانیہ نئے احوال سے مطابقت رکھنے والا اور اجتہادی روح کا حامل بھی ہو اور اس معذرت خواہانہ اور مصالحت پرستانہ انداز سے بھی پاک ہو جس کا ماڈریٹ اسلام کے نام پر اس وقت غلغلہ ہے۔

اس نئے بیانیہ کی خصوصیات کیا ہوں؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے۔ اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کچھ باتیں جو اس وقت بطور مثال ذہن میں آرہی ہیں، انہیں عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں۔

الف) نظام یا تہذیب؟

جدیدیت نے دنیا کو نظریات اور نظاموں کی حکمرانی فراہم کی تھی۔ قومی ریاست، قوت وطاقت کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ قومی ریاست کے اقتدار اعلیٰ (sovereignty) کا تصور جدید سیاست کا اہم ترین تصور تھا۔ ان حالات میں اسلامی مفکرین نے بجاطور پر ریاست اور سیاسی نظام کو اپنے بیانیہ کا بھی اور اسلامی نصب العین کا بھی اہم ترین عنوان قرار دیا تھا۔ بدلی ہوئی دنیا میں جبکہ سیاست کے بالکل نئے روپ سامنے آرہے ہیں، نیشن اسٹیٹ کی آہنی دیواریں تیزی سے زمین بوس ہورہی ہیں، افکار و نظریات کے بڑے نظام معدوم ہوتے جارہے ہیں، اور تجارتی مفادات، ٹکنالوجی کے کرشمے اور تہذیبی قدریں زیادہ تر نئی دنیا کی صورت گری کررہی ہیں، یہ سوال نہایت اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ اسلامی فکر کی پیشکش کا موثر طریقہ کیا ہوسکتا ہے؟ اقامت دین یعنی مکمل اسلامی زندگی کے خواب میں کیا اب بھی ریاست مرکزی اہمیت کی حامل ہے؟ ایک خیال یہ ہے کہ اس بدلے ہوئے دور میں تہذیب اور تمدن پر بہت زیادہ زور دینے کی ضرورت ہے۔ یعنی ایک ہمہ گیر تہذیبی و تمدنی انقلاب اسلامی جدوجہد کا ہدف بنے اور اس انقلاب کے لیے درکار فکری کمک فراہم کی جائے۔ اسلام کے ایک ایسے تہذیبی بیانیہ کو سامنے لایا جائے جس میں موجودہ دور کے اٹھائے ہوئے تہذیبی اور تمدنی سوالات، اسلام کی روشنی میں اطمینان بخش حل فراہم کیا جائے۔ ایک فرد کے لئے خوشحال زندگی کا راستہ کیا ہے؟ خاندان اور جنسی رویوں کو کن قدروں کا پابند ہونا چاہیے؟ میڈیا اور سوشل میڈیا کی اخلاقیات کیا ہوں؟ جدید ترین ٹکنالوجی کے حوالے سے اسلامی موقف کیا ہو؟ انسانوں کی نگرانی اور ان کے حق انتخاب پر نیز ان کے ضمیر اور ان کی رائے پر ٹکنالوجی کے کنٹرول کے سلسلے میں اسلام کی رہنمائی کیا ہے؟ ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں شہری تنظیم کے اصول کیا ہوں؟ عصری مالیاتی طریقوں کے سلسلے میں اسلامی اپروچ کیا ہو؟ فنون لطیفہ اور تفریحات کا اسلامی پیراڈائم کیا ہو؟ الگورتھم کی حکمرانی کو اسلامی فلسفہ کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات نہایت عمیق غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ ان کے سلسلے میں فتوے مطلوب نہیں ہیں بلکہ گہرے سماجیاتی حل اور اطمینان بخش کلامی مباحث مطلوب ہیں۔

یہ تہذیبی بیانیہ جہاں عصر حاضر کی سوچ اور رائج طریقوں پر نقد کرے وہیں نئے رجحانات اور طریقوں کی ایجاد و اختراع کا بھی ذریعہ بنے یعنی صرف رد عمل پر مبنی (reactive) نہ ہو بلکہ اقدامی (proactive) بھی ہو۔

اس سلسلے میں سب سے اہم مثال اسلامی معاشیات کی دی جا سکتی ہے۔ اسلامی معاشیات، اسلام کے انسان دوست اصولوں اور قدروں کو روبہ کار لانے کا ایک موثر ذریعہ بن سکتا تھا۔ اسی علی گڑھ میں اسلامی معاشیات کا جو خواب دیکھا گیا تھا وہ بڑی تمدنی تبدیلی کا خواب تھا۔ لیکن اب اسلامی معاشیات دھیرے دھیرے اسلامی مالیات تک محدود ہوگئی اور اسلامی مالیات بھی اسلام کے معاشی مقاصد کے حصول کا انقلابی ذریعہ بننے کے بجائے جدید سرمایہ دارانہ معیشت ہی کے آلات و وسائل میں فقہی حیلوں کے سہارے اسلامی پیوند کاری تک محدود ہوکر رہ گئی۔ اس وقت جو تہذیبی چیلنج درکار ہے وہ اعلیٰ درجہ کی تخلیقی اور اجتہادی سوچ کا تقاضہ کرتا ہے۔

ب) قانون یا اقدار؟

گزشتہ صدی میں قومی ریاست اور اس کا قانونی نظام ایک ہمہ گیر قوت کے طور پر سامنے آیا تھا۔ دنیا کے سامنے یہ سوال سب سے اہم سوال بن گیا تھا کہ جدید دنیا کا قانونی نظام کیا ہو؟ اس وقت ہمارے بزرگوں نے اسلامی شریعت اور اسلام کے قانونی نظام کو وضاحت کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اب دنیا ایک ایسے دور میں قدم رکھ رہی ہے جہاں انسانوں پر حکومتوں کے قوانین سے زیادہ غیر حکومتی عناصر (Non State Players) یعنی کارپوریٹ، ٹکنالوجی، میڈیا وغیرہ کا استبداد بڑھ رہا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اسلام کی قدریں یا جسے عصری اصطلاح میں نرم قوت (SoftPower) کہا جاتا ہے، اس کو نمایاں کیا جائے۔

ج) روحانی تسکین

ٹکنالوجی کے اس دور میں انسان کی بڑی ضرورت روحانی تسکین ہے۔ اس ضرورت کا بہت سی غیر اسلامی تحریکیں بری طرح استحصال کررہی ہیں۔ روحانیت کے نام سے دسیوں ادارے اب عالمی برانڈ بن چکے ہیں۔ عہد وسطیٰ میں اسلام کی کشش کا ایک بڑا سبب اس کی روحانی طاقت تھا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ جدید حالات و مسائل کے تناظر میں اسلام کو روحانی ارتقاء اور روحانی تسکین کے ایک موثر فلسفے کے طور پر پیش کیا جائے۔

د) مذاہب کو مخاطب کرنے کی ضرورت

بیسویں صدی کے تحریکی ڈسکورس میں اصلاً جدید نظریات کو مخاطب کیا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں واضح کیا گیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں مذہب کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور مذہب پر مبنی روحانی، اخلاقی، تہذیبی اور تمدنی فلسفے دنیا کو متوجہ کررہے ہیں۔ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ مذہب اور مذہبی فلسفوں کو مخاطب کیا جائے۔ عیسائیت کے ساتھ ساتھ بدھ مت، ہندوازم اور چین و جاپان کے مذہبی اور نیم مذہبی فلسفے، کہیں روحانیت کے نام پر، کہیں تناؤ سے پاک خوشگوار زندگی کے نام پر، کہیں ماحولیات کے تحفظ کے نام پر اور اس طرح مختلف عنوانات سے ایک نئے عالمی تمدن کی صورت گری میں اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔ ان سب کا جواب دینا تو دور کی بات ہے، ان کا سنجیدہ، گہرا مطالعہ بھی ابھی ہماری جانب سے باقی ہے۔

خود ہمارے ملک میں قوم پرستی کے نام پر احیا پرستی اور نسل پرستی کی ایک طاقتور تحریک غیر معمولی، سیاسی و سماجی قوت سے مالامال ہوچکی ہے۔ اس تحریک کے اثرات اب ہمارے ملک سے نکل کر ساری دنیا میں عام ہونے لگے ہیں۔ اس تحریک کا ایک پہلو تو سیاسی ہے لیکن ایک بہت بڑا پہلو تہذیبی، تمدنی اور سماجی ہے۔ اس تحریک کا اسلامی ریسپانس ابھی بھی وقتی سیاسی اختلاف یا اس کے اختلاف میں اٹھنے والی سیکولر آوازوں میں آواز ملانے سے آگے نہیں بڑھ پایا ہے۔ یہ صرف ہندوستان کی حد تک نہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی اسلامی فکر کی بہت بڑی کمی ہے۔

نئے افکار، نئے نظریات اور نئے آئیڈیاز

یہ تفصیلی بحث اس موقع پر میں نے اس لئے چھیڑی ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت اسلام کو درپیش فکری اور علمی چیلنج بہت بنیادی اور بہت گہرا ہے۔ ہماری ضرورتیں نہ سوالات کے فقہی جوابات اور فتووں سے پوری ہوسکتی ہیں اور نہ محض پرانی کتابوں کی باتوں کو نئی زبان میں دہرانے سے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے اہل فکر عصر حاضر کے مسائل اور افکار و نظریات کا انتہائی گہرا مطالعہ کریں اور نئے افکار اور نئے آئیڈیاز کے ساتھ سامنے آئیں۔

اس کام کے لئے علی گڑھ کی سر زمین اور اس ادارہ سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی۔ یہ کام علمائے دین اور سماجی سائنسدانوں کے اشتراک اور ہم آہنگی ہی سے ممکن ہے۔ علی گڑھ میں تمام سماجی علوم کے نیز انجینیرنگ، ٹکنالوجی، میڈیسین، قانون، علم انتظام وغیرہ جیسے علوم کے بہترین شعبے موجود ہیں۔ دینی اداروں اور علمائے دین سے ربط و ہم آہنگی کے لحاظ سے بھی ملک میں اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہے۔ اس لیے بجاطور پر علی گڑھ کے اس ممتاز ادارہ سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر نئی سوچ اور نئے آئیڈیاز کی تخلیق کے عمل کا آغاز کرے۔ اس سیمینار سے بھی مجھے امید ہے کہ اس سلسلہ کو شروع کرنے میں مدد ملے گی۔

ان پیچیدہ چیلنجوں کو سمجھنے اور اس کا حل تلاش کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن نوخیز ذہنوں سے بھی مدد لی جائے جن کی فکری توانائیاں ابھی تازہ دم ہیں اور لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی اس دنیا کی پیچیدگیوں کو جو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرح کے سیمیناروں میں نوجوان اہل علم، مرکزی یونیورسٹیوں کے نوجوان فضلاء اور طلبہ کی ایک تعداد ضرور شریک ہونی چاہیے۔ عالم اسلام کے مختلف علاقوں کے حالیہ تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خواتین کو بھی جب موقع فراہم کیا جاتا ہے تو وہ غیر معمولی علمی و تحقیقی کام کرتی ہیں ان کی شرکت بھی بڑھنی چاہیے۔

عالم اسلام کے مختلف علاقوں کے حالیہ تجربات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان خواتین کو بھی جب موقع فراہم کیا جاتا ہے تو وہ غیر معمولی علمی وتحقیقی کام کرتی ہیں ان کی شرکت بھی بڑھنی چاہیے۔

قانون کے رکھوالوں کی سفاکیاں، انسانیت لہولہان

بسلسلہ صفحہ نمبر ۵

پولیس کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ملک کے قانون کے مطابق کام کرے۔ مگر دلی فسادات کے دوران پولیس نے پھر ایک بار عوام کو مایوس کیا ہے۔ کئی دنوں تک دلی کی سڑکوں پر قانون کی بالادستی کی جگہ نفرت کا راج قائم رہا۔ ایسی نفرت جس نے فسادیوں کے دلوں کو پتھر سے بھی سخت بناڈالا تھا۔ انسانیت اور اخوت کی جگہ درندگی ان کے سروں پر جنوں بن کر سوار تھی۔ جن علاقوں میں بے سہاروں کے گھر، دکان اور مذہبی مقام جلائے جارہے تھے، وہاں پولیس جان بوجھ کر غائب تھی۔ لوگ مدد کے لیے چیخ رہے تھے پولیس کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔ مظلوموں اور بے سہاروں کی مدد کرنا تو دور کی بات ہے پولیس بعض اوقات مسلمانوں کو 'سبق سکھلانے' کے لیے سڑکوں پر اتری ہوئی تھی۔ یہ بات تو ثبوت کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ فسادیوں کو پکڑنے اور حالات کو قابو میں کرنے کے لیے دہلی پولیس نے کوئی موثر اقدامات نہیں اٹھائے۔ الٹے پولیس ان لوگوں کو پریشان کررہی ہے جو فرقہ وارانہ تشدد کو روکنے کے لیے سرگرم عمل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر دلی پولیس نے عدالت عظمیٰ میں ایک حلف نامہ داخل کیا ہے اور مشہور و معروف سماجی جہدکار ہرش مندر کے خلاف نفرت انگیز تقریر کرنے کا الزام عائد کیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہرش مندر سیکولرازم اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے عرصے سے کام کررہے تھے۔ ان کی این جی او 'کاروان محبت' ہجومی تشدد اور منافرانہ جرائم کے متاثرین کے دکھ بانٹتی رہی ہے۔ یہ بات ارباب اقتدار کو پریشان کررہی تھی اور وہ ہرش مندر پر کارروائی کرنے کا بہانہ تلاش کررہے تھے۔ اب حکومت پولیس کو استعمال کرکے ان کو ہراساں کرنا چاہتی ہے۔ پولیس کا اس قدر کسی خاص سیاسی جماعت کے

تعلیمی ادارے اور محکوم طبقات کے حقوق

تعلیمی میدان میں محکوموں کے واجب حقوق پائے بغیر ملک میں انصاف کا نظام قائم نہیں کیا جاسکتا ہے

ابھے کمار

صدیوں سے بھارت میں محکوم، مظلوم اور پسماندہ طبقات کو وسائل اور تعلیم سے دور رکھا گیا ہے۔ ان پر چند اعلیٰ ذات کے امیر مردوں کا ہی قبضہ رہا ہے۔ بڑی ذات میں پیدا ہونے والے لوگ ہی زمین کے مالک رہے ہیں، جبکہ کھیت میں کام کرنے والا اکثر دلت، آدی واسی اور پچھڑا ہوتا ہے۔ مذہبی اور تعلیمی اداروں پر بھی اعلیٰ ذات کے لوگوں کا ہی قبضہ رہا۔

مذہبی کتابوں میں بے شمار جگہوں پر انہوں نے یہ بات درج کر دی ہے کہا کہ اعلیٰ ذات کے لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے پسماندہ اور دیگر محروم طبقات پیدا ہوئے ہیں۔ تعلیم پانے کی خواہش رکھنے والے نچلے طبقات کے لوگوں کو انہوں نے تعلیم کے قابل نہیں سمجھا۔ اگر کسی طرح محروم طبقات نے خود کی محنت سے تعلیم حاصل بھی کر لی، تو اعلیٰ ذات کے استادوں نے ایکلویہ کی طرح ان کا انگوٹھا کاٹ کر انہیں بڑی دردناک سزا دی۔ بھارت کی پسماندگی اور یہاں کے سماج میں جذبۂ اخوت کی کمی کی ایک بڑی وجہ غیر برابری پر ٹکا ہوا معاشرہ ہے۔ چالاک اعلیٰ ذات کے لوگوں نے مذہبی کتابوں کی مدد سے غلط کو صحیح قرار دیا اور ناانصافی کو انصاف بنا کر پیش کیا۔

مگر اسلام کی آمد کے بعد بھارت کے حالات کچھ بہتر ہوئے۔ دین اسلام نے برابری پر زور دیا ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے اپنے آخری پیغام میں کہا تھا کہ گوروں پر کالوں کو برتری نہیں ہے اور نہ ہی ایک قوم کی بالادستی دوسری قوم پر ہونی چاہیے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ اسلام کا پیغام مسلم حکمرانوں اور شرفاء نے اپنی سہولت کے مطابق یاد رکھا اور بھلا بھی دیا۔ بھارت کے پسماندہ طبقات کے لوگ اسلام کی طرف راغب ہوئے اور انہوں نے اس میں امید کی روشنی دیکھی۔ مگر امیر اور اعلیٰ ذات کے مسلمانوں نے پسماندہ طبقات کو اکثر مسلمان اور برابر کا انسان کم اور حقیر زیادہ سمجھا۔ المیہ دیکھیے کہ مذہب بدلنے کے بعد بھی ملک کے پسماندہ طبقات کو وہ انصاف نہیں ملا، جس کی حسرت ان کے دلوں میں تھی اور نہ ہی ان کے حالات میں بہت زیادہ بہتر ہوئی۔ مسلم حکمرانوں نے ملک کے غریب ترین لوگوں کو گلے لگانے کے بجائے دوسرے مذاہب کے شرفا سے گٹھ جوڑ کیا۔ مغل بادشاہ اورنگزیب، جسے مندر توڑنے کے لیے بھگوا طاقتیں دن رات نشانہ بناتی ہیں، اس نے اپنے دور اقتدار میں سب سے زیادہ ہندو شرفا کو منصب پر بیٹھایا تھا۔ بدلے میں انہوں نے اورنگزیب کی حکومت کو تقویت دینے میں سب کچھ کیا۔ سلطنت بدل گئی، حاکم کا دین بھی بدل گیا، مگر رعایا کی تقدیر نہیں بدلی۔ پچھڑا، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، پسماندہ ہی رہا۔ دھوبی، نائی، کسان، مزدور، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، محکوم ہی رہا۔

بعد میں جب انگریزوں حاکم بنے۔ مغل بادشاہوں سے الگ، ان کا مقصد بھارت کا اقتصادی طور پر بڑا استحصال کرنا تھا۔ دھیرے دھیرے بھارت میں نوآبادیاتی نظام قائم ہو گیا۔ اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے انہوں نے دھرم کے نام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑوایا اور فرقہ وارانہ تاریخ کو نصاب کا حصہ بنا کر سماج کے ذہن کو نفرت کے بارود سے بھر دیا۔ مگر انگریزی حکومت کے ساتھ، جدید نظریات بھی بھارت میں آئے۔ اسی انگریزی حکومت کے دور میں ملک کے دلت اور پسماندہ طبقات کو کچھ ایسے مواقع فراہم ہوئے، جن کو انہیں صدیوں سے محروم رکھا گیا تھا۔ پہلی بار ان کے سامنے ایک ایسی حکومت تھی، جو ذات پات کے بجائے قانون کے سامنے سب برابر ہیں کی بات کرتی تھی۔ انگریزی حکومت کے آنے کے بعد ایک اچھی تعداد میں پسماندہ طبقات کے لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے اور سرکاری نوکری پانے کا ایک موقع ملا۔ یہ بھارت کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا۔ مہاراشٹرا میں پیدا ہوئے جیوتی پھلے انگریزی

”

ناانصافی دیکھیے کہ آج کی تاریخ میں بھی تعلیمی اداروں اور سرکاری نوکریوں میں دلت، آدی واسی اور پسماندہ طبقات کو حق نہیں مل پایا ہے۔ مثال کے طور پر مرکزی یونیورسٹی میں پچھڑے سماج کے پروفیسر ندارد ہیں۔ اعلیٰ ذات کی لابی ایک کے بعد ایک سازش رچ کر محکوموں کو اُن کے آئینی حقوق سے محروم رکھنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ اعلیٰ ذات نجکاری کی پالیسی اپنا کر سرکاری اداروں کو اپنے ایجنٹوں کو بیچ رہی ہے۔ نجکاری کی وجہ سے ریزرویشن پر بڑی مار پڑتی ہے کیونکہ پرائیویٹ اداروں میں ریزرویشن نافذ نہیں ہوتا ہے۔ جو سرکاری ادارے باقی ہیں، وہاں بھی زیادہ تر نوکریاں ٹھیکے پر دی جا رہی ہیں، جہاں ریزرویشن نہیں ہے۔

حکومت اور عیسائی مشنری کے کام کاج کو نزدیک سے دیکھا۔ پھلے نے اعلیٰ ذات کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پسماندہ طبقات سے اپیل کی کہ وہ تعلیم حاصل کریں۔ مہاتما پھلے پسماندہ مالی ذات سے آتے تھے اور انہوں نے دلت و پسماندہ خواتین کے لیے شاید سب سے پہلے اسکول کھولا۔ انہوں نے انیسویں صدی میں ہی خواتین کی تعلیم کی بات کی جب دنیا کے مختلف حصوں میں عورتوں کو برابر کا انسان بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پھلے کا کہنا تھا کہ بھارت کے پسماندہ طبقات کے اوپر باہر سے آئے اعلیٰ ذات کے لوگوں نے اپنا تسلط قائم کیا اور صدیوں سے چلے آرہے اپنے راج کو بنائے رکھنے کے لیے محکوموں کو تعلیم سے دور رکھا۔ بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے مہاتما پھولے اور اُن کی اہلیہ ساوتری بائی پھلے کی راہ پر چلتے ہوئے محکوموں کے لیے ریزرویشن کی لڑائی لڑی اور ان سے کہا کہ نجات کا راستہ تعلیم حاصل کرنا، آپس میں اتحاد پیدا کرنا اور ظلم کے خلاف اور سماجی انصاف اور برابری پانے کے لئے مزاحمت کرنا ہے۔

آزادی کے بعد دلت یعنی ایس سی اور آدی واسی یعنی ایس ٹی کو ان کی آبادی کے تناسب سے تعلیمی اداروں، سرکاری نوکری اور قانون ساز اسمبلی میں ریزرویشن دیا گیا۔ پچھڑا، پسماندہ طبقات کو ایجوکیشن اور نوکری میں ہی صرف ریزرویشن ملا اور وہ بھی آزادی کے چار دہائی بعد۔ ناانصافی دیکھیے کہ آج کی تاریخ میں بھی تعلیمی اداروں اور سرکاری نوکریوں میں دلت، آدی واسی اور پسماندہ طبقات کو حق نہیں مل پایا ہے۔ مثال کے طور پر مرکزی یونیورسٹی میں پچھڑے سماج کے پروفیسر ندارد ہیں۔ اعلیٰ ذات کی لابی ایک کے بعد ایک سازش رچ کر محکوموں کو اُن کے آئینی حقوق سے محروم رکھنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ اعلیٰ ذات نے نجکاری کی پالیسی اپنا کر سرکاری اداروں کو اپنے ایجنٹوں کو بیچ رہی ہے۔ نجکاری کی وجہ سے ریزرویشن پر بڑی مار پڑتی ہے کیونکہ پرائیویٹ اداروں میں ریزرویشن نافذ نہیں ہوتا ہے۔ جو سرکاری ادارے باقی ہیں، وہاں بھی زیادہ تر نوکریاں ٹھیکے پر دی جا رہی ہیں، جہاں ریزرویشن نہیں ہے۔ تعلیمی اداروں میں فیس بڑھا کر محکوم طبقات کو باہر کا راستہ دکھایا جاتا ہے کیونکہ زیادہ تر غریب لوگ دلت، آدی واسی، پچھڑا اور مسلمان ہیں۔ پھر انٹرویو کے دوران محکوم طبقات کے امیدواروں کو دانستہ طور پر بہت ہی کم نمبر دیا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں عام زمرے کی تمام سیٹوں کو، جس پر سب کا حق ہے، صرف اعلیٰ ذاتوں کی جاگیر بنا دی گئی ہے۔ کئی بار دلت، آدی واسی امیدوار جنرل کیٹیگری میں انٹرویو دینے جاتا ہے تو اس کو انٹرویو دینے سے پہلے کئی اعتراضات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں مسلمانوں کی حالت تو سب سے زیادہ خراب ہے۔ اگر مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو او بی سی ریزرویشن میں شامل نہیں کیا جاتا اور اے ایم یو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے تعلیمی ادارے نہیں ہوتے تو آج کالج اور یونیورسٹی میں مسلمان چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ بھید بھاؤ صرف ریاستی یونیورسٹی میں نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ملک کے معزز اور موقر کالج، یونیورسٹی اور تحقیقی اداروں میں بھی دیکھنے کو مل رہا ہے۔ حال کے دنوں میں دہلی میں واقع جے این یو میں محکوم طبقات کے طلبہ کو پی ایچ ڈی انٹرویو کے دوران بہت ہی کم نمبر دے کر داخلہ پانے سے روک دیا گیا، جبکہ پریاگ راج میں واقع جی بی پنت انسٹی ٹیوٹ میں جنرل کیٹیگری کے امیدوار کو منتخب کر لیا گیا، جبکہ او بی سی امیدوار کو ساری ڈگری اور لیاقت کے باوجود بھی نااہل قرار دے دیا گیا۔ بورڈ کی بے ایمانی دیکھیے کہ جس امیدوار نے درجہ اول سے لے کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور ریسرچ پیپر لکھا اس کی دہائیوں کی محنت کو پانچ منٹ کے اندر میں صفر ثابت کر دیا گیا! یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ تعلیمی میدان میں محکوموں کے واجب حقوق پائے بغیر ملک میں انصاف کا نظام قائم نہیں کیا جاسکتا ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

مودی حکومت کی تعلیمی پالیسی کیخلاف طلبائی مزاحمت کی داستان

ایڈمن

حالیہ شمارہ

ابھے کمار

مودی حکومت کے پانچ سال پورے ہوگئے ہیں۔ اب انہیں پارلیمانی انتخاب میں حصہ لے کر اپنی کارکردگی کا حساب عوام کو دینا ہے۔ یہ تو کہنا ابھی جلد بازی ہوگی کہ عوام کا آخری فیصلہ کیا ہوتا ہے، تاہم اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ حکومت کی غلط پالیسیوں کے خلاف مزاحمت کرنے میں جو طبقہ گزشتہ پانچ سالوں میں پیش پیش رہا ہے وہ طلبا اور نوجوانوں ہی کا طبقہ ہے۔ طلبہ کے علاوہ، کسان، مزدور، اقلیت، دلت، آدی واسی، پسماندہ اور دیگر محروم طبقات بھی مودی حکومت کی

پالیسیوں کے شکار رہے ہیں۔ مگر حکومت کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ اس ماہ ہونے والے لوک سبھا انتخاب میں رائے دہندگان میں سب سے بڑی تعداد نوجوانوں اور طلبا کی ہے اور اگر ان کی ناراضگی انتخابات تک برقرار رہی، تو مودی جی کا دوبارہ اقتدار میں آنا مشکل ہوگا۔

طلبا کی ناراضگی دور کرنے کے لیے، مودی حکومت اگر کچھ کرنا بھی چاہے تو اب وہ نہیں کر سکتی ہے۔ دیر بہت ہو چکی ہے۔ انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہو چکا ہے۔ حکومت الیکشن کمیشن کے بنائے گئے ضابطوں کو ماننے کے لیے پابند عہد ہے۔ اس لیے وہ بعض 'من لبھاون' منصوبے لانا بھی چاہے تو نہیں لا سکتی۔

جب ہم مودی حکومت کی تعلیمی پالیسی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہاتھ لگتی ہے۔ تعلیم کو سب تک پہنچانے، اس کے بجٹ کو بڑھانے اور روزگار کے مواقع زیادہ سے زیادہ فراہم کرنے کے وعدوں کو، مودی جی نے پورا نہیں کیا۔ یہ سارے وعدے صرف انتخابی جملے ہی ثابت ہوئے۔

یہ وجہ ہے کہ مودی حکومت کے پانچ سالوں کے دوران، ریاستی مشینری اور طلبا آمنے سامنے کھڑے رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مودی حکومت کے خلاف اصل معنوں میں طلبا نے ہی حزب اختلاف کا رول ادا کیا ہے۔ جب مودی جی کی غلط پالیسیوں پر تنقید کرنے کی ہمت اپوزیشن پارٹیاں بھی نہیں جٹا پا رہی تھیں، تب یونیورسٹیوں نے ہی 'مودی سرکار مردہ باد!' کے نعرے بلند کیے۔

امتیازی سلوک کے خلاف منظم جدو جہد کی ضرورت

فلسطینی مزاحمت

شمارہ پڑھیں

جب مودی حکومت نے تعلیم کی نجی کاری اور 'بھگوا کرن' کا ایجنڈا تھوپنا شروع کیا، تب طلبا کے سامنے مزاحمت کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ پورے پانچ سال، طلبا سڑکوں پر 'بول رے ساتھی ہلّہ بول، مودی سن لے اتنا بول!' کے نعرے بلند کرتے رہے۔ ایک لمبے عرصے کے بعد حکومت اور طلبا اس قدر ایک دوسرے سے بھڑتے رہے۔ مگر مودی حکومت نے جو حملے تعلیم پر کیے ان سب کا ذکر کرنا ایک یہاں ممکن نہیں ہے۔ لہذا میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی، ٹیس، جیسے نامور اداروں سے جڑے ہوئے کچھ واقعات کا تذکرہ کروں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مودی حکومت ان اداروں پر حملے در حملے کرتی رہی۔ دوسری طرف طلبا نے بھی اس کے خلاف زبرست مزاحمت کی۔ یہ مضمون مودی حکومت کی طلبا مخالف پالیسی اور اس کے خلاف کی گئیں مزاہمتوں کا مختصر تذکرہ ہے۔ راقم الحروف خود بھی ان حملوں کا شکار رہا ہے اور ان مزاحمتوں کا حصہ رہا ہے۔

طلبا کی مزاحمت اس بات کے خلاف تھی کہ مودی حکومت کی تعلیمی پالیسی نے غریب اور محروم طبقات کو تعلیم سے کافی دور دھکیل دیا۔ نہ صرف فیس میں بے تحاشہ اضافہ کیا گیا، بلکہ اسکالرشپ میں بھی کافی تخفیف کردی گئی۔ اگر کاغذ پر اسکالرشپ رہی بھی تو اس کے حصول کی راہ میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کردی گئیں۔ مثال کے طور پر اقلیتی طبقات کو دی جانے والی مولانا آزاد نیشنل اسکالرشپ میں نیٹ پاس کرنا لازمی کردیا گیا۔ وہیں دوسری طرف نیٹ پاس کرنے والے امیدواروں کی تعداد کم کردی گئی۔ اتنا ہی نہیں تعلیمی اداروں میں طلبا کی 'اِن ٹیک سیٹ' کم کردی گئی۔ کئی اداروں میں تحقیق کررہے طلبا کے لیے دروازے بند کردیے گئے۔ یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں کے فنڈ اور گرانٹ میں زبردست تخفیف کردی گئی۔ سیمینار، لائبریری، لیب کے لیے مختص بجٹ میں اضافہ کرنے کے بجائے

اسے میں بھی تخفیف کر دی گئی۔ تعلیمی اداروں کو خود مختار بنانے کے بہانے ان کو پیسہ اُگائی کرنے کا کھلا لائسنس دے دیا گیا۔

بتدریج تعلیم کا بجٹ کم ہوتا چلا گیا۔ ایسا اس لیے بھی ہوا کہ اعلی مناصب پر براجمان افراد، جن کا کام پالیسی سازی ہے، عوام کی تعلیم پر خرچ کئے جارہے پیسے کو وسائل کی بربادی سمجھتے ہیں۔ وہ یہ بھی فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ پیسہ عوام کی محنت کی کمائی سے ٹیکس کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے اور اگر یہ پیسہ عوام کی تعلیم پر خرچ ہو تو اس سے بہتر بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ مگر ان کا مقصد یہ ہے کہ جو بھی تعلیم سرکاری بجٹ پر فراہم کی جارہی ہے اس کو پرائیویٹ کمپنیوں کو دے دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تعلیم بھی دوسری اشیاء کی طرح بازار میں فروخت ہو۔ تعلیم کی نجی کاری کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ اس کی سماج کے نچلے طبقات تک رسائی نہ ہو سکے۔ ان پالیسی سازوں کو ڈر ہے کہ اگر تعلیم محروم طبقات تک پہنچ جاتی ہے تو یہ برہمنی اور سرمایہ دارانہ نظام کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر غریب، محروم طبقات اور اقلیت تعلیم یافتہ ہو گئے تو ان کا تسلط کیسے بنا رہے گا؟

یہ بھی کتنی افسوسناک بات ہے کہ جہاں مودی حکومت نے تعلیمی اداروں کے فنڈ میں تخفیف کی وہیں ہزاروں کروڑ کے سرکاری پیسوں کو اپنے اور اپنی حکومت کی بڑائی میں اشتہارات پر خرچ کیے۔ اگر تعلیمی اداروں پر پیسے خرچ بھی ہوئے تو وہ بنیادی ضرورتوں کے لیے نہیں، بلکہ کیمرے لگوانے اور سیکوریٹی بڑھانے کے نام پر خرچ کیا گیا۔ اس طرح کے منصوبوں کو لاگو کرنے پر لیڈران اور افسران کو بڑا کمیشن ملتا ہے۔ جو باقی پیسے بچے ان کا بڑا حصہ بھگوا نظریہ ساز لیڈروں کی 'مورتی' (مجسمہ) لگانے، آر ایس ایس اور بی جے پی سے وابستہ بابا اور گرو کے پروگرام منعقد کرنے میں خرچ ہوئے۔

تضاد دیکھئے کہ پسماندہ اور چائے بیچنے والے غریب کے نام پر ووٹ مانگنے والے نریندر مودی نے پورے پانچ سال سرمایہ داروں اور آر ایس ایس کے لیے کام کیا۔ اپنے آپ کو بابا صاحب امبیڈ کا پیرو کار بتاتے نہیں تھکنے والے، وزیر اعظم مودی نے یونیورسٹیوں میں ریزرویشن پر ہوئے حملے در حملے کے خلاف منہ تک نہیں کھولا۔ کیا مودی یہ نہیں جانتے ہیں کہ امبیڈ کر یہ چاہتے تھے کہ سرکار رفاہی کاموں کو زیادہ سے زیادہ انجام دے اور سماج کے ہر طبقے، بالخصوص محروم طبقات، کی نمائندگی کو یقینی بنائے؟ مگر بابا صاحب کے خود ساختہ پیرو کار مودی نے رفاہی کاموں کو اُلٹا کم کر دیا یا ختم کر دیا اور محروم طبقات کی سرکاری اداروں سے بے دخلی پر منہ تک نہیں کھولے۔

یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ مودی نے اپنی انتخابی تشہیر کے وقت یہ بھی کہا تھا کہ وہ مسلمانوں کی طرقی کے خیر خواہ ہیں اور وہ ان کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں کمپوٹر دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے ساتھ بھی انصاف نہیں کیا گیا ہے اور ان سے کیے گئے وعدوں کو پورا نہیں کیا گیا ہے۔ اقلیتوں کی تعلیم پر توجہ دینا تو دور کہ بات ان کو اُلٹا نشانہ بنایا گیا ہے۔ جن یونیورسٹیز میں اقلیتی طبقے کے طلبا زیادہ تعداد میں زیر تعلیم ہیں ان کی فیس بڑھا دی گئی۔ سچر رپورٹ اور مشرا کمیشن کی سفارشات کے باوجود، حکومت مسلمانوں کی تعلیم کو لے کر بے حس رہی۔ الٹا اقلیتوں کے تعلیمی اداروں پر بھگوا شر پسند عناصر نے حملے کیے۔ اقلیتوں کو انصاف دینے اور حملہ آوروں کو سزا دینے کی بجائے، پولیس اور انتظامیہ حکومت کے دباؤ میں یا تو خاموش رہی یا حملہ آوروں کو تحفظ فراہم کرتی رہی۔

اگر کہا جائے کہ مودی حکومت کی تعلیمی پالیسیوں نے ملک کے تعلیمی اداروں کی بنیاد کھودنے کا کام کیا ہے تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ جو تعلیمی ادارے برسہا برس سے جاری تھے اور ملک کی ترقی میں ان کا نمایاں رول رہا ہے، ان پر ایک کے بعد ایک حملے کیے گئے۔ مقصد تھا ان کے کیریکٹر یعنی تشخص کو بدل دیا جائے۔ جو ادارے اپنے تشخص کو بدلنے کے لیے آسانی

سے تیار نہیں تھے ان کو برباد کرنے کی کوشش ہوئی۔ ایسا اس لیے کیا گیا کیوں کہ لبرل اور سیکولر تعلیمی اداروں سے سنگھ پریوار کو ایک لمبے وقت سے ٹیس ہے۔ ان کو درد اس بات کا ہے کہ یہ ادارے اس کے فرقہ وارانہ نظریہ کو قبول نہیں کرتے اور مسلسل اس کے خلاف مواد پیدا کرتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ راقم الحروف کا یہ قطعی ماننا نہیں ہے کہ تعلیم پر حملے مودی کے دور حکوت سے پہلے نہیں ہوئے تھے۔ دراصل سابقہ حکومتوں نے بھی تعلیم کو کافی نقصان پہنچایا۔ مودی جی سے پہلے منموہن سنگھ جی نے بھی تعلیم کی نجی کاری کے لیے پالیسی اپنائی۔ اس سے پہلے واجپئی سرکار نے تعلیم کی نجی کاری اور 'بھگواکرن' کرنے کی کوششیں کیں۔ واجپئی کے زمانے میں نصاب بدلنے کی سازش کی گئی اور نوکریوں کی بحالی کم کر دی گئی۔ جہاں بحالی بھی ہوئی وہاں بھگوا نظریہ کے حامل لوگوں کو باصلاحیت لوگوں پر ترجیح دی گئی۔ یہ سب کچھ ایک طویل منصوبہ کے تحت کیا گیا۔

تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آر ایس ایس، جن سنگھ اور بی جے پی روز اول سے تعلیم کے اوپر سرکاری بجٹ کو کم کرنے کے حق میں رہی ہیں۔ بھگوا طاقتیں چاہتی ہیں کہ تعلیم کا نجی کرن ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ سنگھی نظریہ لبرل فنون لطیفہ اور سماجی علوم کے تئیں بھی منفی رویہ رکھتا ہے۔ ان کے مقابلے وہ تکنیکی اور پروفیشنل تعلیم کو ترجیح دیتا ہے۔ حالانکہ اس کی تکنیکی اور پروفیشنل تعلیم سے 'محبت' بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے دور حکومت میں ان اداروں کی فیس نہ بڑھتی۔

لبرل فنون لطیفہ اور سماجی علوم کی تیز دھار کو کند کرنے کے لیے، مودی حکومت نے ملک کے نامور تعلیمی اداروں پر حملے کیے۔ مودی حکومت نے یہ طے کیا کہ جو ادارے سنگھ پریوار کے خلاف تنقیدی افکار کو پیدا کرتے ہیں یا اسے فروغ دیتے ہیں، اس کو بدنام کیا جائے۔ اسی منصوبے کے تحت فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ، پونے میں بی جے پی کا ڈائریکٹر مقرر

کر دیا گیا۔ اس تقرری کے خلاف فلم اینڈ ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ، پونہ نے اپنی مٹھی تانی۔ سیکڑوں طلبا نے تقریباً 160 دنوں تک بھوک ہڑتال پر بیٹھے رہے۔ ان کا واجب مطالبہ تھا کہ بی جے پی کے ممبر گجندر چوہان کو انسٹی ٹیوٹ کے صدر کے عہدے سے ہٹایا جائے کیوں کہ ان کی صلاحیت اس ذمہ داری کے لیے بالکل بھی میچ نہیں کھاتی تھی۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ چوہان کو لا کر بی جے پی اس ادارے کے تشخص کو بدلنا چاہتی تھی۔ مگر حکومت کو کون سمجھائے کہ اس سے ایک خاص پارٹی کو بھلے ہی فائدہ ہو جائے مگر اس طرح کی تقرری نے ادارے کو بہت نقصان پہنچایا۔ یہ سلسلہ رکنے کے بجائے چلتا رہا۔ بڑے بڑے اداروں کو چلانے کے لیے نااہل لوگوں کو بھیجا گیا۔ ڈائریکٹر، وائس چانسلر اور پروفیسر بننے کے لیے سارے ضابطوں اور قوانین کو طاق پر رکھا گیا اور سنگھ سے جڑے ہوئے لوگ ان اداروں پر بیٹھ کر اس کی بنیاد کمزور کرنے کا کام انجام دینے لگے۔ اسی دوران حیدرآباد میں واقع حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں بھی سرکار کے خلاف آوازاٹھنی شروع ہو گئی۔ ایچ سی یو میں ایک دلت طالب علم، جن کو ہم روہت ویمولا کے نام سے جانتے ہیں، کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا گیا۔ روہت ویمولا کو طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ اس کے وظیفے کو روک دیا گیا۔ اسے ہاسٹل سے نکال دیا گیا۔ ایک دلت طالب علم کے خلاف پورا برہمنی نظام مل کر کام کر رہا تھا۔ مجبوراً روہت ویمولا نے ایک دن خودکشی کرلی۔ اس خبر نے پورے ملک میں سنسنی پھیلا دی۔ دلت طلبا اس کے خلاف پورے ملک میں احتجاج کرنے لگے۔ ان کی اس لڑائی میں پسماندہ، اقلیت اور دیگر روشن خیال طبقہ ساتھ آیا۔ احتجاج کی شدت سے گھبرا کر حکومت نے کیمپس میں پولیس بلائی اور طلبہ کے خلاف طاقت کا استعمال کیا۔ اس واقعہ نے یہ ثابت کر دیا کہ مودی حکومت کا

'دلت حمایتی' ہونے کا دعوی محض ایک جملے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

روہت ویمولا کے معاملے میں 'بیک فوٹ' پر گئی مودی حکومت نے لوگوں کی توجہ دوسری طرف موڑنے کے لیے جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے اوپر حملہ کر دیا۔ ایک جلوس کا حوالہ دے کر، حکومت نے یہ دعویٰ کیا کہ جے این یو میں 'بھارت مخالف' نعرے لگے ہیں اور 'دہشت گردوں' کی 'حمایت' میں جلوس نکالا گیا۔ کارپوریٹ میڈیا کی مدد سے جے این یو کو 'اینٹی نیشنل' یعنی 'غدارِ وطن' کہا جانے لگا۔ حکومت کے اشارے پر جے این یو کو برا بھلا کہا گیا۔ کئی بار جے این یو کے طلبا کے ساتھ تشدد کے واقعات بھی انجام دیے گئے۔ ابھی تک جے این یو کے طلبا کو کسی نہ کسی بہانے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ 'اینٹی نیشنل' کا اتنا پروپگنڈا ہوا کہ اینٹی نیشنل کی ایک نئی اصطلاح پبلک ڈسکورس کا حصہ بن گئی۔ بات بات پر حریفوں کو چُپ کرانے کے لیے بی جے پی اور آر ایس ایس کے افراد اینٹی نیشنل کا حربہ استعمال کرنے لگے۔ بعض اوقات پولیس کی مدد سے بی جے پی نے اپنے حریفوں کو 'وطن سے غداری' کے کیس میں پھنسایا جس کی بنا پر بہت سارے لوگوں کو جیل بھی بھیجا گیا۔ جے این یو میں بھی گزشتہ تین سالوں میں درجنوں طلبا کے خلاف انتظامیہ نے جھوٹا کیس درج کیا گیا۔ بعض اوقات ان سے جرمانہ بھی وصول کیا گیا۔

اینٹی نیشنل پروپگنڈے کے پیچھے سرکار کا اصل مقصد طلبا مخالف تعلیمی پالیسی سے عوام کی توجہ ہٹانا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب ٹی وی شو میں بحث نیشنل بنام اینٹی نیشنل کی ہوتی ہے تو حکومت کی ناقص تعلیمی پالیسی دب جاتی ہے۔ لوگ یہ نہیں جان پاتے ہیں کہ سرکار کی تعلیمی پالیسی محروم طبقات کو تعلیم سے دور کر رہی ہے۔ جے این یو میں حملے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ ادارہ سماجی انصاف اور روشن خیال نظریہ کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جو حضرات جے این یو سے واقف ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ یہاں فیس پرائیویٹ اداروں کے مقابلے کافی کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غریب اور محروم طبقات کے طلبا یہاں پڑھنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ اس ادارے میں محروم طبقات اور

خواتین کو بعض اضافی نمبر دیے جاتے ہیں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں داخلہ لے سکیں۔ روشن خیال نظریہ کو فروغ دینے والے اس ادارے میں تنوع دیگر اداروں کے مقابلے زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ ساری خصوصیت بھگوا قوتوں کو ایک لمبے عرصے سے پسند نہیں تھی۔ وہ اس کے تشخص کو بدلنے کے لیے وہ موقع کی تلاش میں بہت دنوں سے لگے ہوئے تھے۔ اینٹی نیشنل کا پروپگنڈا ابھی تھما بھی نہیں تھا کہ جے این یو میں ایک دوسرا فتنہ کھڑا کر دیا گیا۔ نجیب کو جے این یو میں داخلہ لیے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ اس پر بھگوا شر پسندوں نے حملے کر دیے۔ سال 2016 میں نجیب نے ایم ایس سی کورس میں داخلہ حاصل کیا تھا۔ اسے ماہی مانڈوی ہوسٹل رہنے کے لیے ملا۔ اسی ہوسٹل میں ایک بڑی سازش کے تحت بھگوا شدت پسند عناصر، جن میں سے کچھ کا تعلق بی جے پی کی طلبا تنظیم اے بی وی پی سے تھا، اسے معمولی سی بات کا بہانہ بنا کار آدھی رات کو پیٹنے لگے۔ افسوسناک بات یہ بھی ہے کہ اس کی پٹائی ایک ایسے کیمپس میں ہوئی جہاں سیکورٹی کے پختہ انتظام ہیں۔ اس کی پٹائی اس طرح دردناک طریقے سے کی گئی گویا اس کا اب لنچنگ ہو رہا ہو۔ نجیب کو اس قدر پیٹا گیا کہ اس کے کان اور ناک سے خون بہنے لگے۔ اس نے مدد کے لیے آواز لگائی، مگر گارڈ تک اس کی مدد کے لیے نہیں آئے۔ جب صبح میں اس کی ماں (فاطمہ نفیس) اپنے بیٹے کو دیکھنے بدایوں سے جے این یو پہنچی تو نجیب وہاں نہیں تھا۔ اس وقت سے نجیب غائب بتایا جاتا ہے۔ اپنے بیٹے کو پانے کے لیے نجیب کی ماں گزشتہ دو سالوں سے در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہیں، انہوں نے سب کو مدد کے لیے پکارا، تمام متعلق محکموں میں فریاد کی، مگر اب تک وہ اپنے بیٹے کے انتظار میں آنسو بہا رہی ہیں۔ نجیب سانحہ نے مسلم طلبا کے دلوں میں خوف بھر دیا۔ جے این یو اور دیگر تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے سے پہلے ان کے والدین کئی مرتبہ سوچنے لگے۔ محروم طبقات یونیورسیٹوں میں اپنے بچوں کو بھیجنے سے ڈرنے لگے۔

اس طرح جے این یو پر حملے در حملے ہوتے رہے۔ یونیورسیٹی کو مزید پرائیویٹ کرنے اور سنگھی نظریہ کے حامل افراد کو نوکریوں میں بحال کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ اس طرح یہاں کے تعلیمی معیار کو چوپٹ کیا گیا۔ دوسری طرف ریزرویشن بھی پورا نہیں کیا جارہا ہے۔ داخلہ کے لیے بنائے گئے نئے 'پیٹرن' میں ملٹی چوائیس سوالات کا نظام لایا جارہا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو طلبا کی 'اینالیٹکل' یعنی تجزیاتی صلاحیتوں کی جانچ نہیں ہوسکے گی، جو کہ تحقیق اور ریسرچ کے لیے کافی اہم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، اس سال کے داخلہ سے متعلق امتحانات کی فیس کو 300 فیصد بڑھادیا گیا ہے، جس کو لے کر طلبا احتجاج کررہے ہیں۔ ایک طرف فیس میں اضافے کو فنڈ پیدا کرنے کے نام پر جائز قرار دیا گیا ہے وہیں عوام کے پیسے کو غیر ضروری چیزوں پر پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔ مثال کے طور پر جے این یو انتظامیہ نے لاکھوں لاکھ روپے 'مجسمے' بنانے اور سنگھ سے جڑے بابا اور گروؤں کے پروگرام کو منعقد کرنے میں خرچ کیا ہے۔ ممبئی میں واقع ٹاٹا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز (TISS) میں بھی فیس بڑھانے اور محروم طبقات کو دی جانے والی اسکالرشپ کو ختم کیے جانے کے خلاف لمبے وقت تک لڑائی چلی، مگر انتظامیہ اپنے طلبہ مخالف موقف پر بضد رہا۔ فیس نہ صرف سوشل سائنس بلکہ سائنس سے متعلق دوسرے کورسز کی بھی بڑھی ہے۔ تعلیمی اداروں کو پیسے اگائی کا اڈہ سمجھ لیا گیا ہے۔
ٹھیک اسی وقت دوسری جانب نوکریوں کے مواقع کم ہوتے جارہے ہیں۔ سالہا سال سے خالی پُر نہیں کی گئی ہیں۔ ہر جگہ گیسٹ پوزیشن بناکر کام چلایا جارہا ہے، جس کی وجہ سے نوجوانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے۔ دہلی یونیورسیٹی میں زیادہ تر اساتذہ گیسٹ فیکلٹی کے طور پر کام کررہے ہیں۔ اس پوری پالیسی سے ہمارے ملک کی تعلیم کے معیار کو کافی نقصان پہنچا ہے۔

مودی جی کے دور حکومت میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی پر بھی کئی حملے ہوئے۔ بات بات پر پولیس بلائی گئی۔ اس دوران بھگوا شدت پسند کیمپس میں کافی سرگرم رہے اور انھوں نے یونیورسیٹی کے ماحول کو خراب کرنے کے لیے ہر ممکن جتن کیا۔ ان کو حکومت اور انتظامیہ کی حمایت بھی حاصل تھی۔ پچھلے سال پولس کے ذریعے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کئی طلبا پر تشدد کیا گیا۔ اس سال کئی سارے طلبا، جن میں طلبا یونین کے لیڈران بھی شامل ہیں، پر 'غدار وطن' کا جھوٹا مقدمہ دائر کیا گیا۔ سب سے زیادہ ہنگامہ تو محمد علی جناح کی تصویر پر مچایا گیا۔ شرپسندوں نے مطالبہ کیا کہ جناح کی تصویر کو یونیورسٹی سے ہٹا کر پھینک دیا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو وہاں کے طلبا کو دیش بھکت نہیں مانا جائے گا۔ اس پورے فتنے کا اصل مقصد اے ایم یو اور مسلمانوں کو بدنام کرنا تھا۔ جذباتی مسئلے اٹھا کر، شرپسند اصلی سوالات سے عوام کا دھیان ہٹانا چاہتے ہیں۔

ان شرپسندوں کو کون بتائے کہ ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم ایک حقیقت ہے۔ یہ ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ یہ تقسیم ہوا۔ مگر ملک کی تقسیم بھی دونوں ہندوستان اور پاکستان کی مشترکہ تاریخ کو الگ نہیں کر سکتی ہے۔ اگر ملک کی تقسیم کے لیے جناح 'قصوروار' تھے اور جناح کی تصویر، جو اس زمانہ میں اے ایم یو میں لگی جب جناح اور کانگریس کے لیڈران ایک ساتھ کام کرتے تھے، تو پھر انگریزوں سے جڑی ہوئی ساری یادگاریں کیسے جائز ہو سکتی ہیں جنھوں نے ہمارے ملک پر دو سو سالوں تک حکموت کی اور ہمارا استحصال کیا؟ جہاں تک بات اس کی ہے کہ تقسیم کے لیے کون ذمہ دار کہ ہے تو اس کا جواب بھی آسان نہیں ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کانگریس پارٹی مسلمانوں کے واجب مطالبات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھی؟

اے ایم یو کے علاوہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بھی 'جناح پریمی' اور 'ہندو- مخالف' ہونے کا الزام لگایا گیا اور اس پر ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔ بھگوا شدت پسند تنظیموں سے جڑے ہوئے کچھ شر پسند جامعہ کے گیٹ پر آ کر اشعال انگیزی کرنے لگے۔ ان فرقہ پرستوں کو کون سمجھائے جامعہ کے قیام میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ جامعہ جیسے قومی تعلیمی ادارے کا قیام کانگریس کے 1920 کی دہائی میں بنائی گئی قومی تعلیمی پالیسی کے بعد وجود میں آیا۔ قومی تعلیمی پالیسی کا مقصد تھا کہ ایسے تعلیمی اداروں کا قیام کیا جائے جو خود مختار ہو اور جو ہندوستانیوں کی ضرورت کو پورا کرے۔

مودی کے اس پانچ سال کے دور حکومت میں کشمیری طلبا بھی نشانہ پر رہے ہیں۔ تعلیم کے لیے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر ملک کے مختلف حصوں میں پڑھ رہے ان کشمیری طلبا کو ہر چھوٹی بات پر نشانہ بنایا گیا ہے۔ اگر کرکٹ کے میدان میں بھارت پاکستان سے میچ ہار گیا تو اس کے غصے میں کشمیریوں پور حملے کیے گیے۔ ان پر الزام لاگایا گیا کہ وہ پاکستان کی جیت کا 'جشن' منا رہے تھے۔ جب کبھی ہندوستانی فوج پر حملے ہوئے تو ان کے سوشل میڈیا کے پوسٹ کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سامنے لایا گیا اور ان پوسٹ کو دہشت گردوں کی حمایت میں لکھا گیا بتایا گیا۔ ان کے خلاف سخت کاروائی کی گئی اور ان کو یونیورسٹی سے باہر کر دیا گیا۔

دلت، آدی واسی، پچھڑے طبقات کے اوپر بھی زبردست مار پڑی ہے۔ انہیں بھلے ہی پاکستان حمایتی کہہ کر نہ ستایا گیا ہو، مگر ان کے آئینی حقوق ریزرویشن پر ایک کے بعد ایک حملے کیے گئے ہیں۔ ان کے خلاف سازش رچی گئی اور 13 پوائنٹ روسٹر کے نام پر ان کا ریزرویشن ہضم کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔

یہ سارے واقعات یہ بیان کررہے ہیں کہ مودی سرکار کی تعلیمی پالیسی مجموعی طور پر طلبا مخالف رہی ہے۔ بھارت جیسے ملک میں ضرورت اس بات کی کہ ہے کہ تعلیم پر بجٹ کا زیادہ سے زیادہ حصہ خرچ کیا جائے، مگر مودی حکومت نے بجٹ بڑھانے کے بجائے اسے اور کم ہی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلبا ان پانچ سالوں میں ان پالیسیوں کی مخالفت میں آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ اگر ان کا یہ غصہ برقرار رہا، تو مودی حکومت کے لیے دوبارہ اقتدار میں آنا مشکل کام ہوگا۔

Abhay Kumar

M Phil (Modern History)

Centre for Historical Studies

Jawaharlal Nehru University

New Delhi-110067

اپریل2019

تعلیم سے دور کرنے کی دانستہ کوشش

جہاں ملک کے بہت سارے حصوں میں نئے نئے مال اور شاپنگ کمپلیکس وجود میں آ رہے ہیں، وہیں کتابوں اور جرائد کی دکانیں بند ہو رہی ہیں

ابھے کمار

ہر سال پانچ ستمبر کو یومِ اساتذہ منایا جاتا ہے۔ یہ دن ملک کے دوسرے صدر جمہوریہ اور ماہر تعلیم، ڈاکٹر سروپلی رادھا کرشنن کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کو بہت سارے لوگ ایک مثالی مدرس کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ، وہ ہندوستانی فلسفے کے بڑے جانکار تھے۔ اس موضوع پر ان کی کتابیں آج بھی درسگاہوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ حالانکہ بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ہندو فلسفے کو تنقیدی نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی انہوں نے دلت بہوجن روایات کو اپنی تحریروں میں مناسب جگہ دی۔ حالانکہ یہاں ہمارا مقصد کسی شخص کی تخلیقات کا تجزیہ کرنا نہیں ہے، بلکہ ملک کی تعلیم عامہ کی صورتِ حال پر کچھ باتیں عرض کرنا ہیں۔

بے شک یہ ایک منفی پیش رفت ہے کہ جہاں ملک کے بہت سارے حصوں میں مال اور شاپنگ کمپلیکس وجود میں آتے جا رہے ہیں، وہیں کتابوں اور جرائد کی دکانیں بند ہو رہی ہیں۔ ہر طرف صارفیت کا بول بالا ہے۔ عالم اسی کو سمجھا جا رہا ہے، جس کی تنخواہ زیادہ ہو اور جو بڑے منصب پر بیٹھا ہو۔ معاشرے کے تئیں اس کی فکر کیا ہے اور وہ سماج میں مثبت تبدیلی لانے کے لیے کیا کر رہا ہے، ان پہلوؤں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی ہے۔ ملک کے پالیسی سازوں کے ذہنوں میں ایک ہی بات گشت کر رہی ہے کہ تعلیمی اداروں سے سوچنے اور سمجھنے والے طلبہ اور طالبات نہیں، بلکہ فیکٹریوں اور کمپنیوں میں ۱۲ر سے ۱۴ر گھنٹے تک کام کرنے والا روبوٹ نکلے۔ بی جے پی کے حامی پالیسی ساز آئے دن اخباروں میں مضامین لکھ کر حکومت کو یہ نصیحت دیتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم میں زیادہ بچوں کو داخلہ دینے کی پالیسی بھارت کی معیشت کے لیے درست نہیں ہے۔ ان کے مطابق، حکومت کو چاہیے کہ وہ شعبہ فنون وانسانیت اور سماجی علوم کی جگہ، پیشہ وارانہ کورسز کو فروغ دے تاکہ سرمایہ داروں کو سستے مزدور آسانی سے مل جائیں۔

ایسی منافع خور ذہنیت نہ صرف مزدور مخالف ہے، بلکہ یہ دلت، بہوجن اور اقلیتوں کے مفاد کے بھی خلاف ہے۔ یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ بھارت کے کمزور طبقات کو تعلیم سے دور رکھ کر ہی غیر برابری کا یہ نظام کھڑا کیا گیا ہے۔ اعلیٰ ذات کے افراد نے نہ صرف ان کو وسائل سے محروم رکھا، بلکہ انہیں پڑھنے لکھنے کے قابل بھی نہ سمجھا۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے، تعلیمی اداروں تک کمزور طبقات کی رسائی بہت ہی کم تھی۔ مگر جدید دور میں، جہاں نوآبادیات کا سیاہ دور بھی دیکھا گیا، وہیں اس دور میں تعلیم عامہ کا نظام بھی کھڑا ہوا، جہاں تعلیم حاصل کرنے میں ذات، مذہب اور جنس کی قید نہیں تھی۔ قومی تحریک کے بعد جب ملک میں جمہوری ڈھانچہ قائم ہوا، تو ریاست کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ سب کو تعلیم مہیا کرے اور سماج میں مساوات کو فروغ دے۔ حالانکہ اعلیٰ ذات کی لابی نے ریزرویشن کو نافذ کرنے میں ہر طرح کی رکاوٹیں ڈالیں، مگر مساوات کی تحریک نے بہت ساری رکاوٹوں کو راہ سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ سچ ہے کہ آج بھی تعلیمی اداروں پر مٹھی بھر اعلیٰ ذات کے افراد چھائے ہوئے ہیں، مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محکوم طبقات کے بہت سارے لوگ لڑ کر تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ محکوم طبقات کے یہ پڑھے لکھے افراد اپنے سماج کا حق پانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور بابا صاحب امبیڈکر کے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

”
جہاں ایک طرف ملک کے حکمراں بھارت کو وشو گرو بنانے کا خواب بیچ رہے ہیں، وہیں بجٹ تیار کرتے وقت ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ تعلیم عامہ سے متعلق فنڈ کو کم کر دیا جائے، تاکہ عوام پریشان ہو کر پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی طرف جانے پر مجبور ہو جائیں۔ ارباب اقتدار بہت اپنا سینہ چوڑا کر کے یہ بات چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ بھارت دنیا کی تیسری بڑی معیشت بننے جا رہا ہے، مگر انہیں اس بات پر شرم نہیں آتی کہ بھارت سے چھوٹی معیشتیں تعلیم کے شعبے میں ہم سے زیادہ بجٹ مختص کرتی ہیں۔ ایک عرصے سے سوشلسٹ تحریک کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ تعلیم پر بجٹ کا ۱۰ ر فیصد حصہ خرچ کیا جائے، مگر بھارت میں تعلیم عامہ پر دو فیصد سے تھوڑا ہی زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ ہر طرف بدحالی کا شکار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے اعلیٰ ذات کے پالیسی ساز یہ نہیں چاہتے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی حالت بہتر ہو۔ انہیں خوف ہے کہ اگر ان تعلیمی اداروں میں بہتر سہولیات ہوں گی، تو کمزور طبقات کے لوگ ریزرویشن کی مدد سے یہاں قابض ہو جائیں گے۔ ارباب اقتدار کو اس بات کا بھی خوف ہے کہ معیاری تعلیم کے پھیلاؤ سے سماج میں بیداری پیدا ہو گی اور پھر سماجی اصلاح کی تحریک جنم لے گی۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت پسند طبقات تعلیم عامہ کو فروغ دینے سے ڈرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تعلیمی حلقے پر بازار کا قبضہ ہو جائے تاکہ صرف پیسے والوں کے بچے ہی پڑھ لکھ سکیں اور عوام اَن پڑھ بنی رہے تاکہ مٹھی بھر طاقتور لوگوں کی بالادستی بدستور قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں کی اندیکھی کی جا رہی ہے۔ حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے کلاس رومز کے دروازے اساتذہ کی کمی کی وجہ سے طلبہ اور طالبات کے لیے بند کیے جا رہے ہیں۔ ملک کے مستقبل کو نجی تعلیمی اداروں کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ کوچنگ سینٹرز بچوں کو سبز باغ دکھلا کر ان سے موٹی رقم لوٹ رہے ہیں۔ جلدی سے کامیابی حاصل کرنے کے نام پر، کوچنگ سینٹرز بچوں کو نقلی اور غیر مستند کتابوں کی بیساکھی پر چلنے کی تربیت دے رہے ہیں۔

جہاں ایک طرف ملک کے حکمراں بھارت کو وشو گرو بنانے کا خواب بیچ رہے ہیں، وہیں بجٹ تیار کرتے وقت ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ تعلیم عامہ سے متعلق فنڈ کو کم کر دیا جائے، تاکہ عوام پریشان ہو کر پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی طرف جانے پر مجبور ہو جائیں۔ ارباب اقتدار بہت اپنا سینہ چوڑا کر کے یہ بات چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ بھارت دنیا کی تیسری بڑی معیشت بننے جا رہا ہے، مگر انہیں اس بات پر شرم نہیں آتی کہ بھارت سے چھوٹی معیشتیں تعلیم کے شعبے میں ہم سے زیادہ بجٹ مختص کرتی ہیں۔ ایک عرصے سے سوشلسٹ تحریک کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ تعلیم پر بجٹ کا ۱۰ ر فیصد حصہ خرچ کیا جائے، مگر بھارت میں تعلیم عامہ پر دو فیصد سے تھوڑا ہی زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ ہر طرف بدحالی کا شکار ہے۔ حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ بہار، اتر پردیش، جھارکھنڈ اور بنگال کے کالجوں میں پڑھائی کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ سال کا ایک تہائی حصہ داخلہ لینے اور امتحان منعقد کرنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ طلبہ اور طالبات داخلہ لیتے ہیں اور کالج کی فیس ادا کرتے ہیں، مگر انہیں اپنے کالجوں میں بنیادی سہولتیں نہیں ملتیں۔ حال تو اس قدر بُرا ہو چکا ہے کہ زیادہ تر کالجوں میں مطلوبہ کلاس رومز اور ٹیچرز نہیں ہیں۔ بہت سارے ایسے شعبے ہیں، جہاں ایک بھی استاذ موجود نہیں ہے۔ حال تو اس قدر خراب ہے کہ بیشتر کالجوں میں اساتذہ کے بیٹھنے اور پڑھانے کے لیے معقول جگہ میسر نہیں ہے۔ زیادہ تر تعلیمی اداروں کی لائبریریاں عملے اور فنڈ کی کمی کی وجہ سے بند ہیں۔ کئی اداروں میں پانی اور صفائی کا بھی معقول انتظام نہیں ہے۔ کالج انتظامیہ بنیادی سہولیات کو پورا کرنے میں قاصر ہے، مگر کالج کے اندر نظم وضبط کے نام پر وہ طلبہ، عملے اور اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائیاں کرنے میں سب سے آگے رہتا ہے۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ تعلیمی اداروں کا ماحول جیل کی طرح بنتا جا رہا ہے، جہاں تنقیدی فکر کا دم گھٹ رہا ہے۔ ■

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)
debatingissues@gmail.com

انتخابات اور کمزور طبقات

مخلوط حکومت اور اتفاق رائے پر مبنی نظام کی جگہ، ایک ملک اور ایک انتخابات کی بات کی جارہی ہے جو طاقتور لوگوں کو مزید طاقتور بنانے کی ایک منفی کوشش ہے

ابھے کمار

عام انتخابات کچھ ہی دنوں میں ہونے کو ہیں۔ ان دنوں سیاسی پارٹیاں اپنے امیدواروں کی فہرست جاری کررہی ہیں اور سیاست داں بھی تشہیری مہم میں مصروف ہو چکے ہیں۔ مگر یہ بات ہمیں نہیں فراموش کرنی چاہیے کہ جمہوریت نہ صرف انتخابات بلکہ کامیاب جمہوریت کا نام ہے جہاں آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کیے جائیں اور کمزور سے کمزور تر انسان کو بھی انتخابات کے طریقۂ کار میں برابری کے مواقع فراہم ہوں۔ جمہوریت کی روح اکثریت کی بالادستی نہیں ہے، جمہوریت نہ تعداد کے زور پر اقلیتوں کو دبانے کی سیاست ہے۔ جمہوریت اصل معنوں میں اقلیتوں اور کمزوروں کو مساوی حقوق فراہم کراتا ہے۔ جمہوری ملک میں انتخابات کی اہمیت اس لیے ہوتی ہے کہ ان سے سیاسی بیداری پیدا کی جاتی ہے اور کمزور طبقات کو اپنی آواز بلند کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں کمزور طبقات کے رائے دہندگان، امیروں کے مقابلے میں، اپنا ووٹ ڈالنا نہیں بھولتے ہیں۔ مگر ہمارے انتخابی نظام میں بہت ساری خامیاں بھی ہیں۔ مثال کے طور پر، پیسہ اور طاقت کا بول بالا بڑھتا ہی جارہا ہے۔ تنوع کی جگہ یکسانیت کی بات کی جارہی ہے۔ مخلوط حکومت اور اتفاق رائے پر مبنی نظام کی جگہ، ایک ملک اور ایک انتخابات کی بات کی جارہی ہے۔ یہ سب کچھ اور نہیں بلکہ طاقتور لوگوں کو مزید طاقتور بنانے کی ایک منفی کوشش ہے۔ آج عام آدمی انتخابات لڑنے کی بات سوچ کر ہی گھبرا جاتا ہے۔ حالانکہ ہمارے ملک کا آئین سب کو یکساں حقوق دیتا ہے۔ دولت مند تاجر ہو یا دلت رکشہ چالک، سب کے ووٹ کی قیمت ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر پیسہ اور طاقت کے زور نے اس مساوات کو بھی بے معنیٰ کردیا ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ انتخابات ہونے کو ہی ہم جمہوریت کی کامیابی نہیں کہہ سکتے۔ بہت ساری آمرانہ حکومتیں بھی وقت وقت پر رسماً انتخاب کرواتی ہیں اور انتخابی طریقۂ کار کے دوران کچھ ایسی دھاندلی کرتی ہیں جس کا نتیجہ ہر حال میں ان کے ہی حق میں آتا ہے۔ ایسے انتخابات کو ہم صاف وشفاف انتخابات نہیں کہہ سکتے اور نہ ہی اس کا کوئی رشتہ جمہوریت سے ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوری نظام ہے، مگر کئی بار ایسا دیکھا گیا ہے کہ کمزور اور اقلیتی طبقات کے رائے دہندگان کو ووٹ دینے سے روکا گیا ہے۔ کچھ پر تو یہ دباؤ ڈالا گیا کہ وہ دوسروں کی مرضی سے ووٹ ڈالیں۔ ایسی بھی خبریں ہیں کہ بہت سارے علاقوں میں جب دلت اور مسلمان ووٹ دینے کے لیے پولنگ بوتھ پر پہنچتے ہیں، تو انہیں یہ باور کرایا گیا کہ ان کا ووٹ دیا جاچکا ہے! دیہی علاقوں میں اعلیٰ ذات کے لوگ انتخابی کارروائیوں کو اپنے مفاد میں موڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی لیڈر انتخابی تشہیر کے لیے نکلتا ہے، تو اس کی گاڑی اکثر اعلیٰ ذاتوں کے گھروں پر رکتی ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ رفتہ رفتہ محکوم طبقات اپنی آوازیں بلند کرنا شروع کردیتے ہیں۔ شمالی بھارت میں مَنڈل اور بہوجن سیاست نے دلتوں، پسماندہ ذاتوں کو زبان دی ہے، حالات بدل رہے ہیں اور اب کوئی بھی لیڈر دلت بستی کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ دکھاوے کے لیے ہی صحیح، سیاسی لیڈروں کو دلت کے گھر پر کھانا کھانا پڑتا ہے اور اس کی تصویر سوشل میڈیا پر شیئر کرنی پڑتی ہے۔ آج بہوجن سیاست کا اثر ہے کہ دلت کے لیے کوئی کام کرے یا نہ کرے، تمام لیڈروں کو دلت دوست ہونے کا دعویٰ کرنا پڑتا ہے۔ یہ تبدیلی واقعی بڑا انقلاب ہے۔ یہ بھارت کی جمہوریت کی کامیابی ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ کمزور طبقات کا ایک بڑا حصہ بیلٹ پیپر سے الیکشن کرانے کے حق میں دکھ رہا ہے۔ بہت سارے جہد کار آزادنہ اور منصفانہ انتخابات کو یقینی بنانے کے لیے ای وی ایم پر پابندی لگانے

انتخابات کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ عوام کے سر پر سیاسی جماعتیں بیٹھ جائیں اور سیاسی جماعت کی باگ ڈور ایک شخص کے ہاتھ میں آجائے۔ انتخابات کی یہ بھی روح نہیں کہ ایک مخصوص مذہبی گروپ کو ٹکٹ نہ دیا جائے اور اس کو برا بھلا کہہ کر انتخابات جیتے جائیں۔ انتخابات کا یہ بھی اصول نہیں کہ ایک ہی خاندان کے لوگ ہمیشہ کے لیے حاکم بن جائیں۔ سیاست میں اقربا پروری بھی منفی چیز ہے۔ لیڈرشپ ان کو ملنی چاہیے جو عوامی فلاح کے لیے کام کرنے کی خواہش رکھتے ہوں، مگر لیڈرشپ ان کو دی جارہی ہے، جو کسی بڑے لیڈر کے فرزند ہوتے ہیں۔

کی بات کہہ رہے ہیں۔ ان کو اس بات کا خدشہ ہے کہ الیکٹرانک مشین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جارہی ہے۔ ملک میں ای وی ایم سے متعلق بڑھتی بے چینی کو دیکھتے ہوئے، اس سوال پر سنجیدگی سے غور ہونا چاہیے۔ تمام شکوک وشبہات کو دور کیا جانا چاہیے۔ یہ اس لیے کہ تمام فریقین کو اعتماد میں لینے کا نام ہی جمہوریت ہے۔ یہ مسئلہ اس لیے بھی اہم ہے کہ مغربی ملکوں میں بیلٹ پیپر پر ہی انتخابات ہوتے ہیں۔

ہمارے ملک کے انتخابی طریقۂ کار میں بعض بدعنوانیاں پائی جاتی ہیں۔ جیسے، انتخابات جیتنا اب عام آدمی کے اختیار سے باہر ہوتا جارہا ہے۔ مُکھیا کے انتخابات سے لے کر ایم ایل اے اور ایم پی کے الیکشن میں بہت پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ٹکٹ ان کو اکثر ملتا ہے جو دولتمند اور طاقتور ہیں۔ جو لیڈر برسہا برس سے اپنی پارٹی کے تئیں وفادار رہے ہیں، بڑی گاڑیوں اور ہیلی کاپٹر میں صفر کرنے والوں کو ترجیح دی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ، جرائم پیشہ اور بدعنوانی میں مبتلا لوگوں کو انتخابات کے میدان میں اتارا جارہا ہے۔ ایسا اس لیے کہ سیاسی پارٹیوں کی یہ منفی سوچ ہے کہ الیکشن جیتنا کسی بھولے بھالے انسان کے لیے آسان نہیں ہے۔ فرقہ پرست عناصر کا بھی سیاست میں دبدبہ ہے۔ وہ اکثر اقلیتوں کا خوف دکھا کر، اکثریتی طبقہ کا ووٹ حاصل کرنے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ ایسے عناصر مذہبی اور جذباتی مسائل پر انتخابات لڑوانا پسند کرتے ہیں اور روزی، روٹی اور نوکری کے سوالات ان کے لیے اہم نہیں ہیں۔ میڈیا بھی ان کے اس مذموم کھیل میں برابر کا شریک ہے۔ ہمارے انتخابی طریقۂ کار کی بڑی خامی یہ بھی ہے کہ اس میں روز بروز شخصیت پرستی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ایک ہی شخص کے پوسٹر آپ ہر طرف دیکھ سکتے ہیں اور ان کی تقریریں براہ راست ہر چینل پر نشر ہوتی ہیں۔

انتخابات کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ عوام کے سر پر سیاسی جماعتیں بیٹھ جائیں اور سیاسی جماعت کی باگ ڈور ایک شخص کے ہاتھ میں آجائے۔ انتخابات کی یہ بھی روح نہیں کہ ایک مخصوص مذہبی گروپ کو ٹکٹ نہ دیا جائے اور اس کو برا بھلا کہہ کر انتخابات جیتے جائیں۔ انتخابات کا یہ بھی اصول نہیں کہ ایک ہی خاندان کے لوگ ہمیشہ کے لیے حاکم بن جائیں۔ سیاست میں اقربا پروری بھی منفی چیز ہے۔ لیڈرشپ ان کو ملنی چاہیے، جو عوامی فلاح کے لیے کام کرنے کی خواہش رکھتے ہوں۔ مگر لیڈرشپ ان کو دی جارہی ہے، جو کسی بڑے لیڈر کے بیٹے ہوتے ہیں۔ یہ سیاسی بدعنوانی ہے جو جمہوریت کو کمزور کرتی ہے۔ بھارت جیسے ذات پات پر مبنی سماج میں، کمزوروں کے ہاتھوں میں لیڈرشپ ہونی چاہیے۔ جو لوگ سالوں سال سے سماج کے حاشیہ پر ڈھیل دیے گیے تھے، ان کو ملک چلانے کا سب سے پہلا حق ہے۔ سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے کیا خوب کہا تھا کہ اعلیٰ ذات کھیت میں ڈالی جانے والی اس کھاد کی مانند ہے جو اپنی ہستی کو فنا کردیتی ہے جو اپنی طاقت کو کمزور طبقات کے اندر ڈال دیتے ہیں تا کہ محکوموں کی فصل ہری بھری ہو جائے۔ ڈاکٹر لوہیا چاہتے تھے کہ اعلیٰ ذات سیاست اور اقتدار کی ذمہ داری دلت، آدی واسی، پسماندہ ذات، اقلیت اور خواتین کے سپرد کردیں کیونکہ ایسے طبقات کے ساتھ صدیوں سے بھید بھاؤ ہوتا رہا ہے۔ ڈاکٹر لوہیا کی اپیل تھی کہ سماج میں مساوات لانے کے لیے اعلیٰ ذات کو اپنے ذاتی مفاد کو ترک کرنا ہوگا اور کمزوروں کو آگے کرنا چاہیے۔ محکوم طبقات اکثریت میں ہونے کے باوجود، اقتدار سے دور ہیں، جبکہ چند مٹھی بھر لوگ سارے عہدوں اور وسائل پر قابض ہیں۔ بابا صاحب امبیڈکر بھی محکوموں کے اپنے ہاتھ میں اقتدار لینے کی بات کہتے تھے۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ اچھا قانون خود میں اس بات کا ضامن نہیں ہے کہ کمزوروں کو انصاف بھی ملے گا۔ محکوم طبقات جب تک خود پالیسی سازی میں حصہ نہیں لیں گے، کوئی اور ان کی فلاح کے لیے سنجیدہ نہیں ہوگا۔ مگر آج برسر اقتدار بھگوا جماعت دلت، آدی واسی، اور پسماندہ ذات کو پیچھے کررہی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کو سیاست میں اچھوت بنانے کا عہد کر رکھا ہو۔ یہ سب ہمارے مجاہدین آزادی کے خوابوں کا خون کرنے کے مترادف ہے اور ملک کی جمہوریت کو کمزور کرنے کی ایک سازش ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

21.6.22

اَگنی پتھ: کیا یہ آئین مخالف منصوبہ نہیں ہے؟

۸ سال گزر جانے کے بعد بھی موجودہ سرکار روزگار دینے میں پوری طرح سے ناکام رہی ہے

ابھے کمار

ان دنوں پورے ملک میں 'اَگنی پتھ اِسکیم' کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔ اتر پردیش، بہار ،ہریانہ، تلنگانہ جیسی ریاستوں میں بے روزگار اور مصیبت زدہ نوجوانوں کا غصہ اس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے کہ ملک کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ملک کے بنیادی مسائل کوحل کرنا ارباب اقتدار کی اولین ترجیح نہیں رہی۔ روزگار پیدا کرنے سے زیادہ انہیں بڑے بڑے سرمایہ داروں کے خزانہ کو بھرنے اورانتخابات کوجیتنے کی فکر رہتی ہے۔وزیراعظم نریندر مودی کی بی جے پی سرکار نے لوگوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اقتدار میں آنے کے بعد وہ روزگار پیدا کرے گی۔ملک کے نوجوانوں نے مودی جی کوایک نہیں دودو مواقع دیے۔مگر ۸ سال گزر جانے کے بعد بھی ان کی سرکار روزگار دینے میں پوری طرح سے ناکام رہی ہے۔حالانکہ بھاجپا والے اپنے حریفوں کوآئین مخالف کہتے نہیں تھکتے ،مگر روزگار پیدا نہیں کرنا اور عوامی بہبود سے منہ موڑ لینا کیا آئین مخالف امر نہیں ہے؟

سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کریں کہ 'اگنی پتھ منصوبہ' کیا ہے پھر ہم اس پر بھی بحث کریں گے کہ کس طرح یہ منصوبہ آئین کی روح کے خلاف ہے؟ فوج میں اب جوانوں کی بھرتی 'اگنی پتھ اسکیم' کے تحت ہی کی جائے گی۔ساڑھے ۱۷سال سے لے کر ۲۱ سال کی عمر تک ہی نوجوان فوج میں کام کر سکتے ہیں۔جب احتجاج نے زور پکڑا تو اس کی عمر ۲۱ سال سے بڑھا کر ۲۳ سال کر دی گئی۔ جہاں پہلے جوان اپنی پوری عمر فوج میں گزار دیتے تھے،اب ان کی نوکری صرف چار سال تک محدود کردی گئی ہے۔اس مدت میں تربیتی پروگرام بھی شامل ہے۔ ۲۳ سال پورے ہونے کے بعد صرف ۲۵ فیصد جوانوں کو آرمی میں رکھا جائے گا، باقی جوان سبکدوش ہو جائیں گے۔ جہاں 'اگنی پتھ اسکیم' کے تحت نوکری پانے والے 'اگنی ویروں' کی تنخواہ بہت کم ہوگی، وہیں ان کو کوئی پنشن بھی نہیں ملے گی۔اس طرح کی اسکیم نہ صرف نوجوانوں میں بے روزگاری کو جنم دے گی، بلکہ اس سے فوج کی کارکردگی پر بھی منفی اثر پڑے گا۔ سرکار صرف پیسہ بچانے کے لیے نوجوانوں کے مستقبل سے کھلواڑ کر رہی ہے۔ بھارت جیسے ملک کی فوج کے لیے بہت سارے چیلنجز ہیں اور یہاں کے مسائل بھی بہت ہی جدا جدا ہیں۔اس لیے کسی جوان سے یہ توقع کرنا کہ چار سال کے اندر وہ سب کچھ سیکھ لے گا اور فوج کی تمام ضرورتوں کے مطابق اپنے فرائض کو انجام دے گا خام خیال ہے۔اس طرح کے پروگرام کا ایک بڑا خطرہ یہ بھی ہے کہ چار سال کے اندر جب کوئی جوان اسلحہ چلانے کی تربیت لے کر سبکدوش کر دیا جاتا ہے تو اس کے دل میں احساس کمتری بھی بڑھ سکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسلحہ کی تربیت لے چکے ان نوجوانوں کو کوئی گمراہ کرنے کی کوشش کرے اور انہیں کسی متنازع مسائل پر ہتھیار بند مخالفت کرنے کے لیے آمادہ کرے۔ ایسا بھی خطرہ ہے کہ 'اگنی پتھ اسکیم' سے نکلے نوجوان کہیں شہریوں کی رضا کار فوج کا حصہ نہ بن جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ بھارت کی فوج کافی پیشہ ورانہ ہے اور اس نے ابھی تک سیاسی لیڈر شپ کی قیادت میں کام کیا ہے۔ کیا 'اگنی پتھ منصوبہ' فوج کی پیشہ ورانہ کارگردگی پر منفی اثر نہیں ڈالے گا؟

ملک کی سالمیت کے علاوہ 'اگنی پتھ منصوبہ' ملک کے آئین کی روح کے بھی منافی ہے۔ بھارت کے آئین کی تمہید ہی میں ذکر ہے کہ 'ہم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ

> روزگار پیدا کرنا سرکار کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بے روزگاری کی وجہ سے نوجوانوں کا مستقبل برباد ہوجاتا ہے اور وہ غلط راستہ پر بھی بھٹک سکتے ہیں ۔دستور میں تمہید کے علاوہ بھارت کے آئین کے چوتھے حصہ 'مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول' بھی سرکار کوفلاحی کاموں کے لیے کہتے ہیں ۔ مثال کے طور پر دفعہ ۳۸ کہتی ہے کہ 'مملکت، ایسے سماجی نظام کو، جس میں قومی زندگی کے سب ادارے سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف سے آراستہ ہوں، جہاں تک اس سے ہو سکے، مکمل طور پر قائم اور محفوظ کر کے لوگوں کی فلاح وبہبود کو فروغ دینے میں کوشاں رہے گی' مگر حکومتیں آج غلط سمت میں چل رہی ہیں۔

بھارت کو ایک مقتدر سماج وادی، غیر مذہبی، عوامی جمہوریہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں: انصاف، سماجی، معاشی، سیاسی آزادیٔ اظہار خیال،، عقیدہ، دین اور عبادت، مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع، اور ان سب میں اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کو عظمت اور قوم کے اتحاد وسالمیت کو تیقن حاصل ہو...' آئین کی تمہید کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ سرکار عوامی فلاح کے لیے کام کرے۔ تمہید میں یہ بھی صاف طور پر درج ہے کہ ریاست کا کام سماجوادی یعنی سوشلسٹ معاشرہ کی تشکیل دینا ہے اور سب کے لیے انصاف کو، جس میں سماجی اور معاشی انصاف بھی شامل ہے، یقینی بنانا ہے۔ کوئی پوچھ سکتا ہے کہ سوشلسٹ یا سوشلزم سے کیا مراد ہے؟ ماہریات کے بیچ ان سوالوں پر اتفاق نہیں ہے، مگر اتنا تو کہا ہی جا سکتا ہے کہ سوشلسٹ نظام کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ریاست عوام کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کام کرے۔ تعلیم، روزگار اور صحت عامہ کی سہولت غریب سے غریب آدمی کو میسر ہو۔ سرکار روزگار پیدا کرے اور اقتصادی مسائل کو خود سے حل کرے۔ معاشی نظام کو بازار کے سپرد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ سرکار کو اس پر کنٹرول رکھنا ہے، کیونکہ بازار اکثر نفع کمانے کے لیے لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔ سرکار کو پبلک سیکٹر کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا چاہیے۔ جو بھی اہم کارخانے اور وسائل ہیں ان کی ملکیت عوام کی ہونی چاہیے۔اسے ہم نیشنلائزیشن کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ سرکار ملک کے وسائل کو خود اپنی تحویل میں لے اور اہم اداروں اور شعبوں کو قومی بنائے۔ جب ملک کے وسائل کو نیشنلائزڈ کیا جاتا ہے تو وہ کسی ایک کی ملکیت نہیں رہتے، بلکہ وہ ملک کا سرمایہ بن جاتے ہیں۔ پھر اس کا استعمال منافع کمانے کے لیے نہیں کیا جاتا بلکہ سب کی بھلائی کے لیے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ریل کا کرایہ کم رکھا جاتا ہے تو اس سے مسافروں کو فائدہ ہوتا ہے اور اگر ریل کا کرایہ کچھ بڑھا دیا جاتا ہے اور اس سے ریل کی آمدنی بڑھ جاتی ہے تو وہ کسی کی جیب میں نہیں جاتی ، بلکہ وہ پیسہ ریل کے ملازموں کی سیلری یا ریل کے بنیادی ڈھانچہ اور سہولت کو بہتر بنانے میں استعمال ہوتا ہے۔ مگر افسوس کہ سرکاریں، خاص کر بھاجپا کی حکومتیں، آئین کی روح کے خلاف عوامی وسائل کو نجی کمپنیوں کے ہاتھوں لیز پر دے رہی ہیں، جو اسے بیچنے کے مترادف ہی ہے۔

روزگار پیدا کرنا سرکار کی بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بے روزگاری کی وجہ سے نوجوانوں کا مستقبل برباد ہوجاتا ہے اور وہ غلط راستہ پر بھی بھٹک سکتے ہیں ۔دستور میں درج تمہید کے علاوہ بھارت کے آئین کے چوتھے حصہ 'مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول' بھی سرکار کوفلاحی کاموں کے لیے کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر دفعہ ۳۸ کہتی ہے کہ 'مملکت، ایسے سماجی نظام کو، جس میں قومی زندگی کے سب ادارے سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف سے آراستہ ہوں، جہاں تک اس سے ہو سکے، مکمل طور پر قائم اور محفوظ کر کے لوگوں کی بہبود کو فروغ دینے میں کوشاں رہے گی'۔ مگر حکومتیں آج غلط سمت میں چل رہی ہیں۔ ہر شعبہ میں نوکریاں ختم کی جارہی ہیں۔ اگر کچھ لوگوں کو نوکری پر رکھا بھی جارہا ہے ان سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جارہا ہے اور کم سے کم مزدوری دی جاتی ہے۔ نوکری میں کوئی سوشل گارنٹی نہیں ہے اور نہ کوئی پنشن۔ سب ٹھیکہ داری نظام پر چل رہا ہے۔ ملک کی بد قسمتی دیکھیے کہ حکومتوں کے پاس سرمایہ داروں کے خزانہ کو بھرنے کے لیے مال ہی مال ہے، مگر عوام کے لیے روزی، روٹی، تعلیم، صحت عامہ اور روزگار پیدا کرنے کے لیے بجٹ نہیں ہے۔ اس ناانصافی کے خلاف اور اپنے حقوق کے لیے ہم سب کو پُرامن طریقہ سے احتجاج کرنا ہی ہوگا۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا

انسانی حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کا تعلق کسی مذہب سے نہیں انسانیت سے ہوتا ہے

ابھے کمار

پہلی بار میں نے فلم شعلے میں گبّر سنگھ کو یہ ڈائلاگ بولتے ہوئے سنا تھا کہ ُاب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے، مگر سچ پوچھیے تو مجھے اس کا مطلب اب سمجھ میں آ رہا ہے۔ کسان تحریک کے پہاڑ جیسے بلندعزم کے سامنے، فتح، اور مغرور بھگوا حکومت آج کس طرح بونی سی نظر آ رہی ہے۔کل تک جب کسان سڑکوں پر تین زرعی قوانین کے خلاف احتجاج کر رہے تھے،تب بھگوا سرکار ان کی بات سننے کے بجائے پولیس کو آگے کرتی رہی ۔نوجوان ، بوڑھے اور عورت سب پر لاٹھیاں اور ڈنڈے برسائے گئے۔سال بھر سے کسان کھلے آسمان میں دھرنے پر بیٹھے ہوئے ہیں، وہیں حکمراں محلوں میں بے حسی کی نیند سو رہے تھے۔ مظاہرین کسان دھوپ میں جلتے رہے اور پیاس سے تڑپتے رہے، برسات میں بھیگتے رہے اور سردی میں کانپتے رہے،مگر سرکار نے اپنی ہٹ دھرمی نہیں چھوڑی۔اس لمبی لڑائی میں بہت سارے کسان شہید بھی ہوئے،مگر ان کی قربانی رائیگاں نہیں گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ کسان تحریک مضبوط ہوتی گئی، وہیں سرکار کی شبیہ بگڑتی گئی۔بگڑتی امیج کو سُدھارنے کے لیے سرکار نے مین اسٹریم میڈیا کو آگے کیا، جنہوں نے اناج پیدا کرنے والے کسانوں کو خالصتانی دہشت گرد اور نکسلی تک کہا ،مگر جب کوئی حربہ کام نہیں آیا اور بھگوا سرکار دن بدن ذلیل ہوتی چلی گئی،تو آخر کار نریندر مودی حکومت نے اپنی شکست قبول کرلی اور زرعی قوانین کو واپس لینے کا اعلان کردیا۔

سیاسی اور سماجی تجزیہ کاروں کا ماننا ہے کہ مودی سرکار نے زرعی قانون کو واپس لینے کا فیصلہ انتخابات کو مدنظر رکھ کر کیا ہے۔ پنجاب، گجرات، اتر پردیش جیسی اہم ریاستوں میں اسمبلی انتخابات کی آہٹ دروازے پر محسوس کی جاسکتی ہے۔بھگوا جماعت کو یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی تھی کہ زرعی قوانین کو فوراً واپس نہیں لیا گیا تو الیکشن کے دوران انہیں رائے دہندگان کا غصہ جھیلنا پڑسکتا ہے۔حالانکہ بھگوا حکومت کا اصل مقصد بڑے سرمایہ داروں کی جیب بھرنا ہوتا ہے،مگر ان کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب اقتدار اس کے ہاتھوں میں ہو، وہیں حزب اختلاف مودی سرکار کے بیک فُٹ پر جانے سے کافی خوش نظر آ رہی ہے۔شاید اقتدار میں آنے کے بعد پہلی بار مودی سرکار ایک قدم پیچھے ہٹی ہے۔اب تک وہ اپنے حریف کو روندتی چلی جا رہی تھی۔اب تک سرکار کی پالیسی کے خلاف بولنے والوں کو دہشت گردی اور ملک سے غداری کرنے کے الزام میں پریشان کیا جاتا تھا۔کیا اب وزیر اعظم نریند مودی کی تنزلی کا دور شروع ہوگیا ہے؟

ماہرین کا ماننا ہے کہ سیاست اور اقتدار کے جس عروج تک نریندر مودی کو جانا تھا وہاں تک وہ پہنچ چکے ہیں اور اب ان کا زوال شروع ہوگیا ہے۔مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سنگھ پریوار یا پھر بھگوا نظریات ہندوستانی سیاست سے غائب ہونے جا رہے ہیں۔یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بھگوا عناصر ایک لمبے وقت سے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ان کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستانی قومیت کو ہندوتو کے رنگ میں رنگنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ بھارت کبھی بھی کسی ایک خاص مذہب اور دھرم کو ماننے والی کمیونٹی کی جاگیر نہیں رہا ہے۔اس ملک کی روح میں کثرت میں وحدت کی خوشبو شامل ہے۔مگر گزشتہ ۱۰۰ سالوں میں بھگوا نظریہ نے ہندوتو کو عام سوجھ بوجھ کا حصہ بنا دیا ہے۔آج ہندوتو انظریہ کے لوگ ہر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے، کاروبار، سیاسی پارٹی، فلم، میڈیا میں بڑے عہدوں پر قابض ہیں،مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مودی سرکار کا غرور تھوڑا ٹوٹا ضرور ہے؟

زرعی قوانین کے واپس لینے کے بعد 'مودی ہے تو ممکن ہے' کا بیانیہ تھوڑا کمزور ہوا ہے۔کل تک مودی سرکار ایک طرفہ فیصلہ لیتی تھی۔اوپر بیٹھے ایک دو لوگ سب کچھ طے کرتے تھے۔کابینہ کے وزرا سے لے کر پارٹی کے بڑے افسران کے سامنے ہاں میں ہاں بھرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ڈاکٹر امبیڈکر نے بار بار شخصیت پرستی کے خلاف لوگوں کو متنبہ کیا تھا،مگر اس کی دھجیاں اڑتی رہیں اور ہر بات کے لیے 'تھینک یو مودی جی' کہا جاتا رہا۔جب کابینہ کے وزرا اور پارٹی کے بڑے لیڈران کی بات پر توجہ نہیں دی گئی تو پھر کسان اور اپوزیشن لیڈروں کی بات سننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔تین طلاق ایشوز کے دوران بھی ایسا ہی کچھ دیکھا گیا جب مودی سرکار نے مسلمانوں کی ملی اور مذہبی قیادت کو پوری طرح نظر انداز کیا۔مگر اب مودی کی مخالف لابی تھوڑا مضبوط ضرور ہوگی۔تو کیا اب زرعی قوانین کی واپسی کے بعد مودی سرکار کو سی اے اے، این آر سی اور دفعہ ۳۷۰ رد کرنا ہوگا؟

> بھارت کبھی بھی کسی ایک خاص مذہب اور دھرم کے ماننے والی کمیونٹی کی جاگیر نہیں رہا ہے۔ اس ملک کی روح میں کثرت میں وحدت کی خوشبو شامل ہے۔مگر گزشتہ ۱۰۰ سالوں میں بھگوا نظریہ نے ہندوتو کو عام سوجھ بوجھ کا حصہ بنا دیا ہے۔آج ہندوتو نظریہ کے لوگ ہر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے، کاروبار، سیاسی پارٹی، فلم، میڈیا میں بڑے عہدوں پر قابض ہیں،مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مودی سرکار کا غرور تھوڑا ٹوٹا ضرور ہے؟

بہت سارے لوگ اس طرح کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ مذکورہ قوانین بھی ختم ہونے چاہئیں اور مودی سرکار اب دباؤ میں ہے۔ دریں اثنا مسلمانوں کے ایک بڑے ملی اور مذہبی لیڈر نے کانپور میں شہریت قانون کو واپس لینے کی اپیل سرکار سے کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ سی اے اے کو ختم کیا جائے کیونکہ اس کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو ہوگا۔مذکورہ لیڈر کی مانگ جہاں بالکل درست ہے وہیں ان کی دلیل صد فیصد صحیح نہیں ہے۔یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ سی اے اے اور این آر سی کا معاملہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے ۔ان کی زد میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں، بلکہ ملک کا آدی واسی اور دلت بھی ہے۔ پسماندہ طبقات اور غریب لوگ جن کے پاس زمین نہیں ہے وہ بھی سی اے اے اور این آر سی کے نشانہ پر ہیں۔سرکاری کاغذات نہ رکھنے والے لوگوں کے اوپر شہریت چھینے جانے کا خطرہ تلوار کی طرح لٹک رہا ہے۔اس لیے سی اے اے اور این آر سی کو صرف مسلمانوں سے جوڑنا بہت بڑی غلطی ہے۔

بھگوا طاقتیں بھی یہی چاہتی ہیں کہ ملک کا ہر مسئلہ ہندو بنام مسلمان ہو کے رہ جائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شہریت کا رشتہ ملکیت سے ہوتا ہے۔جن کے پاس زمین اور جائیداد نہیں ہے ان کی شہریتَ ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔تبھی تو آسام میں بھی شہریت سے متعلق کاغذات جمع نہ کرنے والوں میں غیر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔اس لیے سی اے اے اور این آر سی کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔شہریت مخالف تحریک نے بڑی کامیابی حاصل کی مگر کسان تحریک کے برعکس اس کو مسلمانوں کا ایشو بنا دیا گیا۔اس لیے مسلمان ذمہ دار نہیں ہیں، انہوں نے تو ملک کے آئین کو بچانے کے لیے سب سے زیادہ قربانی دی ،مگر دیگر طبقات کی شمولیت جتنی ہونی چاہیے تھی اتنی نہیں ہوسکی۔

آج شہریت مخالف تحریک کو کسان تحریک سے نصیحت لینے کے ساتھ یہ بات سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ بھگوا طاقتیں اقتدار پر صرف اس وجہ سے قابض ہیں کیونکہ وہ ہر بات کو فرقہ وارانہ رنگ دینے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔جس دن ہندو مسلمان کا کھیل ختم ہوجائے گا اس دن بھگوا سیاسی جماعت کہیں پر بھی نظر نہیں آئے گی۔اس لیے تمام سیکولر فورسز کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہندو مسلمان کے زاویہ سے باتوں کو پیش نہ کرے۔مسلم لیڈرشپ کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے درد کو دیگر محروم طبقات کے درد سے جوڑ کر دیکھیں، محکوموں کے اتحاد سے ہی دنیا بدلی ہے اور آگے بھی بدلے گی۔ بھارت جیسے ملک میں جہاں ہر دھرم، مذہب اور ذات برداری کے لوگ رہتے ہیں وہاں اتحاد کی بنیاد مذہب نہیں بلکہ استحصال ہوگا۔اسی طرح کشمیر کی خصوصی حیثیت کی بحالی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ کو سیکولر پلیٹ فارم پر لایا جائے کیونکہ انسانی حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کا تعلق کسی مذہب سے نہیں انسانیت سے ہوتا ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

کسانوں کا درد اہلِ اقتدار کیا جانیں!

دراصل یہ لڑائی کسی کی جیت اور ہار کی ہے ہی نہیں۔ سرکار نے خود اسے اپنی انا کا ایشو بنالیا ہے جبکہ جمہوریت کا دوسرا نام سب کو ساتھ لے کر چلنے کا ہے

ابھے کمار

قومی راجدھانی دہلی کے باڈر پر، ملک کے ہزاروں کسان زرعی قانون واپس لیے جانے کے مطالبے کے ساتھ دھرنے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جہاں ہم میں سے بہت سارے لوگ اپنے گھروں کے اندر لحاف اوڑھے ہوئے محفوظ ہیں، وہیں کسانوں کو اس کڑاکے کی سردی میں کھلے آسمان میں دن رات گزارنا پڑ رہا ہے۔ یہ احتجاج کئی مہینوں سے چل رہا ہے، تعطل اب بھی برقرار ہے۔ میڈیا کی خبروں کے مطابق، تحریک پر بیٹھے ۱۷۰ سے زیادہ لوگ سردی اور دیگر وجوہات سے دم توڑ چکے ہیں۔ مگر اس سب کے باوجود بھی حکومت بے حس بنی ہوئی ہے۔ کسانوں کے اوپر ہو رہے ظلم کو دیکھ کر پتھر بھی رو پڑے، مگر جمہوریت کی دہائی دینے والی حکومت لاش سے بھی زیادہ سرد معلوم پڑتی ہے۔

کسانوں کی بات سُننے اور اس پر غور کرنے کے بجائے، پولیس اور انتظامیہ جائے احتجاج پر نکیلی کیلیں گاڑ دیں۔ اتنا ہی نہیں کنٹیلے تار بھی بچھائے گئے ہیں، بیرکیڈ کی دیوار سڑک پر پہلے ہی اٹھائی جا چکی ہے۔ ظلم کی انتہا تب ہوگئی جب دھرنے پر بیٹھے لوگوں کے لیے پانی کی سپلائی روک دی گئی۔ جب اس سے بھی لوگوں کا حوصلہ پست نہیں ہوا تو پتھر چلوایا گیا۔ حملہ آوروں کو بھیجا گیا۔ پولیس لاٹھیاں تو برساتی ہی رہی ہے اور پالتو میڈیا اناج پیدا کرنے والوں کو جم کر بدنام کرتا ہی رہا ہے۔ کسانوں کو ملک کا غدار، کہا گیا اور ان کے تار دہشت گرد، تنظیموں سے بھی تلاش کر لیے گیے۔ پڑوسی ملک کو بھی گھسیٹا گیا۔ مگر اب تک ارباب اقتدار کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ کسانوں کی تحریک برسر اقتدار جماعت کے ناقابل فتح ریکارڈ کو توڑ رہی ہے۔ شاید بھگوا اونٹ گزشتہ کئی سالوں میں پہلی بار پہاڑ کے نیچے آتا دکھ رہا ہے۔

دراصل یہ لڑائی کسی کی جیت اور ہار کی ہے ہی نہیں۔ سرکار نے خود اسے اپنی انا کا ایشو بنالیا ہے۔ جمہورت کا دوسرا نام ہی اتفاق ہے۔ جمہوریت کا دوسرا نام سب کو ساتھ لے کر چلنے کا ہے۔ اگر سب کے مفاد کا خیال رکھنا ہے تو ضد کو چھوڑنا ہوگا۔ اگر جمہوریت کو کامیاب ہونا ہے تو دوسروں کے زاویہ سے بھی چیزوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ زور زبردستی اور طاقت کا استعمال جمہوری اقدار کے منافی ہے۔ کاش! یہ بات برسر اقدار جماعت کو سمجھ میں آجاتی۔ کاش وہ ان کا درد سمجھ پاتی جن کی وجہ سے ہماری تھالی میں ہر روز روٹی اور چاول پہنچے ہیں۔ مگر ایسا کچھ بھی ہوتا نہیں دکھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر وزیر اعظم نریندر مودی کا پیر کے روز راجیہ سبھا میں دئے گئے بیان نے کسانوں کی بچی کھچی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے پوری کسان تحریک کو خارج کرتے ہوئے کہا کہ احتجاج پر بیٹھے لوگ آندولن جیوی، ہیں، جن کا کام لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔ ان کا ماننا یہ ہے کہ پیشہ ور احتجاج کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جو لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں سے انہوں نے خبردار رہنے کی بات کہی۔

وزیر اعظم کے مذکورہ بیان نے بہت لوگوں کو مایوس کیا ہے۔ ایک مضبوط جمہوریت کی پہچان بحث، اختلاف، تنقید اور احتجاج ہوتا ہے۔ جمہوریت میں کوئی بھی رائے یا پالیسی مقدس نہیں ہو سکتی۔ یہ بات کون نہیں جانتا کہ ایک فریق کا مفاد دوسرے فریق سے اکثر ٹکراتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ فیصلہ عام عوام کے حق میں لیے جائیں۔ اگر ہزاروں کی تعداد

> **بھوک کیا ہوتی ہے وہ وہی جان سکتے ہیں جو کبھی بھوکے رہے ہوں، جو بھوکا رہا ہے وہ جانتا ہے اناج کی اہمیت۔ جو اناج کی اہمیت جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ بھلے ہی ہزاروں بوریاں اناج بیچ کر سونے کا ایک ٹکڑا بڑی مشکل سے خریدا جا سکے، مگر جب انسان بھوکا ہوتا ہے تو اس کی جان صرف دو پیسے کی روٹی بچاتی ہے، لاکھوں اور کروڑوں کے سونے اور زیور نہیں۔ میں نے کم سے کم بھوک محسوس کی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ کسان کا قرض ہم کبھی چکا نہیں سکتے۔**

میں کسان احتجاج کر رہے ہیں تو اسے نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے۔ مگر سرکار بڑے سرمایہ داروں کے دباؤ میں زرعی قانون کو واپس نہیں لینا چاہتی ہے، کیونکہ یہ قانون بڑے سرمایہ داروں کو بڑی تعداد میں اپنے شرائط پر کسانوں سے اناج خریدنے اور اس کی جمع خوری کرنے کی راہ ہموار کردی ہے۔ دراصل جو لوگ اوپر بیٹھے ہوئے ہیں اور سرکار کی پالیسی بنا رہے ہیں انہوں نے کبھی بھوک کی اذیت محسوس ہی نہیں کی ہے۔ اہل اقتدار کسان کا درد کیسے محسوس کریں گے؟ جس نے کبھی پسینہ بہا کر کمائی نہ کی ہو، وہ کیا جانے محنت کیا چیز ہوتی ہے؟ اسے کیا خبر کہ محنت کا دوسرا نام ہی کسان ہے۔

تخت اقتدار کو چھوڑ کر کسانوں کا درد سب سمجھتے ہیں۔ تبھی تو اس تحریک کو اتنی طاقت مل رہی ہے اور یہ دبے دبائی نہیں جا رہی ہے۔ میرے گھر والے بھی چھوٹے کسان تھے۔ میرے بابا کے پاس زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ میرے بچپن کے دنوں میں ہمارا خاندان بھی بڑا تھا اور پیداوار بھی کم ہوتی تھی۔ اس وجہ سے دھان اور گیہوں پورے سال نہیں چل پاتے تھے۔ مثال کے طور پر اپریل اور مئی کے اختتام تک، دھان ختم ہو جاتا تھا۔ اس وجہ سے ماں کو صبح و شام روٹی ہی بنانی پڑتی تھی۔ روز روز روٹی کھا کر دل بھر جاتا تھا اور 'بھات' یعنی چاول کھانے کی بڑی خواہش ہوتی۔ گھر کے بڑے بزرگ تو کچھ نہیں کہتے اور جو ملتا کھا لیتے، مگر میں بھات کھانے کے لیے ضد کرتا۔ کئی بار ایک آدھ کیلو چاول خرید کر لایا جاتا اور جب میں ضد کرتا تو صرف میرے لیے بھات پکتا۔ بعد کے دنوں میں پیداوار بھی بڑھی اور گھر کے دیگر ممبران روزی روٹی کی تلاش میں شہر آگئے اور اس طرح سے گھر میں اناج کا خرچ کم ہوگیا۔ کچھ سالوں سے اب ہمارے پاس سال بھر کھانے کے لیے اناج موجود رہتا ہے۔ جب میں خواہش کروں تو چاول پک سکتا ہے۔

اس بات کا ذکر کرنے کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ بھوک کیا ہوتی ہے وہ وہی جان سکتے ہیں جو کبھی بھوکے رہے ہوں، جو بھوکا رہا ہے وہ جانتا ہے اناج کی اہمیت۔ جو اناج کی اہمیت جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ بھلے ہی ہزاروں بوریاں اناج بیچ کر سونے کا ایک ٹکڑا بڑی مشکل سے خریدا جا سکے، مگر جب انسان بھوکا ہوتا ہے تو اس کی جان صرف دو پیسے کی روٹی بچاتی ہے، لاکھوں اور کروڑوں کے سونے اور زیور نہیں۔ میں نے کم سے کم بھوک محسوس کی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ کسان کا قرض ہم کبھی چکا نہیں سکتے۔ وہ تپتی ہوئی دھوپ میں کام کرتا ہے۔ وہ برسات کے موسم میں کیچڑ میں دھس کر گھنٹوں کھڑا رہتا ہے اور دھان کی روپائی کرتا ہے۔ جب وہ شام کو گھر لوٹتا ہے تو اس کے پیر کیچڑ کی وجہ سے سڑ جاتے ہیں اور اس میں زبردست درد ہوتا ہے۔ میری ماں کپڑے بتی کو تیل میں ڈبو کر جلا دیتی اور پھر میرے بابا کے سڑے ہوئے پیر پر جلتی آگ سے داغتی تا کہ زخم جلد ٹھیک ہو جائیں۔ جب سردی کے موسم میں ہم اپنے گھروں سے نہیں نکلے، تب کسان گیہوں کی آبپاشی کرنے کے لیے اپنے کھیت میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر ان باتوں کو تخت نشین محسوس کرتے تو ان اناج اگانے والے دھرتی کے فرشتوں پر لاٹھیاں نہیں برساتے۔ تبھی تو کسان کی لڑائی صرف کسان کی آمدنی سے نہیں ہے، بلکہ یہ ملک کے قومی مفاد اور ۱۳۰ کروڑ سے زائد ہندوستانیوں سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ کسی بھی قیمت پر اناج جیسے اہم امور کو کارپوریٹ کے حوالے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سرکار یہ اکثر بھول جاتی ہے کہ عوام اور ملک کے مفاد کے دفاع کے لیے عوام نے اسے ملک کی کمان دی ہے۔ اس کا کام ڈائنا سور کی شکل میں بڑی کارپوریٹ کمپنیوں کے لیے خوراک کا انتظام کرنا نہیں ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

پھر وہی مسلم مخالف پروپیگنڈا

بی جے پی مسلم مخالف پروپیگنڈے کا سہارا لے کر انتخابات جیتنے کی مذموم کوشش کررہی ہے، یہ ملک کی جمہوریت کے لیے تشویش کا باعث ہے
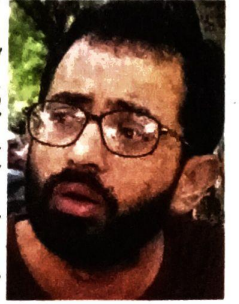
ابھے کمار

آج چوتھے مرحلے کے انتخابات اختتام پذیر ہوگئے۔اب صرف تین مراحل کے الیکشن باقی رہ گئے ہیں،مگرجس قدر برسراقتدار بی جے پی مسلم مخالف پروپیگنڈے کا سہارا لے کر انتخابات جیتنے کی مذموم کوشش کررہی ہے، وہ ملک کی جمہوریت کے لیے تشویش کا باعث ہے۔بی جے پی کسی طرح یہ ثابت کرنے کو بے چین ہے کہ حزب اختلاف مسلمانوں کی جماعت ہےاوروہ دلت،آدی واسی اوراوبی سی مخالف ہے جبکہ بی جے پی ہندوؤں کی سب سے بڑی خیر خواہ تنظیم ہے۔ایک نہیں بلکہ کئی مواقع پر،بھگوالیڈر مسلمانوں کا ڈر دکھلا رہے ہیں۔ان کی یہ کوشش ہے کہ مسلمانوں کے خلاف دلتوں،آدی واسیوں اور پسماندہ ذاتوں کو کھڑا کرکے ان کا ووٹ حاصل کیا جائے۔اس بار تو ایسا محسوس ہورہا ہے کہ بی جے پی مسلمانوں کو نشانہ بنانے میں اپنے ہی سابقہ ریکارڈ کو توڑنے جارہی ہے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اس پروپیگنڈے کو ہوا دینے میں، ملک کے وزیراعظم پیش پیش ہیں۔وزیراعظم، جو ایک سو چالیس کروڑ ہندوستانیوں کے لیڈر ہیں، وہ صرف انتخابات جیتنے کے لیے،سماج میں زہر کھولنے کی کوشش کررہے ہیں۔

گزشتہ ہفتوں کے اخبارات کے صفحات نریندر مودی کی انتخابی ریلیوں کی کوریج سے بھرے پڑے ہیں۔ٹی وی چینلز بھی ان کی ہی تقاریر اور بیانات کو آگے بڑھا رہے ہیں،خواہ شمال بھارت میں دی گئی ہو یا پھر جنوبی بھارت میں،ایک خاص قسم کا پیٹرن دکھائی دے رہا ہے۔اپنی بیشتر تقاریر میں،مودی جی یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کانگریس دلتوں،آدی واسیوں اور اوبی سی کے حقوق کو چھیننے کی سازش رچ چکی ہے۔وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ کانگریس محکوم طبقات کے ریزرویشن کو مسلمانوں میں بانٹ دینے کو بیتاب ہے۔ڈکھ کی بات ہے کہ وزیراعظم یہ سب بغیر کسی پختہ ثبوت کے بولے جارہے ہیں۔ان سے ان کے الزامات کا ثبوت طلب کرنے کی ہمت کوئی نہیں کررہا ہے۔میڈیا تو ان کی تعریف کرنے میں ہی مصروف ہے۔حالانکہ الیکشن کمیشن نے کرناٹک بی جے پی کے ایک انتہائی فرقہ وارانہ اشتہار کو سوشل میڈیا سے ہٹانے کا حکم جاری کیا ہے مگر عوام کی توقعات یہ ہیں کہ الیکشن کمیشن مزید فعال بنے اور وہ انتخابی مہم کو فرقہ واریت کے زہر میں ڈوبنے سے بچائے۔کمیشن کو چاہیے کہ وہ مودی کے بیانات پر غور کرے۔ایک ریلی کے بعد دوسری ریلی میں وہ مسلمانوں کو ٹارگیٹ کرتے نظر آرہے ہیں۔

مثال کے طور پر، راجستھان کے ٹونک ضلع میں، مودی نے ۲۳؍اپریل کو ایک انتخابی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے، یہ الزام عائد کیا کہ اگر کانگریس اوران کی اتحادی جماعت اقتدار پر قابض ہو جائے گی، تو وہ دلتوں اور اوبی سی کمیونٹی کے ریزرویشن کو لوٹ کر، ایک خاص جماعت میں بانٹ دے گی۔ایک خاص جماعت سے ان کا اشارہ مسلمانوں کی طرف تھا۔انہوں نے اپنی اسی تقریر میں کہا کہ باباصاحب امبیڈکر نے دلتوں،آدی واسیوں اور بیک ورڈ طبقات کو ریزرویشن دیا،جبکہ کانگریس مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کو ریزروشن دینا چاہتی ہےاوراس طرح دلتوں،آدی واسیوں اوراوبی سی کمیونٹی کی حق تلفی کرنے جارہی ہے۔مودی نے اس تقریر میں سابق وزیراعظم منموہن سنگھ کے ۲۰۰۶ء میں دیے گئے ایک بیان کو بھی توڑ مروڑ کر پیش کیا اور کہا کہ ڈاکٹر سنگھ نے کہا تھا کہ ملک کے وسائل پر پہلا حق مسلمانوں کا ہے۔دو دن پہلے، راجستھان کے بانس واڑہ میں، مودی نے مسلمانوں کا ڈر اکثریتی طبقہ میں پیدا کرنے کی پوری کوشش کی۔وزیراعظم نے کہا کہ کانگریس اگر اقتدار میں آئی تو وہ عوام کی دولت کو ہڑپ کر اسے مسلمانوں میں

> جب آئین بن کر تیار ہوا تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے ریزرویشن چھین لیا گیا۔یادرہے کہ مسلمانوں کو ریزرویشن انگریزوں کے دور میں ملتا تھا، جسے آزاد بھارت میں گناہ سمجھا جانے لگا۔آج مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ جیلوں میں ہیں، جبکہ ان کی نمائندگی کالجوں، یونیورسٹیوں، نوکریوں اور کاروبار میں بہت ہی کم ہے۔آج ان کو ہندوستانی سیاست میں الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔افسوس کی بات کہ مسلمانوں کو آگے لانے کی بجائے، ان کو ہی ولن بنا کر سیاست ہورہی ہے۔

بانٹ دے گی،جن کے پاس زیادہ بچے ہیں اور جو درانداز ہیں۔بی جے پی کے بیشتر لیڈر مسلسل مسلمانوں پر یہ الزام لگاتے رہے ہیں کہ وہ بچے پیدا کر کے ملک کی ڈیموگرافی بدلنے کی کوشش کررہے ہیں۔نیز دہشت گردوں، جرائم پیشہ افراد اور دراندازوں کو بھی ایک خاص مذہب سے جوڑنے کی مسلسل مذموم کوشش کی جارہی ہے۔

اس طرح کی باتیں، ۷؍مئی کو وزیراعظم نے مدھیہ پردیش کی ایک ریلی میں پھر دوہرائیں۔انہوں نے الزام لگایا کہ جو چارہ گھوٹالہ کا ملزم ہے اس نے مسلمانوں کو پورا ریزرویشن دینے کی بات کہی ہے۔وہ بہار کے سابق وزیراعلیٰ لالو پرساد کے اس بیان کی مذمت کررہے تھے، جس میں انہوں نے مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کی حمایت کی ہے۔مودی نے مزید کہا کہ لالو کا بیان اس بات کی دلیل ہے کہ انڈیا اتحاد دلتوں، آدی واسیوں اوراوبی سی کا حق غصب کرنا چاہتا ہےاورانہیں مسلمانوں میں تقسیم کرنے کی سازش کررہا ہے۔مودی کے الزامات صرف ریزرویشن تک ہی محدود نہیں ہیں۔مودی نے سیکولر جماعت پر نشانہ سادھتے ہوئے کہا کہ اس نے گودھرا کے حملہ آوروں کو بچانے کی کوشش کی۔سال ۲۰۰۲ء کے گجرات فسادات کے دوران ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے تھے، جن کی غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ فسادزدہ عوام کو تحفظات فراہم کرنے میں مودی ناکام رہے تھے۔تبھی تو اس وقت کی اٹل بہاری باجپائی کی مرکزی حکومت میں معاون جماعتوں نے مودی کو ہٹانے کا مطالبہ کیا تھا۔مگر آخری وقت لال کرشن اڈوانی اور سنگھ پریوار کی ایک بڑی لابی نے ایسا نہیں ہونے دیا اور نریندر مودی کو بچا لیا۔آج وہی مودی الٹے سیکولر پارٹیوں پر یہ الزام لگارہے ہیں کہ انہوں نے مسلم حملہ آوروں کو بچانے کی کوشش کی۔اپنی انتخابی ریلی میں، مودی نے مسلمان کے ساتھ ساتھ پاکستان کو بھی گھسیٹا ہے۔ ۳؍مئی کو گجرات میں تقریر کرتے ہوئے، مودی نے کہا کہ پاکستانی لیڈر کانگریس کی جیت کے لیے دعا کررہے ہیں۔اس طرح مودی مسلمان، پاکستان اور کانگریس کو ایک صف میں لاکر کھڑا کرنے کی کوشش کررہے تھے اور بی جے پی کو دیش بھکت اور ہندو نواز بتلا رہے تھے۔

مودی نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے دلتوں، آدی واسیوں اور اوبی سی کے لیے کیا کیا ہے۔اس کے علاوہ، یہ بات میڈیا کے لوگ آپ کو نہیں بتائیں گے کہ کانگریس پارٹی کے انتخابی منشور میں مسلمان لفظ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔وہیں اس نے ایس سی، ایس ٹی اور اوبی سی کے نام کئی مرتبہ لیا۔کانگریس یہ چاہتی ہے کہ مسلمان سیکولرزم کے نام پر آنکھ بند کر کے اور خاموشی سے اسے ہی ووٹ کرے اور اقتدار کی کرسی پر بیٹھا دیں۔مگر بی جے پی کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔اس نے پہلے ہی یہ بات ٹھان لی تھی کہ اسے مسلمانوں کی منہ بھرائی کے لیے کانگریس کو ہر حال میں ٹارگیٹ کرنا ہے۔یہ بات ہمارے وزیر اعظم کبھی نہیں بولتے کہ ان کی معاون جماعت این سی پی نے فروری میں ایک قرارداد پاس کر کے مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کی بات کہی تھی۔حالانکہ این سی پی کی یہ قرارداد بھی علامتی ہی نظر آرہی ہے۔مگر پھر بھی مودی کو یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ اجیت پوار پر سوال اٹھائیں کیونکہ ان کی حمایت سے مہاراشٹر کی بی جے پی اور شیوسینا کی حکومت چل رہی ہے۔جو بی جے پی آج مسلم ریزرویشن کے نام پر ڈر پیدا کررہی ہے وہ اس تاریخی حقیقت پر بھی بات نہیں کرنا چاہے گی کہ سردار پٹیل نے، جن کو وہ اپنا ہیرو مانتی ہے، قانون ساز اسمبلی کے مشاورتی کمیشن کی قیادت کرتے ہوئے، اقلیتوں بشمول مسلمانوں کے لیے ریزرویشن کی بات کہی تھی۔یہ دوسری بات ہے کہ جب آئین بن کر تیار ہوا تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے ریزرویشن چھین لیا گیا۔یاد رہے کہ مسلمانوں کو ریزرویشن انگریزوں کے دور میں ملتا تھا، جسے آزاد بھارت میں گناہ سمجھا جانے لگا۔آج مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے سب سے زیادہ جیلوں میں ہیں، جبکہ ان کی نمائندگی کالجوں، یونیورسٹیوں، نوکریوں اور کاروبار میں بہت ہی کم ہے۔آج ان کو ہندوستانی سیاست میں الگ تھلگ کردیا گیا ہے۔افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کو آگے لانے کی بجائے، ان کو ہی ولن بنا کر سیاست ہورہی ہے۔■

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)

debatingissues@gmail.com

لب پر گاندھی دل میں گوڈسے!

سات دہائیوں کے بعد بھی جمہوریہ ہند میں عوام کو انصاف اور مساوات کی آس

گوڈسے کو پھانسی لگی مگر اس کے نظریات کو فروغ ملا! کیا بھارت کی تاریخ صرف آریائی، ویدک اور ہندو تہذیب تک ہی محدود ہے؟

ابھے کمار، نئی دلی

کہتے ہیں کہ ہاتھی کے دانت دکھانے کے الگ اور کھانے کے الگ ہوتے ہیں۔ یہ بات بڑی حد تک بھگوا جماعت پر صادق آتی ہے۔ جہاں ایک طرف اس سے جڑے سرکردہ لیڈر گاندھی کے مجسمہ پر گلپوشی کرتے ہیں اور ان کو اپنا آئیڈیل بھی کہتے ہیں تو دوسری طرف بابائے قوم کے قاتل ناتھو رام گوڈسے کو بھی ہیرو مانتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں بھی صحیح ہوں؟ یا تو گاندھی کا موقف درست ہو سکتا ہے یا پھر گوڈسے کی سوچ صحیح ہو سکتی ہے۔ مگر بھگوا جماعت کی عیاری اور سیکولر طاقتوں کی بے عملی اور موقع پرستی کا نتیجہ ہے کہ آج گوڈسے کی زہریلی سوچ سماج کے ایک بڑے حصہ میں پھیل گئی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ آئینی منصب پر بیٹھے بھگوا لیڈر عوام کے سامنے گاندھی کو ہی اپنا رہنما قبول کرتے ہیں اور باپو کی ہی آرتی اُتارتے ہیں، مگر ایسا لگتا ہے کہ وہ یہ سب حالات کو مد نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ ان کا منشا تو یہ ہے کہ گوڈسے کے راستہ پر ملک کو چلایا جائے اور یہاں کی مشترکہ وراثت اور شہادت کی تاریخ کو مٹا کر اسے ایک ہی رنگ میں رنگ دیا جائے۔

ملک کی یہ بدقسمتی ہے کہ فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف ملک کے عوام نے سیکولر لیڈرشپ کو اتنا کچھ موقع دیا مگر انہوں نے صحیح کم اور خراب زیادہ کیا۔ فرقہ پرستی اور نفرت کے خلاف جو لڑائی ان کو لڑنی چاہیے تھی اور جو عوامی حمایت ان کو دی گئی تھی اس کی اہمیت کو وہ نہ سمجھ سکے اور انہوں نے اقتدار کی خاطر ایک کے بعد ایک سمجھوتا کیا اور بعض اوقات فرقہ پرستوں کے ساتھ پس پردہ سازباز بھی کی، اس طرح ملک کو کمزور کیا۔ سیکولر طاقتوں کی یہ نادانی تھی یا ان کی موقع پرستی کہ انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ گوڈسے کو پھانسی لگ جانے کے بعد اس کی کہانی کا اختتام ہو گیا۔ مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔ انہوں نے گوڈسے کو ایک نفرت انگیز نظریہ کی علامت سمجھنے کے بجائے واحد جنونی انسان سمجھا جو ایک روز پستول اٹھا کر گاندھی کے جسم میں تین گولی ماردیں اور کہانی ختم۔

سیکولر فورسیز کی اس غفلت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوتوا طاقتیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف مین اسٹریم میں واپس آگئیں بلکہ انہوں نے گوڈسے کو دوبارہ عوام میں ہیرو بنانے کا کام کیا۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ انہوں نے اس کام کو انجام دینے میں کتنا وقت لگایا مگر یہ تلخ حقیقت ہے کہ فرقہ پرست اور شدت پسند گروپوں سے باہر بھی اس کا پرچار کیا گیا اور بہت سارے لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا کی گئی کہ گوڈسے نے ہندو سماج اور ملک کے لیے قربانی دی اور اس نے گاندھی کو ہلاک کر کے صحیح کام کیا تھا۔

میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ ہندو سماج، خاص کر اعلی ذات کے ایک حصہ میں گوڈسے کو ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پرائمری اسکول کا طالب علم تھا تب بھی میرے گاوں میں گوڈسے کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ بات ۱۹۹۰ کی دہائی کی ہے، اس وقت تک بھگوا طاقتیں سیاست کے مرکز تک نہیں پہنچ پائی تھیں اور اقتدار کی کرسی پر سیکولر طاقتیں ہی قابض تھیں۔ میرا آبائی وطن شمالی بہار کا ایک بہت ہی پسماندہ گاوں ہے، جو نیپال کی سرحد سے قریب ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے گاوں میں ایک شکلا جی ہوتے تھے، جو پاس کے کسی اسکول میں معلم تھے۔ کم پڑھے لکھے گاوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ سرکاری نوکری تھی اس کے علاوہ وہ زمیندار بھی تھے۔ بات کرنے کا انداز بھی اچھا تھا۔ زبان شیریں تھی اور آرام سے بولتے تھے۔ وہ ہندی کے اخبارات پڑھتے تھے اور ریڈیو سے خبریں بھی سنتے تھے۔ گاوں کے دیگر باشندے کم پڑھے لکھے تھے۔ لوگوں کو ماسٹر جی ملک اور دُنیا کی سیاست اور حالات حاضرہ کے بارے میں جانکاری دیتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب بہار کے گاوں میں ٹی وی ایک دو گھروں تک ہی پہنچ پایا تھا۔ ڈی ٹی ایچ اور کیبل نیٹ ورک تو دور گاوں میں بجلی بھی نہیں تھی۔

شاید ناتھو رام گوڈسے کے بارے میں سب سے پہلے میں نے انہی سے سنا تھا۔ گاندھی جی کے بارے میں ہم تھوڑا بہت جانتے تھے کیونکہ یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کی تقریب کے دوران ہمارے اسکول کے بچوں کی ریلی گاوں بھر میں گھومتی تھی۔ مائک کو ہاتھ میں پکڑ کر ہم مہاتما گاندھی زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ گاندھی کون تھے، ان کے کیا افکار تھے یہ سب ہم کو معلوم نہیں تھا۔ مگر جب میں نے ماسٹر جی کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ گوڈسے نے گاندھی کا قتل کرنے کے بعد ایک کتاب لکھی جسے سب کو پڑھنا چاہیے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس کتاب میں گوڈسے نے یہ بتلایا ہے کہ آخر کیوں اسے گاندھی کو مارنے کی ضرورت پڑی۔ ماسٹر جی کی باتوں کو سن کر ایسا لگا کہ گوڈسے نے بڑی قربانی دی اور دیش کو بچایا تھا۔ ماسٹر جی نے گاندھی کی غلطیوں کے بارے میں بھی بتلایا کہ وہ کیسے مسلم نواز تھے اور کیسے انہوں نے ہندو سماج کا نقصان کیا تھا۔ شکلا جی کی بات مجھے آج بھی یاد ہے۔ مگر اب ان کی باتوں کا مطلب کچھ اور ہی سمجھ میں آتا ہے۔ جس گوڈسے کی کتاب کا ذکر انہوں نے کیا تھا اسے میں کچھ سال پہلے پڑھ چکا ہوں اور اب مجھے اس بات کا یقین ہونے لگا ہے کہ ماسٹر جی ضرور بھگوا تنظیم کے پرچارک، مبلغ یا پھر اس کے اہم کارکن رہے ہوں گے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بچپن میں ماسٹر جی کی نفرت انگیز باتیں بھی بری نہیں لگتی تھیں کیونکہ کہنے والا گاوں کا ہی ایک معزز ٹیچر تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے شعور میں اضافہ ہوا۔ اپنے ذاتی تجربہ اور مطالعہ سے مجھے سماج کے اندر جڑیں مضبوط کر چکی فرقہ پرستی کی بیماری سے چھٹکارا ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ سیکولر نظریہ ہی درست ہے اور جو لوگ دھرم اور مذہب کے نام پر معاشرہ میں دراڑیں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ ملک کے دوست نہیں بلکہ دشمن ہیں۔ مجھے اس بات کا مضبوط یقین ہونے لگا کہ اصل لڑائی نابرابری کے خلاف ہونی چاہیے۔ میں نے دیکھا کہ سماج میں غیر مساوی نظام آسمان سے نہیں ٹپکا ہے بلکہ کچھ مٹھی بھر لوگ اس کے لیے ذمہ دار ہیں۔ ارباب اقتدار کا اس میں مفاد ہے کہ ذات پات اور دھرم کے نام پر لوگوں کو بانٹ کر رکھا جائے اور نفرت اس قدر پھیلائی جائے کہ باطل ہی حق اور شر ہی خیر نظر آنے لگے۔ لوگوں کو دھرم کے نام پر اس لیے تقسیم کیا جاتا ہے تاکہ ان کا ذہن اور ان کی لڑائی کبھی بھی صحیح سمت اختیار نہ کرے۔

یہ بہت دکھ کی بات ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں آج اپنے ناپاک منصوبہ میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئی ہیں۔ سماج کا ایک حصہ نفرت کی سیاست کی زد میں آگیا ہے۔ جب دن رات افواہیں پھیلائی جائیں اور جھوٹ کو بار بار دہرایا جائے تو وہ سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ آج ایسا ہی کچھ گوڈسے کے بارے میں بھی ہو رہا ہے۔ آزادی کو ملے ہوئے ہمیں ۷۵ سال سے بھی زیادہ ہو گئے مگر آج بھی ہماری جمہوریت فرقہ پرست عناصر کے خطرہ سے آزاد نہیں ہے۔ آج تو حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ باپو کے قاتل کے نظریہ کے حاملین اقتدار کی کرسی پر براجمان ہو گئے ہیں۔ ایک زمانہ تک انہوں نے ملک کے آئین کو اس لیے برا بھلا کہا کیونکہ وہ ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں پر مبنی نہیں ہے۔ انہوں نے گاندھی کو مسلم نواز کہہ کر نئی نسلوں کو گمراہ کیا۔ آج بھی گوڈسے کو ہیرو بنانے کے لیے پوری مشینری لگی ہوئی ہے۔ یہ بات ہمیں نہیں فراموش کرنی چاہیے کہ جو لوگ آج حکومت میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ گوڈسے کے نظریہ کو دل سے قبول کرتے ہیں اور دنیا کو دکھلانے کے لیے

گاندھی جی کا عکس

> یہ بات بھگوا تنظیمیں نہیں سمجھنا نہیں چاہتیں کہ بھارت کی اصل طاقت یہاں کے لوگوں کے مابین اتحاد ہے۔ لوگوں کو دھرم کے نام پر لڑانے سے ایک مخصوص سیاسی جماعت ہی مضبوط ہو سکتی ہے مگر ملک اور سماج اندر سے کمزور ہوتا ہے۔ یہ بات ان فرقہ پرستوں کو کون سمجھائے کہ یہ ملک جتنا ہندووں کا ہے اتنا ہی مسلمانوں اور دیگر مذہبی گروپوں کا بھی ہے۔ اس ملک کے وسائل پر جتنا حق ہندووں کا ہے اتنا ہی پسماندہ، دلت اور آدی واسی سماج کے لوگوں کا بھی ہے۔ جس طرح مرد کو تمام حقوق دیے گیے ہیں، اسی طرح خواتین کو بھی حقوق ملنے چاہئیں۔

گاندھی کے نام کا جاپ کرتے ہیں۔

اخبارات کے پرانے صفحات کو پلٹ کر دیکھیے یا پھر انٹرنیٹ پر سرچ کر لیجیے آپ کو بہت ساری ایسی کہانیاں مل جائیں گی جن میں گوڈسے کو میڈیا اور عوام کے سامنے ہیرو بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جب ہنگامہ زیادہ بڑھ جاتا ہے اور گوڈسے بھکتی پر سوال اٹھنے لگتے ہیں تو سرکار میں بیٹھے بھگوا لیڈر خود کو ان ساری حرکتوں سے الگ کر لیتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ گوڈسے نواز فوج کو پیدا کرنے والے اور ان کو ہر طرح سے مدد فراہم کرنے والے کوئی اور نہیں بلکہ یہی بھگوا تنظیمیں ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو گوڈسے کا نام اس کے ساتھ ہی مٹ گیا ہوتا۔ اگر بھگوا عناصر گوڈسے کو آگے نہیں کرتے تو آج اس کے مجسمہ پر گلپوشی نہیں ہوتی، نہ کوئی اس کے لیے مندر بنانے کی بات کہتا اور نہ کوئی گاندھی کی تصویر پر علامتی طور سے گولی چلاتا! یہ بھی بات ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ بھگوا حکومت میں بیٹھے جو لوگ بھی خود کو گوڈسے کے نام سے اپنے آپ کو منسوب نہیں کرتے ہیں وہ بھی گوڈسے کی سوچ کے مطابق ہی سیاست کرتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں گوڈسے کی زندگی اور اس کے نظریہ کے بارے میں چند اہم باتوں کا ذکر کرنا پڑے گا۔

ناتھو رام گوڈسے نے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کی شام پانچ بجے باپو کے جسم میں تین گولیاں ماریں۔ یہ واقعہ تب پیش آیا جب وہ دہلی میں واقع بِرلا ہاوس میں پوجا پاٹ کر رہے تھے۔ باپو کے قتل کے الزام میں گوڈسے پر مقدمہ چلا اور اسے عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی۔ گوڈسے کی اس مذموم حرکت کے بعد ملک میں بھگوا فرقہ پرست تنظیموں کے خلاف ایک ماحول بن گیا۔ چونکہ گوڈسے کا تعلق ہندو مہاسبھا سے تھا اور وہ وی ڈی ساورکر کے رابطہ میں بھی تھا اس لیے عوام میں ان بھگوا تنظیموں کی مقبولیت کافی کم ہو گئی اور وہ مین اسٹریم سے الگ تھلگ پڑ گئے۔ اس کے بعد سیکولر طاقتوں نے محسوس کیا کہ اب بھگوا عناصر کبھی بھی دوبارہ سر اٹھا نہیں سکیں گے۔ مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔ رفتہ رفتہ بھگوا طاقتوں نے پاوں پھیلانے شروع کیے۔ انہوں نے سیکولر طاقتوں کی موقع پرستی اور غفلت کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور تصویر بدلنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

گوڈسے نواز طاقتیں آج اقتدار کی کرسی پر قابض ہیں اور ملک کی مشترک وراثت میں یقین رکھنے والے لوگوں اور اس پر عمل کرنے والوں کو غدار وطن، مسلم نواز کہہ کر دن رات گالیاں دی جا رہی ہیں۔ آج صورت حال اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ بابائے قوم کے قاتل گوڈسے کے مجسمہ پر گلپوشی کی جا رہی ہے اور میڈیا کے کیمروں کے سامنے اس کی آرتی اُتاری جا رہی ہے۔ یہ سب ملک کے لیے بہت ہی خطرناک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ گوڈسے کے پستول سے نکلنے والی گولی سے بھی زیادہ خطرناک یہ فرقہ وارانہ فکر ہے۔ گولی تو ایک انسان کی جان لے سکتی ہے، مگر نفرت، تفریق اور فتنہ بھڑکانے والا نظریہ پورے سماج اور ملک کو تباہ اور برباد کر دیتا ہے۔

گوڈسے گاندھی کے افکار اور ان کی پالیسی سے کافی ناراض تھا۔ اس کو لگتا تھا کہ گاندھی مسلمانوں کے مفاد میں اس قدر کام کر رہے ہیں جس سے ہندو سماج کا بڑا بھاری نقصان ہو رہا ہے۔ حالانکہ ان باتوں میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ گوڈسے کے ذہن پر بھگوا شدت پسند تنظیموں کا اثر تھا۔ گوڈسے اپنی جوانی کے دنوں میں آر ایس ایس سے جڑا ہوا تھا۔ پھر وہ ہندو مہاسبھا کے قریب آیا۔ اتنا ہی نہیں وہ مہاراشٹرا سے شائع ہونے والے مراٹھی روزنامہ "اگرانی" کا مدیر بھی بنا۔ اس کو لوگ پنڈت ناتھو رام گوڈسے کے نام سے بھی پکارتے تھے اور وہ ساورکر کے کافی قریب تھا۔ گاندھی کے بارے میں گوڈسے نے اپنے دل میں بہت ساری غلط فہمیاں پال رکھی تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ گاندھی مسلمان، مسلم لیگ کے رہنماوں اور پاکستان پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں، جبکہ وہ اس بات سے فکر مند نہیں ہیں کہ ہندووں کے خلاف قتل وغارت گری کرنے والے یہی لوگ ہیں۔

دراصل گاندھی اور سیکولر طاقتوں کو مسلم نواز کہنے والا گوڈسے ہی واحد شخص نہیں تھا۔ آج بھی اس طرح کے خیالات بھگوا عناصر کی طرف سے پھیلائے جاتے ہیں کہ سیکولر لیڈرشپ مسلمانوں کے لیے کام کرتی ہے اُسے ہندو سماج اور ملک کی زیادہ فکر نہیں رہتی۔ گوڈسے کا بھی یہی ماننا تھا کہ تقسیم ملک کے وقت مسلمانوں نے ہندووں پر ظلم اور زیادتی کی اور مسلم لیگ کی سرکار خاموش تماشائی بنی رہی۔ گاندھی سے گوڈسے کی ناراضگی اس بات سے بھی تھی کہ گاندھی اپنی پوجا پاٹ کے دوران قرآن بھی پڑھتے ہیں۔ گوڈسے کی غلط سوچ کی بنیاد میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ قدیم زمانہ سے ہندوستان ہندووں کے لیے مادر وطن اور مقدس سرزمین رہا ہے۔ بھارت کی جو عظیم تاریخ ہے اسے بنانے میں صرف اور صرف ہندووں کا ہی رول رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف مسلمان بھارت میں دسویں صدی کے بعد داخل ہوئے اور انہوں نے "ہندو" ملک کے اوپر مسلم حکومت تھوپ دی۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں کو حملہ آور کہنے والوں میں صرف گوڈسے ہی شامل نہیں ہے، بلک ملک کی حکومت کے عالی منصب پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے بھی ہزار سال کی غلامی کی بات کہہ کر مسلمانوں کو نشانہ بنایا ہے۔

گوڈسے اور دیگر بھگوا فرقہ پرستوں کی نفرت انگیز سوچ اس وجہ سے ہے کہ ان کا خیال ہے کہ مظلوم تو صرف ہندو ہی ہو سکتا ہے اور ظالم صرف غیر ہندو، جیسے مسلمان، مسلم لیگ، پاکستان اور عیسائی۔ اگر بات تقسیم ملک کی جائے تو یہ کہنا کہ فسادات میں صرف ہندووں کا ہی خون بہا تو یہ سراسر غلط بات ہو گی۔ مگر گوڈسے کو صرف ہندو خون بہتا ہوا نظر آیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خون ہندو کا نہیں بہا اور نہ ہی مسلمان اور سکھ کا بہا تھا بلکہ صحیح معنوں میں کہا جائے تو خون مظلوموں کا بہا تھا اور ظلم اور زیادتی کرنے والے طاقتور لوگ تھے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی علاقہ میں ہندو کے ساتھ ظلم کیا گیا ہو اور کسی علاقہ میں سکھ، عیسائی، مسلمان اور دیگر کے ساتھ۔ دراصل تقسیم ملک، بھارت میں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے ایک المیہ تھا جس میں خون انسان کا بہا تھا اور وہ اس لیے بہا تھا کہ ہندوستان کے لیڈروں نے اپنی کرسی کی پرواز زیادہ اور ملک و معاشرہ کی پروا کم کی تھی۔ اگر ان لیڈروں نے اقتدار میں سب کو شریک کرنے اور کمزور طبقات کو ان کا حق دینے کی کوشش سچے دل سے کی ہوتی تو آج ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

یہ بات بھگوا تنظیمیں نہیں سمجھنا نہیں چاہتیں کہ بھارت کی اصل طاقت یہاں کے لوگوں کے مابین اتحاد ہے۔ لوگوں کو دھرم کے نام پر لڑانے سے ایک مخصوص سیاسی جماعت ہی مضبوط ہو سکتی ہے مگر ملک اور سماج اندر سے کمزور ہوتا ہے۔ یہ بات ان فرقہ پرستوں کو کون سمجھائے کہ یہ ملک جتنا ہندووں کا ہے اتنا ہی مسلمانوں اور دیگر مذہبی گروپوں کا بھی ہے۔ اس ملک کے وسائل پر جتنا حق ہندووں کا ہے اتنا ہی پسماندہ، دلت اور آدی واسی سماج کے لوگوں کا بھی ہے۔ جس طرح مرد کو تمام حقوق دیے گیے ہیں، اسی طرح خواتین کو بھی حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ کہنا کہ یہ ملک صرف ہندووں کا ہے، ملک کو مضبوط کرنے کے بجائے کمزور کرتا ہے۔ کیا ملک کی آزادی میں ہندووں کے علاوہ دیگر سماجی گروپ کے لوگوں نے قربانیاں نہیں دی تھیں؟ کیا بھارت کی تاریخ صرف آریائی، ویدک اور ہندو تہذیب تک ہی محدود ہے؟ ہرگز نہیں۔ دراصل بھارت کی تاریخ صرف ہندو تہذیب کی داستان نہیں ہے، بلکہ اس میں بدھ مت، جین مت، اسلام، عیسائیت، پارسی اور سکھ دھرم کی بھی عظیم داستانیں بھی شامل ہیں۔ جہاں بھارت میں آریائی، ویدک اور سنسکریت تہذیب اہم ہے، اسی طرح ڈراویڈ کلچر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس ملک میں دھرم کو ماننے والوں سے لے کر دھرم کو نہ ماننے والوں تک کی تاریخ اور افکار شامل ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ سیاسی فائدہ کے لیے باپو کے قاتل گوڈسے کے حامیوں کے خلاف کاروائی کرنے کے بجائے ان کو بچایا جا رہا ہے۔ یہ سب رجحانات ملک کی مشترکہ وراثت کے لیے بے حد خطرناک ہیں۔ آیئے ایک بار پھر ہم باپو کے یوم شہادت پر عہد کریں کہ ہم گوڈسے کی زہریلی سوچ کو ملک میں پھیلنے سے روکیں گے اور اس کے حامیوں کو سماج میں الگ تھلگ کرنے کے لیے پوری کوشس کریں گے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

***

یہ زہر پھیلنے نہ دیجیے!

سانجھی وراثت میں یقین رکھنے والوں کو غدار وطن اور مسلم نواز ہندو کہہ کر دن رات گالی دی جارہی ہے

ابھے کمار

آج سے ۷۴ سال قبل جنوری کی سردی میں ناتھورام گوڈسے نے مہاتما گاندھی کو گولی سے مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ باپو کے قتل کے الزام میں، گوڈسے پر مقدمہ چلا اور اسے عدالت نے پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ گوڈسے کی اس مذموم حرکت کے بعد ملک میں فرقہ پرست تنظیموں کے خلاف ایک ماحول بن گیا۔ چونکہ گوڈسے کا تعلق ہندو مہاسبھا وغیرہ سے تھا اور وہ وی ڈی ساورکر کے رابطہ میں بھی تھا، اس لیے عوام میں ان تنظیموں کی مقبولیت کافی کم ہوگئی اور وہ مین سٹریم سے الگ تھلگ پڑ گئے۔ اس کے بعد سیکولر فورسیز کو یہ لگا کہ اب یہ عناصر کبھی بھی دوبارہ سر اٹھا کر سامنے نہیں آئیں گے۔ مگر سیکولر فورسیز کی یہ خام خیالی تھی۔ رفتہ رفتہ فرقہ پرست طاقتوں نے کام کرنا شروع کیا۔ انہوں نے سیکولر فورسیز کی موقع پرستی اور غفلت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ تصویر بدلنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ آج سانجھی وراثت میں یقین رکھنے والے لوگوں اور اس پر عمل کرنے والے افراد کو غدار وطن اور مسلم نواز ہندو کہہ کر دن رات گالی دی جارہی ہے۔ صورت حال اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ بابائے قوم کے قاتل گوڈسے کے مجسمہ پر گل پوشی کی جارہی ہے اور میڈیا کے کیمروں کے سامنے اس کی آرتی اُتاری جارہی ہے۔ یہ سب ملک کے لیے بہت ہی خطرناک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ گوڈسے کے پستول سے نکلنے والی گولی سے بھی زیادہ خطرناک اس کی فرقہ وارانہ فکر ہے۔ گولی تو ایک انسان کی جان لے سکتی ہے، مگر نفرت، تفریق اور فتنہ کو بھڑکانے والا نظریہ پورے سماج اور ملک کو تباہ اور برباد کرسکتا ہے۔

ناتھورام گوڈسے نے ۳۰ جنوری، ۱۹۴۸ کی شام پانچ بجے باپو کے جسم میں تین گولی ماری۔ یہ واقعہ تب پیش آیا جب وہ دہلی میں واقع بڑلا ہاؤس میں عبادت کررہے تھے۔ گوڈسے گاندھی کے افکار اور ان کی پالیسی سے کافی ناراض تھا۔ اس کو لگتا تھا کہ گاندھی مسلمانوں کے مفاد میں اس قدر کام کررہے ہیں کہ اس میں ہندو سماج اور بھارت کا بہت بڑا بھاری نقصان ہورہا ہے۔ حالانکہ ان باتوں میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ گوڈسے کی سوچ کے اوپر شدت پسند تنظیموں کا اثر تھا۔ گوڈسے ہندو مہاسبھا کے قریب آیا۔ اتنا ہی نہیں وہ مہاراشٹرا سے شائع ہونے والے مراٹھی روزنامہ "اگرانی" اخبار کا مدیر بھی تھا۔ اس کو لوگ پنڈت ناتھورام گوڈسے کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ گاندھی کے بارے میں گوڈسے نے بہت ساری غلط فہمیاں پال رکھی تھیں۔ اسے یہ لگتا تھا کہ گاندھی مسلمان، مسلم لیگ کے رہنماؤں اور پاکستان پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں، جبکہ وہ اس بات سے فکرمند نہیں ہیں کہ ہندوؤں کے خلاف قتل اور غارت کرنے والے یہی لوگ ہیں۔

دراصل گاندھی اور سیکولر فورسیز کو مسلم نواز کہنے والا گوڈسے ہی واحد شخص نہیں تھا۔ آج بھی اس طرح کی بات فرقہ پرست عناصر کی طرف سے پھیلائی جاتی ہے کہ سیکولر لیڈر شپ مسلمان کے لیے کام کرتی ہے اور اسے ہندو سماج اور ملک کی زیادہ فکر نہیں رہتی۔ گوڈسے کا بھی یہی ماننا تھا کہ تقسیم ملک کے وقت مسلمانوں نے ہندوؤں پر ظلم اور زیادتی کی اور مسلم لیگ خاموش تماشائی بنی رہی۔ گاندھی سے گوڈسے کی ناراضگی اس بات سے تھی کہ گاندھی اپنی عبادت کے دوران قرآن بھی پڑھتے ہیں۔ گوڈسے کی غلط سوچ کی بنیاد میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ قدیم زمانہ سے ہندوستان ہندوؤں کے لیے مادر وطن اور کی مقدس سرزمین رہا ہے۔ بھارت کی جو عظیم تاریخ ہے اسے بنانے میں صرف اور صرف ہندوؤں کا ہی رول رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف مسلمان بھارت میں ۱۰ ویں صدی کے بعد داخل ہوتے چلے آئے اور انہوں نے "ہندوؤں کے اوپر مسلم حکومت تھوپ دی۔

> ”گوڈسے کی حامی طاقتوں کی نفرت انگیز سوچ اس وجہ سے ہے کہ ان کو یہ لگتا ہے کہ مظلوم تو صرف ہندو ہی ہوسکتا ہے اور ظالم صرف غیر ہندو، جیسے مسلمان، مسلم لیگ، پاکستان اور عیسائی ہوسکتا ہے۔ اگر بات تقسیم ملک کی کی جائے تو یہ کہنا کہ دنگوں میں صرف ہندوؤں کا ہی خون بہا تو یہ سراسر غلط بات ہوگی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مسلمانوں کو حملہ آور کہنے والوں میں صرف گوڈسے ہی شامل نہیں ہے، بلک ملک کی حکومت کے عالی منصب پر بیٹھے ہوئے ایک شخص نے بھی ہزار سال کی غلامی کی بات کہہ کر مسلمانوں کو نشانہ بنایا تھا۔

گوڈسے اور دیگر فرقہ پرستوں کی نفرت انگیز سوچ اس وجہ سے ہے کہ ان کو یہ لگتا ہے کہ مظلوم تو صرف ہندو ہی ہوسکتا ہے اور ظالم صرف غیر ہندو، جیسے مسلمان، مسلم لیگ، پاکستان اور عیسائی ہوسکتا ہے۔ اگر بات تقسیم ملک کی کی جائے تو یہ کہنا کہ دنگوں میں صرف ہندوؤں کا ہی خون بہا تو یہ سراسر غلط بات ہوگی۔ مگر گوڈسے کو صرف ہندو خون بہتا ہوا نظر آرہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ خون ہندو کا نہیں بہا، اور نہ ہی خون مسلمان اور سکھ کا بھی بہا تھا۔ صحیح معنوں میں کہا جائے تو خون مظلوموں کا بہا اور ظلم اور زیادتی کرنے والے طاقتور لوگ تھے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی علاقہ میں ہندو کے ساتھ ظلم کیا گیا ہوگا، اور کسی علاقہ میں سکھ، عیسائی، مسلمان اور دیگر کے ساتھ۔ دراصل تقسیم ملک بھارت میں رہنے والے تمام لوگوں کے لیے ایک المیہ تھا، جس میں خون انسان کا بہا اور خون اس لیے بہا کہ ہندوستان کے لیڈران نے اپنی کرسی کی پرواہ زیادہ اور معاشرہ اور ملک کی پرواہ کم کی تھی۔ اگر ان لیڈروں نے اقتدار میں سب کو شریک کرنے اور کمزور سے کمزور طبقات کو اس کا حق دینے کی کوشش سچے دل سے کی ہوتی تو آج ملک کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔

یہ بات شدت پسند عناصر نہیں سمجھنا چاہتے کہ بھارت کی اصل طاقت یہاں کے لوگوں کے مابین اتحاد ہے۔ لوگوں کو دھرم کے نام پر لڑانے سے ایک مخصوص سیاسی جماعت ہی مضبوط ہو سکتی ہے، مگر سماج اور ملک اندر سے کمزور ہوتا ہے۔ یہ بات فرقہ پرستوں کو کون سمجھائے کہ یہ ملک جتنا ہندوؤں کا ہے اتنا ہی مسلمان اور دیگر مذہبی گروپوں کا ہے۔ اس ملک کے وسائل پر جتنا حق عالیٰ ذاتوں کا ہونا چاہیے اسی طرح پسماندہ، دلت، آدی واسی سماج کے لوگوں کو بھی حق ملنا چاہیے۔ جس طرح مرد کو تمام حقوق دیے گیے ہیں، اسی طرح خواتین کو بھی حقوق ملنے چاہئیں۔ کیا ملک کی آزادی میں ہندوؤں کے علاوہ دیگر سماجی گروپ کے لوگوں نے قربانی نہیں دی تھی؟ کیا بھارت کی تاریخ صرف آریائی، ویدک اور ہندو تہذیب تک ہی محدود ہے؟ ہرگز نہیں۔ دراصل بھارت کی تاریخ صرف ہندو تہذیب کی داستان نہیں ہے، بلکہ اس میں بدھ مت، جین مت، اسلام، عیسائیت، پارسی اور سکھ دھرم کی بھی عظیم داستان بھی شامل ہے۔ جہاں بھارت میں آریائی، ویدک اور سنسکریت تہذیب اہم ہے، اسی طرح بھارت میں ڈراوڈ کلچر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس ملک میں دھرم کو ماننے والوں سے لے کر دھرم کو نہ ماننے والوں تک کی تاریخ اور افکار شامل ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ سیاسی فائدہ کے لیے باپو کے قاتل گوڈسے کے حامیوں کے خلاف کاروائی کرنے کے بجائے ان کو بچایا جارہا ہے۔ یہ سب رجحانات ملک کی مشترکہ وراثت کے لیے بے حد خطرناک ہیں۔ آئیں ایک بار پھر ہم باپو کے یوم شہادت پر عہد کریں کہ ہم گوڈسے کی زہریلی سوچ کو پھیلنے سے روکیں گے اور اس کے حامیوں کو سماج میں الگ تھلگ کرنے کے لیے پوری کوشش کریں گے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

ہاتھرس سانحہ: دلت سماج کی نظر سے

”اعلیٰ ذات کے صرف چار افراد نے نہیں، سارے سسٹم نے عصمت ریزی کی“

ابھے کمار، دلی

ہاتھرس اجتماعی عصمت ریزی اور قتل کے خلاف پورے بھارت میں احتجاج ہو رہا ہے۔ مقتول دلت لڑکی کے خاندان والوں کا مطالبہ ہے کہ سپریم کورٹ کی نگرانی میں اس پورے معاملے کی جانچ کرائی جائے۔ ۱۹ سالہ دلت لڑکی کے خاندان والے یہ نہیں چاہتے کہ تفتیش کی ذمہ داری سی بی آئی کے سپرد کی جائے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دلت سماج کا اعتماد پولیس، انتظامیہ اور ریاستی حکومت کے تیئں کافی کم یا ختم ہو گیا ہے؟ دلت سماج اپنے خواتین کے اوپر ہونے والے حملوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ دلت یا پھر دیگر محروم طبقات کی خواتین ہی کیوں سب سے زیادہ جنسی تشدد کا شکار ہوئی ہیں؟ آخر کیوں ان کے خلاف عصمت ریزی کی وارداتیں رکنے کا نام نہیں لے رہی ہیں؟

ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے راقم الحروف نے دلت سماج سے تعلق رکھنے والی چند خواتین سے بات کی۔ ڈر اور خوف کا عالم یہ ہے کہ بہت ساری خواتین اپنا نام اخبار میں ظاہر کرنے سے بھی کترا رہی تھی۔ جس طرح سے اتر پردیش کی بی جے پی سرکار نے پولیس کو آگے کر کے عوام کی آواز دبانے کی کوشش کی وہ تاناشاہی سے کم نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہیں تو اتر پریش کی یوگی سرکار پولیس کے بل پر چل رہی ہے۔ اسی وجہ سے بہت ساری دلت لڑکیاں اس پورے معاملہ پر اپنی بات تو رکھنا چاہتی ہیں مگر وہ یہ نہیں چاہتیں کہ ان کا نام، ٹھکانہ، پیشہ یا تصویر اخبار میں شائع کیا جائے۔ اس مضمون میں ہم چار دلت خواتین کی رائے شامل کر رہے ہیں، جنہوں نے پورے معاملے کو امبیڈکاری نظریہ سے دیکھا ہے۔ اتر پریش کے اُناو ضلع کی ایک دلت طالبہ نے جو دلی میں واقع ایک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کر رہی ہیں، اپنی بات رکھتے ہوئے کہا کہ ان کو اس بات کا دُکھ ہے کہ ”نربھیا کیس میں تمام کمیونٹی کے لوگ سڑک پر نکل آئے تھے، مگر اب وہی معاملہ ایک دلت لڑکی کے ساتھ پیش آیا ہے تو صرف نچلے طبقے کے لوگ اور کچھ دانشور ہی آواز بلند کر رہے ہیں۔“

اناو کی اس طالبہ کا کہنا یہ ہے کہ ”ذات کی وجہ سے دلت کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر غیر دلت خاتون، خاص کر اعلیٰ ذات پر حملہ ہوتا ہے تو اس کی مذمت سب کرتے ہیں اور میڈیا اور سیاست میں یہ ایک بڑا ایشو بن کر ابھرتا ہے مگر جب وہی ستم کسی دلت کے اوپر ڈھایا جاتا ہے تو اس پر لوگ کُھل کر نہیں بولتے“۔

ذات پات نے عوام کو اس طرح سے بانٹ رکھا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو انسان نہیں سمجھتا ہے۔ تبھی تو گزشتہ دنوں ہاتھرس کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے ملزمین کی حمایت میں ’مہا پنچایت‘ بلائی۔ سب سے شرمناک بات یہ ہے کہ دلت لڑکی کو انصاف دلانے کے بجائے، بی جے پی کے لیڈران حملہ کرنے والوں کے ساتھ کھڑے نظر آ رہے ہیں، جو ان کے ’بیٹی بچاؤ بیٹی پڑھاؤ‘ کے کھوکھلے نعروں کی پول کھول دیتا ہے۔ مثال کے طور پر بی جے پی کے ایک مقامی سابق ایم ایل اے راجویر سنگھ کے گھر پر ایک بڑی پنچایت کا انعقاد کیا گیا اور سر عام یہ کہا کہ گینگ ریپ میں جیل بھیجے گئے سارے ملزمین بے گناہ ہیں (ہندوستان، ۴ اکتوبر)

اُناو کی طالبہ کا یہ بھی الزام ہے کہ مقتول دلت لڑکی کا علاج صحیح طریقے سے نہیں کیا گیا، وہیں دوسری طرف اس کی لاش کو پولیس والوں نے رات کے اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ جلا دیا۔ آخر کیوں لڑکی کو علاج مہیا کرانے میں حکومت اور انتظامیہ نے سستی دکھائی جبکہ اس کی لاش کو جلانے میں انہوں نے بجلی جیسی پھرتی دکھلائی؟ آخر مقتول دلت لڑکی کے خاندان والوں کو اس کی لاش کیوں نہیں سپرد کی گئی؟ کیا لاش کو جلا دینے کے پیچھے سارے ثبوت جلا دینے کا ارادہ تھا؟

ہاتھرس گینگ ریپ کیس کو دیکھ کر کوئی بھی کھلے ذہن کا انسان یہ بات بات صاف طور کہہ سکتا ہے کہ پولیس اور انتظامیہ نے روز اول سے ہی لاپروائی برتی تھی اور دلت کی بیٹی کو انصاف نہ دینے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ چاہے معاملہ ایف آئی آر درج کرنے کا ہو، یا پھر اسے وقت پر اسپتال پہنچانے کا ہو یا پھر کیس میں الجھن پیدا کرنے کا ہو، اسے انصاف سے دور رکھنے کے لیے سب کچھ کیا گیا۔

اس دردناک کیس کی شروعات ۱۴ ستمبر کے روز ہوئی، جب ہاتھرس کی ایک دلت لڑکی کو بھول گرہی گاؤں کے ایک کھیت میں اعلیٰ ذاتوں کے لڑکوں نے مبینہ طور پر عصمت دری کر دی۔ باور یہ کیا جا رہا ہے کہ دلت لڑکی اور اس کی ماں گھاس کاٹنے کے لیے کھیت میں گئی تھیں۔ مذکورہ کھیت اعلیٰ ذات والوں کی ملکیت ہے۔ لڑکی گھاس کاٹنے کے لیے اپنی ماں سے کچھ دور چلی گئی۔ کچھ دیر بعد دلت لڑکی کی ماں کو اپنی بیٹی کی چیخ پکار سنائی دی۔ جب وہ دوڑ کر وہاں گئی تو پایا کہ ان کی بیٹی خون میں لت پت تھی اور اس کی زبان بھی کاٹ لی گئی تھی۔

بعد میں اس معاملہ کو مقامی پولیس تھانہ میں لے جایا گیا۔ دلت لڑکی نے بھی پولیس تھانہ پہنچ کر شکایت درج کرائی۔ بعد میں دلت لڑکی کو مقامی اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے بتلایا کہ یہ معاملہ سنگین ہے۔ اس کے بعد دلت لڑکی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جے این میڈکل کالج لے جایا گیا۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ دلت لڑکی کو علی گڑھ اسپتال میں شام کے وقت داخل کیا گیا جبکہ اس کے اوپر حملہ صبح کے وقت ہوا تھا۔ خیال رہے کہ جائے واردات، ہاتھرس سے علی گڑھ کی دوری صرف دو گھنٹوں کی ہے پھر بھی اتنی تاخیر کی گئی۔ شاید دلت لڑکی کو وقت پر اسپتال پہنچا دیا جاتا تو اس کی جان بچ سکتی تھی۔ انہیں سوالوں کے بارے میں اُناو کی طالبہ اشارہ کر رہی تھی کہ اس کا علاج ٹھیک سے نہیں ہوا۔ پھر علی گڑھ اسپتال میں داخل دلت لڑکی کی حالت خراب ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ ۱۹ ستمبر کے روز اس نے اپنا بیان درج کرایا اور دو حملہ آوروں کا نام لیا، جن میں کوئی سندیپ بھی شامل ہے۔ اس بیان میں دلت لڑکی نے چھیڑ چھاڑ کی بھی بات کہی تھی۔ اس بیان

رہنا رویندرن، پی ایچ ڈی | چنٹو کماری، پروفیسر سیاسیات | صحافی مینا کوتوال

کی بنیاد پر پولیس نے دفعہ ۳۰۷ اور ۳۵۴ جو کہ جان سے مارنے کی کوشش اور چھیڑ چھاڑ سے متعلق ہے، کے تحت حملہ آوروں کے اوپر کیس درج کیا اور سندیپ کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ۲۱ اور ۲۲ اکتوبر کو متاثرہ دلت لڑکی نے مجسٹریٹ کی سامنے سندیپ کے علاوہ ۳ اور حملہ آوروں لوکُش، روی

> عصمت دری کے بعد لڑکی کو مار کر اس کی لاش درخت پر اس لیے لٹکائی جاتی ہے تا کہ سارے دلت سماج کو یہ سبق دیا جا سکے کہ ان کی زندگی اعلیٰ ذاتوں کی خدمت کے لیے ہے۔ اس لیے عصمت دری کا معاملہ برہمنی نظام کا حصہ ہے اور اعلیٰ ذات کے لوگ حیوانیت انجام دے کر اپنی طاقت اور اپنی بالادستی کو دوسروں پر تھوپنا چاہتے ہیں۔

اور راموکا نام لیا۔ دلت لڑکی نے ان کے خلاف جنسی تشدد کا بھی الزام لگایا۔ غور طلب ہے کہ یہ متاثرہ لڑکی کا آخری بیان تھا۔ بعد میں پولیس نے گینگ ریپ کے ساتھ جان سے مارنے کا مقدمہ درج کیا مگر معاملہ کو پیچ میں الجھانے اور حملہ آوروں کو بچانے کی کوشش پولیس اور انتظامیہ کی طرف سے ہونی شروع ہوئی۔ مثال کے طور پر ہاتھرس کے ایس پی نے یہ بیان دیا کہ جنسی تشدد کے کوئی ثبوت موجود نہیں ہیں وہیں دوسری طرف علی گڑھ کے جین این اسپتال کے ڈاکٹروں کی رپورٹ نے متاثرہ کے اوپر جسمانی حملے کے نشان ہونے کی بات قبول کی۔ مگر کیا اس کے ساتھ زبردستی عصمت دری کی گئی، اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ صرف فارنسک ٹیسٹ سے ہی سامنے آسکتے ہیں۔ اس دوران تین دیگر ملزمین کو گرفتار کیا گیا۔ ۲۸ تاریخ کو دلت لڑکی کی حالت بہت خراب ہونے لگی۔ پھر اسے دہلی کے صفدر جنگ اسپتال لے جایا گیا۔ اگلے روز یعنی ۲۹ ستمبر کو دلت لڑکی کا انتقال ہو گیا (انڈیا ٹوڈے، ۵ اکتوبر)۔

صحافی مینا کوتوال ہاتھرس معاملے کو بڑی قریب سے دیکھ رہی ہیں اور اس کے اوپر جم کر لکھ اور بول بھی رہی ہیں۔ انہوں نے ہفت روزہ دعوت سے بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت دن سے چندر شیکھر راون کی قیادت والی ’بھیم آرمی‘ کے رابطہ میں رہی تھی۔ مینا کوتوال، جن کا تعلق راجستھان کے ایک دلت سماج سے ہے، کہتی ہیں کہ اگر ہاتھرس گینگ ریپ میں انصاف پانا ہے اور اس طرح کے آنے والے حملوں کو روکنا ہے تو لوگوں کو بڑی تعداد میں سامنے آنا ہوگا اور مل کر احتجاج کرنا ہوگا۔ انہوں نے مزید کہا کہ سارے امبیڈکر نظریہ کے حامل تنظیموں کو ایک ساتھ آنا ہوگا۔ انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ اعلیٰ ذات کے وہ لوگ جو امبیڈکر کے نظریہ کو مانتے ہیں، ان کو بھی اس اتحاد میں شامل ہونا چاہیے۔

متاثرہ دلت لڑکی کی موت کے بعد اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے مینا کوتوال کہتی ہیں کہ ”ان (حملہ آوروں) کے ساتھ صرف چار اعلیٰ ذات کے لوگوں نے نہیں بلکہ کئی اعلیٰ ذات کے لوگوں اور حکام نے عصمت دری کی ہے۔ سسٹم نے گینگ ریپ کیا تھا۔ نچلی ذات میں جنم لینے کی قیمت چکانی پڑی“۔ (’دی وائر‘، ہندی، یکم اکتوبر)۔ سسٹم پر کم ہوتے ہوئے اعتماد کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ نظام اعلیٰ ذات کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کے دلوں میں دلتوں کے تیئں ہمدردی نہیں ہے تبھی تو مینا کوتوال کہتی ہیں کہ اب دلت خواتین کو برہمنی مرد بالادستی کے خلاف متحد ہو جانا چاہیے۔ وہ ایک کام جو پھولن دیوی نے کر دکھلایا تھا وہ کام ہر خاتون کو کرنا چاہیے اسے اب سسٹم سے کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ انہوں (پھولن دیوی) نے آخر میں تنگ آکر فیصلہ کیا تھا کہ برہمنی اور ذات پات پر مبنی مرد بالادستی کے حملوں کا واجب جواب دینا چاہیے۔

چنٹو کماری بہار میں واقع بکرم گنج (روہتاس) کے اے ایس کالج میں سیاسیات کی پروفیسر ہیں۔ وہ بھی دلت سماج سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کی پی ایچ ڈی بھوجپور (بہار) کے محکوم طبقات کے کلچر سے وابستہ ہے۔ چنٹوں کماری بھی ہاتھرس کی عصمت دری کو جاگیر دارانہ برہمنی نظام سے جوڑ کر دیکھتی ہیں۔ انہوں نے یہ صاف طور سے کہا کہ یہ عصمت دری کوئی جنسی خواہشات کو پورا کرنے کا معاملہ نہیں ہے جہاں کچھ مردوں نے عورتوں کو دیکھا اور ان کے ساتھ زور زبردستی کر لی ”یہ معاملہ صرف ہاتھرس کا ہی نہیں ہے، بلکہ ملک کے مختلف حصوں میں دلت خواتین پر حملے ہو رہے ہیں۔ ان سب کے پیچھے جو بڑی وجہ ہے وہ ذات پات پر مبنی نظام ہے۔ یہ سب کچھ ایک جاگیردارانہ برہمنی سسٹم کی پیداوار ہے۔ دلت خواتین پر حملے اس لیے کیے جاتے ہیں تا کہ ان کو یہ بتلا دیا جائے کہ اگر انہوں نے ذات پات پر مبنی سماج کے خلاف جانے کی جرأت کی اور اپنے حقوق کے لیے ان کی مخالفت کی تو ان کے ساتھ ہر طرح کے ظلم روا رکھے جائیں گے۔ عصمت ریزی کے ذریعہ اعلیٰ ذات کے لوگ دلتوں کو بار بار یہ یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی حدود میں رہیں اور اعلیٰ ذاتوں کے ماتحت بنے رہیں تبھی تو عصمت دری کے بعد لڑکی کا باقاعدہ ویڈیو بنایا جاتا ہے اور اس کو پھیلایا جاتا ہے۔ عصمت دری کے بعد لڑکی کو مار کر اس کی لاش درخت پر اس لیے لٹکائی جاتی ہے تا کہ سارے دلت سماج کو یہ سبق دیا جا سکے کہ ان کی زندگی اعلیٰ ذاتوں کی خدمت کے لیے ہے۔ اس لیے عصمت دری کا معاملہ برہمنی نظام کا حصہ ہے اور اعلیٰ ذات کے لوگ حیوانیت انجام دے کر اپنی طاقت اور اپنی بالادستی کو دوسروں پر تھوپنا چاہتے ہیں“۔ چنٹو کماری نے یہ بھی کہا کہ پولیس، انتظامیہ، حکومت اور ریاست ان سارے حملوں میں ملوث ہیں۔ ”اگر ایسا نہیں ہوتا تو یہ معاملے پیش نہیں آتے اور اگر آتے بھی تو حملہ آوروں کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔ ہاتھرس کیس میں بھی یہ بات پھر سے ثابت ہوئی ہے کہ دلت خواتین کے اوپر ہو رہے حملوں میں سسٹم کی خاموش تائید شامل ہے“۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ اس کا حل کیا ہے تو ان کا جواب تھا کہ اس طرح کی وارداتیں ایک دن میں ختم نہیں ہو سکتیں بلکہ اس کے لیے ایک لمبی لڑائی لڑنے کی ضرورت ہے۔

رہنا رویندرن نے جے این یو سے بین الاقوامی امور میں پی ایچ ڈی کی ہے اور ابھی دلی یونیورسٹی میں پڑھا رہی ہیں۔ ان کا تعلق بھی کیرالا کے ایک دلت خاندان سے ہے۔ وہ بھی ہاتھرس کیس کو دیکھ کر کافی مایوس ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ برہمنی نظام کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ”یہ معاملہ صرف خواتین کے اوپر حملے تک محدود نہیں رکھا جانا چاہیے بلکہ اس کے تار کاسٹ ’سسٹم‘ سے جڑے ہیں۔ اس لیے جب تک ریپ کے معاملوں کو ذات پات پر مبنی نظام سے جوڑ کر نہیں دیکھا جائے گا، تب تک اس طرح کی وارداتیں ختم نہیں ہوں گی“۔ بابا صاحب امبیڈکر نے بھی ذات پات پر مبنی سماج کو خواتین کے اوپر ہو رہے تشدد سے جوڑ کر دیکھا تھا۔ ان کا ایک اہم مضمون ”دی رائز اینڈ فال آف دی ہندو وومن“ ان کے کلیکٹیڈ والیوم ۱۹ میں شامل کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں امبیڈکر لکھتے ہیں کہ برہمنی نظام میں خواتین کو تعلیم سے دور رکھا گیا ہے۔ یہی نہیں عورتوں کو ہندوؤں کی مذہبی کتاب وید پڑھنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ امبیڈکر نے منو دھرم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس میں خواتین کو برابری نہیں دی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ منو کے زمانے سے پہلے ہندو عورتوں کی حالت اتنی خراب نہیں تھی، مگر منو نے جو بدھ کے بعد پیدا ہوئے، عورتوں کے بارے میں بہت سارے غیر مساوی قانون بنا ڈالے اور ان کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ مثال کے طور پر منوسمرتی کا حوالہ دیتے ہوئے امبیڈکر نے کہا کہ اس میں عورتوں کے بارے میں یہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ مردوں پر ڈورے ڈالتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ عورتوں کو غلام کی طرح ملکیت سے بھی محروم کر دیا گیا اور منو نے عورتوں کی پٹائی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ مطلب یہ کہ منو دھرم، ذات پات پر مبنی سماج اور خواتین کی بدحالی آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔ وہ اقلیتی حقوق اور سماجی انصاف سے متعلق امور پر لکھتے ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

***

حجاب پر پابندی: مسلمانوں کے خلاف بھگوا طاقتوں کی بڑی سازش

لبرل لوگ مظلوم کو ہی قصوروار ٹھہرا کر شر پسندوں کا کام آسان کر رہے ہیں

ابھے کمار، نئی دلی

سرکاری تعلیمی اداروں میں باحجاب طالبات کی آمد پر پابندی کے خلاف معاملہ زیر سماعت ہے۔ کچھ روز پہلے کرناٹک ہائی کورٹ کی تین ارکان پر مشتمل بینچ نے اپنے عبوری حکم میں کہا ہے کہ حتمی فیصلہ آنے تک کالج کھول دیے جائیں، وہیں طالبات کو تعلیمی اداروں میں حجاب پہننے کی ضد نہیں کرنی چاہیے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو چیف جسٹس ریتو راج اَوستھی، کرشنا ایس دِکشیت اور زیب النساء قاضی کی بینچ نے بھی طالبات کو راحت دینے کے بجائے ان کو مایوس کیا ہے۔ بہت سارے لوگ کورٹ کے عبوری حکم کو باحجاب طالبات کے حقوق کی معطلی کے مترادف بتلا رہے ہیں۔ قومی دارالحکومت دلّی، سمیت ملک کے مختلف حصوں میں حجاب پر پابندی کے خلاف احتجاج منظم کیا جا رہا ہے۔ کچھ دنوں پہلے دلی میں واقع جواہر لال نہرو یونیورسٹی، (جے این یو) میں سماجی انصاف اور بائیں بازوں کی تنظیموں سے وابستہ طلبہ نے حجاب پابندی پر اپنی ناراضگی ظاہر کی اور اسے مسلمانوں کے خلاف بھگوا طاقتوں کی ایک نئی سازش بتلایا۔ جے این یو کے ان طلبہ کا کہنا ہے کہ حجاب پر پابندی کی آڑ میں بھگوا طاقتیں مسلم خواتین کو تعلیم سے دور رکھنا چاہتی ہے اور ساتھ ساتھ اس ایشو کو بھڑکا کر مسلمانوں کی شبیہ مسخ کرنا چاہتی ہیں۔ میڈیا کی مدد سے بھگوا طاقتوں نے مسلمانوں کو ملک کی ترقی میں رکاوٹ اور آئینی اصول مساوات، سیکولرازم اور حقوق نسواں کا دشمن کہہ کر بدنام کیا ہے، وہیں دوسری طرف ان کو توہم پرستی، دقیانوسی اور مذہبی شدت پسندی کے پیروکار کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایسا وہ دانستہ طور پر کرتے ہیں تاکہ مسلمان اپنی ترقی کے بارے میں نہ سوچ پائیں اور ان کی پوری توانائی خود کی زندگی بچانے اور خود کی صفائی دینے میں برباد ہو جائے۔ چاہے مسئلہ تین طلاق کا ہو یا پھر حجاب کا، بھگوا طاقتوں کا اصل مقصد سماج میں اصلاح کرنا کم اور مسلم اقلیت کو مین اسٹریم سے مزید الگ تھلگ کرنا ہے اور ان کے نوجوانوں کے اندر احساس پستی اور کمتری کے خیالات کو بھر دینا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں ان دنوں حجاب پر تنازعہ ہندوستان کی جنوبی ریاست کرناٹک میں کھڑا کیا گیا ہے، جہاں بھگوا طاقتیں بر سر اقتدار ہیں۔ یاد رہے کہ کچھ دنوں پہلے کرناٹک انتظامیہ نے باحجاب مسلم طالبات کو کلاس روم میں داخل ہونے سے روک دیا ہے، جس کے خلاف زبردست احتجاج ہو رہا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ملک کی کئی سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں نے مظاہرین کی حمایت کی ہے۔ مگر بھگوا سرکار نے اپنے فیصلہ کو واپس لینے کے بجائے اس معاملے پر انتہائی افسوسناک بیان دیا ہے کہ ایسے کپڑے جو مساوات، ملک کی سالمیت اور نظم وضبط کو تباہ کرتے ہیں انہیں کلاس روم میں پہننے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ایسی پابندی شہریوں کے مذہبی آزادی کے خلاف بھی نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے بھگوا حکومت نے کرناٹک ایجوکیشن ایکٹ ۱۹۸۳ کا بھی سہارا لیا ہے اور کہا ہے کہ کالج کے ذریعہ طے شدہ لباس کو پہننا طلبہ اور طالبات پر لازم ہے۔

حجاب پر اچانک سے پابندی لگانے کے پیچھے بھگوا طاقتوں کا مقصد یہ ہے کہ کسی طرح سے سماج کے اندر میں ہندو مسلمان کا کھیل کھیلا جائے تاکہ ان کو اس کا فائدہ انتخابات میں ملے۔ بھگوا طاقتوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ روٹی کی مار اس ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو جھیلنی پڑ رہی ہے۔ لوگ روزی روٹی اور صحت عامہ کی بات نہ کریں اور وہ دھرم کے نام پر ایک دوسرے سے لڑنے لگیں، ایسا ہی کچھ مقصد بی جے پی کا ہے اس لیے اس نے بڑی سوچی سمجھی سازش کے تحت اس ایشو کو الیکشن سے عین قبل اُٹھایا ہے۔ بہت سارے جہد کاروں اور اسکالرز کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حجاب پر پابندی کا موجودہ سیاق اُتر پردیش اور پنجاب سمیت ملک کی مختلف ریاستوں میں ہونے والے اہم اسمبلی انتخابات ہے۔ اپنے ماسٹر اسٹروک کو بی جے پی پھر کھیل رہی ہے اور ایک بار پھر مخالف لہر پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ حجاب پر پابندی سے بھگوا طاقتوں کو وقتی فائدہ یہ مل سکتا ہے کہ اس طرح کے تنازعات رائے عامہ کی سمت کو بنیادی سوال سے ہٹا کر مذہبی اور جذباتی مسائل کی طرف کر دیتے ہیں۔ بھگوا طاقتیں بھی یہی چاہتی ہیں کہ دن رات دھرم اور مذہب پر بات ہو اور لوگ خود کو اپنے مذہبی تشخص سے باہر نہ دیکھیں۔ ملک کی اقتصادی پالیسی کس سمت میں جا رہی ہے، لوگوں کو روزگار اور صحت عامہ کی سہولت کس حد تک مل پا رہی ہے، نوجوان کیسی تعلیم پا رہے ہیں، ان سارے سوالوں سے بھگوا سیاسی جماعت ہمیشہ سے بھاگتی رہی ہے۔ کورونا وبا کے دوران بھی جب ساری دنیا بیماری سے لڑ رہی تھی اور غریب اور مزدوروں کو مدد پہنچائی جا رہی تھی، تب بھی بر سر اقتدار بھگوا جماعتوں نے کورونا کا مذہب ڈھونڈ نکالا اور اس کے پھیلاؤ کے لیے تبلیغی جماعت اور مسلمان کو بلی کا بکرا بنایا۔ سرکار کی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے، مسلمانوں کو گالی دی گئی اور ان کا معاشی بائیکاٹ تک کیا گیا۔ بہت سارے مسلمانوں کو جیل تک بھیجا گیا۔ کچھ ایسا ہی گیم پلان اس بار حجاب کے تنازعہ میں بھی نظر آ رہا ہے۔

ایسی باتیں کہہ کر بھگوا حکومت عدالت اور پبلک کے سامنے خود کو قانون کے راستہ پر چلنے والی سرکار بتلانا چاہتی ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد مسلمانوں کے زخموں پر مزید نمک چھڑکنا، ان کو پسماندہ اور مذہبی شدت پسند قرار دینا ہے اور خود کو آئین کا محافظ اور مساوات اور خواتین کے حقوق کا چیمپین بتانا ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ حجاب پر پابندی لگانے کا یہ فیصلہ نہ صرف مسلم خواتین بلکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے بھی خطرناک ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ بھی بھگوا حکومت کر رہی ہے، ویسی نفرت انگیز اور مسلم مخالف پالیسی یوروپ اور دنیا کے دیگر حصوں کی دائیں بازو حکومتوں نے پہلے ہی اپنالی ہے اور اس طرح سے انہوں نے سماج کے اندر میں کشیدگی پیدا کی ہے۔ سرکار کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی زبان کانپتی ہے کہ کیسے کوئی پوشاک نظم وضبط کے لیے خطرہ ہو سکتی ہے؟ کیا سرکار نے کوئی تحقیق کی ہے جس کی بنیاد پر وہ کہہ سکتی ہے کہ حجاب پہننے والیاں جرائم پیشہ ہوتی ہیں اور بھگوا چولا پہننے والے نہ تو کسی مذہبی مقام کو مسمار کر سکتے ہیں، نہ کسی فسادات میں حصہ لے سکتے ہیں اور نہ ہی وہ بم دھماکہ میں شامل ہو سکتے ہیں؟

پہلے بھی دیکھا گیا کہ سماجی اصلاح اور حقوق نسواں کے بہانے بی جے پی نے مسلم سماج کی تذلیل کی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے شدت پسند پیروکاروں کو یہ بھی یقین دلاتی ہے کہ ان کی مسلم مخالف سیاست کی آگ کی لپٹیں اور تیز ہو رہی ہیں۔

دراصل حقوق نسواں کے نام پر اقلیتی سماج کے زخموں پر نمک چھڑکنا، بھگوا طاقتوں کا بنیادی ایجنڈا رہا ہے۔ انہوں نے مسلم پرسنل لاء کے اندر مسلم خواتین کی مبینہ "نابرابری اور استحصال" کو سیاسی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسی فرقہ وارانہ سیاست کے تحت بی جے پی نے جہاں خود کو مسلم خواتین کے حقوق کا سب سے بڑا 'خیر خواہ' کہا ہے، وہیں ملت کے اندر اثر و رسوخ رکھنے والی مسلم قیادت اور کانگریس جیسی حریف سیاسی جماعت کو مسلم خواتین کے حقوق کے ساتھ کھلواڑ کرنے کا الزام لگایا ہے۔

جس طرح بی جے پی مسلم خواتین کی 'مظلوم' شبیہ کو ایک سیاسی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کر رہی ہے وہ ہمیں استعماری طاقتوں کی یاد دلاتی ہے۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں استعماری یا پھر خارجی طاقتوں نے اپنی مداخلت اور اپنے تسلط کو جائز قرار دینے کے لیے محکوم

> بھگوا طاقتوں کا طویل مدتی منصوبہ یہ ہے کہ حجاب کی آڑ میں مسلم طالبات کو ناخواندگی کے کنوئیں میں دھکیل دیا جائے اور مظلوم اقلیت پر ہی شدت پسند اور خواتین مخالف ہونے کے بیانیہ کو مزید طاقت دی جائے۔ مگر سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ کچھ لبرل اور حقوق نسواں کے پاسبان اس پورے کھیل کو یا تو سمجھ نہیں رہے ہیں یا دانستہ طور پر سمجھنا نہیں چاہتے اور کئی بار مظلوم کو ہی قصوروار ٹھہرا کر بھگوا طاقتوں کا کام آسان بنا رہے ہیں۔

قوموں کی عورتوں کی بُدحالی کا بہانا بنایا تھا اور خود کو ان کا محافظ اور نجات دہندہ قرار دیا تھا۔ ایسا ہی کچھ ہمیں انگریزوں کے دور حکومت میں اپنے ملک میں بھی دیکھنے کو ملا تھا جب ہندوستانی خواتین کی مظلومیت کو ایک اہم سبب بتا کر ہندوستانیوں کو غیر مہذب کہا گیا اور یہ بیانیہ فرنگیوں کی حکومت سازی اور اس کے استحکام کا ایک قطب بنی۔ سماج کے برے رسم و رواج کی اصلاح کے نام پر فرنگیوں نے دیس کا مال لوٹا۔ مگر اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ میں ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے وقت یہاں کی خواتین کے تشویشناک حالات کا انکار کر رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خواتین سماج میں نابرابری کا شکار تھیں، ان میں تعلیم کی شرح بہت کم تھی۔ بچپن کی شادی اور ستی پرتھا جیسی غیر انسانی رسومات ان کو جکڑی ہوئی تھیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے سماج کی اصلاح کی ذمہ داری ہم ایسی طاقتوں کے ہاتھوں میں دے دیں، جن کا صل مقصد لوگوں میں پھوٹ ڈالنا اور راج کرنا ہے۔ مختصراً کوئی بھی اصلاح کسی سماج پر اوپر سے نہیں تھوپی جا سکتی ہے۔

کچھ ایسا ہی حال کی دہائیوں میں افغانستان میں دیکھنے کو ملا، جب مظلوم افغان خواتین کے نام پر امریکا نے وہاں مداخلت کی اور اس ملک کو تباہی کے دہانے پر لا چھوڑا۔ اسی استعماری سازش کے تحت افغان خواتین کی یہ شبیہ بنائی گئی کہ وہ اپنے ہی معاشرہ میں اپنے ہی مردوں کے ہاتھوں ظلم و بربریت کا شکار ہو رہی ہیں اور ان کی نجات مغرب، بالخصوص امریکا سے ہی ممکن ہوگی۔ یہاں پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ افغانستان میں خواتین کے حالات اس دور میں بہت خراب تھے۔ مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خارجی طاقتوں کا اصل مقصد وہاں کی خواتین کو ان کی بدحالی اور غربت سے نکالنا نہیں بلکہ اس ملک سے اپنے اسٹریٹجک مفاد کو پورا کرنا تھا۔

تین طلاق کے کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی مقصد بھگوا طاقتوں کا بھی نظر آیا۔ ظاہری طور پر وہ مسلم خواتین کی رہنمائی کا تماشہ کر رہی ہیں، اس کا اصل مقصد اپنے شدت پسند ووٹ بینک کو خوش کرنا ہے۔ مگر اس کا جو بڑا مقصد ہے وہ یہ ہے کہ مسلم پرسنل لاء کو بدنام کیا جائے اور اس کی جگہ یکساں سول کوڈ لایا جائے لوک سبھا میں گزشتہ ۲۷ دسمبر ۲۰۱۸ کو پاس ہونے والے مسلم خواتین کی شادی کے حقوق سے متعلق تحفظ بل، پر نظر ڈالیں تو اس میں خامیاں ہی خامیاں نظر آ رہی ہیں، اس بل کا مقصد مسلم خواتین کو 'ایمپاور' کرنا کم اور ان کے شوہروں کو جیلوں میں ٹھونسنا زیادہ نظر آ رہا ہے۔ اگر شوہر جیل میں جائیں تو متاثرہ خواتین اور ان کے خاندان کی کفالت کی ذمہ داری پر یہ بل خاموش ہے۔ یہ بھی دیکھیے کہ مسلم خواتین کے لیے ان کے خودساختہ 'بھیّا' مودی جی نے سول معاملے کو فوجداری بنا دیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تین طلاق دینے والے کو تین سال کی سزا بھی مقرر کر دی ہے۔ طلاق کے لیے اتنی سخت سزا کسی بھی دیگر پرسنل لاء میں نہیں ہے۔ مزے کی بات یہ بھی ہے کہ اس پورے معاملے میں متاثرہ خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے وہ ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کر رہے ہیں۔ بی جے پی طلاق کے مسئلہ پر بے حد فعال و سرگرم تو رہتی ہے مگر اپنی توانائی کا ایک دہائی حصہ بھی مسلم خواتین کو صحت، تعلیم، روزگار اور سیاسی نمائندگی کے مواقع فراہم کرنے کے لیے صرف نہیں کیا ہے۔

بھگوا طاقتوں کی مسلم مخالف پالیسی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ وہ بری طرح سے اسلاموفوبیا کا شکار ہیں۔ اسے اسلاموفوبیانہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ بھگوا طاقتوں کو صرف مسلم خواتین ہی مظلوم اور پسماندہ دکھائی دیتی ہیں، جبکہ اسے ذات پات، نابرابری، بچپن کی شادی، جہیز، اور بیواؤں کی بدحالی جیسے مسائل ہندو سماج میں دکھائی نہیں دیتے۔ کوئی یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ مسلم سماج کے اندر اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، مگر کسی اصلاحی کام کو فرقہ پرستی کے رنگ میں رنگنا بھی تو درست نہیں ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کو ایسا لگتا ہے کہ اسلام اور مسلم سماج پسماندگی اور دقیانوسیت کا دوسرا نام ہے۔ کئی بار یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مسلم سماج میں اصلاح نہیں ہوئی ہے، جبکہ دوسرا سماج وقت کے ساتھ بدل رہا ہے۔ مسلم سماج جمود کا شکار ہے، یہی بات اسلاموفوبیا کا خلاصہ ہے۔ وہ قدیم زمانہ میں رکا ہوا ہے اور جدیدیت سے میلوں پیچھے ہیں۔ یہ بھی اسلاموفوبیا پروپگنڈا کا حصہ ہے کہ مسلم سماج سائنس اور عقل کی جگہ توہم پرستی اور جہالت میں غرق ہے۔ یہ اسی بائیسزی کا حصہ ہے۔

بھگوا طاقتوں کا طویل مدتی منصوبہ یہ ہے کہ حجاب کی آڑ میں مسلم طالبات کو ناخواندگی کے کنوئیں میں دھکیل دیا جائے اور مظلوم اقلیت پر ہی شدت پسند اور خواتین مخالف ہونے کے بیانیہ کو مزید طاقت دی جائے۔ مگر سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ کچھ لبرل اور حقوق نسواں کے پاسبان اس پورے کھیل کو یا تو سمجھ نہیں رہے ہیں یا دانستہ طور پر سمجھنا نہیں چاہتے اور کئی بار مظلوم کو ہی قصوروار ٹھہرا کر بھگوا طاقتوں کا کام آسان بنا رہے ہیں۔ حجاب پر پابندی لگانے کے پیچھے ایک بڑی سازش یہ ہے کہ پہلے سے ہی تعلیمی طور پر پسماندہ مسلم خواتین کو مزید تعلیمی کے میدان میں پیچھے دھکیلا جائے۔ اصول اور عمل میں بھگوا طاقتیں یہ کبھی بھی نہیں چاہتیں کہ پسماندہ اور اقلیت طبقات کے افراد تعلیم یافتہ ہوں۔ ان کو ڈر ہے کہ اگر محکوم اور مظلوم پڑھ لکھ جائیں گے تو وہ ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کریں گے اور اس طرح غیر برابری اور استحصال پر مبنی ذات پات کا یہ نظام ٹوٹ جائے گا اور اس کے مالک بنے ہوئے چند مٹھی بھر لوگوں کی ظلم و زیادتیاں بند ہو جائیں گی۔ اعلیٰ طبقات کے اسی نظام نے صدیوں سے دلت، آدی واسی، پسماندہ اور خواتین کو تعلیم سے دور رکھا۔ جیوتی باپھُلے اور بابا صاحب امبیڈکر ان باتوں کو سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کی قربانیوں کی بدولت آزاد ملک کی درسگاہوں کو سب کے لیے کھول دیا گیا۔ اس وقت بھی اور آج بھی بھگوا طاقتیں یہ نہیں چاہتیں کہ محکوم طبقات تعلیم حاصل کریں۔ حجاب پر پابندی لگا کر بھگوا حکومت مسلم طالبات کو اَن پڑھ رکھنا چاہتی ہیں، کیونکہ ان بہادر خواتین نے شہریت ترمیمی قانون کے دوران یہ دکھلا دیا تھا کہ عورتیں تحریک کی قیادت کرنا بھی جانتی ہیں۔ یاد رکھیے کہ پرائیویٹ یونیورسٹیوں اور کالجوں نے پہلے ہی اپنے کیمپس کے باہر موٹی فیس کی اونچی دیواریں کھڑی کر کے محکوم طبقات کو تعلیم سے محروم کر دیا ہے اور جو مسلم خواتین سرکاری تعلیمی اداروں میں کسی طرح پڑھ لیتی تھیں، اب یہاں بھی ان کو باہر کرنے کا ماسٹر پلان تیار کر لیا گیا ہے۔

جہاں ایک طرف بھگوا طاقتیں حجاب پر پابندی لگا کر اپنی مسلم مخالف سیاست کو آگے بڑھانا چاہتی ہیں، وہیں کچھ لبرل اسکالر اور اکٹویسٹ بھی حجاب کے خلاف بیان دے کر بھگوا سیاسی جماعت کے بیانیہ کو تقویت فراہم کر رہے ہیں۔ ان لبرل لوگوں کی پریشانی یہ ہے کہ وہ ریاست اور سماج کو زمین پر دیکھنے کے بجائے کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ بھارت میں ایک سیکولر آئین ہے اور یہاں کے شہریوں کو مذہب کی آزادی اور اقلیتی حقوق دیے گئے ہیں۔ مگر اچھا قانون بن جانا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ سماج میں سب کو انصاف مل جائے گا۔ اگر قانون کو نافذ کرنے والے لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہو اور محکوم طبقات کو اقتدار سے باہر رکھا جائے تو سماج میں ظلم کا سلسلہ نہیں رک پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے سماج، معیشت اور سیاست میں اکثریتی سماج کا ہی تسلط قائم ہے۔ جب بھگوا طاقتیں اقتدار پر قابض ہو جاتی ہیں تو یہ تسلط صاف طور سے ہر جگہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ ملک کا سب سے بڑا لیڈر کورونا وبا کی ساری احتیاط کو طاق پر رکھ کر ایودھیا میں مندر کے سنگ بنیاد کے موقع پر پوجا پر بیٹھ جاتا ہے، مگر ملک کے ٹی وی چینل اسے سیکولرازم کی پامالی نہیں بلکہ ملک کو مضبوط کرنے والا قدم بتاتے ہیں۔ سرکاری اداروں میں پروگرام کی شروعات پوجا پاٹھ اور دیپ جلا کر جاتی ہے، ان سب کاموں کو جائز کہا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں ان موقعوں پر سنگھ پرچارک سرکاری مہمان ہوتے ہیں اور وہ اپنی تقریر میں بھارت کی تمام برائی کے لیے مغلوں اور مسلمانوں کو کوستے ہیں، مگر اس پر کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ وہیں دوسری طرف باحجاب خواتین کو مجرم سمجھ کر درس گاہوں میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے۔ یہ پابندی سرکار کی بیٹی بچاؤ اور بیٹی پڑھاؤ کی حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے۔ اس بڑی سازش سے لڑنا ہی ہوگا۔ ظلم کے خلاف مزاحمت ہی تو زندہ ہونے کی علامت ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

***

حجاب سے بیر ہے یا مسلمانوں سے؟

سرکار کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی زبان کانپتی ہے کہ کیسے کوئی پوشاک نظم وضبط کے لیے خطرہ ہوسکتی ہے؟

ابھے کمار

اتر پردیش اور پنجاب سمیت ملک کے مختلف ریاستوں میں ہونے والے اہم اسمبلی انتخابات سے عین قبل، بھگوا طاقتوں نے ایک بار پھر مسلم مخالف کارڈ کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ اس بار ہنگامہ حجاب کے مسئلہ کو اُچھال کر کیا جارہا ہے۔ کوشش بھی اس بار یہی ہے کہ حجاب کے ذریعہ لوگوں کو مذہبی بنیاد پر گول بند کیا جائے۔ مگر طویل مدتی منصوبہ یہ ہے کہ حجاب کے ایشوز کی آڑ میں مسلم طالبات کو ناخواندگی کے کنوئیں میں ڈھکیل دیا جائے اور مظلوم اقلیت پر ہی شدت پسند اور خواتین مخالف ہونے کے بیانیہ کو مزید طاقت دی جائے۔ مگر سب سے افسوس کی بات یہ ہے کہ کچھ لبرل اور حقوق نسواں کے پاسبان اس پورے کھیل کو یا تو سمجھ نہیں رہے ہیں یا دانستہ طور پر سمجھنا نہیں چاہتے ہیں اور کئی بار مظلوم کو ہی قصوروار ٹھہرا کر بھگوا طاقتوں کا کام آسان بنا رہے ہیں۔

حجاب کے مسئلے پر تازہ معاملہ ہندوستان کی جنوبی ریاست کرناٹک میں سامنے آیا ہے، جہاں بھگوا طاقتیں برسر اقتدار ہیں۔ کچھ دنوں پہلے کرناٹک انتظامیہ نے حجاب پوش مسلم طالبات کو کلاس روم میں داخل ہونے سے روک دیا ہے، جس کے خلاف زبردست احتجاج ہو رہا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ ملک کی کئی سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں نے مظاہرین کی حمایت کی ہے۔ مگر بھگوا سرکار اپنے فیصلہ کو واپس لینے کے بجائے اس معاملے پر انتہائی افسوسناک بیان دیا ہے کہ ایسے کپڑے مساوات، ملک کی سالمیت اور نظم وضبط کو تباہ کرتے ہیں اسے کلاس روم میں پہننے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ایسی پابندی شہریوں کے مذہبی آزادی کے خلاف بھی نہیں ہے۔ اتنا ہی نہیں اپنی بات کو درست ثابت کرنے کے لیے بھگوا حکومت نے کرناٹک ایجوکیشن ایکٹ ۱۹۸۳ کا بھی سہارا لیا ہے اور کہا ہے کہ کالج کے ذریعہ طے شدہ لباس کو پہننا طلبہ اور طالبات پر لازم ہے۔

ایسی باتیں کہہ کر بھگوا حکومت عدالت اور پبلک کے سامنے خود کو قانون کے راستہ پر چلنے والی سرکار بتانا چاہتی ہے۔ مگر اس کی اصل منشا مسلمانوں کے زخم پر مزید نمک چھڑکنا، ان کو پسماندہ اور مذہبی شدت پسند قرار دینا ہے اور خود کو آئین کا محافظ اور مساوات اور خواتین کے حقوق کا چمپئن بتانا ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ حجاب پر پابندی لگانے کا یہ فیصلہ نہ صرف مسلم خواتین بلکہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے خطرناک ہے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ بھی بھگوا حکومت کر رہی ہے، ویسی نفرت انگیز اور مسلم مخالف پالیسی یوروپ اور دنیا کے دیگر حصوں کی بائیں بازو کی حکومتوں نے پہلے ہی اپنالیا ہے اور اس طرح سے انہوں نے سماج کے اندر کشیدگی پیدا کی ہے۔ سرکار کو یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کی زبان کانپتی ہے کہ کیسے کوئی پوشاک نظم وضبط کے لیے خطرہ ہو سکتا ہے؟ کیا سرکار نے کوئی تحقیق کی ہے جس کی بنیاد پر وہ کہہ سکتی ہے کہ حجاب پہنے والا جرائم پیشہ ہوتا ہے اور بھگوا چولا پہننے والا نہ تو کسی مذہبی مقامات کو مسمار کر سکتا ہے، نہ ہی وہ کسی فسادات میں حصہ لے سکتا ہے اور نہ وہ بم دھماکہ میں شامل ہو سکتا ہے!
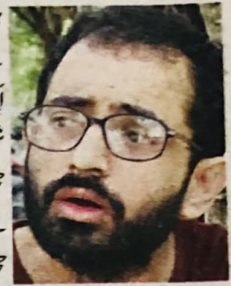
حجاب پر پابندی سے بھگوا طاقتوں کو وقتی فائدہ یہ مل سکتا ہے کہ اس طرح کے تنازعات رائے عامہ کے سمت کو بنیادی سوال سے ہٹا کر مذہبی اور جذباتی مسائل کی طرف کر دیتے ہیں۔ بھگوا طاقتیں بھی یہی چاہتی ہیں کہ دن رات دھرم اور مذہب پر بات ہو اور لوگ خود کو مذہبی تشخص سے باہر نہ دیکھیں۔ ملک کی اقتصادی پالیسی کس سمت میں جا رہی ہے، لوگوں کو روزگار اور صحت عامہ کی سہولت کس حد تک مل پا رہی ہے، نوجوان کیسی تعلیم لے پا رہے ہیں، ان سارے سوالوں سے بھگوا سیاسی جماعت ہمیشہ سے بھاگتی رہی ہے۔ کورونا وبا کے دوران بھی جب ساری دنیا بیماری سے لڑ رہی تھی اور غریب اور مزدوروں کو مدد پہنچائی جا رہی تھی، تب بھی برسر اقتدار بھگوا جماعتوں نے کورونا کا مذہب ڈھونڈ نکالا اور اس کے پھیلاؤ کے لیے تبلیغی جماعت اور مسلمان کو بلی کا بکرہ بنایا۔ سرکار کی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے، مسلمانوں کو گالی دی گئی اور ان کا معاشی بائیکاٹ تک کیا گیا۔ بہت سارے مسلمانوں کو جیل تک بھیجا گیا۔ کچھ ایسا ہی گیم پلان اس بار حجاب کے تنازعہ میں بھی دکھ رہا ہے۔

„

حجاب پر پابندی لگا کر حکومت مسلم طالبات کو اَن پڑھ رکھنا چاہتی ہے، کیونکہ ان بہادر خواتین نے شہریت ترمیمی قانون کے دوران یہ دکھلا دیا تھا کہ خواتین تحریک کی قیادت کرنا بھی جانتی ہیں۔ یاد رکھیے پرائیویٹ یونیورسٹی اور کالج نے پہلے ہی اپنے کیمپس کے باہر موٹی فیس کی اونچی دیواریں کھڑی کر کے محکوم طبقات کو تعلیم سے محروم کر دیا ہے اور جو مسلم خواتین سرکاری تعلیمی اداروں میں کسی طرح پڑھ لیتی تھیں، اب ان کو باہر کرنے کا ماسٹر پلان تیار کر لیا گیا ہے۔

حجاب پر پابندی لگانے کے پیچھے ایک بڑی سازش یہ ہے کہ پہلے سے ہی تعلیمی طور پر پسماندہ مسلم خواتین کو اعلیٰ تعلیمی میدان سے پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اصول اور عمل میں بھگوا طاقتیں یہ کبھی بھی نہیں چاہتیں کہ پسماندہ اور اقلیتی طبقات کے افراد تعلیم یافتہ ہوں۔ ان کو ڈر ہے کہ اگر محکوم اور مظلوم پڑھ لکھ جائیں گے تو وہ ظلم اور زیادتی کے خلاف آواز بلند کریں گے اور اس طرح غیر برابری اور استحصال پر مبنی ذات برادری کا یہ نظام ٹوٹ جائے گا اور اس کے مالک بنے ہوئے چند مٹھی بھر لوگوں کا ظلم اور زیادتی ختم ہو جائے گی۔ اعلیٰ طبقات کے اسی نظام نے صدیوں سے دلت، آدی واسی، پسماندہ اور خواتین کو تعلیم سے دور رکھا۔ مہاتما جیوتی با پھلے اور بابا صاحب امبیڈکر ان باتوں کو سمجھتے تھے اور انہوں نے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ ان کی قربانیوں کی بدولت آزاد ملک کے درس گاہ کو سب ذات اور دھرم کے لیے کھول دیا گیا۔ اس وقت بھی اور آج بھی بھگوا طاقتیں یہ نہیں چاہتی ہیں کہ محکوم طبقات تعلیم حاصل کریں۔ حجاب پر پابندی لگا کر بھگوا حکومت مسلم طالبات کو اَن پڑھ رکھنا چاہتی ہے، کیونکہ ان بہادر خواتین نے شہریت ترمیمی قانون کے دوران یہ دکھلا دیا تھا کہ خواتین تحریک کی قیادت کرنا بھی جانتی ہیں۔ یاد رکھیے پرائیویٹ یونیورسٹی اور کالج نے پہلے ہی اپنے کیمپس کے باہر موٹی فیس کی اونچی دیواریں کھڑی کر کے محکوم طبقات کو تعلیم سے محروم کر دیا ہے اور جو مسلم خواتین سرکاری تعلیمی اداروں میں کسی طرح پڑھ لیتی تھیں، اب ان کو باہر کرنے کا ماسٹر پلان تیار کر لیا گیا ہے۔

جہاں ایک طرف بھگوا طاقتیں حجاب پر پابندی لگا کر اپنی مسلم مخالف سیاست کو آگے بڑھا رہی ہیں، وہیں کچھ لبرل اسکالر اور اکٹویسٹ بھی حجاب کے خلاف بیان دے کر بھگوا سیاسی جماعت کے بیانیہ کو تقویت فراہم کر رہے ہیں۔ ان لبرل جماعت کے ساتھ دقت یہ ہے کہ وہ ریاست اور سماج کو زمین پر دیکھنے کے بجائے کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ یہ سچ بات ہے کہ بھارت میں ایک سیکولر آئین ہے اور یہاں کے شہریوں کو مذہبی آزادی اور اقلیتی حقوق دیے گئے ہیں۔ مگر اچھا قانون بن جانا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ سماج میں سب کو انصاف مل جائے گا۔ اگر قانون کو نافذ کرنے والے لوگوں کے دلوں میں کھوٹ ہو اور محکوم طبقات کو اقتدار سے باہر رکھا جائے تو سماج میں ظلم کا سلسلہ نہیں روک پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے سماج، معیشت اور سیاست میں اکثریت سماج کا ہی تسلط قائم ہے۔ جب بھگوا طاقتیں اقتدار میں قابض ہو جاتی ہیں تو یہ تسلط صاف طور سے ہر جگہ دکھنے لگتا ہے۔ ملک کا سب سے بڑا لیڈر کورونا وبا کے سارے احتیاط کو طاق پر رکھ کر ایودھیا میں مندر کے سنگ بنیاد کے موقع پر پوجا پر بیٹھ جاتا ہے، مگر ملک کے ٹی وی چینل اسے سیکولرازم کی پامالی نہیں بلکہ ملک کو مضبوط کرنے والا قدم بتاتے ہیں۔ سرکاری اداروں میں پروگرام کی شروعات پوجا پاٹھ اور دیپ جلا کر ہوتا ہے، ان سب کاموں کو جائز کہا جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں ان موقع پر سنگھ پرچارک سرکاری مہمان ہوتے ہیں اور وہ اپنی تقریر میں بھارت کی تمام برائی کے لیے مغلوں اور مسلمانوں کو کوستے ہیں، مگر اس پر کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ وہیں دوسری طرف با حجاب خواتین کو مجرم سمجھ کر درسگاہوں میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے۔ یہ پابندی سرکار کی بیٹی بچاؤ اور بیٹی پڑھاؤ کی سچائی کو بھی بیان کرتی ہے۔ اس بڑی سازش سے لڑنا ہی ہوگا۔ ظلم کے خلاف مزاحمت تو ہی تو، زندہ ہونے کی علامت ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

اختیار کرنے پر بھی پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ اخبار نے مزید لکھا ہے مودی حکومت نے تین طلاق کی پریکٹس کو ختم کرنے کے لیے باضابطہ قانون بنا دیا ہے۔ کرناٹک میں مسلم بچیوں کو حجاب پہن کر اسکولوں اور کالجوں میں داخل نہیں ہونے دیا جا رہا ہے۔ سڑک کے کنارے لگے ان کے اسٹالز کو ہندو تنظیموں کے کارکنان بزور قوت بند کرا رہے ہیں۔ کھلی جگہوں پر نماز جمعہ پڑھنے سے بھی کئی ریاستوں میں مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ اخبار نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ بھارت میں مسلمانوں کے خلاف حکومت کی کارروائی سے ملک میں فی الوقت تو بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے اور اگر صورتحال یہی رہی تو اسے بدامنی میں تبدیل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھارت میں بلڈوزر کی سیاست پر اپنا سخت رد عمل ظاہر کیا ہے۔ اس کے خصوصی نمائندہ آکار پٹیل نے ایک بیان میں کہا کہ ”حکام چن چن کر اور بے رحمی سے ان مسلمانوں کے خلاف کریک ڈاؤن کر رہے ہیں جو بولنے کی جرات کرتے ہیں۔ انہیں اس وقت امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ طاقت کا بے تحاشا استعمال، من مانی گرفتاریاں اور تعزیری طور پر گھروں کے انہدام کے ساتھ مظاہرین کے خلاف کریک ڈاؤن انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کی مکمل خلاف ورزی ہے اور بھارت کے انسانی حقوق سے متعلق وعدوں کی بھی صریح خلاف ورزی ہے“۔

کیمپس فرنٹ منگلور یونیورسٹی کے طلبہ اختلافی آوازوں کو دبانے کے لیے حکومت کی جانب سے ’بلڈوزر سیاست‘ کے خلاف ’پلاکارڈ مظاہرہ‘ کرتے ہوئے

”ماضی میں محض احتجاج کی پاداش میں لوگوں کے گھر مسمار نہیں کیے جاتے تھے لیکن اب، ہندو قوم پرست رہنماؤں کے اشارے پر احتجاج و مظاہروں میں پیش پیش رہنے والوں کے مکانات کو منہدم کیا جا رہا ہے اور کھلے عام اور کیمرے کے سامنے انہیں تشدد کا نشانہ بنانے کو روٹین کا حصہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے جو بہت خطرناک نتائج کا حامل ہوگا۔“ (آکار پٹیل)

ایمنسٹی نے حراست میں لیے گئے مظاہرین کی فوری اور غیر مشروط رہائی کا مطالبہ کیا ہے۔ پٹیل کا کہنا ہے کہ ”یہ گرفتاریاں اور انہدامی کارروائیاں مسلمانوں کو نشانہ بنانے والی ریاستوں کے اقدامات میں تشویش ناک اضافے کا حصہ ہیں“۔

مسٹر پٹیل نے واضح لفظوں میں اپنے بیان میں کہا ہے کہ ۲۰۱۴ء میں نریندر مودی کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے بھارت میں مسلمانوں کے خلاف تشدد آمیز ظالمانہ کارروائیوں میں اضافہ ہوا ہے اور ہندو قوم پرست، مسلمانوں کو ان کے مذہب کی بنا پر معاندانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا رہے ہیں اور ان کے خلاف حالیہ انتقامی کارروائیوں نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ ماضی میں محض احتجاج کی پاداش میں لوگوں کے گھر مسمار نہیں کیے جاتے تھے لیکن اب، ہندو قوم پرست رہنماؤں کے اشارے پر احتجاج و مظاہروں میں پیش پیش رہنے والوں کے مکانات کو منہدم کیا جا رہا ہے اور کھلے عام اور کیمرے کے سامنے انہیں تشدد کا نشانہ بنانے کو روٹین کا حصہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے جو بہت خطرناک نتائج کا حامل ہوگا۔

مسلم دنیا کو امن دشمنی کا طعنہ، ہندی میڈیا کی نظر میں او آئی سی ممالک اور مسلمان ”انتہا پسند“

نوپور شرما کے دفاع کی کوشش۔ ہندی اخبارات کے اداریوں کا ایک جائزہ

ابھے کمار، نئی دلی

بی جے پی کی معطل شدہ قومی ترجمان نوپور شرما کے پیغمبر اسلام کے خلاف توہین آمیز ریمارکس کا حوالہ دیتے ہوئے ہندی پریس کے کئی اداریوں اور مراسلوں نے پوری کوشش کے ساتھ ایک بیانیہ تیار کرنے میں اپنی توانائی صرف کر دی ہے تاکہ اس پورے واقعہ کا الزام مسلم دنیا پر ڈالا جا سکے۔ تنظیم اسلامی تعاون (OIC) سے لے کر مسلم ممالک اور مسلمان ”انتہا پسند“ عناصر تک، ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس بلی کے بکروں کی کمی نہیں ہے بلکہ وہی اصل مجرمین ہیں۔

راشٹریہ سہارا نے اپنے اداریے (۷ جون) میں نوپور شرما اور نوین جندال کے دفاع میں ساری حدیں پار کر دیں۔ لکھا کہ ”پارٹی نے تادیبی کارروائی ضرور کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے (نوپور شرما اور نوین جندال نے) واقعی کچھ غلط کیا ہے، اگر انہوں نے واقعی کچھ غلط کیا ہے تو انہیں سزا ملنی چاہیے جیسا کہ مسلمانوں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے۔ تاہم، ملک میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد کا خیال ہے کہ نوپور شرما نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جو پیغمبر اسلام کی توہین کے مترادف ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انتہا پسند اور بی جے پی مخالف قوتیں جان بوجھ کر نوپور شرما کے بیان کو پیغمبر اسلام کی توہین کے طور پر پیش کر رہی ہیں۔

مختصراً، روزنامہ یہ باور کرواتا ہے کہ نوپور شرما کے خلاف الزامات ”بی جے پی مخالف قوتوں کے ذریعہ اپنے سیاسی مفادات کے پیش نظر لگائے گئے ہیں۔

ہندوتوا بریگیڈ کی طرف سے کیے گئے اشتعال انگیز سیاسی بیانات پر تنقید کرنے کے بجائے، ہندی اخبارات نے یہ دلیل دی کہ شرما اور جندال کو ان کے ریمارکس کی وجہ سے پارٹی سے معطل کرنے سے معاملہ ختم ہو گیا ہے۔ اسی طرح ہندی پریس نے ایک ناقابل دفاع موقف اختیار کیا کہ مسلم ممالک کے پاس مذہبی عدم رواداری کے معاملے پر ہندوستانی حکومت پر تنقید کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ بی جے پی اپنے دو رہنماؤں کو معطل کر چکی ہے جنہوں نے پیغمبر اسلام کے خلاف متنازعہ ریمارکس کیے تھے۔ لہٰذا اسلامی ممالک کے لیے ہندوستان کو اخلاقی سبق دینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ ممالک جنونی مذہبی رہنماؤں کو پناہ دیتے ہیں جو دہشت گردوں کے ساتھ ساتھ دوسرے عقائد کے نظام کا مذاق اڑاتے ہیں“ ہندی کے معروف روزناموں میں سے ایک روزنامہ دینک جاگرن نے اپنے اداریے (۷ جون) میں یہ بات لکھی۔

اسلامی تعاون تنظیم (OIC) سے لے کر مسلم ممالک اور مسلمان ”انتہا پسند“ عناصر تک، ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس بلی کے بکروں کی کمی نہیں ہے بلکہ یہی لوگ ہیں جو امن وامان کی راہ میں حائل ہیں۔

پنجاب کیسری (۸ جون) میں فیروز بخت احمد نے نوپور شرما کے بارے میں کچھ متضاد باتیں لکھیں۔ ایک جگہ انہوں نے نوپور شرما کے بیان کو ’احمقانہ‘ قرار دیا جب کہ دوسری جگہ ایک مسلم پینلسٹ پر الزام لگا کر اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی جس نے ان کے مطابق ٹی وی بحث کے دوران اس کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی: درحقیقت نوپور شرما کے اپنا کنٹرول کھونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ٹی وی ڈیبیٹ میں حصہ لے رہی تھیں، ایک مسلمان پینلسٹ نے شیولنگ کو فاؤنٹین کہہ کر ان کی توہین کی تھی۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مصنف کی تحریر معروف ہندوتوا بیانیہ کو برقرار رکھتی ہے۔ اگر ہندوتوا طاقتوں نے ایک دن گیانواپی مسجد کے اندر موجود چشمے کو شیولنگ کہنے کا فیصلہ کیا تو اسے ایک آفاقی سچائی کے طور پر قبول کیا جانا چاہیے۔ یہ کہ معاملہ زیر سماعت ہے اور عدالت نے چشمہ بنام شیولنگ تنازعہ کو طے کرنے کے لیے کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا ہے، لہٰذا اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔

ہندوتوا طاقتیں زبردستی اپنا نقطہ نظر دوسروں پر مسلط کریں گی، اگر کوئی ان سے سوال کرنے کی جرات کرے گا تو اس پر ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا الزام لگایا جائے گا۔

روزنامہ جاگرن (۸ جون) میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے سریرام چولیا نے اسلامی ممالک پر دوہرے معیار کا الزام عائد کرتے ہوئے لکھا ”اس میں کوئی شک نہیں کہ ۵۷ ممالک پر مشتمل او آئی سی نے گھٹیا پن کی تمام حدیں پار کر دی ہیں۔ اس نے الزام لگایا ہے کہ ہندوستان میں اقلیتوں پر ظلم کیا جا رہا ہے“ اس نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ’اسلام کے خلاف نفرت کا ماحول‘ پیدا کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ اسی OIC نے اپنے انتہا پسند رکن پاکستان کے ذریعے اسلامو فوبیا (اسلام کے خلاف نفرت) سے نمٹنے کا عالمی دن منانے کی قرارداد منظور کی تھی۔ بھارت اور فرانس سمیت کئی ممالک نے اس قرارداد کو مسترد کرتے ہوئے عالمی برادری کو یاد دلایا کہ اگر ہم اس معاملے کو غیر جانب داری سے دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بہت سی مذہبی برادریوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ اسی لیے اسلام کو واحد مظلوم مذہب تسلیم کرنا نہ صرف ناپسندیدہ ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہادی دہشت گرد، اسلامو فوبیا کی آڑ میں اپنی پر تشدد کارروائیوں کا جواز پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک نوپور شرما کی نفرت انگیز تقریر کا تعلق ہے، مصنف نے ان کے تضحیک آمیز ریمارکس سے متعلق ہر چیز کا احاطہ کرنے کے لیے کچھ الفاظ استعمال کیے ہیں اور انہیں عجلت میں ”کچھ قابل اعتراض“ قرار دیا ہے۔ مصنف اس بارے میں کچھ نہیں کہتا کہ فرقہ پرست طاقتوں کو اس طرح کے بیانات سے جو لطف اندوزی حاصل ہوتی ہے یہاں تک کہ پولیس، انتظامیہ اور حکومت کھلے عام مسلمانوں اور ان کے مذہبی مقامات کو نشانہ بناتی ہے اور فرقہ وارانہ کشیدگی میں اپنے سیاسی مفادات کو تحفظ فراہم کرتی ہے۔

۱۱ جولائی کے اداریے میں، روزنامہ جاگرن جمعہ کے تشدد کو جامع انداز میں دیکھنے میں ناکام رہا۔ پولیس کی طرف سے نہتے مظاہرین پر طاقت کے استعمال اور اسمبلی اور احتجاج کے بنیادی حق کو مجرمانہ سرگرمی بنانے کی کوشش کی مذمت کرنے کے بجائے روزنامہ نے بی جے پی حکومت کے خلاف سازشی تھیوری کو اچھالا۔ ”چونکہ نوپور شرما کے بیان پر ملک گیر ہنگامہ آرائی کی اطلاع اسلامی ممالک کے غصے کے بعد سامنے آئی تھی، اس سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ یہ کسی کے زیر اہتمام اور منصوبہ بند تھا۔“

❊❊❊

ہندو یا مسلم کے احساسات کو مت چھیڑیئے

جہاں ترقی پر ہونی چاہیے وہاں ارباب اقتدار پیار کرنے والوں کا مذہب اور ذات پوچھ رہے ہیں

ابھے کمار

آبادی اور سیاسی طور پر ملک کی سب سے بڑی ریاست اُتر پردیش میں ان دنوں الیکشن کا ماحول ہے۔ کچھ حلقوں میں تو رائے دہندگان نے ووٹ بھی ڈال دیے ہیں، جبکہ دیگر علاقوں میں پولنگ کا عمل جاری ہے۔ ایسی خبریں آرہی ہیں کہ برسر اقتدار بھگوا طاقتوں کو کسانوں، مزدوروں اور نوجوانوں کی زبردست ناراضگی جھیلنی پڑ رہی ہے۔ لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے، بھگوا طاقتیں اپنی پوری توانائی دھرم اور مذہب کا کارڈ کھیلنے میں صرف کررہی ہیں۔ شاید سابق وزیر اعلیٰ لالو پرساد یادو نے بجا فرمایا ہے کہ ملک میں جس طرح سے دھرم اور مذہب کے نام پر سیاست ہورہی ہے وہ اسے خانہ جنگی کی طرف ڈھکیل رہی ہے۔

جیسے جیسے انتخابات کا مقابلہ سخت ہو رہا ہے، ویسے ویسے بھگوا طاقتوں نے لو جہاد اور تبدیلیٔ مذہب کا تنازع چھیڑنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ ہی روز قبل، اپنے انتخابی منشور میں اُتر پردیش کی بی جے پی سرکار نے لوگوں کے مذہبی احساسات کو ہوا دی ہے۔ بھگوا جماعت نے وعدہ کیا کہ اگر وہ دوبارہ اقتدار میں واپس آتی ہے تو وہ 'لو جہاد' کے کیس میں سزا کو بڑھا کر ۱۰ سال کر دے گی۔ علاوہ ازیں، مجرموں سے ایک لاکھ روپیہ کا جرمانہ بھی وصول کیا جائے گا۔ اتنا ہی نہیں زبردستی دھرم بدلنے والوں کو ۱۰ سال کی سزا اور ۲۵ ہزار روپیہ کا جرمانہ ہوسکتا ہے۔ یاد رہے کہ اتر پردیش میں بہت سارے مسلمان، بالخصوص عالم دین، کو تبدیلیٔ مذہب کے جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر جیل بھیج دیا گیا ہے اور اس طرح مسلمانوں کے اندر زبردست خوف و ہراس کا ماحول پیدا کیا گیا ہے۔

بھارت کا سیکولر آئین شہریوں کو یہ آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے دھرم کی پُرامن طریقہ سے اشاعت اور تبلیغ کریں، مگر ہر بار بھگوا نظریہ کے حامل سیاست دانوں نے اقلیتوں کو دھرم بدلنے کے نام پر پریشان کیا ہے۔ وہیں دوسری طرف بھگوا طاقتیں ملک کے مختلف حصوں میں آدی واسی، دلت اور دیگر کمزور طبقات کو ہر طریقۂ کار کو اپنا کر ہندو بنا رہی ہیں۔ میڈیا کی مدد سے دن رات یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مسلمان اور عیسائی ہندوؤں کو لالچ دے کر اور فریب دے کر مذہب بدل رہے ہیں اور اس طرح تیزی سے بھارت کو اندر سے کمزور کررہے ہیں۔ تبدیلیٔ مذہب کا عمل ملک کی سالمیت اور ڈیموگرافی کو بدل رہا ہے۔

دھرم بدلنے کا یہ پروپیگنڈا لو جہاد کے تنازع سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یہاں بھی بھگوا طاقتیں بغیر کسی دلیل اور تحقیق کے یہ بات کہتی ہیں کہ ہندو لڑکی کو ہمیشہ سے مسلمان لڑکا محبت کے دام میں پھنساتا ہے اور اسے دھوکے سے مسلمان بنا دیتا ہے!

اتر پردیش میں ایسا فرقہ وارانہ ڈسکورس پھر شروع ہوگیا ہے۔ سوچیے ذرا، ملک کس سمت میں جا رہا ہے؟ آزادی کے ۷۰ سال گزر جانے کے بعد بھی ہمارے لیڈران پیار و محبت جیسی خوبصورت چیز کو ایک جرم بتلا کر پیش کر رہے ہیں۔ کتنی دُکھ کی بات ہے کہ جہاں سماج کے اندر بات ترقی پر ہونی چاہیے وہاں ارباب اقتدار پیار کرنے والوں کا دھرم اور ذات پوچھ رہے ہیں۔ کون کیا لباس پہنے گا، کون کیا چیز کھائے گا، کون کس سے پیار کرے گا، ان ساری باتوں سے پورا ملک پریشان ہے! اگر ان باتوں سے سیاست کا مطلب ہے تو سمجھ لیجیے کہ سیاست لبرل نہیں رہی، بلکہ وہ آمریت اور فسطائیت کی طرف بڑھ رہی ہے۔

لو جہاد کا جتنا معاملہ ہندو مسلمان کا ہے، اس سے کہیں زیادہ یہ معاملہ خواتین کو غلام بنائے رکھنے کا ہے۔ بھگوا طاقتوں کو اس بات کا ڈر ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر عورتیں آزاد ہوجائیں گی اور وہ اپنی مرضی سے پیار و محبت اور اپنے ہم سفر کا انتخاب کریں گی، تو اس سے ذات پات کا نظام کمزور ہوجائے گا۔ اس لیے لو جہاد کے معاملہ کو حقوق نسواں اور ان کی آزادی کی لڑائی سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے۔ یہ صرف ہندو اور مسلمان کے بیچ کا تنازع نہیں ہے۔

بھارت کا آئین لوگوں کو شخصی اور مذہبی آزادی کو بنیادی حقوق کا حصہ مانتا ہے اور ریاست کو ان کی پامالی کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ مگر برسر اقتدار بھگوا جماعت ہر روز کسی نہ کسی بہانے ایسے قانون لا رہی ہے، جو بھارت کے لبرل تشخص کو چوٹ پہنچا رہا ہے۔

در اصل بھگوا جماعت نہ صرف اقلیتوں کے خلاف سیاست کرتی ہے، بلکہ وہ دلت، آدی واسی، پسماندہ اور خواتین کو کمتر سمجھتی ہے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے تو صاف طور پر کہا ہے کہ ذات پات کا تعلق خواتین کی غلامی سے بھی ہے۔ بقول امبیڈکر، جب اعلیٰ ذات کے لوگوں نے شادی بیاہ آپس میں ہی کرنا شروع کر دیا اور دوسری ذات اور سماجی گروپ سے اپنی دوری بنا لی، تو بعد کے دنوں میں دیگر ذات اور برادریوں نے بھی ان کی نقل کی۔ دھیرے دھیرے یہ رواج ابھرنے لگا کہ ایک ذات برادری دوسری ذات برادری سے شادی کرنے سے گریز کریں اور اسی طرح ذات پات کا غیر مساوی نظام پیدا ہوگیا۔ ذات پات کو توڑنے کے لیے، بابا صاحب امبیڈکر نے باہمی کھان پان کو بڑھانے اور مختلف ذاتوں کے مابین شادی بیاہ کی بات پر زور دیا ہے۔ اپنے دیگر مضامین میں ڈاکٹر امبیڈکر نے کہا کہ بودھ مذہب کے انقلاب کے بعد مذہبی کتابوں کے اندر عورتوں اور نچلی ذاتوں کے خلاف قانون بنا دیا گیا اور ان کی آزادی پر روک لگا دی گئی۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ مظلوم کے خلاف ہو رہے ظلم و زیادتی کو جائز ٹھہرایا جائے۔ ایشور کے نام پر مٹھی بھر لوگوں نے اپنے مفاد کو پورا کیا اور غیر مساوی نظام کو پیدا کیا۔ اس نظام نے اعلیٰ ذات کے لوگوں کی بالادستی کو قائم کیا اور دلت، پچھڑے طبقات کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی غلام بنایا۔ اتنا ہی نہیں ذات پات کے نظام کو مزید مضبوط کرنے کے لیے خواتین کی آزادی کو بھی ختم کر دیا گیا اور ان پر طرح طرح کی پابندی لگا دی گئی۔ ان کی حالت غلام سے بھی بدتر ہوگئی اور وہ صرف اپنے سماج کے مردوں کی خادمہ بن کر رہ گئیں۔ تبھی تو ڈاکٹر امبیڈکر نے مظلوموں کے زمرے میں دلت، پچھڑا کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی رکھا ہے اور یہ کہا ہے کہ خواتین کی آزادی پر روک اور ذات پات کا گہرا رشتہ ہے۔ سوشلسٹ نظریہ ساز ڈاکٹر رام منوہر لوہیا بھی پسماندہ طبقات کے زمرے میں عورتوں کو رکھتے تھے اور ان کو اس بات سے بڑی تکلیف ہوتی تھی کہ عورتوں کی آزادی پاکھنڈ کی آڑ میں چھین لی گئی ہے۔

سچ پوچھیے تو لو جہاد کا جتنا معاملہ ہندو مسلمان کا ہے، اس سے کہیں زیادہ یہ معاملہ خواتین کو غلام بنائے رکھنے کا ہے۔ بھگوا طاقتوں کو اس بات کا ڈر ہمیشہ لگا رہتا ہے کہ اگر عورتیں آزاد ہو جائیں گی اور وہ اپنی مرضی سے پیار و محبت اور اپنے ہم سفر کا انتخاب کریں گی، تو اس سے ذات پات کا نظام کمزور ہو جائے گا۔ اس لیے لو جہاد کے معاملہ کو حقوق نسواں اور ان کی آزادی کی لڑائی سے جوڑ کر دیکھنا چاہیے۔ یہ صرف ہندو اور مسلمان کے بیچ کا تنازع نہیں ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ سماج کے اندر موجود ان غیر مساوی اور خواتین مخالف جذبات کو دور کرنے کے بجائے، آئینی منصب پر بیٹھے لوگ ووٹ حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے مذہبی احساسات کو چھیڑ رہے ہیں اور عورتوں کی غلامی کو بنائے رکھنے کے لیے ہر روز نئے نئے قانون لا رہے ہیں۔ یہ سب ملک کے لیے بہت ہی خطرناک ہے۔ ہم سب کو اس غیر مساوی سوچ اور سیاست کے خلاف لڑنا ہوگا۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

ہندو راشٹر ایک دھوکہ ہے

جان بوجھ کر کچھ لوگ ہندوؤں کے لیے عہد زریں کا خواب بیچتے ہیں، تاکہ سماج کے اصل مسائل کی طرف لوگوں کا دھیان نہ جا پائے

ابھے کمار

ہندو راشٹر کے قیام کے لیے ایک بار پھر بھگوا طاقتیں سر گرم ہو گئی ہیں۔ میڈیا میں زیر بحث خبروں کے مطابق بھگوا عناصر نے بعض مقامات پر دھرم سنسد کا انعقاد کیا ہے، جس میں انہوں نے نہ صرف ہندو راشٹر بنانے کی بات دوہرائی ہے، بلکہ مسلمان اور دیگر محروم طبقات کے خلاف ہتھیار بند جنگ کرنے کی بھی دھمکی دی ہے۔ افسوس کہ بات یہ ہے کہ نفرت کے ان سوداگروں کے خلاف تادیبی کاروائی کرنے کے بجائے، سرکار، عدالت اور انسانی حقوق کے ادارے ابھی تک خاموش ہیں۔ فرقہ پرست سے لے کر سیکولر پارٹیوں کے زیر حکومت ریاستوں میں دھرم سنسد منعقد کیا گیا ہے، کیا آئین اور اقلیت مخالف یہ جلسہ انتظامیہ کی پست پناہی کے بغیر ممکن ہو سکتا تھا؟ یہ موقع بے محل نہیں ہے جب ہم ہندو راشٹر کے تصور کے بارے میں باتیں کریں۔ سچ پوچھیے تو ہندو راشٹر کے قیام سے ملک کا ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کا بڑا نقصان ہوگا۔ اقلیت اور دیگر محروم طبقات کی بات چھوڑیے کیونکہ ان کو تو پہلے سے ہی ہندو راشٹر کی سوچ میں دوئم درجہ کا شہری بنا دیا گیا ہے۔

گزشتہ سو سالوں میں بھگوا جماعت نے خوب پروپیگنڈہ کیا ہے کہ ہندو راشٹر کے بن جانے سے بھارت کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ مگر اس زہریلی سوچ نے اب تک ملک کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ اسی فرقہ وارانہ سوچ نے مہاتما گاندھی کی جان لی۔ کہیں نہ کہیں ہندو مسلم تنازعات کے لیے یہی نفرت انگیز سوچ سب سے زیادہ ذمہ دار ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ بھگوا طاقتوں کے پروپیگنڈے کو خارج کرنے کے لیے سابقہ سیکولر جماعتوں نے سچے من سے کوشش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج نفرت کا کھیل ہر طرف کھیلا جا رہا ہے۔ میڈیا سے لے کر ملک کی عام سوچ میں فرقہ پرستی کا زہر گھول دیا گیا ہے۔ چوک چوراہے، ٹرین اور بس میں فرقہ پرست یہ سوال کر رہے ہیں کہ اگر پاکستان میں اسلامک نیشن کا قیام ہو سکتا ہے تو بھارت ہندو راشٹر کیوں نہیں بن سکتا۔ ہماری نئی نسل فرقہ وارانہ سوچ سے برباد ہو رہی ہے۔ اس لیے آج اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ بھگوا طاقتوں کی فریب کاری کے خلاف ایک مہم چلائی جائے اور ان کے نفرت انگیز نظریات کا مدلل جواب دیا جائے۔

ہندو راشٹر کی حمایت میں یہ افواہ پھیلائی جاتی ہے کہ بھارت دیش بنیادی طور پر ہندو قوم پر مبنی ہے۔ ہندو ثقافت، ہندو قوم کو ملک سے جوڑا جاتا ہے ہیں اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہندو لفظ کا مطلب ہندو دھرم کے ماننے والوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ جو کوئی بھی بھارت کو اپنا مادر وطن مانتا ہے اور جن کے مذہبی مقامات اسی ملک میں واقع ہیں وہ سب ہندو ہیں۔ اس طرح بھگوا عناصر اوپری من سے یہ کہتے ہیں کہ اگر مسلم اور عیسائی بھی بھارت کو اپنا مادر وطن دل سے قبول کر لیں اور بھارت کو اپنی 'پیترک بھومی' تسلیم کر لیں تو وہ بھی ہندو قوم کا حصہ بن جائیں گے۔ اس طرح سے بھگوا عناصر کی یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ ہندو راشٹر کے تصور کو مذہب کی قید سے آزاد کر کے پیش کیا جائے اور اس میں غیر ہندوؤں کو شامل کیا جائے۔ تبھی تو چالاک بھگوا لیڈران

> ”
>
> بھگوا طاقتیں کبھی اس بات کا جواب نہیں دیتیں کہ بدھ مت، جو بھارت میں پھیل گیا تھا، خود ہی مٹ گیا یا پھر مٹا دیا گیا۔؟ وہیں دوسری طرف بھارت میں اسلام اور عیسائی مذاہب کے پیروکار ہزاروں سالوں سے زندگی گزر بسر کر رہے ہیں تو پھر اسلام اور عیسائیت کو کیسے بیرونی مذہب کہا سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندو راشٹر بھارت کے جمہوری اور سیکولر آئین کے سراسر خلاف ہے۔ مگر افسوس کہ بھارت کے ارباب اقتدار وقتی فائدے کے لیے نفرت کے ان سوداگروں کو تحفظ دے کر ملک کو کمزور کر رہے ہیں۔

بعض اوقات یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ ان کی تنظیم کسی مسلم یا عیسائی کے خلاف نہیں ہے۔ جو کوئی بھی ہندو کلچر میں یقین رکھتا ہے وہ سب بھارتیہ ہیں۔ کئی بار بھگوا لیڈران یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ پوجا پاٹھ، رسم و رواج، عقیدہ، دھرم، مذہب کی آزادی میں ان کا یقین ہے اور وہ سچے سیکولر ہیں جبکہ ان کے حریف سیکولر جماعت اور کمیونسٹ مسلمانوں کی منہ بھرائی کرتے ہیں اور ہندو مفاد کے خلاف کام کرتے ہیں۔ اس طرح ان کو بھارتی کلچر اور ملک کا مخالف بتا کر پیش کیا جاتا ہے۔

حالانکہ بھگوا عناصر کے دکھانے اور کھانے کے دانت الگ الگ ہوتے ہیں۔ وہ یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ وہ دھرم کی قید سے آزاد ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سچا سیکولر ایک ہندو ہی ہو سکتا ہے اور بھارت ہمیشہ سے ہی سیکولر رہا ہے کیونکہ یہاں کا قومی کلچر ہندو رہا ہے۔ دراصل وہ بات ضرور مذہب کی قید سے آزاد ہندو کلچر کی کرتے ہیں، مگر ان کے تصور کے ہندو کلچر کی ساری علامات اور تاریخ ایک مخصوص دھرم پر مبنی ہوتی ہے اور اس میں اقلیت مسلمان، عیسائی اور دیگر محروم طبقات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی ہے۔ اس ہندو کلچر میں عیسائی اور اسلام مذہب کو باہر کا مذہب بتلایا گیا ہے اور ان سے جڑی ہوئی تمام تاریخ اور علامتوں کو ترک کر دیا گیا ہے۔

جہاں وہ عیسائیت اور اسلام کو غیر ہندو کلچر سے باہر کر دیتے ہیں وہیں بدھ، جین اور سکھ مت کو ہندو دھرم کے اندر ہڑپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر تاریخ یہ کہتی ہے کہ جین، بدھ، سکھ مذہب نے ذات پات اور دیگر غیر مساوی سماجی نظام کے خلاف بغاوت کی تھی، جس کو دبانے کے لیے تشدد کو بھی جائز قرار دیا گیا۔ بھگوا طاقتیں کبھی اس بات کا جواب نہیں دیتیں کہ بدھ مت، جو بھارت میں پھیل گیا تھا، خود ہی مٹ گیا یا پھر مٹا دیا گیا؟ وہیں دوسری طرف بھارت میں اسلام اور عیسائی مذاہب کے پیروکار ہزاروں سالوں سے زندگی گزر بسر کر رہے ہیں تو پھر اسلام اور عیسائیت کو کیسے بیرونی مذہب کہا سکتا ہے؟ کیا یہ بات تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے کہ بھارت میں آریائی اور ویدک دور سے پہلے ہڑپہ تہذیب پائی جاتی تھی؟ قدیم بھارت میں دراوڑ تہذیب بھی تو تھی، جو کہ آریائی اور وید کلچر سے الگ تھی۔ آخر اسے بھگوا عناصر اپنے ہندو راشٹر میں کتنا جگہ دیتے ہیں؟

دراصل ہندو راشٹر کا تصور ایک خطرناک ارادہ ہے۔ اس خطرناک ارادہ کی حامی پوری ہندو قوم نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو مٹھی بھر اعلیٰ ذات کے ہندو اس تخریب کاری کے پیچھے کھڑے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر ہندوؤں کے لیے عہد زریں کا خواب بیچتے ہیں، تاکہ سماج کے اصل مسائل کی طرف لوگوں کا دھیان نہ جا پائے۔ بھگوا عناصر دانستہ طور پر قدیم بھارت کو ملک کے لیے سب سے سنہرا دور بتلاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ قدیم بھارت میں ذات پات اور عورتوں کے خلاف غیر مساوی نظام قائم تھا۔ قدیم بھارت کی تاریخ اچھوتوں اور بدھ مت کے ماننے والوں کے خلاف ظلم و زیادتی کی داستان بھی ہے۔ بھگوا طاقتیں بھارت کی ساری برائی کے لیے مسلمان، عیسائی، انگریز اور کمیونسٹ کو قصوروار مانتے ہیں اور اعلیٰ ذات کی بالادستی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندو راشٹر بھارت کے جمہوری اور سیکولر آئین کے سراسر خلاف ہے۔ مگر افسوس کہ بھارت کے ارباب اقتدار وقتی فائدہ کے لیے نفرت کے ان سوداگروں کو تحفظ دے کر ملک کو کمزور کر رہے ہیں۔ آج سے ۸۰ سال پہلے بابا صاحب امبیڈکر نے ہندو راشٹر کے خطرہ سے متنبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر ہندو راشٹر کا تصور ایک حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے تو بلا شبہ یہ ملک کے لیے سب سے بڑی آفت اور تباہی ہوگی۔ کسی بھی قیمت پر ہندو راج کو قائم ہونے سے ہمیں روکنا ہوگا۔■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

یہ مذہبی نہیں ایک سیاسی نظریہ ہے

دھرم کے ڈرامہ بازوں نے نہ صرف اپنے دھرم کو نقصان پہنچایا ہے بلکہ ان کی وجہ سے ملک پوری دنیا میں بدنام بھی ہو گیا ہے

ابھے کمار

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے دن ایودھیا میں نہ صرف بابری مسجد مسمار کی گئی، بلکہ سیکولر ازم کا ستون بھی منہدم کیا گیا۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ جس دن بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر کا یوم وفات تھا، اُس دن ہی بابری مسجد کو ملبہ میں تبدیل کر کے ملک کو فرقہ وارانہ آگ میں ڈھکیل دیا گیا۔ بابا صاجب کا پیغام آزادی، مساوات اور اخوت کا رہا ہے اور انہوں نے پوری زندگی سیکولر اور مثبت سوچ کو آگے بڑھایا، مگر ان کے نظریہ کے برعکس، فرقہ پرستوں نے دھرم اور مذہب کے نام پر لوگوں کو تقسیم کیا اور ایک تاریخی مذہبی مقام کو منہدم کر دیا۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بابری مسجد کے خلاف سازش تیار کی جارہی تھی، تب سیکولر طاقتوں نے اس کا مقابلہ کرنے اور فرقہ پرستوں کو ہرانے کی بجائے یا تو خاموشی اختیار کر لی یا پھر پردہ کے پیچھے ان کے ساتھ سمجھوتہ کیا۔ ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہندو کارڈ کھیل کر وہ اقتدار میں بنے رہیں گے، مگر یہ ان کی خام خیالی تھی۔ آج بھی سیکولر پارٹیاں نرم ہندوتوا کا کارڈ کھیلنے سے باز نہیں آرہی ہیں۔

دراصل ہندوتوا نظریہ کا تعلق دھرم اور عقیدہ سے زیادہ سیاست سے ہوتا ہے۔ خود بھگوا لیڈروں نے بھی یہ قبول کیا ہے کہ رام مندر تحریک کا رشتہ سیاست سے تھا۔ یہ بات کون نہیں جانتا ہے کہ ۱۹۸۴ کے عام انتخابات میں بی جے پی کو صرف دو سیٹیں حاصل ہو پائی تھی اور وہ ہندوستانی سیاست میں ایک چھوٹی طاقت ہی سمجھی جاتی تھی۔ مگر بی جے پی کے لیڈر ایل کے اڈوانی اور وی ایچ پی کے لیڈر اشوک سنگھل کی قیادت میں جیسے جیسے رام مندر کا ایشو بڑا ہونے لگا، ویسے ویسے بی جے پی کی سیٹیں بھی بڑھنے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بی جے پی نے کئی ریاستوں میں حکومت سازی کر لی اور ۱۹۹۰ کی آخری دہائی میں اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں مرکز میں سرکار بھی بنا لی۔ تبھی تو یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب کبھی بھی ڈرامہ باز لوگ بھگوان کا جاپ شروع کر دیں، تو سمجھ لیجیے کہ کچھ بڑی سازش رچی جارہی ہے۔

آج کل اتر پردیش میں بھی بہت سارے ڈرامہ باز بھگوان کا نام لے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، اتر پردیش کی بھگوا حکومت کے ایک بڑے وزیر نے حال کے دنوں میں سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ ڈال کر یہ مطالبہ کیا ہے کہ ایودھیا کے کی طرح ہی متھرا میں بھگوان کرشن کا مندر بنایا جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ متھرا میں بھگوان کرشن کے بہت سارے مندر ہیں اور نیا مندر بنانے سے وزیر موصوف کو کوئی روک بھی نہیں رہا ہے۔ مگر ان کا مطالبہ یہ ہے کہ متھرا میں جو مغلیہ عہد کی تاریخی مسجد ہے اسے ہٹا کر بھگوان کرشن کا مندر بنایا جائے۔ ذرا سوچیے کہ وزیر موصوف کیسے بھکت ہیں جو ایک دھرم کے ماننے والوں کے مذہبی مقام کو توڑ کر دوسرے مذہب کے لیے مذہبی مقامات بنانا چاہیے ہیں؟ انہوں نے مزید کہا کہ ایودھیا اور کاشی میں بڑا مندر بنانے کا کام چل رہا ہے اور اب متھرا کی تیاری کرنی ہے۔ وزیر موصوف کے اس پوسٹ کے بعد سوشل میڈیا پر جے شری رام، جے شیو شمبھو کا ہیش ٹیگ بھی چلایا گیا اور اس طرح کے تاثرات عام کرنے کی کوشش کی گئی

”

کسان تحریک کی طاقت نے بھی حکومت کی نیند غائب کر دی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست میں اپوزیشن لیڈر کی مقبولیت کافی بڑھی ہے۔ اسی پس منظر میں کاشی اور متھرا کا ایشوز اچھالا جارہا ہے، تاکہ عوام جذباتی مسئلہ میں پڑ کر دھرم کی بنیاد پر ووٹ ڈال دے اور بھگوا حکومت کے لیے راستہ ہموار کر دے۔ اس لیے سیکولر طاقتوں کو یہ بات سمجھنے کی ضورت ہے کہ جو غلطی انہوں نے بابری مسجد سانحہ کے دوران کی تھی اسے نہ دوہرائیں۔

کہ گویا متھرا میں مندر بنانے کے لیے ملک کے ۸۰ کروڑ ہندو بے چین ہیں!

کئی بار ایسا لگتا ہے کہ دھرم کے ان پاکھنڈیوں نے جتنا نقصان مسلمانوں کو نہیں پہنچایا ہے شاید اس سے بھی زیادہ نقصان انہوں نے اپنے دھرم کو پہنچایا ہے۔ مسلمان تو ان کے نفرت اور تشدد کے شکار بنے ہی ہیں، مگر ہندوتوا کے ان ڈرامہ بازوں نے ہندو دھرم اور ہندو سماج کو پوری دنیا میں بدنام کیا ہے۔ حالانکہ بہت سارے دانشوروں کا کہنا ہے کہ ہندوازم اور ہندوتوا میں فرق ہے۔ جہاں ہندو دھرم کروڑوں لوگوں کے لیے عقیدہ ہے، وہیں ہندوتوا ایک سیاسی نظریہ ہے، جس کا مقصد لوگوں کو لڑا کر سیاسی مفاد حاصل کرنا ہے۔ مگر کئی بار لوگ ہندتوا اور ہندوازم میں فرق نہیں کر پاتے ہیں اور وہ جب کسی ہندو کو دیکھتے ہیں تو بعض اوقات ان کے من میں یہ خیال گشت کرنے لگتا ہے کہ کہیں یہ شخص بھی مسلم مخالف تو نہیں ہے؟ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وزارت کے منصب پر بیٹھے کسی بھی شخص کو یہ بات نہیں فراموش کرنی چاہیے کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری لینے سے پہلے ملک کے سیکولر اور جمہوری آئین کی قسمیں لی ہیں۔ بھارت کا آئین اس بات کی کبھی بھی اجازت نہیں دیتا کہ سیاست میں دھرم کا استعمال کیا جائے اور آئینی پوسٹ پر بیٹھا کوئی شخص کسی کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ کرے۔ مگر اتر پردیش کے وزیر نے تو ان ساری باتوں کو طاق پر رکھ کر، خود کو شدت پسند ہندو ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اتر پردیش کو ترقی کی راہ پر دکھانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا گیا ہے۔ اتر پردیش کی بات تو چھوڑ ہی دیجیے، دہلی کے میٹرو اور بس اسٹاپ پر اتر پردیش کی بھگوا حکومت کے اشتہار ہر طرف لگے ہوئے ہیں۔ اِن پوسٹروں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ملک میں صرف اتر پردیش ریاست ہی ترقی کر رہی ہے اور باقی ساری ریاستیں تو یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی ہوئی ہیں! عوام کے پیسہ کو اتر پردیش کی سرکار پانی کی طرح بہا رہی ہے۔ اعداد و شمار کو توڑ مروڑ کر بھگوا حکومت کی کامیابی کے دعوے کیے جارہے ہیں۔ بھگوا طاقتیں بھلے ہی جتنا ترقی کا ڈھول پیٹ لیں، انہیں لگتا ہے کہ ان کی کشتی کو صرف فرقہ وارانہ سیاست ہی کنارے لگا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست میں بڑی تعداد میں لوگ بھگوا حکومت سے ناخوش ہیں۔ جہاں ریاست میں پولیس کو کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے اور حراستی قتل کے معاملے بھی بڑھے ہیں، وہیں شر پسندوں کو حکومت اور انتظامیہ سے پوری طرح حمایت حاصل ہے اور وہ اقلیتوں، دلتوں اور پسماندہ طبقات پر حملے کر رہے ہیں۔ مہنگائی، بے روز گاری، صحت عامہ کی بری حالت سے عوام تکلیف میں ہے۔ ترقی کے جو سبز باغ دکھائے گئے تھے، اسے عوام جان چکی ہے۔

کسان تحریک کی طاقت نے بھی حکومت کی نیند غائب کر دی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست میں اپوزیشن لیڈر کی مقبولیت کافی بڑھی ہے۔ اسی پس منظر میں کاشی اور متھرا کا ایشوز اچھالا جارہا ہے، تاکہ عوام جذباتی مسئلہ میں پڑ کر دھرم کی بنیاد پر ووٹ ڈال دے اور بھگوا حکومت کے لیے راستہ ہموار کر دے۔ اس لیے سیکولر طاقتوں کو یہ بات سمجھنے کی ضورت ہے کہ جو غلطی انہوں نے بابری مسجد سانحہ کے دوران کی تھی اسے نہ دوہرائیں۔ عوام کو بھی یہ عہد کرنا ہوگا کہ وہ ڈرامہ بازوں کے فریب میں نہ آئیں۔ ہم سب یہ عزم کریں کہ ہم دوبارہ بابری مسجد سانحہ کو دوہرانے نہیں دیں گے۔

مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں

ہندوستان میں

سماجی ہم آہنگی کی ضرورت

مسائل اور تقاضے

(مقالات سیمینار)

ترتیب

شکیل احمد سلفی

مکتبہ سلفیہ

لہیریا سرائے، دربھنگہ، بہار

سلسلہ مطبوعات سلفی اکاڈمی

Hindustan Men Samaji Ham-Ahangi Ki Zaroorat:
Masaael aur Taqaze

Compiled by : Shakeel Ahmad Salafi

Mobile No. 9471049723

Year of Publication : 2023 ISBN 978-81-959228-6-4

Price: 325/-

نام کتاب	:	ہندوستان میں سماجی ہم آہنگی کی ضرورت: مسائل اور تقاضے
		مجموعۂ مقالات سیمینار
مرتب	:	شکیل احمد سلفی
سن اشاعت	:	۲۰۲۳ء
قیمت	:	۳۲۵روپے
تعداد	:	۵۰۰
کمپوزنگ	:	مرکز فروغ علم ودانش، دربھنگہ
ناشر	:	مکتبہ سلفیہ، لہیریا سرائے، دربھنگہ

ملنے کے پتے

مکتبہ سلفیہ،، لہیریا سرائے، دربھنگہ، مکتبہ ترجمان، دہلی

فہرست

	مقالات	مقالہ نگاران	صفحہ

سماجی ہم آہنگی کو درپیش چیلنجز: تاریخی تناظر

ڈاکٹر ابھے کمار

ڈاکٹر ابھے کمار کا تعلق مشرقی چمپارن کے رکسول سے ہے۔ انہوں نے ہائی اسکول اور انٹر تک کی تعلیم رکسول میں پوری کی۔ پٹنہ کے اے این کالج سے انگریزی آنرس کیا۔ دہلی میں انگلش جرنلزم میں پی جی ڈپلوما کیا۔ اس کے بعد انگریزی کے مشہور اخبار انڈین اکسپریس میں بطور رپورٹر کام کیا۔ بعد میں جے این یو سے اعلی تعلیم اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ فی الوقت دہلی یونیورسٹی میں پالٹیکل سائنس پڑھاتے ہیں۔ ان کے مضامین مختلف اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کئی سالوں سے روزنامہ انقلاب کے لیے کالم لکھ رہے ہیں۔ مسلم پرسنل لاء پر بھی ان کی کتاب زیر طباعت ہے۔

ہندوستان میں سماجی ہم آہنگی کے مسئلے کو تاریخ کے نقطہ نظر سے دیکھنا اس لیے ضروری ہے کیونکہ بہت سی باتیں جو سماجی ہم آہنگی کو کمزور کر رہی ہیں، ان کے تار نو آبادیاتی دور کی فرقہ واریت پر مبنی تاریخ نگاری سے ملتے ہیں۔ نو آبادیاتی دور کی تاریخ نگاری کو چیلنج کرنا تو دور کی بات، فرقہ پرست طاقتیں اس کے دور کے بہت سارے بیانیے کو قومیت کے نام پر تقویت دے رہی ہیں۔ آسان لفظوں میں کہا جائے تو تاریخ کا بھگوا کرن کیا جا رہا ہے اور سیکولر تاریخ کے اوراق کو نصاب کی کتابوں سے پھاڑ کر ہٹایا جا رہا ہے۔ حال کے دنوں میں این سی ای آر ٹی کی کتابوں سے بہت سی ایسی چیزیں ہٹا دی گئی ہیں جو فرقہ واریت کو سیدھے طور پر نشانہ بناتی

تھیں۔ پوری کوشش ہے کہ تاریخ کو مسخ کیا جائے اور مذہبی زاویے سے بھارت کی تاریخ کو دوبارہ لکھا جائے اور اسے گھر گھر تک پہنچایا جائے۔ اگر ایسا خطرناک کام ہو گیا تو ملک کی مشترکہ تہذیب کو بڑا ٹھیس پہنچے گا۔ سب سے مشکل بات یہ ہے کہ تاریخ کا بھگوا کرن کرنے والا کوئی ایک فرد نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسی جماعت ہےجس کو ہم نظر انداز کر دیں۔ دراصل اس مذموم کام کو انجام دینے کے لیے ہزاروں لوگ لگے ہوئے ہیں۔ سب سے دُکھ کی بات یہ ہے کہ ان سب کاموں میں سرکاری وسائل کا بے جا استعمال ہو رہا ہے۔ عوام کے پیسوں کو خرچ کر کے عوام کے درمیان ہی دوریاں پیدا کی جارہی ہیں اور یہ سب کچھ راشٹر واد کے نام پر جائز ٹھہرایا جارہا ہے۔ حالانکہ یہ کارروائی بظاہر اقلیت مخالف نظر آتی ہے اور ہے بھی، مگر اصل میں یہ بھارت کے تمام مظلوم اور کمزور طبقات کے خلاف ہے۔ تاریخ کا بھگوا کرن ایک ایسا خطرناک عمل ہے جو مظلوم گروپوں اور اقلیتوں کی تاریخ کو دفن کرنے کی ایک بڑی سازش ہے۔ حالیہ دنوں میں بہت سے ایسے ابواب کو نصاب کی کتاب سے پھاڑ کر پھینک دیا گیا جن میں مسلم شخصیت کی بات ہوتی تھی۔ جس طرح سے شہروں کے نام بدلے جارہے ہیں اور سڑکوں کو نیا نام دیا جارہا ہے، وہ سب برسر اقتدار جماعت کی اقلیتوں کی زبان، تاریخ اور ان کی برادری میں پیدا ہوئی اہم اور قابل شخصیات کے خلاف بغض اور فرقہ وارانہ نفرت کی بھی علامت ہے۔ ہمیں تعلیم کے بھگوا کرن کے خلاف پُرامن طریقے سے آواز اٹھانی پڑے گی۔ اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور تعلیم کے بھگوا کرن کی خطرناک سازش کو کامیاب ہونے سے نہیں روکا، تو پھر سماج کا تانا بانا ٹوٹ جائے گا جس کو دوبارہ جوڑنے میں کافی عرصہ لگ سکتا ہے۔

اسی پس منظر میں تاریخ کے بھگوا کرن کے خلاف ہمیں بولنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس

لیے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص نظریہ کو عوام پر تھوپنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ تاریخ کو ایسا توڑا موڑا جارہا ہے، گویا یہ ملک کسی ایک دھرم، ذات اور زبان کے رہنے والوں کا ملک رہا ہو، باقی تمام لوگ یہاں پردیسی کی حیثیت سے رہ رہے ہوں۔ ارباب اقتدار کی مدد سے چل رہے فرقہ وارانہ پروپیگنڈا کی وجہ سے ملک میں ایک ایسا طبقہ اُبھر کر سامنے آیا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ سماجی ہم آہنگی اور تکثیریت کو فروغ دینا اقلیتوں کی منہ بھرائی ہے اور ایسی پالیسی ملک اور اکثریتی سماج کے مفاد کے خلاف ہے۔ اس کے نزدیک ایک مضبوط ملک کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جب یہاں کے تمام باشندے ایک ہی رنگ میں رنگ دیئے جائیں۔ ایسے فرقہ پرست عناصر اقلیتوں کو اکثریتی ثقافت میں زبردستی ضم کرنے کے بڑے حامی ہیں۔ بات بات پر اقلیتوں کو پکڑ لینا اور ان سے ان کے مذہبی عقیدے کے خلاف کہنا کہ فلاں نعرہ بولو اس مذموم پالیسی کی ایک علامت ہے۔ فرقہ پرست عناصر ایک مضبوط ریاست کے قیام کے خواہشمند ہیں اور وہ لامرکزیت کو منفی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا تنوع میں یقین نہیں ہے اور انہیں یکسانیت مطلوب ہے۔ وہیں ان کو لگتا ہے کہ تکثیریت، سماجی ہم آہنگی، پسماندہ اور کمزور طبقات کے حقوق کے تحفظ کے لیے اٹھائے گئے اقدامات، معاشرے کو توڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح سوچنا ہندوستان کے مشترکہ نظریہ کے سراسر خلاف ہے۔ یہ سب خام خیالی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور ایک غلط سوچ کی اپج ہے۔

فرقہ پرست عناصر یہ سمجھنے کو تیار نہیں ہیں کہ یکسانیت کی پالیسی سماج میں ہم آہنگی کو کمزور کرتی ہے اور عوامی اتحاد میں دراڑ پیدا کرتی ہے۔ تکثیریت فطری اور یکسانیت کی پالیسی غیر فطری ہے۔

امریکہ کی ییل یونیورسٹی کے پروفیسر اور ممتاز مورخ جیمز سکاٹ نے یکسانیت کے مسائل

کو تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہوئے اس مسئلہ کو جدید ریاست اور سرمایہ دارانہ نظام سے جوڑ کر دیکھا ہے۔ پروفیسر سکارٹ کا کہنا ہے کہ جدید ریاست کیو جود میں آنے سے دنیا میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں اور معیشت میں بڑے بدلاؤ ہوئے۔ سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دینے کے لیے سماج میں جبری یکسانیت کی پالیسی تھوپی گئی۔ پیڑ اور جنگلات میں بھی تبدیلیاں لائی گئیں اور ان پیڑوں کو فروغ دیا گیا جن سے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف جنگلات کو تباہ کیا گیا اور اس کو عوام کی پہنچ سے دور کیا گیا تو دوسری طرف مصنوعی طریقے سے شجر کاری کی گئی جس کے پیچھے پیسے کمانا ہی مقصد تھا۔ گویا اس طرح ماحولیات کی تکثیریت کو بھی تباہ کیا گیا اور یکسانیت کو نفع خوری کے لیے نافذ کیا گیا۔

سیاست میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جارحانہ قومیت اور نسل پرستی کے نظریہ سے متاثر لوگوں نے اقلیتوں پر ظلم کیے اور ان کو مارا پیٹا اور ان کو اپنے علاقوں سے بھگانے کی کوشش کی۔ کل تک تمام مذاہب کے لوگ جو ایک ساتھ رہتے تھے ان میں نشے میں چور ارباب اقتدار کو اقلیتوں سے اکثریت کو خطرہ نظر آنے لگا۔ جدید دور میں نیشنلزم کو اقلیتوں کے خلاف ہوئے مظالم سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے۔

بھارت میں جب انگریزوں کا راج قائم ہوا اور جدید ریاست وجود میں آئی، تب سرمایہ دارانہ نظام کو بھارت پر تھوپا گیا۔ نجی ملکیت کو مقدس بنا کر پیش کیا گیا اور اس کے لیے قوانین بنے اور سماج کے اندر وہ تمام تبدیلیاں لانے کی کوششیں کی گئیں جن سے منافع پر مبنی اقتصادی نظام وجود میں آسکے۔ قوانین اور رسم و رواج میں جو تکثیریت پائی جاتی تھی، ان کو بدل دیا گیا اور ان سب کے پیچھے جو منشا کار فرما تھی وہ تھی یکسانیت کی ذہنیت۔ ارباب اقتدار کی یہ سوچ تھی کہ اگر ایک یکساں قانون بن جائے اور یکسانیت پر مبنی سماجی ڈھانچہ پیدا کر دیا

جائے، تو پھر ریاست کا کام کاج اور تجارت اور کاربار آسان ہو جائے گا۔ ان سب کے پیچھے مقصد ایک ہی تھا کہ نجی ملکیت کا نظام پیدا ہو اور لوگوں کے درمیان منافع خوری اور مسابقہ کا جذبہ پیدا کیا جا سکے۔ نو آبادیاتی دور میں بھارت کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام میں بڑی تیزی سے تبدیلی ہوئی۔ جو زمین اور وسائل سب کے تھے ان کو زمینداروں اور طاقتور لوگوں کے حوالے کر دیا گیا، کیونکہ یہ سمجھا گیا کہ وہی اس کا بہتر استعمال کر سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسا سوچنے والوں کی مزید دلیل یہ تھی کہ اگر وسائل یوں ہی پڑے رہیں گے تو ان کا کیا فائدہ ہو گا۔ بہتر پالیسی تو یہی ہے کہ وسائل پر ان کا ہی قبضہ ہو، جو ان وسائل سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں اور ریاست کو ٹیکس دے سکیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں بھارت میں زمینداری نظام عمل میں آ گیا، جس کا نقصان سب سے زیادہ بھارت کے آدیواسیوں کو جھیلنا پڑا اور اس پالیسی کے خلاف انہوں نے انگریزوں سے لڑائیاں بھی لڑیں، جب قومی تحریک کے بہت سارے لیڈر پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ جو لوگ نجی ملکیت کو مقدس سمجھتے ہیں اور ان کو لگتا ہے کہ زمینوں پر ان کو مالکانہ حق ایشور نے دیا ہے، وہ اکثر یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ نو آبادیاتی دور سے پہلے زمین کسی کی نجی ملکیت نہیں ہوتی تھی اور اسے کوئی ایک فرد کسی دوسرے فرد کو نہ ہی فروخت کر سکتا تھا اور نہ ہی اس سے وہ خرید ہی سکتا تھا۔ زمینداری نظام کے آنے کے بعد ملک کا ایک بڑا طبقہ مفلسی کے دلدل میں دھکیل دیا گیا کیونکہ کل تک وہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدرتی وسائل کا استعمال بغیر کسی روک ٹوک کے کر سکتا تھا، مگر اب جو مشترکہ زمین، میدان اور تالاب تھے، وہ کسی مخصوص فرد کی نجی ملکیت بن گئے۔

اقتصادی نظام میں تبدیلی لانے کے لیے ضروری تھا کہ ریاست عوام کے بارے میں تمام

طرح کی جانکاری حاصل کرے۔ جدید ریاست پہلے کی ریاستوں سے اس معنی میں مختلف ہے کہ اس کے پاس اپنے شہریوں کے بارے میں تمام جانکاری موجود ہے۔

۱۸۵۷ کے بعد استعماری حکومت نے جانکاری جمع کرنے کا کام تیزی سے شروع دیا۔ پھر عوام کے درمیان موجود مختلف شناختوں کو نظر انداز کیا گیا اور ان کو کچھ خاص مذہبی زمروں میں ڈال دیا گیا۔ بھارت میں فرقہ فرستی کی جڑ وہیں سے مضبوط ہونی شروع ہوتی ہے، جب لوگ اپنے مقامی تشخص کو بھلا کر خود کو بڑے مذہبی گروپ کا حصہ سمجھنے لگے اور ان کے ذہن میں سیاسی فرقہ پرستی کا بخار چڑھ گیا۔ یہ وہی دور ہے جب سماج میں سوشل ہارمنی پر دباؤ بڑھنے لگا، جو آج بھی پوری طرح سے ختم نہیں ہوا ہے۔ حالات تو ایسے ہو گئے ہیں کہ اب سماجی دوریوں کو بڑھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

نوآبادیاتی دور میں جس طرح سے تشخص سازی کا کام شروع ہوا، اس نے چھوٹی چھوٹی شناختوں کو مٹا دیا یا انہیں مناسب نمائندگی نہیں دی۔ کئی بار لوگوں کے پاس متبادل بھی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر قبائلی لوگوں کو کس بڑے مذہب کے حصہ مانا جائے؟ اس سوال کا جواب اتنا آسان نہیں تھا۔ اسی طرح دلت اور پسماندہ طبقات کے رسم و رواج کسی خاص بڑے مذہب سے پوری طرح میل نہیں کھاتے تھے۔ اعلیٰ ذات کے افراد جس طرح سے مذہب کو دیکھتے تھے اور ان کے جو رسم و رواج تھے، ان سے پسماندہ طبقات کے رسم و رواج بہت جدا تھے۔ مگر مردم شماری کا ایسا طریقہ اپنایا گیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سیاسی میدان میں ہندو اور مسلمان نام کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کے نام پر سیاست کرنے والے لوگ آ گئے۔ مردم شماری کا منفی اثر یہ تھا کہ اس نے عوام کو کچھ ہی خانوں میں بانٹنا شروع کر دیا اور اس طرح سے کل ہند سطح پر ہندو اور مسلمان کا تشخص پیدا ہو گیا اور پھر سیاسی لیڈران نے اپنے مفاد کے لیے

عوام کے جذبات سے کھیلنا شروع کر دیا۔ پھر سماج کے اندر کشیدگی میں اضافہ ہونے لگا اور جو لوگ برسہابرس سے ایک ساتھ رہتے آرہے تھے، ان کے درمیان سیاست دانوں نے دیوار کھڑی کر دی۔ پروفیسر سکارٹ نے یہ بھی کہا ہے کہ نہ صرف انسانوں کے بارے میں جدید ریاست نے جانکاری جمع کی اور ان کو مختلف گروپ میں بانٹا اور ان کو ایک نیا تشخص دیا جو ان کے درمیان بگاڑ پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوا، کیونکہ لوگ سرکاری تشخص کو ہی حقیقت مان بیٹھے اور آپس میں لڑنے لگے۔

تاریخ نگاری کا بھی اس میں بڑا منفی رول رہا ہے۔ یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ نوآبادیاتی دور نے نہ صرف طاقت کے زور پر ہمیں محکوم بنایا، بلکہ علم کے حلقہ میں بھی ہمیں مغلوب بنایا اور ہمیں بتلایا کہ ہم کون ہیں، ہماری تاریخ کیا ہے اور ہمارے دوست اور دشمن کون ہیں۔ بھارت میں جدید تاریخ نگاری کی شروعات بھی نوآبادیاتی دور میں ہی ہوئی۔ جدید تاریخ نگاری جدید ریاست کے ہاتھوں میں ایک بڑا ہتھیار ہے۔ تاریخ نگاری کی مدد سے ہی ریاست ہمارے دماغوں پر راج کرتی ہے اور عوام کے ایک گروپ کو دوسرے گروپ کے مقابل میں کھڑا کرتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی حکومت کے لیے جواز حاصل کرتی ہے اور لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر ریاست کا وجود ختم ہو جائے اور ان جیسے حاکم ان کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے آس پاس نہ ہوں، تو سماج کے اندر انارکی پیدا ہو جائے گی اور پھر شریف لوگوں کا جینا مشکل ہو جائے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ انگریزوں کے دور میں ہی تاریخ نگاری کا سلسلہ شروع ہوا اور تاریخ کو مذہبی بنیادوں پر عہدوں میں بانٹ دیا گیا۔ قدیم بھارت کو ہندو دور کہا گیا، جبکہ عہد وسطیٰ کو مسلم دور کا لیبل دیا گیا۔ برطانوی مورخ جیمز میل کی چالا کی بھی دیکھیے کہ انہوں نے قدیم بھارت اور عہد وسطیٰ کو مذہبی رنگ میں

رنگ دیا، مگر جب جدید دور آیا، جس کی باگ ڈور انگریزوں کے ہاتھوں میں تھی جو خود بھی ایک مخصوص مذہب کے پیروکار تھے، مگر جدید دور کو کسی مذہب سے نہیں جوڑا گیا اور اسے ایسا پیش کیا گیا کویا پہلے کا دور مذہب اور توہم پرستی کا دور رہا ہے، جہاں لوگ دھرم اور عقیدے کے نام پر لڑتے تھے اور ملک اور سماج جمود کا شکار رہا تھا اور ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی، مگر جدید دور روشنی اور مذہبی رواداری کا دور ہے، جہاں حکومت کسی کے ساتھ بھی امتیاز نہیں کرتی ہے۔

حالانکہ قومیت کے نظریہ کے حامل ہندوستانی مورخ انگریزی تاریخ نگاری کے بڑے ناقد تھے، مگر انہوں نے بھی اپنی سہولت کے مطابق جو بات انگریزی مورخوں کی ان کے مفاد میں تھی ان کو گلے سے لگالیا اور جو بات ان کو ناگوار گزرتی تھی ان کو چھوڑ دیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قومیت سے لبریز تاریخ نگاری میں بھی بڑی دقت تھی اور اس نے انگریزی حکومت کی تنقید تو ضرور کی، مگر فرقہ پرستی کے زہر کو پوری طرح سے ترک نہیں کیا اور وہ بھی تعصب پرستی کے شکار تھے۔ مثال کے طور پر بنگال کے اسکالر پروفیسر بنے کمار سرکار کو ہی لے لیجئے۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ انگریزی اور دیگر یوروپی فلسفیوں کو باتوں کو پڑھ کر انہیں باتوں کو ہندو دھرم کی کتابوں کا حوالہ سمجھا کرتے تھے۔ پروفیسر سرا کرنے ۱۹۲۱ میں ایک مضمون لکھا جو یہ بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہندو دھرم میں ریاست کا تصور کیا ہے۔ انہوں نے ریاست کے ہندو نظریہ کو اس طرح پیش کیا ہے، گویا وہ انگریز سیاسی فلسفی تھامس ہابس کی باتوں کو اپنی زبان میں دہرا رہے ہوں۔ ریاست کے بارے میں بنے کمار سرکار لکھ رہے ہیں کہ ہندو مت کا یہ نظریہ ہے کہ بغیر ریاست کے سماج انارکی کے اندھیرے میں چلا جائے گا، جہاں انصاف اور عدل نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی اور طاقتور لوگوں کا بول بالا

ہو گا۔ جیسے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے، اسی طرح ریاست کی غیر موجودگی میں کمزور لوگوں کو طاقتور لوگ مار ڈالیں گے اور ان کی جائیداد کو چھین لیں گے۔ پروفیسر سرکار کے مطابق، اگر اس تاریکی سے کوئی نجات دلا سکتا ہے، تو وہ ہے ریاست کا قیام ہے، جہاں حکمراں ڈنڈا یعنی طاقت کے زور سے اور سزا کا خوف دلا کر لوگوں کو قانون ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح ایک طاقتور راجا سماج کے اندر امن وامان کو قائم کرتا ہے جبکہ ریاست کے باہر جو زندگی ہو گی وہ بالکل انارکی اور تشدد پر مبنی ہو گی۔

جو باتیں پروفیسر سرکار ہندو دھرم کے حوالے سے کہہ رہے ہیں وہ ۱۷ویں صدی کے برطانوی فلسفی تھامس ہابس کی باتوں کا نچوڑ ہے۔ اس طرح قارئین خود دیکھ سکتے ہیں کہ جو اسکالر خود کو راشٹر وادی کہتے تھے ان کی تحریروں اور فکر پر انگریزوں کے نصاب اور تاریخ نگاری کا کتنا اثر ہے۔ اتنا ہی نہیں بہت سارے راشٹر وادی مورخوں نے جارحانہ طور پر فرقہ واریت پر مبنی باتیں بولنا اور لکھنا شروع کر دیں اور اس طرح سے سماج کے اندر کشیدگی پھیلنے لگی۔ مثال کے طور پر، کچھ راشٹر وادی مورخ حضرات یہ کہنے لگے کہ قدیم بھارت ہندو دور تھا، جب ملک کی ترقی ہوئی اور ہر شعبہ میں ہندوستانیوں نے بڑا مقام حاصل کیا۔ جو جمہوریت یوروپ میں ۱۹ویں اور ۲۰ صدی میں عمل میں آئی، اس جمہوریت کے تار قدیم بھارت میں تلاش کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آریائی نظریہ کے ماننے والے بھی کوئی کم نہیں تھے اور یہ کہا جانے لگا کہ جو ہندو کلچر ہے وہ آریائی ثقافت پر مبنی ہے۔ اعلیٰ ذات کے لوگوں اپنی بالادستی کو ثابت کرنے اور دلت، آدی واسی اور پسماندہ طبقات کو کمتر دکھلانے کی جلد بازی میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ یوروپ کی تہذیب اور بھارت کی تہذیب آریائی ثقافت پر مبنی ہے۔ جرمنی میں فاشزم کا جو مذموم نظریہ پروان چڑھا اور اس نے دنیا میں تباہی مچائی وہ بھی نسل پرستی پر ہی

مبنی ایک نظریہ تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ جو آریائی نسل ہے صرف پاک اور سب سے بہتر ہے۔ نسل پرستی کا جنون جرمنی میں کچھ یوں چڑھا کہ جو اقلیت یہودی تھے ان کو مارا جانے لگا اور قومی شکست کے لیے ان کو مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ بھارت میں بھی اس زمانہ میں ہٹلر کے نظریہ سے کچھ لوگ متاثر تھے۔ ان کو یہ لگتا تھا کہ ہٹلر اپنے ملک کو آگے بڑھانے اور اپنی نسل کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے مثالی کام کر رہا ہے۔ فرقہ پرستوں کے درمیاں ایسی بھی جماعت تھی، جس نے ہٹلر کی تعریف میں باقاعدہ لکھا۔

یہ وہی دور ہے جب ہندو فرقہ پرست قدیم بھارت کو ہندو مذہب سے جوڑ کر دیکھنے لگے اور یہ بھول گئے کہ وہ دور جتنا ہندو مذہب کا تھا، اس سے کم وہ بدھ مت اور جین مت کے لیے نہیں تھا۔ اگر بھارت میں سنسکرت قدیم زبان ہے، تو تمل بھی کوئی کم پرانی زبان نہیں ہے۔ اگر سنسکرت نے بھارت کی سرزمین پر اپنا اثر چھوڑا ہے، تو تمل اور دیگر ڈراوڑ زبانوں کا بھی خوب اثر دیکھا جاتا ہے۔ مورخوں نے بھی بڑی غلطی کی جب انہوں نے سنسکرت کو دیگر ماخذ سے کہیں زیادہ اہمیت دی۔ یہ بات بھی فراموش کر دی گئی کہ ہندو لفظ کا استعمال بہت بعد میں شروع ہوا ہے اور اس کا استعمال قدیم زمانہ میں کرنا کیسے درست ہے؟ اس بات پر بھی غور نہیں کیا گیا کہ جہاں ہندو دھرم کے پیروکار بھارت میں بڑی تعداد میں ہیں، وہاں یہ بھی حقیقت ہے کہ دیگر مذاہب کے لوگ بھی اس ملک میں رہتے آئے ہیں۔ اس ملک میں ایسے بھی لوگ ہیں اور وہ بڑی تعداد میں ہیں، جو کسی بڑے مذہب کو نہیں مانتے یا پھر وہ ایشور کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ ان حقائق سے فرقہ واریت سے متاثر مورخوں نے منہ پھیر لیا اور ہندوستان کی ایک رنگی تصویر بنائی، جو آج بھی فرقہ پرستوں کے ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے اور وہ اسے ہی بھارت کی حقیقت سمجھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ فرقہ پرست بیانیہ میں ایک مخصوص مذہب کے ماننے والوں کو ملک کا سچا شہری اور محب وطن کہا جاتا ہے، وہیں دوسری طرف اقلیتوں کو شک کے دائرے میں رکھا جاتا ہے۔ارباب اقتدار میڈیا اور ان کے ذرائع ابلاغ بھارت کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی مسلسل کوشش کر رہے ہیں جو کسی طرح بھی سماجی ہم آہنگی کے لیے مددگار نہیں ہے۔ میڈیا کی مدد سے ان فرقہ وارانہ باتوں کا پرچار حالیہ برسوں میں کچھ زیادہ ہی ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ سماج میں کشیدگی پیدا ہو رہی ہے۔ حالات کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم بہت سارے حلقوں میں کام کریں۔ علم کے حلقہ میں فرقہ واریت پر مبنی بیانیہ کو سمجھنا اور اسے خارج کرنے کے لیے ہمیں فکری بیداری پیدا کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ فرقہ پرستی کو فروغ دینے میں فرقہ واریت پر مبنی کتابوں کا بڑا رول ہے۔ خاص کر تاریخ کی نصابی کتابوں کا بھگوا کرن ہو رہا ہے اور وہ باتیں پڑھائی جا رہی ہیں، جو فرقہ پرستی کو فروغ دینے والی ہیں۔

آج کی فرقہ پرستی کا تعلق نوآبادیاتی دور سے ہے اور ہمیں لوگوں کے ذہن سے فرقہ واریت کو مٹانا ہوگا۔ نوآبادیاتی دور میں ہی فرقہ پرست مورخوں نے نہ صرف ایک مخصوص مذہب کو بھارت کا اصلی مذہب کہہ کر پکارا، بلکہ جو مذاہب ان کی نظروں میں ہندومت سے جدا تھے، ان کو غیر ملکی کہہ کر بدنام کیا۔ مگر یہ سچائی ہرگز نہیں ہے۔ مثال کے طور پر بھارت میں عیسائیت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی اور کسی مذہب کی۔ بھارت میں عیسائیت کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنی حضرت عیسیٰ کی ہے۔ عیسیٰ مسیح کے دور سے کچھ ہی سالوں بعد ان کے پیروکاروں نے بھارت کی سرزمین پر قدم رکھا اور انہوں نے ساحلی علاقوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے بڑی تعداد میں لوگ عیسائی بننے لگے۔ اسی طرح مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم جس کی ہم سب اولاد ہیں اور خود کو آدمی کہتے

ہیں، جنت کے بعد سب سے پہلے ہندوستانی برصغیر میں ہی قدم رکھا۔ اگر عقیدہ پر مبنی اس بات سے کوئی انکار بھی کر دے، تو تاریخی شواہد موجود ہیں کہ محمد بن قاسم کی بھارت میں آمد سے سینکڑوں سال پہلے عرب کے مسلمانوں کے بھارت سے تعلقات تھے اور انہوں نے تجارت کے ساتھ ساتھ دین اسلام کی بھی تبلیغ کی۔ بہت پہلے ہی اسلام کی روشنی بھارت میں پہنچ گئی تھی۔ عرب کے تاجروں نے کیرالا کے ساحلی علاقوں میں اتر کر مقامی عورتوں سے شادیاں کیں اور اس طرح سے ہندوستان کے ہو کر رہ گئے۔ اس زمانے کے مقامی راجاؤں نے بھی رواداری کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے عرب مسلمانوں کو مسجدیں بنانے کی اجازت دی۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بھارت کو کبھی بھی کسی ایک دھرم و مذہب سے جوڑ کر نہیں دیکھا جا سکتا ہے، بلکہ یہ ملک ایک گلدستہ کی طرح ہے، جس میں طرح طرح کے پھول لگے ہوتے ہیں۔ نو آبادیادی دور سے ہی فرقہ پرست مورخوں نے اَکھنڈ بھارت کا نظریہ بھی دینا شروع کر دیا۔ اسی دور میں انگریزی مورخوں اور ان کے زیر اثر بھارتی فرقہ پرست مورخوں نے سلطنت مغلیہ اور مسلم بادشاہوں کو مذہبی بنیاد پر ظالم کہا، جبکہ جو راجا ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے، ان کو سچے دیش بھکت کا خطاب دیا گیا۔ تاریخ کو فرقہ واریت کے زہر میں گھول دیا گیا اور سماج کے اندر کشیدگی پھیلنے لگی اور پھر لوگ آپس میں بٹنے لگے۔

فرقہ واریت پر مبنی تاریخ نگاری کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ بہت سارے مسلم مورخ بھی تعصب پر مبنی باتیں کہنے لگے۔ انہوں نے نگریزوں سے یہ بات ادھار لے لی کہ عہد وسطیٰ واقعی مسلم دور تھا، جب ہندو راجاؤں کو مسلمانوں نے ہرایا اور ان پر حکومت کی۔ مسلم مورخوں کی تحریروں سے مسلم نیشنلزم کی بو آنے لگی اور وہ خود کو ہندوؤں کے مقابلے میں برتر سمجھنے لگے۔ مگر وہ اس بات کو بھول گئے کہ مسلم بادشاہوں کی بھارت میں طویل عرصہ تک حکومت

بھی رہی، تب بھی عام مسلمان عام ہندوؤں کی طرح، ٹیکس کے بوجھ تلے دبے رہے اور ریاست ان کا استحصال کرتی رہی۔ وہیں دوسری طرف ہندوؤں کے اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے بہت سارے شرفا مسلم بادشاہوں کے قریب ہوگئے اور انہوں نے اپنا ذاتی مفاد پورا کیا۔ جس اورنگزیب عالمگیر کو شدت پسند کہ کر پروفیسر جادو ناتھ سرکار نے فرقہ پرستی کے بیانیہ کو مزید تقویت دی، وہ اس بات کو نہیں سمجھ پائے کہ آخر اورنگزیب کے دور میں سب سے زیادہ ہندو منصب دار کیوں تھے؟ اگر اورنگزیب شدت پسند مسلم بادشاہ تھا، تو کم از کم اس کے اختلافات تو دکن کے دیگر مسلم بادشاہوں سے نہیں ہونے چاہیے تھے؟ اگر ساری بات مذہب کی ہی تھی، تو پھر اورنگزیب اور اس کے بھائی داراشکوہ میں تو لڑائی نہیں ہونی چاہیے تھی؟ اگر اورنگزیب نے بعض مندوروں کو سیاسی لڑائی کی وجہ سے توڑا، تو اسی سیاست کی وجہ سے اس نے بہت سارے مندروں کے لیے دان بھی دیا۔ پروفیسر رومیلا تھاپر، پروفیسر ہربنس مکھیا اور پروفیسر بپن چندرا نے انہیں مسائل پر بڑی طویل گفتگو ریڈیو پر سال ۱۹۶۸ میں کی تھی اور صحیح فرمایا تھا کہ تاریخ کو کبھی بھی مذہبی زاویے سے نہیں دیکھا جانا چاہیے، بلکہ تاریخ کو دیکھنے کا بہتر طریقہ سماجی اور اقتصادی زاویہ ہے۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ کئی بار ہم درباریوں کے ذریعے لکھی گئی کتابوں کو سچائی تصور کر لیتے ہیں اور اس کو دیگر ماخذ سے جانچنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اکثر تاریخ کو فرقہ وارانہ طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کا منفی اثر سماج میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ پھر یہ ہمارے سماج کی ہم آہنگی پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ تاریخ کی انہیں غلطیوں کی وجہ سے ہمارا سماج آزادی سے پہلے بٹ گیا تھا۔ ملک کی تقسیم میں فرقہ واریت پر مبنی تاریخ نگاری کا اہم رول ہے۔ آج صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ بلکہ آج کے حالات اور بھی تشویشناک لگ رہے ہیں کیونکہ فرقہ پرستی کے عروج کی وجہ

سے فرقہ واریت پر مبنی تاریخ نگاری کا سلسلہ بھی تیزی سے بڑھا ہے۔

پروفیسر بنی پرساد، جو الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کے پہلے صدر تھے، نے یہ بات اپنی تحریروں میں بار بار دہرائی ہے کہ مورخ اکثر ادھر ادھر سے ایک دو باتوں کو جمع کر کے بڑی بات کہنے کی غلطی کر دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ بھارت کی تاریخ نگاری میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر بھارت کی تاریخ نگاری کا سب بڑا مسئلہ یہ ہے کہ تاریخ کے واقعات کے لیے تاریخیں درست طریقے سے تفویض نہیں کی گئی ہیں۔ یعنی کون سا واقعہ کب ہوا، اس کو لے کر ایک رائے نہیں ہے۔ مورخین کئی بار یہ غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ وہ ماضی میں پیش آئی وارداتوں کو قدیم سے قدیم بنا کر پیش کرنے کی ہوڑ میں رہتے ہیں۔ پروفیسر پرساد کے مطابق، ان کمیوں کو دور کرنے کئے لیے ہمیں بہت حد تک غیر ملکی سیاحوں کی تحریروں کو پڑھنے کی ضرورت ہے، اور یہ تب ہی ممکن ہے جب مورخ کو زبان پر قدرت حاصل ہو اور وہ تحریروں کو تاریخی پس منظر میں سمجھے۔ ایک اور بڑی غلطی مؤرخیں یہ کرتے ہیں کہ وہ آج کی نظروں سے ماضی کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے ایسے سوالات کرتے ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ مثال کے طور پر یہ سوال کرنا کہ اشوک کتنا بڑا اسیکولر راجا تھا یہ سوال ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ سیکولرزم کا نظریہ جدید دور میں سامنے آیا۔ جب سرمایہ دارانہ دور میں ریاست نے مذہب کو دنیاوی امور سے جدا کر دیا اور چرچ کا کام صرف مذہبی امور میں دخل دینا رہ گیا، جبکہ ریاست نے بقیہ تمام امور کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ اسی طرح قومیت کے تار کو قدیم دور میں تلاش کرنا بھی وقت کی بربادی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قومیت کے نظریہ کا اُبھار جدید یورپ میں ہوا۔ جب بڑے بڑی سلطنتیں ٹوٹ گئیں اور دیسی زبانیں کلاسکی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہونے لگیں۔ جب رومی

سلطنت کا زوال ہوا اور اس کے بعد چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنیں، تو ان کے پیچھے جو نظریہ کام کر رہا تھا وہ اسی قومیت کا تھا۔ اس لیے یہ سوال کرنا کہ گپتا کے دور میں قومیت کی شکل کیا تھی، یہ سراسر غلط سوال ہے۔ اسی طرح ہندو مسلمانوں کی سیاسی لڑائی کو مغلیہ دور میں تلاش کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ سیاسی فرقہ واریت کا وجود جدید دور میں شروع ہوا، جب مردم شماری کے ذریعہ عوام کو مختلف مذہبی گروپ میں بانٹا گیا اور انتخاب کی وجہ سے سماجی گروپ کے سیاسی لیڈران ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ جدید دور میں اقتدار اسی جماعت کو مل پاتی ہے، جس کے پاس نمبر یا تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ ووٹ کی سیاست نے فرقہ پرستی کو ایک سیاسی رنگ دے دیا۔ اس لیے فرقہ پرستی کا روگ جدید دور سے پہلے وجود میں نہین تھا۔ اگر کہیں ہندو اور مسلمان کے درمیان کچھ جھگڑا بھی دیکھنے کو ملتا تھا، تو وہ مقامی تھا اور اس کی کوئی سیاسی وجہ نہیں تھی۔

چونکہ آج فرقہ پرست ذہنیت کے لوگ اقتدار کے قریب ہیں اور ان کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ اگر لمبے وقت تک انہیں راج کرنا ہے، تو عوام کے دل و دماغ کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی توجہ انتخابات جیتنے اور جتنا مال لیڈروں، افسروں اور صحافیوں کی خریدنے پر خرچ کرتی ہے، اتنی ہی توانائی وہ اپنے پروپگینڈے کو پھیلانے میں بھی صرف کرتی ہے۔ دراصل اس کی ایک بڑی ترجیح لوگوں کی ذہنیت کو اپنے رنگ میں رنگنا ہے۔ یہ کام اس کے ادارے بخوبی کر رہے ہیں۔ اس کی طاقت اس کی تنظیمیں ہیں، جو زندگی کے ہر شعبہ میں سرگرم عمل ہیں۔ اس کا آئی ٹی سیل دن رات کام کر رہا ہے۔ پورا میڈیا اس کی جیب میں ہے۔ طویل مدت سے اور بڑی ہی پابندی کے ساتھ، اس کے ترجمان اخبارات اور جرائد مذہبی تعصب کو بڑھاوا دے رہے ہیں اور ہندوؤں کے سامنے مسلمان، عیسائی اور سیکولر طاقتوں کو دشمن بنا کر پیش کر

رہے ہیں۔وہیں دوسری طرف سیکولر جماعت اپنی آئیڈیالوجی کو لے کر تذبذب میں ہے۔ایک طرف اس کا انتخابی منشور سیکولر ہے تو دوسری طرف بعض اوقات وہ فرقہ پرستی کا بھی سہارا لیتی ہے۔

حالیہ کچھ برسوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں بھارت کی تاریخ کو اپنے موقف اور اپنے ذاتی مفاد کے مطابق بری طرح سے بدل رہی ہیں۔چونکہ وہ اقتدار پر قابض ہیں، اس لیے وہ جو چاہ رہی ہیں وہ پورا ہو رہا ہے۔ان کے نزدیک تاریخ نگاری کے اصول کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔کسی واقعہ کو تاریخی ماننے سے پہلے، ایک پیشہ ور اور ایماندار مؤرخ اس سے جڑے ہوئے تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرتا ہے۔وہ تمام ماخذ کو عقل اور دلیل کے ترازو پر تولتا ہے۔تعصب اور ذاتی مفاد کے خول سے نکل کر سائنٹفک طریقۂ کار کا استعمال کرتا ہے۔فیصلے لینے سے پہلے، وہ تمام باتوں کو ٹھنڈے دماغ سے سوچتا ہے۔مگر یہ بے حد افسوس کی بات ہے کہ تاریخ کی ان باریکیوں کی پرواہ نہیں کر رہی ہے۔ماخذ دیکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے سے پہلے ہی، فرقہ پرست طاقتوں کو نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔تصور کیجیے کہ کوئی جج بغیر ایف آئی آر پڑھے اور وکیلوں اور گواہوں کی باتوں کو سُنے بغیر، فیصلہ دینے لگے، تو پھر معاشرہ میں کس قدر بے چینی پھیلے گی! ٹھیک اسی طرح ایک خاص سیاسی مفاد کو پورا کرنے کے لیے تاریخ کے اوراق کو ایک رنگ میں رنگا جا رہا ہے اور ملک کو کمزور کیا جا رہا ہے۔یہ بات یاد رکھنے کی ضررت ہے کہ تاریخ کو مسخ کرنا انسانی جسم کو زخمی کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔تاریخ اگر مسخ کر دی گئی اور عوام کے دماغ میں فرقہ وارانہ اور نفرت انگیز باتوں کو بھر دیا گیا تو سمجھ لیجیے کہ پورا معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔بندوق کی گولی سے بھی زیادہ چوٹ فرقہ پرست مورخ کا قلم کر سکتا ہے۔گولی صرف ایک انسان کی جان لے سکتی ہے، مگر فرقہ پرستی پورے

معاشرہ اور ملک کو جلا سکتی ہے۔

فرقہ پرست جماعت کی ہٹ دھرمی یہ ہے کہ یہ ملک صرف اور صرف ایک مذہبی گروپ کا ہے۔ وہ یہ جھوٹ سب پر تھوپنا چاہتی ہے کہ اس ملک کی ہزاروں سالوں کی تہذیب اور ثقافت صرف ہندوانہ رہی ہے۔ وہ ہندو نسل کو ہی قومیت کا عَلم بردار سمجھتی ہے اور ہندو ہی ان کی نظروں میں سچا محب وطن ہے۔ اسی فرقہ پرست سیاست کا سہارا لے کر ایوان اقتدار تک پہنچی ہے اور اس کی پوری کوشش ہے کہ سماج میں ہم آہنگی کی جگہ دوریاں بنی رہیں۔ اسی لیے تو فرقہ پرست جماعت بڑی تیزی سے درسی نصاب اور تاریخ کی کتابوں میں مسلم، عیسائی سماج اور سیکولر جماعت کے خلاف زہر بھرا مواد پیش کر رہی ہے۔ اپنے حریف کو بھارت کی تہذیب اور ثقافت کا دشمن بتا کر بھگوا جماعت ہمیشہ کے لیے راج کرنا چاہتی ہے۔ خاص کر مسلمان کو ان کے ہی ملک میں باہری حملہ آور کہہ کر مسلسل گالی دی جا رہی ہے۔ اکثریتی سماج کو ڈرایا جا رہا ہے کہ اگر مسلمان اور عیسائی ترقی کرتے رہے تو ملک اور ہندو سماج کمزور ہو جائے گا۔ یہ بات وہ بعض اوقات کھلے عام کہہ رہی ہے کہ جہاں بھی ہندوؤں کی تعداد گھٹے گی وہاں ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

بھگوا جماعت اس تاریخی حقیقت کو ماننے کو تیار نہیں ہے کہ مذہب وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ہندو دھرم بھی تبدیلیوں کے دور سے گزرا ہے۔ اس لیے ایک اچھا مورَخ وہی ہے جو تاریخ کی تبدیلی اور اس زمانہ کے سیاق کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ لیتا ہے۔ مگر فرقہ پرست مؤرخین تاریخ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہزاروں سال سے ایک ہی مقام پر تاریخ ٹھہری ہوئی ہے۔ بھگوا طاقت یہ بات بھی چھپانا چاہتی ہے کہ بُدھ اور جین دھرم سے جڑے ہوئے مجسمے ملک کے ہر خطے میں پائے گئے ہیں۔ وہ یہ بات بھی دبا دینا چاہتی ہے کہ قدیم

بھارت میں ذات پات اور جنسی استحصال کا چلن تھا۔ دلتوں پر کافی ظلم ہوئے، وہیں اسلام کے چراغ نے بھارت کی اندر مساوات اور اخوت کی روشنی جلائی۔ جس قدیم بھارت کو فرقہ پرست طاقت ایک خاص مذہب سے جوڑ کر پیش کرتی ہے۔ وہ دور بدھ مت اور جین مت کا بھی تھا۔ ایک زمانہ تک بدھ مت پورے بھارت میں پھیلا ہوا تھا۔ بھگوا جماعت اس پر بات نہیں کرنا چاہتی ہے کہ کیسے بدھ مت کو اپنے ہی ملک میں ختم کر دیا گیا۔ تشدد کو اسلام سے جوڑنے والے کبھی اس بات پر منہ نہیں کھولتے کہ بدھ مت کے پیروکاروں کو کن لوگوں نے تشدد کی آگ کا ایندھن بنایا؟ دراصل ہندوستانی معاشرہ طبقاتی، جنسی اور ذات اور برادری کی بنیاد پر بٹا ہوا ہے۔ بھارت کی تاریخ میں کوئی بھی دور کبھی بھی ایک روایت سے منسوب نہیں رہا ہے، بلکہ یہاں مختلف دھارائیں بہتی رہی ہیں۔

محکوم طبقات اور یوم انسانی حقوق

موجودہ دور میں مذہب کی سیاست کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ دقیانوسی سوچ بھی پروان چڑھ رہی ہے

ابھے کمار

ہر سال ۱۰ دسمبر کو عالمی یوم انسانی حقوق منایا جاتا ہے۔ آج ہی کے دن، سال ۱۹۴۸ میں، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کے عالمی منشور کو قبول کیا تھا۔ دو سال بعد جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد پاس کی اور دنیا کے تمام ممالک اور تنظیموں سے اپیل کی کہ وہ ہر سال ۱۰ دسمبر کو یوم انسانی حقوق کے طور پر منائیں۔ انسانی حقوق کو سمجھنے میں اقوام متحدہ کا منشور ایک اہم دستاویز ہے، جو نسل، رنگ، ذات، جنس، زبان، اور خطے کے امتیازات سے اوپر اٹھ کر سب کے لیے یکساں بنیادی حقوق کی بات کرتا ہے۔ یہ منشور اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانوں کی عزت و وقار کا احترام کیا جانا چاہیے، کیونکہ ہم سب ایک ہی انسانی خاندان کے رکن ہیں۔ دنیا میں آزادی، انصاف اور امن کے قیام کے لیے یہ ضروری ہے کہ تمام انسانوں کو مساوی اور ناقابلِ تنسیخ حقوق دیے جائیں۔

غور طلب ہے کہ اقوام متحدہ کی تشکیل دوسری عالمی جنگ کے بعد ہوئی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب یورپ کے بڑے ممالک اپنے ذاتی مفاد کے لیے لڑ رہے تھے، مگر انہوں نے اپنے جھگڑوں میں دنیا کے دیگر حصوں کو بھی لپیٹ لیا تھا۔ انہی تلخ تجربات کے بطن سے اقوام متحدہ اور اس سے وابستہ تنظیمیں، جن میں انسانی حقوق کے ادارے بھی شامل ہیں، وجود میں آئیں۔ عالمی جنگ سے پہلے حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کے حامل یہ سمجھتے تھے کہ طاقت کے زور پر کچھ بھی کیا جاسکتا ہے اور ریاست اپنے مفاد کی خاطر کچھ بھی کرسکتی ہے۔ مگر اب ان کی آنکھوں کے سامنے لاشوں کے انبار اور ملبے میں تبدیل شدہ شہر تھے۔ اس سیاق میں جارحانہ فکر رکھنے والے نظریہ ساز جماعت کی کافی مخالفت ہوئی۔ ناقدین میں ایک بڑا گروہ لبرل دانشوروں کا تھا، جو یہ رائے رکھتے تھے کہ جنگ کسی بھی مسئلے کا حل نہیں ہے اور تنازعات کو اداروں اور مکالمے کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔ حالات نے لبرل جماعت کی دلیلوں کو مضبوطی دی۔ یہی لبرل لابی اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے منشور کو متعارف کرانے میں پیش پیش تھی۔

حالانکہ یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ جارحانہ فکر کے حامل حقیقت پسندانہ نظریہ ساز یعنی ریئلسٹ اسکالرز کی لابی کے اوپر امن اور مذاکرات کی بات کرنے والی لبرل لابی مسلط ہوگئی ہے۔ آج بھی بین الاقوامی امور کے ماہرین طاقت ہی کی پرستش کرتے ہیں، اور ان کی فکر بہت حد تک حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے میل کھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ بھی آج دنیا میں جنگ روکنے اور امن قائم کرنے میں اس لیے ناکام رہا ہے۔ جہاں اس کا پروگرام اور منشور عوام کے حق میں ہے، وہیں ان پر پورے خلوص سے عمل نہیں کیا جا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر کی حامل لابی بین الاقوامی تنظیم کی سرگرمیوں کو بھی متاثر کر رہی ہے اور جن کے پاس پیسہ ہے وہ انہیں پردے کے پیچھے سے کنٹرول کرتے ہیں، جس کی وجہ سے محکوم طبقات، مظلوم عوام اور غریب ممالک کے مفادات درکنار کر دیے جاتے ہیں۔ مگر ان تضادات کی طرف اشارہ کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہم عالمی تنظیموں کی اہمیت کو ہی خارج کر دیں، یا پھر ناامیدی کی چادر اوڑھ کر سو جائیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اقوام متحدہ کی تاریخ اور انسانی حقوق سے وابستہ اس کے

"

جہاں تنقید کو جمہوریت کی روح سمجھا جاتا ہے، وہاں حکومت کی عوام مخالف پالیسیوں کی مخالفت کی وجہ سے بڑی تعداد میں مسلم نوجوانوں کو برسوں سے جیل میں قید رکھا گیا ہے۔ جے این یو کے ذہین اسکالر شرجیل امام، عمر خالد، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم میران حیدر اور دیگر کو ان کے شہری حقوق دینے سے عدالت قاصر ہے اور انہیں سالوں سال ضمانت سے محروم رکھا گیا ہے۔ جبکہ فسادات میں ملوث دائیں بازو کے شرپسند آزادانہ گھوم رہے ہیں اور ان میں سے بعض پارلیمنٹ میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔

دستاویزات کو پڑھیں اور ان کا استعمال کمزور طبقات کے حقوق کے تحفظ کے لیے کریں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں بھی انسانی حقوق سے متعلق باتوں کو نصاب کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔ جب تک ہم قانون کے بارے میں اچھی طرح نہیں جانیں گے، تب تک ہم اس کا استعمال کمزور لوگوں کے مفاد میں نہیں کرسکیں گے۔

مثال کے طور پر، اقوام متحدہ کا انسانی حقوق سے وابستہ منشور کہتا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں اور ان کے حقوق یکساں ہیں۔ سبھی لوگ آپس میں اخوت کے رشتے سے بندھے ہوئے ہیں، اور سب کے پاس عقل و شعور اور ضمیر موجود ہے۔ یہ بات منشور کے آرٹیکل ایک میں کہی گئی ہے۔ مگر زمینی حقیقت یہ ہے کہ آج بھی لوگوں کو ذات، برادری، مذہب، نسل، جنس، زبان، اور علاقے کی بنیاد پر امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ملک میں آج بھی چھوت چھات اور ذات پات کا کلنک ختم نہیں ہوا ہے۔ موجودہ دور میں مذہب کی سیاست بڑھنے کے ساتھ ساتھ دقیانوسی سوچ بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ مسلم مخالف پروپیگنڈا ہر روز بڑھ رہا ہے۔ ہر دن مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے اور ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائی جا رہی ہے۔ بھارت کا آئین اور انسانی حقوق کا منشور جہاں سب کو یکساں حقوق دیتا ہے اور مساوات، آزادی، اور اخوت کی بات کرتا ہے، وہیں بھارت کے مظلوم طبقات کو مختلف طریقوں سے دبایا اور ستایا جا رہا ہے۔ اقلیتوں کو نشانہ بنا کر دائیں بازو کی تنظیمیں سیاست کر رہی ہیں۔ اقلیتوں کے مذہبی عقائد اور مقامات پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ حالات اس قدر خراب ہوگئے ہیں کہ نماز پڑھنے والا ہر مسلمان اس خوف میں مبتلا ہے کہ نہ جانے کب اس کے علاقے کی مسجد کے سروے کا حکم نامہ آجائے اور اسے متنازع قرار دے دیا جائے۔ ارباب اقتدار کو یہ بات کون سمجھائے کہ جمہوری ریاست کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو جینے کی آزادی فراہم کرے، انہیں تحفظ دے، اور ان کی ترقی کے لیے راہ ہموار کرے۔ ایک جمہوری ریاست میں کسی بھی قسم کی غلامی اور غیر برابری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جہاں کوشش یہ ہونی چاہیے کہ استحصال کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا جائے، وہیں اس کی شدت بڑھ رہی ہے۔ انسانی حقوق کا مطلب یہ ہے کہ کسی فرد کو نقصان نہ پہنچایا جائے، ظلم کا خاتمہ ہو، اور قانون کی حکمرانی قائم ہو۔ کسی کو بھی غیر قانونی طریقے سے گرفتار نہ کیا جائے۔

مگر تلخ حقیقت یہ ہے کہ جہاں ہمارے ملک کے راکٹ خلا میں پہنچ گئے ہیں، وہیں ایک انسان اپنے سر پر میلا ڈھونے اور سڑکوں پر کھلے آسمان میں سونے کے لیے مجبور ہے۔ وہیں جیلوں میں دلتوں، مسلمانوں، آدی واسیوں اور دیگر پسماندہ ذاتوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جہاں تنقید کو جمہوریت کی روح سمجھا جاتا ہے، وہاں حکومت کی عوام مخالف پالیسیوں کی مخالفت کی وجہ سے بڑی تعداد میں مسلم نوجوانوں کو برسوں سے جیل میں قید رکھا گیا ہے۔ جے این یو کے ذہین اسکالر شرجیل امام، عمر خالد، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طالب علم میران حیدر اور دیگر کو ان کے شہری حقوق دینے سے عدالت قاصر ہے اور انہیں سالوں سال ضمانت سے محروم رکھا گیا ہے۔ جبکہ فسادات میں ملوث دائیں بازو کے شرپسند آزادانہ گھوم رہے ہیں اور ان میں سے بعض پارلیمنٹ میں بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ان مایوس کن حالات میں مزید مایوسی اختیار کرنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ ہمیں مثبت کاموں پر توجہ دینی چاہیے اور خود سے جو بھی کرنے سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ حق کی لڑائی کو آگے بڑھانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم انسانی حقوق کی اہمیت کو سمجھیں اور عالمی یوم انسانی حقوق کو ایک تہوار کے طور پر منائیں۔ ■

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)

debatingissues@gmail.com

حب الوطنی کا امتحان مت لیجیے

کیا سرکار اس بات کا جواب دے گی کہ جس کے پاس گھر نہیں ہے، وہ ترنگا لہرانے کہاں جائے؟

ابھے کمار

نریندر مودی حکومت کی رابطہ عامہ یعنی پی آر ٹیم اکثر چھوٹی سی چھوٹی بات کو ایک بڑا واقعہ بنا کر پیش کر دیتی ہے۔ اگر کچھ بڑا نہ بھی ہو رہا ہو، تب بھی یہ میڈیا کی مدد سے اُسے بڑا بنا کر دکھلا دیتی ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ جو چیز دکھتی ہے وہی بکتی بھی ہے۔ اب 'یوم آزادی کا امرت مہوتسو' کی تقریب کو ہی لے لیجیے۔ آزادی کے ۷۵؍ سال پورے ہونے کے موقع پر پی آر ٹیم ایسا ماحول بنا رہی ہے گویا موجودہ حکومت جیسی کوئی بھی سابقہ حکومت 'دیش بھگت' نہیں تھی۔ اس بار ہر گھر ترنگا مہم چلائی جا رہی ہے اور ارباب اقتدار عوام کو یہ نصیحت دے رہے ہیں کہ وہ ۱۳؍ سے ۱۵؍ اگست کے درمیان اپنے گھروں سے قومی پرچم ترنگا کو لہرائیں۔ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ ایسا کرنے سے عوام کے دلوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوگا۔ یوم آزادی یا یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی برسوں سے ہوتی آ رہی ہے، مگر اس بار اسے کچھ الگ دکھلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مین اسٹریم کے صحافی، برسر اقتدار سیاسی جماعت کے کارکنان اور سرکاری اداروں کے افسران عوام کو دیش بھکتی کا درس دینے میں پیش پیش ہیں۔ ایوان اقتدار میں چکر لگانے والے عناصر خود کو سب سے 'بڑا' دیش پریمی دکھلانے کی ہوڑ میں ہیں۔ کیمرے کے سامنے خود کو ملک دوست بتلانے کا فیشن چل پڑا ہے۔ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر بھگوا جماعت اپنے حریفوں سے حب الوطنی کا امتحان بھی لے رہی ہے۔ مگر ارباب اقتدار کو کون سمجھائے کہ وطن سے محبت ایک فطری چیز ہے۔ جو جہاں پیدا ہوتا ہے، وہاں کی مٹی کی خوشبو کو پوری زندگی محسوس کرتا ہے۔ جن پیڑ اور پودوں کے نیچے انسان بڑا ہوتا ہے، ان کی سر سبز و شادابی کو یاد کر کے اس پر شادمانی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جن کھیت، تالاب اور ندی کے درمیان وہ اپنا بچپن گزارتا ہے، ان کو یاد کر کے وہ ہمیشہ سکون و مسرت پاتا ہے۔ لہٰذا انسان کو حب الوطنی کا درس دینا ویسا ہی فضول کا کام ہے، جیسا مچھلی کو پانی میں تیرنے کے لیے تربیت دینا۔

مگر جدید دور میں قومی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد حب الوطنی کے معنی بدلنے لگے۔ انسان کی ایک پہچان نہیں ہوتی، بلکہ وہ بیک وقت کسی نہ کسی مذہب، علاقہ، جنس، زبان، ثقافت وغیرہ سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ مگر قومی ریاست میں قومیت کو سب سے اہم سمجھا جانے لگا۔ حالانکہ بھارت میں قومیت کا نظریہ کثرت میں وحدت کا رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہماری الگ الگ مذہبی، علاقائی اور لسانی پہچان ہے، ویسے ہی ہماری ایک قومی پہچان بھی ہے۔ مثال کے طور پر گاندھی جی کی شخصیت ایک سناتنی ہندو کی تھی، مگر وہ ساتھ ساتھ ایک سچے ہندوستانی بھی تھے۔ اسی طرح مولانا آزاد ایک مسلمان اور ہندوستانی تھے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی جگہ سیکولر کانگریس کو اپنی پارٹی مانا۔ وہ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر بننے والے ملک پاکستان کی جگہ بھارت کو اپنا پیارا وطن مانا۔ مگر شدت پسند، نسل پرست اور ایک قوم، مذہب اور زبان کی بات کرنے والے تاریخ کو فراموش کر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ وحدت پر تو خوب زور دیتے ہیں، مگر کثرت کی بات کو جان بوجھ کر نہیں کرتے۔ اگر ان کی نیت میں کھوٹ نہیں ہوتی تو وہ ایسا سوال نہیں کرتے "تم پہلے مسلم ہو یا انڈین؟"

تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کا دائرہ تنگ اور سمٹتا جا رہا ہے۔ اب تو مجاہدین آزادی کو پہچان دیکھ کر اپنایا، یا فراموش کیا جا رہا ہے۔ تاریخی حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ لمبے وقت تک کانگریس کے ساتھ ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ کے کارکنان

> ارباب اقتدار کو کون سمجھائے کہ وطن سے محبت ایک فطری چیز ہے۔ جو جہاں پیدا ہوتا ہے، وہاں کی مٹی کی خوشبو کو پوری زندگی محسوس کرتا ہے۔ جن پیڑ اور پودوں کے نیچے انسان بڑا ہوتا ہے، ان کی سر سبز و شادابی کو یاد کر کے اس پر شادمانی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جن کھیت، تالاب اور ندی کے درمیان وہ اپنا بچپن گزارتا ہے، ان کو یاد کر کے وہ ہمیشہ سکون و مسرت پاتا ہے۔

مل کر کام کرتے تھے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آزادی کی لڑائی کے کانگریس کے لیڈروں کے مابین اتفاق کم اور اختلاف زیادہ نظر آتا تھا؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مدن موہن مالویہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا دونوں کے صدر تھے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جب ۱۹۴۲ء کے دوران کانگریس کے لیڈران بھارت چھوڑو تحریک کا نعرہ بلند کر رہے تھے، تب بابا صاحب امبیڈکر برطانوی حکومت میں شامل تھے؟ کیا یہ بات سچ نہیں ہے کہ ہندو مہاسبھا کے لیڈر اور جن سنگھ کے صدر شیاما پرساد مکھرجی، نہرو کابینہ میں وزیر تھے۔ پھر کیسے مکھرجی دیش بھگت کہے جا رہے ہیں اور ان کے ٹیم لیڈر نہرو پر سوالوں کی جھڑی لگا دی جا رہی ہے؟ کیا اس بات میں شک ہے کہ انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے لڑنے اور مرنے والے ملک کے آدی واسی ہیں۔ ۱۸؍ویں صدی میں آدی واسی علاقوں میں انگریزوں نے قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے اس استحصال اور زیادتی میں مقامی زمیندار اور دلال بھی شامل تھے۔ ٹیکس کی صورت میں آدی واسیوں سے موٹی رقم لوٹی جانے لگی۔ وسائل کی لوٹ اور آدیواسی طرز زندگی پر ہو رہے نوآبادیاتی حملے کے خلاف ۱۸؍ویں صدی میں بڑی بغاوت ہوئی۔ جب کانگریس، گاندھی، نہرو اور ساورکر اور آر ایس ایس کہیں بھی سیاسی میدان میں نظر نہیں آ رہے تھے، تب برسا منڈا انگریزوں اور ان کے دیسی ایجنٹوں کے خلاف لڑائی لڑ رہے تھے۔ مگر آج ان باتوں کو نئی نسلوں کو نہیں بتلایا جا رہا ہے۔ اگر غلطی سے ایک یا دو آدی واسی ہیرو کو یاد بھی کیا جاتا ہے، تو ان کی فکر کو جان بوجھ کر دبا دیا جاتا ہے۔ جنگ آزادی کی داستان گاندھی ساورکر سے شروع ہو کر آر ایس ایس پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ آج کسی کے پاس یہ ہمت نہیں ہے کہ بھگوا طاقتوں سے یہ سوال کرے کہ ان کا نظریہ ماضی میں قومی پرچم اور آئین کو لے کے کیا رہا ہے؟ اس بات پر بھی میڈیا چرچا نہیں کرتا کہ ملک کے محکوم طبقات (دلت، آدی واسی، پسماندہ طبقات، اقلیت، خواتین) کو کیوں تاریخ کی کتابوں میں جگہ نہیں مل پاتی ہے؟ کیا ان کی قربانیوں کو فراموش کرنا ملک سے غداری نہیں ہے؟

تضاد دیکھیے کہ سرکار لوگوں سے اپیل کر رہی ہے کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے ترنگا لہرا کر اپنی دیش بھکتی کا ثبوت دیں، مگر اسی سرکار نے بے گھروں کو گھر مہیا کرانے کے اپنے فرائض کو کبھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ کیا سرکار اس بات کا جواب دے گی کہ جس کے پاس گھر نہیں ہے، وہ ترنگا لہرانے کہاں جائے؟ کیا یہ بات غلط ہے کہ بھارت میں کروڑوں لوگوں کے پاس آج بھی اپنا گھر نہیں ہے، کیا ایسے لوگ دیش دروہی قرار دیے جائیں گے، کیوں کہ وہ اپنے گھروں پر قومی پرچم لہرانے سے قاصر ہیں؟ جن کے پاس مکان، کھیت اور جینے کے لیے معقول وسائل نہیں ہیں، ان کو حب الوطنی کا درس دینا کتنا جائز ہے؟ کیا یہ ملک کی بدقسمتی نہیں ہے کہ یہاں دنیا کے بڑے سے بڑے امیر لوگ بستے ہیں، وہیں غریب لوگوں کی سب سے بڑی آبادی بھی یہیں رہتی ہے؟ آزادی کے ۷۵؍ سال بعد بھی کروڑوں لوگوں کو صاف پانی دستیاب نہیں ہے۔ کیا اس کوتاہی کے لیے ارباب اقتدار کی حب الوطنی پر سوال اٹھنے چاہیے؟

یوم آزادی کے موقع پر ترنگا لہرانے کی مخالفت کوئی بھی سچا ہندوستانی نہیں کر سکتا، مگر جس طرح سرکار نے ہر گھر ترنگا مہم کے بہانے خود کو سب سے بڑا دیش بھگت دکھلانے کی کوشش کی ہے، وہ اس کی غیر سنجیدہ سیاست کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگر ملک کو مضبوط بنانا ہے تو سب کے ساتھ انصاف کرنا ہوگا اور سب کی آنکھوں سے آنسو پوچھنے ہوں گے۔ لوگوں کو ذات، مذہب، جنس، زبان، علاقہ سے اوپر اٹھ کر یکساں حقوق دینے ہوں گے۔ دراصل جذبہ حب الوطنی کہنے سے پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ قومی پرچم کو دیکھ کر ابھر آتا ہے۔ کسی بھی قومی ریاست میں جب شہری کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اس ملک کا کرایہ دار نہیں بلکہ برابر کا حقدار ہے تو وہ ملک پر مر مٹنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بابا صاحب امبیڈکر نے بجا فرمایا ہے کہ سب سے بڑا ملک دوست وہ ہے جو سماج کی برائیوں کو دور کرنے کے لیے لڑتا ہے۔ یعنی محکوم طبقات کے حقوق کے لیے لڑائی لڑتا ہے اور سماج میں آزادی، مساوات اور اخوت کو فروغ دیتا ہے۔ اس لیے حب الوطنی کا درس دینا وقت کی بربادی ہے۔ سرکار کو چاہیے کہ وہ اپنی توانائی صرف علامتی چیزوں پر ضائع نہ کرے، بلکہ وہ لوگوں کی ترقی کے لیے سنجیدگی سے کوشش کرے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

آزادی کے ۷۵ سال اور مسلمان

مسلمان اس بات سے دکھی ہیں کہ ملک کی بیشتر سیاسی جماعتیں انہیں کھلنا ئک بنا کر اپنی ساری خامیوں پر پردہ ڈال رہی ہیں

ابھے کمار

گزشتہ دنوں بھارت کی آزادی کے ۷۵ ویں سال کے موقع پر ملک بھر میں جشن منایا گیا۔ ہر طرف لوگ قومی پرچم لیے ملک پر اپنی جان قربان کر دینے والے مجاہدین آزادی کو خراج عقیدت بھی پیش کیا۔ یہ موقع تھا جب لوگوں نے ملک کے حالات پر بھی سوچا۔ خاص کر محکوم اور اقلیتی سماج نے اپنے حالات اور مسائل پر بات چیت کی۔ اہم سوال یہ تھا کہ ان سالوں میں محکوم طبقات کو کیا حاصل ہوا؟ دلت، آدیواسی اور دیگر مظلوم طبقات کی طرح مسلمان بھی تعصب اور ناانصافی جھیل جا رہا ہے۔ مسلمان اس بات سے دکھی ہیں کہ ملک کی بیشتر سیاسی جماعتیں اسے کھلنا ئک بنا کر اپنی ساری خامیوں پر پردہ ڈال رہی ہیں۔

مسلم مخالف تعصب سسٹم میں کئی دہائیوں سے جڑیں پیوست کر چکا ہے۔ رفتہ رفتہ فرقہ فرقہ پرستی کا زہر ملک کی رگوں میں پھیلتا گیا۔ اب تو سیکولر پارٹیوں نے بھی مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حقوق پر بولنا بند کر دیا ہے۔ ملک کے مسلمانوں کے اندر یہ تاثرات یقین میں بدلتے جا رہے ہیں کہ وہ اس ملک میں ہندوؤں کے برابر نہیں ہیں۔ جہاں ملک میں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کا تقریباً ۱۴ فیصد ہیں، وہیں ان کی نمائندگی سرکاری نوکریوں، پارلیمنٹ اور اسمبلی اور دیگر سرکاری اداروں میں پانچ فیصد سے بھی کم ہے۔ کالج، یونیورسٹی میں ان کی تعداد ندارد ہے۔ کئی معاملوں میں ان کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہو گئی ہے۔ وہیں دوسری طرف، وہ اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ جیل میں قید کیے گیے ہیں۔ انہیں انسداد دہشت گردی کے جھوٹے کیس میں مسلسل پکڑا جا رہا ہے۔ یو اے پی اے کے کیس میں پھنسا کر مسلم نوجوانوں کا مستقبل برباد کیا جا رہا ہے۔ بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے مسلمانوں کو سالوں سال جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ حیرت اس امر پر ہے کہ پانچ سال، دس سال، اور کچھ معاملوں میں پندرہ سال کے بعد ایک دن ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جب ان کی رہائی ہوتی ہے تو سنگل کالم کی بھی ایک خبر نہیں بن پاتی ہے۔

مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کا اعتماد مین اسٹریم میڈیا سے کافی کم ہو گیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ملک کے حالات کو کشیدہ بنانے اور مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے میں گودی میڈیا آگے آگے رہتا ہے۔ وہیں میڈیا مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی پر شاید ہی کوئی خبر دکھاتا ہے۔ میڈیا مسلم خواتین کی حالت پر بڑا آنسو بہاتا ہے، مگر اس نے شاید ہی کبھی مسلم خواتین کی شرح خواندگی، روزگار، غربت پر کوئی مہم چلائی ہو۔ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی میں اس بات پر بڑا غصہ ہے کہ مسلم خواتین کی مظلومیت کا پوسٹر میڈیا اور سیاسی جماعتیں ہر طرف چسپاں کرنے میں آگے رہتی ہیں تاکہ مسلم کمیونٹی مزید ذلیل ہو، مگر کبھی ان خواتین کے ٹھوس مسائل پر وہ کچھ نہیں کہتے۔ تین طلاق کے معاملے میں مسلم مردوں کے لیے سزا کا قانون تو بن گیا مگر مسلم خواتین کی راحت اور بازآبادکاری کے لیے ایک روپیہ کا بھی بجٹ نہیں بنایا گیا۔

مسلمانوں کے اندر کچھ لوگ اب ایسا بھی سوچنے لگے ہیں کہ جو وہ جھیل رہے ہیں وہ ان کے بچے اب نہ جھیلیں۔ کچھ پیسے والے تو یہ چاہ رہے ہیں کہ ان کا بچہ پڑھ لکھ کر کسی اور ملک میں بس جائے۔ ان کو اس بات کا ڈر ستا رہا ہے کہ آزاد بھارت میں مسلم مخالف دنگوں کا سلسلہ آج بھی بند نہیں ہوا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ فساد اس ملک کا عام ہندو اور مسلمان نہیں کرتا، بلکہ اسے سیاسی مفاد کے لیے کرایا جاتا ہے، جس میں پولیس، انتظامیہ اور سرکار پوری طرح سے ملوث ہوتی ہے۔ لوگوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ فرقہ پرست پارٹی کے علاوہ سیکولر پارٹیوں نے بھی دنگا کرا کر انہیں برباد کیا ہے۔ تشدد کا یہ سلسلہ اب بھی رکا نہیں ہے۔ کہیں گوشت کے نام پر، تو کہیں ایک خاص نعرے پر، جو مسلمانوں کے مذہبی عقائد کے خلاف ہوتے ہیں، کے نام پر، اکثر مسلمانوں پر حملے ہو رہے

مسلمانوں کے اندر کچھ لوگ اب ایسا بھی سوچنے لگے ہیں کہ جو وہ جھیل رہے ہیں وہ ان کے بچے اب نہ جھیلیں۔ کچھ پیسے والے تو یہ چاہ رہے ہیں کہ ان کا بچہ پڑھ لکھ کر کسی اور ملک میں بس جائے۔ ان کو اس بات کا ڈر ستا رہا ہے کہ آزاد بھارت میں مسلم مخالف دنگوں کا سلسلہ آج بھی بند نہیں ہوا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں فساد اس ملک کا عام ہندو اور مسلمان نہیں کرتا، بلکہ اسے سیاسی مفاد کے لیے کرایا جاتا ہے، جس میں پولیس، انتظامیہ اور سرکار پوری طرح سے ملوث ہوتی ہے۔ لوگوں کو یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ فرقہ پرست پارٹی کے علاوہ سیکولر پارٹیوں نے بھی دنگا کرا کر انہیں برباد کیا ہے۔

ہیں۔ پولیس اور سرکار مظلوموں کو انصاف دلانے کے بجائے حملہ آوروں کو بچاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ سب باتیں مسلمانوں کو اندر سے ہلا رہی ہیں۔

مگر مایوسی کے اس عالم میں دور کہیں جلتا ہوا امید کا چراغ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ مسلمان سسٹم کی ناانصافی سے پوری طرح مایوس ہیں، مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر ایک بڑا اہم مثبت بدلاؤ بھی نظر آ رہا ہے۔ اس بدلاؤ کے پیچھے بلاشبہ نوجوان اور خاتون ہیں، وہ سابقہ قیادت کے مقابلہ میں زیادہ سرگرم نظر آ رہے ہیں اور ان کے اندر اپنے ملک اور ملت کے لیے بہت کچھ کرنے کا جذبہ پایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر، یوم آزادی کے موقع پر مجھے تاریخی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے آس پاس کے علاقے، جیسے اوکھلا، ابوالفضل، شاہین باغ، ذاکر نگر، جانے کا موقع ملا۔ میرے کچھ جے این یو کے ساتھی مدرسہ سے فارغ بچوں کے لیے خصوصی کوچنگ ان علاقوں میں چلاتے ہیں۔ کوچنگ میں فارغین مدرسہ کو جے این یو، جامعہ، دہلی یونیورسیٹی، اے ایم یو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد سینٹرل یونیورسیٹی اور دیگر ملک کے بڑے تعلیمی اداروں میں داخلہ ٹیسٹ پاس کرنے کے لیے خصوصی تیاری کرائی جاتی ہے۔

۱۵ اگست کے موقع پر مجھے مذکورہ کوچنگ میں منعقد ایک تقریب میں مدعو کیا گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو بڑی پریشانی محسوس ہوئی کہ اتنی چھوٹی سی جگہ میں یہ بچے کیسے پڑھائی کرتے ہیں۔ مگر تھوڑی دیر بعد، جب میں نے ان بچوں کے چہروں پر حوصلہ اور امید کی روشنی دیکھی، تو میرے دل کو بہت سکون ملا۔ نوجوان بچے بڑے جوش کے ساتھ، اپنے ہاتھوں میں قومی پرچم اور غبارے لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ کچھ آپس میں بات کر رہے تھے، تو کچھ دیگر مٹھائی کھانے میں مصروف تھے۔ بعد میں کوچنگ کے ذمہ داروں نے بتایا کہ یہاں پر پڑھنے والے زیادہ تر بچے غریب گھر سے آتے ہیں۔ بہت سے بچوں کے پاس کتاب خریدنے اور کمرہ کرایہ پر لینے کے لیے پیسے نہیں ہوتے ہیں۔ مگر ان کے اندر کچھ کرنے کا بڑا جنون ہے۔ مدرسہ کے یہ بچے بڑے ذہین ہیں۔ وہ بہت ساری زبانوں پر قدرت رکھتے ہیں۔ عربی، اردو، ہندی اور انگریزی وہ بول سکتے ہیں۔ ان کے اندر سوشل سائنس پڑھنے کا بڑا شوق پایا گیا۔ ان میں سے بہت سارے بچے یو پی ایس سی اور دیگر امتحانات کی تیاری کر کے ملک کی تعمیر میں اہم رول ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے دیگر صحافی اور ٹیچر بن کر معاشرہ کے لیے مشعل راہ بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔

جب میں کوچنگ سے باہر نکلا تو پاس میں ہی مسلم ملی رہنماؤں کی ایک بڑی میٹنگ چل رہی تھی۔ میٹنگ کا عنوان تھا 'بھارت کی آزادی کے ۷۵ سال اور آئیڈیا آف انڈیا'۔ اس پروگرام میں مقررین نے مسلم مسائل سے جڑی بہت ساری باتیں کیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مگر اس میٹنگ سے امید کا ایک سرچشمہ بھی پھوٹتا ہوا نظر آیا۔ بہت سارے مقررین نے کہا کہ مسلمان بھارت جیسے ایک سیکولر اور جمہوری ملک میں رہتے ہیں، جس کا آئین سب کو برابری کے حقوق دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کے اوپر حملے ہو رہے ہیں، مگر ظلم کے شکار دلت، آدی واسی، اور دیگر محروم طبقات بھی ہیں۔ میٹنگ کے دوران جس بات پر بار بار زور دیا گیا وہ یہ کہ مسلمان اپنے مسائل کے ساتھ ساتھ دیگر مظلوم طبقات کے مسائل پر بھی ساتھ آئیں اور آپس میں اتحاد پیدا کریں۔ سی اے اے کے خلاف مسلم نوجوانوں کی قیادت میں جو تاریخی اور انقلابی تحریک چلائی گئی، اسے بھی مثال کے طور پر پیش کیا گیا۔ وہاں موجود لوگوں کو اس بات کا یقین دلایا گیا کہ انہیں ڈرنے کی ضرورت بالکل بھی نہیں ہے۔ اس ملک میں مسلمان ۲۰ کروڑ ہیں، اتنی بڑی آبادی کو دنیا کی کوئی طاقت صفحہ ہستی سے نہیں مٹا سکتی۔ اس لیے مسلمانوں کو ڈر اور خوف کو ترک کر ملک اور ملت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرنا چاہیے۔ ان باتوں کو سن کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ رات کے بعد دن ضرور آتا ہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر سسٹم کے تئیں مایوسی پائی جاتی ہے، تو ان کے اندر امید کے چراغ بھی جل رہے ہیں۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

آئین مخالف کون ہے؟

کل کے آئین مخالف آج ملک کے سب سے بڑے محب وطن بن گئے ہیں اور خود کو آئین کے چیمپئن کہہ رہے ہیں

ابھے کمار

ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے سابق گیند باز امت مشرا نے ۲۲ را پریل کو ایک ٹویٹ کیا اور مسلمانوں کا نام لیے بغیر کہا ہے کہ مسلمان آئین کا احترام نہیں کرتے ہیں۔ ۲۲را پریل کے روز سابق لیگ اسپن مشرا لکھتے ہیں کہ ’میرا ملک، میرا خوبصورت ملک، دنیا میں سب سے عظیم ملک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر ایسا تبھی ہوسکتا ہے، جب کچھ لوگوں کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ ہمارے ملک کا آئین ایسی کتاب ہے جس کی تعمیل سب سے پہلے ہونی چاہیے۔‘

اتر پردیش سے تعلق رکھنے والے امت مشرا نے ۲۲ ٹیسٹ میچ کھیلے ہیں، جبکہ ۳۶ ایک روزہ میچ میں انہوں نے شرکت کی ہے۔ بطور کھلاڑی وہ بین الاقوامی سطح پر بہت کامیاب نہیں ہو پائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا کریئر چھوٹا ہے۔ مگر اُن دِنوں مشرا جی پر میڈیا کافی توجہ دے رہا ہے۔ شاید اتنے میڈیا اسٹیشن تو اُن کو تب بھی نہیں ملے تھے جب وہ بھارتی ٹیم کا حصہ تھے۔

بہت ممکن ہے کہ مشرا جی بی جے پی کے بیانیہ کو دانستہ طور پر بڑھا رہے ہوں؟ کیا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سیاست میں بھگوا جماعت کی ٹیم کی طرف سے ایک نئی سیاسی پارٹی کی شروعات کرنے کا من بنا چکے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب تو انہیں کے پاس ہے۔ مگر یاد رہے کہ مشرا جی کا یہ ٹویٹ بھارتی ٹیم کے سابق آل راؤنڈر عرفان پٹھان کے ٹویٹ کے فوراً بعد آیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ پٹھان کو بولڈ کرنے کے لیے امت مشرا کو بھگوا جماعت نے گیند تھما دی ہے۔ سب سے افسوس کہ بات یہ ہے کہ جس کھلاڑی کے اندر گیند کو ٹرن دینے کی صلاحیت ہے، وہ اب فیکٹ اور تاریخ کو گھمانے کے کام میں لگ گیا ہے۔

اس مشکل بھرے حالات میں عرفان پٹھان نے ہمت سے کام لیا۔ انہوں نے ایک سچے انسان اور ایک محب وطن کے طور پر ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کی۔ عرفان پٹھان کو یہ بات بخوبی معلوم ہوگی کہ سرکار کے بیانیہ کے خلاف بولنا کتنا جوکھم بھرا کام ہے۔ مگر عرفان نے اپنے ضمیر کی آواز سنی اور انہوں نے وہی کیا جو ایک سچے ہندوستانی سے توقع ہونی چاہیے۔ عرفان نے ۲۱ را پریل کو ٹویٹ کرتے ہوئے مظلوموں کی ترجمانی کی اور کہا کہ ’میرا ملک، میرے خوبصورت ملک میں ایک عظیم ملک بننے کی صلاحیت ہے۔ مگر ـــ‘ عرفان پٹھان کا یہ ٹویٹ ملک کے حالات کو بیان کر رہا تھا۔

ملک میں بڑھ رہے فرقہ پرستی کے واقعات اور مسلمانوں کے خلاف بڑھ رہی اشتعال انگیزی، نفرت اور تشدّد کے معاملوں کے خلاف عرفان کی طرح ملک کا سیکولر اور انصاف پسند طبقہ بہت ہی افسردہ ہے۔ لوگوں میں غم اور غصہ اس بات سے بھی بڑھ گیا ہے کہ پولیس، انتظامیہ اور سرکار شر پسندوں کو پکڑنے کے بجائے الٹا مظلوم مسلمانوں کو پکڑ کر جیل بھیج رہی ہے اور غریب محنت کش مسلمانوں کو بنگلہ دیشی، روہنگیا اور دہشت گرد کہہ کر نہ صرف بدنام کر رہی ہے، بلکہ آئین کی روح کے خلاف جا کر اُن کے گھروں کو بلڈوزر سے دن کے اجالے میں اور میڈیا کے کیمرے کے سامنے توڑ رہی ہے۔

ملک کے بہت سارے حصوں میں دانستہ شر پسند عناصر نے رام نومی کا جلوس نکالا۔ ایک سازش کے تحت جلوس کو مسلم علاقوں اور اُن کے مذہبی مقامات سے گزارا گیا۔ اتنا ہی نہیں کئی بار مسلمانوں کو گالیاں دی گئیں اور تلوار کو جلوس کے دوران نچایا گیا۔ پھر شر پسندوں نے مسلمانوں اور اُن کے مذہبی مقامات پر پتھر بھی چلائے۔ کوشش پوری تھی کہ مسلمانوں کو کچھ کرنے پر آمادہ کیا جائے اور پھر اس کو کچلنے اور امن کو بحال کرنے کے نام پر مسلمانوں کو مزید مارا اور پیٹا جائے۔ انتخابات سے قبل فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھنے کے مقصد سے یہ سب ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکار مسلمانوں کے اوپر ہو رہے حملوں پر خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔

> ملک میں بڑھ رہے فرقہ پرستی کے واقعات اور مسلمانوں کے خلاف بڑھ رہی اشتعال انگیزی، نفرت اور تشدّد کے معاملوں کے خلاف عرفان کی طرح ملک کا سیکولر اور انصاف پسند طبقہ بہت ہی افسردہ ہے۔ لوگوں میں غم وغصہ اس بات سے بھی بڑھ گیا ہے کہ پولیس، انتظامیہ اور سرکار شر پسندوں کو پکڑنے کے بجائے الٹا مظلوم مسلمانوں کو پکڑ کر جیل بھیج رہی ہے اور غریب محنت کش مسلمانوں کو بنگلہ دیشی، روہنگیا اور دہشت گرد کہہ کر نہ صرف بدنام کر رہی ہے۔

عرفان کا بیان کسی کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے والا بھی نہیں ہے۔ انہوں نے تو کسی کا کھلے طور پر نام بھی نہیں لیا۔ اشارے اشارے میں انہوں نے بڑی بات کہہ ڈالی کہ اگر ہم نے باہمی لڑائی اور جھگڑے کو دور کر دیا اور سب سچے طریقے سے کام کرنے لگیں تو اپنا پیارا ملک صحیح معنوں میں دنیا کا ایک عظیم ملک بن جائے گا۔ اس بات کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ اگر ہم دھرم اور مذہب کے نام پر یوں ہی لڑتے رہے تو اس سے ملک کو کمزور ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ یہ بات تو معمولی انسان بھی جانتا ہے کہ اتحاد میں طاقت ہوتی ہے۔ مگر یہ بات ناقابل فہم ہے کہ عرفان کی بات امت مشرا کو اتنی بری کیوں لگ گئی کہ وہ ٹویٹ کرنے پر مجبور ہو گئے؟

آج عرفان کے بہانے مسلمانوں کو نصیحت دینے والے مشرا جی اصل مواقع پر خاموش کیوں رہتے ہیں؟ انہوں نے اس وقت تو ٹویٹ نہیں کیا تھا جب دہلی فسادات میں مسلمانوں کو مارا جا رہا تھا؟ مشرا جی کا کوئی ردِعمل تب بھی نہیں آیا تھا جب اخلاق کو ہجوم مار کر رہا تھا؟ ان دنوں جب ملک نفرت اور اشتعال انگیزی کی آگ میں جل رہا ہے، اس کے خلاف مشرا جی نے ابھی تک کچھ نہیں لکھا ہے۔ آخر کیوں امت مشرا کو عرفان کی بات اتنی خراب لگی کہ وہ اس کے رد کرنے کے لیے آ گئے؟ آخر کیوں عرفان کے ٹویٹ کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے ایسی باتیں کہہ ڈالیں جن سے فرقہ پرستوں کو تقویت ملتی ہے؟

دراصل مشرا جی کا ٹویٹ اسلاموفوبیا کی ایک مثال ہے۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت اور اُن کے بارے میں غلط فہمی کا ہی دوسرا نام اسلاموفوبیا ہے۔ اسلاموفوبیا کے جراثیم سے بیمار شخص کو یہ لگتا ہے کہ مسلمان سیکولر نہیں ہوتے۔ اُن کے دماغ میں مسلمانوں کے حوالے سے بہت زیادہ تعصّب بھرا رہتا ہے، جیسے مسلمان تو جمہوریت اور سیکولر آئین کے خلاف ہوتے ہیں، وہ تو مذہب کی قید سے آزاد ہو ہی نہیں سکتے، وہ سیکولر اور ریشنل بھی نہیں ہو سکتے، وہ تو اب بھی عہد وسطیٰ میں جیتے ہیں اور ان کے اندر جدید خیالات کا فقدان ہوتا ہے، وہیں اکثریتی طبقہ مساوات، آزادی، جمہوریت میں یقین رکھتا ہے، جہاں مسلمان تنگ نظر ہوتا ہے اور وہ صرف اور صرف اپنے مذہب سے رہنمائی پاتا ہے اور ان کے دلوں میں آئین کے تئیں کا کوئی احترام نہیں ہوتا، وہیں اکثریتی سماج قانون کی راہ پر چلتا ہے۔

جس طرح اسلاموفوبیا سے متاثر شخص یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان صرف اور صرف اپنے مذہب اور اسلامی قانون کو مانتے ہیں اور ان کے دلوں میں ملک کے قانون اور یہاں کے آئین کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے، اسی طرح امت مشرا نے عرفان پٹھان کی باتوں کو کاٹتے ہوئے مسلمانوں کو آئین مخالف کہہ ڈالا۔ مشرا جی نے جو بات کہی وہی بات ملک کے فرقہ پرست ہمیشہ کہتے آ رہے ہیں کہ اقلیتیں اکثریت اور ملک کی دشمن ہیں۔ فرقہ پرست ہمیشہ ماحول بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اکثریتی سماج قانون کو مانتا ہے اور سیکولر ہے، وہیں دوسری طرف اقلیتی سماج مذہب کی زنجیر میں قید ہے اور وہ سیکولر نہیں ہو سکتا۔ مشرا جی کو یہ کون بتلائے کہ ملک کے لیے قربانی دینے والوں میں مسلمان کسی دوسرے سماج سے کم نہیں تھے۔ فسادات کے دوران جانیں اُن کی سب سے زیادہ گئیں، مگر ہمیشہ صبر و تحمل سے کام لیا ہے اور مشکل سے مشکل لمحات میں ہم آہنگی کے جذبہ سے کام لیا اور قانون کا احترام کیا۔

مشرا جی کو یہ کون سمجھائے کہ ملک کے آئین کی سب سے بڑی بے حرمتی ۶ ر دسمبر ۱۹۹۲ کو ہوئی، جب دن کے اجالے میں ایک قدیم مسجد کو منہدم کر دیا گیا تھا؟ کیا مشرا جی یہ نہیں جانتے ہیں کہ بھگوان رام کا نام لے کر سیاسی مفاد کو پورا کرنے والے کون لوگ تھے، جنہوں نے آئین کے ساتھ غداری کی؟ وہ وہی لوگ ہیں جو ایک طویل وقت تک ہندوستانی آئین کو بیرونی نظریات پر مبنی دستور کہہ کر اُسے ٹھکراتے رہے۔ کل کے آئین مخالف آج ملک کے سب سے بڑے محب وطن بن گئے ہیں اور خود کو آئین کے چیمپئن کہہ رہے ہیں۔ دراصل ملک میں آئین مخالف مسلمان نہیں۔ صحیح معنوں میں فرقہ پرست ہیں جو لوگوں کو دھرم کے نام پر لڑاتے اور غریبوں کا حق مارتے ہیں۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

Inquilab 26.4.22

اسلام اور جمہوریت

ابھے کمار

اسلام کے بارے میں بہت ساری غلط فہمیوں کو پیدا کرنے میں برطانوی امریکی مؤرخ برنارڈ لیوس کا اہم کردار رہا ہے۔ سال ۲۰۱۸ میں ان کا انتقال ایک سو ایک سال کی عمر میں ہوا۔ اپنے طویل تعلیمی کریئر کے دوران، اس مستشرق مصنف نے لاتعداد کتابیں لکھی ہیں اور ان کے سینکڑوں مضامین آج بھی پڑھے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں کو امریکی اقتدار بہت غور سے پڑھتا تھا اور ان پر عمل بھی کرتا تھا۔ آسان لفظوں میں کہیں تو برنارڈ لیوس نے اسلام کا مطالعہ ارباب اقتدار اور طاقتور لوگوں کے نقطہ نظر سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان جیسے ایک باصلاحیت محقق سچائی کو بیان کرنے میں قاصر رہا ہے۔ اس نے اسلام کے تئیں پوری دنیا میں کنفیوژن اور اس کے خلاف تعصب پیدا کیا ہے۔ یاد رہے کہ تہذیبوں کے مابین تصادم کا مفروضہ بھلے ہی سموئیل پی ہنٹنگٹن نے دیا ہو، مگر اس کے پیچھے بھی برنارڈ لیوس کی منفی سوچ کام کر رہی تھی۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد، دنیا میں جس طرح سے اسلام کو نشانہ بنایا گیا ہے اور اسے تشدد اور دہشت گردی سے جوڑا گیا ہے اس میں برنارڈ لیوس اور ان کے شاگرد مصنفوں کا بڑا رول رہا ہے۔ برنارڈ لیوس کی تحریروں نے بھی اسلام کو لبرل جمہوریت کے خلاف کھڑا کیا ہے اور مسلم معاشرے کے رجعت پسندانہ عناصر کو اس سماج کا ترجمان بتلایا ہے۔

گہرائی سے دیکھا جائے تو برنارڈ لیوس اور ان جیسے مستشرقین کی تحریروں کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ دین اسلام کو ایک منفرد مذہب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان میں یہ بتانے کی ہمت نہیں ہے کہ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے بنیادی اصول بہت حد تک ملتے جلتے ہیں۔ اسی طرح مسلم اور غیر مسلم معاشرے میں روشن خیال اور رجعت پسند دونوں طرح کے گروپ پائے جاتے ہیں، مگر برنارڈ لیوس کو مسلم معاشرے میں مذہبی جنون کے علاوہ اور کچھ نہیں دکھتا۔ انہیں وہاں مزدور، کسان اور خواتین کی لڑائیاں بالکل بھی نہیں دکھتیں ہیں۔ مسلم معاشرے کے اندر مساوات کے لیے چل رہی لڑائیوں سے بھی انہیں کوئی خاص مطلب نہیں ہے۔ استعماری طاقتوں نے مسلم ممالک کا کس حد تک استحصال کیا ہے اور جمہوری اقدار پر چوٹ کی ہے، یہ برنارڈ لیوس کی تحریروں میں پوری طرح سے غائب ہے۔ برنارڈ لیوس اور ان جیسے دیگر مستشرقین کا ہدف یہی ہوتا ہے کہ وہ مسلم معاشرے کو یہودیت، عیسائیت اور مغربی تہذیب کے بگاڑ کے طور پر پیش کریں اور ان کے مابین موجود رائی جیسے اختلاف کو پہاڑ جیسا بنا کر پیش کریں۔ ایک مخصوص ایجنڈے پر کام کرنے والے مصنفین کبھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان تنازعہ کی تاریخ بہت ہی چھوٹی ہے، جبکہ ان کے درمیان تعاون، ہم آہنگی کی تاریخ بہت لمبی ہے۔ دکھ کا عالم یہ ہے کہ جس فلسطین میں یہودی ارباب اقتدار مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھ کر حملہ کر رہے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھنا چاہتے کہ ان کے ساتھ مسلمانوں نے ہمیشہ سے دوستانہ سلوک کیا ہے اور مسلم ممالک میں انہیں تحفظات ملے ہیں، جبکہ ان کے خلاف ظلم مغربی ممالک میں ہوئے ہیں۔

اسی تعصب کی وجہ سے برنارڈ لیوس نے لبرل جمہوریت اور اسلام کے بیچ اختلاف دکھایا ہے۔ فروری ۱۹۹۳ء میں انہوں نے 'دی اٹلانٹک منتھلی' جرنل میں 'اسلام اینڈ لبرل ڈیموکریسی' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ اپنی تحریر کی شروعات کرتے ہوئے لیوس نے کہا کہ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو ترکی کو چھوڑ کر باقی مسلم ممالک میں لبرل جمہوریت نہیں پائی جاتی ہے۔ اپنی دلیل کو ثابت کرنے کے لیے لیوس نے مسلم معاشرے میں اسلامی شدت پسندوں کو ہی پورے معاشرے کا ترجمان بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کہا کہ ایسے عناصر کا ماننا ہے کہ مسلمانوں کو ہر قسم کے مغربی نظریات جیسے سوشلزم، نیشنلزم اور لبرل ازم کو ترک کر دینا چاہیے اور انہیں غیر مسلمانوں کے قانون اور اداروں کو اپنانے سے گریز کرنا چاہیے۔

لیوس نے مزید کہا کہ ایسے شدت پسند جمہوریت کو بھی اسلامی معاشرے کے لیے موزوں نہیں سمجھتے۔ یہ ممکن ہے کہ اسلامی معاشرے میں کچھ ایسے افراد یا کچھ ایسی تنظیمیں ہوں، جن کی رائے جمہوریت کے خلاف ہو۔ مگر ایسے عناصر تو ہر سماج میں پائے جاتے ہیں، جو یہ نہیں چاہتے کہ عوام کو بااختیار بنایا جائے۔ خود مغربی دنیا میں انتہائی دائیں بازو کے گروپوں کی طاقت بڑھ رہی ہے، جو جمہوریت اور مساوات کے مخالف ہیں۔ مگر کوئی بھی ایماندار اسکالر ایسے عناصر کو مغربی ممالک یا تہذیب کا نمائندہ نہیں مانتا۔ مگر برنارڈ لیوس اور ان کے چیلوں نے اسلامی معاشرے کے سب سے شدت پسند عناصر کو ہی اسلام کا ترجمان بنا کر پیش کیا ہے۔ لیوس کی دلیل کی دوسری بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جمہوریت کے فروغ کے لیے صرف اور صرف 'یہودی عیسائی مذہب اور یونانی- رومن ریاستی دستکاری اور قانون' کو کریڈٹ دینا چاہتے ہیں۔ آسان لفظوں میں کہیں تو دنیا بھر میں جو کچھ بھی ترقی ہوئی ہے وہ یہودی، عیسائی، یونانی اور رومی معاشرے کے بطن سے ہوئی ہے۔ مگر تاریخی سچائی یہ ہے کہ انسانی ترقی میں پوری دنیا کی خدمات رہی ہیں۔ چین، عرب، ہندوستان، افریقہ اور لاطینی امریکہ جیسے علاقوں سے بھی بہت سارے مثبت کام ہوئے ہیں۔ برنارڈ لیوس کی تنگ نظری کا عالم یہ ہے کہ وہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی خدمات کو سراہنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ بات ہائی اسکول میں پڑھنے والے بچوں کو بھی معلوم ہے کہ یہودیت اور عیسائیت کی جائے پیدائش ایشیا ہی رہی ہے۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے مابین ہم آہنگی زیادہ اور اختلاف کم ہیں۔ جو اختلاف ابھر کر سامنے بھی آئے ہیں، ان کا تعلق سیاست سے زیادہ ہے اور دین سے کم ہے۔ غیر جانبدار مؤرخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ جس یونان کو مغربی تہذیب کا گہوارا کہا جا رہا ہے، اسے ایک وقت تک افریقہ کا حصہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے مراسم ایشیا کے ممالک سے زیادہ تھے۔ جس نشاۃ ثانیہ کو یورپ کی جدیدیت اور ترقی کا پہلا باب سمجھا جاتا ہے، اس میں بھی مسلم مصنفوں کا بہت بڑا رول ہے۔ انہوں نے ہی یونانی فلسفیوں کی تحریروں کو عربی میں ترجمہ کر کے محفوظ رکھا تھا، جس کا ترجمہ کر کے یورپی مصنف ان کو دوبارہ سے جان سکے۔ میرا یہ ہرگز بھی کہنا نہیں ہے کہ دنیا میں ساری ترقی مسلم ممالک میں ہوئی یا سب کچھ مثبت ایشیا میں ہوا۔ میری برنارڈ لیوس کے شاگردوں سے یہی اختلاف ہے کہ وہ ایک مخصوص سیاست کے زیر اثر دنیا کے ایک حصے کو مہذب، جمہوری، لبرل اور روشن خیال دکھلاتے ہیں اور باقی دنیا کو غیر مہذب اور جنونی کہہ کر بدنام کرتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جمہوریت وقت کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ یونان میں جو جمہوری نظام دو ہزار سال سے پہلے پایا جاتا تھا، وہ آج کے امریکی اور برطانوی جمہوریت سے کافی الگ ہے۔ ہندوستان جیسے ملک جو دو سو سالوں سے نوآبادیاتی نظام کا شکار رہا ہے، وہاں بھی جمہوریت کا تجربہ کامیاب رہا ہے۔ بھارت کی جمہوریت نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ صنعتی ترقی، خواندگی کی بلند شرح، جمہوریت کی شرط نہیں ہے، بلکہ مساوات کی جستجو ہی جمہوریت کی کامیابی کی اصل قوت ہے۔ مزدوروں اور خواتین کی تحریکوں نے جمہوریت کو مضبوط کیا ہے۔ ان کی لڑائیوں کا اثر تھا کہ ووٹ دینے کے حقوق سب کو فراہم کیے گئے، جو کل تک صرف مالدار لوگوں تک ہی محدود تھے۔ آج بھی جمہوری نظام میں سب کچھ اچھا نہیں چل رہا ہے اور اس کے سر پر پیسے والے اور اعلیٰ ذات کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے کمزور طبقات اور اقلیتوں کے حقوق مارے جا رہے ہیں۔ مسلم معاشرے میں بھی جمہوری طاقتیں بہت مضبوط ہیں، مگر دنیا کی استعماری طاقتیں نہیں چاہتیں کہ مسلم معاشرے سے کوئی زمینی اور عوامی لیڈر ابھرے۔ یہ وجہ ہے کہ مغرب کی بڑی طاقتیں ہمیشہ آمرانہ طاقتوں کو پس پردہ حمایت دیتی ہیں تاکہ وہ ان کے مفادات کو پورا کر سکیں۔ مؤرخ برنارڈ لیوس اور ان کے شاگردوں کی تنگ نظری ان مسلم اور اسلام مخالف مفروضوں کی اہم وجہ ہے۔ ■

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)
debatingissues@gmail.com

مسلم مخالف تعصب کیسے کام کرتا ہے؟

تاریخی حقائق کی روشنی میں چشم کشا تحریر

ابھے کمار

مسلم مخالف تعصب کیا ہے اس کے اہم اجزاء کیا ہیں مسلمانوں اور ان کے دین کے خلاف کیسے پروپیگنڈا پھیلایا جاتا ہے ان کے خلاف کیسے تعصب کا ماحول تیار کیا جاتا ہے کیسے لوگوں کے دل ودماغ میں ان کے خلاف کٹرپن اور نفرت بھر دی جاتی ہے؟ کیا مسلم مخالف تعصب کی کوئی فکری تاریخ بھی ہے؟ ان سوالوں کا جواب کسی ایک مضمون میں سمیٹ لینا ممکن تو نہیں ہے پھر بھی کچھ پہلوؤں کو سمجھنے کی ایک چھوٹی سی کوشش یہاں کی جا رہی ہے۔

حالیہ دنوں میں جس طرح ملک کی سیاست فرقہ وارانہ ڈسکورس کی طرف مبذول ہوئی ہے وہ کافی تشویشناک ہے۔ سیکولرازم اور اقلیتی حقوق جیسے آئینی اقدار پر گہری چوٹ کی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کو مزید حاشیہ پر دھکیلا جا رہا ہے۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔ کیونکہ مسلم مخالف جذبات ملک کے بڑے حصے میں پھیل چکے ہیں۔ دہلی انتخابات اور پھر مسلم مخالف فسادات کے بعد حالات نارمل ہوئے بھی نہ تھے کہ تبلیغی جماعت کا تنازعہ پیدا کر دیا گیا اسی لیے کشیدگی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ رہی ہے۔ اب تو مسلمانوں کا معاشی بائیکاٹ کرنے کی بھی خبریں آ رہی ہیں۔ نفرت کا زہر کس قدر لوگوں کی رگوں میں سرائیت کر چکا ہے اس کا اندازہ ان دو مثالوں سے آپ لگا سکتے ہیں۔ کچھ روز پہلے سوشل میڈیا پر میں نے اپنی ایک تصویر پوسٹ کی تھی جس پر ایک نے بڑا ہی نفرت انگیز کمینٹ کیا، مجھے خبر دار کیا گیا کہ میں تبلیغیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھوں! مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ میری تصویر سے تبلیغی جماعت کا کیا رشتہ ہے؟ ایک دیگر پوسٹ میں مَیں نے حکومت سے اپیل کی کہ وہ اپنی توجہ تبلیغی جماعت سے ہٹا کر غریبوں اور مزدوروں کی فاقہ کشی اور دیگر مسائل پر مرکوز کرے۔ اس پر ایک شخص نے نا اتفاقی ظاہر کی اور کہا کہ حکومت ان کو راشن پانی کیوں دے جبکہ تبلیغی جماعت کے لوگ "تھوکتے" پھرتے ہیں؟

ان دونوں واقعات نے مجھے بہت مایوس کیا۔ اسی تناظر میں مَیں نے سوچا کہ کیوں نہ مسلم مخالف تعصب پر کچھ لکھوں۔ پریشانی کا سبب یہ ہے کہ بھگوا طاقتوں کا مسلم مخالف نظریہ سماج میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔ بہت سارے لوگ بھی جانے انجانے فرقہ پرستوں کی زبان بول رہے ہیں۔ سوچیے کہ کیسے ایک بڑی تعداد، جن میں آپ کے ہمارے پڑوسی بھی شامل ہیں، مسلم مخالف وائرس سے متاثر ہو جاتے ہیں؟ یہ وائرس ان کی سوچ کو بھی آلودہ کر رہا ہے جو ہندو فرقہ پرست طاقتوں کے مخالف سمجھے جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف پھیلے اس تعصب، نفرت اور کٹر پن کو سوشل سائنس کی اصطلاح میں "اسلامو فوبیا" (Islamophobia) کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف "فوبیا"۔ کیمبرج لغت میں فوبیا کے معنی شدید خوف یا ناپسندیدگی بتائے گئے ہیں۔ یہ خوف یا ناپسندیدگی کسی بھی چیز کے خلاف ہو سکتی ہے۔ مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس خوف اور تعصب کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہوتی بلکہ اسے تصور کر لیا جاتا ہے۔ اسے مسلسل پروپیگنڈے اور غلط فہمی کی مدد سے عوام کے دل ودماغ میں بٹھا دیا جاتا ہے اور پھر ہماری سوچ اور فکر بھی جانے انجانے میں اس سے آلودہ ہو جاتی ہے۔

جان ایل ایس اسپوسیٹو (Esposito) نے اپنی کتاب "دی چیلنجز آف پلورل ازم ان دی ٹوینٹی فرسٹ سنچری" (۲۰۱۱) کے مقدمہ میں اسلامو فوبیا کی اصطلاح کی تعریف پیش کی ہے۔ ۱۹۹۷ کی برطانوی رنی مڈ (Runnymede) رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "اسلامو فوبیا در اصل مسلمانوں اور اسلام کے خلاف خوف، نفرت اور عداوت" ہے۔ اسلامو فوبیا کو بنائے رکھنے میں بند پڑے خیالات (closed views) کا ایک چین کام کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں کے تئیں منفی اور حقارت آمیز سٹیریوٹائپز (stereotypes) خیالات کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا آغاز ۱۹۸۰ کی دہائی کے آخر اور ۱۹۹۰ میں ہوا جبکہ یوروپ اور امریکہ میں اسلامو فوبیا خطرناک طریقے سے پھیلنے لگا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹرس پر ہوئے حملوں کے بعد سے اسلامو فوبیا تیزی سے پھیلنا شروع ہو گیا۔ مسلمانوں کی مغربی ممالک میں ہجرت، ایرانی انقلاب، طیاروں کے یرغمال بنائے جانے کے واقعات نے اسلامو فوبیا کو بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

۲۰۰۴ میں اقوام متحدہ کے صدر کوفی عنان نے بھی اسلاموفوبیا پر گہری تشویش کا اظہار کیا تھا۔ "کنفرنٹنگ اسلاموفوبیا" کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "ستمبر ۱۱ کے روز امریکہ میں رونما ہوئے حملے کے بعد، مغرب ممالک میں رہنے والے مسلمانوں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ان کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے اور وہ تعصب اور ہراسانی کے بھی شکار ہو رہے ہیں"۔ پھر سال ۲۰۰۷ میں اقوام متحدہ کی حقوقِ انسانی کی تنظیم کے ہائی کمشنر لوئیس آربر نے بھی یہ بات تسلیم کی کہ عام مسلمانوں کے خلاف یوروپ میں تعصب بڑھا ہے۔

یقیناً مغربی دنیا میں مسلمان اپنے آپ کو ۱۹۸۰ اور ۱۹۹۰ کے بعد غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔ ان کی شبیہ مسخ کر دی گئی اور ان کو وہاں کے سماج کے لیے خطرہ سمجھا جانے لگا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک غیر مسلم کسی جرم میں گرفتار ہوتا تو اس کے جرم کو ایک فرد کی غلطی تک ہی محدود رکھا جاتا تھا۔ مگر جب کوئی مسلمان اسی طرح کے جرم میں گرفتار ہو جاتا تو اس واقعے کو پورے اسلام اور مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے پھر میڈیا اس پر خوب ہنگامہ برپا کرتا ہے۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسلامو فوبیا ڈسکورس میں مسلمانوں کے اندر موجود تنوع کو در کنار کر کے ان کی ایسی امیج پیش کی جاتی ہے گویا دنیا کے کروڑوں مسلمان ایک ہی ہیں ان کے اندر کوئی فرق نہیں ہے اور سب ایک ہی طرح سے سوچتے اور عمل کرتے ہیں۔ اس کے لیے انگریزی میں ایک اصطلاح homogenization استعمال ہوتی ہے۔ اس کے تحت گروپس، فرقے یا ملت کے سارے لوگوں کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا جاتا ہے۔ سب کو یکساں بنا کر پیش کیا جاتا ہے یعنی سب کو ملا کر ایک کر دیا جاتا ہے۔ خیال رہے کہ مساوات کا نظریہ بھی لوگوں کے درمیان طبقاتی خلیج کو پاٹتا ہے اور لوگوں کو برابر تصور کرتا ہے مگر homogenization کا نظریہ منفی ہے۔ یہ کسی سماج، مذہب، نسل اور ذات میں پیدا ہونے والے تمام لوگوں کو ایک رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گویا سارے افراد ایک جیسے سلوک کے حق دار ہیں۔ اسلامو فوبیا کے زیر اثر بہت سارے لوگ ایک مسلمان کی غلطی کے لیے سارے مسلمانوں کو قصوروار سمجھتے ہیں اور وہ سب کو خطرہ تصور کرنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ پھر یہ غلط فہمی دل ودماغ میں بیٹھ جاتی ہے کہ سارے مسلمان "مجرم" ہیں۔

اس مسئلے پر پاکستانی نژاد برطانوی شہری اور انگریزی کے مشہور ناول نگار محسن حامد نے ایک اہم مضمون ۲۲ مئی ۲۰۱۳ کو "Islam is not monolithic" کے عنوان سے "گارڈین" میں لکھا۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ اسلامو فوبیا مسلمانوں کے اندر موجود تنوع کو در کنار کر دیتا ہے اور ایسا تاثر پیش کرتا ہے گویا مسلمانوں کی کمیونٹی کا تشخص سب پر بھاری ہے۔ اسلامو فوبیا نے مسلمانوں کے اندر پائے جانے والی ساری تکثریت اور تنوع کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ وجہ ہے کہ مسلمانوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کی وفاداری ملک سے نہیں بلکہ ان کی امت سے ہوتی ہے۔

محسن حامد نے جس بات پر مایوسی ظاہر کی ہے اس کا تعلق کہیں نہ کہیں مغربی اسکالرز کی متعصبانہ تحریر سے ہے، جنہوں نے مسلم معاشرے کی شبیہ کو بگاڑنے میں بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔ اس موضوع پر انگریزی اور تقابلی ادب کے ممتاز اسکالر ایڈورڈ سعید نے اپنی تحریروں میں بہت ہی مفصل اور اہم گفتگو کی ہے۔ ۱۹۷۸ میں مطبوعہ "Orientalism" (استشراقیت) ان کی شاہکار تخلیق ہے اس میں انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ زمانہ قدیم سے مغربی اسکالرز نے جن کو انہوں نے مستشرقین کہا ہے مشرق کی شبیہ بگاڑی کر رکھ دی ہے۔

حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ مستشرقین نے یوروپ کے زاویے سے مشرق، بشمول مسلم معاشرے اور اسلام کو دیکھا اور ان کے تشخص کو مسخ کر دیا۔ مثال کے طور پر مغرب عقل اور دلیل پر بھروسا کرتا ہے وہ لبرل ہے وہ سائنس میں یقین رکھتا ہے اس کے بر عکس، مشرق منطق پر نہیں چلتا یہ پسماندہ ہے یہ وحشی ہے یہ زمانہ قدیم میں ٹھیرا ہوا ہے یہ بچہ ہے اور نفس پرست بھی ہے۔

> سیکولرازم اور اقلیتی حقوق جیسے آئینی اقدار پر گہری چوٹ کی جا رہی ہے مسلمانوں کو مزید حاشیہ پر دھکیلا جا رہا ہے وہ آج خود کو پہلے سے کہیں زیادہ غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں کیونکہ مسلم مخالف جذبات ملک کے بڑے حصے میں پھیل چکے ہیں دہلی انتخابات اور پھر مسلم مخالف فسادات کے بعد ابھی حالات نارمل ہوئے بھی نہ تھے کہ تبلیغی جماعت کا تنازعہ پیدا کر دیا گیا اسی لیے کشیدگی کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ رہی ہے اور اب تو مسلمانوں کے معاشی بائیکاٹ کرنے کی خبریں بھی آ رہی ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلامو فوبیا ایک بائیزی (binary) میں چیزوں کو بانٹ دیتا ہے۔ بائیزی کا مطلب یہ ہے کہ چیزیں دو مختلف حصوں میں منقسم ہیں۔ مستشرقین نے مغرب، یوروپ اور عیسائیت کو ایک کر کے پیش کیا اور ان کے آپس کے تمام اختلاف کو مٹا دیا۔ مغرب اچھائی کی علامت بتائی گئی جبکہ مشرق کے تمام مشرقی مذاہب اور معاشروں کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا اور برائی کی علامت بتایا۔ اس فریب کو ادب اور میڈیا کی مدد سے پھیلایا گیا اور اب بھی یہ مشرق کی سوچ میں پیوست ہے۔ اسی ناقص سوچ کو بہت سارے انقلابی اسکالرز نے ثقافتی سامراجیت (cultural imperialism) کا نتیجہ بتلایا ہے اور اس سے نجات پانے کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ مگر اس سے ابھی بھی نجات نہیں ملی ہے۔ تیسری دنیا بھلے ہی سیاسی طور پر سامراجیت کو شکست دے چکی ہو مگر یہاں کا طرزِ حکومت، قانون اور فکر بہت حد تک مغربی سسٹم کی ہی نقل ہے۔ ہندوستان میں فرقہ پرستی اور مسلم مخالف تعصب کے تار بھی انہیں مستشرقین کے افکار سے جڑے ہوئے ہیں۔ انگریزی حکومت نے اپنے دور میں عالم بھی پیدا کیے اور ہندوستان کی تاریخ بھی لکھوائی جنہوں نے ہمارے تشخص کو تباہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ ہم جو آج سوچتے ہیں اس پر بہت بڑا اثر انگریزی معلومات کا ہے۔ نو آبادی دور میں انگریزی حکومت نے اپنے مفادات کے مطابق ہندوستان کی تاریخ اپنے سرکاری مورخوں سے لکھوائی۔ پھر یہ درسی کتابوں اور ذرائع ابلاغ میں شامل کر کے سب تک پہنچا دیا گیا۔ ممتاز مورخ رومیلا تھاپر نے اپنے ایک مضمون "کمیونل ازم اور دیگر تحریکیں" (۱۹۷۷) میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں مستشرقین نے ہندوستان کی تاریخ کی ایسی تشریح کی جس نے ہندو فرقہ پرستوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ کو ویدک دور (Vedic period) کہا اور اس کی خوب تعریف کی۔ ہندو فرقہ پرستوں نے مستشرقین کی انہیں باتوں کو پکڑ لیا اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ قدیم بھارت آریائی لوگوں سے منسوب ہے جو ان کے اسلاف ہیں۔ وہیں دوسری طرف یہ کمیونل پروپیگنڈا کیا گیا کہ مسلمان بھارت کے اصل باشندے نہیں ہیں وہ باہر کے ملکوں سے حملہ آور بن کر آئے ہیں۔

حالاں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ فرقہ پرست اس حقیقت کو قبول کرنا نہیں چاہتے ہیں کہ قدیم ہندوستان میں ویدک کلچر کے مد مقابل جین، بدھ اور چارواک نظریہ بھی تھا۔ ایک زمانے میں بدھ مذہب بھارت میں کافی پھیل گیا تھا بعد میں بدھ مذہب اور برہمن ازم کے درمیان بڑی لڑائی ہوئی اس کے بعد برہمن ازم کا احیاء عمل میں آیا۔ برہمنیت نے اپنے حریفوں کو دبا کر ختم کر دیا گیا اس لیے قدیم بھارت کی تاریخ صرف آریائی کلچر تک محدود نہیں کی جا سکتی۔ ویدک دور سے پہلے دریائے سندھ کے کنارے ایک بڑی ترقی یافتہ اور شہری تہذیب پروان چڑھی تھی جسے ہم انڈس یا ہڑپا تہذیب بھی کہتے ہیں۔ جنوب میں تمل کلچر بھی قدیم زمانہ میں بڑا ترقی یافتہ تھا۔ پیغمبر کے دور کے بعد عرب کے تاجروں نے اسلام کا تعارف ساحلی علاقوں میں کروایا تھا اور اس کی تاریخ دہلی سلطنت سے کافی پرانی ہے۔ عیسائیت بھی سامراجی طاقتوں کی آمد سے پہلے ہی بھارت میں قدم رکھ چکی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کسی ایک مذہب یا مذہبی گروپ کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ اس پر سب کا برابر کا حق ہے۔ ان باتوں کو مستشرقین اپنی تحریروں میں پیش نہیں کر سکے اور انہوں نے قدیم ہندوستان کو ہندو دور اور عہد وسطیٰ کو مسلم دور کہہ کر ایک binary بنائی، جسے لپک کر ہندو فرقہ پرستوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو شدت پسند بھارت کی تکثریت اور تنوع کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس سے ان کی فرقہ پرست سیاست کی پول کھل جاتی ہے۔ بھارت کو ہندی، ہندو اور ہندوستان کے ہم معنی بنا کر پیش کیا گیا۔ اسلام پر بطورِ خاص حملہ کیا گیا اور اس کی تاریخ کو مسخ کرنے کی مذموم کوشش کی گئی۔ اس کے لیے انگریزی مورخ سب سے زیادہ قصوروار ہیں۔ اسی مسخ شدہ تاریخ کا استعمال فرقہ پرست آج تک کرتے آ رہے ہیں۔ جب ملک میں فرنگیوں کے خلاف لڑائی ہو رہی تھی تب فرقہ پرست سامراجی حکومت سے لڑنے کے بجائے عوام کو مذہب کے نام پر تقسیم کر رہے تھے۔

اسلاموفوبیا کا یہ اثر ہے کہ مسلم سماج کو صرف کلچر اور مذہب کے زاویے سے دیکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر نسل، علاقہ، جنس الگ الگ ہیں اور ان کے اندر مختلف طبقات ہیں، ایسی باتوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ امیر اور غریب مسلمان دونوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عقائد اور مسلک کے نام پر جو فرق ہے اس کو بھی نظر انداز کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی مرتبہ تین طلاق دینے کو اہل حدیث اور شیعہ صحیح نہیں سمجھتے۔ مگر بھگوا طاقتوں نے ایسا تاثر پیش کیا کہ گویا سارے ہی مسلمان ایک ہی بار میں تین طلاق دینے کو صحیح سمجھتے ہوں۔ مسلم سماج میں لوگ مذہب کے پیروکار بھی ہیں اور مذہب پر عمل نہ کرنے والے بھی، مگر سب کو ایک ہی رنگ میں رنگ دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو بھی اپنی سہولت کے مطابق فراموش کر دیا جاتا ہے کہ سیاسی طور پر بھی مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان ایک بڑا گروہ لبرل اور اشتراقی مسلمانوں کا بھی ہے، مگر انہیں بھی اسلامو فوبیا کے تحت صرف مسلمان ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی دوسری سب سے بڑی آبادی مسلم قوم مختلف معاملوں میں منقسم ہے۔ اگر ان کے درمیاں ہم آہنگی دیکھی جاتی ہے تو ان کے درمیان خطرناک جنگیں بھی ہوئی ہیں۔ تاریخ کے اوراق میں اگر ہم جائیں گے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت بھی قائم کی۔ انہوں نے ثقافت، ادب، علم وسائنس کے میدان میں زبردست خدمات بھی انجام دیں۔ جس نشاۃ ثانیہ کے بعد یوروپ کی تصویر بدل گئی وہ ممکن نہ ہو پاتی اگر مسلمانوں نے یونانی اسکالرز کی تحریروں کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے محفوظ نہ رکھا ہوتا۔ مگر پھر تنزلی اور ٹھیراؤ کا دور بھی دیکھا گیا۔ ان کے بہت سارے علاقوں میں مغربی ملکوں کی کالونیاں بنیں اور ان کا زبردست استحصال ہوا۔ ان پر ظلم بھی کیے گئے۔ مگر پھر مسلمانوں نے لڑ کر آزادی بھی حاصل کی۔ آزادی کے بعد ان کو ایک نیا چیلنج ملا۔ مگر اسلامو فوبیا سے متاثر لوگ ان تمام تاریخی حقائق کو فراموش کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ گویا ان کی تاریخ ہزاروں سالوں سے ایک ہی بات پر آ کر اٹکی ہوئی ہے۔ اسلامو فوبیا مسلم سماج کے اندر مسلسل چل رہی تبدیلی کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔ وہ یہ تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں ہے کہ ان کے اندر بھی اصلاح ہوئی ہے۔ کئی بار یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مسلم سماج میں اصلاح نہیں ہوئی ہے جبکہ دوسرے سماج وقت کے ساتھ بدل رہے ہیں مسلم سماج جمود کا شکار ہے، یہی چیزیں اسلاموفوبیا کا تمام تر خلاصہ ہیں۔ وہ قدیم زمانہ میں رکا ہوا ہے اور جدیدیت سے میلوں پیچھے ہے۔ یہ بھی اسلامو فوبیا پروپیگنڈے کا حصہ ہے کہ مسلم سماج سائنس اور عقل کی جگہ توہم پرستی اور جہالت میں غرق ہے۔ یہ اسی binary کا حصہ ہے جس کا ذکر ایڈورڈ سعید کر رہے تھے۔

ہندوستان میں بھگوا فرقہ پرست اپنی مسلم مخالف سیاست کو آگے بڑھانے کے لیے اسلامو فوبیا کے بہت سارے وہ طریقہ کار ادھار لیتے ہیں جو ان کے لیے مستشرقین نے پیدا کیے ہیں۔ جس طرح مستشرقین نے مغرب اور مشرق کی binary کھڑی کی ہے اسی طرح ہندو فرقہ پرستوں نے اسلام (اور عیسائیت) کو ہندو دھرم سے جدا اور اس کے لیے غیر بتلایا ہے۔ اگر آپ ہندو فرقہ پرست عناصر کی تحریروں کو پڑھیں گے تو یہ binary نظر آ جائے گی۔ مثال کے طور پر ہندو دھرم قومی (national) ہے جبکہ اسلام اور عیسائیت غیر ملکی (foreign) ہیں۔

ہندتوا کے نظریہ سازبی ڈی ساورکر نے بڑی چالاکی سے سکھ اور بدھ مت کو ہندو دھرم کا ایک جز قرار دے کر ان کے تشخص کو غصب کرنے کی کوشش کی۔ جس کی مخالفت سکھ اور بدھ دھرم کے پیروکار بار بار کرتے رہے ہیں۔ فرقہ پرست یہ تعصب بھی پھیلاتے ہیں کہ ہندو دھرم شانتی یعنی امن اور رواداری کی بات کرتا ہے جبکہ اسلام کے پیروکار تشدد میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ بات وہ کھل کر نہیں کہتے۔ خود کو لبرل دکھانے کے لیے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو غیر ہندووں کے جداگانہ عقیدوں اور رسوم ورواجوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور وہ اس کا احترام بھی کرتے ہیں مگر وہ ہندو دھرم کی بڑائی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ دیگر مذاہب خود بخود تعصب کے شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی رواداری کی پول تب کھل جاتی ہے جب وہ ہندوستان کی تاریخ اور اس کی سیاست پر لکھتے اور بولتے ہیں۔ وہاں وہ مسلم حکمرانوں کو اکثر "ظالم" اور "متشدد" بنا کر پیش کرتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں انہوں نے علاالدین خلجی (۱۲۹۶۔۱۳۱۶) کو جم کر نشانہ بنایا ہے۔ اورنگ زیب (۱۶۱۸۔۱۷۰۷) کی شبیہ کو وہ بہت عرصے سے مسخ کرنے کوشش کر رہے ہیں۔ چند سال پہلے تو انہوں نے دہلی کی ایک شاہراہ کا نام اورنگ زیب سے بدل کر سابق صدر جمہوریہ اے پی جے کلام کے نام پر رکھ دیا تھا۔ اسلاموفوبیا کے تحت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلمان محب وطن نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی وفاداری امت کے تئیں ہوتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مسلم جدیدیت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں یعنی وہ ماڈرن نہیں بن پائے ہیں ان کے اندر سائنس کا شعور نہیں ہے وہ جہالت میں پڑے ہوئے ہیں ان کے اندر سیکولر خیالات پروان نہیں چڑھ سکتے ہیں کیونکہ مسلم سماج پر بالادستی علماء اور مذہبی قائدین کی ہے۔ وہ یہ تاثر پھیلاتے ہیں کہ مسلمان مسجدوں سے کنٹرول ہوتے ہیں۔ یہی نہیں مسلمانوں میں اظہارے رائے کی آزادی موجود نہ ہونے کا بھی الزام لگایا جاتا ہے۔ مسلم خواتین کی "حالتِ بد" پر مگر مچھ کی آنسو بہائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ مجموعی طور پر دنیا ماڈرن ہو گئی ہے وہ سائنس، ترقی، اور جمہوریت کے راستے پر جا رہی ہے مگر مسلم سماج آج بھی قدامت پرستی اور مذہبی جنون سے باہر نہیں آپایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہندو سماج ماڈرن ہو چکا ہے؟ کیا اس کے اندر قدامت پسندی نہیں ہے؟ کیا ان کی خواتین طلاق، جہیز اور گھریلو تشدد کی شکار نہیں ہیں۔ کیا ہندو سماج توہم پرستی میں مبتلا نہیں ہے؟ ان سوالوں پر بھگوا شدت پسند بات نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک ساری برائیاں مسلم سماج کے اندر موجود ہیں اور وہ ہر طرح سے پاک پوتر ہیں۔ جب طلاق ثلاثہ کے موضوع پر سیاست گرم تھی اور ماحول کو فرقہ وارانہ بنایا جارہا تھا تب بھگوا فرقہ پرست اور ان کے حامی یہی مسلم مخالف تعصب کا کارڈ کھیل رہے تھے۔ اسلاموفوبیا پر مبنی بیانیہ کو پھیلایا گیا۔ ۵ مئی ۲۰۱۷ کو بی جے پی کے قومی جنرل سکریٹری بھوپندر یادو نے انگریزی کے اخبار "انڈین ایکسپریس" میں ایک مضمون لکھتے ہوئے کہا کہ مسلم پرسنل لا وقت سے کافی پیچھے ہے اور نئے بھارت کے لیے رکاوٹ ہے۔ فرقہ پرست یہ جان بوجھ کر کنفیوزن پیدا کرتے ہیں کہ پرسنل لا صرف مسلم سماج کے اندر ہی ہے جسے ختم کر دینا چاہیے۔ در حقیقت پرسنل لاز مسلمانوں کے علاوہ دیگر کمیونیٹیز کو بھی ملے ہوئے ہیں اور اس پر چلنے کا آئینی حق سب کو ملا ہوا ہے۔ مسلم پرسنل لا میں اصلاح کی ضرورت پر اس طرح زور دیا گیا ہے گویا اس میں اصلاح کے بعد مسلمانوں اور ملک کی ساری پریشانی دور ہو جائے گی۔ اگر مسلم پرسنل لا میں اصلاح کی ضرورت ہے تو ہندو پرسنل لا میں کیوں نہیں؟ بہت سارے لوگوں کے اندر یہ بھی غلط فہمی ہے کہ ہندو پرسنل لا میں کوئی خامی نہیں ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ مسلم سماج کے اندر خواتین کے مسائل نہیں ہیں، مگر ہندو خواتین بھی تو اپنے سماج میں دقتیں جھیل رہی ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مسلم اور ہندو خواتین آج بھی اپنے سماج میں برابری نہیں پاسکی ہیں؟ کیا دونوں گھریلو تشدد کے شکار نہیں ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ان کو اب بھی معقول مزدوری نہیں ملتی؟ ملکیت میں بھی ان کو اپنے حقوق پانے میں سماج رکاوٹ ڈالتا ہے؟ کیا جہیز کی آگ میں بھارتی خواتین کو نہیں جلایا جارہا ہے؟ اگر یہ سب باتیں صحیح ہیں تو صرف مسلم خواتین کی حالت زار پر کیوں آنسو بہایا جارہا ہے؟ کیا ساری خواتین (خواہ وہ مسلم ہوں یا ہندو) کے مسائل ملتے جلتے نہیں ہیں؟ مگر فرقہ وارانہ ڈسکورس نے صرف مسلم خواتین کو ہی اپنے مردوں کے ظلم کا شکار بتلایا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا اسلاموفوبیا ہی ہے۔

بی جے پی کے ٹکٹ پر ۲۰۰۴ میں اتر پردیش سے انتخاب لڑ چکے عارف محمد خان کو فرقہ پرست اور سرکاری میڈیا مسلم خواتین کا چیمپین بنا کر پیش کرتا ہے۔ مگر ان کی بھی سوچ بہت حد تک اسلاموفوبک ڈسکورس سے متاثر ہے۔ تین طلاق کی جب سنوائی چل رہی تھی تو وہ کھل کر میڈیا میں بی جے پی کے موقف کی ترجمانی کر رہے تھے۔ میڈیا ان کو ماہر پرسنل لا اور مسلم خواتین کا خیر خواہ بنا کر پیش کر رہا تھا۔ اگر آپ ان کی تحریروں کو یاد کریں تو آپ کو ان میں مستشرقین کی تحریروں کا اثر نظر آجائے گا۔ ان کے بیان کا ایک چھوٹا سا اقتباس یہاں پیش کرنا چاہوں گا جو انہوں نے طلاقہ ثلاثہ سے متعلق ۲۲ اگست (۲۰۱۷) کے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد دیا تھا۔ مستشرقین کی طرح وہ مسلم سماج کی ساری برائیوں کے لیے مذہبی لیڈرشپ کو قصوروار قرار دیتے ہیں۔ "پرسنل لا بورڈ کے جن

لوگوں نے طلاق ثلاثہ جیسی برائی کو بچانے میں اپنی پوری طاقت لگا دی تھی حقیقت میں وہ اس روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں جس نے گزشتہ ایک ہزار سال میں ترقی کے ہر ایک کام میں خواہ وہ جدید تعلیم کا معاملہ ہو یا پھر سماجی اصلاح کا، ہمیشہ رخنہ اندازی کی ہے ('دینک جاگرن'، ۲۳ اگست ۲۰۱۷)۔"

اس بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا کہ عارف محمد خاں کو مسلم پرسنل لا بورڈ کی تنقید کرنے سے کوئی نہیں روک رہا ہے، لیکن جب وہ مستشرقین کی زبان بولنے لگیں گے تو مسلمان ناراض ہوں گے ہی۔ کیا ان کا یہ بیان تاریخی طور پر صحیح ہے کہ ہزاروں سالوں سے مسلم پرسنل لا اور علماء ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں؟ سب سے پہلی بات تو یہ کہ بطورِ کلاس، علماء کا دائرہ حلقہ پچھلے دو سو سالوں میں بہت بڑھا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ بجھ جانے کے بعد مسلم سماج میں روشنی دکھانے کی غرض سے وہ سامنے آئے

ہیں۔ حالیہ دنوں میں بنگلہ دیش کی متنازعہ مصنفہ تسلیمہ نسرین نے بھی تبلیغی جماعت پر پابندی کا مطالبہ کر کے ہندوتو طاقتوں کی فرقہ پرست سیاست کو تقویت دی ہے انہوں نے بھی مسلمانوں کی پریشانی کے لیے صرف مذہبی قیادت کو ذمہ دار ٹھیرایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مذہبی قیادت مسلمانوں کو تاریکی کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مستشرقین بھی مسلم سماج کے اندر مذہبی قیادت کا دیو کھڑا کرتے ہیں اور یہ دکھلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر سیکولر آئیڈیا پروان نہیں چڑھ سکتا ہے۔ ۱۳ اپریل (۲۰۲۰) کے ہندی روزنامہ 'جن ستہ' میں انہوں نے ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ "ہم مسلم معاشرے کو تعلیم یافتہ بنانا چاہتے ہیں، ان کو ترقی پسند بنانا بنانا چاہتے ہیں، ان کو توہم پرستی سے نکالنا چاہتے ہیں لیکن لاکھوں کی تعداد میں موجود یہ لوگ (تبلیغی جماعت) تاریکی اور جہالت پھیلا رہے ہیں"۔

کچھ ایسی ہی بات آر ایس ایس سے جڑے رام بہادر رائے نے اپنے ایک مضمون میں کہی ہے۔ انہوں نے بھی الزام لگایا کہ مسلم سماج جمود میں مبتلا ہے "ان میں جو علماء ہیں وہ آج کے وقت میں بھی ٹھیرے ہوئے ہیں۔ جبکہ دنیا کے پورے مذاہب وقت کے ساتھ بدلے ہیں"۔ (پانچ جنیہ، ۱۲ اپریل، ۲۰۲۰، ص۔ ۱۰)۔

یہ ممکن ہے کہ اسلاموفوبیا کی شکلیں مختلف سیاق میں الگ ہو سکتی ہیں۔ اس مضمون میں یہ دلیل پیش نہیں کی جارہی ہے کہ ہندو فرقہ پرست ہر بات مستشرقین کی تحریروں سے نقل کرتے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ سیاق کے اعتبار سے ان کے طریقے کار میں کچھ فرق ہو سکتا ہے۔ اس مضمون میں صرف یہ کہا جارہا ہے کہ اسلاموفوبیا کا نظریہ ایک binary میں کام کرتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ جو لوگ اسلاموفوبیا سے متاثر ہیں ان کا تعلق مستشرقین یا ہندو فرقہ پرستوں سے ہو۔ بہت سارے اسکالرز جن کا تعلق لیفٹ یا دیگر سیکولر اور ترقی پسند تحریکوں سے رہا ہے وہ بھی جانے انجانے میں مسلمانوں کے تئیں بہت ساری ایسی رائیں رکھتے ہیں جن کو مستشرقین نے پھیلایا ہے۔

ایسا اس لیے ممکن ہوا کیونکہ جب کوئی پروپیگنڈا بہت دنوں تک گشت کرتا ہے تو اس کی زد میں بہت سارے ایسے لوگ بھی آجاتے ہیں جن کا تعلق فرقہ پرست جماعتوں سے کبھی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے

> **اسلامو فوبیا مسلم سماج کے اندر مسلسل چل رہی تبدیلی کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔ وہ یہ تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں ہے کہ ان کے اندر بھی اصلاح ہوئی ہے۔ کئی بار یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ مسلم سماج میں اصلاح نہیں ہوئی ہے جبکہ دوسرے سماج وقت کے ساتھ بدل رہے ہیں مسلم سماج جمود کا شکار ہے، یہی چیزیں اسلامو فوبیا کا تمام تر خلاصہ ہیں**

مقابلہ کرنا ایک مشکل کام ہے۔ مسلم مخالف تعصب حالیہ دنوں میں بہت بڑھ گیا ہے۔ تبلیغی جماعت کو کورونا وائرس پھیلانے کے لیے ذمہ دار بتلا کر اسلاموفوبیا کے لیے میدان تیار کر دیا گیا ہے۔ اس پروپیگنڈے کی رفتار ۳۰ مارچ کے بعد اچانک تیز ہوئی اس دن دہلی میں واقع تبلیغی جماعت کے دفتر پر پولیس کا ریڈ پڑا تھا پھر ایک نیا بیانیہ دیا گیا کہ کورونا کو پھیلانے اور حالات کو خراب کرنے میں مسلمان، بالخصوص تبلیغی مسلمان کا ہاتھ ہے۔ پھر پوری ڈیبیٹ صحت عامہ کی بے توجہی، مزدوروں کی ہجرت اور حکومت کی راحت رسانی کے کاموں کو انجام دینے میں ناکامی کے اشوز سے دور ہو گئی۔ توجہ غریب اور تارکین وطن مزدوروں کی فاقہ کشی سے ہٹ کر 'تبلیغی وائرس' پر چلی گئی۔ پھر نئے اصطلاحات گڑھے گئے: 'تبلیغی جہالت'، 'تبلیغی جہاد'، 'انسانی بم' وغیرہ۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کو 'ملک مخالف سرگرمیوں' میں ملوث ہونے اور 'دہشت گردوں' سے جڑے ہونے کے بہانے گالیاں دی گئیں۔ ایک مشہور ہندی نیوز چینل کے اینکر نے تبلیغی جماعت کو جان بوجھ کر 'طالبانی' جماعت کہہ دیا۔ پھر علماء اور مذہبی لیڈروں کو نشانہ بنایا گیا ان پر سائنس سے دور اور جہالت میں مبتلا ہونے کا بے بنیاد الزام لگایا گیا۔ تبلیغی جماعت کے صدر کے خلاف کیس بھی درج ہوا پھر تبلیغی جماعت کے بد عنوانی میں ملوث ہونے کی خبر بھی گشت کرنے لگی۔ مگر سوال یہ ہے کہ اسلاموفوبیا کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ دوسرے الفاظ میں مسلم معاشرے اور اسلام کا مطالعہ کس طرح کیا جائے کہ مستشرقین کی خامیوں کو دور کیا جائے۔ اس موضوع پر امریکہ کے دی سنٹر آف سٹی یونیورسیٹی آف نیویارک میں ثقافتی علم البشریات کے ماہر طلال اسد نے بہت اہم بات کہی ہے۔ وہ اسلام پر تحقیق کرنے والے نامور مصنف محمد اسد کے بیٹے ہیں۔ طلال اسد نے اپنے ایک اہم مقالہ "اسلام میں علم البشریات کا تصور" (۲۰۱۲) میں اسلام کا مطالعہ کیسے کیا جائے اس پر روشنی ڈالی ہے جو کہ کافی اہم ہے اور جو اسلاموفوبیا سے مقابلہ کرنے میں کافی اہم ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ اسلام کا مطالعہ اس کے تاریخی سیاق میں ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت کے معاشی تناظر (political economy) کے پہلووں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے یہ درست کہا ہے کہ محقق کو "تبدیلی اور اختلاف اور تاریخی بتبدیلیوں سماجی تشکیلات (social formations) کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے اور ان کو پہلے سے طے شدہ خلاصہ (essence) کو اپنانے سے گریز کرنا چاہیے (ص۔ ۱۰۰۔۱۰۱)۔" طلال اسد یہ کہنا چاہتے کہ اسلام کو اس کے بدلتے ہوئے سیاق اور مستند تاریخ کی روشنی میں دیکھا جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر کسی قوم یا تہذیب کو اچھے اور برے کی تقسیم میں محدود کرنے سے بچا جاسکتا ہے۔

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)
ای میل: debatingissues@gmail.com

آدی واسی حقوق کا چمپئن پال سنگھ مُنڈا

آج بھی جب آدی واسیوں کی تحریک زور پکڑتی ہے تو اسے عیسائی مشنری کی سازش سے منسوب کرکے قومی سلامتی کے لیے خطرہ بتایا جاتا ہے

ابھے کمار

اقتدار اکثر ان کو ہی یاد رکھتا ہے جو حکمراں جماعت اور اس کے نظریہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقتدار میں تبدیلی کے ساتھ نئے نظریات اور نئے چہروں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جاتا جاتا ہے۔ آزادی کے بعد کی سیکولر حکومت نے گاندھی، نہرو اور اِندرا کے ناموں کو آگے بڑھایا اور اب ہندوتوا کے دور میں ساورکر، شیاما پرشاد مکھرجی، دین دیال اپادھیائے، اٹل بہاری باجپائی، اور مودی کے ناموں کا ورد ہو رہا ہے۔ سیکولرازم بنام ہندوتوا کے اس کھیل میں سب سے زیادہ نقصان دلت، آدی واسی، پسماندہ، مسلم اور دیگر محروم طبقات کے لیڈروں کا ہوا ہے۔ ایسے ہی فراموش کیے گئے ایک رہنما کا نام جے پال سیکھ منڈا ہے۔ اُن کا یوم ولادت ۳ جنوری کو ہے۔ سال ۱۹۰۳ میں ان کی پیدائش جھارکھنڈ کے کھونٹی سب ڈویژن میں ہوئی تھی۔

جے پال سنگھ مُنڈا کا گھر کا نام پَرمود پاہَن تھا۔ ان کے والد کا نام کشتو مونی تھا، جبکہ والدہ کا نام رادھا مونی تھا۔ وہ آدی واسی کے جس گروپ میں پیدا ہوئے وہ منڈا تھا۔ جے پال منڈا کی اِبتدائی تعلیم مقامی سَنت پال پرائمری اسکول میں ہوئی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ سال 1918 میں برطانیہ روانہ ہو گئے۔ آکسفورڈ سے انہوں نے میٹرک کا امتحان سال ۱۹۲۲ میں پاس کیا۔ ان کو ہاکی، کرکٹ، فٹبال، رگبی کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ مباحثے میں بھی حصہ لیتے تھے۔ لکھنے کے شوق نے انہیں اَخبار کے قریب لا دیا اور وہ کھیل کے بارے میں مضامین لکھنے لگے۔ انہوں نے سال ۱۹۲۶ میں آکسفورڈ سے بی اے پاس کیا اور آئی سی ایس کے لیے اگلے سال منتخب ہوئے۔ مگر انہوں نے قوم کی خاطر اسے چھوڑ کر نیشنل ہاکی ٹیم کی قیادت سنبھالی اور ۱۹۲۸ ایمسٹرڈم اولمپکس میں شرکت کی۔ نسلی بھید بھاؤ سے دُکھی ہو کر منڈا نے ہاکی کو خیر باد کہا۔ اگلے سال ۱۹۲۹ میں برطانیہ کے سنت جان کالج سے ایم اے (اقتصادیات) پاس کیا۔ مُنڈا کو کلکتہ کی موہن بگان ہاکی ٹیم تشکیل دینے کا بھی شرف حاصل ہے۔ انہوں نے سال ۱۹۳۲ میں تارا مجمدار سے شادی کی۔

مگر ۱۹۳۰ کی دہائی کے دوران ان کا رجحان سیاست کی طرف ہونے لگا۔ وہ اس بات سے افسردہ تھے کہ آدی واسیوں کو ان کا حق نہیں مل پا رہا تھا اور ان کے علاقہ کے وسائل کا استحصال غیر آدی واسی کر رہے تھے۔ دھیرے دھیرے ان کا وقت سیاسی اور سماجی مسائل کو سمجھنے اور دور کرنے میں لگنے لگا۔ پھر سال ۱۹۳۸ میں انہوں نے آدی واسی مہاسبھا کی قیادت سنبھالی اور صدر منتخب ہوئے۔ اس پلیٹ فارم سے انہوں نے آدی واسی کے حقوق کے لیے لڑائی لڑی۔ کئی بار ان کا سیدھا مقابلہ کانگریس پارٹی سے ہوا۔ بالخصوص بہار کانگریس کے وہ بڑے شدید ناقد تھے۔ اُن کا ماننا تھا کہ بہار ریاستی کانگریس کے اعلیٰ ذات کے رہنما جھارکھنڈ اور آدی واسی سماج کے مفاد کے خلاف کام کر رہے تھے۔ اُن کو اس بات سے بھی غصہ تھا کہ جھارکھنڈ کا علاقہ قدرتی وسائل سے مالا مال تھا، مگر سرکار اُن کا استحصال کر رہی تھی۔ جو وہاں کے اصل باشندے ہیں، اُن کا حال بے حال تھا۔ آدی واسی علاقوں میں غیر آدی واسی حاکم بن بیٹھے تھے۔ اس لیے مُنڈا آدی واسیوں کے لیے ایک مخصوص جھارکھنڈ ریاست کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر ریاست کا قیام مُنڈا کی وفات کے ۳۰ سال بعد وجود میں آیا۔

ایک بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جھارکھنڈ کا مطالبہ بیسوی صدی کے شروعاتی دہائی سے ہی ہونے لگا تھا، مگر اس کی تشکیل تقریباً سو سال بعد ہوئی۔ سو سال کے دوران جھارکھنڈ کے اندر بہت کچھ بدل گیا۔ آدی واسی علاقوں میں غیر آدی واسی بڑی تیزی سے بسنے لگے اور

> ”
>
> آدی واسی کہنے سے اعلیٰ ذات کو اس بات سے پرہیز تھا کہ اگر ایک طبقہ بھارت میں آدی واسی کہلائے گا تو پھر جو باہر سے بھارت میں آئے ہیں، ان کے بارے میں بحث چھڑ جائے گی۔ کل تک قومی رہنما جو اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتے تھے، خود کو بھارت کے آریائی نسل سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ وہ خود کو بھارت کے مقامی لوگوں سے الگ اور انگریزوں اور سفید فام یورپین سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ اس طرح وہ خود کو بھارت کے پسماندہ، دلت اور آدی واسی سے الگ اور ان کو غیر آریائی قوم کہہ کر حقیر سمجھتے تھے۔

وہاں کی ڈیموگرافی تیزی سے بدلنے لگی۔ شہروں میں غیر آدی واسی بہاری اور بنگالی بڑی تعداد میں بسنے لگے اور انہوں نے حکومت کی مدد سے آدی واسی علاقوں میں زمین خرید لی اور وہاں کے حاکم بن بیٹھے، جبکہ مقامی آدی واسی کو کولی، مزدور، اور نوکر بننے پر مجبور کر دیا گیا۔ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ آدی واسی علاقوں میں نہ صرف انگریز بلکہ دیسی بنیا، مہاجن اور زمیندار نے بھی ظلم و زیادتی کی۔ استحصال کی رفتار انیسویں صدی سے تیز ہونے لگی، جس کی مخالفت میں آدی واسیوں نے ہتھیار اٹھایا۔ بِرسا مُنڈا نے اپنی جان کی قربانی دی۔ کانگریس کے قیام سے پہلے ہی آدی واسی انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے، مگر بعد میں جب تاریخ لکھی گئی تو اُن کی قربانی کو فراموش کر دیا گیا۔

آدی واسیوں کے خلاف کام کرنے میں انگریزی حکومت اور ان کے مقامی ایجنٹ آگے آگے تھے۔ انگریزوں نے انہیں پسماندہ کہا اور انہیں غیر مہذب کہہ کر اُن کے علاقوں میں حکومت کی۔ اُن کی ترقی کا بہانا بنا کر اُن کی زمین، ان کے جنگل اور زیر زمین ذخائر کو لوٹا۔ انہوں نے آدی واسیوں کو قبیلہ کہہ کر بیک ورڈ سمجھا۔ جب قومی تحریک نے تیزی پکڑی تو اعلیٰ ذات کے قومی لیڈروں نے انہیں ہندو کہا اور ان کو زبردستی ہندو مین اسٹریم سماج کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ معروف ماہر عمرانیات اور بشریات جی ایس گھوریہ نے آدی واسیوں کو پچھڑا ہندو، کہہ کر اُن کے تشخص کو مٹانا چاہا۔ اس طرح آزادی کے پہلے اور آزادی کے بعد کے لیڈروں نے آدی واسی علاقوں کو دل کھول کر لوٹا۔ یہاں تک کہ نام نہاد مہذب سماج نے اپنی ترقی کی عمارت انہیں آدی واسی علاقوں کی قبروں پر رکھی۔

جے پال مُنڈا آدی واسی مسائل کو کافی نزدیک سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کا ماننا تھا کہ آدی واسی یہاں کے سب سے پرانے باشندے ہیں اور وہ قدیم زمانے کے حاکم ہیں۔ بعد میں چل کر اُن کو لوٹا گیا اور ان کو پسماندہ بنا دیا گیا۔ منڈا آدی واسیوں کے لیے قبیلہ یا ایس ٹی کی جگہ آدی واسی لفظ کو ترجیح دیتے تھے، مگر آزاد بھارت میں ایس ٹی یعنی شیڈول ٹرائب کو تسلیم کیا گیا۔ آدی واسی کہنے سے اعلیٰ ذات کو اس بات سے پرہیز تھا کہ اگر ایک طبقہ بھارت میں آدی واسی کہلائے گا تو پھر جو باہر سے بھارت میں آئے ہیں، ان کے بارے میں بحث چھڑ جائے گی۔ کل تک قومی رہنما جو اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتے تھے، خود کو بھارت کے آریائی نسل سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ وہ خود کو بھارت کے مقامی لوگوں سے الگ اور انگریزوں اور سفید فام یورپین سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ اس طرح وہ خود کو بھارت کے پسماندہ، دلت اور آدی واسی سے الگ اور ان کو غیر آریائی قوم کہہ کر حقیر سمجھتے تھے۔ مگر جب ووٹ کی سیاست سامنے آئی اور انہوں نے تعداد کی طاقت کو سمجھ لیا تو ہندو سماج کے اعلیٰ ذات کے لیڈروں نے آریائی نسل کی جگہ ہندو قوم کی بات زیادہ کرنی شروع کر دی۔ اس کے پیچھے اُن کا مقصد مسلم لیگ کے رہنماؤں کو اقلیتوں سے منسوب کرنا تھا اور کانگریس اور ہندو مہاسبھا کو اکثریتی سماج کا نمائندہ بنا کا پیش کرنا تھا۔ تبھی تو ۱۹۳۰ کی دہائی کے بعد سے اعلیٰ ذات کے ہندو لیڈروں نے آدی واسی اور دلت کو ہندو کہنا شروع کر دیا۔ جو بھی آدی واسی اور دلت اُن کے کام کاج پر سوال اٹھاتا تھا ان کو عیسائی مشنری اور انگریزی حکومت کا دلال کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی جاتی۔ جے پال مُنڈا نے بھی بہت سارے آدی واسیوں کی طرح عیسائی دھرم کو قبول کیا تھا اور ان کے واجب سوال کو بھی دبانے کے لیے اُن پر عیسائی مشنری کا ایجنٹ ہونے کا جھوٹا الزام لگایا گیا۔ آج بھی جب آدی واسیوں کی تحریک زور پکڑتی ہے تو اسے عیسائی مشنری کی سازش سے منسوب کر کے قومی سلامتی کے لیے خطرہ بتایا جاتا ہے۔

اپنی وفات سے پہلے انہوں نے کانگریس پارٹی میں اپنی جھارکھنڈ پارٹی کو ضم کیا مگر وہاں بھی انہیں دھوکا ملا۔ وہ ۲۲ ممبران اسمبلی اور ۱۵ ایم پی کے ساتھ کانگریس پارٹی میں گئے اور پھر بہار سرکار میں نائب وزیر اعلیٰ بھی بنے۔ مگر ۲۳ دن بعد ہی ان کو وزیر کے منصب سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد وہ کانگریس سرکار کی پالیسی کی جم کر تنقید کی۔ ۱۹۶۷ میں وہ پھر جھارکھنڈ پارٹی کو جوائن کیا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک انسان ہونے کی وجہ سے مُنڈا بھی تنقید سے پرے نہیں ہیں، مگر ان کی زندگی اور تحریر کو جاننے اور پڑھنے سے ہمیں آدی واسی سماج کے مسائل کو سمجھنے اور اُن کے حقوق کے لیے لڑنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

مضمون نگار جے این یو میں اسکالر ہیں

خبریں

طلبہ کے خلاف پولیس زیادتی: جامعہ انتظامیہ اور بھگوا حکومت کی ملی بھگت کا نتیجہ

ابھے کمار 19/02/2025

طلبہ کا کہنا ہے کہ ان کا 'قصور' اتنا ہی تھا کہ وہ 15 دسمبر کو یونیورسٹی میں ایک پروگرام منعقد کر کے اس دن کو یوم مزاحمت کے طور پر منانا چاہتے تھے۔ یہ وہی دن ہے جب 2019 میں جامعہ کے طلبہ سی اے اے اور این آر سی جیسے غیر جمہوری قوانین کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے اور اس وقت کی انتظامیہ نے طلبہ کے جمہوری حقوق کا تحفظ کرنے کے بجائے پولیس کو کیمپس میں بلا کر مظاہرین پر لاٹھیاں برسوائی تھیں۔
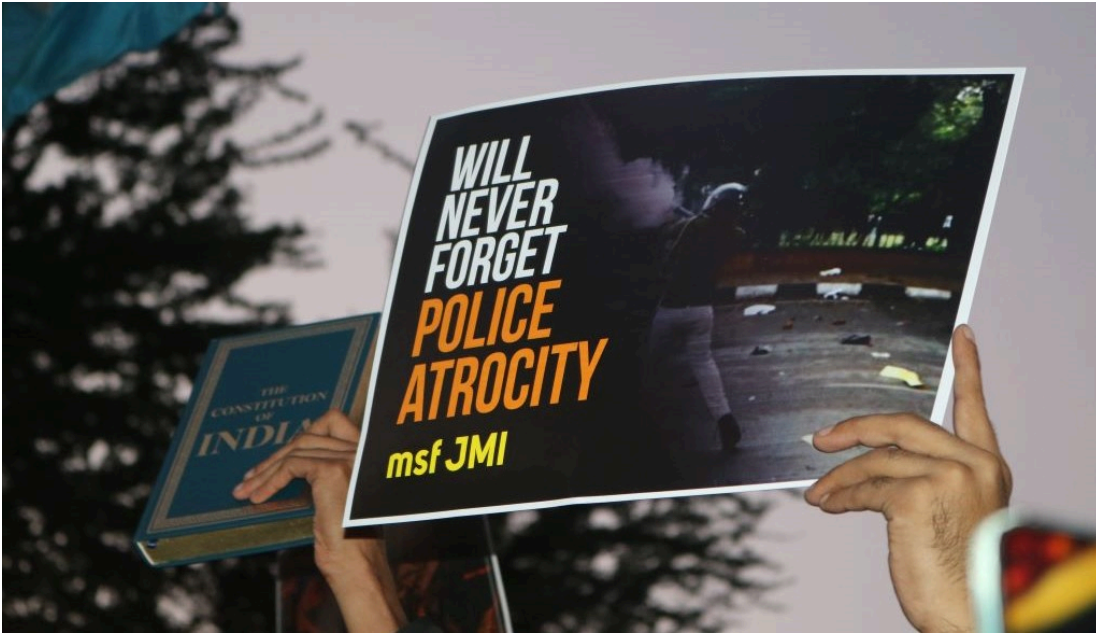
فائل فوٹو: (تصویر: اویس صدیقی)

سوموار کے روز، جب یہ مضمون لکھا جا رہا ہے، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ یونیورسٹی کی کلاسوں کا بائیکاٹ کر رہے ہیں۔ انہیں اس بات پر شدید غصہ ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ اپنے سیاسی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے نہ صرف طلبہ کو مختلف طریقوں سے ہراساں کر رہی ہے، بلکہ تحریکِ جامعہ کو کچلنے پر بھی آمادہ ہے۔

یہ تاریخ دانوں سے مخفی نہیں کہ جامعہ کی بنیاد تحریکِ آزادی کے بطن سے نکلی تھی۔ مہاتما گاندھی کی قومی تعلیمی پالیسی اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت کے طور پر مجاہدین آزادی نے اس ادارے کی تشکیل کی تھی۔ اگر بانیانِ جامعہ چاہتے تو وہ انگریزی تعلیمی اداروں میں اپنی جگہ بنا کر ایک آرام دہ اور خوشحال زندگی گزار سکتے تھے، مگر انہوں نے اپنے اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کے بجائے ملک کی آزادی اور عوام کے حقوق کو ترجیح دی۔

افسوس کہ آج حالات اس قدر دگرگوں ہو چکے ہیں کہ جامعہ کی انتظامیہ بھگوا حکومت کے اشارے پر پولیس کو کیمپس میں بلا کر اپنے ہی طلبہ کی آواز دبانے کی کوشش کر رہی ہے۔

انتظامیہ کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ ایک دن وہ بانیانِ جامعہ کے مزارات پر جا کر گلپوشی کرتی ہے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کا عہد کرتی ہے، لیکن اگلے ہی دن وہی انتظامیہ طلبہ جہدکاروں کو علی الصبح، جب پوری دہلی نیند کی آغوش میں ہوتی ہے، چپکے سے دھرنے کی جگہ سے اٹھوا کر پولیس کے حوالے کر دیتی ہے۔

جامعہ انتظامیہ یونیورسٹی میں جمہوری آوازوں کو دبانے کے لیے ہر روز ایک نئی سازش رچ رہی ہے۔ اگر حکمراں جماعت کی نیت واقعی درست ہوتی تو وہ انتظامیہ میں صاف ستھری شبیہ رکھنے والے افراد کو تعینات کرتی، تاکہ وہ طلبہ کے مفادات کو اولین ترجیح دے سکیں۔ مگر بھگوا حکومت نے لیاقت اور صلاحیت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے افراد کو بڑے عہدوں پر فائز کیا ہے، جن کی وفاداری ملک کے سیکولر اور سوشلسٹ آئین سے زیادہ ہندو قومیت پر مبنی تفریق انگیز نظریے اور بھگوا جماعت کے پروگرام سے ہے۔

اگرچہ سابقہ حکومتوں کے دور میں بھی جامعہ انتظامیہ نے طلبہ کے حقوق کو نظر انداز کیا، لیکن گزشتہ دس سالوں میں انتظامیہ نے اقتدار کی چاپلوسی کے تمام ریکارڈ توڑتے ہوئے طلبہ کے حقوق کو بری طرح کچل ڈالا ہے۔

جامعہ انتظامیہ کے جانبدارانہ رویے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنے ادارے کو بھگوا تنظیموں کے پروگراموں کے لیے پوری طرح کھول رکھا ہے۔ ہر روز انتظامیہ بھگوا نظریے سے جڑے لیڈروں کے استقبال کے لیے ریڈ کارپٹ بچھاتی ہے، لیکن جب طلبہ جمہوری طریقے سے کسی تقریب کا انعقاد کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اجازت نہیں دی جاتی۔

کوئی جامعہ انتظامیہ سے یہ پوچھے کہ اگر طلبہ یونیورسٹی کے اندر تقریبات، جلسے اور اپنے واجب مطالبات کے حق میں پُرامن دھرنے اور مظاہرے نہیں کریں گے، تو پھر کہاں کریں گے؟

یونیورسٹی سیاسی شعور کا ایک اہم مرکز ہوتی ہے۔ اگر یہاں طلبہ کو اپنی رائے کے اظہار اور حکومت سے سوال کرنے کا موقع نہ دیا جائے، اور سوال پوچھنے کی پاداش میں انہیں یونیورسٹی سے نکال کر پولیس کے حوالے کر دیا جائے، تو پھر جیل اور یونیورسٹی میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟

حالانکہ جیلوں میں بھی اکثر دھرنے اور ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ شہیدِ اعظم بھگت سنگھ نے بھی جیل میں احتجاج کیا تھا۔ جامعہ انتظامیہ ان کی یومِ شہادت پر ان کی تصویر پر گل پوشی تو کرتی ہے، مگر ان کی تعلیمات کے برخلاف یونیورسٹی کو جیل میں تبدیل کر رہی ہے۔

جامعہ میں جس طرح ایک درجن سے زیادہ طلبہ کو احتجاج کرنے کے 'جرم' میں پولیس کے ذریعے زبردستی دھرنے سے اٹھوایا گیا، جس طرح بعض طلبہ کے ساتھ بدسلوکی کی گئی، انہیں وکیل سے رابطے کے جمہوری حق سے محروم رکھا گیا، اور بعد میں انہیں یونیورسٹی سے معطل کر دیا گیا، یہ کسی جمہوری ملک کی یونیورسٹی کا نہیں بلکہ کسی آمرانہ نظام کے تحت چلنے والے ادارے کا منظرنامہ پیش کرتا ہے۔

گزشتہ 13 فروری کی صبح، جن طلبہ کو پولیس نے دھرنے سے اٹھایا اور ان پر ظلم و زیادتی کی، انہوں نے الزام لگایا ہے کہ یہ سب کچھ جامعہ انتظامیہ اور بھگوا حکومت کی ملی بھگت کا نتیجہ ہے، جو جامعہ کی تاریخ اور اس کی وراثت کو برباد کر کے اس کا 'بھگوا کرن' کرنا چاہتے ہیں۔

مظاہرین طلبہ کا کہنا ہے کہ ان کا صرف اتنا ہی 'قصور' تھا کہ وہ 15 دسمبر کو یونیورسٹی میں ایک پروگرام منعقد کر کے اس دن کو یومِ مزاحمت کے طور پر منانا چاہتے تھے۔ یہ وہی دن ہے جب 2019 میں جامعہ کے طلبہ سی اے اے اور این آر سی جیسے غیر جمہوری قوانین کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس وقت ملک کی حزبِ اختلاف کو بھی یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان قوانین کے خلاف کیسے لڑا جائے، کیونکہ کئی سیکولر پارٹیوں کے اندر دائیں بازو کے عناصر سرگرم تھے۔

ان کا ماننا تھا کہ اگر وہ سی اے اے اور این آر سی کے خلاف کھل کر احتجاج کریں گے، تو بی جے پی انہیں 'ہندو مخالف' قرار دے کر مزید سیاسی نقصان پہنچائے گی۔

سیکولر پارٹیاں اگر آج کمزور ہو چکی ہیں، تو اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ جب انہیں محکوم طبقات کے ساتھ کھڑے ہونے کا وقت آتا ہے، تو وہ مصلحت پسندی کے نام پر مجرمانہ خاموشی اختیار کر لیتی ہیں۔

سال 2019 میں بھی ایسی ہی صورتحال تھی، جب آئین پر اتنے بڑے حملے کے باوجود اپوزیشن پارٹیاں احتجاج کرنے میں ناکام رہیں۔ مگر جامعہ کے طلبہ نے تحریک جامعہ اور اس کی وراثت کو اپنے سینوں میں اتارتے ہوئے دھرنے پر بیٹھنے کا فیصلہ کیا اور حکومت کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہا کہ وہ اس قانون کو کسی صورت قبول نہیں کریں گے، کیونکہ یہ آئین کے بنیادی اصول سیکولرازم کی صریح خلاف ورزی ہے۔

سی اے اے اور این آر سی کے خلاف، سال 2019 میں جامعہ کے طلبہ دھرنے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت کی جامعہ انتظامیہ نے طلبہ کے جمہوری حقوق کا تحفظ کرنے کے بجائے، 15 دسمبر کو پولیس کو کیمپس میں بلا کر مظاہرین پر لاٹھیاں برسوائیں۔

پولیس کی بربریت کا عالم یہ تھا کہ لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرتے ہوئے طلبہ کو بھی نہ بخشا گیا اور انہیں بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مذکورہ سانحے کو پانچ سال مکمل ہونے پر، 15 دسمبر کو یومِ مزاحمتِ کے طور پر منانے کا پروگرام تھا۔

یاد رہے کہ سی اے اے اور این آر سی کی مخالفت کرنے کے 'جرم' میں جامعہ کے بہت سے طلبہ کو ملزم بنایا گیا ہے، اور کچھ آج بھی جیلوں میں قید ہیں۔ میران حیدر بھی ان میں سے ایک ہیں، جو آج تک ضمانت کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

اس سال جامعہ کے طلبہ 15 دسمبر کو یومِ مزاحمت جامعہ کی مناسبت سے ایک تقریب منعقد کرنا چاہتے تھے، مگر جامعہ انتظامیہ نے نہ صرف انہیں ایسا کرنے سے روکا بلکہ پولیس کے ذریعے طلبہ کو کیمپس سے اٹھوا دیا اور ایک درجن سے زیادہ طلبہ کو یونیورسٹی سے معطل کر دیا۔ یہ تمام طلبہ مخالف کارروائیاں نہ صرف ملک کے نوجوانوں کے مستقبل سے کھلواڑ ہیں، بلکہ جامعہ کی تحریک اور اس کی وراثت کی توہین بھی ہیں۔

جامعہ انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ فوری طور پر طلبہ کی معطلی کا فیصلہ واپس لے، قصوروار افسران کے خلاف کارروائی کرے اور آئندہ یونیورسٹی کو طلبہ کے مفادات کے مطابق چلائے، نہ کہ اس تاریخی درسگاہ کو فرقہ پرست طاقتوں کے اڈے میں تبدیل کرے۔

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے۔)

Categories : خبریں (https://thewireurdu.com/category/news/), فکر و نظر (https://thewireurdu.com/category/commentary-and-analysis/)

Tagged as: Delhi (https://thewireurdu.com/tag/delhi/), Delhi Police (https://thewireurdu.com/tag/delhi-police/), jamia millia islamia (https://thewireurdu.com/tag/jamia-millia-islamia/), Jamia Protest (https://thewireurdu.com/tag/jamia-protest/), muslim community

جامعہ کی تحریک ملک کو بچانے کے لئے ہے

شہریت کا بل لا کر، بھگوا حکومت گاندھی کے ملک میں ساورکر کے نظریہ کو مسلط کرنا چاہتی ہے

ابھے کمار

آج بھی وہ کالی رات آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ وہ خوفناک رات جب جامعہ پر لاٹھیاں برس رہی تھیں۔ پھول کے جیسے جامعہ کے طلبہ کو بری طرح سے مارا اور پیٹا جا رہا تھا۔ پولیس بلا امتیاز لاٹھیاں برسائی جا رہی تھیں۔ ہر طرف چیخ وپکار کی آواز گونج رہی تھی۔ سڑک سے لے کر کیمپس تک طلبہ کو دوڑا دوڑا کر مارا جا رہا تھا۔ زیادتی کا عالم یہ تھا کہ لائبریری میں بیٹھے طلبہ کو بھی نہیں بخشا گیا۔ حکومت کے اشارے پر کیے جا رہے اس تشدد نے دیکھتے ہی دیکھتے جامعہ کو خون سے لت پت کر ڈالا۔

حیوانیت کا یہ منظر تقریباً ایک سال پہلے یعنی ۱۵ دسمبر ۲۰۱۹ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیکھا گیا۔ جامعہ کے بچوں کا صرف اتنا قصور تھا کہ وہ ملک کے آئین کو بچانے کے لئے احتجاج کر رہے تھے۔ ہڈیوں کو چھیدنے والی سردی کے درمیان ان کو کھلے آسمان کے نیچے دھرنے پر بیٹھنا پڑا۔ وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ سیکولرازم، یعنی آئین کے اہم ستون، پر حملہ ان کو ہرگز بھی قابل قبول نہیں تھا۔

آج سے سو سال پہلے جامعہ اسی سیکولرازم کی 'ماٹی' سے نکلی ہے۔ جامعہ کے چمن کی آبیاری مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، محمود الحسن (دیوبند)، حکیم اجمل خاں، مختار احمد انصاری، ذاکر حسین جیسی دیگر اہم شخصیات نے کی، جو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر بھی تھے۔ ملک کی آزادی اور سیکولرازم کی علامت شروع سے ہی جامعہ رہی ہے۔ ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا دوسرا نام جامعہ رہا ہے۔ ہمارے ملک کے آئینی اقدار بھی سیکولرازم، مساوات اور شخصی آزادی رہے ہیں۔ جامعہ کے طلبہ انہیں اقدار کے تحفظ کے لیے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال چکے تھے۔

جامعہ کے طلبہ کی لڑائی اسی دھرم، مذہب یا کمیونٹی سے نہیں تھی۔ نہ یہ ان کا جھگڑا کسی مخصوص افراد سے تھا۔ وہ ایک خاص ذہنیت سے لڑ رہے تھے۔ وہ لوگوں کے مذہب کے نام پر بانٹنے والے حکمرانوں سے اپنی غیر اتفاقی کا اظہار کر رہے تھے۔ ملک کی برسر اقتدار جماعت کو لگتا تھا کہ وہ طاقت کے زور پر کیسا بھی قانون پاس کرا سکتی ہے۔ دیش کے حکمرانوں کو اس بات کا غرور ہو چلا تھا کہ دھرم اور مذہب کی سیاست کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کو ایسا لگنے لگا تھا کہ وہ گاندھی کے امن کے پیغام کو مٹا کر گوڈسے کی نفرت انگیز باتوں کو لکھ دیں گے۔ وہ بھگت سنگھ، امبیڈکر اور مولانا آزاد کے نظریات کو مٹا کر ملک پر گوڈسے اور ساورکر کی باتوں کو تھوپنا چاہتے تھے۔ ہندوتوا کے ایک بڑے ایجنڈے کو تھوپتے ہوئے، بھگوا حکومت نے سال ۲۰۱۹ کے آخر میں شہریت ترمیمی قانون کو تھوپ ڈالا۔ قانون بناتے وقت اور اسے پاس کراتے وقت سرکار نے کوئی بحث نہیں کی۔ سرکار کو لگتا تھا کہ پارلیمنٹ میں اکثریت کے زور پر وہ اسے پاس کروا لے گی اور لوگوں کو اسے ماننے کے لیے مجبور کر دے گی۔

آسان الفاظ میں کہا جائے تو شہریت قانون مذہبی امتیاز پر مبنی ہے۔ یہ ملک کے آئینی اقدار کے خلاف ہے۔ یہ سیکولرازم اور مساوات کے خلاف ہے۔ اس قانون کے تحت افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے ہندو، سکھ، بودھ، عیسائی پناہ گزینوں کو ہندوستان میں شہریت مل سکتی ہے، مگر انہیں ملکوں کے مسلمانوں کو نہیں۔ مختصر یہ کہ شہریت قانون میں ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر تعصب کا شکار بنایا گیا ہے۔ اس طرح کا قانون لانے کے پیچھے بھگوا طاقتوں کا اصل مقصد بھارت کو ہندو راشٹر کی طرف ایک قدم اور دھکیلنا ہے۔ شہریت قانون کو لا کر بھگوا طاقتیں ملک کے سیکولر دستور کو بھی بدلنے کا مشق کر رہی تھیں۔ الغرض، وہ مسلمانوں کو شہریت کے قانون سے باہر کر کے آئین کے سیکولر ڈھانچہ کو توڑنا چاہتی ہے۔ مگر شہریت قانون کی مخالفت کرنے کی ہمت ملک کی یونیورسیٹوں نے دکھلایا۔ یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ جامعہ کے طلبہ اس لڑائی کو لڑنے میں آگے آگے رہے۔ جب ملک کی سول سوسائٹی، میڈیا وغیرہ سب خوف زدہ تھے، تب طلبہ نے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ جب ملک کے قائدین اپنے محلوں میں تھے، تب یونیورسٹی کے نوجوانوں نے ملک کو بچانے کے لئے مٹھی تانی۔

جامعہ کا شہریت مخالف مظاہرہ حکمرانوں کو یہ یاد دلانے کی پوری کوشش کرتا رہا کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا نہیں ہے اور نہ ہی یہ ملک صرف مسلمانوں کا ہے۔ بلکہ یہ ملک سب کا ہے۔ کوئی بھی حکومت مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کر سکتی ہے، کیونکہ ملک کا آئین اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔

کسی بھی جمہوری حکومت کو بات چیت سے تنازع کو دور کرنا چاہیے۔ امن اور مکالمہ کی راہ پر گامزن ہونا چاہیے۔ لیکن دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، کی حکومت نے مکالمہ، کا راستہ چھوڑ دیا، اور لاٹھی اور پولیس پر بھروسہ کیا۔ ۱۵ دسمبر، ۲۰۱۹ کی اسی رات اچانک پولیس کا ایک بڑا ہجوم جامعہ پر ٹوٹ پڑا۔ نہتے طالب علموں پر حملہ کیا گیا۔ یہ چوٹ جامعہ پر ہو رہی تھی، مگر خون سیکولر کے دستور کا بہہ رہا تھا۔

شہریت قانون بہت حد تک ہندوتوا کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ ہندوتوا کے نظریہ ساز وی ڈی ساورکر نے اپنی پوری زندگی سیکولر اصولوں پر مبنی شہریت کی مخالفت کی۔ ساورکر چاہتے تھے کہ شہریت کی بنیاد خون، نسل، ثقافت مانا جائے۔ ایسی فرقہ وارانہ سوچ آئین کے اقدار کے منافی ہے۔ حالانکہ ساورکر نے کھلے طور پر اپنی تحریروں میں مذہب کا تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن وہ درحقیقت مذہب کی ہی بات کر رہے تھے۔ وہ شہریت کی سیکولر بنیاد کو ختم کرنا چاہتے تھے اور اس کو ہندو قوم پر منحصر کرانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندو قوم کو ہندوستانی ثقافت اور تاریخ کا بنیاد، سمجھا اور کہا کہ مسلمان اور عیسائی ہندو قوم سے الگ ہیں، کیونکہ ان کے مقدس مقامات ہندوستان سے باہر ہیں۔

شہریت کا بل لا کر، بھگوا حکومت گاندھی کے ملک میں ساورکر کے نظریہ کو مسلط کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، ہندوتوا کی حکومت ہندوستانی آئین کو زعفرانی رنگ میں رنگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیکن ملک کی یونیورسٹی اس خطرے کو پوری طرح سمجھ چکی تھی۔ جامعہ، علی گڑھ، جے این یو، آسام، حیدرآباد یونیورسٹی نے نفرت کی اس سیاست کی مخالفت کے لیے سامنے آئی اور سرکار کو صاف طور پر کہہ دیا کہ مذہب پر مبنی قانون سیکولر انڈیا کو قابل قبول نہیں ہے۔ جامعہ کا شہریت مخالف مظاہرہ حکمرانوں کو یہ یاد دلانے کی پوری کوشش کرتا رہا کہ یہ ملک صرف ہندوؤں کا نہیں ہے اور نہ ہی یہ ملک صرف مسلمانوں کا ہے۔ بلکہ یہ ملک سب کا ہے۔ کوئی بھی حکومت مذہب کی بنیاد پر شہریوں کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کر سکتی ہے، کیونکہ ملک کا آئین اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔

جامعہ تحریک مکمل طور پر پرامن انداز میں منظم کی جا رہی تھی، جس میں ہندو مسلمان، دلت پسماندہ قبائلی، مرد اور خواتین سب شامل تھے۔ یہ تحریک حکمرانوں کو یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ملک کی آزادی اور ملک کی تعمیر کے لئے تمام لوگوں نے قربانیاں دی ہیں۔ جامعہ کی تحریک ہندوستان جیسے خوبصورت ملک کو بچانے کے لئے ہے۔ جامعہ کی لڑائی اپنی یونیورسٹی کی تاریخ بتا رہی تھی کہ کیمپس کی تعمیر میں گاندھی جی کی شراکت اتنی ہی ہے جتنی ذاکر حسین کی ہے۔ جامعہ کی تعمیر قومی تعلیمی پالیسی پر مبنی تھی۔ اس چمن میں ہر مذہب اور فرقے کے پھول کھلے ہیں۔

اگرچہ اس پرامن تحریک کو ظلم اور جبر کے ذریعہ دبا دیا گیا تھا، لیکن کوئی بھی جابر قوتیں اسے تاریخ کے صفحات سے مٹا نہیں سکتی ہیں۔ شاید یہ تحریک گھاس کی طرح تھی۔ گھاس کمزور اور نازک نظر آسکتی ہے، لیکن اس کے اندر بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ بڑے درخت زلزلے اور سیلاب میں گر پڑتے ہیں، لیکن گھاس کچھ وقت کے لئے مرجھا تو سکتی ہے، لیکن گھاس دوبارہ پھر پنپ کر شاداب ہو جاتی ہے۔ گھاس کبھی ہمت نہیں ہارتی۔ جامعہ کے طلبہ نے ہمیں زندگی جینے کا سبق سکھلایا ہے۔ سبق یہ ہے کہ زندگی کا دوسرا نام ہی مزاحمت ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

فکر و نظر

کیا جامعہ واقعی 'ہندومخالف' اور 'جناح پریمی' ہے؟

ابھے کمار 11/05/2018

جامعہ ملیہ اسلامیہ معاملہ: جن کے اکابرین نے خود کبھی انگریزوں سے لوہا نہیں لیا اور اپنی ساری توانائی عوام کو مذہب کے نام پر تقسیم کرنے میں لگائی، وہی آج ملک میں دیس بھکتی کے ''ٹھیکیدار'' بن بیٹھے ہیں۔

فوٹو: پی ٹی آئی

منگل کی شام دہلی میں واقع تاریخی تعلیمی ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مین گیٹ پر پہنچ کر، تقریباً 10 سے 15 ہندو شدت پسند عناصر نے 'جناح پریمی دیس چھوڑو' اور 'ہندوؤں کا اَپمان نہیں سہے گا ہندوستان' جیسے اشتعال انگیز نعرے دینے لگے اور ماحول کو بگاڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ حالانکہ شرپسندوں کو گیٹ سے اندر داخل ہونے سے روک دیا گیا، جس کی وجہ سے ایک بڑا ناخوشگوار واقعہ ہوتے ہوتے ٹل گیا۔ واقعہ کے بعد شرپسندوں نے جامعہ کے طلبا کو دھمکیاں بھی دیں۔ تادم تحریر جامعہ میں بے چینی، اضطراب اور عدم تحفظ کی کیفیت بنی ہوئی ہے۔

جامعہ کے طلبا اسے ایک بڑی سازش کا حصہ مان رہے ہیں۔ ان کا خدشہ ہے کہ یہ سب مذہبی منافرت و کشیدگی پھیلانے اور مسلمانوں کو ملک بھر میں 'بدنام' کرنے کی ایک نئی سازش تھی۔ جامعہ پر ہوئے اس حملے کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر ہوئے حالیہ حملہ سے جوڑ کر دیکھا جا رہا ہے، جہاں شدت پسندوں نے نہ صرف سابق نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری پر حملہ کیا، بلکہ جامعہ کی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو 'جناح پریمی' کہہ کر گالیاں دیں۔

دریں اثنا، مثبت پہلو یہ ہے کہ جامعہ کے طلبا نے اپنا موقف سامنے لانے میں سوشل میڈیا کا اچھا استعمال کیا ہے۔ ہندو فرقہ پرستوں کو بے نقاب کرنے میں جامعہ کے بہت سارے ہندو طلبا نے سوشل میڈیا پر لکھا ہے کہ وہ 'ہندو' ہیں مگر جامعہ میں اپنے آپ کو 'غیر محفوظ' محسوس نہیں کرتے۔ جامعہ کی ایسی ہی ایک طالبہ انشل بھامرا ہیں، جنہوں نے اپنے بلاگ پر سوال اٹھایا ہے اگر مان لیا جائے کہ جامعہ میں تعداد کم ہونے کی وجہ سے ہندو طلبا غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں، تو کیا ہندو فرقہ پرست عناصر یہ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ملک کے دیگر حصوں میں اقلیت بشمول مسلمان، سکھ، عیسائی، عدم تحفظ میں بتلا رہتے ہیں؟

راقم الحروف نے بھی جامعہ سے (ایم اے پولیٹیکل سائنس) ہی پڑھائی کی ہے۔ اس درسگاہ سے میری قربت اس وجہ سے بھی ہے کہ میں نے اپنی زندگی کے دو بہترین سال اے ایم خواجہ ہاسٹل، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں گزارے ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے ہمارا ہاسٹل اے ایم خواجہ (1885-1962) کے نام پر رکھا گیا ہے، جو سال 1936 سے 1962 تک

امیر جامعہ تھے اور جنہوں نے اپنی پوری زندگی جامعہ کی خدمت میں گزار دی۔ ان کی خدمت ان معنی میں بھی اہم ہے کہ وہ دور جامعہ کے لئے بحران کا دور تھا۔

فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈہ کے بر عکس، جامعہ میں غیر مسلم طلبا کی ایک بڑی تعداد پر امن ماحول اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا میں تعلیم حاصل کرتی ہے۔ ہاسٹلوں میں بھی میں نے بڑی تعداد میں غیر مسلم طلبا کو رہتے ہوئے پایا۔ غیر مسلم ہونے کی وجہ سے میں نے کبھی بھی تعصب اور امتیاز محسوس نہیں کیا۔ ہاسٹل میں ہم سب کو جمعہ اور اتوار کا بے صبری سے انتظار ہوتا تھا۔ جمعہ کی شام کو 'چکن قورمہ' اور 'فروٹ کریم' ملتا، اتوار کی صبح ناشتے میں آلو پراٹھا اور دھنیا کی چٹنی ملتی تھی، جو کافی لذیذ ہوتی تھی۔

ہفتہ بھر کے انتظار کے بعد، ہم اتوار کی شام کو چکن بریانی کا لطف لیتے۔ رمضان کا انتظار سب کو ہوتا تھا۔ افطار میں ملنے والی پکوڑی کی لذت مانو اب بھی ہمارے ذائقہ میں ہے۔ مہینہ کے آخر میں ایک 'گرانڈ' افطار کا انتظام ہوتا تھا۔ سال 2008 کی بات ہے۔ ایک ایسی ہی یاد، رمضان کے گرانڈ افطار کی ہے۔ جمعہ کی شام تھی۔ میں دوپہر کے وقت خواجہ ہاسٹل کے ریڈنگ روم میں پڑھ رہا تھا، مگر میں یہی سوچ رہا تھا کہ کب سورج ڈوبے اور ہمیں افطار ملے۔ تبھی کچھ پٹاخے جیسی آواز آئی۔ میں نے اسے نظر انداز کیا۔ مگر تھوڑی دیر میں میرے ایک صحافی دوست کا فون آیا اور اس نے کہا کہ پاس میں ہی پولیس انکاؤنٹر ہوا ہے، جس کو ہم 'بٹلہ ہاوس' انکاؤنٹر کے نام سے جانتے ہیں۔

جو لوگ بھی جامعہ کی حب الوطنی پر سوال اٹھا رہے ہیں یا اس پر 'جناح پریمی' ہونے کا بیہودہ الزام عائد کر رہے ہیں وہ نہ صرف جامعہ بلکہ تحریک آزادی کے مجاہدوں کی تذلیل کر رہے ہیں۔ جن کے اکابرین نے خود کبھی انگریزوں سے لوہا نہیں لیا اور اپنی ساری توانائی عوام کو مذہب کے نام پر تقسیم کرنے میں لگائی، وہی آج ملک میں دیس بھکتی کے "ٹھیکیدار" بن بیٹھے ہیں۔ نامور مورخ سریش چندر گھوش نے اپنی کتاب 'دی ہسٹری آف ایجوکیشن ان ماڈرن انڈیا' میں صاف طور سے لکھا ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تشکیل تحریک عدم تعاون کے نظریہ سے متاثر ہو کر ہوئی، جب ملک کے قومی رہنماؤں نے انگریزی نظام تعلیم سے ہٹ کر ہندوستانی قومی تعلیمی ادارے قائم کرنے کی بات کہی۔ 1920 کے ناگپور قرارداد میں کانگریس نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے بچوں کو انگریزی حکومت کے ماتحت اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکالیں اور خود مختار قومی اسکول اور کالج کھولیں۔

ٹیگور کا وشو بھارتی، گروکل اور جامعہ جیسے قومی تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔ جامعہ کی شبیہ خراب کرنے کی کوشش کرنے والے فرقہ پرست اس پر پردہ پوشی کرتے ہیں کہ سامراجیت مخالف آئیڈیالوجی اور جذبہ قومیت سے سرشار ہو کر ہی وجود میں آیا۔ جامعہ کے قیام میں مہاتما گاندھی نے بھی کافی نمایاں رول ادا کیا۔ مشہور مورخ مشیر الحسن اور رخشندہ جلیل نے اپنی کتاب 'پارٹنرز ان فریڈم: جامعہ ملیہ اسلامیہ' میں کہا ہے کہ گاندھی نے جامعہ کے مالی تعاون سے لے کر اس کی ہر طرح سے مدد اور ستائش کی۔ گاندھی کے متبع صنعت کار جمنا لال بجاج، بیٹا دیو داس گاندھی، قریبی دوست مادھو دیسائی جامعہ سے جڑے ہوئے تھے۔ گاندھی نے اپنے پوتے رسک لال کو جامعہ میں پڑھنے کے لئے بھیجا۔

جامعہ جب 29 اکتوبر 1920 کو وجود میں آیا تب سے لے کر آج تک جامعہ کے دروازے تمام مذاہب و مکاتب فکر کے لوگوں کے لئے کھلے رہے ہیں۔ اپنے شروعاتی دن سے لے کر آج تک جامعہ میں ہندو، مسلمان سب ساتھ میں پڑھتے اور رہتے

ہیں۔ پروفیسر مشیرالحسن اور رخشندہ جلیل کے الفاظ میں "ہندو اور مسلم طلبا نہ صرف [جامعہ میں] پڑھتے تھے، بلکہ ایک ساتھ کھاتے اور سوتے بھی تھے"۔ جامعہ میں اس دور سے ہی ہندوؤں کی مقدس سمجھی جانے والی کتاب 'گیتا' پڑھائی جاتی تھی اور سنسکرت اور ہندی پڑھنے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔جامعہ کے بانیوں میں سے ایک اور اس کے پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علی جوہرنے سال 1926-1925میں 'ہمدرد' میں لکھتے ہوئے یہ صاف طور سے کہا کہ جامعہ کے "دروازے ہر مذہب کے لئے کھلے ہوئے ہیں"۔

جامعہ کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ مگر افسوس کہ فرقہ پرست طاقتیں جامعہ کی شبیہ بگاڑنے اور اسے بدنام کرنے کے لئے ہر طرح کی تخریب کاری کر رہی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جب سے سنگھی طاقتیں برسراقدار آئی ہیں تب سے تخریب کاریوں میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ جامعہ میں پہلے سے کہیں زیادہ آر ایس ایس کی طلبا تنظیم اے بی وی پی مضبوط ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے درمیان متحرک 'آر ایس ایس کی تنظیم 'مسلم راشٹریہ منچ' جامعہ میں کافی سرگرم ہوئی ہے اور اس کی تخریب کاری کو روکنے میں انتظامیہ ناکام ہے۔گزشتہ سال رمضان میں مسلم راشٹریہ منچ نے افطارپارٹی کا انتظام جامعہ میں کیا تھا، جس میں اندریش کمار کو مدعو کیا گیا تھا۔

آر ایس ایس لیڈر اور مسلم راشٹریہ منچ کے سرپرست اندریش کمار 2007 اجمیر بم دھماکہ کیس میں ملزم بنائے گئے تھے، جن کو اب عدالت نے بری کر دیا ہے۔ اس پروگرام کی مخالفت کرنے پر پولیس نے طلبا کی پٹائی کی اور ان میں سے متعدد کو حراست میں لیا گیا ۔مگر اس پروگرام کے نام پر مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کے لئے اندریش کمار پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ اندریش کمار نے مسلمانوں کو صلاح دی کہ گوشت نہ کھائیں، کیوں کہ اس سے بیماری ہوتی ہے اور افطار میں گائے کا دودھ پیئیں اور تلسی کا پودا اپنے گھر میں لگائیں، جو ان کو جنت لے جانے میں مدد کرے گا۔

ان تمام سنگھی حرکتوں کے پیچھے ایک ہی مقصد ہے کہ کسی طرح سے ہندو مسلم ہم آہنگی کو نقصان پہنچایا جائے اور لوگوں کو مذہب کے نام پر تقسیم کیا جائے۔ اسی لئے جامعہ پر جو حملہ ہو رہا ہے وہ حملہ چند منچلوں کے دماغ کا فتور نہیں ہے بلکہ ایک بڑی سازش کا حصہ ہے، جس کا نشانہ بظاہر مسلمان دکھ رہے ہیں اور اصلاًوہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ اس کا اصل نشانہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور یہاں کی جمہوریت ہے۔

Related

شہریت قانون: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پراکٹر نے استعفیٰ دیا
شہریت قانون: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پراکٹر نے استعفیٰ دیا

اے ایم یو اور جامعہ میں دلتوں کو ریزرویشن ملنا چاہیے: یوگی آدتیہ ناتھ
اے ایم یو اور جامعہ میں دلتوں کو ریزرویشن ملنا چاہیے: یوگی آدتیہ ناتھ

اے ایم یو تنازعہ: طلبا سنگھ کے غنڈوں کے خلاف کھڑے ہیں اور میڈیا جناح کی تسبیح گنے جا رہا ہے
اے ایم یو تنازعہ: طلبا سنگھ کے غنڈوں کے خلاف کھڑے ہیں اور میڈیا جناح کی

تصویر وطن

جے این یو کو کرائے پر دینے کی تیاری

ابھے کمار

ستمبر 2024

ملک کی دارالحکومت دہلی میں واقع جواہرلال نہرو یونیورسٹی یعنی جے این یو بلا شبہ ملک کا تعلیمی سرمایہ ہے۔ اس بات کا اعتراف نیاک (نیشنل اسسمنٹ اینڈ ایکریڈیٹیشن کونسل) بھی کرتا ہے اور اسے ملک کی ٹاپ یونیورسٹی کے زمرے میں رکھتا ہے۔یہی نہیں، یو جی سی نے یونیورسٹی کے کئی تعلیمی مراکز کو 'سینٹرز آف ایکسیلنس' قرار دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جے این یو میں پڑھنے کی خواہش لاکھوں طلبہ اور طالبات کی ہوتی ہے۔ جو بچے شعبہ فن و بشریات، سماجی علوم اور بین الاقوامی امور میں داخلہ لینا چاہتے ہیں، ان کی پہلی پسند اکثر جے این یو ہی ہوتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں بھارت اور بیرونی ممالک سے تعلق رکھنے والے طلبہ اور طالبات جے این یو میں داخلہ پانے کے لیے سالوں سال تیاری کرتے ہیں، اور ان میں سے کچھ ہی خوش قسمت امیدواروں کو اَراولی کی پہاڑی پر بسے اس خوبصورت یونیورسٹی میں پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔

ملک میں تحقیق اور ریسرچ کو فروغ دینے اور سماج کے دبے کچلے طبقات کو صلاحیت تربیت دینے کے لیے جے این یو کا قیام عمل میں آیا۔ یہ یونیورسٹی 1966 میں پارلیمنٹ سے پاس کیے گئے جے این یو ایکٹ کے تحت وجود میں آئی، جس میں اس یونیورسٹی کے مقاصد واضح ہیں۔ اس یونیورسٹی کی تشکیل سماجی انصاف کے اصولوں پر کی گئی تھی۔ جے این یو ایکٹ واضح طور پر کہتا ہے کہ "یونیورسٹی ان اصولوں کے مطالعہ کو فروغ دینے کی کوشش کرے گی جن کے لیے جواہر لعل نہرو نے اپنی زندگی کے دوران کام کیا، جیسے قومی یکجہتی، سماجی انصاف، سیکولرازم، جمہوری طرز زندگی، بین الاقوامی تفہیم اور معاشرتی مسائل کے لیے سائنسی نقطہ نظر"۔

مگر بہت ہی دُکھ کی بات ہے کہ گزشتہ ۱۰ سالوں میں جے این یو کے تشخص کو بدلنے کے لیے ہر طرح کی سازشیں کی گئی ہیں۔ جہاں ایک طرف جے این یو کے بیدار طلبہ و طالبات کو دانستہ طور پر نشانہ بنایا گیا ہے اور ان میں سے بعض کو جیل میں قید بھی کیا گیا ہے، وہیں فلاحی کاموں سے متعلق فنڈز میں بھی کمی کر دی گئی ہے۔ آج حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ اس یونیورسٹی کے بعض

اثاثوں کو بازار میں کرائے پر دینے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ سب نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی حکومت کی طلبہ مخالف پالیسی کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ میڈیا میں یہ بات گشت کر رہی ہے کہ ملک کے اس موقر تعلیمی ادارے کے اثاثوں کو کوڑی کے دام میں نجی کمپنیوں کو کرائے پر دینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس پورے معاملے پر آر ایس ایس اور بی جے پی کی مجرمانہ خاموشی ان کی دوہری سیاست کو عیاں کر رہی ہے۔ جہاں بھگوا تنظیمیں دن رات بھارت کو ''وِشو گرو'' بنانے کا خواب بیچتی ہیں، وہیں اس کے دور حکومت میں ملک کی ایک یونیورسٹی کو چلانے کے لیے اس کے اثاثوں کو بھاڑے پر پرائیویٹ کمپنیوں کو دینے کا بھی منصوبہ تیار کیا جا رہا ہے۔

جے این یو کے بعض اثاثوں کو کرائے پر دینے کی بات خود جے این یو کی وائس چانسلر پروفیسر سانتی شری دھولی پوری پنڈت نے پریس کے سامنے آکر کہی ہے۔ 'دی انڈین ایکسپریس' (17 ,اگست) میں ان کا تفصیلی بیان شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے کہا کہ جے این یو کے پاس گومتی گیسٹ ہاؤس اور 35 فیروز شاہ روڈ جیسے اثاثے ہیں۔ یونیورسٹی انتظامیہ ان اثاثوں کو پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ کے ماڈل پر کرائے پر دینے کا متمنی ہے تاکہ یونیورسٹی کو مسلسل فنڈز مل سکیں۔ ایک اور اہم بات جو جے این یو کی وائس چانسلر نے کہی وہ یہ تھی کہ یونیورسٹی کیمپس کے اندر موجود ایک درجن کے قریب قومی ادارے، جو اسے کرایہ نہیں دیتے، ان سے بھی کرایہ لینے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ گومتی گیسٹ ہاؤس دہلی کے مَنڈی ہاؤس کے قریب واقع ہے، جہاں فیڈریشن آف انڈین چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کی عمارت ہے۔ گومتی گیسٹ ہاؤس اس عمارت کے پیچھے واقع ہے۔ جے این یو کی وائس چانسلر نے کہا کہ یونیورسٹی انتظامیہ اسے کسی پرائیویٹ ادارے کو دینے کے بارے میں سوچ رہا ہے تاکہ یونیورسٹی کو ایک رقم کرائے کے طور پر

مل سکے۔ انتظامیہ کو امید ہے کہ گومتی گیسٹ ہاؤس سے فی ماہ 50 ہزار سے ایک لاکھ روپے تک کی آمدنی ہو جائے گی۔

جے این یو کی وائس چانسلر کی باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کی جائیدادوں کو "مانیٹائز" کیا جائے تاکہ یونیورسٹی کے پاس فنڈز کی کمی دور ہو سکے۔ پریس کو اس بارے میں مزید معلومات دیتے ہوئے جے این یو کی وائس چانسلر نے کہا کہ گومتی گیسٹ ہاؤس کے علاوہ، فیروز شاہ روڈ پراپرٹی پر انڈین چیمبر آف کامرس کے طرز پر ایک کثیر المنزلہ عمارت بنائی جائے گی، جس میں سیمینار ہال، آڈیٹوریم، اور گیسٹ ہاؤس شامل ہوں گے، اور انہیں پھر کرائے پر دے دیا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اس تعمیر میں دو سال سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔

علاوہ ازیں، جے این یو انتظامیہ یہ بھی کوشش کر رہا ہے کہ اس کے کیمپس کے اندر جو 12, قومی ادارے موجود ہیں، ان سے ہر ماہ کرایہ لیا جائے۔ جے این یو کی وائس چانسلر کو امید ہے کہ جب یونیورسٹی کے اثاثوں سے کرایہ آنے لگے گا تو یونیورسٹی کے پاس آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ تیار ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ یونیورسٹی فیس بڑھانے کے بارے میں نہیں سوچ رہی ہے، اس لیے کرایہ لینے کے علاوہ زیادہ متبادل نظر نہیں آ رہے ہیں۔ جے این یو کی وائس چانسلر نے اس بات کی طرف بھی اشارہ دیا کہ یونیورسٹی کیمپس میں سولر پینلز لگانے پر غور کیا جا رہا ہے تاکہ یونیورسٹی کو بجلی کے بل کے طور پر بڑی رقم نہ دینا پڑے۔ وائس چانسلر کا دعویٰ ہے کہ جے این یو کو ہر ماہ اپنے فنڈ کا ایک بڑا حصہ بجلی پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ طلبہ سب کچھ "مفت" چاہتے ہیں، یہاں تک کہ اے سی بھی۔ حالانکہ وائس چانسلر کا یہ بیان کہ طلبہ مفت خوری کی ذہنیت میں مبتلا ہیں، کافی مایوس کن ہے۔ جے این یو کے ہاسٹلوں میں صرف بلب، ٹیوب لائٹ، اور پنکھا چلانے کی اجازت ہوتی ہے، جبکہ انتظامیہ کے افسران کے کمروں میں اے سی لگا ہوتا ہے۔ خود وائس چانسلر کے چیمبر میں کئی سارے اے سی لگے ہوئے ہیں، مگر طلبہ کو ہاسٹل میں بلب اور پنکھے کا

معمولی سا بجلی بل بھی ادا کرنا ناگوار گزر رہا ہے۔ یہ بتلاتا ہے کہ جے این یو انتظامیہ معیاری تعلیم کو ہر طالب علم کو مہیا کرانے کے اپنے فریضے سے منہ موڑ رہی ہے اور وہ ہر چیز کو منافع خوری کے نقطہ نظر سے دیکھ رہی ہے۔

جے این یو کے اثاثوں کو کرائے پر دینے کے علاوہ، جے این یو انتظامیہ یونیورسٹی کو فی الحال مالی دباؤ سے نکالنے کے لیے 'انسٹی ٹیوٹ آف ایمیننس' کے درجہ کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اسے امید ہے کہ جیسے ہی جے این یو کو یہ اعزاز حاصل ہو جائے گا، اسے ایک ہزار کروڑ روپے کی مالی امداد مل جائے گی، جس سے یونیورسٹی ایک بڑی رقم بطور سود حاصل کرتی رہے گی، اور اس سے جے این یو کے مالی بحران سے نکلنے میں آسانی ہوگی۔ حالانکہ اس مطالبے کی حمایت میں بائیں بازو کی طاقتیں بھی سامنے آگئی ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے راجیہ سبھا رکن پی سندوش کمار نے مرکزی وزارت تعلیم کو خط لکھا ہے اور انہوں نے جے این یو کے لیے ''انسٹی ٹیوٹ آف ایمیننس'' کے درجہ کا مطالبہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنا خط وزیر تعلیم دھرمیندر پردھان کو ارسال کر کے جے این یو کے مالی بحران پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ سی پی آئی کے راجیہ سبھا ممبر نے جے این یو کے خراب انفراسٹرکچر کا بھی مسئلہ اٹھایا ہے اور اس بات پر بھی رنج کا اظہار کیا ہے کہ اساتذہ کی ترقیوں کو لے کر ناراضگی پائی جا رہی ہے۔ سی پی آئی ایم پی نے اپنے خط کے ذریعے وزیر تعلیم پردھان کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ جے این یو کے اثاثوں کو پرائیویٹ ہاتھوں میں دینے کی کوشش افسوسناک ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ انتہائی بد قسمتی کی بات ہے کہ جے این یو جیسے باوقار ادارے کو منافع خوری کی ذہنیت سے دیکھا جا رہا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی افسوس کا اظہار کیا ہے کہ مودی حکومت تعلیم عامہ پر سرکاری اخراجات کو کم کر رہی ہے۔

جہاں جے این یو کے مالی بحران کی بات ملک کے سیکولر اور بائیں بازو کے سیاست دان اٹھا رہے ہیں، وہیں جے این یو کے طلبہ و طالبات ''فنڈ کٹ'' اور اپنے حقوق پر ہو رہے حملوں کے

خلاف دھرنے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ گزشتہ دنوں جے این یو کے طلبہ و طالبات برسات کے اس موسم میں سابرمتی ٹی پوائنٹ کے پاس سڑک کے کنارے بھوک ہڑتال پر تھے۔ ان کی ہڑتال ایک ہفتے سے زیادہ دنوں تک چلی۔ انہوں نے 23 اگست کے روز وزارتِ تعلیم کے دفتر تک مارچ بھی نکالا۔ انہوں نے جے این یو میں مسلسل ہو رہے فنڈ کٹ کا مسئلہ اٹھایا۔ ان کے مطالبات میں ایک پہلو یہ ہے کہ طلبہ و طالبات کے لیے وظیفہ کو پانچ ہزار روپے تک کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے یونیورسٹی کے انفراسٹرکچر کو بہتر بنانے اور لائبریری کے ڈھانچے کو بہتر کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

مگر جے این یو طلبہ و طالبات کے مطالبات کو ابھی تک جے این یو انتظامیہ نظر انداز کر رہا ہے۔ طلبہ کے تمام مطالبات کو خارج کرنے کے لیے جے این یو وی سی کے پاس ایک آسان بہانہ ہے کہ یونیورسٹی کے پاس فنڈ نہیں ہے۔ مگر جے این یو کے طلبہ یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ اگر یونیورسٹی کے پاس واقعی فنڈز کی کمی ہے تو پھر یونیورسٹی کیسے جے این یو کے لوگو کو تبدیل کرنے کے لیے دو کروڑ روپے خرچ کر سکتی ہے؟ طلبہ یونین کا یہ بھی الزام ہے کہ یونیورسٹی لائبریری کے فنڈ میں 80 فیصد کٹوتی کر دی گئی ہے۔ جے این یو طلبہ کے مطالبات کو انتظامیہ بھلے ہی نظر انداز کر دے، مگر یہ بات اب اعداد و شمار کے حوالے سے سامنے آگئی ہے کہ جے این یو میں طلبہ کے فلاح سے متعلق فنڈ اور ریسرچ کے بجٹ میں کافی کمی آئی ہے۔ 31 اگست کے روز، انگریزی کے مشہور اخبار "ٹیلی گراف" میں ایک خبر جے این یو کے فنڈ کٹ سے متعلق شائع ہوئی، جس میں جے این یو کی سالانہ رپورٹ کی بنیاد پر دکھایا گیا ہے کہ جے این یو انتظامیہ نے اکیڈیمک بجٹ کو گزشتہ 10 سالوں میں 50 فیصد کم کر دیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق، سب سے زیادہ نقصان ریسرچ اسکالرز کو ہوا ہے، جو فیلڈ ورک کے لیے یونیورسٹی سے مالی تعاون کے متمنی تھے۔ سال 2014 کے بعد جب ملک میں نریندر مودی کی حکومت مرکز میں آئی تب سے مسلسل طلبہ و طالبات کے وظیفے میں بھاری

کمی کی گئی ہے۔ جے این یو نے گزشتہ ایک دہائی میں اکیڈیمک جرنلز کی خریداری بھی تقریباً بند کر دی ہے اور سیمینار کے لیے بھی گرانٹ بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اگر کوئی گرانٹ ملتا بھی ہے تو سب ایسے پروگرام ہوتے ہیں جو آر ایس ایس اور بی جے پی کے ایجنڈوں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ٹیلی گراف نے جے این یو کی اپنی سالانہ رپورٹ کے حوالے سے کہا ہے کہ دس سال پہلے وظیفے پر 15 کروڑ روپے سے زیادہ خرچ کیا جاتا تھا، جو اب کم ہو کر 3, کروڑ پر آگیا ہے۔ اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ وظیفے، جس کا سیدھا فائدہ غریب اور ضرورت مند طلبہ کو ہوتا ہے، میں پانچ مرتبہ تخفیف کر دی گئی ہے۔ لیب کے لیے آج سے 10 سال پہلے 2 کروڑ روپیہ خرچ ہوتا تھا، اب اسے ایک کروڑ کے اندر سمیٹ دیا گیا ہے۔ اسی طرح، فیلڈ ورک اور کانفرنس کے لیے 90 لاکھ روپے دیے جاتے تھے، مگر ایک دہائی میں یہ رقم 11 لاکھ پر آگئی ہے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو فیلڈ ورک اور کانفرنس کے لیے مالی امداد میں 80 سے 90 فیصد کی کمی آئی ہے۔ آج سے دس سال پہلے سیمینار کے لیے ایک کروڑ روپے ملتے تھے، وہ اب آدھا کر دیا گیا ہے۔ جرنلز کی خریداری میں بھی بڑی تخفیف کی گئی ہے۔ دس سال پہلے جہاں 8 کروڑ سے زیادہ اس پر خرچ کیا جاتا تھا، وہیں آج اس کے لیے صرف دو کروڑ ہی مختص کیے جاتے ہیں۔ جے این یو کے فنڈ کٹ پر جے این یو اساتذہ کا کہنا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ کسی بھی یونیورسٹی کے بجٹ میں اضافہ ہونا چاہیے۔ مگر جب اس میں اضافہ نہیں ہوتا تو پھر انتظامیہ فلاحی کاموں سے اپنے ہاتھ کھینچنے لگتی ہے، جس کا سب سے زیادہ نقصان طلبہ و طالبات کے مفاد پر پڑتا ہے۔

جہاں ایک طرف ٹیلی گراف کی خبر یہ کہتی ہے کہ جے این یو انتظامیہ نے گزشتہ ایک دہائی میں طلبہ اور ریسرچ سے متعلق فنڈ میں کافی کٹوتی کی ہے، وہیں "انڈیا ٹوڈے" (20 جولائی، 2024) نے ایک آر ٹی آئی کی بنیاد پر یہ خبر شائع کی ہے کہ گزشتہ دس سالوں میں جے این یو کے فنڈ میں ڈیڑھ مرتبہ اضافہ ہوا ہے۔ وہیں دوسری طرف یونیورسٹی نے بڑی تعداد میں اپنے ہی طلبہ کے خلاف بہت سارے

ایف آئی آر بھی درج کی ہے۔ جب سے بھگوا طاقتوں نے جے این یو پر اپنا قبضہ جمایا ہے تب سے لاکھوں کی تعداد میں طلبہ اور طالبات سے مظاہرے کرنے اور نظم و ضبط کے نام پر جرمانہ لیا گیا ہے۔ انظامیہ ہی جانتی ہے کہ ان پیسوں کا کہاں استعمال کیا گیا ہے۔ انڈیا ٹوڈے کی مذکورہ خبر کے مطابق، پونے کے ایک آرٹی آئی جہد کار پر پھل سارادا نے یہ معلومات حاصل کی ہے کہ وزیر اعظم نریندر مودی کی قیادت والی حکومت کے دور میں گزشتہ دہائی کے مقابلے میں زیادہ سبسڈی دی گئی ہے۔ آرٹی آئی سے پتہ چلا ہے کہ سال 2004 سے سال 2015 کے درمیان، جے این یو کو کل دو ہزار 55, کروڑ روپے کی سبسڈی ملی۔ اس کے مقابلے میں، گزشتہ دہائی کے دوران سبسڈی بڑھ کر تین ہزار 30, کروڑ روپے ہوگئی۔ ایسا لگتا ہے کہ سبسڈی میں ڈیڑھ گنا اضافہ بڑھی ہوئی مہنگائی اور بڑھتی ہوئی ٹیچروں کی تنخواہوں کے مدنظر کچھ زیادہ نہیں تھا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ جے این یو میں طلبہ و طالبات کی تعداد او بی سی ریزرویشن کے نفاذ کے بعد تقریباً دو گنا بڑھ گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ او بی سی ریزرویشن کے مدنظر جنرل کوٹے کی سیٹیں بھی بڑھا دی گئی تھیں۔ بعد کے سالوں میں جے این یو میں بہت سارے نئے شعبے کھلے اور بہت سارے ٹیچروں کی تقرریاں ہوئیں۔

اگر ان باتوں کو دھیان میں رکھا جائے تو سبسڈیز میں اضافہ فنڈ کٹ کی لاجک کو خارج نہیں کرتا ہے، کیونکہ یونیورسٹی کے بجٹ کا بڑا حصہ طلبہ کے فلاحی کاموں کے علاوہ کہیں اور خرچ ہو رہا ہے۔

ایک بہت بڑا فنڈ بھگوا جماعت کے سیاسی ایجنڈے کو پورا کرنے کے لیے پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کی عمارتوں کا بھی برا حال ہے۔ فنڈ کی کمی کی وجہ سے بہت سارے مقامات پر چھتیں ٹوٹ کر گر رہی ہیں اور کچھ بارش کے موسم میں ٹپک رہی ہیں۔ یہ سب اشارہ کرتا ہے کہ مودی حکومت ہو یا جے این یو انتظامیہ، ان کی نظر میں تعلیم عامہ کی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ تعلیم کو بازار کے حوالے کر دیا جائے۔ اسی سوچ کی وجہ سے جے این یو کے اثاثوں کو کرایہ پر دینے کا ناپاک منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔

یہ افسوسناک ہے کہ ملک کی مؤقر یونیورسٹی کی جائیداد کو سرمایہ داروں کے حوالے کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ حالانکہ جے این یو کی وی سی نے دعویٰ کیا ہے کہ گومتی گیسٹ ہاؤس کو کرایہ پر دینے سے یونیورسٹی کو صرف 50, ہزار سے ایک لاکھ روپے ماہانہ ملے گا۔ مگر کوئی جاکے وی سی موصوفہ سے پوچھے کہ یہ چھوٹی سی رقم جے این یو جیسی بڑی یونیورسٹی کے اخراجات کا کتنا حصہ برداشت کر پائے گی؟ کیا اس رقم سے یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو تنخواہ دی جا سکتی ہے؟ ہرگز بھی نہیں۔ بہت سارے طلبہ و طالبات کے ذہن میں یہ سوال بھی گردش کر رہا ہے کہ کہیں گومتی گیسٹ ہاؤس کو کرایہ پر دینے کے پیچھے بھگوا جماعت سے قریب سرمایہ داروں کی لابی کارفرما تو نہیں ہے، جو سالوں سے جے این یو کی ملکیت پر لالچی نگاہیں لگائے ہوئے ہیں؟

یہ جے این یو انتظامیہ کی خام خیالی ہے کہ اس طرح کے اثاثوں کو کرایے پر دینے کے اقدامات یونیورسٹی کی آمدنی کا مستقل ذریعہ بن جائیں گے۔ جب سے جے این یو کی وی سی کا مذکورہ بیان آیا ہے، تب سے عوام اس بات سے فکرمند ہیں کہ کہیں یہ سب جے این یو کو پوری طرح منافع خوری کے ماڈل پر ڈھالنے کی سازش تو نہیں ہیں؟ عوام کو اس بات سے ناراضگی ہے کہ جے این یو انتظامیہ تعلیم کو بازار میں بیچنے اور خریدنے کی شَے سمجھ کر کام کر رہی ہے۔

حیققت تو یہ ہے کہ جے این یو میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ ملک کے مختلف حصوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ آج ہر طرح کی تعلیم مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ غریب آدمی اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دینے سے قاصر ہے۔ ملک کے پالیسی سازوں کی کوشش ہے کہ تعلیم کو سرمایہ داروں کے حوالے کر دیا جائے۔ انہیں معلوم ہے کہ جب تک سرکاری اسکول اور کالج برباد نہیں ہوں گے، تب تک پرائیویٹ تعلیمی ادارے آباد نہیں ہوں گے۔ افسوس کی بات ہے کہ ملک کے اعلیٰ منصوبہ بندی کرنے والے طبقے کے ذہنوں میں ایک ہی بات گردش کر رہی ہے کہ تعلیمی اداروں سے سوچنے اور سمجھنے والے طلبہ و طالبات نہیں، بلکہ فیکٹریوں اور کمپنیوں میں 12 سے 14 گھنٹے تک کام کرنے

والے روبوٹ نکلیں۔ انہیں جے این یو کے کردار سے اس لیے بھی بغض ہے کیونکہ وہاں کے بچوں میں سیاسی بیداری پائی جاتی ہے اور ان کا ذہن فرقہ واریت کو قبول نہیں کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جے این یو اور اس جیسے تعلیمی اداروں کے خلاف برسر اقتدار بھگوا طاقتیں مسلسل پروپیگنڈا کرتی ہیں۔ پزشتہ 10 سالوں سے جے این یو کو ملک مخالف یونیورسٹی کہہ کر بدنام کیا گیا ہے۔ بھگوا جماعت کے حامی پالیسی ساز آئے دن اخباروں میں مضامین لکھ کر حکومت کو یہ نصیحت دیتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیمکے حلقہ میں زیادہ بچوں کو داخلہ دینے کی پالیسی بھارت کی معیشت کے لیے درست نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ جے این یو میں ''سیٹ کٹ'' کیا گیا اور پی ایچ ڈی میں داخلے کوپیچیدہ بنایا گیا تاکہ کم سے کم امیدوار اس طرف رُخ کریں۔ ایسی سرمایہ دارانہ ذہنیت حکومت کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ شعبہ فن و بشریات اور سماجی علوم کی جگہ،پیشہ ورانہ کورسز کو فروغ دے تاکہ سرمایہ داروں کو سستے مزدور آسانی سے مل جائیں۔ جے این یو ماڈل ایسی غریب اور مزدور مخالف ذہنیت کے خلاف رہا ہے۔

ایسی منافع خور ذہنیت نہ صرف مزدور مخالف ہے، بلکہ یہ دلت، بہوجن اور اقلیتوں کے مفاد کے بھی خلاف ہے۔یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ بھارت کے کمزور طبقات کو تعلیم سے دور رکھ کر ہی غیر برابری کا یہ نظام کھڑا کیا گیا ہے۔ اعلیٰ ذات کے افراد نے نہ صرف انہیں وسائل سے محروم رکھا، بلکہ انہیں پڑھنے لکھنے کے قابل بھی نہ سمجھا۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے، تعلیمی اداروں تک کمزور طبقات کی رسائی بہت ہی کم تھی۔ مگر جدید دور میں، جہاں نوآبادیت کا سیاہ دور دیکھا گیا، وہیں اس دور میں تعلیم عامہ کا نظام بھی کھڑا ہوا، جہاں تعلیم حاصل کرنے میں ذات، مذہب اور جنس کی قید نہیں تھی۔ قومی تحریک کے بعد جب ملک میں جمہوری ڈھانچہ قائم ہوا، تو ریاست کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ سب کو تعلیم مہیا کرے اور سماج میں مساوات کو فروغ دے۔ ایسی ہی فکر کےپیٹ سے جے این یو کا جنم ہوا تھا۔

حالانکہ اعلیٰ ذات کی لابی نے ریزرویشن کو نافذ کرنے میں ہر طرح کی رکاوٹیں ڈالیں، مگر مساوات کی تحریک نے بہت ساری رکاوٹوں کو راہ سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی۔ جے این یو میں بھی ریزرویشن حاصل کرنے کے لیے لمبی لڑائی چلی اور بڑی مشکل سے محکوم طبقات نے یہاں اپنی جگہ بنائی۔ یہ سچ ہے کہ آج بھی تعلیمی اداروں پر مٹھی بھر اعلیٰ ذات کے افراد چھائے ہوئے ہیں، مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ محکوم طبقات کے بہت سارے لوگ لڑ کر تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ محکوم طبقات کے یہ پڑھے لکھے افراد اپنے سماج کا حق پانے کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور بابا صاحب امبیڈکر کے مشن کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ایسی لابی جے این این یو میں بھی کافی مضبوط ہے اور تعلیم کو مہنگا کر جے این یو انتظامیہ کمزور کرنا چاہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے اعلیٰ ذات کے پالیسی ساز یہ نہیں چاہتے کہ جے این یو کی حالت بہتر ہو۔ اسی طرح وہ اس بات کے خواہشمند نہیں ہے کہ عام سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی حالت بہتر ہو۔ انہیں خوف ہے کہ اگر ان تعلیمی اداروں میں بہتر سہولیات ہوں گی، تو کمزور طبقات کے لوگ ریزرویشن کی مدد سے یہاں قابض ہو جائیں گے۔ ارباب اقتدار کو اس بات کا بھی خوف ہے کہ معیاری تعلیم کے پھیلاؤ سے سماج میں بیداری پیدا ہوگی اور پھر سماجی اصلاح کی تحریک جنم لے گی۔ یہی وجہ ہے کہ رجعت پسند طبقات تعلیم عامہ کو فروغ دینے سے ڈرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ تعلیمی حلقے پر بازار کا قبضہ ہو جائے تاکہ صرف پیسے والوں کے بچے ہی پڑھ لکھ سکیں اور عام جنتا اَن پڑھ بنی رہے تاکہ مٹھی بھر طاقتور لوگوں کی بالادستی بدستور قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکاری تعلیمی اداروں کی اندیکھی کی جا رہی ہے۔ جے این یو سے باہر تو حالات اور بھی خراب ہیں۔

سرکاری اسکولوں اور کالجوں کے کلاس رومز کے دروازے اساتذہ کی کمی کی وجہ سے طلبہ و طالبات کے لیے بند کیے جا رہے ہیں۔ ملک کے مستقبل کو نجی تعلیمی اداروں nکی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ کوچنگ سینٹرز بچوں کو سبز باغ دکھا کر ان سے موٹی رقم لوٹ رہے ہیں۔ جلدی سے کامیابی حاصل

کرنے کے نام پر، کوچنگ سینٹرز بچوں کو نقلی اور غیر مستند کتابوں کی بیساکھی پر چلنے کی تربیت دے رہے ہیں۔ جے این یو کے ایڈمیشن کو بھاری پھیر بدل اور نصاب میں تبدیلی کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جے این یو انتظامیہ نہیں چاہتا ہے کہ طلبہ کے اندر میں سیاسی شعور پیدا ہو۔ اسی لیے سوالات کے پیٹرن میں تبدیلی کیا جا رہا ہے تاکہ بچیں "گائیڈ بک" کی طرف متوجہ ہوں۔

جہاں ایک طرف ملک کے حکمراں بھارت کو "وشو گرو" بنانے کا خواب بیچ رہے ہیں، وہیں بجٹ تیار کرتے وقت ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ تعلیم عامہ سے متعلق فنڈ کو کم کر دیا جائے، تاکہ عوام پریشان ہو کر پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی طرف جانے پر مجبور ہو جائیں۔ ارباب اقتدار اپنا سینہ چوڑا کر کے یہ بات چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ بھارت دنیا کی تیسری بڑی معیشت بننے جا رہا ہے، مگر انہیں اس بات پر شرم نہیں آتی کہ بھارت سے چھوٹی معیشتیں تعلیم کے شعبے میں ہم سے زیادہ بجٹ مختص کرتی ہیں۔ اربات اقتدار کو اس بات پر بھی شرم نہیں آتی کہ وہ فنڈ کٹ کر کے اپنے تعلیمی اثاثوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ ایک عرصے سے سوشلسٹ تحریک کا یہ مطالبہ رہا ہے کہ تعلیم پر بجٹ کا ۱۰ فیصد حصہ خرچ کیا جائے، مگر بھارت میں تعلیم عامہ پر دو فیصد سے تھوڑا ہی زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کا بنیادی ڈھانچہ جے یو یو اور جے یو سے باہر بدحالی کا شکار ہے۔ حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ بہار، اتر پردیش، جھارکھنڈ اور بنگال کے کالجوں میں پڑھائی کے علاوہ سب کچھ ہوتا ہے۔ سال کا ایک تہائی حصہ داخلہ لینے اور امتحان منعقد کرنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ طلبہ و طالبات داخلہ لیتے ہیں اور کالج کی فیس ادا کرتے ہیں، مگر انہیں اپنے کالجوں میں بنیادی سہولتیں نہیں ملتیں۔ حال تو اس قدر بُرا ہو چکا ہے کہ زیادہ تر کالجوں میں مطلوبہ کلاس رومز اور اساتذہ نہیں ہیں۔ بہت سارے ایسے شعبے ہیں، جہاں ایک بھی استاد موجود نہیں ہے۔ حال تو اس قدر خراب ہے کہ بیشتر کالجوں میں اساتذہ کے بیٹھنے اور پڑھانے کے لیے معقول جگہ میسر نہیں ہے۔ زیادہ تر تعلیمی اداروں کی لائبریریاں عملے اور فنڈ کی کمی کی وجہ سے بند ہیں۔ کئی اداروں میں پانی

اور صفائی کا بھی معقول انتظام نہیں ہے۔ کالج انتظامیہ بنیادی سہولیات کو پورا کرنے میں قاصر ہے، مگر کالج کے اندر نظم و ضبط کے نام پر وہ طلبہ، عملے اور اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائیاں کرنے میں سب سے آگے رہتا ہے۔ اختصاریہ ہے کہ تعلیمی اداروں کا ماحول جیل کی طرح بنتا جا رہا ہے، جہاں تنقیدی فکر کا دم گھٹ رہا ہے۔ اگر وقت رہتے جے یو یو میں بھگوا سازش کو ناکام نہیں کیا گیا تو جے این یو کی حالات مذکورہ کالجوں سے بہتر نہیں رہ پائے گی۔

جو کچھ بھی کل تک جے این یو کے باہر دیکھا جا رہا تھا، اب اس کی شروعات جے این یو میں کی جا رہی ہے۔ اگر تعلیم عامہ کو بچانا ہے تو ہمیں تعلیم میں بڑھتے سرمایہ دارانہ رجحانات سے لڑنا ہوگا۔ جے این یو کو بچانے کی لڑائی ملک کے دیگر تعلیمی اداروں کو بچانے کی لڑائی سے جوڑ کر دیکھنا ہوگا۔ عوام کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ جب اپنا ووٹ دیں تو تعلیم عامہ کے حوالے سے کون سی سیاسی جماعت اور امیدوار سنجیدہ ہیں، اس پر بھی غور کریں۔ معیاری تعلیم ہر شہری کا حق ہے، مگر ہر شہری کو یہ بھی بات یاد رکھنی چاہیے کہ حق بھیک میں نہیں ملتا، بلکہ اس کے لیے لڑنا ہوتا ہے۔ جس طرح جے این یو کے طلبہ لڑ رہے ہیں، ہمیں بھی ان کی لڑائی میں شامل ہونا چاہیے اور اپنے آس پاس کے تعلیمی اداروں کو بچانے کے لیے عوامی پر امن جدوجہد کرنی چاہیے۔

پچھلا مضمون

اگلا مضمون

اپریل ۲۰۱۸ء

نئی نسل کا معمار اور تعمیر و ترقی کا داعی
ماہنامہ
رفیقِ منزل
ISSN 2456-0375

کیا بابری مسجد کے نیچے مندر تھا؟

www.rafeeqemanzil.com /RafeeqEManzil

جلد: ۳۱ | شمارہ: ۴ | اپریل ۲۰۱۸ء | رجب المرجب۔ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ

editor@rafeeqemanzil.com

MANAGER
Bilal Khan 9029194433
managerrmgp@sio-

Asst. MANAGER
Abdul Jabbar 08447622919
asst.managerrmgp@sio-

₹160 سالانہ | ₹15

D-300, Abul Fazl Enclave Jamia Nagar, Okhla New Delhi - 110025 | Tel: 26949817 | Email:managerrmgp@sio-india.org |

Printed on behalf of The Students Islamic O rganisation ofIndia, Printer & Publisher Tanveer Alam, Printed at Bharat Offset, 2034/35, Qasim Jan Street, Ballimaran, Delhi - 110006, Published from 230, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025 | **Editor: Mustajab Khatir**

جے این یو میں لازمی حاضری: ایک نیا سنگھی حملہ

ابھے کمار

لازمی حاضری کا معاملہ جے این یو میں طول پکڑتے جا رہا ہے اور جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ویسے ویسے طلبا اور اساتذہ کا یقین مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ لازمی حاضری کے پیچھے سنگھ کی ایک گہری سازش ہے۔ بھگوا طاقتوں اور سرمایہ داروں کی آنکھوں میں جے این یو بہت دنوں سے کھٹک رہا تھا کیوں کہ یہاں سماج کے حاشیے پر رہنے والے لوگ بھی پڑھنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ یہاں ان کے لیے ریزرویشن اور پسماندگی کی بنیاد پر Deprivation points بھی ملتے ہیں جن کی وجہ سے ان کو یہاں داخلہ لینے میں سہولت مل جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ جے این یو کی فیس دوسری یونیورسٹیوں بالخصوص پرائیویٹ یونیورسٹی کے مقابلے بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جے این یو کے طلبا میں گاؤں دیہات اور غریب خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ یہاں کے سیکولر ماحول میں پڑھنے کی وجہ سے طلبا کے اندر جمہوری اور روشن خیال نظریہ پرورش پاتا ہے اور طلبا کا عقیدہ مساوات، حریت اور اخوت جیسی اقدار پر مضبوط ہوتا ہے۔ جے این یو کی یہ خصوصیات سنگھ کو کسی طرح بھی قبول نہیں کیوں کہ سنگھ کا نظریہ ہمیشہ سے غیر مساوی نظام پر مبنی رہا ہے۔ اسی طرح سرمایہ داروں کو بھی جے این یو پسند نہیں ہے کیوں کہ یہاں کا ماڈل سوشلزم کی تائید کرتا ہے اور مساوات پر مبنی سماج کی تشکیل کا خواب دیکھتا ہے۔ مختصراً تعلیم کو بیچنے اور محروم طبقات جیسے دلت، آدی واسی، پچھڑا، مسلمان اور دیگر اقلیتی جماعت کو یونیورسٹی سے بھگانے کی سمت میں جے این یو انتظامیہ لازمی حاضری کو ایک بڑے ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کر رہا ہے جسے حکومت، سرمایہ دارانہ طبقہ اور سنگھ پریوار کی پشت پناہی حاصل ہے۔ بہت سے لوگوں کے بیچ میں یہ غلط فہمی ہے کہ جے این یو کے طلبا لازمی حاضری کی غیر ضروری مخالفت کر رہے ہیں۔ کارپوریٹ میڈیا لوگوں تک پوری حقیقت نہیں پہونچا رہا ہے۔ جے این یو کے طلبا لازمی حاضری کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کیوں کہ اس کا تعلق تعلیم اور تحقیق کے فروغ سے نہیں ہے۔ اس طرح کی کاروائی محض طلبا اور اساتذہ پر نگرانی رکھنے کے لیے کی جا رہی ہے اور یہ ان کی آزادی کو ختم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لازمی حاضری آنے سے پہلے جے این یو میں اساتذہ، طلبا کی حاضری دوسری طرح سے لیتے تھے۔ طلبا کو اپنے اسائنمنٹ، ٹرم پیپر، وقفے وقفے پر دینے پڑتے تھے۔ سمسٹر کے دوران انھیں کئی بار امتحان بھی دینا پڑتا تھا جو طالب علم ان ساری تعلیمی ضروریات کو پورا نہیں کرتا ان کے خلاف تادیبی کاروائی بھی کی جاتی۔ مثال کے طور پر ان کو کم مارکس دیئے جاتے۔ کئی دفعہ وہ امتحان میں بھی فیل کر دیئے جاتے اور اس کے بعد بھی بات نہیں بنتی نظر آتی تو انھیں یونیورسیٹی سے باہر کر دیا جاتا۔ جب اس طرح کا منظم نظام طلبا کا درسی جائزہ لینے میں پہلے سے کامیاب تھا اور غیر حاضری اور ڈراپ آوٹ کا مسئلہ یہاں کبھی نہیں تھا تو پھر جے این یو وی سی لازمی حاضری کو تھوپ کر کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کو بھی معلوم ہے کہ جے این یو کہ رینکنگ ہندستان کی ٹاپ یونیورسیٹیوں میں ہوتا ہے اور یہ سب بغیر لازمی حاضری کے ہی جے این یو نے حاصل کیا تھا۔

جے این یو انتظامیہ کی دلیل یہ ہے کہ لازمی حاضری سے تعلیم وتحقیق کا معیار بڑھے گا اور جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جے این یو کی اکثریت نے حالیہ ریفرینڈم میں لازمی حاضری کو پوری طرح سے خارج کر دیا ہے۔ 98 فیصدی طلبا نے لازمی حاضری کی مخالفت میں اپنی رائے دی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جے این یو انتظامیہ کی دلیل کھوکھلی ہے۔ مدھوکشور جو جے این یو اکیڈمک کاؤنسل کی رکن اور رائٹسٹ نظریہ کی حامل ہیں انھوں نے بھی اپنے ٹوئیٹ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ لازمی حاضری کو اکیڈمک کاؤنسل سے کبھی بھی پاس نہیں کرایا گیا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وائس چانسلر تمام قوانین کو بالائے طاق رکھ کر ایک خاص ایجنڈے کے تحت لازمی حاضری کو جے این یو میں تھوپ رہے ہیں۔

جب سے جگدیش کمار کو جے این یو کا وائس چانسلر بنا کر بھیجا گیا ہے تبھی سے انھوں نے ایک کے بعد ایک ایسے فیصلے لیے ہیں جس سے جے این یو کو بڑا نقصان ہوا ہے۔ جب وہ آئے تو انھوں نے پولیس بلا کر اپنے ہی طلبا یونین کے صدر کو گرفتار کروا کر پورے جے این یو پر غدار وطن ہونے کا الزام لگا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ہزاروں سیٹیں ختم کر دیں۔ اب ریزرویشن کو بھی نافذ نہیں کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے جے این یو کے دروازے محروم طبقات کے لیے تقریباً بند ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہر روز ایک نیا چارج طالب علم پر تھوپا جا رہا ہے اور ٹیوشن فیس میں بھی ایک بڑا اضافہ کسی وقت کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام کاروائیوں کو وی سی یونیورسیٹی کے اندر فنڈ پیدا کرنے کے نام پر صحیح بتا رہے ہیں اور ان کی دلیل ہے کہ تعلیمی ادارے کو اپنا خرچہ خود اٹھانا چاہیے۔ مگر وہیں دوسری طرف اسی ادارے میں لاکھوں کروڑوں کا سرکاری مال بھاجپا سیاستدانوں، بھگوا باباؤں کے پروگرام کو منعقد کرنے میں صرف کیا جا رہا ہے۔ لاکھوں روپیے کبھی دہلی بی جے پی صدر اور مشہور بھوجپوری گلوکار منوج تیواری کے پروگرام میں خرچ ہو رہا ہے تو دوسری طرف شری شری روی شنکر کی تقریر کے نام پر کئی لاکھ پانی کی طرح بہا دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے سیاسی پروگرام کرنے کے لیے جے این یو وی سی کے پاس فنڈ تو ہے مگر طالب علم کو اسکالرشپ اور بنیادی سہولیات دینے کے لیے ان کے پاس کوئی فنڈ نہیں ہے۔ حالت اس قدر خراب ہوچکی ہے کہ جے این یو کے میس میں انڈے کی قیمت بازار میں انڈے کی قیمت کے مقابلے دو گنا بڑھا دی گئی ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے طلبا کو مزید سہولیات دی جائے۔ زیادہ سے زیادہ تعلیمی ادارے ملک کے کونے کونے میں کھولے جائیں مگر اس طرف نہ تو حکومت کام کر رہی ہے اور نہ ہی انتظامیہ۔ ساری کی ساری توانائی طلبا کو ڈسپلن کرنے میں خرچ کی جا رہی ہے۔ لازمی حاضری کو بھی اسی سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ونٹر سمسٹر کے اختتام میں تقریباً ایک مہینہ بچا ہے مگر جے این یو میں درس و تدریس ابھی بھی بری طرح سے متاثر ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبا لازمی حاضری یعنی Compulsory Attendance کی مخالفت میں اتر آئے ہیں۔ ہر روز جگہ جگہ پر اس کی مخالفت میں احتجاجی نعرے بھی بلند کیے جا رہے ہیں۔ مخالفت کرنے والوں میں تمام طلبا تنظیمیں - لیفٹسٹ، لبرل اور رائٹسٹ - شامل ہیں۔ ان کا یہی مطالبہ ہے کہ انتظامیہ اس طلبا مخالف فرمان کو فوراً واپس لے کیوں کہ جے این یو میں غیر حاضری کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ خیال رہے کہ جے این یو انتظامیہ نے سب سے پہلے 22 دسمبر 2017 کو ایک سرکولر جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ طلبا ہی نہیں بلکہ ایم فل اور پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالروں کو بھی لازمی حاضری دینی ہوگی۔ انتظامیہ اس سرکولر کو لے کر اڑا ہوا ہے اور اسے واپس نہ لینے کے لیے وہ ہر طرح کے حربے استعمال کر رہا ہے۔ انتظامیہ کو چاہیے تھا کہ وہ طلبا اور اساتذہ کی بات کو سنے اور ان کے ساتھ مکالمے میں جائے مگر اس کے برعکس دھمکی اور پولیس کے ڈنڈے سے ڈرا کر طلبا کو خاموش کر دینا چاہتا ہے۔ انتظامیہ کی طرف سے طلبا کو یہاں تک کہا گیا ہے کہ اگر انھوں نے اپنی حاضری نہیں دی تو انھیں ہاسٹل سے باہر کر دیا جائے گا، ان کا وظیفہ روک دیا جائے گا اور انھیں طبی سہولیات سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان تمام طلبا مخالف اقدامات کو انتظامیہ یہ کہہ کر جائز ٹھہرا چاہتا ہے کہ یہ طلبا کے فلاح و بہبود کے لیے اٹھائے گئے ہیں۔ انتظامیہ کی دلیل ہے کہ لازمی حاضری، ڈراپ آؤٹ کے مسئلے کو ختم کر دے گی اور پی ایچ ڈی جلد پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ مگر انتظامیہ کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اپنی بات کو آگے تو رکھ سکتا ہے مگر اسے کسی پر تھوپ نہیں سکتا۔ اگر انتظامیہ ڈراپ آؤٹ کے مسئلے کو لے کر واقعی فکرمند ہے تو وہ اس پر مذاکرہ کرنے سے کیوں کترا رہا ہے؟

اس فیصلے کو لے کر جے این یو طلبا کے اندر زبردست غم و غصہ پایا جا رہا ہے۔ انھوں نے بہت سے ایسے واجب سوالات اٹھائے ہیں جن کا کوئی جواب انتظامیہ کے پاس نہیں ہے۔ جیسے اگر لازمی حاضری کو ان پر تھوپ دیا گیا تو وہ فیلڈ ورک پر کیسے جائیں گے؟ تاریخ اور سماجیات کے طالب علموں کو کئی سارے آرکائیوز میں جانا پڑتا ہے۔ اگر وہ ہر روز حاضری لگانے کے لیے اپنے سینٹر آئیں گے تو وہ آرکائیوز اور دیگر کتب خانوں میں کب جا پائیں گے؟ اس کے علاوہ طلبا اس فرمان کو جے این یو کے آزاد اور روشن خیال کردار پر ایک بڑا حملہ مانتے ہیں اور اسے طلبا سیاست کو ختم کا ایک بہانا تصور کرتے ہیں۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خوف اور پہرے کے ماحول میں تنقیدی ڈسکورس کی گنجائش نا کے برابر ہو جاتی ہے۔ قومیت کی سیاست کرنے والی فرقہ پرست جماعت یہ بھول جاتی ہے کہ قومی شاعر رویندر ناتھ ٹیگور نے ایک ایسے بھارت کا خواب دیکھا تھا جہاں سوچ پر پہرہ نہ ہو اور علم کو محدود نہ رکھا جائے۔

اگر انتظامیہ کو لگتا ہے کہ لازمی حاضری سے جے این یو کا تعلیمی معیار بڑھ جائے گا تو کیا وہ اسے ثابت کرنے کے لیے کسی سائنٹفک مطالعہ کا حوالہ دے سکتا ہے؟ کیا انتظامیہ سائنٹفک اور منطقی دلیل کی بنیاد پر یہ ثابت کر سکتا ہے کہ اس طرح کے اقدامات نے تعلیم و تحقیق کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آج جب ماہر تعلیم اوپن لرننگ، امتحان اور گریڈ سے پرے تعلیم کی بات کر رہے ہیں تو وہیں جے این یو انتظامیہ اس سمت میں پہل کرنے کے بجائے الٹی دوڑ لگا رہا ہے۔

انتظامیہ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جے این یو کا کلاس روم اور سیمینار ہال اکثر ہی طلبا سے کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے۔ نیلادری بھٹاچاریہ، ابھجیت پاٹھک، نویدیتا مینن، گوپال گرو، اتساہ پٹنائک، پربھات پٹنایک جیسے پروفیسر طلبا میں اتنے مقبول ہیں کہ ان کے کلاس میں نہ صرف متعلقہ کلاس بلکہ دوسری جماعتوں کے طلبا بھی شامل ہو کر ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ جے این یو آنے سے قبل میں ان اساتذہ کے بارے میں سن چکا تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میرے سینئر ان کے لکچرز سننے کے لیے جے این یو آتے تھے۔

جے این یو میں طلبا کا ذوق و شوق تو یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی اور دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف کورسز کو چنتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایم۔ اے اور ایم فل کورسز کے دوران بہت سے ایسے اضافی کورسز لیے تھے جن کا میرے نصاب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ اساتذہ بھی اپنی طرف سے اضافی کلاسز لیتے ہیں۔ یہ سب کچھ لازمی حاضری کے نفاذ سے پہلے جے این یو میں بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ چل رہا تھا۔

حکومت کو چاہیے کہ وہ سیاسی مفادات سے بالاتر ہو کر اپنے آئینی و عوامی فرائض کو نبھائے۔ اسے چاہیے کہ اس معاملے میں مداخلت کرے اور جے این یو کے کردار کو برباد ہونے سے بچائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جے این یو جیسے ادارے ملک کے دیگر مقامات پر کھولے جائیں۔ اسے تباہ کر کے مخصوص سیاسی فائدہ تو اٹھایا جا سکتا ہے مگر اس سے ملک کا بہت بڑا نقصان ہوگا۔ انتظامیہ کو بھی اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کا رول یونیورسٹی میں جتنا ہی محدود ہوا اتنا ہی تعلیم اور تحقیق کے لیے بہتر ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کی مداخلت ہر روز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ابھی حالیہ دنوں میں جے این یو انتظامیہ نے تقریباً آدھے درجن ڈیپارٹمنٹ کے چیئرپرسن اور اسکول کے ڈین (Dean) کو ہٹانے کا فرمان صرف اس لیے جاری کر دیا ہے کہ یہ لوگ انتظامیہ کے اشارے پر نہیں ناچ رہے تھے۔ اس کے خلاف جے این یو میں طلبا پورے زور و شور سے مزاحمت کر رہے ہیں مگر ان کی کامیابی بہت حد تک ملک کی سیاسی تبدیلی پر بھی منحصر ہے۔

Inquilab. New Delhi. Sep 9 - 2021 - P. 9

’جہادی دہشت گردی کورس‘ ایک نیا فتنہ

ابھے کمار
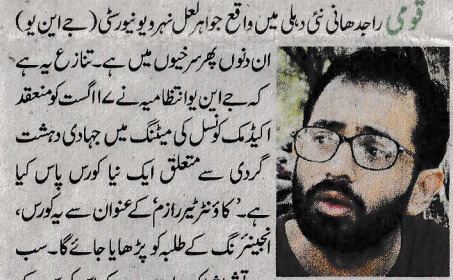
قومی راجدھانی نئی دہلی میں واقع جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) ان دنوں پھر سرخیوں میں ہے۔ تنازع یہ ہے کہ جے این یو انتظامیہ نے ۱۷ اگست کو منعقد اکیڈمک کونسل کی میٹنگ میں جہادی دہشت گردی سے متعلق ایک نیا کورس پاس کیا ہے۔ ’کاؤنٹر ٹیررازم‘ کے عنوان سے یہ کورس، انجینئرنگ کے طلبہ کو پڑھایا جائے گا۔ سب سے تشویشناک بات یہ ہے کہ اس کورس کے اندر مذہبی دہشت گردی کے نام پر صرف جہادی دہشت گردی کی ہی نشان دہی کی گئی ہے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو کورس تیار کرنے والوں کی نظر میں، دہشت گردی کے لیے صرف اور صرف اسلام اور مسلمان ہی ذمہ دار ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے علاوہ، اس کورس میں اشتراکی نظریہ کو بھی خطرہ بنا کر پیش کیا گیا ہے، مذکورہ کورس کے اندر پڑوسی ملک چین اور بھارت کے پرانا دوست روس کے تار بھی دہشت گردی سے جوڑ کر دکھائے گئے ہیں۔ کورس میں بچوں کو پڑھایا جائے گا کہ کیسے ان ممالک نے ’اسلامی دہشت گردی‘ کو اثر انداز کیا ہے۔ اس طرح کورس بنانے والوں نے اسلام، مسلمان، کمیونزم، چین، روس کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ ان سب کو بھارت کی سیکورٹی اور سالمیت کے لیے خطرہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

حالانکہ اس کورس کی مخالفت خود جے این یو کے اندر سے ہی ہو رہی ہے۔ جے این یو طلبہ یونین اور ٹیچرس نے جے این یو انتظامیہ کی منشا پر بہت سارے سوال کھڑے کیے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کورس کو اکیڈمک کونسل میں پاس کراتے وقت کوئی بحث نہیں ہوئی۔ طلبہ اور ٹیچروں کا الزام ہے کہ جے این یو انتظامیہ بھگوا ایجنڈے کو مسلسل نافذ کر رہا ہے۔ وہیں، محروم طبقات سے تعلق رکھنے والے بعض جے این یو کے ٹیچروں نے کہا کہ جے این یو انتظامیہ جہاں ایک طرف سیٹوں میں تخفیف، نجکاری، ریزرویشن مخالف پالیسی لاکر دلت، آدی واسی، پچھڑے، پسماندہ طبقات اور مذہبی اقلیت سماج کے طلبہ کے لیے کیمپس کی دیواریں اونچی کر رہی ہے، وہیں جہادی دہشت گردی کے نام پر نیا کورس شروع کر کے وہ بچوں کے دماغ میں ایک خاص مذہب اور اس کے پیروکاروں کے خلاف نفرت بھرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یاد رہے کہ موجودہ وائس چانسلر ایم جگدیش کمار کی مدت بہت پہلے ہی ختم ہو گئی ہے۔ صحیح معنوں میں، ان کی حیثیت ایک کارگزاروی سی سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر پھر بھی وہ بڑے بڑے فیصلے لے کر، بھگوا ایجنڈے کو مزید تھوپ رہے ہیں۔

جب کیمپس میں جہادی دہشت گردی کے لیے ایک نیا کورس پاس کرایا جا رہا تھا، تب طلبہ اپنے مطالبات کو لے کر احتجاج کر رہے تھے۔ ان کو اس بات کا دکھ ہے کہ جے این یو کیمپس کئی سالوں سے بند پڑا ہے۔ کلاسز نہیں چل رہی ہیں۔ لائبریری سے کوئی کتاب نہیں لے سکتا۔ ہاسٹل میں بچے لوٹ کر نہیں آئے ہیں۔ طلبہ کا یہ سوال جائز ہے کہ جب کمبھ کا میلہ لگ سکتا ہے، جب انتخابی ریلیاں ہو سکتی ہیں، جب مندر کے دروازے کھل سکتے ہیں، پھر جے این یو کیوں بند پڑا ہے؟ اتنا ہی نہیں، طلبہ کو اسکالرشپ نہیں مل پا رہی ہے، ڈاکٹر بی آر امبیڈکر سینٹرل لائبریری میں کام کرنے والے صفائی کرمچاری، جو دلت سماج سے آتے ہیں، ان کو تنخواہ وقت پر نہیں مل رہی ہے۔ وہ اناج اور روزمرہ کی ضروری اشیا کے لیے ادھر ادھر مدد کے لیے فریاد کر رہے ہیں۔ کاویری ہاسٹل کے منیجر کی ۱۳ ہزار کی سیلری نصف سے بھی زیادہ کاٹ لی گئی ہے۔ مگر ان سب باتوں پر جے این یو انتظامیہ کا دھیان نہیں ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ جے این یو میں دہشت گردی سے متعلق کبھی کچھ پڑھایا نہیں جاتا ہے یا پھر کسی نے کوئی پی ایچ ڈی اس موضوع پر نہیں جمع کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس بار دہشت گردی سے متعلق کورس کو صرف اور صرف اسلام اور مسلمان کو ٹارگیٹ کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ تین سال پہلے بھی ایسا کورس لانے کی بات ہوئی تھی، مگر جب کافی احتجاج ہوا تو معاملہ دب گیا۔

۲۰۱۸ میں جب اسلامک ٹیررازم سے متعلق ایک کورس کو لانچ کرنے کی بات میڈیا میں آئی تھی، تب دہلی اقلیتی کمیشن کے صدر ڈاکٹر ظفر الاسلام نے جے این یو انتظامیہ سے اس کورس کے بارے میں تفصیلات طلب کیں۔ جواب میں جے این یو انتظامیہ نے کہا کہ اس طرح کا کورس لانے کا کوئی منصوبہ نہیں ہے، مگر ایسا لگتا ہے کہ آئندہ اتر پردیش کے اسمبلی انتخابات اور ۲۰۲۴ کے پارلیمانی الیکشن کے مدنظر، بھگوا تنظیمیں لوگوں کو دھرم اور مذہب کے نام پر لڑانا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے ان کو اسلام اور مسلمانوں کو بھارت اور ہندو سماج کے سامنے ایک بڑا خطرہ بنا کر پیش کرنا پڑ رہا ہے۔ اس طرح کے کورس مسلم مخالف ماحول کو پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

راقم الحروف نے بھی اس وقت اس کورس کی مخالفت میں صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند کو ایک کھلا خط لکھ کر اس پر روک لگانے کی اپیل کی تھی۔ آج بھی میرا موقف یہی ہے کہ دہشت گردی کو کسی بھی خاص مذہب سے جوڑ کر دیکھنا بہت ہی غلط ہے۔ جو لوگ دن رات دہشت گردی کا خوف دکھا کر لوگوں کو ڈراتے ہیں، ان سے اگر کوئی پوچھ لے کہ دہشت گردی کی تعریف کیا ہے، تو ان کے پاس جواب نہیں ہوگا۔ یہ اس لیے کہ ابھی تک پوری دنیا میں اس پر اتفاق نہیں بن پایا ہے۔ مگر دہشت گردی کو ختم کرنے کے نام پر بہت ساری جنگیں لڑی جا چکی ہیں اور ہزاروں لاکھوں لوگوں کا خون بہایا جا چکا ہے۔ دہشت گردی کے خطرات پر بات کرنے والے ان سوالوں کا جواب دینے سے اکثر بھاگتے ہیں۔ آخر کیوں ایک ہی انسان کسی کے لیے مجاہد آزادی ہوتا ہے اور دوسرے کے لیے دہشت گرد؟ کیوں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے نام بدل جاتے ہیں؟ کیسے طالبانی مجاہد آزادی ہو جاتا ہے اور پھر دہشت گرد؟

دنیا کی کسی بھی روشن خیال یونیورسٹی میں دہشت گردی کو ایک مخصوص مذہب سے جوڑ کر نہیں پڑھایا جاتا۔ اسلامی دہشت گردی، عیسائی دہشت گردی، ہندو دہشت گردی یا سکھ دہشت گردی کے نام پر کہاں کورس چلتے ہیں؟ اگر دہشت گردی کا نام کسی معصوم کو ستانا اور کسی کا خون بہانا ہے، تو دنیا میں کون سا ایسا دھرم اور مذہب ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کے پیروکاروں نے کبھی بھی کسی کا ناحق خون نہیں بہایا ہے؟ پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں کس دھرم کے لوگوں نے لڑائی کی شروعات کی؟ کون جدال وقتال کے لیے ذمہ دار تھا؟ کس دھرم کے لوگوں نے نوآبادیات اور سامراجیت کو قائم رکھنے کے لیے، تیسری دنیا کے لوگوں کو ستایا؟ دھرم کو نہ ماننے والے ملحد حکمراں بھی ظالم ثابت ہوئے ہیں۔ کون ہے جو ہتھیار بناتا ہے؟ کیا ان سب برائیوں کے لیے صرف اور صرف اسلام اور مسلمان ہی ذمہ دار ہے؟

میرا مطالعہ یہ کہتا ہے کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنا نہایت غلط ہے۔ یہ سچ ہے کہ اسلام کا غلط استعمال کر کے کچھ لوگوں نے اسے بدنام کیا ہے۔ مگر مذہب کی غلط تشہیر کرنے والے دوسرے مذاہب میں بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ ایسا اگر نہیں ہوا ہوتا تو عیسیٰ مسیح اور مہاتما گاندھی کا قتل نہ ہوا ہوتا۔ اسلام کا سچا پیغام عبادت کو خدمت خلق سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ یہ فساد کی مخالفت اور امن و صبر کی بات کرتا ہے۔ قرآن میں مالک کی عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ، بے سہارا لوگوں کو سہارا دینے، رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسکین، مسافروں کی مدد کرنے کی بات کرتا ہے۔ قرآن میں یہ صاف کہا گیا ہے کہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔ جو لوگ جہاد کو ہمیشہ تشدد سے جوڑتے ہیں وہ بھی اسلام کو نہیں سمجھتے۔ جہاد کا مطلب تشدد نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر جاہلیت اور ناخواندگی کے خلاف جہاد چھیڑنے کا مطلب قتل وغارت نہیں بلکہ علم کی روشنی جلانا ہوتا ہے۔ آئیں ہم سب مل کر جے این یو میں جہادی دہشت گردی کے نام پر شروع ہونے والے کورس کے فتنہ کو پنپنے سے پہلے ہی ختم کرنے کی پہل کریں۔ ہمیں پرامن طریقے سے اس کی مخالف کرنی چاہیے۔ یہ کورس سماج میں کشیدگی پیدا کرے گا اور نوجوانوں کے دماغ میں اسلام اور مسلم مخالف نفرت کے بارود کو بھر دے گا۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

جے این یو: اب کھانے پر بھی پہرا

ہر روز ملک کی مشترکہ وراثت اور تنوع پر شر پسند عناصر چوٹ کر رہے ہیں ملک کو بچانے کے لیے سیکولر طاقتوں کو ایک ساتھ آنا ہی ہوگا

ابھے کمار

ملک کو مسلسل فرقہ پرستی کی آگ کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ جے این یو سے خبر آ رہی ہے کہ شدت پسند ہندو تنظیم سے جڑے طلبہ نے گوشت کھانے کو لے کر ہنگامہ کیا ہے اور جن لوگوں نے ان کی غنڈہ گردی کی مخالفت کی ہے، انہیں مارا پیٹا بھی گیا۔ کچھ طالبات کو گہری چوٹیں بھی آئیں، کچھ کے ساتھ بدسلوکی کی گئی۔ جے این یو سے موصولہ باوثوق ذرائع کے مطابق، بی جے پی کی طلبہ تنظیم سے وابستہ طلبہ نے رام نومی کے موقع پر کاویری ہاسٹل کے اندر ہون اور پوجا کی اور پھر اس بات کو لے کر ہنگامہ کرنے لگے کہ آج کے روز گوشت نہیں پکنا چاہیے۔ جے این یو کے عام طلبہ نے اس سانحہ پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شدت پسندوں کا اصل مقصد ایشور کی عبادت کرنا کم اور ہنگامہ کھڑا کرنا زیادہ تھا۔ مزید جانکاری کے مطابق، رام نومی کے روز اے بی وی پی کے کارکنان ہوسٹل کے اندر ہون کرنے کے لیے بضد تھے۔ جے این یو میں اپنے نو سال کے قیام کے دوران، میں نے کبھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ ہوسٹل کے اندر کبھی ہون ہوا ہو۔ آر ایس ایس اور بی جے پی سے منسلک اے بی وی پی کے کچھ حامی یہ کہتے ہیں کہ جب مسلمان ہوسٹل میں افطار کر سکتے ہیں تو ہندو طلبہ ہون کیوں نہیں کر سکتے؟ مگر سچائی یہ ہے کہ روزہ دار طلبہ کے لیے جے این یو میں افطار اور سحری کا اہتمام کیا جاتا ہے کیونکہ وہ صبح کا ناشتہ اور لنچ نہیں لیتے ہیں۔ یہ کوئی مذہبی معاملہ نہیں ہے۔ وہیں دوسری طرف ہون ایک مذہبی رسوم ہے جسے یونیورسٹی کے ہاسٹل میں کرنے کی یہاں کوئی روایت نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اقلیت اور اکثریت فرقہ کے حالات ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ ملک کتنا بھی سیکولر کیوں نہ ہو، سماج کے اندر اکثریت سماج کا دھرم اور کلچر کا دبدبہ اکثر دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کو کتنے پولیس تھانوں میں، جو کہ ایک سیکولر ادارہ ہے، مندر نظر آتے ہیں اور کتنے تھانوں میں مسجد، گرودوارا اور کلیسا نظر آتے ہیں؟ بے شک مندر آپ کو ہر جگہ دکھ جائیں گے۔ اسی طرح جب ملک میں ہولی اور دیوالی منائی جاتی ہے تو ہر طرف اس کا اثر دکھتا ہے، وہیں بہت سارے ایسے ادارے بھی ہیں، جہاں عید کے روز کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔ اس لیے اقلیت کے مذہب اور ثقافت کو اکثریتی طبقہ کے دھرم اور سنسکرتی کے مد مقابل کھڑا کرنا نہایت افسوسناک امر ہے۔ اقلیتوں کے مذہب اور ثقافت کا احترام کرنا چاہیے۔

جے این یو میں جو کچھ بھی ہوا اس کو دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کا حصہ تھا۔ ہون کے دوران اے بی وی پی سے جڑے طلبہ نے پوجا میں کم دھیان لگایا اور اپنے حریف کو نشانہ بنانے اور ان کے خلاف ماحول سازی کرنے میں زیادہ توانائی صرف کی۔ مسلم، عیسائی، دلت، آدی واسی اور بائیں محاذ کی تنظیموں سے جڑے طلبہ پر وہ ایک کے بعد ایک تبصرے کرتے رہے۔ اُن کا پورا منصوبہ یہ تھا کہ کسی طرح سے ہنگامہ کھڑا کیا جائے اور میڈیا کی مدد سے دیش میں یہ پیغام دیا جائے کہ جے این یو میں ہندو طلبہ کو اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی نہیں ہے اور مسلمان اور لیفٹ کے سرگرم کارکنان اُن کی پوجا میں خلل ڈال رہے ہیں۔ جب اشتعال انگیزی سے بھی اُن کا مقصد پورا نہیں ہوا تو اے بی وی پی اور دیگر ہم خیال تنظیموں سے جڑے طلبہ نے گوشت کو لے کر معاملہ اٹھایا اور کہا کہ رام نومی کے دن گوشت کیسے پک سکتا ہے؟ پھر بی جے پی کے حامی اس کو لے کر واویلا مچانے لگے۔ جب احتجاج ہوا اور دیگر طلبہ نے کہا کہ گوشت ہاسٹل مینو کے مطابق پک رہا ہے تو انہوں نے اور ہنگامہ کھڑا کیا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جے این یو میں بدھ، جمعہ اور اتوار کو گوشت پکتا ہے۔ جو گوشت نہیں کھاتے اُن کے لیے پنیر کی سبزی بنتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ رام نومی کے دن گوشت کی سپلائی نہیں ہونا چاہیے اور ہوسٹل میں گوشت نہیں پکنا چاہیے، یہ تو سراسر داداگیری ہے۔ کس کو کیا کھانا ہے، وہ انسان خود طے کرے گا۔ جس طرح سے لوگوں کو سبز خوری کا احترام کرنا چاہیے اسی طرح سے گوشت خوری پر بھی کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بہت دکھ کی بلت ہے کہ بھارت کو سبزی خور ملک کے طور پر طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل بھارت کے زیادہ تر لوگ گوشت کھاتے ہیں۔ دراصل گوشت سستا اور اچھا پروٹین کا ذریعہ ہے اور اسے کھانا صحت کے لیے اچھا ہے مگر جو گوشت نہیں کھاتے اُن کا بھی احترام ہونا چاہیے۔

> بھاجپا ہندو سماج اور ملک کو ایک رنگ میں رنگنے کے لیے آمادہ ہے۔ تبھی تو وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے زور زبردستی اور طاقت کا بے جا استعمال کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ جے این یو میں ویسا ہی ہوا۔ گوشت پر روک لگانے کے خلاف آواز بلند کرنے والے طلبہ اور طالبات پر شر پسندوں نے پتھر چلایا اور بعض کو پیٹا۔ پولیس اس پورے واقع کے دوران تماشائی بنی رہی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ انتظامیہ، پولیس، اور ارباب اقتدار کی ملی بھگت سے ہوا۔

عام طلبہ کا کہنا ہے کہ ایک سچا عقیدتمند کبھی بھی دھرم اور مذہب کے نام پر لڑ نہیں سکتا اور جو لڑتا ہے وہ بھگوان کا بھکت نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگ تو صرف کسی سیاسی جماعت کے ایجنٹ ہو سکتے ہیں۔ دھرم اور مذہب کا سچا پیغام یہی ہے کہ عبادت اور عقیدے کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی بھی انسان دھرم کو بغیر دل میں اتارے اسے اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنا سکتا۔ جو لوگ مذہب کو سچے دل سے مانتے ہیں وہ دوسروں کے عقیدے کا احترام کرتے ہیں، وہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہیں۔ انہیں بخوبی معلوم ہے کہ اگر اوپر والا چاہتا تو سب کو ایک ہی مذہب میں پیدا کر دیتا مگر جب اس نے لوگوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ ہر فرد اپنی مرضی سے مذہب کو قبول کرے۔ اس لیے دھرم کے معاملے میں انسانوں کو زور، زبردستی اور داروغہ گیری سے کام نہیں لینا چاہیے۔

مگر زور زبردستی بھاجپا کا ہمیشہ سے حصہ رہا ہے۔ رام مندر تحریک کے دوران شدت پسندوں نے شری رام چندر جی کا مندر بنانے کی بات صرف نہیں کہی بلکہ ایک پرانی مسجد کو مسمار کر اسی مقام پر مندر بنانے کا فتنہ چھوڑا تھا۔ جب مندر تحریک کا جنم نہیں ہوا تھا اس وقت بھاجپا کی طاقت ایک چھوٹی پارٹی سے بھی کم تھی اور ایک وقت میں اُن کے پاس صرف دو ایم پی تھے۔ مگر ملک کی سیاست میں جیسے جیسے مندر تحریک نے جارحانہ رُخ اختیار کیا ویسے ویسے بی جے پی کی سیٹیں بڑھنے لگیں اور وہ مرکز میں قابض ہو گئی۔ اگر آپ ہندوتوا کے بانیان اور مفکرین کو پڑھیں گے اور ان کی زندگی کو دیکھیں گے تو ان کے نزدیک دھرم اقتدار حاصل کرنے کی ایک سیڑھی ہے۔

مگر بھاجپا ہندو سماج اور ملک کو ایک رنگ میں رنگنے کے لیے آمادہ ہے۔ تبھی تو وہ اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے زور زبردستی اور طاقت کا بے جا استعمال کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ جے این یو میں ویسا ہی ہوا۔ گوشت پر روک لگانے کے خلاف آواز بلند کرنے والے طلبہ اور طالبات پر شر پسندوں نے پتھر چلایا اور بعض لوگوں کو پیٹا۔ پولیس اس پورے واقع کے دوران تماشائی بنی رہی جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ انتظامیہ، پولیس، اور ارباب اقتدار کی ملی بھگت سے ہوا۔ ہر روز ملک کی مشترکہ وراثت اور تنوع پر بھگوا طاقتیں چوٹ کر رہی ہیں۔ ملک کو بچانے کے لیے سیکولر طاقتوں کو ایک ساتھ آنا ہی ہوگا۔

■■■

کاس گنج سانحہ: جب محافظ ہی قاتل بن جائیں!

عوام اس بات سے افسردہ ہیں کہ پولیس اپنی آئینی ذمہ داری نبھانے میں پھرنا کام رہی ہے اور وہ مسلسل سیاسی دباؤ میں کام کررہی ہے

ابھے کمار

اتر پردیش میں نظم وضبط کی صورت حال دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ آبادی کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی ریاست میں عوام خوف کے سائے میں زندگی گزار رہے ہیں۔ تازہ معاملہ کاس گنج کا ہے، جہاں ۲۱ سالہ الطاف کی پولیس حراست میں موت ہوگئی ہے۔ غم سے نڈھال الطاف کے گھر والوں نے یہ الزام لگایا ہے کہ پولیس نے اسے حراست میں بری طرح سے سر اور پیر پر مارا اور اس کا قتل کر دیا گیا۔ کاس گنج سانحہ کے بعد ریاست کی بھگوا سرکار کی زبردست مذمت ہو رہی ہے اور انسانی حقوق کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ریاست میں پولیس کو بے لگام اختیار دے دیا گیا ہے اور ریاستی حکومت خاکی وردی کا سیاسی استعمال کررہی ہے۔ حالانکہ پولیس اپنے دفاع میں یہ کہہ رہی ہے کہ الطاف نے تھانہ کے باتھ روم میں گلا گھونٹ کر خود کو مارنے کی کوشش کی۔ مگر پولیس کے مذکورہ بیان پر بہت سارے سوالات اٹھ گئے ہیں۔ مثلاً، پولیس جس باتھ روم کے نل سے خودکشی کرنے کی بات کہہ رہی ہے، اس کی اونچائی ڈیڑھ یا دو فٹ سے زیادہ نہیں ہے، جبکہ الطاف کی لمبائی اس سے تین گنا زیادہ تھی! پھر کیسے وہ اپنے قد سے بہت ہی چھوٹے نل سے خود کو لٹکا کر مار سکتا ہے؟ کیسے کوئی اپنی جیکٹ کی ڈوری سے لٹک کر خودکشی کر سکتا ہے؟ مجموعی طور پر عوام کا ردعمل یہ بھی ہے کہ پولیس کہانی بنا کر اپنے آپ کو بچا رہی ہے۔

عوام اس بات سے بھی افسردہ ہیں کہ پولیس اپنی آئینی ذمہ داری کو نبھانے میں پھرنا کام رہی ہے اور وہ مسلسل سیاسی دباؤ میں کام کررہی ہے۔ بعض دفعہ وہ محافظ کی جگہ قاتل بن جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو کیوں ہر روز حراستی قتل اور انکاؤنٹر کے مذموم واقعات رونما ہوتے؟ دراصل پولیس کا کام تفتیش کرنا اور ثبوت کو عدالت کے سامنے پیش کرنا ہوتا ہے۔ مگر نو آبادیاتی دور، جب پولیس محکمہ وجود میں آیا، سے لے کر اب تک پولیس کا استعمال سیاسی طور پر ہوتا رہا ہے۔ مگر اب تو پولیس کھل کر سیاسی جماعت کے اشارہ پر ناچ رہی ہے۔ خاص کر جہاں بھی بھگوا طاقتیں اقتدار میں ہیں، وہاں پولیس کا استعمال فساد کے دوران لوگوں کی جان و مال بچانے کے بجائے اقلیتوں پر حملے کرانے کے لیے بھی ہو رہا ہے۔ الطاف کی حراستی موت اتر پردیش میں کوئی منفرد واقعہ نہیں ہے۔ گزشتہ مہینوں گورکھ پور میں منیش گپتا کے گھر والوں نے الزام لگایا کہ اس کی موت پولیس کی پٹائی سے ہوئی تھی۔ حد تو یہ ہوگئی ہے کہ یوپی کی پولیس کرکٹ میچ کے دوران کسی ٹیم کی حمایت کرنے کے ملزم طلبہ پر یو اے پی اے جیسی دہشت گردی سے متعلق دفعات نافذ کرنے کی بات کھلے عام کر رہی ہے۔ مگر مین اسٹریم میڈیا کو جنگل راج صرف غیر بھگوا ریاستوں میں ہی دکھتا ہے۔

الطاف کا معاملہ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ پولیس فرقہ وارانہ جذبے سے کام کر رہی تھی یا پھر اسے ایسا کرنے کے لیے سیاسی دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ الطاف کے خلاف یہ الزام تھا کہ اس کا ہاتھ کسی غیر مسلم لڑکی کو اغوا کرنے میں ہے۔ لڑکی کے گھر والوں نے پولیس میں نہ صرف شکایت درج کی، بلکہ اسے مارنے کی بھی دھمکی دی، جیسا کہ الطاف کے والد نے روتے ہوئے میڈیا کے سامنے کہا۔ پولیس کا کام یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پورے معاملہ کی تفتیش کرتی اور جو بھی اس میں قصوروار پایا جاتا اس کے خلاف کاروائی کرتی۔ مگر کاس گنج سانحہ میں تفتیش پوری ہونے سے پہلے، پولیس نے

فرقہ پرست نہیں چاہتے کہ پولیس محکموں میں تنوع اور تکثیریت نظر آئے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پولیس پروفیشنل بنے اور ان کے اندر اصلاح ہو۔ وہ نہیں چاہتے کہ پولیس کے اندر جڑ جما چکا فرقہ وارانہ تعصب ختم ہو۔ الطاف کی موت نہ صرف ان کے گھر والوں، مسلمان بلکہ پورے ملک کے لیے فکر کا لمحہ ہے۔ جب محافظ قاتل بن جائے تو ملک کی جمہوریت خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اس بحران کی ایک بڑی تدبیر عوامی تحریک ہے۔

الطاف کو مجرم مان لیا اور اسے فوراً سزا بھی دے دی گئی۔ الطاف کو سزا دے کر بھگوا عناصر یہ پیغام دینا چاہیے ہیں کہ ہندو سماج کی بہو اور بیٹیوں کے اوپر حملہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔ الطاف کو راستہ سے ہٹا کر فرقہ پرست اپنی تھیوری کو پھر سے مضبوط کرنا چاہتے ہیں کہ ہندو سماج کی بہو اور بیٹی کے سامنے سب سے بڑا خطرہ مسلمان ہیں۔ الطاف کو راستہ سے ہٹا کر وہ اپنے لو جہاد کی فرضی اور نفرت پر مبنی پر پروپیگنڈا کو بھی تقویت دینا چاہتے ہیں۔

پولیس کی زیادتی کا سب سے بڑا شکار مظلوم طبقات ہی رہے ہیں۔ سی اے اے مخالف احتجاج کے نام پر پولیس نے مسلمانوں کو بری طرح سے مارا پیٹا اور ان میں سے بہت سارے لوگوں کے اوپر فرضی مقدمہ ڈال کر جیل بھیج دیا۔ گائے، گوشت، لو جہاد کے نام پر ہر روز مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ خواتین، خاص کر دلت سماج کی بہنوں اور بیٹیوں پر، ایک کے بعد ایک حملہ ہوئے ہیں۔ جب دلت خواتین پر حملہ ہوتا ہے تو پولیس گرفتاری کرنے کے بجائے مجرموں کو بچانے لگتی ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بھگوا عناصر نہ صرف مسلمان بلکہ ملک کی اکثریت آبادی کے مفاد کے خلاف کام کرتے ہیں۔ اس ملک میں سب سے بڑی آبادی دلت، آدی واسی، پچھڑا، مسلمان اور دیگر اقلیتوں کی ہے۔ مگر ان کے اوپر چند مٹھی بھر لوگ راج کرتے ہیں۔ محکوم طبقات کو روز نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ آدی واسیوں کو ان کے جل، جنگل اور زمین سے محروم کیا جا رہا ہے اور طاقت کا استعمال کر کے ان کو ان کے گھروں سے اجاڑا جا رہا ہے، وہیں ان کے علاقوں میں غیر آدی واسیوں کو بسایا جا رہا ہے اور وہاں کی ڈیموگرافی بدلی جا رہی ہے۔ دلتوں کو صدیوں سے تعلیم سے دور رکھا گیا ہے، ان کو زمین اور جائداد کو حاصل کرنے سے روکا گیا ہے۔ اگر ندی اور تالاب میں جانور پانی پی لے تو اتنا بڑا ہنگامہ نہیں ہوتا جتنا بڑا ایک دلت کے پانی کے قریب جانے سے ہوتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ آزادی کے بعد چھوت چھات کو قانون کی کتاب میں جرم قرار دے دیا گیا، مگر آج بھی دلتوں کو برابری کا حق نہیں ملا اور اور آج بھی کام کا بٹوارہ ذات اور برادری پر ٹکا ہوا ہے۔ آج بھی صفائی کا کام دلتوں سے ہی کرایا جاتا ہے۔ وہیں پچھڑا سماج جسے ہم بیک ورڈ کلاس یا پسماندہ جماعت کہتے ہیں، ان کی آبادی ملک میں سب سے زیادہ ہے، جبکہ سرکاری اور غیر سرکاری آفس، تعلیمی ادارہ، عدلیہ، میڈیا، فلم انڈسٹریز اور بزنس اور کاروبار میں ان کی نمائندگی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

دلت، آدی واسی، پچھڑے کی طرح مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں پر حملے ہر روز ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کی حالت اس لیے بھی زیادہ خراب ہے، کیونکہ برسر اقتدار بھگوا جماعت کی پوری سیاست اقلیت مخالف ہے۔ پولیس کی اس فرقہ وارانہ اور مسلم مخالف ذہنیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے اوپر بیٹھے سیاسی حاکم فرقہ پرست نظریہ کے حامل ہیں۔ فرقہ پرست نہیں چاہتے کہ پولیس محکموں میں تنوع اور تکثیریت نظر آئے۔ وہ نہیں چاہتے کہ پولیس پروفیشنل بنے اور ان کے اندر اصلاح ہو۔ وہ نہیں چاہتے کہ پولیس کے اندر جڑ جما چکا فرقہ وارانہ تعصب ختم ہو۔ الطاف کی موت نہ صرف ان کے گھر والوں، مسلمان بلکہ پورے ملک کے لیے فکر کا لمحہ ہے۔ جب محافظ قاتل بن جائے تو ملک کی جمہوریت خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ اس بحران کی ایک بڑی تدبیر عوامی تحریک ہے۔

(مضمون نگار جے این یو کے شعبہ تاریخ سے پی ایچ ڈی ہیں)

ہندوستان کا کمبھ میلہ اور مسلمان

نفرت پر مبنی افواہوں کا بازار اس قدر گرم ہے کہ فرقہ پرست افراد بے بنیاد الزامات لگا کر نکل پڑتے ہیں، اور ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں ہوتا

ابھے کمار

۱۲ / سال کے طویل انتظار کے بعد پریاگ راج میں مہا کمبھ پر خوب ہلچل ہے۔ مقدس گنگا، جمنا، اور سرسوتی کے سنگم پر عقیدت مند غسل کرتے ہوئے اپنے مذہبی فرائض ادا کر رہے ہیں۔ چھ ہفتوں تک جاری رہنے والے اس میلے میں کروڑوں عقیدت مند حاضر ہوئے۔ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہبی اجتماع ہے۔ اگرچہ کمبھ میلے کی مقبولیت نے جدید دور میں شدت اختیار کی ہے۔ انگریزوں کی آمد اور ریل کی سہولتوں کے فروغ کے ساتھ عقیدت مندوں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا۔ بعدازاں، ہندو احیا پرستوں نے کمبھ میلے کو ہندو شناخت کا ایک اہم حصہ قرار دے کر اس کی اہمیت کو مزید اجاگر کیا۔ اسی طرح، حکمرانوں کے درمیان کمبھ کے بہتر انتظام کا کریڈٹ لینے کے لیے بھی مسابقت دیکھنے میں آئی۔ اس بار بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کی یوپی حکومت کا محکمہ تعلقات عامہ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کو نہ صرف کمبھ میلے کا کامیاب منتظم بلکہ ہندو سماج کے عظیم رہنما کے طور پر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ دوسری جانب، ہندو انتہا پسند کمبھ جیسے مذہبی اجتماع کو فرقہ وارانہ رنگ دینے سے باز نہیں آ رہے ہیں۔ جہاں ملک اور دنیا کے میڈیا کی نظریں کمبھ میلے پر مرکوز ہیں، وہیں شدت پسند تنظیمیں مسلمانوں کے اس میلے میں داخلے کی اجازت روکنے اور ان کے معاشی بائیکاٹ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔

حالانکہ انتظامیہ کی جانب سے مسلمانوں کو کمبھ میں داخلے سے روکنے کے لیے کوئی حکم جاری نہیں کیا گیا، لیکن اقلیتوں میں یہ بے چینی محسوس کی جا رہی ہے کہ یوگی حکومت نے شدت پسندوں کے خلاف کوئی واضح موقف اختیار نہیں کیا ہے۔ ایک مشہور ہندی نیوز چینل کو دیے گئے انٹرویو میں یوگی آدتیہ ناتھ نے کہا کہ کمبھ میلے کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں، مگر ساتھ ہی فرقہ پرستوں کے بیانیے کے مطابق یہ بھی کہا کہ جو لوگ سناتن دھرم کا احترام نہیں کرتے، وہ اس میلے میں نہ آئیں تو بہتر ہوگا۔ جہاں ایک طرف ایسے فرقہ وارانہ مطالبات بھارت کی سیکولر شناخت کو نقصان پہنچا رہے ہیں، وہیں بہت سارے مسلمانوں کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ انہیں میلے میں اپنی دکانیں سجانے کے مواقع سے محض ان کے مذہبی تشخص کی وجہ سے محروم رکھا جا رہا ہے۔

ہندوتو وادی نظریہ کی حامل تنظیم اکھل بھارتیہ اکھاڑہ پریشد نے مطالبہ کیا ہے کہ جو لوگ غیر سناتنی ہیں، انہیں کمبھ میلے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی انہیں میلے کے اندر کوئی ہوٹل یا دکان چلانے کا موقع ملنا چاہیے۔ یہ تنظیم یوگی آدتیہ ناتھ کی حکومت پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ وہ مسلمانوں پر پابندی عائد کرے۔ مسلم دشمنی کی شدت کا عالم یہ ہے کہ اس تنظیم سے وابستہ مذہبی لیڈروں نے ہندو روایات سے منسلک فارسی کے الفاظ کو بھی تبدیل کرنے کی تجویز دی ہے۔ مثال کے طور پر، 'شاہی اسنان' میں استعمال ہونے والے 'شاہی' لفظ کو بدلنے کی سفارش کی گئی ہے، اور جہاں بھی 'پیشوائی' جیسی اصطلاحات استعمال کی جاتی رہی ہیں، انہیں بھی تبدیل کرنے کی وکالت کی جا رہی ہے۔ ایک الزام یہ بھی عائد کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی موجودگی یا ان کے ہوٹل چلانے سے کمبھ میلے میں نظم و ضبط کا مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔ انتہا پسندوں کے بے بنیاد دلائل کے مطابق، اگر مسلمانوں نے کمبھ میلے میں کھانے پینے کے ہوٹل کھول لیے، تو اس سے عقیدت مندوں کے عقائد مجروح ہو سکتے ہیں کیونکہ ان کے مطابق مسلمان دانستہ طور پر کھانے پینے کی اشیاء کو آلودہ کر کے پیش کرتے ہیں۔ نفرت پر مبنی افواہوں کا بازار اس قدر گرم ہے کہ فرقہ پرست افراد بے بنیاد الزامات لگا کر نکل پڑتے ہیں، اور ان سے جواب طلب کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ حال ہی میں ایک ویڈیو وائرل ہوئی تھی، جس کی بنیاد پر یہ خبر چلائی گئی کہ کسی مسلم شخص نے کمبھ میلے کے بینر پر پیشاب کر دیا تھا۔ اس افواہ کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا کی جائے کہ مسلمان ان کے مقدس میلے کمبھ کی بے حرمتی کر رہا ہے۔ تاہم، رائے بریلی کی پولیس نے ۱۱/ جون کو واضح کر دیا کہ پیشاب کرنے والا شخص مسلمان نہیں، بلکہ ایک ہندو تھا، جو نشے کی حالت میں تھا اور اس نے کسی دیوار کے قریب پیشاب کیا تھا۔ اس واقعے کا کمبھ میلے کے بینر کی بے حرمتی سے کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا۔ اس نوعیت کی افواہیں اور متعلقہ ویڈیوز حالیہ دنوں میں خوب وائرل کی گئی ہیں، جن میں مسلمان جیسی شکل یا نام والے شخص کو کھانے پینے کی اشیاء کو آلودہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جہاں تک ہوٹلوں میں صفائی کا تعلق ہے، یہ ایک اہم مسئلہ ہے اور انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ صفائی کے معاملے میں غفلت برتنے والے ہوٹل مالکان کے خلاف کارروائی کرے۔ تاہم، یہ بالکل بھی مناسب نہیں کہ صفائی جیسے اہم مسئلے کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر مسلم مخالف نفرت پیدا کی جائے۔

قانونی طور پر چھوت چھات کا خاتمہ سالوں پہلے ہو چکا ہے، لیکن دلتوں اور مسلمانوں کے خلاف تعصب اور امتیاز کی ذہنیت اب بھی برقرار ہے۔ جیسے ہی کسی فرقہ پرست کو یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی دکان یا ہوٹل کا مالک دلت یا مسلمان ہے، وہ اس کا بائیکاٹ کرتا ہے۔ بی جے پی حکومت نے مذہبی عقیدت کے احترام کے نام پر ہوٹل مالکان کو اپنے نام کی پلیٹ ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ دلت اور مسلمان مالکان کی پہچان واضح کی جائے تا کہ محکوم طبقات کے خلاف معاشی بائیکاٹ کا دروازہ کھل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرقہ پرست اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک وہ مسلم مخالف بیانیہ نہیں پھیلائیں گے، تب تک انہیں مسلم مخالف پالیسی بنانے میں مشکلات کا سامنا ہوگا۔ اسی مقصد کے تحت یہ بات خوب پھیلائی جا رہی ہے کہ مسلمان ہوٹل والے جان بوجھ کر گندہ اور ناپاک کھانا پیش کرتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے کا اصل مقصد مسلمانوں کے ہوٹلوں کو بند کرانا اور ان کی کاروباری سرگرمیاں ہندوتو وادی جماعت کے قریبی لوگوں کے حوالے کرنا ہے، تاکہ مسلمانوں کو معاشی طور پر مجبور اور مفلسی میں مبتلا کر دیا جائے۔ کئی اقتصادی ماہرین یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ نسل پرستی، فرقہ پرستی، اور ذات پات کا گہرا تعلق تجارت کی کامیابی اور ناکامی سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہوٹلوں میں کام کرتے ہوئے اکثر دلت مزدور دکھائی دیتے ہیں، مگر دلتوں کے نام سے ہوٹل کم دکھائی دیتے ہیں۔ قانونی طور پر چھوت چھات کا خاتمہ سالوں پہلے ہو چکا ہے، لیکن دلتوں اور مسلمانوں کے خلاف تعصب اور امتیاز کی ذہنیت اب بھی برقرار ہے۔ جیسے ہی کسی فرقہ پرست کو یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی دکان یا ہوٹل کا مالک دلت یا مسلمان ہے، وہ اس کا بائیکاٹ کرتا ہے۔ بی جے پی حکومت نے مذہبی عقیدت کے احترام کے نام پر ہوٹل مالکان کو اپنے نام کی پلیٹ ظاہر کرنے پر مجبور کیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ دلت اور مسلمان مالکان کی پہچان واضح کی جائے تا کہ محکوم طبقات کے خلاف معاشی بائیکاٹ کا دروازہ کھل جائے۔

سرکاری نوکریوں میں مسلمانوں کی شرح تقریباً ۵ / فیصد ہے، اور بیشتر مسلمان مزدوری یا چھوٹے کام کر کے اپنا گزارہ کرتے ہیں۔ اگر فرقہ پرستوں کے مذکورہ ناپاک عزائم کمبھ کے میلے میں کامیاب ہو گئے تو مسلمانوں کی موجودگی کاروبار اور تجارت میں مزید کم ہو جائے گی، اور وہ سڑکوں پر آ جائیں گے۔ فرقہ پرست طاقتیں یہی چاہتی ہیں کہ مسلمانوں کو ہر محاذ پر کمزور کیا جائے۔ لیکن اس وقت کی سب سے اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم حکومت کو یہ یاد دلائیں کہ سیکولر نظام میں دھرم پر مبنی پالیسی نہیں بنائی جا سکتی، اسی طرح، حکمراں جماعت کو یہ بات واضح کرنی ہوگی کہ عید، دسہرا، اور کرسمس کے موقع پر لگنے والا میلہ کسی ایک مذہبی گروپ کا نہیں ہوتا ہے بلکہ انہیں پورا معاشرہ مل کر مناتا ہے۔ ■

(مضمون نگار تاریخ کے اسکالر ہیں)

debatingissues@gmail.com

شہری حقوق کا بڑا مجاہد لوہیا

جب تک حکومتیں پولیس اور ڈنڈے کے زور پر چلتی رہیں گی، تب تک ڈاکٹر لوہیا کی معنویت برقرار رہے گی

ابھے کمار

سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا جدید بھارت کی اہم شخصیت ہیں۔ حالانکہ آج وہ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، مگر ان کا اثر ہر طرف محسوس کیا جاتا ہے۔ نہ تو وہ کبھی وزیر بنے اور نہ ہی کسی حکومت کی کمان سنبھالی، مگر پھر بھی وہ لاکھوں دلوں پر راج کرتے تھے۔ آج سے ۵۵ سال پہلے اسی اکتوبر کی ۱۲ تاریخ کو انہوں نے دہلی کے ایک اسپتال میں آخری سانس لی۔ یہ ملک کی بدقسمتی تھی کہ لوہیا محض ۵۷ سال کی عمر میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کی زندگی بھلے ہی چھوٹی تھی، مگر ان کی خدمات بہت بڑی تھیں۔ ان کا شمار بھارت کے بڑے اسکالرز میں ہوتا ہے۔ انہوں نے جرمنی سے معیشت میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ اقتصادی مسائل کے علاوہ، ان کی دلچسپی سیاسیات، تاریخ اور سماجی علوم کے مختلف موضوعات میں تھی۔ لیڈر شپ کی خوبی ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انہوں نے طلبہ تحریک میں کافی قریب سے حصہ لیا تھا اور اس کی قیادت بھی کی تھی۔ وہ ایک بڑے صحافی اور مقرر بھی تھے۔ انہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اور ۱۹۴۲ کی 'بھارت چھوڑو تحریک' میں نمایاں کردار ادا کیا۔ آزادی کی لڑائی کے دوران وہ کانگریس سے منسلک سوشلسٹ گروپ کے اہم رکن تھے۔ وہ گاندھی اور جواہر لعل نہرو سے بہت متاثر تھے۔ مگر آزادی ملنے کے بعد وہ کانگریس اور نہرو کے بڑے ناقد بن گئے۔ وہ اپنی آخری سانس تک سوشلسٹ جماعت کو مضبوط کرنے کے لیے سرگرم عمل رہے۔ ان کی زندگی پر انسان دوستی، سوشل ازم اور گاندھی ازم جیسے نظریات کا بڑا اثر تھا۔ انہوں نے سرمایہ داری اور یوروپی اشتراکیت پر تنقید کی۔ ان نظریات کے متبادل کے طور پر انہوں نے سوشلزم کا نظریہ پیش کیا۔ ان کا ماننا تھا کہ بھارت جیسے غریب ایشیائی ممالک کو یوروپی ماڈل کی نقل نہیں کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر لوہیا کا کہنا تھا کہ جو معیشت زیادہ سے زیادہ روزگار پیدا کرے وہی بھارت جیسے غریب اور بڑی آبادی والے ملک کے لیے زیادہ مفید ہے۔ الغرض، وہ سرمایہ اور صنعت کی مرکزیت کے بڑے مخالف تھے۔ انہوں نے ذات برادری پر مبنی غیر برابری کے خلاف بڑی لڑائی چھیڑی اور محکوموں کے لیے ۶۰ رفیصد ریزرویشن کی بات کہی۔ وہ طبقاتی اور جنسی عدم مساوات کے بھی سخت مخالف تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان کی جگہ ہندی یا علاقائی زبان کی اہمیت پر زور دیا۔ انہوں نے ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی مہم چھیڑی۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ ڈاکٹر لوہیا تنازعات سے پاک رہے ہیں۔ قومیت، ہندو مسلم سوالات، خارجہ پالیسی، مسئلہ کشمیر، سرکاری زبان، ہندوستانی تاریخ اور اشتراکیت کے موضوع پر لوگوں نے ان سے شدید اختلاف بھی درج کیا ہے۔ مگر ان کے ناقدین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ بہت بہادر اور بے باک لیڈر تھے۔ کئی بار ان کے اس انقلابی تیور سے خود ان کی پارٹی کے سینئر لیڈر سکتہ میں آ گئے۔ آج ان خوبیوں کی ہندوستانی سیاست میں بڑی کمی محسوس کی جا رہی ہے۔

عصری دور کی سیاست میں جی حضوری کا چلن اور اقتدار اور صنعت میں مرکزیت کے امراض بڑھ رہے ہیں۔ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے سر پر حکومت بیٹھ جا رہی ہے۔ سپریم لیڈر کے سامنے وزرا خود سپردگی کر دے رہے ہیں۔ اقتدار کی مرکزیت کا بڑا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ سرکاری اداروں کی خود مختاری اور پیشہ ورانہ تشخص کو بدلا جا رہا ہے۔ آئین اور قانون کی کتاب کے مطابق کام نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ان اداروں کے کام کاج سپریم لیڈر کے فرمان سے چل رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ میڈیا، انتظامیہ، پولیس اور عدالت پر

> ارباب اقتدار کو خوش کرنے کے لیے عوام کی شخصی آزادی پر پولیس چوٹ کر رہی ہے۔ لوگوں میں اس بات کی بے چینی ہے کہ شہری حقوق کا احترام کرنے کے بجائے، عدالت حکومت کے دباؤ میں فیصلے دے رہی ہے۔ بہت لوگ عاملہ کی بڑھتی طاقت سے تشویش میں مبتلا ہیں۔ حالات بگڑ رہے ہیں اور نظام قابل رحم شکل اختیار کر رہا ہے۔ ایسے خطرات سے مقابلہ کرنے کے لیے لوہیا کی زندگی اور ان کے افکار سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

دباؤ بڑھتا جا رہا ہے کہ وہ حکومت کے سُر میں سُر ملا کر بولیں۔ مرکزیت بدعنوانی کو جنم دیتی ہے، جس میں عام انسان سب سے زیادہ پریشان ہوتا ہے۔ ارباب اقتدار کو خوش کرنے کے لیے عوام کی شخصی آزادی پر پولیس چوٹ کر رہی ہے۔ لوگوں میں اس بات کی بے چینی ہے کہ شہری حقوق کا احترام کرنے کے بجائے، عدالت حکومت کے دباؤ میں فیصلے دے رہی ہے۔ بہت لوگ عاملہ کی بڑھتی طاقت سے تشویش میں مبتلا ہیں۔ حالات بگڑ رہے ہیں اور نظام قابل رحم شکل اختیار کر رہا ہے۔ ایسے خطرات سے مقابلہ کرنے کے لیے لوہیا کی زندگی اور ان کے افکار سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ تبھی تو شخصی آزادی اور شہری حقوق کے نظریات لوہیا کے افکار میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کی بے باکی دیکھیے کہ انہوں نے نہ صرف حکومت وقت سے ٹکر لی بلکہ اپنی ہی پارٹی کے لیڈروں کی آمرانہ پالیسی کی سرعام مخالفت کی۔ آج کتنے سیاست داں ہیں جو ڈاکٹر لوہیا کی اس وراثت کو اپنی زندگی میں اپنانے کو تیار ہیں؟

شہری حقوق کے لیے لوہیا کی قربانیوں کو آج بھلا دیا گیا ہے۔ یہ بات نئی نسلوں کو معلوم نہیں ہے کہ لوہیا نے خود اپنی ہی سرکار کی غلطیوں کے خلاف محاذ کھول دیا تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۴ کا ہے، جب لوہیا پرجا سوشلسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری تھے۔ اس وقت ٹراونکور، چین کی ریاست میں ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔ کانگریس کے خلاف ووٹوں کے انتشار کو روکنے کے لیے لوہیا کی سیاسی جماعت کا اتحاد کمیونسٹ پارٹی سے ہوا۔ جب نتائج سامنے آئے تو کسی بھی پارٹی کو واضح اکثریت حاصل نہیں ہوئی۔ حالانکہ لوہیا کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کے پاس صرف ۱۹ سیٹیں تھیں، مگر کانگریس نے اسے باہر سے حمایت دے کر حکومت بنانے کا موقع فراہم کیا۔ پہلی مرتبہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کی سرکار بنی۔ پٹم تانو پلے کو وزیر اعلیٰ کا حلف دلایا گیا۔ مگر کچھ دنوں بعد وہاں مزدوروں نے بڑا احتجاج کیا۔ سرکار نے اپنی جابرانہ پالیسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہتے مزدوروں پر گولیاں چلائیں۔ آٹھ افراد ہلاک ہو گئے۔ ڈاکٹر لوہیا اس وقت جیل میں تھے۔ گولی باری کی بات جان کر ان کو کافی دکھ ہوا۔ سوانح نگار اندومتی کیلکر کے مطابق، ڈاکٹر لوہیا نے ۱۲ راگست ۱۹۵۴ء کو جیل سے ہی ایک تار بھیج کر اپنے ہی وزیر اعلیٰ سے استعفیٰ مانگا۔ جب لوہیا کے سامنے یہ بہانہ پیش کیا گیا کہ مظاہرین متشدد ہو گئے تھے اور پولیس کو گولی چلانے پر مجبور ہونا پڑا، تو انہوں نے سیاسی مفاد کے مقابلے میں انسانی زندگی اور شہری حقوق کی اہمیت پر زور دیا۔

ہندستانی سیاست میں آج کتنے لیڈر ہیں، جو پارٹی کے مفاد سے اوپر انسانی زندگی اور بنیادی حقوق کے تحفظ کے لیے زبان کھولتے ہیں؟ آج پارلیمنٹ اور اسمبلی میں کتنے سیاست داں شہری حقوق کے لیے سامنے آتے ہیں؟ جھوٹے الزامات میں ہزاروں دلت، آدی واسی اور مسلم نوجوانوں کو جیل میں بند کر دیا گیا ہے، وہیں فسادات کی سازش کرنے والے اور اقلیتوں کا خون بہانے والے ترقی پا رہے ہیں۔ ان ناانصافیوں کے خلاف آج کے سیاست داں کیوں تحریک نہیں چھیڑ رہے ہیں؟ ڈاکٹر لوہیا اپنی اصول پسندی کی وجہ سے جیل جاتے رہے، مگر انہوں نے ظالموں کے سامنے خود سپردگی نہیں کی۔ ۱۹۵۳ء میں جب لوہیا پارٹی کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے، تب انہوں نے پانی ٹیکس کے خلاف اتر پردیش میں ستیہ گرہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ستیہ گرہ کو کچلنے کے لیے اتر پردیش سرکار نے بہت سارے مظاہرین کو گرفتار کروایا۔ لوہیا کو خصوصی اختیارات ایکٹ ۱۹۳۲ کے تحت جیل بھیج دیا گیا۔ جب الہ آباد ہائی کورٹ کے سامنے لوہیا کو پیش کیا گیا تو انہوں نے صاف لفظوں میں کہا کہ مذکورہ قانون بھارت کے آئین کے خلاف ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ سول نافرمانی کو جرم قرار دینا گاندھی جی کی خدمات کو خارج کرنے کے مترادف ہے۔ فیصلہ دیتے ہوئے، چیف جسٹس نے لوہیا کی باتوں کی اہمیت کو تسلیم کیا اور کہا کہ ۱۹۳۲ ایکٹ کی دفعہ ۳ بھارت کے آئین کے خلاف ہے۔ شاید آج حالات اور بھی زیادہ خراب ہوئے ہیں۔ اختلاف رائے کو پولیس لاٹھیوں اور گولیوں سے خاموش کر رہی ہے۔ جب تک حکومتیں پولیس اور ڈنڈے کے زور پر چلتی رہیں گی، تب تک ڈاکٹر لوہیا کی معنویت برقرار رہے گی۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)
debatingissues@gmail.com

سوشلسٹ رہنما ڈاکٹر رام منوہر لوہیا

سماجی نابرابریوں کے خلاف لوہا لینے والی شخصیت

ذات پات کے خلاف لڑائی کو منطقی انجام تک پہنچانے کی ضرورت

ابھے کمار، دلی

ان دنوں پورے ملک میں سوشلسٹ ڈاکٹر لیڈر رام مَنوہر لوہیا کی یوم ولادت منائی جارہی ہے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو ان کی عمر ۱۱۲ سال ہوتی۔ ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ کو اتر پردیش کے ضلع فیض آباد میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ ان کے گھر والوں کا پیشہ لوہے کی تجارت تھا۔ تجارت کے ساتھ ساتھ سیاست بھی ان کو وراثت میں ملی۔ ان کے والد ہیرالال کانگریس کے بڑے حامی تھے۔ ۱۹۳۰ کی دہائی میں شروع ہونے والی سِول نافرمانی تحریک کے دوران، ہیرالال جیل بھی گئے۔ لوہیا کی تعلیم کاشی، کلکتہ اور جرمنی میں ہوئی۔ جرمنی سے انہوں نے نمک ستیہ گرہ اور محصولات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ جرمنی میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ انہوں نے طلبائی سیاست میں بھی حصہ لیا اور بھارت کی قومی تحریک کی آواز بیرون ملکوں تک پہنچائی۔ حالانکہ وہ کانگریس کے بڑے لیڈروں کے قریب تھے اور ملک کو آزاد کرانے میں انہوں نے بڑی قربانی دی تھی، مگر جب ملک آزاد ہوا اور اقتدار کی کرسی پر کانگریس براجمان ہوئی تو لوہیا اقتدار کے گلیاروں میں رہنے کے بجائے حزب اختلاف کی صفوں میں جا بیٹھے۔

اپنی ۵۷ سال کی زندگی میں لوہیا نے بہت کچھ پڑھا اور لکھا۔ حالانکہ ان کی پی ایچ ڈی شعبہ اقتصادیات میں تھی، مگر ان کی دلچسپی دیگر مضامین میں بھی تھی۔ وہ فلسفہ اور تاریخ کے بھی گہرے طالب علم تھے۔ انہوں نے سوشلزم، تاریخ، زبان، ذات پات، نابرابری، بین الاقوامی اور خارجی امور کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ ان کی ساری تحریروں کا ایک جگہ تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے، انہوں نے ۲۶ جون، ۱۹۶۲ میں نینی تال میں ایک چھوٹا سا پرچہ لکھا، جو "سات انقلاب" کے عنوان سے شائع ہوا۔

پرچہ کی شروعات لوہیا نے بیسویں صدی کے حالات سے کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے زیادہ ظلم اور زیادتی ۲۰ ویں صدی میں دیکھنے کو ملی ہے، جہاں لاکھوں معصوم لوگوں کی جانیں سامراجیت نے لیں۔ انہوں نے کہا کہ سامراجی ممالک نے غلام ملکوں کے لوگوں کا خون بہانے میں سابقہ سارے رکارڈ توڑ دیے ہیں۔ افریقہ میں واقع ملک کانگو کی مثال دیتے ہوئے لوہیا نے کہا کہ گزشتہ ۷۰ سے ۸۰ سالوں میں وہاں ۶۰ لاکھ لوگوں کو کسی نہ کسی طریقہ سے ہلاک کر دیا گیا ہے۔ نہ صرف لوگوں کی جانیں لی گئی ہیں، بلکہ سامراجیت نے ان ملکوں میں زبردست استحصال بھی کیا۔ انہوں نے بھارت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں بھلے ہی اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو گولی مار کر قتل نہیں کیا گیا، مگر بھوک کی وجہ سے بھارت میں ۴۰ تا ۶۰ لاکھ لوگ ہلاک ہوئے ہیں۔ اسی طرح جرمنی میں ہٹلر نے ۵۰ لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

لوہیا نے جہاں ۲۰ ویں صدی کو انسانی تاریخ کا سب سے تباہ کن دور کہا تھا، وہیں ان کا یہ بھی کہنا تھا، اس دور کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ظلم و زیادتی اور ناانصافیوں کے خلاف کئی محاذوں پر ایک ساتھ مزاحمت ہو رہی ہے۔ "بیسویں صدی کی دو مخصوص پہچان ہیں۔ اول، یہ سب سے ظالمانہ دور رہا ہے۔ دوّم، جس طرح سے اس دور میں ناانصافی کے خلاف جنگ چل رہی ہے، ویسی جنگ انسانی تاریخ کے کسی دور میں نہیں دیکھی گئی۔ یہ صدی اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں ظلم بھی دیکھا گیا ہے اور اس کو ختم کرنے کی ایک خواہش بھی دیکھی جارہی ہے" (رام منوہر لوہیا، سات انقلاب، مَست رام کپور، رام منوہر لوہیا، ان انٹروڈکشن، ص۔ ۲۰۹)۔

لوہیا اس بات سے خوش تھے کہ انصاف کے لیے دنیا کے ہر ملک سے آواز اُٹھ رہی ہے۔ بقول لوہیا، اس صدی کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر طرح کی ناانصافی کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے۔ لوہیا ایک طرح کی ناانصافی کی بات نہیں کر رہے ہیں بلکہ مختلف اقسام کی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ لوہیا یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان ناانصافیوں کے خلاف سات طرح کے الگ الگ انقلاب پوری دنیا میں چل رہے ہیں۔ لوہیا کی نظر میں انقلاب کے تعلقات نابرابری کو ختم کرنے کی مہم سے جڑے ہوئے ہیں۔ لوہیا سمجھتے تھے کہ عدم مساوات صرف اقتصادی بنیاد پر ہی نہیں برتا جارہا ہے بلکہ اس کے تار سامراجیت، رنگ، ذات اور خواتین مخالف سوچ اور اداروں سے جڑے ہوئے ہیں۔

عالمی اور ملکی سطح پر عدم مساوات کی بات کرنے والے لوہیا اس بات سے بھی افسردہ تھے کہ ملک کے حاکم اور حکمران فضول خرچی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اس وقت کے وزیر اعظم کے ایک دن میں ۲۵ سے ۳۰ ہزار روپیہ خرچ کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک مزدور کی ایک دن کی آمدنی بقول لوہیا صرف ۵۰ پیسہ ہے۔ لوہیا یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرح کی نابرابری دنیا میں اور کہیں نہیں دکھائی دیتی ہے۔ لوہیا برابری کے بڑے قائل تھے اور ان کو کسی بھی طرح کی درجہ بندی پسند نہیں تھی۔ یہ ان کی بڑی بہادری تھی کہ انہوں نے ایک انتخاب میں ایک صفائی ملازمہ کو اپنی پارٹی سے ٹکٹ دیا تھا اور اسے انہوں نے ایک رانی امیدوار کے خلاف کھڑا کیا تھا۔ رانی کے خلاف ایک مہترانی کو مقابلہ میں لا کر لوہیا سماج کے اندر موجود نابرابری کے نظام اور اس طرح کی سوچ کے خلاف ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

لوہیا نے ذات پات کی ناانصافی کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ ان کو یہ بات قطعی پسند نہیں تھی کہ سماج کے اندر میں کوئی اعلیٰ ذات کے طور پر پہچانا جائے اور تو کوئی پسماندہ ذات کہہ کر تعصب کا شکار بنایا جائے۔ انہوں نے کہا کہ ذات پات کے مسائل بھارت میں ہی پائے جاتے ہیں مگر اس کے اثرات دیگر ملکوں میں بھی موجود ہیں۔

تاریخ پیدائش ۲۳ :مارچ

اس لیے لوہیا کی پارٹی نے محکوم طبقات کے لیے ۶۰ فیصد ریزریشن کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ بات لوہیا کو بخوبی معلوم تھی کہ نام نہاد صلاحیت کی بنیاد پر محکوم طبقات کے امیدواروں کو باہر کا راستہ دکھایا جاتا ہے محکوموں کے خلاف اس طرح کا تعصب اس وقت بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔ آج بھی محکوم طبقات کو کم نمبر دیے جاتے ہیں اور ان کو بڑے منصب پر بیٹھے ہوئے اعلیٰ ذات کے لوگ باہر کر دیتے ہیں۔ اس ناانصافی کو لوہیا اسی زمانے میں سمجھ گئے تھے تبھی تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر دلت، آدی واسی، اقلیت، پچھڑے اور خواتین زمرہ سے امیدوار کم صلاحیت بھی رکھتے ہوں، تب بھی ان کو ریزرویشن دیا جائے کیونکہ موقع پانے کے بعد وہ اپنی صلاحیت کو بہتر کریں گے۔

بقول لوہیا انسانی تاریخ ذات اور طبقاتی نظام کے بیچ میں جھول رہی ہے۔ انہوں نے طبقہ یعنی کلاس کو ڈھیلی ذات کہا، وہیں ذات کو منجمد طبقہ کہا۔ اس طرح یہ بات صاف ہے کہ لوہیا طبقاتی نظام اور ذات کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ ان کے درمیان تعلقات پر زور دیتے ہیں۔ لوہیا کی یہ بات بہت اہم ہے کہ ذات اور طبقہ کی لڑائی ایک ساتھ لڑنے کی ضرورت ہے، مگر افسوس کی بات ہے کہ اکثر اسے الگ الگ پلیٹ فارموں پر لڑا جاتا ہے۔

لوہیا مرد اور عورت کے درمیان موجود نابرابری کے بھی سخت مخالف تھے، اس لیے وہ خواتین سمیت دیگر محروم طبقات کے لیے خصوصی مواقع کی بات کرتے تھے۔ لوہیا یہ سمجھتے تھے کہ جب دلت، آدی واسی، پچھڑے طبقات اور اقلیتوں کی حالت بہتر ہو جائے گی تو خصوصی مواقع کی معنویت ختم ہو جائے گی۔ مگر جب تک وہ برابری نہیں پالیتے تب تک ان کو ریزرویشن ملنا چاہیے۔ وہیں دوسری طرف وہ خواتین کے لیے ہمیشہ کے لیے خصوصی مواقع کی بات کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لوہیا سمجھتے تھے کہ خواتین فطری طور سے کمزور ہوتی ہیں۔

اس لیے لوہیا کی پارٹی نے محکوم طبقات کے لیے ۶۰ فیصد ریزریشن کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ بات لوہیا کو بخوبی معلوم تھی کہ نام نہاد صلاحیت کی بنیاد پر محکوم طبقات کے امیدواروں کو باہر کا راستہ دکھایا جاتا ہے محکوموں کے خلاف اس طرح کا تعصب اس وقت بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔ آج بھی محکوم طبقات کو کم نمبر دیے جاتے ہیں اور ان کو بڑے منصب پر بیٹھے ہوئے اعلیٰ ذات کے لوگ باہر کر دیتے ہیں۔ اس ناانصافی کو لوہیا اسی زمانے میں سمجھ گئے تھے تبھی تو انہوں نے کہا تھا کہ اگر دلت، آدی واسی، اقلیت، پچھڑے اور خواتین زمرہ سے امیدوار کم صلاحیت بھی رکھتے ہوں، تب بھی ان کو ریزرویشن دیا جائے کیونکہ موقع پانے کے بعد وہ اپنی صلاحیت کو بہتر کریں گے۔

مذکورہ پرچہ کے آخری حصہ میں لوہیا نے گرہ کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہر انسان ستیہ گرہ کرنا شروع کر دے، تو پوری دنیا کو بچایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے کہا کی دلیل اور منطق اہم ہے، مگر یہ کمزور حقیقت مانی جاتی ہے۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ منطق اور دلیل بے لگام نہ رہے۔ اگر ایسا ہوا تو تشدد برپا ہوگا۔ اس لیے لوہیا عقل و دلیل کو ستیہ گرہ سے جوڑنے کی ضرورت پر زور دیتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر عقل و دلیل کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو وہ جانوروں کی طرح زور زبردستی کام لیں گے۔ مگر جب معقولیت کے ساتھ ایک ایسا فلسفہ جڑ جاتا ہے جو یہ کہتا ہو کہ تشدد کی راہ پر چلے بغیر ظلم، زیادتی اور ناانصافی کی مخالفت ہر حال میں کی جائے تو اچھا نتیجہ برآمد ہوگا۔ اس طرح ستیہ گرہ کو اختیار کیے بغیر نہ تو ناانصافی کے خلاف لڑا جاسکتا ہے اور نہ ہی تشدد کی آگ کو بجھایا جاسکتا ہے۔

لوہیا شخصی آزادی کے بہت بڑے حامی تھے۔ وہ اپنی حکومت کی زیادتیوں کے خلاف بھی بولنے اور لکھنے سے نہیں ڈرتے تھے۔ ان کا ایقان تھا کہ انسان کی شخصی آزادی میں سرکار اور سماج کی طرف سے کوئی بھی مداخلت نہیں ہونی چاہیے تبھی تو وہ کہتے تھے کون کس سے شادی کرے گا اس پر بھی کوئی روک نہیں ہونی چاہیے۔ کسی شخص کی پسند اور ناپسند کا بھی احترام ہونا چاہیے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ لوگوں کی ذاتی زندگی میں کوئی مداخلت نہ ہو۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمین کو کسی سیاسی پارٹی میں شامل ہونے سے روکا نہیں جانا چاہیے۔

مگر جس بات کے لیے لوہیا بار بار جیل گئے آج وہی سب کچھ بھارت میں ہو رہا ہے۔ 'لو جہاد' کے نام پر لوگوں کو آپسی پسند سے شادی کرنے پر سزا دی جارہی ہے۔ بھگوا سرکار 'لو جہاد' کے نام پر بہت سارے مسلمان نوجوانوں کو جیل بھیج رہی ہے، وہیں نام نہاد زبردستی تبدیلیٔ مذہب کو روکنے کے لیے ایسے ایسے خطرناک قانون لائے جارہے ہیں جو دستور کے مذہبی آزادی کے بنیادی حقوق کے خلاف ہیں۔ اتنا ہی الگ سیاسی نظریہ رکھنے پر بھگوا حکومت اپنے ناقدین پر روز بروز حملے کر رہی اور ان کے ساتھ ہر موڑ پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ طلبہ کے جائز مسائل کو سننے اور ان کو تعلیم، سہولت، نوکری دینے کے بجائے سیاست کرنے کا الزام لگا رہی ہے اور انہیں دانستہ طور پر پریشان کر رہی ہے۔ لوہیا کی ان باتوں کو بھگوا سرکار سرکار آسانی سے فراموش کر دیتی ہے، مگر اسے یہ بات کہنے کی بڑی جلدی رہتی ہے کہ لوہیا کانگریس کے سخت مخالف تھے۔ بھگوا طاقتوں کو یہ کون بتلائے کہ لوہیا اقتدار کے نشہ میں چور اور عوام مخالف کاموں کو انجام دینے والی سرکار کے خلاف تھے۔ اگر لوہیا آج زندہ ہوتے تو بھگوا طاقتوں کے ظلم اور زیادتی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور تمام اپوزیشن پارٹیوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کا کام کرتے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

***

تاریخ میں 'مہاڈ' کانفرنس کی اہمیت

امبیڈکر کی قیادت والی 'مہاڈ تحریک' نے ذات پات کے جال میں پھنسے ہندوستانی سماج کو باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا تھا

ابھے کمار

ممبئی سے تقریباً ۱۷۰ کلومیٹر کی دوری پر مہاڈ شہر واقع ہے، جہاں اسی مارچ کی ۱۹ر اور ۲۰ تاریخ کو دلت سماج کے لوگوں نے مہاڈ کانفرنس کا انعقاد کیا تھا۔ یہ اجتماع سن ۱۹۲۷ء میں منعقد ہوا تھا، مگر ۹۸ر سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کانفرنس کی اہمیت برقرار ہے۔ یہ کانفرنس چھوت چھات اور ذات پات سے نجات پانے کی دلت تحریک کا ایک اہم باب ہے۔ اس تاریخی جلسہ کو اس لیے بھی یاد کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ چھوت چھات کی ظالمانہ سماجی برائی آج بھی چھپے یا ڈھکے طور پر جاری ہے۔ آزادی ملنے کے بعد، حالانکہ چھوت چھات کو قانونی طور پر جرم قرار دے دیا گیا ہے، مگر آج بھی یہ لعنت مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی، کیونکہ ذات پات کے غیر مساوی سماجی نظام کو جڑ سے ختم کیے بغیر، چھوت چھات پوری طرح سے کبھی مٹ نہیں سکے گی۔

چھوت چھات اور ذات پات کے خلاف آوازیں انگریزوں کی آمد کے بعد اٹھنے لگیں۔ عیسائی مشنری، انگریزی تعلیم، اور برطانوی پالیسیوں کی وجہ سے اچھوتوں کو اپنے مسائل کو اٹھانے کا ایک سہارا ملا۔ برطانوی حکومت میں، بہت سارے دلتوں کو فوج اور دیگر شعبوں میں نوکری ملی، اور ان کے بچے اب اسکول اور کالج جانے لگے۔ حالانکہ یہ سماجی تبدیلی بہت سست تھی، اور انگریزوں کو بھی یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ اگر انہیں بھارت میں حکومت کرنی ہے، تو وہ اعلیٰ ذاتوں کو ناراض نہیں کر سکتے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں دنیا بھر میں مساوات کو حاصل کرنے کے لیے تحریکیں چلیں اور مزدوروں نے مساوات کو ایک اہم مسئلہ بنایا اور ہڑتالیں کیں۔ جہاں فرانس میں انقلاب برپا ہوا، وہیں امریکہ میں بھی غلامی کا خاتمہ کیا گیا۔ انسانیت، آزادی، اور جمہوریت کے نظریات کے تئیں محکوم طبقات کی دلچسپی بڑھی۔ انیسویں صدی کے آتے آتے، بھارت میں بھی دلتوں اور دیگر محکوم طبقات نے سماجی برابری حاصل کرنے کے لیے آواز اٹھانی شروع کر دی تھی۔ اس پس منظر میں ہمیں مہاڈ کانفرنس کو بھی دیکھنا چاہیے۔

اس کانفرنس کے پیچھے بمبئی قانون ساز کونسل کا اگست ۱۹۲۳ء کا وہ بل ہے، جو کونسل کے ممبر سیتارام کیشا بولے نے پیش کیا تھا۔ اس بل کے تحت دلتوں کے لیے عوامی مقامات اور ادارے جیسے تالاب، ندی، اسکول، اسپتال، اور عدالتوں سے ہر طرح کی سماجی پابندی ہٹانے کی بات کی گئی تھی، اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان مقامات پر دلتوں کی رسائی کو حکومت بغیر کسی رکاوٹ کے یقینی بنائے۔ بامبے حکومت نے اس بل کی روشنی میں تمام ذیلی اداروں کو یہ حکم دیا تھا کہ دلتوں کے خلاف ہو رہے سماجی امتیازات کو ختم کیا جائے۔ سماج میں ذات پات کی برائی اتنی مضبوط تھی کہ دلتوں کو انصاف دلانے کے لیے سرکاری عملہ بھی ہچکچا رہا تھا۔ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ اگر انہوں نے دلتوں کو مساوی حقوق فراہم کر دیے، تو اعلیٰ ذاتوں کی لابی ان کے خلاف ہو جائے گی۔ دوسری بات یہ تھی کہ سرکاری اداروں میں بھی اعلیٰ ذات کی لابی مضبوط تھی، جو سماج میں اٹھ رہی مساوات کی آواز کو دبانا چاہتی تھی۔ لیکن دلت تحریک بھی اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پُرعزم تھی، اور بابا صاحب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی قیادت میں دلتوں نے یہ عہد کیا کہ انہیں پبلک تالاب سے پانی پینے کا مساوی حق ملے گا۔ جب حکومت نے ان کے مطالبات کی حمایت کر دی، تو وہ پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔

امبیڈکر کی قیادت والی مہاڈ تحریک نے ذات پات کے جال میں پھنسے ہندوستانی سماج کو باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اس کے علاوہ، اس تحریک کا پیغام یہ بھی ہے کہ محکوم اور دبے کچلے طبقات کو اپنی لڑائی خود لڑنی ہوگی۔ بابا صاحب کا واضح پیغام تھا کہ حق لڑ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ بلا شبہ، امبیڈکر کی اس تحریک سے دلت سماج اور ملک کو بہت فائدہ ہوا، مگر آج بھی بابا صاحب کا یہ مشن پوری طرح سے نافذ نہیں ہوا ہے۔

مہاڈ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا، کیونکہ یہ ایسی جگہ تھی جہاں بڑی تعداد میں فوج میں نوکری کر چکے دلت سماج کے لوگ بسے ہوئے تھے۔ ان کے اندر سیاسی شعور دیگر دلتوں کے مقابلے میں زیادہ پایا جاتا تھا۔ بابا صاحب امبیڈکر بھی مہاڈ شہر سے بخوبی واقف تھے، اور انہیں یقین تھا کہ مہاڈ کے دلت اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے کو تیار ہیں۔ امبیڈکر کو یہ بھی علم تھا کہ مہاڈ میونسپلٹی نے دلتوں کے لیے تالاب سے پانی پینے کی قرارداد پاس کر دی تھی۔ ۱۹ر مارچ کے روز، ڈاکٹر امبیڈکر نے صدارتی خطبہ دیا اور دلتوں سے اپیل کی کہ وہ عزت نفس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے اندر سماجی اصلاح کریں۔ انہوں نے کہا کہ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے ذہنوں سے اونچ نیچ کے تصورات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس جلسے میں ہزاروں دلت سماج کے لوگ شامل تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کچھ اعلیٰ ذات کے لوگ بھی موجود تھے، جنہوں نے کانفرنس کے بین ذات نکاح کی حمایت تو نہیں کی، لیکن دلتوں کے تالاب سے پانی پینے کے حق کی تائید کی۔

جلسہ کے دوسرے دن صبح نو بجے، دلتوں نے مہاڈ کے چاودار تالاب کی طرف رخ کیا۔ بابا صاحب امبیڈکر خود ہزاروں دلتوں کی قیادت کرتے ہوئے تالاب تک پہنچے اور سب نے پُرامن طریقے سے تالاب سے پانی پیا اور واپس جلسے کی طرف لوٹ آئے۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ بات اعلیٰ ذات کے لوگوں تک پہنچی کہ دلتوں نے تالاب سے پانی پی لیا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہر بھر میں افواہ پھیل گئی کہ دلت ویریشور مندر میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہزاروں سال سے چلی آ رہی انسان سوز اچھوت پرتھا پر لگنے والی اس چوٹ کو دقیانوسی سماج کیسے برداشت کر سکتا تھا؟ نتیجتاً، اعلیٰ ذات کے اشارے پر بڑی تعداد میں شرپسندوں نے دلتوں پر حملہ کیا۔ بابا صاحب امبیڈکر کے ساتھ بھی بدسلوکی کی گئی۔ حالانکہ امبیڈکر چاہتے تو دلت شرپسندوں کو جواب دے سکتے تھے، لیکن انہوں نے دلتوں سے صبر اور تحمل کی اپیل کی۔ اس حملے میں ۲۰ر دلتوں کو چوٹیں آئیں اور دیگر مقامات پر بھی دلتوں کو مارا اور پیٹا گیا۔ تاہم، امبیڈکر نے قانونی راستہ اپنایا اور پولیس کی مدد لی۔ امبیڈکر کو خوشی تھی کہ انتظامیہ نے شرپسندوں کے خلاف کارروائی کی اور پانچ افراد کو عدالت نے کڑی سزا دی۔

لیکن جس بات نے امبیڈکر کو سب سے زیادہ دکھ پہنچایا، وہ یہ تھی کہ اعلیٰ ذات کے لوگوں نے تالاب کو پاک کرنے کے لیے اس میں گائے کا گوبر، پیشاب، دہی، اور دودھ کا آمیزہ ڈال کر تالاب کو 'پاک' کیا اور پھر اس کا پانی پیا۔ ذات پات پر مبنی اس سماج کی غیر انسانی ذہنیت دیکھیے کہ وہ انسان کے ہاتھوں تالاب سے پانی پینے کو ناپاک سمجھتے ہیں، لیکن گوبر ڈال کر اسے پاک کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔

امبیڈکر نے ان باتوں کا تفصیلی ذکر اپنے جریدے 'بہشکرت بھارت' میں کیا ہے۔ ۲۲ر اپریل ۱۹۲۷ء کے اپنے مضمون میں امبیڈکر نے واضح طور پر کہا کہ مہاڈ تالاب کا پانی پی کر اچھوتوں نے کوئی غیر واجب کام نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں نے امن برقرار رکھا تھا۔ ہم اس واقعے کو مار پیٹ کے زاویے سے نہیں دیکھتے بلکہ اسے مساوات کی مذہبی جنگ سمجھتے ہیں۔ ماضی میں جیت کسی کی بھی ہو، مگر آخر کار کامیابی ہماری ہی ہوگی، اس میں کوئی شک نہیں۔' امبیڈکر کی قیادت والی مہاڈ تحریک نے ذات پات کے جال میں پھنسے ہندوستانی سماج کو باہر نکلنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اس کے علاوہ، اس تحریک کا پیغام یہ بھی ہے کہ محکوم اور دبے کچلے طبقات کو اپنی لڑائی خود لڑنی ہوگی۔ بابا صاحب کا واضح پیغام تھا کہ حق لڑ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ بلا شبہ، امبیڈکر کی اس تحریک سے دلت سماج اور ملک کو بہت فائدہ ہوا، مگر آج بھی بابا صاحب کا یہ مشن پوری طرح سے نافذ نہیں ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاڈ کانفرنس کی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔

(مضمون نگار جدید تاریخ کے اسکالر ہیں)

dabatinissues@gmail.com

اکثریتی تسلط، اقلیتی حقوق اور امبیڈکر

صرف اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کا مفاد ہی قومی مفاد نہیں ہوسکتا

۱۴ اپریل کو سالانہ یوم پیدائش پر خاص مضمون

ابھے کمار

محکوموں اور مظلوموں کے مسیحا بابا صاحب بھیم راو امبیڈکر ۱۴ اپریل ۱۸۹۱ء کو بمبئی صوبے کے ایک اچھوت مہار ذات میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے خود بھی اپنی زندگی میں طرح طرح کے تعصب، ظلم وستم برداشت کیے۔ اچھوت ہونے کی وجہ سے ”کاسٹ“ ہندو (غیر اچھوت ہندو) بالخصوص اعلیٰ ذات کے لوگوں نے ان کے ساتھ زندگی کے ہر موڑ پر بھید بھاؤ کیا۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو امبیڈکر کی اس بات سے ’چڑ‘ تھی کہ وہ ذات پات اور چھوا چھوت پر مبنی بھید بھاو کے مسئلے کو قومی سیاست کے مرکز میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ محکوم طبقات کی واجبی نمائندگی کے لیے بھی زندگی بھر کام کرتے رہے۔ ان کا ماننا تھا کہ کسی بھی جمہوریت کا تصور اقلیتوں کی نمائندگی اور ان کے حقوق کے تحفظ بغیر ممکن نہیں ہے کیونکہ اکثریت کا تسلط اور جمہوریت ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ کاش یہ بات ملک کے حکمراں سمجھ لیتے۔ مگر اس وقت سے اب تک ان کی باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا ہے۔ آج تو حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ اقلیتوں اور دیگر محکوم طبقات کے حقوق کی بات کو اکثریتی طبقے کے مفاد کو چوٹ پہنچانے سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق کو الٹنے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قومی تحریک سے وابستہ اعلیٰ ذات پر مبنی قیادت اقلیتوں اور محکوم طبقات کے سوالوں کو دبا کر اقتدار کی کمان انگریزوں سے اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتی تھی۔ امبیڈکر بھی ہندوستان کی آزادی کے پیروکار تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی قیادت خود ہندوستانیوں کے پاس ہو مگر انہیں محکوموں اور مظلوموں کے حقوق کی بہت زیادہ فکر لاحق تھی۔ ان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ آزاد بھارت میں محکوم اور مظلوم طبقات کو اقتدار میں واجبی حصہ داری مل پائے گی بھی یا نہیں۔ وہ اس بات سے بھی فکر مند تھے کہ آزاد بھارت میں اقلیتی طبقات پر اکثریتی طبقات اپنی عددی تعداد کی بنیاد پر کہیں غالب نہ ہو جائے اور اپنے مفادات ان پر نہ تھوپے۔ ان کے نزدیک اگر اقلیتوں پر اکثریتی طبقے کا تسلط تھوپ دیا جاتا ہے تو یہ جمہوری اقدار کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔ جن خدشات اور سوالات سے امبیڈکر آزادی کے وقت پریشان تھے، آج بھی وہ خدشات اور سوالات جوں کے توں قائم ہیں، جو بات امبیڈکر نے اپنی زندگی میں کہی تھی اس کی اہمیت اور معنویت آج اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندو احیا پرست طاقتیں اقتدار کے گلیاروں میں پہنچ گئی ہیں۔ مرکز اور ملک کے بیشتر ریاستوں میں ہندو شدت پسند جماعتیں برسر اقتدار ہیں۔
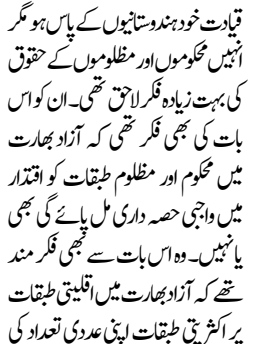
جمہوریت کیا ہے؟ اس کا جواب اکثر لوگ کچھ اس طرح دیتے ہیں کہ جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جہاں عوام کی حکومت، عوام کے مفاد کے لیے، عوام کے ذریعے تشکیل دی جاتی ہے۔ بابا صاحب امبیڈکر نے جمہوریت کی جو تشریح کی ہے وہ اس سے ایک قدم آگے ہے۔ انہوں نے اقلیتی حقوق کو جمہوریت کا ایک اہم ستون مانا ہے۔ ان کے نزدیک حکومت سازی کا عمل اکثریتی ووٹ سے ہی طے ہوتا ہے مگر اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ اکثریتی حکومت اقلیتی طبقات کے مفادات اور اقتدار میں ان کی حصہ داری کو نظر انداز کر دے۔ آج حالات اس قدر خراب ہو چکے ہیں کہ پارلیمنٹ میں مسلم اراکین کی تعداد آج ۱۹۵۷ کے بعد سب سے کم ہے۔ برسر اقتدار بی جے پی مسلمانوں کو الیکشن میں ٹکٹ نہ دینے کی غیر اعلانیہ پالیسی اپنا رہی ہے اور اسے یہ کہنے میں ’شرم‘ محسوس نہیں ہوتی کہ بی جے پی ہندوؤں کی پارٹی ہے اور اس کی حریف کانگریس مسلمانوں کی!۔

اس سے بی جے پی کا یہ ایجنڈا کھل کر سامنے آجاتا ہے کہ ووٹروں کو مذہب کی بنیاد پر اکھٹا کیا جائے اور خود کو اکثریتی طبقے سے جوڑ دیا جائے تاکہ اس کی سیاسی اکثریت فرقہ وارانہ اکثریت میں تبدیل ہو جائے۔ ہندو احیا پرستی کی پالیسی پر چل کر وہ ہندوستانی سیاست میں ناقابل شکست پارٹی کی حیثیت اختیار کرنے کی مذموم کوشش کر رہی ہے جو کہ امبیڈکر کی نظر میں جمہوریت کے لیے نہایت ہی مہلک اور خطرناک ہے۔ اتر پردیش اسمبلی الیکشن کو ہی لے لیجیے جس میں بی جے پی نے ایک بھی ٹکٹ کسی مسلم کو نہیں دیا اور اپنی حریف بی ایس پی کی جم کر اس بات پر تنقید کی کہ اس نے مسلمانوں کو ۹۰ نشستوں پر اتار کر مسلمانوں کی منہ بھرائی کی تھی۔ اقتدار میں حصہ داری تو دور کی بات ہے، جب پالیسی بنانی ہوتی ہے تو وہاں بھی بی جے پی مسلمانوں کے جذبات اور مفادات کا خیال نہیں رکھ رہی ہے۔ مثال کے طور پر بی جے پی طلاق ثلاثہ پر لوک سبھا میں ایک بل لائی اور اس مسئلے پر طویل بحث بھی ہوئی مگر حکومت نے کبھی بھی مسلمانوں کے معتبر قائدین اور ملی رہنماؤں سے گفتگو نہیں کی اور کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ آخر کار مسلم سماج اس مسئلے کو کس طرح سے دیکھتا ہے۔ مسلمانوں کے نام پر بی جے پی نے ایسے لیڈروں کو آگے بڑھایا جو مسلم سماج میں بے اثر ہیں۔ بی جے پی کے علاوہ دیگر سیکولر پارٹیوں کا ریکارڈ بھی اس معاملہ میں قابل اطمینان نہیں ہے۔ سیکولر پارٹی ہونے کا دعویٰ کرنے والی کانگریس بھی مسلم مسائل پر زبان کھولنے سے گریز کر رہی ہے۔ اس کو اس بات کا ’خوف‘ ہے کہ کہیں بی جے پی اس کی مسلم دوستی کو طول نہ دے دے اور اکثریتی طبقے سے اسے مزید دور نہ کر دے۔ غیر بی جے پی اور غیر کانگریسی پارٹیاں جو مختلف صوبوں میں برسر اقتدار ہیں انہوں نے بھی مسلمانوں سے ووٹ تو لے لیے مگر ان سے کیے وعدوں کو پورا کرنے میں سنجیدگی نہیں دکھائی ہے۔

امبیڈکر چاہتے تھے کہ آزاد بھارت میں سبھی طبقات کو ان کا واجب حق اور ان کی صحیح نمائندگی ملے۔ ۶ مئی ۱۹۴۵ء کو بمبئی میں واقع کل ہند درج ذیل فہرست ذات فیڈریشن کی سالانہ تقریب میں بولتے ہوئے امبیڈکر نے کہا کہ کسی بھی صورت میں ایک طبقہ دوسرے طبقے پر اپنا تسلط نہ تھوپے۔ انہوں نے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ تعداد کی بنیاد پر اکثریتی طبقہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اقلیتی طبقے پر اپنی مرضی تھوپے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اکثریت پر مبنی حکومت اصولاً درست نہیں ہے اور ایسی حکومت عملاً صحیح بھی نہیں ہے مگر اکثریت پر مبنی حکومت اس معنی میں قابل قبول ہوسکتی ہے جب وہ نسبتی (relative) ہو۔ ایسی حکومت جو مطلق (absolute) بن جائے وہ قابل قبول ہرگز نہیں ہے۔

امبیڈکر کے مذکورہ بالا جملے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اکثریتی ووٹ حکومت سازی میں کلیدی رول ادا کرتا ہے اور صرف اقلیتی ووٹ کی بنیاد پر حکومت نہیں بن سکتی مگر اس کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ اکثریتی طبقہ اپنے ووٹ اور اپنی تعداد کی بنیاد پر ایک مطلق العنان حکومت قائم کرے اور اقلیتی طبقات کی حصہ داری اور ان کے واجب نمائندگی کو نظر انداز کر دے۔ تبھی تو امبیڈکر نے ہندوؤں کو متنبہ کیا کہ انہیں کبھی یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اکثریت پر مبنی حکومت ’مقدس‘ (sacrosanct) ہے اور اس پر کوئی سوال نہیں اٹھا سکتا۔ آزادی کے وقت ہندو مسلم مسائل کو وہ اسی سیاق میں دیکھتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ ملک کی تقسیم روکی جا سکتی ہے اگر ایک ایسی حکومت تشکیل دی جائے جہاں اقلیتی طبقات کے مفادات کو پس پشت نہ ڈالا جائے۔ بابا صاحب امبیڈکر یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اقلیتی طبقات کی رہنمائی صرف اور صرف اقلیتی طبقات ہی کر سکتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے آئین میں دلت، آدی واسی، پسماندہ اور مذہنی اقلیتی طبقوں کی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لیے خصوصی حقوق کی پیروی کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ایک طبقہ یا پھر ایک سماجی گروہ اقتدار میں آجانے کے بعد اکثر وہ اپنے ہی طبقے کے مفاد کا خیال رکھتا ہے اور دیگر طبقات کے حقوق یا مفادات اس کی نظروں میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔

> **اکثریت نے آخر بابا صاحب کی اس بات کو سچ ثابت کیا ہے کہ ان کے ذریعہ اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ممکن نہیں ہے**

اگر ہم حکومت اور دیگر سرکاری شعبوں میں اقلیتوں اور دیگر محروم طبقات کی نمائندگی کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی نمائندگی ہر جگہ دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دلت اور آدی واسیوں کی حالت بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ انہیں بھی اکثر محفوظ سیٹ ہی سے ٹکٹ دیا جاتا ہے جو کہ ان کی سیاسی جماعتوں کی آئینی ’مجبوری‘ ہے۔ اگر یہ سیاسی جماعتیں واقعی بابا صاحب کے افکار کے تئیں سنجیدہ ہوتیں تو ان کی نمائندگی صرف محفوظ سیٹوں تک ہی محدود نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کی حالت تو اور بھی خراب ہے۔ ان کے لیے نہ تو پارلیمنٹ اور اسمبلی میں ریزرویشن ہے اور نہ ہی ان کو ملک گیر سطح پر ان کی آبادی کے مطابق ریزرویشن دیا گیا ہے۔ آزادی کے وقت آئین ساز اسمبلی کی روداد پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں مسلمانوں کو متناسب نمائندگی دینے کی تجویز پیش کی گئی تھی، مگر جب آئین بن کر تیار ہوا تو اسے جگہ نہیں دی گئی۔ بعد کے دنوں میں کچھ ریاستوں نے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے کچھ اقدام اٹھائے ہیں۔ خاص کر منڈل کمیشن نے پسماندہ مسلمانوں کو او بی سی میں شامل کر کے انہیں ریزرویشن کا مستحق بنایا تھا مگر یہ کافی نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمان پسماندہ ہندوؤں کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے اور ان کے حصے میں بہت کم سیٹیں جاتی ہیں۔ دلت مسلمانوں کو بھی ایس سی ریزرویشن نہیں دیا جاتا جو کہ ہندوستان کے سیکولر آئین پر بڑا سوال ہے۔ یہ سب ناانصافی بابا صاحب کی زندگی کے آخری دنوں میں عمل میں آئی جسے وہ بھی روک نہیں پائے۔ ان موضوعات پر مزید تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

اپنی کتاب ”اسٹیٹ اینڈ مائینارٹی“ میں وہ کہتے ہیں کہ جب اقلیتی یا محروم طبقے کے لوگ اپنے جائز مطالبات کے لیے احتجاج کرتے ہیں تو ان کی سرگرمیوں کو فرقہ واریت کا رنگ دے کر خارج کر دیا جاتا ہے۔ وہیں دوسری جانب سماج کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے مفاد کو ہی قومی مفاد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ امبیڈکر کی تحریروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے ذہن پر فرقہ واریت بنام قومیت کا موضوع چھایا ہوا تھا۔ آزادی کے وقت امبیڈکر جب دلتوں اور دیگر محروم طبقات کی حمایت میں آواز بلند کر رہے تھے تو ان پر بھی یہ الزام اس زمانے کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے لگایا کہ وہ سماج کو بانٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ امبیڈکر نے کئی مواقع پر کانگریس کی زیر قیادت چل رہی تحریک آزادی پر بھی سوال اٹھائے تھے۔ ان کی رائے میں کانگریس دیگر محروم طبقات کے ساتھ اقتدار میں شراکت داری کرنے سے کتراتی رہی ہے اور دلت اور اقلیتوں کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے۔

اپنی دلیل کو پیش کرتے ہوئے امبیڈکر نے اپنی کتاب "مسٹر گاندھی اینڈ دی ایمانسیپیشن آف انٹچ ایبلز" میں کہتے ہیں کہ یہ غلط سوچ ہے کہ ایک خاص (یعنی اکثریتی) طبقہ سماج کے ہر طبقے کی رہنمائی کرنے کا اہل ہے۔ کیونکہ اکثریتی طبقہ صرف اپنے طبقے کو لوگوں کے ہی مفاد کو پیش نظر رکھے گا۔ اس طرح سماج کے دیگر محروم طبقات پر ایک خاص طبقے کا تسلط قائم ہو جانا یقینی ہے۔ اسی طرح مختلف حلقوں سے منتخب اراکین پارلیمنٹ اور اسمبلی بھی صرف اپنے طبقوں کے مفادات کو ہی ذہن میں رکھ کر کام کریں گے اور دیگر طبقوں کے مفادات یا تو پس پشت ڈال دیے جائیں گے یا ان کی حیثیت محض ثانوی ہو کر رہ جائے گی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں ریزرویشن کی پالیسی بھی انہیں اقدار پر مبنی ہے۔ لیکن کئی بار ریزرویشن مخالف طاقتیں اسے غریبی ہٹانے کے پروگرام سے جوڑ دیتی ہیں اور دلیل دیتی ہیں کہ اعلیٰ ذات کے لوگوں کو بھی غربت کی بنیاد پر ریزرویشن ملنا چاہیے۔ مگر ریزرویشن کا اصل مقصد غریبی دور کرنا نہیں بلکہ سماج کے مختلف طبقوں کو فیصلہ سازی کی کارروائی میں شامل کرنا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ امبیڈکر کی اس تدبیر کو نہ اس وقت مانا گیا اور نہ آج کے ارباب اقتدار اسے ماننے پر راضی ہیں۔ لیکن جب بات امبیڈکر سے اپنا رشتہ جوڑنے کی ہو اور دلت ووٹروں کو اپنی طرف راغب کرنے کی ہو تو سبھی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے سے مسابقت کرتی نظر آتی ہیں۔

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)
ای میل: debatingissues@gmail.com

خبر و نظر

پرواز رحمانی

گزشتہ میقات کا نعرہ

وزیر اعظم نے اپنی گزشتہ میقات میں سب کا ساتھ سب کا وکاس کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ابھی اس کا مطلب سمجھنے میں بہت سے شہریوں کو دقت ہو رہی تھی کہ اس میقات میں اس نعرے میں ایک اور لفظ کا اضافہ کر دیا گیا یعنی ”سب کا وشواس“ بنا دیا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان الفاظ کو وہی لوگ سمجھ سکے اور انہی لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا جو آج کی حکمراں پارٹی کے بے داغ وفادار تھے، باقی شہریوں تک اِن الفاظ کا کوئی حصہ نہیں پہنچ سکا۔ مسلمانوں اور دلت طبقے ان خوش نما الفاظ سے محروم ہی رہے۔ گزشتہ میقات میں وزیر اعظم کے حلف لیتے ہی گائے کے تحفظ کا مسئلہ پیدا کیا گیا اور گائے کو مارنے کے الزام میں کچھ لوگ شارعِ عام پر مسلمانوں کو قتل کرنے لگے۔ اعلیٰ سطح سے دلت ریزرویشن کا مسئلہ اٹھایا گیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ دلت برادری کے لوگوں کو سرِ عام مارا جانے لگا۔ عیسائی برادری کے ساتھ بھی اس دوران اچھا سلوک نہیں کیا گیا.... اب سب کا وشواش کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف گورنمنٹ کو ایک اور مسئلہ مل گیا ہے اور وہ ہے تبلیغی جماعت۔ کورونا وائرس کے شور کے درمیان کچھ شر پسند اور بد دیانت ٹی وی چینلوں نے بستی حضرت نظام الدین کے تبلیغی مرکز کے خلاف یہ واویلا مچانا شروع کر دیا کہ کورونا وائرس وہیں سے پھیلا ہے۔

وزیر اعظم کی آتما خوش ہوئی

پرائم منسٹر کو جب یہ بات بتائی گئی تو انہوں نے فوراً ایک اشتعال انگیز بیان دے ڈالا۔ ”نظام الدین پورے ملک کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے“ بس پھر کیا تھا حکومت اور بی جے پی کے لوگ اسے جگہ جگہ اٹھانے لگے۔ بدیانت اور بدکار میڈیا نے بھی پوزیشن سنبھال لی..... ایک سانس میں بولنے لگے کہ مرکز تبلیغ میں بہت سے غیر ملکی بھی آئے تھے۔ وہاں دو دن کا بہت بڑا اجتماع ہوا تھا۔ جب لوگ اجتماع کے بعد اپنے اپنے مقامات پر پہنچے کورونا وائرس بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ کورونا وائرس کے جو پازیٹو مریض اسپتال میں داخل ہوئے ہیں ان میں سے زیادہ تر تبلیغی ہیں۔ مرکزی حکومت میں اعلیٰ سطح کی کئی میٹنگیں ہوئیں جن میں عوام کو اس ”خطرناک چیلنج“ سے خبردار کیا گیا۔ تبلیغی لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لانے پر انعامات کا اعلان کیا گیا۔ پھر کیا تھا جن لوگوں کا تبلیغ سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا وہ مسلمان بھی پکڑے جانے لگے..... اور یہ سب مرکزی حکومت اور وزیر اعظم کے ایماء پر ہوا اور ہو رہا ہے۔ وزیر اعظم نے لاک ڈاون میں کئی بار عوام سے خطاب کیا۔ ان کے تازہ خطاب میں سات باتوں میں تعاون یا ان سے دور رہنے کی نصیحت کی گئی تھی لیکن ایک بات بھی ایسی نہ تھی جس میں تبلیغی جماعت کو ہراساں کرنے یا کسی ایک دھرم کو موردِ الزام ٹھہرانے سے روکا گیا ہو۔

سازش بہت گہری ہے

سچ ہے کہ نظریاتی پارٹیاں خواہ وہ کسی مقصد وخیال کی ہوں اپنے مقصد اور طریقِ کار سے کبھی باز نہیں رہتیں۔ یہ پارٹیاں مثبت نظریات کی بھی ہوتی ہیں منفی نظریات کی بھی۔ منفی نظریات کی پارٹیوں کا طریقہ سماج میں بے چینی پیدا کرنا، نفرت پھیلانا اور مذاہب و کلچر کی بنیاد پر شہریوں میں دراڑیں ڈالنا ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی حالت میں یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں خواہ ملک پر کسی اور وجہ سے کوئی مصیبت ہی کیوں نہ آئی ہوئی ہو۔ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی حکومت اس وقت یہی کر رہی ہے۔ ملک میں کورونا وائرس آیا چین سے لیکن بدنام کیا جا رہا ہے تبلیغی جماعت اور اس کی آڑ میں تمام مسلمانوں کو۔ حالانکہ حقائق چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ یہ کسی اجتماع کا نتیجہ نہیں ہے۔ تبلیغ کے دو چار افراد کو ہو سکتا ہے کہ یہ وائرس چھو گیا ہو لیکن پوری جماعت یا کمیونٹی اس سے بالکل محفوظ ہے۔ لیکن آر ایس ایس کی حکومت کو تو چونکہ اپنے ایجنڈے پر عمل کا یہ زریں موقع مل گیا ہے، یہ اسے ہاتھ سے کیسے جانے دے گی۔ چنانچہ حکومت کا سارا فوکس اسی پر ہو گیا ہے۔ سازش بہت گہری ہے پوری امت مسلمہ کو اس کا نوٹس لینا چاہیے۔ اسے بھی اسلام کی اخلاقی، سماجی اور طبی خدمات کے تعارف کا ایک بہترین موقع ہاتھ آیا ہے۔

منڈل کمیشن اور پسماندہ طبقات کے حقوق

یہ دکھ کی بات ہے کہ ملک کا سب سے بڑا لیڈر ووٹ حاصل کرنے کے لیے خود کو پچھڑا کہتا ہے، مگر اس کے نزدیک اعلیٰ ذات کے مفاد زیادہ عزیز ہیں

ابھے کمار

آج سے ۳۱ سال قبل یعنی ۷ اگست ۱۹۹۰ کو منڈل کمیشن کی سفارشات کو تب کی وی پی سنگھ کی سرکار میں نافذ کیا گیا تھا۔ مرکزی حکومت کے زیر اہتمام چل رہے ادارے اور پبلک سیکٹر، جہاں پسماندہ طبقات یعنی بیک ورڈ کلاس کی نمائندگی ان کی آبادی سے بہت ہی کم تھی، کے اندر ۲۷ فیصد نوکریاں ان کے لیے ریزرو کرنے کا اعلان کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ سرکاری اداروں پر صرف اعلیٰ ذاتوں کا ہی قبضہ نہ بنا رہے۔ اعلیٰ ذات کی طرح محکوم طبقات کو بھی پالیسی سازی اور انتظامیہ میں حصہ لینے کا برابر کا حق ہے۔ منڈل کمیشن اور اس سے پہلے کالیلکر کمیشن کی تشکیل کے پیچھے بھی ایک ہی مقصد تھا کہ جو لوگ بھی پیچھے رہ گئے ہیں یا پھر جن کو دانستہ طور پر دھکیل کر حاشیہ پر ڈال دیا گیا ہے، انہیں ملک کی تعمیر میں برابر کا شریک بنایا جائے۔

یہ بات کہنے کی نہیں ہے کہ بھارتی سماج کے اندر بہت ہی زیادہ نابرابری پائی جاتی ہے۔ زمین، مال و دولت، تعلیمی ادارے، کاروبار اور مذہبی اداروں پر کن کا قبضہ ہے؟ اس کے برعکس کون لوگ ہیں جو ہر روز محنت مزدوری نہ کریں تو ان کے گھر میں چولہا نہیں جلتا ہے؟ وہ کون سی ذات ہیں جو تعلیمی، سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ ہیں؟ آدیواسی، دلت کے بعد سب سے بڑی حالت بیک ورڈ کلاس کی ہے۔ آبادی میں وہ سب سے زیادہ ہیں، مگر اس کے تناسب سے ان کو کچھ حاصل نہیں ہے۔ آج بھی تمام سینٹرل یونیورسٹیوں میں آپ کو ایک درجن سے زیادہ او بی سی کے پروفیسر نہیں پائے جاتے ہیں۔ جو طبقہ بھارت کی کل آبادی کا ۵۰ فیصد سے بھی زیادہ ہے وہ اس طرح بدحال ہے۔ یاد رکھیے بیک ورڈ کلاس کے زمرہ میں ہندو مسلمان اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی آتے ہیں۔ مسلمانوں کی پوری آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ او بی سی ریزرویشن کا مستحق ہے اور آج سرکاری اداروں میں کہیں ایک دو مسلمان نظر آجاتے ہیں تو اس میں منڈل کمیشن کا انقلابی رول ہے۔

مگر جب منڈل کمیشن کی سفارشات کو نافذ کیا جا رہا تھا تو مساوات کے دشمنوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کچھ لوگوں کے شور و غل کو مین اسٹریم اپر کاسٹ میڈیا کی مدد سے تحریک کا نام دے دیا گیا۔ سماج کے جاگیرداروں اور جاگیردارانہ سوچ رکھنے والے لوگوں کو یہ کیسے قبول ہو سکتا تھا کہ جن لوگوں نے صدیوں سے ان کے کھیتوں میں مزدوری کی، جن لوگوں نے ان کے مویشیوں کو چارہ اور پانی ڈالا، جن لوگوں نے ان کے گھروں میں بے گاری کی، جن لوگوں کے نام کو وہ بگاڑ کر پکارتے تھے، وہ اب سرکاری اداروں میں اور انتظامیہ میں اپنی حصہ داری مانگ رہے ہیں؟ ۱۰ سے ۱۵ فیصد لوگ جو ملک کے ۷۰ سے ۸۰ فیصد وسائل پر کالے ناگ کی طرح پھن پھیلائے بیٹھے ہوئے تھے، ان کو مساوات کی اُبھرتی لہر سے بیر ہونا لازمی تھا۔ پھر اپر کاسٹ طلبہ کو سڑکوں پر اتارا جانے لگا۔ ان کے اندر یہ غلط فہمی ڈالی گئی کہ منڈل کمیشن کے بعد ان کو نوکری نہیں ملے گی۔ مظاہرین میں بعض جوتا پالش کرتے نظر آئے اور اس طرح میڈیا کا دھیان اپنی طرف مبذول کیا، گویا ہندوستان کے نوجوانوں کا مستقبل منڈل کمیشن کے نافذ ہونے سے تاریک ہو گیا ہے۔ کچھ طلبہ کو خودکشی کرنے کے لیے بھی آمادہ کیا گیا۔ یونیورسٹی میں بیٹھے بڑے بڑے پروفیسر جو مساوات اور محکوم طبقات کے حقوق پر گھنٹوں لیکچر دیتے نہیں تھکتے تھے، اچانک سے ان کے اندر تکبر کا جن داخل ہو گیا۔

عدم مساوات میں یقین کرنے والے لوگوں کی لابی نے یہ پروپیگنڈا پھیلایا کہ ذات کی بنیاد پر ریزرویشن دینے سے میرٹ پر چوٹ پہنچے گی۔ انہوں نے یہ بھی جھوٹ پھیلایا کہ کاسٹ کی بنیاد پر ریزرویشن دینا آئین کے اقدار و مساوات کے خلاف ہے۔ مگر یہ وہ نہیں بتلانا چاہتے تھے کہ مساوات سے متعلق بنیادی حقوق میں ہمارا آئین سماجی اور تعلیمی طور سے پسماندہ طبقات کے لیے خصوصی توضیحات کی بات کرتا ہے۔ ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے جایا گیا۔ پھر کورٹ نے مرکزی حکومت کے ریزرویشن دینے سے متعلق فیصلہ پر رول لگا دی۔

”

جب منڈل کمیشن کی سفارشات کو نافذ کیا جا رہا تھا تو مساوات کے دشمنوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ کچھ لوگوں کے شور و غل کو مین اسٹریم اپر کاسٹ میڈیا کی مدد سے تحریک کا نام دے دیا گیا۔ سماج کے جاگیرداروں اور جاگیردارانہ سوچ رکھنے والے لوگوں کو یہ کیسے قبول ہو سکتا تھا کہ جن لوگوں نے صدیوں سے ان کے کھیتوں میں مزدوری کی، جن لوگوں نے ان کے مویشیوں کو چارہ اور پانی ڈالا، جن لوگوں نے ان کے گھروں میں بے گاری کی، جن لوگوں کے نام کو وہ بگاڑ کر پکارتے تھے...

مساوات کی لہر کو دبانے کے لیے اعلیٰ ذات کی لابی نے ہندو مسلمان کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ بھگوان رام، جو اَنگنت لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں، کے لیے مندر بنانے کے لیے رتھ یاترا نکالی گئی۔ رام مندر کو قومی سوال بنانے والے تفرقہ پرداز یہ بھول گیے کہ اس ملک میں ہزاروں رام کے مندر پہلے سے ہی موجود ہیں۔ مگر فرقہ پرست عناصر نے یہ قسم کھائی کہ وہ بھگوان رام کا مندر ایک قدیم مسجد کو مسمار کر کے اسی مقام پر بنائیں گے۔ ان کی رام بھکتی دیکھیے کہ جیسے جیسے ان کا رتھ آگے بڑھ رہا تھا، ویسے ویسے پیچھے سے خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ اپر کاسٹ لابی جو بھی افواہ پھیلائے مگر حقیقت یہ ہے کہ منڈل کی سفارشات نے سماج میں بڑا مثبت بدلاؤ لایا ہے اور دبے کچلے لوگوں کو آواز دی ہے۔ منڈل کمیشن نے اپنی رپورٹ میں یہ صاف طور پر لکھا ہے کہ جب بیک ورڈ کاسٹ میں پیدا ہونے والا کوئی شخص ایس پی یا ڈی ایم بنتا ہے، تو اس کی ذات کے اندر ایک اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ بیک ورڈ کاسٹ کے لوگوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی ملک کی تعمیر میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ دو سالوں تک سماعت کرنے کے بعد سپریم کورٹ نے بھی منڈل کمیشن کی سفارشات پر مہر لگا دی اور کہا کہ بھارت میں، سماجی پسماندگی تعلیمی پسماندگی کو جنم دیتی ہے اور دونوں مل کر غریبی کو پیدا کرتی ہیں۔ پھر غریبی سماجی اور تعلیمی پسماندگی کو مضبوط کرتی ہے اور اسے بنائے رکھتی ہے۔ یہ ایک طرح کا خطرناک سائیکل بن جاتا ہے جس سے نکلنا پسماندہ طبقات کے لیے بڑا مشکل ہوتا ہے۔

منڈل ڈے کے موقع پر سابق ایم پی، پسماندہ تحریک کے رہنما اور مساوات کی جنگ، کتاب کے مصنف علی انور سے گزشتہ دنوں نوئیڈا میں ملاقات ہوئی۔ منڈل تحریک کو انہوں نے بطور صحافی کور کیا ہے اور بطور سیاست داں انہوں نے منڈل تحریک میں شرکت کی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ منڈل کمیشن کو آپ کیسے دیکھتے ہیں تو انہوں نے سب سے پہلے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مین اسٹریم میڈیا اکثر منڈل کمیشن پر بحث نہیں کرتا ہے۔ اسی طرح وزیر اعظم وی پی سنگھ، جنہوں نے منڈل کو نافذ کیا، کو گالی جھیلنی پڑی اور ان کے ساتھ بڑی ناانصافی کی گئی۔ وی پی سنگھ کی قربانیوں کو سنجیدگی سے کبھی یاد نہیں کیا گیا۔ منڈل کے لیے انہوں نے اپنی سرکار کی پرواہ نہیں کی اور اس طرح سماج کے ایک بڑے حصہ کو آواز اور سمت دے دی۔

یاد رہے کہ سال ۲۰۱۵ کے بہار اسمبلی انتخابات میں فرقہ پرست طاقتوں کے خلاف جے ڈی یو اور آر جے ڈی کو مینڈیٹ ملا تھا اور بعد میں نتیش کمار نے اپنے مخالفین بی جے پی کے ساتھ سرکار بنا لی تھی، جس کے احتجاج میں علی انور نے آواز بلند کی تھی اور بعد میں انہیں پارٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ مگر علی انور کو اس بات کا افسوس نہیں ہے اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ منڈل ہی کمنڈل کا صحیح علاج ہے۔ انہوں نے یہ بھی قبول کیا کہ منڈل کا مشن ابھی پورا نہیں ہو پایا ہے اور ابھی بھی ۲۷ فیصد ریزرویشن پسماندہ طبقات کو نہیں ملا ہے۔

منڈل کمیشن کی تین دہائیوں کے بعد بھی آج بھی پسماندہ طبقات اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کلاس ون اور یونیورسٹی میں پروفیسر کی تقرری میں او بی سی اپنی آبادی کے تناسب سے بہت کم ہیں۔ تعلیمی اداروں میں بھی ان کو ریزرویشن دینے کی راہ میں روز رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔ بیک ورڈ کاسٹ کے اندر اتحاد کو اپر کاسٹ لابی کمزور کر چکی ہے۔ کاسٹ سینسس کرانے سے بھی سرکار بھاگ رہی ہے، جس کی مخالفت میں گزشتہ دنوں دہلی کے جنتر منتر پر آل انڈیا اسٹوڈینٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے بڑا احتجاج منعقد ہوا۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ ملک کا سب سے بڑا لیڈر ووٹ حاصل کرنے کے لیے خود کو پچھڑا کہتا ہے، مگر اس کے نزدیک اعلیٰ ذات کے مفاد زیادہ عزیز ہیں۔ منڈل ڈے کے موقع پر تمام انصاف پسند طاقتوں کو اپنی غلطی سے سبق لیتے ہوئے متحد ہونے کی ضرورت ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

سیکولر تعلیم کی اہمیت اور مولانا آزادؒ

مولانا آزاد کی نصیحتوں کو مکمل طور پر عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا، مگر موجودہ حکومتیں ان کی وراثت کو پہلے سے کہیں زیادہ نظرانداز کررہی ہیں

ابھے کمار

مولانا ابوالکلام آزاد ایک نامور عالم، مفکر، مصنف، صحافی، مجاہد آزادی، ہندو مسلم اتحاد کے سفیر اور آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم تھے۔ ۱۱ نومبر مولانا کا یومِ ولادت ہے، جسے پورے ملک میں قومی یومِ تعلیم کے طور پر منایا جاتا ہے۔ تاہم، عوام کی ایک بڑی تعداد شدت سے یہ محسوس کررہی ہے کہ حکمراں طبقہ اوران کے پالیسی ساز مولانا آزاد کو خراجِ عقیدت پیش تو کرتے ہیں، مگر جب ان کے پیغام اور مشن پر عمل درآمد کی بات آتی ہے تو اکثر انہیں فراموش کردیتے ہیں۔ سابقہ حکومتوں نے بھی مولانا آزاد کی نصیحتوں کو مکمل طور پر عملی جامہ نہیں پہنایا تھا، مگر موجودہ حکومتیں ان کی وراثت کو پہلے سے کہیں زیادہ نظرانداز کررہی ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ بی جے پی کی حکومتیں تیزی سے تعلیم کی نجکاری کررہی ہیں اور تعلیم کے بجٹ میں مسلسل کمی کررہی ہیں۔ مولانا آزاد تعلیم کو ایک تجارتی شے نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم ایک بہتر سماج تشکیل دینے اور سیکولر جمہوریت کی جڑیں مضبوط کرنے کا ذریعہ تھی۔ مگر آج کے پالیسی ساز تعلیم کو محض منافع کمانے کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ اربابِ اقتدار کی ترجیحات میں جو تبدیلی آئی ہے، اس کا اندازہ وزیرِ تعلیم کے انتخاب سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے پاس مولانا آزاد، ہمایوں کبیر، اور پروفیسر ایس نورالحسن جیسے دانشور وزیرِ تعلیم ہوا کرتے تھے، جنہوں نے وزارتِ تعلیم کو وقار بخشا۔ لیکن اب حالات اس قدر بگڑ چکے ہیں کہ بعض حالیہ وزرائے تعلیم کی اپنی تعلیمی صلاحیت پر ہی سوالات اٹھائے جارہے ہیں۔ سیکولر اقدار پر عمل کرنے کے بجائے، وزارتِ تعلیم آر ایس ایس کے ایجنڈے کو ملک بھر میں نافذ کررہی ہے۔ نصاب میں قومی ہیروز کو شامل کرنے کے نام پر اقلیتوں اور دیگر محروم طبقات کے تعاون کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔ اسی لیے آج مولانا آزاد کا تعلیمی فلسفہ پہلے سے کہیں زیادہ معنی خیز اور اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔

۱۹۴۷ء کی جنوری میں عبوری حکومت میں شمولیت سے لے کر اپنی وفات تک، مولانا آزاد نے کانگریس کے وزیر کی حیثیت سے ملک کی تعلیم عامہ کی ذمہ داری نبھائی۔ جہاں نہرو کے دورِ حکومت کو ملک کے بڑے تعلیمی اداروں کے قیام کا سہرا دیا جاتا ہے، وہیں اس پر تنقید اس بات پر بھی کی جاتی ہے کہ بنیادی تعلیم کو اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی ضروری تھی۔ بطور وزیرِ تعلیم مولانا آزاد کی کامیابیاں اور خامیاں کسی بھی غیر جانبدار محقق کے لیے اہم موضوع ہیں، لیکن کوئی بھی فیصلہ سنانے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ مولانا آزاد کو پہلے سے طے شدہ پالیسی فریم ورک میں کام کرنے کی مجبوری تھی۔ اس کے باوجود، ان کی انفرادی کوششوں کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس دور کے دیگر وزرائے تعلیم کے مقابلے میں مولانا آزاد کی خدمات نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ مولانا آزاد خود قومی تحریک سے جڑے رہنما تھے، جنہوں نے انگریزی غلامی کے تجربات سے گزر کر، نئے بھارت کی تعمیر کا خواب دیکھا اور اس خواب کو حقیقت بنانے کے لیے اپنے دل میں عظیم ارمان سجائے سرگرم عمل رہے۔

مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفے پر کافی مواد دستیاب ہے، مگر ان میں سے ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کی پریس کانفرنس میں ان کی باتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اگر آپ اسے خود پڑھنا چاہیں تو

"

المیہ یہ ہے کہ بھارت، جو دنیا کی پانچویں بڑی معیشت ہے، تعلیمِ عامہ پر اپنے سے چھوٹی معیشتوں کے مقابلے میں کم خرچ کررہا ہے۔ بھارت کی ثقافتی تنوع اور طلبہ کی ذہانت سونے اور چاندی سے زیادہ قیمتی ہیں، اور اگر انہیں مناسب مواقع فراہم کیے جائیں تو بھارت علم کے میدان میں بڑی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ آج کے لیڈران میں ایسا وژن نہیں ہے۔ وہ محض ووٹ حاصل کرنے کے لیے عوام کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے میں مصروف ہیں۔

یہ مولانا آزاد کی تحریروں کے مجموعے میں شامل ہے، جسے تعلیم اور قومی تعمیر نو کانفرنس کے عنوان سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ہماری ملک کے اربابِ اقتدار سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ وہ اسے ضرور پڑھیں۔ اس پریس کانفرنس میں مولانا آزاد نے واضح کیا کہ انسان کے معیار پر کس طرح کی تعلیم فراہم کی جارہی ہے، اس کا اثر کسی دوسری چیز کے مقابلے میں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ ان کے مطابق، ایک حقیقی آزاد خیالی اور انسان دوست تعلیم معاشرے کی فکر کو بدل سکتی ہے اور اسے ترقی وخوشحالی کی راہ پر ڈال سکتی ہے۔ تاہم، انہوں نے خبردار کیا کہ ایک ناقص یا غیر سائنسی نظامِ تعلیم ان تمام امیدوں کو ختم کرسکتا ہے، جو ملک کو آزاد کرنے کی تحریک کے دوران علمبرداروں نے اپنے دلوں میں سجائے تھے۔ مولانا آزاد یہ بخوبی جانتے تھے کہ ایک سیکولر جمہوری ملک کی تشکیل کے لیے تعلیم عامہ کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کو اعلیٰ معیار کی تعلیم فراہم کرے۔ اسی لیے انہوں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ قومی بجٹ میں تعلیم کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے اور اس کی اہمیت خوراک اور لباس کے بعد آتی ہے۔ سوشلسٹوں کا دیرینہ مطالبہ رہا ہے کہ قومی بجٹ کا دسواں حصہ تعلیم پر خرچ کیا جائے۔

المیہ یہ ہے کہ بھارت، جو دنیا کی پانچویں بڑی معیشت ہے، تعلیمِ عامہ پر اپنے سے چھوٹی معیشتوں کے مقابلے میں کم خرچ کررہا ہے۔ بھارت کی ثقافتی تنوع اور طلبہ کی ذہانت سونے اور چاندی سے زیادہ قیمتی ہیں، اور اگر انہیں مناسب مواقع فراہم کیے جائیں تو بھارت علم کے میدان میں بڑی خدمات انجام دے سکتا ہے۔ مگر افسوس کہ آج کے لیڈران میں ایسا وژن نہیں ہے۔ وہ محض ووٹ حاصل کرنے کے لیے عوام کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے میں مصروف ہیں۔

مولانا آزاد ہندوستان کی سیکولر اور گنگا جمنی تہذیب کی ایک بہترین مثال تھے۔ وہ انگریزی تعلیم، سائنس، اور جدید ٹیکنالوجی کی اہمیت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کی فکر یہ تھی کہ تعلیم مادری زبان میں دی جائے، اور انہوں نے کہا کہ مادری زبان میں دسویں جماعت تک تعلیم دینے کا تجربہ کامیاب ثابت ہوا ہے، جسے اعلیٰ سطح پر بھی اپنانا چاہیے۔ تاہم، آج قومی زبانوں اور بولیوں کو حکمران طبقہ کمتر سمجھتا ہے۔ مولانا آزاد کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ تعلیم کے شعبے کو نظرانداز کیا جارہا ہے، اسی لیے وہ اس میں اصلاح کے خواہاں تھے۔ ان کی تعلیمی سوچ میں روایت اور جدیدیت کے درمیان ایک نازک توازن نظر آتا ہے۔ وہ روایت، ثقافت، ورثے، اور جدید سیکولر خیالات کو ساتھ لے کر چلنے کے حامی تھے۔ مولانا آزاد کی رائے یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو اپنے عقائد پر عمل کرنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی دوسرے مذاہب کے پیروکاروں سے اتحاد برقرار رکھنا بھی ضروری ہے۔ ان کے نزدیک مذہبی اور قومی تشخص متضاد نہیں بلکہ ہم آہنگ ہیں۔ اسی لیے وہ سمجھتے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو دیوناگری اور اردو رسم الخط سیکھنی چاہیے۔ ان کی تعلیمی پالیسی کا مقصد قوم کی مشترکہ ثقافت کو مستحکم بنانا تھا۔ وہ نیچرل سائنس، آرٹس، ہیومینٹیز، فلسفے، اور سماجی علوم میں بنیادی تحقیق کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ ماضی کو سمجھنے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے، انہوں نے قومی عجائب گھر کے قیام اور آثارِ قدیمہ کی تحقیق کے فروغ کا منصوبہ بنایا تاکہ مؤرخین کو صرف متون تک محدود نہ رہنا پڑے۔ مگر آج ملک میں چلنے والی فرقہ وارانہ فضا ہندوستانیوں کو مذہبی بنیاد پر تقسیم کررہی ہے۔ اس ملک۔مخالف اور فرقہ وارانہ سازش کو ناکام کرنے کے لیے ہمیں نہ صرف مولانا آزاد کو سچے دل سے یاد کرنا ہوگا، بلکہ ان کی تعلیمات پر بھی عمل پیرا ہونا ہوگا۔ ■

مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے۔

debatingissues@gmail.com

میوات کے مسلمان اور اُن کے مسائل

ہمیں سب کو ساتھ لے کر میوات کی سماجی، تعلیمی اور معاشی ترقی کے لیے کام کرنا ہوگا

ابھے کمار

قومی راجدھانی دہلی سے میوات کا علاقہ صرف گھنٹے دو گھنٹے کے فاصلے پر ہے، مگر ترقی کے معاملے میں وہ دہلی سے میلوں دور ہے۔ آج بھی میوات کے علاقے کو پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے۔ اسکول اور اسپتال بھی یہاں بہت کم تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ تعلیمی پسماندگی کے معاملے میں یہ علاقہ بھارت کے انتہائی پسماندہ علاقوں میں آتا ہے۔ خواتین کی شرح تعلیم بھی بہت ہی کم ہے۔ یہ سب دیکھ کر کئی بار ایسا لگتا ہے کہ میوات کو جان بوجھ کر تعصب کا شکار بنایا گیا ہے۔ میوات میں مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی رہتی ہے اور بہت لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ اگر اس علاقے میں اقلیتوں کی بڑی آبادی نہیں رہتی تو شاید اس کا اتنا برا حال نہیں ہوتا۔

میوات کے مسائل پر اپنی بات رکھنے کے لیے کچھ دن پہلے جامعہ کے میرے ایک پرانے دوست عمران چودھری نے کہا۔ عمران نے جامعہ سے بین الاقوامی امور میں کچھ ہی وقت پہلے پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔ اُن کا ماننا ہے کہ اگر میوات کو اپنی پسماندگی سے باہر نکلنا ہے تو نوجوانوں کو سامنے آنے ہوگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک دہائی سے عمران بھائی ملک کی ایک بڑی اور پرانی پارٹی سے جڑے ہوئے تھے، مگر اب ان کو یہ محسوس ہو چکا ہے کہ میوات کی ترقی سے نہ تو فرقہ پرست پارٹی کو بہت کچھ لینا دینا ہے اور نہ ہی نام نہاد سیکولر پارٹی کے ایجنڈے میں ہی کچھ مثبت پلان ہے۔ تھک ہار کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ علمی اور سماجی طور سے میوات کے مسائل کو منظر عام پر لائیں گے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے فیس بک پر ایک میو گزیٹ نام کا ایک پیج بھی بنایا ہے، جو کافی مشہور ہو رہا ہے۔ کچھ دن پہلے عمران بھائی جے این یو تشریف لائے۔ اُن سے بات چیت شروع کرنے سے پہلے ہم لوگوں نے جے این یو کے خوبصورت کیمپس کی سیر کی۔ ہم نے ریکارڈنگ شروع کرنے سے پہلے پیٹ پوجا بھی کی۔ خوب سارے موموز کھائے۔ جلیبی بھی دبائی اور چائے بھی پی۔ اتنا سب کچھ کھانے کے بعد گفتگو بھی توانائی اور جوش سے بھری ہوئی رہی۔ ہماری گفتگو کو بعد میں فیس بک پر اپ لوڈ بھی کیا گیا۔ اس دوران مجھے میوات اور میوات میں رہائش پذیر میو مسلمانوں کے بارے میں پڑھنے اور مزید جاننے کا موقع ملا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جب ہم میوات کہتے ہیں تو اس کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ پہلا، میوات ایک ضلع ہے، جسے ہم نوح کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ ہریانہ کا سب سے پسماندہ علاقہ ہے۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۸۰ فیصد ہے۔ میوات کا نوح ضلع گروگرام یعنی گڑگاؤں سے بالکل متصل ہے۔ یہاں تک میوات کا علاقہ گڑگاؤں پارلیمانی حلقے کے اندر ہی آتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گوروگرام میں ایک فرد کی سالانہ آمدنی تقریباً تین لاکھ کے قریب ہے، وہیں میوات میں رہنے والا ایک شخص صرف ایک سال میں ۲۷ ہزار روپے ہی کما پاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہیں تو گروگرام کے مقابلے میوات کے لوگوں کی آمدنی دس گنا کم ہے۔ جہاں گروگرام میں داخل ہونے کے بعد آپ کو ایسا لگتا ہے کہ آپ یوروپ اور امریکہ کے کسی ترقی یافتہ زون میں داخل ہوئے ہیں، وہیں پاس کے میوات علاقے میں داخل ہونے پر آپ کو ایسا لگتا ہے کہ یہاں ترقی کی دیوی ابھی تک پہنچی ہی نہیں ہے۔ آپ کو جان کر حیرانی ہوگی کہ میوات میں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے ریل گاڑی نہیں دیکھی ہے۔ ان کی زندگی ابھی بھی کھیتی اور مویشیوں کے پالنے تک ہی محدود ہے۔ دوسرا، میوات کا مطلب ایک وسیع علاقائی تشخص بھی ہے۔ جب ہم میوات کو ایک علاقائی شناخت کے طور پر دیکھتے ہیں تو اس میں ہریانہ کے میوات اور نوح کے علاقے کے علاوہ اُتر پردیش کا متھرا اور راجستھان کا بھرت پور ضلع بھی شامل ہو جاتا ہے۔ جہاں میوات ضلع میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے، وہیں گریٹر میوات میں مسلمانوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے۔

> آزادی کے بعد ملک میں ایک سیکولر آئین بنا، مگر سیکولر پالیسی اکثر زمین پر اتری نہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کے ساتھ بھید بھاؤ کیا گیا۔ یہ سلسلہ میوات میں بھی شروع ہوا، جو آج تک رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ جو پالیسی کو نافذ کرنے والے ہیں، اُن کے دلوں میں کھوٹ ہے۔ وہ سیکولر ذہن سے نہیں بلکہ فرقہ ورانہ ذہن سے سوچتے ہیں۔

میوات علاقے میں بسنے والے میو مسلمان کون ہیں؟ اس سوال کا بھی ایک جواب نہیں ہے۔ کچھ لوگ اُن کو راجپوت سے اسلام دین قبول کرنے والے مانتے ہیں، تو کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ وہ شمال مغربی خطے میں ساتویں اور گیارہویں صدی میں رہنے والے قبیلہ کی اولاد ہیں۔ کچھ جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سکندر اعظم کی فوج کی اولاد ہیں۔ جہاں تک بات ان کے مذہب کی ہے تو بہت سارے اسکالر یہ مانتے ہیں کہ انہوں نے اسلام مذہب کو ایک دن میں قبول نہیں کیا بلکہ رفتہ رفتہ وہ اسلام کے قریب آئے۔ اٹھارہویں صدی کے بعد میو مسلمانوں کا مسلم تشخص واضح طور پر دکھنے لگا۔ تبھی تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام دھرم زور اور زبردستی اور تلوار سے پھیلا وہ غلط بولتے ہیں۔ کچھ لوگ ممکن ہے کہ ڈر یا لالچ سے اسلام اپنائے ہوں، مگر بھارت کی بڑی آبادی صوفی سنت کی زندگی اور اُن کے اخلاق اور اسلام دھرم کی اچھی اور نیک باتوں سے متاثر ہو کر اسلام کے آغوش میں آئی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ دھرم اور مذہب ایک ہونے کی وجہ سے اُن کے سارے پیروکاروں کے مفاد ایک نہیں ہو جاتے ہیں۔ تبھی تو میو مسلمانوں کا مقابلہ بعض اوقات مغلیہ سلطنت سے رہا ہے۔ انگریزوں سے بھی میو مسلمانوں نے لوہا لیا اور برطانوی حکومت اُن سے اس قدر پریشان ہوئی کہ انہیں کریمنل یعنی مجرم کہا جانے لگا۔ اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میو مسلمانوں نے ریاست کے استحصال کے خلاف ہمیشہ لڑائی لڑی ہے۔

آزادی ملنے کے وقت میوات کے بڑے علاقوں میں فساد ہوئے۔ بھرت پور سے بھاگ کر بڑی تعداد میں مسلمانوں نے میوات اور نوح کے علاقے میں پناہ لی۔ آزادی کے بعد ملک میں ایک سیکولر آئین بنا، مگر سیکولر پالیسی اکثر زمین پر اتری نہیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کے ساتھ بھید بھاؤ کیا گیا۔ یہ سلسلہ میوات میں بھی شروع ہوا، جو آج تک رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے۔ یہ اس لیے کہ جو پالیسی کو نافذ کرنے والے ہیں، اُن کے دلوں میں کھوٹ ہے۔ وہ سیکولر ذہن سے نہیں بلکہ فرقہ ورانہ ذہن سے سوچتے ہیں۔ اپنی ریسرچ کے دوران میں نے پایا کہ سرکاری اعداد و شمار اور رپورٹ خود یہ کہتے ہیں کہ دہلی کے انت پاد ہونے کے باوجود بھی میوات ضلع ہریانہ میں سب سے زیادہ پسماندہ ہے۔ یہاں خواتین کی تعلیم بہت ہی کم ہے۔ اسکول اور کالج بھی کہیں کہیں ہیں۔ تعلیمی اور سماجی پسماندگی بہت پھیلی ہوئی ہے۔ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی اموات کی شرح بھی بہت کم ہے۔ پانی کے بھی مسائل بہت زیادہ ہیں۔ نوکری کے بھی مواقع کم ہوتے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں کے اندر زبردست مایوسی ہے۔ انہیں ساری باتوں کو لے کر ہماری گفتگو میوات کے عمران چودھری بھائی سے رہی تھی۔ آخر میں میں نے یہی گزارش کی کہ میوات کے لوگوں کو اپنی پسماندگی دور کرنے کے لئے آگے آنا ہوگا۔ مگر جو راہ ہمیں اختیار کرنی ہے وہ جمہوری ہونی چاہیے۔ سب کچھ پیار، امن اور شانتی سے ہونا چاہیے۔ میوات کے لوگوں کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ اپنی لڑائی کو وسیع بنائیں اور تمام محکوم طبقوں کو ساتھ لے آئیں۔ اشتعال انگیزی سے گریز کرنا ہوگا اور ہمیں کسی کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانی چاہیے۔ یاد رکھیے کہ اقلیتوں کے خلاف تعصب بھارت میں ہی نہیں اور بھی جگہ پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے واجب حقوق کے خلاف موقع پرست لوگ کام کر رہے ہیں، جن کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو سکتا ہے۔ اس لیے لڑائی لمبی ہے اور جذبات کی رو میں بھٹکنے سے گریز کرنا ہوگا۔ ہمیں سب کو ساتھ لے کر میوات کی سماجی، تعلیمی اور معاشی ترقی کے لیے کام کرنا ہوگا۔

مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں

اقلیتوں کی مؤثر نمائندگی ہی اصل جمہوریت ہے

یہ بہت ہی ناامیدی کی بات ہے کہ سیاسی حلقوں میں اقلیتوں کے اوپر اکثریت اپنی بالادستی تھوپ رہی ہے

ابھے کمار

اتر پردیش میں یوگی آدتیہ ناتھ کی قیادت والی بی جے پی سرکار نے کمان سنبھال لیا ہے۔ میڈیا میں آئی خبروں کے مطابق، ۵۲ وزراء پر مشتمل یوگی سرکار میں جہاں اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے بہت سارے لیڈروں کو وزارت میں جگہ دی گئی ہے، وہیں اس میں صرف ایک مسلمان کو شامل کیا گیا ہے۔ یوگی حکومت میں، ۳۳ سالہ دانش آزاد انصاری نئے مسلم چہرہ ہیں۔ دانش آزاد انصاری کو وزیر مملکت کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ کچھ روز پہلے تک، وہ میڈیا کی توجہ سے دور تھے، مگر جو جانکاری اب مل رہی ہے اس کے مطابق یہ وزیر کئی سالوں سے بی جے پی کے لیے خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ سابقہ یوگی سرکار میں محسن رضا کو وزیر بنایا گیا تھا، مگر اس بار ان کو ڈراپ کر دیا گیا ہے۔ انڈین ایکسپریس کی ایک خبر کے مطابق، دانش آزاد انصاری بی جے پی کی ریاستی اقلیتی کمیٹی کے جنرل سکریٹری ہیں۔ اس سے قبل وہ یوگی حکومت میں اردو زبان کمیٹی کے رکن بھی رہے ہیں۔ بی جے پی کی ذمہ داری لینے سے پہلے، وہ آر ایس ایس اور اس کی طلبہ تنظیم اے بی وی پی کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ کہا جا رہا ہے کہ سال ۲۰۱۱ میں جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں کوانٹی منیجمنٹ اور پبلک ایڈمنسٹریشن میں پوسٹ گریجویٹ کر رہے تھے تب ہی سے انہوں نے اے بی وی پی کے لیے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ بعد کے دنوں میں انہوں نے اے بی وی پی کے اندر مختلف عہدوں کو سنبھالا اور آخر کار ترقی پا کر بی جے پی میں آگئے۔ ان دنوں صحافیوں سے بات کرتے ہوئے انہوں نے یوگی اور مودی کی جم کر تعریف کی اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ 'یوگی حکومت نے مؤثر طریقہ سے مسلم سماج کے تمام مسلک کے لیے کام کیا ہے۔ راشن سے متعلق منصوبہ ہو یا آیوشمان کارڈ دینے کی بات ہو، یا سرکاری گھر مہیا کرانے کی پالیسی ہو، مسلمان یوگی سرکار سے مستفید ہوئے ہیں۔ اس وجہ سے وہ بی جے پی، یوگی اور مودی سے محبت کرتے ہیں'۔

حالانکہ میری رائے بی جے پی کے جواں سال وزیر سے الگ ہے۔ میں اپنے اعتراضات کو منظر عام پر اس لیے درج کرانا چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ ملک کی بقا سے جڑا ہوا ہے۔ یہ بات صرف ایک سیاسی جماعت کے نظریہ کی تنقید کرنے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ یہ بھارت کی مشترکہ وراثت اور ساجھی شہادت کی تاریخ سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یہ بھارت کی مشترکہ قومیت، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور تنوع کی صحت سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اتنا ہی نہیں یہ بھارت کی جمہوریت سے بھی براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جس سماج میں مختلف دھرم، مذاہب، ذات برادری، نسل، جنس کے لوگ رہتے ہیں، وہ سماج تب ہی آگے بڑھ سکتا ہے جب اقتدار میں سب کی شرکت کو یقینی بنایا جائے اور سب کے ساتھ انصاف کیا جائے۔ اگر ملک کا ایک بھی شہری یہ محسوس کرتا ہو کہ وہ فلاں مذہب اور ذات سے تعلق رکھنے کی وجہ سے امتیاز اور تعصب کا شکار ہے تو وہ معاشرہ کی صحت کے لیے اچھی بات نہیں ہے۔ اس بات کے پورے امکانات ہیں کہ جب ایک کے ساتھ ناانصافی پر آنکھ بند کر لی جاتی ہے تو ظالم کے حوصلے بلند ہوتے ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے شخص کے ساتھ ظلم و زیادتی کرتا ہے اور دھیرے دھیرے روشنی پر تاریکی طاری ہو جاتی ہے۔ آزادی ملنے سے کچھ ہی دن پہلے ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر بھی اسی طرح کے مسائل سے لڑ رہے تھے۔ آج کے تشویشناک حالات کو سمجھنے کے لیے ہمیں ۱۹۴۷ میں واپس لوٹنا ہوگا۔

جب یہ بات صاف طور پر دکھ رہی تھی کہ بھارت کے آئین کا

جمہوریت وہی ہے، جہاں سرکار بھلے ہی اکثریت کے ووٹ سے بنتی ہے، مگر وہاں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی دی جاتی ہے اور ان کے حقوق کو آئینی تحفظات فراہم کیے جاتے ہیں۔ روز بروز کے کام کاج میں ان حقوق کو زمین پر عمل میں لایا جاتا ہے اور کہیں سے بھی اقلیتوں کے دل میں اس طرح کے شکوک اور خدشات کی جگہ نہیں چھوڑی جاتی ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس نظام میں وہ غیر ہیں۔

مسودہ قانون ساز اسمبلی میں تحریر کیا جائے گا، تب آل انڈیا شیڈیول کاسٹ فیڈریشن نے بابا صاحب امبیڈکر سے یہ التجا کی کہ وہ فیڈریشن کی طرف سے ایک قرارداد قانون ساز اسمبلی میں پیش کریں، جس میں شیڈیولڈ کاسٹ یعنی دلتوں کے حقوق سے متعلق تحفظات درج ہوں۔ بابا صاحب نے اس کام کو بخوبی انجام دیا اور جو ایک کتابچہ کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کتابچہ کا عنوان تھا 'اسٹیٹس اینڈ مائنارٹیز' (ریاستیں اور اقلیتیں) جو بابا صاحب سے ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ کو تیار ہوا۔ امبیڈکر کی باتوں کا نچوڑ یہ تھا کہ جمہوریت کی کامیابی اسی بات پر منحصر ہے کہ اقتدار میں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی حاصل ہو۔

ڈاکٹر امبیڈکر یہ بات بار بار کہتے تھے کہ بھارتی سماج ذات برادری پر ٹکا ہوا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی انسان کسی منصب پر قابض ہوتا ہے تو وہ اکثر اپنی ذات اور برادری کا مفاد پورا کرتا ہے۔ اس لیے سماج میں اگر سب کو انصاف دینا ہے تو تمام ذات اور ملت کے لوگوں کی نمائندگی یقینی بنانی ہوگی۔ جمہوریت کے جو برطانوی ماڈل ہمارے ملک میں نافذ ہیں اس میں حکومت سازی کے لیے وہی گروپ کامیاب رہتا ہے جن کی تعداد زیادہ ہے۔ اکثریت اپنی تعداد اور طاقت کی بنیاد پر ہمیشہ حکومت بنا لیتی ہے اور اقلیت کچھ بھی کر لیں وہ خود کی طاقت سے سرکار بنا پانے میں ناکام رہتی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اکثریت سماج ہمیشہ سے ہی حاکم رہے گا اور اقلیت محکوم رہے گی؟ مگر جمہوریت کا نام نہ ہی زور اور زبردستی ہے نہ ہی اس کا نام بالادستی اور تسلط ہے۔ دراصل جمہوریت وہی ہے، جہاں سرکار بھلے ہی اکثریت کے ووٹ سے بنتی ہے، مگر وہاں اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی دی جاتی ہے اور ان کے حقوق کو آئینی تحفظات فراہم کیے جاتے ہیں۔ روز بروز کے کام کاج میں ان حقوق کو زمین پر عمل میں لایا جاتا ہے اور کہیں سے بھی اقلیتوں کے دل میں اس طرح کے شکوک اور خدشات کی جگہ نہیں چھوڑی جاتی ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس نظام میں وہ غیر ہیں۔

تبھی تو ڈاکٹر امبیڈکر نے اقلیتوں کو اہمیت دینے کی بات کہی۔ یہ بات مؤثر نمائندگی سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جمہوری نظام میں اقلیتوں کو اپنی بات رکھنے، اپنے مفاد کی ترجمانی کرنے، اپنی شکایت کو دور کرانے کا پورا موقع ہونا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو اقتدار میں اس قدر حصہ داری دی جائے اور ایسے اختیارات مہیا کرائے جائیں تاکہ ان کا حق کوئی بھی نہ چھین سکے۔ تبھی امبیڈکر اقلیتوں کے لیے مؤثر نمائندگی کی بات کرتے تھے اور ان کا مطالبہ تھا کہ ہر شعبہ، خواہ وہ قانون ساز اسمبلی ہو یا سرکاری نوکری یا پھر تعلیمی ادارے، ہر طرف اقلیتوں کو واجب نمائندگی دی جائے تاکہ وہ کبھی بھی خود کو اجنبی اور غیر نہ سمجھ پائیں۔ وہ اس بات سے بھی پریشان تھے کہ جہاں اکثریت جمہوریت میں سیاسی اکثریت ہونی چاہیے، وہیں بھارت میں اکثریت فرقہ وارانہ اکثریت ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ حکومت سازی کے دوران اقلیتوں کو مؤثر نمائندگی دی جائے، نہیں تو اقلیت ہمیشہ کے لیے محکوم طبقات بن کر رہ جائیں گے۔ امبیڈکر کہتے ہیں کہ یہ بہت ہی ناامیدی کی بات ہے کہ سیاسی حلقہ میں اقلیتوں کے اوپر اکثریت اپنی بالادستی تھوپ رہی ہے۔ اگر ایسا ہوتا رہا تو یہ بالادستی جمہوریت کے جذبہ کو پارہ پارہ کر دے گی۔

بابا صاحب کی تصویر کے اوپر گل پوشی کرنے میں بھگوا طاقتیں دوسروں سے مقابلہ کرتی ہیں اور انہیں پنڈت جواہر لال نہرو اور کانگریس کے خلاف کھڑا کرتی ہیں تاکہ ان کو زیادہ سے زیادہ دلتوں کا ووٹ حاصل ہو جائے۔ مگر جب بابا صاحب کے پیغامات کو عملی جامہ پہنانے کی بات ہوتی ہے تو بھگوا طاقتیں بھاگ جاتی ہیں۔ بابا صاحب کے افکار کا اس سے بڑا اور کیا مذاق ہو سکتا ہے کہ بی جے پی نے تقریباً ۴ کروڑ مسلمانوں کو نظر انداز کیا ہے اور کسی کو بھی اسمبلی انتخابات کے دوران ٹکٹ نہیں دیا ہے۔ جس کمیونٹی کی آبادی ۲۰ فیصد کے قریب ہو، اس میں سے ایک شخص بھی اسے باصلاحیت نظر نہیں آیا۔ اب وہ بغیر الیکشن لڑائے ایک اقلیت کو وزیر بنا کر اقلیتوں کو یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ بھاجپا سے بڑی دوسری کوئی پارٹی فراخ دل نہیں ہے! میں دانش آزاد انصاری کو وزیر بننے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ امبیڈکر کی ان باتوں کو اپنی پارٹی کے اندر بھی اُٹھائیں۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

اقلیتوں کے حقوق کیوں اہم ہیں؟

اگر سماج میں کوئی طبقہ کسی بھی طرح سے بھید بھاؤ اور تعصب کا شکار ہو تو اس کو دور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے بنیادی مسئلہ کی نشاندہی ہو

ابھے کمار

کیا اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں بولنے لکھنے سے سماج میں پھوٹ پڑتی ہے؟ کیا اقلیتوں کے حقوق کا مطالبہ کرنے کی بجائے عام شہریوں کے حقوق کی بات ہونی چاہیے؟ ایسے سوالات اکثر ہمارے سامنے آتے ہیں اور ایسا تاثر پھیلایا جاتا ہے گویا اقلیتوں کے حقوق کے بارے میں بات کرنے سے ملک کمزور ہو جاتا ہے۔ بھگوا سیاسی جماعت لمبے وقت سے اقلیتوں کے حقوق کی بات کرنے والے لوگوں کو نشانہ بناتی رہی ہے۔ انہوں نے مہاتما گاندھی کو مسلم نواز کہا اور ان کے سینے میں گولی تک داغ دی۔ کانگریس، بایاں محاذ اور سماجی انصاف کے نظریہ کی حامل پارٹیوں کے اوپر بھگوا جماعت مسلم منہ بھرائی کا الزام لگاتی رہی ہے۔ مسلم سیاسی اور ملی جماعت کے بارے میں یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ وہ چھوٹی سوچ میں مبتلا رہتے ہیں اور وہ ہندو سماج اور ملک کے مفاد کے خلاف کام کرتے ہیں۔ ان تمام اعتراضات کے برعکس سچائی یہ ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کے لیے لڑنے سے سماج اور ملک کمزور نہیں بلکہ مضبوط ہوتا ہے۔ اگر سماج میں کوئی طبقہ کسی بھی طرح سے بھید بھاؤ اور تعصب کا شکار ہو، تو اس کو دور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے بنیادی مسئلہ کی نشاندہی ہو اور اس پر کھل کر بات ہو۔ مرض کو چھپا لینے سے مرض دور نہیں ہو جاتا ہے۔ محکوموں، محروموں اور مظلوموں کے خلاف ہو رہے ظلم اور زیادتی کی بات کرنے کے بعد ہی انہیں ختم کرنے کے بارے میں منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی سیاق میں ہمیں اقلیتوں کے حقوق کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔

۱۸ دسمبر ۱۹۹۲ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اقلیتوں کے حقوق سے متعلق ایک قرارداد کو اپنایا تھا اور اس کے بعد سے یہ دن یوم اقلیتی حقوق کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اسی دوران بھارت سرکار نے 'قومی نیشنل کمیشن' کی تشکیل کی۔ بھارت میں مسلمان، عیسائی، سکھ، بودھسٹ، پارسی، جین کو مذہبی اقلیت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن کی طرح ہی ریاستی اقلیتی کمیشن کا کام آئین میں درج اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ کرنا اور ان کی پامالی ہونے پر واجب کاروائی کرنا ہے۔ مگر افسوس کہ بات یہ ہے کہ اقلیتی کمیشن کی کرسی پر اکثر سیاسی لوگوں کو بیٹھا دیا جاتا ہے جن کے دلوں میں اپنی سیاسی جماعت کے مفاد کو پورا کرنا عوام کے مفاد سے کہیں زیادہ اہم ہوتا ہے۔ دوسری بڑی پریشانی یہ ہے کہ جو لوگ اقلیتی حقوق کو اکثریت کے خلاف تصور کر لیتے ہیں وہ 'نیشن اسٹیٹ' یا قومی ریاست کی تاریخ کو سمجھتے نہیں یا پھر دانستہ طور پر سمجھنا نہیں چاہتے۔ دراصل نیشن انگریزی کا ایک لفظ ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے ملک یا عوام۔ یہاں عوام سے مراد کسی مخصوص ملک میں رہنے والے لوگوں سے ہوتا ہے، جن کی زبان، تاریخ، ثقافت، رسم و رواج ایک ہوتی ہے اور جنہیں مجموعی طور پر قوم کہا جاتا ہے۔ 'نیشن اسٹیٹ' کا وجود جدید دور میں اس وقت سامنے آیا جب جدید ملک کی حد ود ایک قوم کی آبادی کے تناسب میں کھینچا جانے لگا۔ پھر قومی ریاست کا وجود ایک آزاد ملک کے طور پر ہوا اور یہ مان لیا گیا کہ اس میں رہنے والے تمام لوگ، جو ایک قوم کہلائے گئے، ایک ہی ثقافت، زبان، تاریخ وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ قوم کی جو اصطلاح بنائی گئی وہ در اصل تنقید سے پاک نہیں تھی کیونکہ دنیا میں کوئی بھی ایسا حصہ نہیں ہے، جہاں ایک ہی زبان، تاریخ، ثقافت سے تعلق رکھنے والے لوگ ہی زندگی گزر بسر کرتے ہیں۔ دراصل سماج تو ایک گل دستہ کی طرح پھولوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے جہاں تمام رنگ اور خوشبو کے پھول پائے جاتے ہیں۔ ہر سماج کا اصل چہرہ 'تنوع' ہے اور اسے کسی ایک خاص مذہب، ذات، نسل سے جوڑنا ایک بیماری ہے۔ تاریخ

> جمہوریت میں حکومت سازی اکثریت کے ووٹ سے کی جاتی ہے اور اعلیٰ ذات کے لیڈر محکوم طبقات کے مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی لیے بابا صاحب امبیڈ نے جمہوریت کی اس کمزوری کو ایک حد تک دور کرنے کے لیے اقلیتوں کے حقوق کو آئینی تحفظات فراہم کروائیں۔ مگر افسوس کہ سماج کے کمزور ترین طبقات کے مفاد کو بچانے کے بجائے اس پر مسلسل حملے کیے جا رہے ہیں۔ مگر ایک بہتر سماج کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماج کے کمزور ترین گروپ کی حالت کو بہتر کیا جائے۔

گواہ ہے کہ جب بھی قومی ریاست تشکیل دی گئی، تو خون خرابہ ہوا اور کمزور ترین لوگوں کا حق مارا گیا۔ جب ایک ہی زبان، مذہب، ثقافت، تاریخ کی بنیاد پر قوم کی تعریف اور توضیح کی جائے گی، جو کبھی وجود میں تھی ہی نہیں، تو دیگر زبان، دھرم کے ماننے والوں کو قوم سے باہر کر دیا جائے گا۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں جہاں بھی قومی ریاست کی تشکیل دی گئی وہاں ایک خاص مذہب، زبان، ثقافت کے ماننے والے لوگوں کو قوم کا حصہ بنایا گیا اور باقی لوگوں کو ان فٹ کہہ کر مین اسٹریم سے الگ تھلگ کر دیا گیا۔ تبھی تو قومی ریاست کی تاریخ اقلیتوں کی بدحالی کی بھی داستان ہے۔

قومی ریاست کے وجود میں آتے ہی دنیا بھر میں کروڑوں لوگ، جو بہت سالوں سے ایک خاص ملک میں رہ رہے تھے، اچانک سے اقلیت بنا دیے گئے اور ان کے لیے زندگی جینا دشوار کر دیا گیا۔ متحدہ بھارت کی ہی مثال لے لیجیے، جہاں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، جین، بدھسٹ، پارسی، دلت، آدی واسی، دراوڑ وغیرہ ہزاروں سالوں سے زندگی جی رہے تھے۔ مگر جب انگریز بھارت میں حکمراں بنے اور تب انہوں نے بھارت کی تاریخ لکھی اور بھارت کو فرقہ واریت کے لیے زمین تیار کر دی۔ انگریزوں نے یہ تعصب کو جنم دیا کہ قدیم بھارت کی تہذیب اور ثقافت ویدک یا ہندو رہی ہے، جبکہ مسلمانوں کی بھارت میں آمد ایک حملہ آور کے طور پر ہوئی۔ ہندو اور مسلم فرقہ پرست نے انگریزوں کے فرقہ وارانہ تاریخ کے بعض حصوں کو اپنی سہولت کے مطابق اُدھار لے لیا۔ ہندو فرقہ پرست کو انگریزوں کی یہ بات پسند آئی کہ اصل ہندوستان ہندو قوم پر مبنی ہے، جبکہ مسلم فرقہ پرست کو اس بات پر فخر محسوس ہوا کہ مسلمانوں نے ہندو قوم کو مغلوب کر ان پر راج کیا ہے اور اس طرح بھارت کے سارے مسلمانوں کے مفاد ہندوؤں کے خلاف ہے اور ہندو قوم کی طرح مسلمان بھی ایک جدا قوم ہے۔ مسلم فرقہ پرستوں نے بڑی آسانی سے یہ بات فراموش کر دی کہ مسلم حکمراں کی طرف سے لڑنے والا نہ صرف مسلم تھا بلکہ ہندو بھی تھا اور اسی طرح ہندو راجا کی طرف سے مسلمان بھی فوج میں شامل تھا۔ مسلمانوں میں امیری غریبی ہوتی ہے، ان میں ذات برادری ہوتی ہے، ان میں زمیندار اور کسان ہوتے ہیں ان سے مسلم فرقہ پرستوں کو کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہندو اور مسلم فرقہ پرست دو قومی نظریہ کے حامی بن گئے اور انہوں نے ملک کو تقسیم کی آگ میں دھکیل دیا۔ تقسیم ملک اور قومی ریاست کے ساتھ ہی ایک بڑی آبادی کو اقلیت بنا دیا گیا۔

یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کوئی اقلیت پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی اقلیت اپنی خوشی سے بننا چاہتا ہے۔ تاریخ نے دنیا کے کروڑوں لوگوں کو اقلیت بنا دیا اور ان کی زندگی مفلوج کر دی۔ تضاد دیکھیے کہ جو بھگوا عناصر بھارت میں مسلمانوں کے لیے اقلیتی حقوق کی مخالفت کرتے ہیں وہ بھارت سے باہر ہندو اقلیت کے حقوق کے بڑے حامی ہیں! یکساں قانون ہر بار مساوات کو فروغ نہیں دیتا کیونکہ لوگوں کی ضرورت الگ الگ ہوتی ہے۔ بس یا ٹرین میں عورتوں کے لیے سیٹوں کو مختص کرنے سے مردوں کا حق نہیں مارا جاتا، بلکہ سماج میں کمزوروں کے ساتھ انصاف کیا جاتا ہے۔ بابا صاحب امبیڈکر اقلیتی حقوق کو جمہوریت کا اہم حصہ مانتے تھے کیونکہ جمہوریت میں حکومت سازی اکثریت کے ووٹ سے کی جاتی ہے اور اعلیٰ ذات کے لیڈر محکوم طبقات کے مفاد کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی لیے بابا صاحب امبیڈ نے جمہوریت کی اس کمزوری کو ایک حد تک دور کرنے کے لیے اقلیتوں کے حقوق کو آئینی تحفظات فراہم کروائیں۔ مگر افسوس کہ سماج کے کمزور ترین طبقات کے مفاد کو بچانے کے بجائے اس پر مسلسل حملے کیے جا رہے ہیں۔ مگر ایک بہتر سماج کی تعمیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ سماج کے کمزور ترین گروپ کی حالت کو بہتر کیا جائے۔ اگر کوئی ہندو مسلمان کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتا ہے تو وہ نہ صرف مسلمان کا بھلا کرتا ہے بلکہ ملک کو بھی مضبوط بناتا ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

کیا سب سے زیادہ خوش مسلمان بھارت میں رہتے ہیں؟

ابھے کمار، دلی

زیادہ تر میڈیا، بھاگوت کے سفید جھوٹ کا ہمنوا بن گیا

'تنشق' کے اشتہار پر تنازعہ، زعفرانی دعوے کی قلعی کھولنے کے لیے کافی

ملک میں اصل دھارے کی صحافت ایک بار پھر راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) کے سربراہ موہن بھاگوت کے سُر میں سُر ملاتی دکھائی دے رہی ہے۔ کچھ روز پہلے بھاگوت نے ایک ہندی ماہ نامہ کو ایک مفصل انٹرویو دیتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ "سب سے زیادہ خوش مسلمان ہندوستان کے ہی ہیں"۔ ایک جمہوری ملک کے میڈیا سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کسی بھی دعوے کو شواہد اور دلائل کی روشنی میں تولے گا اور اگر بات حقیقت پر مبنی نہیں ہے تو اس کی تنقید بھی کرے گا، خواہ یہ بات اقتدار پر قابض لوگوں نے ہی کیوں نہ کہی ہو۔ میڈیا کا فرض ہے کہ وہ عوام کو سچ بتلائے۔ مگر زیادہ تر میڈیا ہاؤسز بھاگوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال پوچھنے کی جرات نہیں کر سکے۔ کچھ ہندی کے اخبارات نے تو اُلٹے بھاگوت کے بیان کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا اور کئی سارے مضامین اس کی حمایت میں چھاپے۔ یہ مضامین صحافتی ضابطوں کی کسوٹی پر بھی کھرے نہیں اترتے ہیں۔ نہ صرف مضامین میں کی گئی باتیں غیر مربوط تھیں بلکہ یہ افسانہ زیادہ اور حقیقت کم معلوم ہو رہی تھیں۔ مختصر یہ کہ میڈیا نے بھاگوت کے پروپیگنڈہ کو حقیقت بنا کر پیش کیا اور خود بھگوا ایجنڈے کو پھیلانے میں آگے آیا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ جس وقت بھاگوت نے بیان دیا، اس وقت بھارتی مسلمانوں کے خلاف سوشل میڈیا پر ایک بڑی نفرت انگیز مہم چلائی جا رہی تھی۔ یہ مہم زیورات کی مشہور برانڈ "تنشق" (ٹاٹا گروپ) کے اشتہار سے جڑی تھی۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے والے وہی لوگ تھے جن کے تار کہیں نہ کہیں بھگوا تنظیموں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت سارے لوگ بھاگوت کے مداح ضرور ہوں گے۔ بھگوا عناصر نے ایک نیا فتنہ چھوڑتے ہوئے الزام لگایا کہ "تنشق" کا مذکورہ اشتہار 'ہندو مخالف' ہے کیونکہ اشتہار میں مسلم گھر میں بیاہی گئی عورت کو بطور ہندو دکھایا گیا ہے اور اس طرح کے اشتہار 'لو جہاد' کو فروغ دیتے ہیں۔ 'لو جہاد' کی اصطلاح ہندوتوا تنظیموں نے وضع کی ہے جس کا مقصد مسلمانوں کی شبیہ کو خراب کرنا ہے۔ 'لو جہاد' سے بھگوا تنظیموں کی مراد ایک ایسا پروپیگنڈا ہے جس کے تحت یہ کہا جاتا ہے کہ مسلم مرد، ہندو عورتوں سے محبت کرنے کا ڈرامہ کرتے ہیں اور پھر بڑی چالاکی سے انہیں اپنے محبت کے دام میں پھانس لیتے ہیں۔ مسلم مرد کا اصل مقصد ہندو عورت سے محبت کرنا نہیں بلکہ ان کا مذہب تبدیل کرنا ہے اور اس سے شادی کر کے بچے پیدا کرنا ہے تاکہ مسلمانوں کی آبادی بڑھتی چلی جائے اور ہندو اکثریت سے اقلیت بن جائیں۔

سوشل میڈیا پر ایک ہندوتوا نظریہ کے حامل شخص نے "تنشق" کے اشہار پر ہائے توبہ مچاتے ہوئے لکھا کہ "مجھے ہر جگہ ہندو بہو کیوں نظر آتی ہے، آپ ہر جگہ مسلمان بہو کو کیوں نہیں دکھاتے؟ میرا بس یہی سوال ہے"۔ اُس شخص نے اپنے پوسٹ میں نہ صرف مسلمانوں کے خلاف تعصب کا اظہار کیا، بلکہ "تنشق" کے اشتہار کے بائیکاٹ کا بھی مطالبہ کیا۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ اُس وقت چل رہا تھا، جب موہن بھاگوت نے اپنا بیان دیا تھا۔ "تنشق" جیسی بڑی کمپنی بھی ہندوتوا کے ہنگامہ سے اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ اس نے اپنے اشتہار کو واپس لے لیا۔ اتنا ہی نہیں اس نے اس پر افسوس بھی ظاہر کیا کہ کچھ لوگوں کے جذبات اس اشتہار سے مجروح ہوئے ہیں۔ یہ سب کچھ ہندوتوا طاقتوں کے عروج اور سماج میں بڑھ رہی بالادستی کی علامت ہے۔

تنشق تنازعہ آر ایس ایس کے سربراہ کے دعوے کی قلعی کھول دیتا ہے۔ اگر کسی اشتہار میں ہندو لڑکی کی شادی مسلم گھرانے میں ہونے کے عمل کو برداشت نہیں کیا جا رہا ہے تو پھر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں کوئی مسلم لڑکا کسی ہندو لڑکی سے نکاح کر لے تو ان پر کیا گزرے گی؟

اگر کسی سماج کی سوچ اتنی تنگ ہو جائے کہ وہ ہندو گھر میں مسلم بہو کے امیج کو تو قبول کر لے مگر مسلم گھر میں ہندو بہو پر مشتعل اور متشدد ہو جائے تو وہ سماج کیسے اقلیتوں کے لیے 'جنت' ہو سکتا ہے؟ میڈیا نے ان واجبی سوالات کو اُٹھانے کی ہمت نہیں دکھلائی۔ اگر ٹاٹا گروپ جیسی کارپوریٹ کمپنی کو کوئی اشتہار واپس لینا پڑا، جس میں ہندو بہو کو مسلم گھر میں دکھایا گیا ہے تو کیا یہ سب بھارتی سماج میں جڑ جما چکے تعصب اور نفرت کی طرف اشارہ نہیں کرتا؟ اگر معاشرے میں تعصب اور نفرت ایک حقیقت ہے تو کیسے ہندوستانی مسلمان، دنیا کے دیگر مسلمانوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ خوشی محسوس کر سکتے ہیں؟

یہ بدقسمتی ہے کہ مرکزی دھارے کا میڈیا بھاگوت سے یہ سوال کرنے سے ڈر رہا ہے کہ جب ہندوستان میں مسلمان، دیگر مذہبی گروپوں کے مقابلے، تعلیم اور ملازمت کے شعبے میں سب سے پیچھے ہیں تو وہ کیسے یہاں سب سے زیادہ خوش ہو سکتے ہیں؟ یہی نہیں ان کی نمائندگی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں گرتی چلی جا رہی ہے، سیاسی پارٹیاں ان کو ٹکٹ دینے سے کترا رہی ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو کیسے بھاگوت یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بہتر حالت میں ہندی مسلمان ہیں؟ بھاگوت کی خود کی سیاسی پارٹی بی جے پی خود مسلمانوں کو ٹکت دینے میں سب سے زیادہ پیچھے رہتی ہے اور اگر دیگر سیاسی جماعتوں نے ان کو کچھ سیٹیں دے بھی دیں اور انتخابات میں اُتار ہی دیا، تو الٹے بھگوا پارٹی اس معاملے کو فرقہ ورانہ رنگ دیتی ہے۔ اگر موہن بھاگوت مسلمانوں کے اتنے ہی خیر خواہ ہیں تو وہ کیوں اپنی سیاسی پارٹی سے نہیں پوچھتے کہ اس میں مسلمانوں کو کیوں واجبی نمائندگی نہیں دی گئی ہے؟ جب مسلمان گائے کے ذبیحہ اور 'لو جہاد' کے بہانے حملوں کا شکار ہوتا رہتا ہے، تو بھلا وہ ہندوستان میں کس طرح سب سے زیادہ خوشی محسوس کر سکتا ہے؟ جب ہندوستان کی جیلوں میں مسلمان کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے اور ان میں سے بہت سے افراد کو انسداد دہشت گردی کے قوانین میں بغیر کسی ثبوت کے ملزم قرار دیا گیا ہے تو وہ ہندوستان میں کس طرح سب سے زیادہ خوشی محسوس کر سکتے ہیں؟ جب بھاگوت کی اپنی سیاسی جماعت بی جے پی کسی بھی سیکولر معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کا موقع نہیں گنواتی ہے اور مسلمانوں کے خلاف سیاست کرتی ہے تو کیسے ان منفی پالیسی کو روکے بغیر بھارتی مسلمان خوشی محسوس کر سکتے ہیں؟ مرکزی دھارے میں شامل میڈیا نے ان سوالوں کو اُٹھانے کی جرأت نہیں کی نہ ہی وہ مسلم طبقہ سمیت پسماندہ اور محروم طبقات کی ترجمانی کرنے کے لیے سامنے آیا۔ اس نے حکمران جماعت کے بیانیہ کو آگے بڑھانے اور 'اکثریتی دھارے' کے ساتھ بہنے کو صحیح سمجھا۔ نوٹ کریں کہ بھاگوت کا انٹرویو اصل میں ایک ہندی ماہنامہ 'وویک' میں شائع ہوا۔ بعد میں آر ایس ایس کے ہندی ترجمان 'پانچ جنیہ' (۱۸ اکتوبر ۲۰۲۰) نے اسے دوبارہ چھاپا۔ اس انٹرویو میں بھاگوت نے متعدد ایسی بیانات دیے جو سیکولرازم، اقلیتی حقوق اور تنوع کے آئینی اصولوں کے منافی ہیں۔ وہ بنارس اور متھرا میں مسلم مذہبی مقامات کے خلاف ایودھیا تحریک کی طرز پر، ہندوتوا مہم چلائے جانے کے امکانات کو بھی مسترد نہیں کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کو 'ہندوستھان' (ہندوؤں کی سرزمین) بھی کہا اور سیکولر قوم کی صریح خلاف 'ہندو قوم' پر زور دیا ہے۔ انہوں نے ڈھٹائی سے کہا ہے کہ "ہندوستان کا مطلب ہندو ہے"۔

مسلمان...!

جیلوں میں سب سے زیادہ

بڑھتی ہوئی نفرت کا شکار، ہجومی تشدد کا نشانہ

دلتوں سے بھی زیادہ پسماندہ

تعلیم اور ملازمتوں میں سب سے پیچھے

اسمبلی اور پارلیمنٹ میں مسلم نمائندوں کی تعداد میں مسلسل کمی

کیا پھر بھی بھارتی مسلمان سب سے زیادہ خوش ہیں؟

میڈیا کس طرح زیادہ ہندوتوا بیانیہ کو قبول کرتا جا رہا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ متعدد اخبارات میں مضامین بھاگوت کے بیان کی حمایت میں آئے۔ یہ سارے مضمون ہندی پریس میں پائے گئے۔ ۱۱ اکتوبر کو ہندی روزنامہ 'پنجاب کیسری' (نئی دہلی) کے پہلے صفحہ پر ایک ادارتی مضمون ادیتہ نارائن چوپڑا نے لکھا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ بھاگوت کے بیان سے ہندوستان کی حقیقت جھلکتی ہے۔ ان کے مضمون نے محمد علی جناح کو "غدار" بھی کہا۔ چوپڑا نے کہا کہ جناح کو برطانوی حکومت نے پیدا کیا تھا جس نے متحدہ ہندوستان کو تقسیم کر کے علیحدہ ملک بنایا۔ چوپڑا کے مطابق اگر تقسیم نہ ہوتی تو بہت بڑی تعداد میں مسلمان اپنا مادر وطن نہ گنواتے۔

دو دن بعد اسی اخبار میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے چانسلر فیروز بخت احمد نے ایک مضمون قلم بند کر کے موہن بھاگوت اور آر ایس ایس کی تعریف میں ساری حدیں پار کر دیں۔ ان کے مضمون میں دلائل کم اور ان کی ار ایس ایس کے تیئں وفاداری زیادہ نظر آ رہی تھی۔ ان کا مضمون نہ صرف غیر مربوط تھا بلکہ حقائق سے میلوں دور تھا۔ ذرا ان کے چند جملے ملاحظہ کیجیے: "اگر ہم ۵۶ اسلامی ممالک کی طرف نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ مسلم ملک میں رہ رہا مسلمان خوش نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اگر ہم ان ملکوں کو پر نظر ڈالیں جہاں مسلم اقلیت میں ہے، جیسے چین، فرانس، روس وغیرہ، تو معلوم ہوگا کہ چین میں تو اب نوزائیدہ بچے کے نام محمد یا احمد رکھنے کی پابندی ہے اور لاکھوں مسلمان وہاں 'ڈیٹینشن کیمپوں' میں جہنم والی زندگی گزار رہے ہیں"۔

فیروز بخت احمد نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ "روس میں مسلم شاہین باغ جیسی کوئی مہم سڑک روک کر نہیں کر سکتے اور نہ ہی وہ وہاں کوئی نئی مسجد تعمیر کر سکتے ہیں۔ فرانس میں، مسلمان خواتین کو حجاب پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ پاکستان کی مثال لیجیے جہاں سنی مسلمان شیعہ مسلمانوں کو کاٹ رہا ہے اور شیعہ سنی کو، بلکہ وہاں تو بہت سے مسلک ہیں، جیسے قادیانی، مہدی، احمدیہ، میمن، مہاجر وغیرہ جو ایک دوسرے کا خون پیتے رہتے ہیں اور یہاں تک کہ مسجدوں اور اسکولوں میں بم دھماکے کرتے ہیں"۔

جہاں ایک طرف موہن بھاگوت نے کہا کہ ہندوستان، مسلمانوں کے لیے جنت ہے، وہیں دوسری طرف فیروز بخت احمد یہ ثابت کر رہے تھے کہ ہندوستان سے باہر ساری دنیا مسلمانوں کے لیے جہنم ہے۔ دراصل بھاگوت اور بخت دونوں مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں اور دونوں ہی الگ الگ طریقے سے ایک ہی بات ثابت کر رہے ہیں۔ دونوں جنت اور جہنم کی تمثیل کا سہارا لے کر حقیقت بیانی سے بچ رہے ہیں۔ کچھ مہینوں پہلے جب خلیجی ملکوں میں بھارت میں جاری مسلم مخالف مہم جسے 'اسلاموفوبیا' بھی کہا جاتا ہے، کے خلاف آواز بلند ہو رہی تھی اور ہندوتوا طاقتوں کی غلطی کی وجہ سے ملک کا نام بدنام ہو رہا تھا، تب بھاجپا نے مرکزی اقلیتی وزیر مختار عباس نقوی کو آگے کیا اور ان سے یہ بیان دلوایا کہ بھارت مسلمانوں کے لیے جنت ہے۔ مگر اگلے ہی روز جب اخبارات کے صفحات مسلمانوں کے خون سے لت پت ہو جاتے ہیں تو پھر جنت کی بات کرنے والے حضرات کہیں نظر نہیں آتے۔

کچھ پیراگراف کے بعد بخت احمد اپنی سیاسی وفاداری کو کھل کر بیان کرنے لگے۔ "حزب اختلاف کو شاید یہ نہیں معلوم کہ آر ایس ایس ایک قوم پرست (راشٹر وادی) اور وفادار تنظیم ہے۔ آر ایس ایس کے رہنما جیسے موہن بھاگوت، ڈاکٹر کرشن گوپال، اندریش کمار وغیرہ سائنس کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آر ایس ایس کے کارکنان نے ۱۹۶۲ کے بھارت چین جنگ میں حصہ لیا تھا۔ اس کے نتیجے میں، پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۶۳ کی یوم جمہوریہ تقریب میں آر ایس ایس کے ایک گروپ کو شامل کیا۔ سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بھی آر ایس ایس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ تنظیم محب وطن ہے اور اس کی تقلید کی جانی چاہیے"۔ احمد نے اپنے مضمون میں اس بارے میں کوئی اعداد و شمار نہیں بتائے کہ کیسے ہندی مسلمانوں کی سماجی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی حالت دنیا کے دوسرے حصوں میں بسنے والے مسلمانوں سے بہتر ہے؟ اور نہ ہی انہوں نے ہندوستان میں اقلیتوں کا تقابلی مطالعہ دیگر ممالک میں رہنے والے اقلیتوں سے کیا۔ یہی نہیں ان کا مضمون سیکولر حزب اختلاف کی جماعتوں پر بھی بہت زیادہ برسا۔

اگلے دن اُجوال دنیا (رانچی، ۱۴ اکتوبر) نے دلیپ اگنی ہوتری کا ایک مضمون شائع کیا۔ یہاں بھی انہوں نے بھاگوت کی ساری باتوں کی آنکھ بند کر کے حمایت کر ڈالی۔ "ہمارے یہاں مسلمان اور عیسائی ہیں۔ انہیں تمام حقوق ملے ہوئے ہیں، لیکن پاکستان نے اپنی اقلیتوں کو تمام حقوق نہیں دیے۔ یاد رہے کہ ہندوتوا طاقتوں کی جانب سے پاکستان کی مثالیں اکثر دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان ایک جنت ہے۔ بھگوا عناصر پاکستان میں مقیم ہندو اقلیتوں پر ہو رہے مبینہ حملوں کو ایک بڑا اشو بنا کر پیش کرتے ہیں اور خود ہی سیکولر جماعتوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ ان حملوں پر خاموش رہتے رہتے ہیں کیونکہ متاثر، مسلمان نہیں بلکہ ہندو ہیں۔ بی جے پی اپنی حریف جماعتوں پر یہ بھی الزام لگاتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی منہ بھرائی کرتے ہیں اور ہندوؤں کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہی الزام لگا کر مہاتما گاندھی کا قتل کیا گیا اور اسی جھوٹ کو پھیلا کر آج ہندوتوا طاقتیں اکثریت کی ٹھیکے دار بن بیٹھی ہے۔

تاہم بھگوا طاقتیں دانستہ طور پر اس حقیقت کو نظر انداز کرتی ہیں کہ ہندوستان اور پاکستان میں سیاسی نظام کی نوعیت مختلف ہے اور ہر وقت ان کا موازنہ کرنا درست نہیں ہے۔ اگر یہ قبول بھی کر لیا جائے کہ پاکستان اپنی اقلیتوں کو مساوی حقوق نہیں دیتا ہے تو یہ دلیل نہیں بن سکتی کہ ہندوستان کے اقلیتوں کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے۔ مگر کچھ آئینی ماہرین کا استدلال ہے کہ پاکستان کے سیاسی نظام اور وہاں کی آئین میں بہت ساری توضیحات اچھی ہیں جن کو دوسرے ممالک اپنا سکتے ہیں۔ ان باتوں کو اکثر ہندتوا طاقتیں چھپانا چاہتی ہیں۔ ہندوستان 'جنت' ہے اور باہر 'جہنم' ہے جیسے ڈسکورس چلا کر وہ ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی اور ان کے خلاف جاری ناانصافی کو ڈھانکنا چاہتے ہیں۔

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔ ان کی دلچسپی اقلیتی حقوق اور سماجی انصاف سے وابستہ سوالوں سے ہے۔)

debatingissues@gmail.com

***

پرسنل لا پر پھر فرقہ وارانہ سیاست

ہندو سماج کے اندر بھی بہت زیادہ تنوع ہے، اس لیے ایک طرح کا قانون تھوپنا سب کو قابل قبول نہیں ہوگا

ابھے کمار

یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم نریندر مودی نے جب لال قلعہ سے اپنی تقریر ختم کی، تب عوام کو بڑی مایوسی ہاتھ لگی۔ اپنی تقریر میں، وزیر اعظم نے پرسنل لا کو نشانہ بناتے ہوئے اسے 'کمیونل' پرسنل لا کہا۔ انہوں نے مزید کہا کہ آزادی کے بعد سے بھارت میں کمیونل پرسنل لا نافذ رہا ہے، جو سماج میں بھید بھاؤ اور اونچ نیچ کو بڑھاوا دیتا ہے۔ یہ پرسنل لا مذہب پر مبنی ہے، جو سماج میں دوریاں بڑھاتا ہے۔ انہوں نے سپریم کورٹ کا بھی حوالہ دیا اور کہا کہ عدالت بھی یکساں سول کوڈ کی بات کرتی رہی ہے۔ وزیر اعظم نے کہا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ملک میں ایک 'سیکولر سول کوڈ' بنے، ایسا ہی کچھ خواب آئین ساز لیڈروں نے دیکھا تھا۔

وزیر اعظم کا بیان پوری طرح سے سیاست سے متاثر نظر آیا۔ ان کی تقریر کا لہجہ بی جے پی کے پرچارکوں کی طرح لگا۔ بھگوا عناصر اکثر یہ افواہ پھیلاتے ہیں کہ پرسنل لا کا فائدہ صرف مسلمانوں کو ملتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے تمام مذہبی گروپس کے اپنے اپنے پرسنل لا ہیں۔ مسلمانوں کی طرح، ہندو، عیسائی، پارسی سماج کے اپنے پرسنل لا ہوتے ہیں۔ آدی واسی سماج کے بھی اپنے روایتی قوانین ہوتے ہیں، جنہیں ماننے کے لیے وہ پوری طرح سے آزاد ہیں۔ جب وزیر اعظم نے کہا کہ پرسنل لا کمیونل ہوتا ہے، تو کیا وہ ہندو کوڈ بل کو بھی کمیونل سمجھتے ہیں؟ حالانکہ ان کا نشانہ مسلم پرسنل لا پر تھا۔ پرسنل لا کی بات کرکے وہ اپنے سخت گیر حامیوں کو یہ یقین دہانی کروا رہے تھے کہ ان کی حکومت مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پرسنل لا سے متعلق ایک اور بڑا کنفیوژن یہ ہے کہ ہندو سماج کے لوگ ملک کے آئین سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے تمام قوانین سیکولر ہیں، جبکہ مسلمان شریعت کو ہی مانتے ہیں، مگر سچائی تو یہ ہے کہ ایک ہندو کی طرح مسلمان بھی ملک کے آئین کا احترام کرتا ہے۔

بھارت میں پرسنل لا اور سیکولر لا کی بحث انگریزوں کی آمد سے شروع ہوئی۔ برطانوی حکومت نے بڑی تیزی سے ملک کے قوانین میں تبدیلی کرنی شروع کر دی۔ چونکہ انگریزوں نے بھارت میں ایک جدید ریاست تشکیل دی تھی اور ان کا پہلا مقصد منافع کمانا تھا، اس لیے انہوں نے نکاح، طلاق، میراث جیسے بعض معاملات کو چھوڑ کر باقی امور کے لیے ایک ہی طرح کا قانون سب پر نافذ کیا، جسے سیکولر لا یا یکساں لا کہا جا سکتا ہے۔ یہاں سیکولر لا کو فرقہ واریت کی مخالفت میں سمجھا جانا ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ فرقہ واریت ایک طرح کا منفی سیاسی نظریہ ہے، جو عوام کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے۔ حالانکہ انگریزوں کو یہ بات بھی بخوبی معلوم تھی کہ ہندوستانی عوام عقیدہ اور اپنے رسم و رواج کو لے کر بہت ہی حساس ہیں۔ اس لیے انگریزوں نے تمام مذہبی جماعتوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنے اپنے پرسنل لا کے مطابق زندگی بسر کریں۔ انگریزوں کے زمانے سے ہی عدالت نے بھی پرسنل لا کا احترام کیا ہے۔

وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں کچھ اس طرح کا تاثر دیا گیا گویا سابقہ حکومتوں نے پرسنل لا کو برقرار رکھا اور ملک میں عدم مساوات کا نظام قائم رہا۔ مگر وہ یہ یاد نہیں رکھنا

جب وزیر اعظم نے کہا کہ پرسنل لا کمیونل ہوتا ہے، تو کیا وہ ہندو کوڈ بل کو بھی کمیونل سمجھتے ہیں؟ حالانکہ ان کا نشانہ مسلم پرسنل لا پر تھا۔ پرسنل لا کی بات کرکے وہ اپنے سخت گیر حامیوں کو یہ یقین دہانی کروا رہے تھے کہ ان کی حکومت مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ پرسنل لا سے متعلق ایک اور بڑا کنفیوژن یہ ہے کہ ہندو سماج کے لوگ ملک کے آئین سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے تمام قوانین سیکولر ہیں، جبکہ مسلمان شریعت کو ہی مانتے ہیں۔ مگر سچائی تو یہ ہے کہ ایک ہندو کی طرح مسلمان بھی ملک کے آئین کا احترام کرتا ہے۔

چاہتے کہ تحریک آزادی کے دوران پرسنل لا کا سوال اٹھتا رہا ہے۔ آزادی ملنے سے پہلے کانگریس کے لیڈروں نے مسلم قائدین سے یہ وعدہ کیا تھا کہ آزادی کے بعد بھارت کے مسلمانوں کے پرسنل لا کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے آئین کے بنیادی حقوق میں اقلیتوں کے لیے مذہبی آزادی کے حقوق دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں ثقافتی حقوق بھی دیے گئے ہیں۔ یہ بھی آئین کے بنیادی حقوق کا حصہ ہے۔ مودی نے اپنی تقریر میں کہا کہ آئین ساز لیڈر سیکولر کوڈ چاہتے تھے۔ حالانکہ یہ بات پوری حقیقت نہیں ہے۔ آئین ساز اسمبلی میں کچھ اراکین یکساں سول کوڈ چاہتے ضرور تھے، مگر بہت سارے دیگر اراکین نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے اپنی تقریر میں حکومت کو متنبہ کیا کہ جب عوام کسی قانون کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں، تو حکومت کو کبھی بھی اس طرح کا قانون ان پر نہیں تھوپنا چاہیے۔ اگر ان پر تھوپ دیا گیا، تو جنتا بغاوت کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ یکساں سول کوڈ کو ریاست کے رہنما اصولوں کا حصہ بنا دیا گیا۔ بھگوا عناصر کی طرف سے یہ سننے کو ملتا ہے کہ چونکہ یکساں سول کوڈ ریاست کے رہنما اصولوں کا حصہ ہے، اس پر قانون بننا چاہیے۔ یکساں سول کوڈ کے پیروکاروں سے کوئی پوچھے کہ ریاست کے رہنما اصولوں میں یکساں سول کوڈ کے علاوہ عوام کے معاشی اور سماجی حقوق کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے، جیسے مزدوروں اور خواتین کے حقوق کی بات کہی گئی ہے۔ یہ سیاست نہیں ہے کہ ریاست کے رہنما اصولوں کی تمام باتوں کو فراموش کرکے صرف یکساں سول کوڈ کی بات کی جا رہی ہے، گویا یکساں سول کوڈ کے آجانے سے ملک کی تمام پریشانیاں اور پسماندگی دور ہو جائیں گی؟

ہندتو وادی کے لیڈروں کے خیالات بھی پرسنل لا اور یکساں سول کوڈ پر یکساں نہیں رہے ہیں۔ شاہ بانو کا معاملہ جب ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ملک بھر میں بحث کا موضوع بنا، تو بی جے پی کو یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ اگر اس نے مسلم پرسنل لا بورڈ کو نشانہ بنایا، تو وہ رائے دہندگان کو مذہبی خطوط پر بانٹ سکے گی۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ہندتو لابی ہندو کوڈ بل کے خلاف سڑکوں پر اتری اور اس کی دلیل تھی کی پرسنل لا میں ریاست کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ بعد کے سالوں میں یکساں سول کوڈ کی ضرورت کو خود آر ایس ایس کے سربراہ ایم ایس گولولکر بھی خارج کر چکے تھے۔ ۲۶/ اگست ۱۹۷۲ء کو آر ایس ایس کے انگریزی ترجمان 'آرگنائزر' نے ایم ایس گولولکر سے پوچھا کہ کیا قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے یکساں سول کوڈ ضروری ہے؟ تو انہوں نے کہا 'نہیں'۔ اپنے جواب کی تشریح کرتے ہوئے آر ایس ایس کے سربراہ نے کہا 'ہندوستان میں ہمیشہ لامحدود تنوع رہا ہے، اور پھر بھی، طویل عرصے تک، ہم ایک بہت مضبوط اور متحد قوم تھے۔ اتحاد کے لیے ہمیں ہم آہنگی کی ضرورت ہے، یکسانیت کی نہیں'۔ کچھ ہی سال پہلے ۲۱/ ویں لا کمیشن کی رپورٹ میں بھی یکسانیت کو ترک کیا گیا ہے اور تنوع پر زور دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ سیکولر سول کوڈ اور کچھ نہیں بلکہ یکساں سول کوڈ کی ہی وکالت ہے۔ اس کی مار نہ صرف اقلیتوں پر پڑے گی بلکہ ملک کے آدی واسی سماج کے کلچر اور ان کی زمین پر بھی حملہ ہوگا۔ ہندو سماج کے اندر بھی بہت زیادہ تنوع ہے، اس لیے ایک طرح کا قانون تھوپنا سب کو قابل قبول نہیں ہوگا۔ افسوس کی بات ہے کہ اس سنگین مسئلہ پر دیش کا قائد بھی ووٹ کی سیاست کر رہا ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

کیا مسلم سیاست مسلمانوں کے حق میں ہے؟

مسلمانوں کے نام پر بنی سیاسی پارٹیاں کچھ سیٹیں تو جیت لیتی ہیں، مگر بڑے پیمانہ پر وہ مسلمانوں کا ہی نقصان کرتی ہیں

ابھے کمار

کیا مسلم سیاست مسلمانوں کے مفاد میں ہے؟ کیا ان کو سیکولر طاقتوں سے اپنے رشتہ منقطع کر لینا چاہیے؟ کن مسائل پر مسلم رہنماؤں کو آگے آنا چاہیے؟ ان سوالوں کا جواب آسان نہیں ہے، مگر میں نے اس مضمون میں ایک چھوٹی کوشش کی ہے۔ اگر میری باتوں سے آپ اتفاق نہیں رکھتے، تو آپ اپنی رائے دیجیے۔ میں اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ سب جانتے ہیں کہ ملک میں پالیسی سازی کا کام حکومت کرتی ہے۔ حکومت بنانے کا موقع اس اتحاد یا پارٹی کو ملتا ہے جو واضح اکثریت حاصل کر لیتی ہے۔ جمہوریت میں ووٹ اور نمبر کا بڑا کھیل ہوتا ہے۔ بھارت میں مسلمان اقلیت ہیں اور ان کی تعداد ۱۴ر فیصد کے قریب ہے، وہیں ہندو ۸۰ر فیصد کے آس پاس ہیں۔ تبھی تو ہندو بنام مسلمان کے نام پر کی جا رہی سیاست مسلمانوں کے مفاد کے سراسر خلاف ہے۔ جب بھی مذہب کے نام پر رائے دہندگان کو پولرائز کیا گیا، تو اس کا نقصان مسلمانوں کو ہی ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے نام پر بنی سیاسی پارٹیاں بعض سیٹ تو جیت لیتی ہیں، مگر بڑے پیمانہ پر وہ مسلمانوں کا ہی نقصان کر دیتی ہیں۔

ہندو فرقہ پرست ہمیشہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے سیاسی لیڈر مسلم پارٹی بنا کر سیاست کریں۔ اگر مسلمان مسلم سیاست کریں گے تو ان کا کام بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے ہندوؤں کو ڈرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس طرح تمام روزی اور روٹی کے سوال دب جائیں گے۔ ایسا ہی کچھ پچھلے چند برسوں میں دیکھا گیا ہے، جب نوٹ بندی، کورونا اور بے روزگاری کے باوجود بھی، بھگوا طاقتیں انتخابات جیتنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اس لیے جب تک ہندو بنام مسلم کا ڈسکور بدل نہیں جاتا، تب تک بھگوا فرقہ پرستوں کو ہرانا مشکل ہے۔ اس لیے جو کوئی بھی ہندو بنام مسلم کے نام پر لوگوں کو پولرائز کر رہا ہے وہ جانے انجانے میں بھگوا طاقتوں کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے۔ مگر کچھ لوگ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان نہیں بلکہ غیر مسلم مذہب کی سیاست کر رہے ہیں۔ مسلمان تو صرف اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے ہیں اور اگر وہ مذہب کے نام پر اپنے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ حقوق کے لیے لڑنے اور انصاف کے لیے اتحاد پیدا کرنے سے مسلمانوں کو کوئی نہیں روک رہا ہے، مگر کسی بھی صورت میں نہیں مذہبی سیاست سے خود کو دور رکھنا چاہیے۔ یاد رہے کہ مذہبی سیاست سے بھگوا طاقتوں کا ہی بھلا ہوا۔ اس لیے مسلمانوں کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنی لڑائی کو دیگر محروم طبقات کی لڑائی سے جوڑ کر کام کریں۔ کچھ لوگ یہ بھی سوال کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں نے سیکولر پارٹیوں سے اتنی چوٹ کھائی ہے، تو ان کو اپنی سیاسی جماعت بنانے کے علاوہ اور کیا چارہ ہے؟ یہ بات بھی بہت حد تک صحیح ہے کہ اگر سیکولر پارٹیاں ایماندار ہوتیں، تو مسلمانوں کی اتنی بری حالت نہیں ہوتی۔ وہ آج سماجی، تعلیمی اور اقتصادی طور پر پچھڑے نہ ہوتے۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں ان کی حالت دلتوں سے بھی زیادہ خراب نہ ہوتی۔ اگر ان کے ساتھ سیکولر پارٹیوں نے انصاف کیا ہوتا تو وہ جیلوں میں اپنی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ بند نہ ہوتے۔ وہ دنگوں میں مارے نہیں جاتے۔ وہ ہر روز اپنے ہی ملک میں، جس کے لیے انہوں نے اپنی جان کی قربانی دی ہے، غدار وطن کہہ کر ذلیل نہیں کیے جاتے۔ ان کو اہم

”

مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بھگوا طاقتیں نہ صرف مسلمانوں کی دشمن ہیں، بلکہ وہ آدی واسی، دلت، پچھڑا اور ملک کی جمہوریت کے لیے بھی خطرہ ہیں۔ اس ملک میں ظلم مسلمانوں کے علاوہ دلت اور آدی واسی پر بھی ہو رہے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ محکوموں کے مابین اتحاد پیدا کیا جائے۔ یہ سب کہنا بہت آسان ہے اور کرنا اتنا ہی مشکل۔

عہدوں پر بھیجنے سے پہلے ان کی حب الوطنی کا امتحان نہیں لیا جاتا۔ ان کی نمائندگی سرکاری اداروں سے لے کر قانون ساز اسمبلیوں تک مسلسل نہیں گرتی۔ ان کے نوجوانوں کو یو اے پی اے اور دیگر کالے قانون میں پھنسا کر جیل میں قید نہیں کیا جاتا، وہیں دنگا اور فساد کرنے والوں کو ’دیش بھکت‘ کہہ کر ہیرو نہیں بنایا جاتا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ سیکولر جماعتوں نے مسلمانوں کے ساتھ دھوکہ کیا ہے، مگر اس کا حل مسلم سیاست بالکل بھی نہیں ہے۔

اگر مسلم سیاست ہوگی تو ہندو سیاست اور زیادہ مضبوط ہوگی۔ پریشانی کا حل مظلوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے سے ہوگا۔ مثال کے طور پر کسانوں کے مسائل، خواہ کسان ہندو ہو یا مسلمان، ایک ہی ہوتے ہیں۔ مزدوروں کا استحصال ہندو یا مسلمان نہیں کرتا، بلکہ زمین، فیکٹری اور کمپنی کا مالک کرتا ہے۔ خون چوسنے والا مالک ہندو بھی ہوتا ہے اور مسلمان بھی۔ اسلام بھی ایک مسلم مزدور کو ایک ظالم مسلم مالک کے خلاف لڑنے اور غیر مسلم مظلوم کے ساتھ کھڑے ہونے کی بات کرتا ہے۔ یاد رہے مذہبی معاملہ کسی بھی انسان کا ذاتی معاملہ ہے، مگر کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مذہب کی بنیاد پر ریاست قائم ہونی چاہیے۔ مگر کیا اس کے لیے ملک کے تمام شہری تیار ہیں؟ مجھے نہیں لگتا کہ بھارت جیسے مخلوط سماج میں کبھی بھی ریاست کو کسی ایک مذہب سے جوڑ کر چلایا جا سکتا ہے۔ یہاں تو کامن گراونڈ پر ہی پالیسی بن سکتی ہے۔ یہ کامن گراونڈ سیکولرازم، جمہوریت اور مساوات ہے۔ مطلب یہ کہ ریاست دھرم کے معاملوں میں سب کو پوری آزادی دے اور دنیوی معاملوں میں سب کو برابر حقوق دے گا۔ پورے ملک میں سی اے اے کی مخالفت اس لیے کی گئی کیوں کہ یہ مذہب پر مبنی قانون تھا۔

میرا ماننا ہے کہ ہندو سیاست کی طرح ہی، مسلم سیاست کی بھی مخالف ہونی چاہیے۔ یہ اس لیے کہ جو بھی مسلمانوں کو مذہب کے نام پر ایک ساتھ جمع کرنا چاہتے ہیں، وہ راہ سے بھٹک چکے ہیں۔ سارے مسلمانوں کے مفاد ایک نہیں ہے۔ ان کے اندر میں بھی طبقاتی نظام پایا جاتا ہے۔ ان کے درمیان بھی ذات پات پر مبنی بھید بھاؤ دیکھا جاتا ہے۔ زمیندار، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، کھیت میں کام کرنے والوں کے ساتھ زیادتی سے پیش آتا ہے۔ منڈل کمیشن اور او بی سی ریزرویشن کی مخالفت میں ہندوؤں کے اعلیٰ ذات کے لیڈروں نے قیادت کی تھی، مگر بہت سارے مسلم اعلیٰ ذات کے لیڈر بھی اس میں شامل ہوئے تھے۔ ان کو اس بات کا خیال نہیں رہا کہ منڈل کمیشن ۸۰ر فیصد کے قریب مسلمانوں کو ریزرویشن دے رہا تھا۔ پسماندہ برادری کے مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ ان کے سماج کی اعلیٰ ذاتیں ان کے ساتھ غیر مساوی سلوک کرتی ہیں۔ شادی اور نکاح کے وقت ذات برادری اور مسلک کا اکثر اوقات دھیان رکھا جاتا ہے، جو غیر آئینی اور غیر اسلامی بھی ہے۔ اس لیے میری یہ تجویز ہے کہ مسلم سیاستدانوں کو صرف مسلمانوں کی بات کرنے سے خود کو روکنا چاہیے۔ ان کو ایک ہی آواز میں دلت، آدی واسی، پچھڑے کی بھی بات کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہونے لگا تو یقین مانیے بھگوا طاقتوں کی آدھی طاقت ختم ہو جائے گی۔ یاد رکھیے ایک وقت تک جامع مسجد کے شاہی امام کو میڈیا کی مدد سے مسلمانوں کا قائد بنا کر پیش کیا گیا۔ آج شاہی امام کی جگہ کسی اور نے لے لی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پچھڑوں اور محکوموں کا اتحاد بنے۔ دلت، پچھڑا، آدی واسی، مزدور، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک پلیٹ فارم پر آئیں۔ مسلمانوں کو یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بھگوا طاقتیں نہ صرف مسلمانوں کی دشمن ہیں، بلکہ وہ آدی واسی، دلت، پچھڑا اور ملک کی جمہوریت کے لیے بھی خطرہ ہیں۔ اس ملک میں ظلم مسلمانوں کے علاوہ دلت اور آدی واسی پر بھی ہو رہے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ محکوموں کے مابین اتحاد پیدا کیا جائے۔ یہ سب کہنا بہت آسان ہے اور کرنا اتنا ہی مشکل۔ یہ اس لیے کہ محروم طبقات کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ مگر دنیا محکوموں، مظلوموں اور مزدوروں کے اتحاد سے ہی بدلی ہے اور آگے بھی بدلے گی۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

کیا مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے؟

سرکار بھی جانتی ہے کہ آبادی کنٹرول کرنے کے لیے قانون بنانے سے بہت سارے مسائل کھڑے ہوں گے تو پھر کیوں وہ ایسے فتنہ کے نفاذ پر بضد ہے؟

ابھے کمار

بعض اوقات آپ نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہو گا کہ ملک میں مسلمانوں کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ کر چپ نہیں ہو جاتے، بلکہ اسے ہندو سماج اور ملک کے خلاف ایک بڑی سازش کے طور پر دیکھتے ہیں۔ فرقہ پرست اکثر یہ کہتے ہیں کہ مسلمان چار چار شادیاں کر کے درجنوں بچے پیدا کرتے ہیں۔ ایسا کر کے وہ ملک کے وسائل پر بڑا بوجھ ڈال رہے ہیں۔ فرقہ وارانہ بیانات کھلے طور سے دے رہے ہیں، مسلمان زیادہ بچے پیدا کر کے ملک کی ڈیموگرافی بدلنا چاہتے ہیں۔ وہ خود ملک کی اکثریت بن کر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ملک کے جس حصوں میں ہندوؤں کی آبادی کم ہوئی ہے، وہ حصہ کمزور ہوا ہے اور وہاں ملک مخالف طاقتیں سرگرم ہوئی ہیں۔ ایسی افواہ پھیلا کر فرقہ پرست طاقتیں ہندوؤں کو ڈراتی ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ہندو اپنے ہی ملک میں اقلیت میں ہو جائیں گے۔ پھر ہندوؤں کو یہ بھی مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچہ پیدا کریں۔ فرقہ پرست طاقتیں سرکار سے مطالبہ کرتی رہی ہیں کہ وہ قانون بنا کر مسلمانوں کو زیادہ بچہ پیدا کرنے سے روکیں۔

جس وقت میں یہ مضمون لکھ رہا تھا، تب ہریانہ سے خبر آئی کہ ہندو فرقہ پرست تنظیم کرنی سینا کے قومی صدر نے ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی آبادی کو کنٹرل کرنے کے لیے قانون لائے۔ مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرتے ہوئے کہا کہ ہم دو ہمارے دو، مگر ان کے دس دس اور بارہ بارہ کیوں؟ اس سے قبل، اتر پردیش کی ریاستی حکومت آبادی کنٹرول کرنے سے متعلق ایک قانون لانا چاہتی ہے۔ ابھی حال کے دنوں میں ملک میں یکساں سول کوڈ لانے کی بحث بھی چھڑی ہوئی ہے۔ فرقہ پرست عناصر یہ بار بار کہہ رہے ہیں کہ یونیفارم سول کوڈ آ جانے سے مسلمانوں کو زیادہ بچہ پیدا کرنے سے روکا جا سکتا ہے اور اس طرح ملک کی ڈیموگرافی بگڑنے سے روک لی جائے گی۔

جہاں بھگوا حکومت پاپولیشن کنٹرول سے متعلق بل لانے کی بات کر رہی ہے، وہیں اس کی مخالفت ہندو شدت پسند تنظیمیں کر رہی ہیں۔ وشو ہندو پریشد نے اتر پردیش سرکار کے ذریعہ مجوزہ آبادی بل کی تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے مختلف کمیونٹی کے مابین آبادی کے تناسب میں مزید بگاڑ پیدا ہوگا۔

سرکار بھی جانتی ہے کہ پاپولیشن بل کو قانون بنانے سے بہت سارے مسائل کھڑے ہوں گے۔ مگر پھر بھی ایسے فتنہ کو لا کر بھگوا حکومت سماج میں کشیدگی پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ لوگوں کو مزید دھرم اور مذہب کے نام پر بانٹنا چاہتی ہے۔ اس کا مقصد اکثریت کے دلوں میں اقلیتوں کے خلاف خوف اور نفرت پھر دینا ہے۔ ایسا کر کے وہ روزی، روٹی اور مکان کے سوالات کو دبا کر رکھنا چاہتی ہے۔ جب ملک میں پاپولیشن کنٹرول کی بات مین اسٹریم کا قومی میڈیا کر رہا تھا، اسی وقت یہ خبر آئی کہ ملک میں بے روزگاری کی شرح گزشتہ ہفتہ کے مقابلہ میں ۱۔۱۶ فیصد بڑھ کر ۔۱۴ فیصد ہو گئی ہے۔ دراصل ملک میں بے روزگاری سب سے بڑا مسئلہ ہے، مگر بڑھتی آبادی کو بڑا دیو بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ نوجوانوں کے پاس نوکری نہیں ہے اور جن لوگوں کی نوکری ہے، ان میں بہت لوگوں کی سیلری کاٹ لی گئی ہے یا ان کی تنخواہ وقت پر نہیں آ رہی ہے۔ جے این یو جیسی ملک کی

> اگر فرقہ پرست یہ افواہ پھیلا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے اور وہ ملک کے لیے خطرہ بن رہے ہیں، تو سیکولر طاقتوں کا جواب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان تو بچہ پیدا کریں گے اور ایسا کرنے سے انہیں کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ ایسا جواب دینے اور ان کے ساتھ کیچڑ اچھالنے میں کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔

معروف یونیورسٹی میں کام کر رہے صفائی ملازمین کو تنخواہیں نہیں مل رہی ہے۔ ان میں سے ایک نے مجھے کل فون کر کے کہا کہ وہ اپنا موبائل بیچنا چاہتے ہیں کیوں کہ ان کے پاس اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے پیسہ نہیں ہے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بھگوا حکومت صرف مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس کی سیاسی مہم، پہلی نظر میں مسلم مخالف دکھتی ہے۔ مگر ہمیں چیزوں کو وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ پوری کوشش ہونی چاہیے کہ ایشوز کو ہندو بنام مسلمان کے زاویہ سے نہ دیکھا جائے۔ اگر فرقہ پرست یہ افواہ پھیلا رہے ہیں کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے اور وہ ملک کے لیے خطرہ بن رہے ہیں، تو سیکولر طاقتوں کا جواب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ مسلمان تو بچہ پیدا کریں گے اور ایسا کرنے سے انہیں کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ ایسا جواب دینے اور ان کے ساتھ کیچڑ اچھالنے میں کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔

نامور صحافی، ماہر اسلامیات اور دہلی اقلیتی کمیشن کے سابق چیرمین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان سے سیکولر طاقتوں کو سیکھنا چاہیے۔ کچھ دن پہلے جب ان سے میں نے یہی سوال کیا، تو انہوں نے ایک دلچسپ بات کہی کہ کچھ وقت پہلے انہوں نے ٹویٹ کر کے کہا تھا کہ جو کوئی چار شادی کرنے والے کسی مسلمان کے بارے میں بتا دے گا، تو وہ انہیں دس ہزار روپیہ انعام کے طور پر دیں گے۔ انہوں نے بتایا کہ آج تک کوئی ان کے پاس نہیں آیا اور نہ ہی کسی نے بتایا کہ ملک میں کون ایسا مسلمان مرد ہے جس کی چار شادیاں ہوئی ہیں۔ اس موضوع پر سابق الیکشن کمیشن ایس وائی قریشی نے حال کے دنوں میں ایک بڑی اہم کتاب لکھی ہے، جس کا نام ہے 'دی پاپولیشن میتھ' اس کتاب میں انہوں نے معتبر اعداد و شمار کا استعال کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ بڑھتی ہوئی مسلمانوں کی آبادی اور اس سے مربوط تمام ڈراؤنے خدشات حقائق سے میلوں دور ہیں۔ انہوں نے اس بات کو قبول کیا ہے کہ سال ۱۹۵۱ میں مسلمانوں کی شرح آبادی ۱۰ فیصد کے قریب تھی، جو سال ۲۰۱۴ میں بڑھ کر ۱۴ فیصد کے قریب ہو گئی ہے۔ وہیں ہندوؤں کی شرح آبادی تب ۸۴ فی صد تھی جواب کم ہو کر ۸۰ فیصد کے پاس آ گئی ہے۔ مگر یہ بات بھی اتنی ہی صحیح ہے کہ مسلمان بڑی تیزی سے فیملی پلاننگ بھی اپنا رہے ہیں۔

قریشی صاحب نے اپنی کتاب میں یہ بھی دکھلایا کہ آبادی بڑھنے کا رشتہ دھرم اور مذہب سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے تار شرح خواندگی، آمدنی، صحت عامہ سے جڑی ہوئی سہولیت کی دستیابی اور دیگر چیزوں سے ہیں۔ آبادی کا رشتہ ریجنل فیکٹر سے بھی ہے۔ مثال کے طور پر اگر آپ کشمیر یا شمالی ہند کو لے لیں تو وہاں آبادی جنوبی ریاستوں کے مقابلہ میں کافی سست رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔ اگر قرآن کی بات بھی کریں، تو وہاں اسٹیر لائزیشن ضرور ممنوع قرار دیا گیا ہے، مگر فیملی پلاننگ کی دیگر پالیسی کو اپنانے سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دو بچوں کے بیچ میں ایک اچھا گیپ رکھنے پر بھی زور دیا گیا ہے۔ مسلم آبادی والے ملکوں میں بھی فیملی پلاننگ اپنائی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک ہزار مرد کے مقابلے میں صرف ۹۲۴ خواتین ہیں، تو ایک مسلمان چار شادی کیسے کر سکتا ہے؟ یہ بھی بات سچ ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کا چلن آدی واسی، بدھ، جین، ہندوؤں میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہے اور یہ بات ۱۹۷۴ کی ایک سرکاری رپورٹ میں درج ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ مسلمانوں میں آبادی کا گروتھ ریٹ گزشتہ دہائیوں سے کافی کم ہوا ہے۔ جہاں سال ۲۰۰۱ میں یہ ۲۹ فیصد تھا وہ سال ۲۰۱۱ میں گھٹ کر ۲۴ فیصد ہو گیا۔ اور امید ہے کہ آنے والے دنوں میں ہندو اور مسلمانوں کی آبادی کا گروتھ ریٹ برابر ہو جائے گا اور پھر آبادی بڑھنے کی شرح میں ایک استحکام پیدا ہو جائے گا۔ ضرورت اس بات کہ ہے کہ فیکٹ سے بات کیا جائے اور اور جذبات کی رو میں نہ جائے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

نجیب کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں؟

نجیب کے لیے انصاف کا مطالبہ کرنا بھارت کے ہر شہری کا فرض ہے

ابھے کمار

پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا اور میں جے این یو کے پیریار ہاسٹل میں دوستوں سے گفتگو کر رہا تھا۔ پھر اچانک باہر شور سونائی دیا۔ جب ہم سب باہر نکلے، تو دیکھا کہ ایک جلوس جے این یو کے نارتھ گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ مظاہرین بھگوا فرقہ پرست طاقتوں سے وابستہ ایک طلبہ تنظیم کے کارکنان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ وہ جے این یو انتظامیہ مردہ باد جیسے سلوگن بھی دے رہے تھے۔ شروع شروع میں بہت کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر مظاہرین کے غصے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگ گیا تھا کہ معاملہ بہت سنگین ہے اور کچھ برا ہو چکا ہے۔

اس جلوس میں ہم سب بھی شریک ہو چلے۔ کچھ ہی دیر بعد، ہمارا خدشہ سچ ثابت ہونے لگا۔ جب جلوس نارتھ گیٹ پر پہنچا، تو نعرہ بازی اور تیز ہو گئی۔ پھر طلبہ لیڈروں نے تقریر کرنی شروع کی۔ وہاں موجود گارڈز پہلے ہی مین گیٹ کو بند کر چکے تھے۔ تقریر سُن کر معلوم ہوا کہ نجیب احمد نام کا ایک لڑکا کچھ ہی مہینے پہلے جے این یو میں داخلہ پایا تھا۔ اس کا داخلہ ایم ایس سی میں ہوا تھا۔ کچھ ہی روز پہلے اس نے ماہی مانڈوی ہوسٹل میں رہنا شروع کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے جامعہ ملیہ اسلامیہ واقع اپنے رشتہ دار کے گھر سے جے این یو آنا جانا کرتا تھا۔

مگر ۱۴ اور ۱۵ کتوبر ۲۰۱۶ کی رات نجیب کے لیے بڑی سیاہ گزری۔ نجیب کے ہاسٹل میں ہی رہنے والا ایک طالب علم نے نارتھ گیٹ پر اپنی بات رکھتے ہوئے بتایا کہ مذکورہ رات کو بھگوا فرقہ پرست تنظیموں سے منسلک طلبہ نجیب کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے پہلے تو نجیب کو ڈرایا۔ پھر اس کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ پھر نجیب کو بری طرح سے مارا اور پیٹا۔ تشویش کی بات یہ بھی ہے کہ یہ سب کچھ کسی سنسان جگہ پر پیش نہیں آیا، بلکہ ملک کی ایک بڑی معزز قومی یونیورسیٹی میں ہوا۔ عینی شاہدین کے مطابق، جب ہجومی تشدد کی زد میں نجیب چیخ رہا تھا، تب پاس میں کھڑے ہاسٹل کے گارڈز اپنے کانوں میں روئی ڈالے بیٹھے تھے۔

یہ سب جان کر ہم سب کو بڑا تعجب ہوا۔ اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کیسے یہ سب کچھ جے این میں ہوا؟ اپنے گھر کے بعد اگر جے این یو کا طلبہ کسی دوسری جگہ سکون پاتا ہے تو وہ آراوالی کی پہاڑی ہی ہے، کیونکہ جے این یو کا ماحول ملک کی دیگر درس گاہوں کے مقابلہ میں کافی اچھا ہے۔ جے این یو کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں ہندوستان کے تمام علاقوں کے طلبہ اور طالبات پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ اصل معنوں میں یہ بھارت کی تکثیریت پر مبنی معاشرہ کی ایک بہتر تصویر ہے۔ یہ کہنے کی بات نہیں ہے کہ جے این یو میں سب لوگ، خاص کر لڑکیاں، بہت ہی زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات ہمیں یقین نہیں ہو رہی تھی کہ کیسے نجیب کے اوپر حملے ہو سکتے ہیں، جب یونیورسٹی کے اندر سینکڑوں کی تعداد میں گارڈ ہر وقت تعینات رہتے ہیں۔ اتنی سیکورٹی کے بیچ اس طرح کی کارروائی کیسے پیش آسکتی ہے؟ اگر جے این یو میں طلبہ محفوظ نہیں ہے، تو وہ اور کہاں ہوں گے؟

نارتھ گیٹ کے احتجاج کے کچھ گھنٹوں بعد مظاہرین طلبہ اپنے اپنے ہاسٹل واپس لوٹ آئیں۔ اس کے بعد بھی نجیب کو انصاف دلانے کے لیے جے این یو کے اندر اور باہر بہت سارے اور بھی احتجاج منعقد ہوئے۔ نجیب کی ماں اور ان کے گھر والوں نے بھی جے این یو انتظامیہ سے ملاقات کی اور نجیب کو ڈھونڈ نکالنے اور اس کے حملہ آوروں کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کی اپیل کی۔ مگر جے این یو انتظامیہ بے حس بنا رہا۔ وہ کل بھی بے حس تھا اور آج بھی بے حس ہے۔ ان دنوں نجیب کی ماں فاطمہ نفیس جے این یو کے وی سی سے ملاقات کی۔ مگر وی سی کا ردعمل مردہ لاش کی طرح رہا۔ فاطمہ نفیس کے بہتے ہوئے آنسو کو دیکھ کر کوئی بھی انسان کا دل رو پڑے گا۔ مگر وی سی محترم کی باگپور کی ایسی تربیت تھی کہ ان کے اوپر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ بعد میں اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے نجیب کی ماں نے بتایا کہ وی سی صاحب ان کی باتوں کو سنتے ہوئے بت کی طرح غیر حساس دکھے۔

ہر روز کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی نجیب غیر برابری اور طبقات نظام پر مبنی اس سماج میں ظلم وزیادتی کا شکار ہو رہا ہے۔ ان کی پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ محروم طبقات کے دلوں میں یہ سب دیکھ کر غم اور غصہ بڑھ رہا ہے کہ جب ان کے سماج کے لوگوں کو مارا پیٹا جاتا ہے، تو پولیس ان کو بچانے کے لیے اکثر نہیں آتی۔ جب ان کے گھروں کی بہن، بیٹی اور ماں کی عزت پر حملہ ہوتا ہے، تو پریس اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ جب کوئی پسماندہ مسلم سماج سے نجیب جیسا ذہین اور محنتی لڑکا جے این یو کا داخلہ امتحان پاس کر کے کیمپس میں آتا ہے، تو اسے ایک سمیسٹر بھی پورا نہیں کرنے دیا جاتا ہے۔ اس کی پٹائی کی جاتی ہے اور پھر اسے غائب بھی کر دیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی میں پڑھنے والے تمام بچے، وی سی کے لیے اپنے بچے کی طرح ہوتے ہیں۔ کسی بھی وی سی کا یہ پہلا فریضہ ہے کہ وہ اپنے سارے بچوں کو ہر حال میں سیکورٹی مہیا کرائے مگر جے این یو وی سی آج بھی نجیب کے کیس میں خاموشی لگائے ہوئے ہیں۔ گزشتہ دنوں جب نجیب کو انصاف دلانے کے لیے جے این یو میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا تو اس میں جے این یو انتظامیہ اور نجیب کے شعبہ کے پروفیسر اور اسٹاف بھی شریک نہیں ہوئے۔ روز اوّل سے آج تک پولیس، کرائم برانچ، جے این یو انتظامیہ، حکومت اور عدلیہ بھی نجیب کے معاملہ میں حساس نہیں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جے این یو اور ملک کی دیگر یونیورسٹی کے بچوں، بالخصوص جن کا تعلق دلت، آدیواسی، پسماندہ اور اقلیت سماج سے ہے، کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ اس ملک میں قانون کی کتابوں میں سب برابر ہیں، مگر زمینی حقیقت کچھ اور ہے۔

اب لوگوں میں سسٹم کے تئیں اعتماد کم ہو رہا ہے۔ ان کو یہ بات کھٹکنے لگی ہے کہ ارباب اقتدار کی نظروں میں، محروم طبقات میں جنم لینے والے لوگوں کی جان کی قیمت اعلیٰ ذاتوں میں پیدا ہونے والے لوگوں کے مقابلہ میں بہت ہی سستی ہے۔ مزید دکھ کی بات یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محروم طبقات کے خلاف ناانصافی کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ ہر روز کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی نجیب غیر برابری اور طبقات نظام پر مبنی اس سماج میں ظلم وزیادتی کا شکار ہو رہا ہے۔ ان کی پکار سننے والا کوئی نہیں ہے۔ محروم طبقات کے دلوں میں یہ سب دیکھ کر غم وغصہ بڑھ رہا ہے کہ جب ان کے سماج کے لوگوں کو مارا پیٹا جاتا ہے، تو پولیس ان کو بچانے کے لیے اکثر نہیں آتی۔ جب ان کے گھروں کی بہن، بیٹی اور ماں کی عزت پر حملہ ہوتا ہے، تو پریس اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ جب کوئی پسماندہ مسلم سماج سے نجیب جیسا ذہین اور محنتی لڑکا جے این یو کا داخلہ امتحان پاس کر کے کیمپس میں آتا ہے، تو اسے ایک سمیسٹر بھی پورا نہیں کرنے دیا جاتا ہے۔ اس کی پٹائی کی جاتی ہے اور پھر اسے غائب بھی کر دیا جاتا ہے۔

ذرا سوچیے اگر نجیب کی جگہ کوئی نریش نام کا طالب علم ہوتا، اور اس کے اوپر جے این یو کی جگہ اے ایم یو میں اس طرح کا حادثہ پیش آتا، تو اب تک یہ معاملہ پولیس، کرائم برانچ، سی بی آئی، وزارت داخلہ سے ہوتے ہوئے پی ایم او تک پہنچ جاتا۔ سرکار بڑے فخر سے اس بات کا پرچار کرتی ہے کہ وہ بیرون ملک میں پھنسے ہندوستانیوں کو صحیح سلامت ملک واپس لاتی ہے، مگر نجیب کی ماں اپنے بیٹے کے پانے کے لیے گہار لگا رہی تھی، تب اس کی آواز سرکار نے نظر انداز کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کا رویہ ملک کے دلت، آدی واسی، پچھڑا، مسلمان اور دیگر اقلیتوں کے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے؟ سوال یہ بھی ہے کہ جس ملک کی پولیس ایک گھنٹہ کے اندر گرفتار شدہ کسی مسلم نوجوان کے بارے میں ساری جانکاری حاصل کر لیتی ہے، اسے ملک کی ایک بڑی اور معروف یونیورسٹی سے غائب کیے گئے ایک طالب علم کے بارے میں کیوں کچھ بھی جانکاری نہیں مل پاتی ہے؟ سوال یہ بھی ہے کہ نجیب کے نام کو نام نہاد مسلم دہشت گردی سے جوڑ کر میڈیا کس سیاسی جماعت کے لیے زمین تیار کر رہی ہے؟

یہ سارے سوالات نہ صرف نجیب سے جڑے ہوئے ہیں، بلکہ ان کے روابط ملک کی جمہوریت، سیکولرازم، سماجی انصاف اور ہم آہنگی سے بھی ہیں۔ اس لیے نجیب کے لیے انصاف کا مطالبہ کرنا بھارت کے ہر شہری کا فریضہ ہے کیونکہ نفرت کے خونخوار بھیڑیے آج دلتوں، پسماندہ ذاتوں، آدی واسیوں اور اقلیتوں کا خون پی رہے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب ناانصافی کی آہ اعلیٰ ذات کے لوگوں کو سوچنے پر مجبور کر دے گی۔ اس لیے نجیب کی لڑائی کو ہم نہیں بھول سکتے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

حقوق انسانی

گمشدگی کے 365+ دن، میرا بچہ کہاں ہے ؟

ابھے کمار 13/10/2017

ہر لمحہ میں اس کا انتظار کرتی ہوں۔ کوئی رات ایسی نہیں گزرتی ہے جب میں اس کے لئے ایکسٹرا دعا نہ کرتی ہوں : نجیب کی ماں

نجیب کی ماں فاطمہ نفیس کبھی بستر پر لیٹ جاتی اور کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ ان کی زبان سے لفظ اور آنکھوں سے آنسو ساتھ ساتھ نکل رہے تھے۔ پاس میں رکھی کرسی پر بیٹھا میں سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ "مجھے پوری امید ہے کہ میرا بچہ سیف (صحیح سلامت) ہے۔ مگر کوئی یہ نہیں بتاتا وہ کہاں ہے۔ " نجیب کی ماں اچانک بول پڑی۔

نجیب کہاں ہے؟ اس سوال کا جواب نجیب کی ماں گزشتہ ایک سال سے تلاش رہی ہیں۔ سال گزر گیا مگر ان کے سوال کا نہ تو جواب ہی ملا اور نہ ان کے حالات ہی بدلے۔

گزشتہ سال 14 اکتوبر کی رات، سنگھی نظریہ سے جڑے ہوئے کئی سارے طالب علموں نے مل کر نجیب کی پٹائی کی تھی۔ پٹائی اتنی زور کی تھی کہ نجیب کی ناک اور کان سے خون نکل آیا۔ اگلے دن سے نجیب اپنے ہاسٹل سے غائب ہو گئے جو آج تک غائب ہیں۔ نجیب کو جے این یو میں داخلہ لئے ہوئے چند مہینے ہی ہوئے تھے جب یہ واردات پیش آئی۔ سنگھیوں نے خوب افواہ پھیلایا کہ نجیب کی پٹائی اس لئے ہوئی تھی کہ اس نے کچھ ہندو لڑکوں کو ان کی مذہبی جذبات کے خلاف کچھ کہا تھا۔ حالانکہ اس کی پٹائی کے پس پردہ حملہ آوروں کا اصل مقصد فرقہ وارانہ کشیدگی کو بڑھانا تھا اور یونیورسٹی کے اندر نگرانی بڑھانے کے لئے ماحول تیار کرنا تھا۔

نجیب کی ماں کا سوال سن کر میں کچھ دیر کے لئے خاموش رہا پھر وہ مجھ سے ہی پوچھ بیٹھی۔ "تم کو میں اپنے بیٹے کی طرح مانتی ہوں بتاؤ نجیب کہاں ہے؟ "میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا مگر میں نے اتنا ضرور کہا کہ " نجیب آج نہیں تو کل ضرور واپس آئے گا "

پچھلے دنوں میری ملاقات نجیب کی 48 سالہ ماں سے ہیومن رائٹس لا نیٹورک کی دلّی آفس میں ہوئی۔ سپریم کورٹ کے مشہور وکیل اور ہائی کورٹ میں نجیب کا مقدمہ لڑ رہے کالن گونسالوس کی رہنمائی میں یہ آفس چلتا ہے جہاں مظلوموں کو قانونی مدد دی جاتی ہے۔ گزشتہ کچھ مہینوں سے جب بھی نجیب کی ماں دلّی آتی ہیں۔ وہ اسی آفس میں ٹھہرنا پسند کرتی ہیں، کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ ان کے دلّی کے رشتہ دار ان سے اور زیادہ "پریشان "ہوں۔ اصل میں ان رشتہ داروں کو نجیب کی

ماں سے کم اور پولس سے زیادہ پریشانی جھیلنی پڑتی ہے۔پولس نجیب کی ماں کو ٹھکانہ دینے والے لوگوں کو طرح طرح سے پریشان کرتی ہے۔

نجیب کی ماں کی دہلی آمد اس بار کورٹ کچہری کے لئے نہیں بلکہ ایمس میں علاج کے غرض سے تھی۔ ان کے ساتھ ان کا تیسرا اور سب سے چھوٹا بیٹا حسیب احمد بھی تھا۔ لال ٹی شرٹ اور بلیو جینس پہنے 22 سالہ حسیب بریلی میں سول انجینئرنگ کی پڑھائی پوری کر رہا ہے۔ چونکہ نجیب کی ماں کو اگلے روز اپنے شہر بدایوں لوٹنا تھا، میں ان سے ملنے جے این یو سے فٹافٹ نکل پڑا۔ راستے میں زبردست ٹریفک جام تھا کیونکہ پاس کے جواہرلال نہرو اسٹیڈیم میں فیفا ورلڈ کپ فٹبال (انڈر 17) کا میچ چل رہا تھا۔گھنٹے بھر جام میں پھنسنے کے بعد، آخر کار دیر شام میں آفس پہنچا۔ آفس کے چوتھی منزل پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں نجیب کی ماں اور حسیب میگی کھا رہے تھے۔ میگی اس لئے کہ ڈاکٹر نے نجیب کی ماں کو "سخت" کھانا کھانے سے منع کیا ہے۔

جیسے ہی میں ان سے ملا اور ان کو سلام عرض کیا نجیب کی ماں نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور حسیب کو میرے لئے میگی بنانے کو کہا۔ نجیب کی ماں سے میری جان پہچان بھی ایک سال پرانی ہے۔ ہماری ملاقات اکثر مظاہرہ اور دھرنے میں ہوتی ہے۔

بستر پر بیٹھی نجیب کی ماں میگی کھا رہی ہے۔ اکثر وہ سلوار اور کرتی میں نظر آتی ہیں اور جب وہ بات کرتی ہیں تو ان کے کان کی بڑی بالی ہلتی ڈولتی رہتی ہے۔ میری ان سے ملاقات کئی مہینے بعد ہوئی۔ اس بار بھی میں نے ان کو پہلے کی ہی طرح پر امید پایا۔ اپنے بیٹے کے ڈھونڈ پانے کا ان کا عزم آج بھی بلند ہے۔ سال بھر کی بھاگ دوڑ، کورٹ کچہری کا چکر اور کئی طرح کی پریشانیوں نے ان کو کسی بھی طرح سے کمزور نہیں کیا ہے۔ "نجیب ایک دن ضرور واپس آئے گا اور صحیح سلامت آئے گا"۔

مگر بیچ۔بیچ میں وہ اپنی سسکی روک نہیں پائی، ماں کا دل جو ٹھہرا۔ "ہر پل میں دروازہ پر دیکھتی رہتی ہوں کہ کب نجیب دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ ہر لمحہ میں اس کا انتظار کرتی ہوں۔ کوئی رات ایسی نہیں گزرتی ہے جب میں اس کے لئے ایکسٹرا دعا نہ کرتی ہوں۔"

ان کی یہ سسکی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ پولیس اور حکومت کس قدر غیر حساس ہو گئی ہے کہ "معمولی انسان کی سنتی ہی نہیں ہے۔ اگر نجیب کسی وزیر کا بیٹا ہوتا تو پولیس اس کو دو دن کے اندر کھوج لیتی۔"

دو دن کی کون کہے گزشتہ ایک سال میں پولیس، کرائم برانچ، خفیہ ایجنسی اور ہندوستان کی سب سے بڑی جانچ ایجنسی سی بی آئی بھی نجیب کے ڈھونڈنے میں پوری "ناکارہ" ثابت ہوئی ہے۔پولیس کی لاپروائی کا عالم یہ ہے کہ نام نہاد حملہ آوروں کے ساتھ اس نے حراستی پوچھ تاچھ بھی نہیں کیا ہے۔ دوسری ناامیدی یہ ہے کہ نجیب کیس کی جانچ کر رہی سی بی آئی تازہ ایف آئی آر درج کرنے کے بجائے پرانے ایف ائی آر کو ہی پھر سے درج کیا ہے۔

"آپ کو لگتا ہے کہ کچھ ہوا ہے؟" نجیب کی ماں نے مجھ سے پوچھا۔ پھر انہوں نے اپنے ہی سوال کا جواب بھی دیا۔ " کچھ نہیں ہوا ہے۔ جو بات پہلے دن سنی تھی وہی آج بھی سن رہی ہوں۔ اتنا ناکارہ پولیس ہے "بات چیت کے دوران انہوں نے وزیر خارجہ اور بی جے پی کی بڑی رہنما سشما سوراج کا بھی ذکر کیا۔ "سنا ہے کہ سشما سوراج غیرملکوں میں لوگوں کو بچاتی ہیں۔ مگر جب ملک میں ہی کوئی غائب ہو جائے تو وہ کیوں نہیں کچھ کرتی ہیں۔ "ان کو مایوسی اس بات سے بھی ہے کہ سشما سوراج کو نجیب سے متعلق ٹوئٹ بھی کروایا گیا مگر انہوں نے کبھی اس کا جواب نہیں دیا اور نہ ہی کبھی نجیب کی خیریت ہی جاننی چاہی۔

سشما سوراج کی خاموشی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نجیب کے نام نہاد حملہ آوروں کے تار بھگوا تنظیم سے جڑے ہونے کا شک ہے۔ جب جے این یو انتظامیہ، پولیس اور حکومت نجیب کے نام نہاد حملہ آوروں کو بچانے کے لئے ہر طرح کے ہتھکنڈے اپنانے سے باز نہیں آرہے ہوں تو بھلا سشما سوراج ان کے خلاف کیسے جا سکتی ہیں۔

اسی دوران ان کا دوسرا بیٹا مجیب احمد کا فون آیا۔ جب فون پر نجیب کی ماں بات کرنے لگی تبھی حسیب میرے لئے گرما گرم میگی بنا کر لایا اور پھر وہ بستر پر بیٹھ کر دیوار سے لیٹ گیا اور موبائل پر کچھ دیکھنے لگا۔

" اب تو اللہ کی ذات پر ہی یقین ہے۔ "نجیب کی ماں نے فون کاٹنے کے فوراً بعد میری طرح مڑی۔ آگے انہوں نے بتایا کہ نجیب کی تلاش میں انہوں نے وہ بھی پیسے خرچ کر دئے جو وہ اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی کے لئے رکھا تھا۔ اوپر سے نجیب کے والد بیمار رہتے ہیں۔ "گزشتہ ایک سال سے میرے گھر میں کسی نے کپڑے نہیں بنوائے ہیں۔ ایک بار نجیب مل جائے تو میں اس کو لے کر خاموش ہو جاؤں گی۔ مجھے کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ مجھے صرف میرا نجیب چاہئے۔ "

اس کے ساتھ ساتھ وہ ان تمام افواہوں کو خارج کر رہی ہیں، جس میں کہاں جا رہا ہے نجیب خود سے بھاگ گیا ہے یا پھر وہ کسی غیرقانونی ادارہ میں شامل ہو گیا ہے۔ "وہ خود سے نہیں گیا ہے۔ جو خود سے گیا ہوتا تو وہ اپنی ماں کو فون نہیں کرتا۔

"وہ آگے بتاتی ہے کہ نجیب کا کسی بھی " فالتو " کاموں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس کو پڑھائی کے علاوہ کسی چیز سے مطلب نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک محنتی لڑکا تھا اور اے ایم یو، ہمدرد، جامعہ اور جے این یو جیسی مشہور یونیورسٹیوں کا داخلہ امتحان اس نے پاس کیا ہے۔

اسی دوران ٹرائل کورٹ میں نجیب کی وکیل پلّوی آئی اور نجیب کی ماں ان سے مقدمہ کے بارے میں بات کرنے لگی۔ پلّوی نے بتایا کہ نجیب کے نام نہاد حملہ آوروں کے اوپر سی بی آئی "نارکو ٹیسٹ " اور " پالیگرافی "ٹیسٹ کر سکتی ہے۔ نجیب کی ماں کی طرح پلّوی بھی پولیس اور سی بی آئی کے سست رویہ سے کافی غیر تشفی بخش دکھی۔ "ہم چاہتے ہیں کہ کورٹ خود اپنی نگرانی میں ایک ایس آئی ٹی قائم کریں جس کے افسر دلّی سے باہر کے ہوں تاکہ تفتیش پوری شفافیت کے ساتھ انجام کو پا سکے۔ "

پلّوی کے جانے کے بعد میں نے بھی ان سے جانے کی اجازت مانگی۔ لوٹتے وقت میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب ماں کو اس کا نجیب مل جائے گا؟

Related

نجیب کی ماں کو سی بی آئی کی کلوزر رپورٹ کے خلاف عرضی دائر کرنے کی اجازت
نجیب کی ماں کو سی بی آئی کی کلوزر رپورٹ کے خلاف عرضی دائر کرنے کی اجازت

نجیب معاملہ میں سی بی آئی دفتر کے باہر مظاہرہ
نجیب معاملہ میں سی بی آئی دفتر کے باہر مظاہرہ

گمشدہ جے این یو طالب علم نجیب کی ماں کا وزیر اعظم سے سوال، اگر آپ چوکیدار ہیں تو میرا بیٹا کہاں ہے
گمشدہ جے این یو طالب علم نجیب کی ماں کا وزیر اعظم سے سوال، اگر آپ چوکیدار ہیں تو میرا بیٹا کہاں ہے

Categories : حقوق انسانی (http://thewireurdu.com/category/human-rights/)

Tagged as: ABVP (http://thewireurdu.com/tag/abvp/), Human Rights (http://thewireurdu.com/tag/human-rights/), JNUSU (http://thewireurdu.com/tag/jnusu/), Najeeb (http://thewireurdu.com/tag/najeeb/), Najeeb JNU (http://thewireurdu.com/tag/najeeb-jnu/), Where is Najeeb (http://thewireurdu.com/tag/where-is-najeeb/), جے این یو (http://thewireurdu.com/tag/%d8%ac%db%92-%d8%a7%db%8c%d9%86-%db%8c%d9%88/), جے این یو اسٹوڈنٹس (http://thewireurdu.com/tag/%d8%ac%db%92-%d8%a7%db%8c%d9%86-%db%8c%d9%88-%d8%a7%d8%b3%d9%b9%d9%88%da%88%d9%86%d9%b9%d8%b3/), حقوق انسانی (http://thewireurdu.com/tag/%d8%ad%d9%82%d9%88%d9%82-%d8%a7%d9%86%d8%b3%d8%a7%d9%86%db%8c/), دہلی (http://thewireurdu.com/tag/%d8%af%db%81%d9%84%db%8c/), فاطمہ نفیس (http://thewireurdu.com/tag/%d9%81%d8%a7%d8%b7%d9%85%db%81-%d9%86%d9%81%db%8c%d8%b3/), نجیب (http://thewireurdu.com/tag/%d9%86%d8%ac%db%8c%d8%a8/), نجیب کی ماں (http://thewireurdu.com/tag/%d9%86%d8%ac%db%8c%d8%a8-%da%a9%db%8c-%d9%85%d8%a7%da%ba/)

حقوق نسواں کی چیمپئن پنڈتا رمابائی

قانون کی کتابوں میں بھلے ہی خواتین کے لیے شخصی آزادی درج ہو، مگر سماج کا دستور آج بھی ذات پات پر ہی ٹکا ہوا ہے

ابھے کمار

پوری دنیا میں آج کے دن کو عالمی یوم خواتین کے طور پر منایا جاتا ہے۔ جدید بھارت میں خواتین کے حقوق کے لیے لڑنے والوں میں پنڈتا رمابائی کا نام سرفہرست ہے۔ ان کے تجزیہ میں عورت کے خلاف ہو رہے ظلم و زیادتی کے تار غیر مساوی ذات پات کے نظام سے جڑے ہوئے ہیں۔ جس طرح ذات پات کو مذہبی کتابوں کی مدد سے جائز ٹھہرایا گیا ہے، اسی طرح رمابائی نے دکھایا کہ مذہبی کتابوں میں خواتین کے خلاف کافی مواد موجود ہے۔ رمابائی خود ایک برہمن سماج میں پیدا ہوئی تھیں اور ان کو سنسکرت زبان پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ رمابائی کے سوالوں کا جواب دینے کے بجائے قدامت پرستوں نے اس بات کو کافی طول دیا کہ انہوں نے ہندو دھرم کو چھوڑ کر عیسائی دھرم کو قبول کرلیا ہے۔ مگر ان منفی باتوں کی پرواہ کیے بغیر وہ اپنی آخری سانسوں تک اپنے مشن میں لگی رہیں۔

مدھو جھا کا مقالہ رمابائی: جینڈر اور کاسٹ کے مطابق، ان کا جنم ۱۸۵۸ میں ہوا تھا۔ رمابائی کے والد کا نام اننت شاستری تھا، جو ایک لبرل برہمن پنڈت تھے۔ وہ بچوں کو سنسکرت کی تعلیم دیتے تھے۔ انہوں نے اپنی اہلیہ کو بھی سنسکرت پڑھایا تھا۔ بچپن کے دنوں میں رما بائی نے اپنے والدین کے ساتھ برصغیر کے مختلف مذہبی مقامات کا سفر کیا۔ بہت سال بعد رمابائی کو کلکتہ میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ ہندو دھرم کی مذہبی کتابوں کے متعلق علم اور سنسکرت زبان پر قدرت کی وجہ سے انہوں نے حاضرین پر بڑا اثر چھوڑا۔ پھر کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں انہوں سرسوتی کہہ کر اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ ہندو دھرم کے ماننے والوں کا یہ عقیدہ ہے کہ سرسوتی علم کی دیوی ہیں اور کسی خاتون کو سرسوتی کہا جانا اس کے لیے بڑے فخر کی بات ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اُس زمانہ میں جب تعلیم صرف مردوں کے لیے ہی ضروری سمجھی جاتی تھی اور خواتین کو گھر کی چہار دیواری میں محدود رکھا جاتا تھا، تب کسی خاتون کو علم کی وجہ سے پذیرائی پانا ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ زندگی نے ایسی کروٹ لی کہ اسی کلکتہ میں ہی رمابائی کی ملاقات برہما سماج کے پیشوا کیشو چندر سین سے ہوئی اور اسی برہما سماج کے ایک رکن وپن بہاری میدھاوی سے انہوں نے بعد میں شادی کی۔ مگر بدقسمتی دیکھیے کہ شادی کے ۱۹ مہینے بعد ہی رمابائی بیوہ ہوگئیں۔ مرنے سے پہلے ان کے شوہر ایک بیٹی چھوڑ گئے، جس کا نام منورما تھا۔

شوہر کے انتقال کے بعد رما بائی اپنے آبائی وطن پونہ لوٹ آئیں، جہاں سے وہ خواتین کے حقوق کی لڑائی لڑتی رہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ اعلیٰ ذات کی بیوہ خواتین کے لیے ایک گھر بنے، جہاں وہ اپنی زندگی گزار سکیں۔ اس سمت میں انہوں نے ۱۸۸۱ میں 'آریہ مہیلہ سبھا' کی تشکیل دی۔ اپنی کارگردگی اور افکار کی وجہ سے قدامت پرست ان کے زبردست مخالف بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب کانگریس کے اندر قدامت پرست لیڈروں کا بول بالا تھا اور وہ لبرل اور سماجی اصلاح کے پیروکاروں کو کنارہ کرنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔ روایتی طور پر کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ 'سماجی اصلاح' سے متعلق مجلس بھی ایک ساتھ بیٹھتی تھی۔ مگر بال گنگادھر تلک نے سیاسی لڑائی کو تیز کرنے کے نام پر سماجی اصلاح کا گلا گھونٹنا چاہا۔ تلک نے ہندو دھرم کے اندر موجود ذات پات کا نہ صرف دفاع کیا، بلکہ مذہبی علامات کا سیاسی استعمال کر کے عوام کو مذہب کی بنیاد پر گول بند کرنے کی کوشش کی۔ دراصل سماجی اصلاح کی مخالفت کرنے کے پیچھے تلک کی منشا یہ تھی کہ سماج میں اعلیٰ ذاتوں کی بالادستی پر کوئی سوال اٹھا نہ پائے۔ تلک کے برعکس، ایک بیوہ عورت

جو بات پنڈتا رمابائی نے آج سے سو سال پہلے کہی تھی اس کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے بھی ہندو کوڈ بل کے ذریعہ ہندو خواتین کے حالات بدلنے کی کوشش کی تھی، مگر تب بھی شدت پسند اور قدامت پسند لوگوں نے بابا صاحب کی ایک نہ چلنے دی۔ آج بھی ہندوستان میں ہزاروں لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے مار دیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ہر موڑ پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کو اپنی مرضی سے جینے اور شادی کرنے کی بھی اجازت ہمارا غیر مساوی سماج نہیں دیتا۔

نے نہ صرف خواتین کے حقوق کے لیے لڑا، بلکہ مذہبی کتابوں میں درج غیر مساوی باتوں کی تنقید کرنے میں بھی پیچھے نہیں ہٹا۔

اپنی مہم کو پورا کرنے کے لیے رمابائی نے برطانیہ کا بھی سفر کیا، جہاں ان کا رجحان عیسائیت کی طرف ہونے لگا، جہاں انہوں نے ۲۵ ستمبر ۱۸۸۳ کو عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی منورما نے بھی اپنا دھرم بدل لیا۔ رمابائی کا نیا نام میری رما ہوگیا۔ چونکہ برطانیہ میں ان کو زیادہ حمایت نہیں ملی، اس لیے وہ امریکہ گئیں، جہاں ان کے کاموں کی پذیرائی ملی۔ امریکہ میں ہی انہوں نے بوسٹن میں ۱۸۸۷ میں پنڈتا رمابائی ایسوسی ایشنز بنائی۔ اس ادارہ نے بیوہ خواتین کے لیے بننے والے اسکول کے لیے مالی تعاون فراہم کرنے کا عہد لیا۔ سال ۱۸۸۹ میں وہ بھارت لوٹ آئیں اور انہوں نے بامبے میں شاردا سدن کے نام سے ایک اسکول کھولا، جو ہندو سماج کے اعلیٰ ذات کی بیوہ کے لیے ایک رہائشی اسکول تھا۔ علم کے حلقہ میں بھی رمابائی نے بڑا کام کیا اور بہت سارے مقالے لکھیں اور مراٹھی زبان میں بائبل کا ترجمہ کیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں سال 1919 میں برطانوی حکومت نے قیصر ہند میڈل سے انہیں نوازا۔ تین سال بعد ۱۹۲۲ میں ان کی وفات ہوگئی۔

۱۸۸۸ میں رمابائی نے 'دی ہائی کاسٹ ہندو وومن' کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا، جو ان کے افکار کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کہا کہ قدیم زمانہ میں ذات پات کا نظام لوگوں کی صلاحیت کی بنیاد پر تھا۔ کون کیا کام کرے گا یہ جنم سے طے نہیں ہوتا تھا۔ مگر بعد کے زمانہ میں ذات پات ہندو دھرم کا عقیدہ بن گیا اور برہمن کو ہندو دھرم کی تمام ذات پر فوقیت دے دی گئی۔ اس طرح صلاحیت اور قابلیت کی جگہ کسی خاص ذات میں پیدا ہوجانے کی وجہ سے بڑا اور چھوٹا مان لیا گیا۔ ذات پات کی وجہ سے ہی اعلیٰ ذات کی لڑکیوں کی شادی دیگر چھوٹی ذاتوں میں ممنوع قرار دے دی گئی اور اسی طرح مختلف ذاتوں کے مابین باہمی شادی بیاہ کا سلسلہ رک گیا۔ مذکورہ کتابچہ میں رمابائی نے بھی بہت ساری مذہبی کتابوں سے اقتباسات پیش کرتے ہوئے دکھلایا ہے کہ نجات کی راہ میں خواتین کو رکاوٹ بتائی گئی ہے۔ علاوہ ازیں، عورتوں کو مردوں کے برابر نہیں سمجھا گیا اور ان کی آزادی اور ان کی خودمختاری ان کے باپ، شوہر اور بیٹے کے ہاتھوں میں منتقل کردی گئی ہے۔ عورتوں کی گمراہی اور بہکاوے میں نہ آنے کی بھی نصیحت دی گئی ہے۔

ان اقتباسات کو پیش کر کے رمابائی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندو سماج میں اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔ مذہبی کتابوں کے اندر موجود خواتین مخالف مواد لوگوں کے ذہن کو آلودہ کرنے میں رول ادا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین کے پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیا جاتا ہے اور جو کسی طرح سے پیدا ہوگئیں ان کو ہر وقت ظلم و ستم سہنے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یاد رکھیے جو بات پنڈتا رمابائی نے آج سے سو سال پہلے کہی تھی اس کی معنویت آج بھی برقرار ہے۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے بھی ہندو کوڈ بل کے ذریعہ ہندو خواتین کے حالات بدلنے کی کوشش کی تھی، مگر تب بھی شدت پسند اور قدامت پسند لوگوں نے بابا صاحب کی ایک نہ چلنے دی۔ آج بھی ہندوستان میں ہزاروں لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے مار دیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ہر موڑ پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کو اپنی مرضی سے جینے اور شادی کرنے کی بھی اجازت ہمارا غیر مساوی سماج نہیں دیتا۔ قانون کی کتابوں میں بھلے ہی شخصی آزادی درج ہے، مگر سماج کا دستور آج بھی ذات پات پر ہی ٹکا ہوا ہے۔ ارباب اقتدار پنڈتا رمابائی کی باتوں کو سننے اور اس پر عمل کرنے کے بجائے، یہ پروپیگنڈہ پھیلا رہا ہے کہ غیر مساوات کے شکار صرف اور صرف مسلم سماج کی خواتین ہیں۔ حقوق نسواں کی لڑائی کو فرقہ وارانہ رنگ دینا فرقہ پرستوں کی سب سے بڑی چالاکی ہے۔ ہمیں ایک بار پھر خواتین کی لڑائی کو سیکولر پلیٹ فارم پر لڑنے کی ضرورت ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

بی جے پی پسماندہ مسلمانوں کو گلے لگانا چاہتی ہے!

اگر بی جے پی واقعی پسماندہ مسلمانوں کو اپنی طرف لانے کے لیے سنجیدہ ہے تو وہ انہیں پارٹی کا ٹکٹ کیوں نہیں دیتی

ابھے کمار

کیا بی جے پی مسلمانوں کی صفوں میں سیندھ لگانے جا رہی ہے؟ آج کل اس موضوع پر میڈیا میں خوب بحث چل رہی ہے۔ مین اسٹریم میڈیا ایسا ماحول بنا رہا ہے گویا بی جے پی راتوں رات پسماندہ مسلمانوں کی سب سے بڑی خیر خواہ پارٹی بن گئی ہے اور پسماندہ مسلمان ان کی طرف تیزی سے دوڑنے لگے ہیں۔ پسماندہ طبقات سے متعلق ایک قلم کار نے گزشتہ دنوں ہندی کے ایک بڑے اخبار میں لکھتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا کہ اب جب کہ وزیر اعظم نے پسماندہ مسلمانوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے تب پھر اس سماج کے لیے بھی یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنا ہاتھ بڑھائے۔ کیا یہ مصنف کی انفرادی رائے ہے یا پھر وہ اپنی جماعت کی ترجمانی کر رہے ہیں؟

بات کچھ یوں ہے کہ جولائی کے شروعاتی ہفتے میں بی جے پی عاملہ کا دو روزہ اجلاس حیدر آباد میں منعقد ہوا، جس میں وزیر اعظم نریندر مودی نے بی جے پی کے کارکنان کو یہ مشورہ دیا کہ وہ غیر ہندو سماج کے محکوم طبقات کے بیچ میں جائیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سرکار کی غریب حامی پالیسی کا فائدہ تمام محکوم طبقات کو ملا ہے۔ راشن، رسوئی گیس، سرکاری مکان اور دیگر اسکیم سے سب مستفید ہوئے ہیں۔ لہٰذا پارٹی کو پسماندہ مسلمانوں کو جوڑنے کے لیے قدم بڑھانا چاہیے۔ حالانکہ مودی نے پسماندہ مسلمانوں کو جوڑنے کی بات خود پریس کے سامنے آکر نہیں کی ہے اور نہ ہی انہوں نے اس کے متعلق کوئی ٹویٹ کیا ہے، جیسا کہ وہ اکثر دیگر مسائل پر کرتے ہیں۔ نہ ہی انہوں نے پسماندہ مسلمان کا نام کسی ریلی کے دوران پکارا ہے، جیسا کہ وہ دلت، آدی واسی، پچھڑا، غریب کا نام اکثر لیتے رہتے ہیں۔ میرے حافظہ میں انہوں نے کسی بھی عوامی ریلی سے پسماندہ مسلمانوں کے دُکھ درد پر نہ ہی کبھی دو آنسو بہائے ہیں اور نہ ہی ان کی ترقی کی بات کسی بڑے جلسہ سے کی ہے۔ پسماندہ مسلمانوں کے مسائل اور ان کی ترقی کے بارے میں بھی بی جے پی کا انتخابی منشور خاموش ہے، پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ اچانک سے وزیر اعظم کو پسماندہ مسلمانوں کی فکر کیسے ستانے لگی؟ مگر اتر پریس بی جے پی اقلیتی مورچہ نے وزیر اعظم کی نصیحت پر کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ میڈیا کو جانکاری دیتے ہوئے مورچہ نے کہا ہے کہ اس نے پسماندہ مسلمانوں کے بیچ اپنے دائرے کو بڑھانے کے لیے بہت سارے منصوبہ بنائے ہیں۔ مثلاً، وہ پسماندہ مسلمانوں کے مابین جا کر یہ بتلانا چاہتا ہے کہ مودی سرکار کی پالیسی کا فائدہ تمام کمزور طبقات کو ملا ہے، جن میں وہ بھی شامل ہیں۔ وہ پسماندہ مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہتا ہے کہ پارٹی کے اندر انہیں مزید نمائندگی دی جائے گی۔ مورچہ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ پارٹی کی اقلیتی یونٹ میں پسماندہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ نمائندگی دی گئی ہے۔ علاوہ ازیں، مورچہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران پاکستان کے خلاف عظیم بہادری کا مظاہرہ کرنے والے اور 'پرم ویر چکر ایوارڈ' سے نوازے گئے عبد الحمید کا یوم ولادت منانے کی تیاری کر رہی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ ویر عبد الحمید کا تعلق مسلمانوں کی ایک پسماندہ ذات ادریسی سے ہے۔

پسماندہ مسلمان کون ہیں؟ پسماندہ مسلمان اپنے سماج کے حاشیہ پر زندگی گزر بسر کرنے والے لوگ ہیں، جن کی آبادی مسلمانوں کی کل آبادی کی اکثریت ہے۔ دلت، آدی واسی، بیک ورڈ مسلمان پسماندہ مسلمان کہے جاتے ہیں۔ پسماندہ اصطلاح منڈل سیاست کے عروج کے بعد کافی مقبول ہوئی۔ چونکہ بھارت میں مسلمان مذہبی

> ”
>
> آج بی جے پی کے پاس پارلیمنٹ میں بڑی اکثریت ہے، مگر اس کی پارٹی میں ایک بھی مسلم ایم پی نہیں ہے۔ آخر وہ پسماندہ مسلمانوں کو ہی ایم پی کیوں نہیں بنا دیتی؟ سوال یہ بھی تو ہے کہ کیسے وہ ہندو نسل پر مبنی اور اقلیت مخالف قومیت کے نظریہ کو اپنائے ہوئے مساوات کی بات کر سکتی ہے؟ کیا وہ پسماندہ مسلمانوں کو بھی ہندوؤں کی طرح سچا محب وطن مانتی ہے؟

اقلیت ہیں، اس لیے ان کو 'مونولتھ' سمجھنے کی غلطی کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کو 'یک سنگی' سمجھنے کی غلطی روایتی مسلم قائدین اور فرقہ پرست دونوں کرتے ہیں۔ مگر سچائی یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر بھی ذات، طبقہ، جنس، علاقہ، مکتب فکر اور مسلک کی بنیاد پر فرق پایا جاتا ہے۔ ہندوستانی سماج کی تلخ حقیقت ذات پات پر مبنی غیر برابری والا معاشرہ ہے، جہاں اعلیٰ ذات کے مٹھی بھر لوگ دلت، آدی واسی، بیک ورڈ سماج کے لوگوں کے اوپر اپنا تسلط جمائے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پسماندہ مسلمان وہ لوگ ہیں جنھوں نے ذات پات کی عدم مساوات سے نجات پانے کے لیے اسلام کو قبول کیا، مگر مسلم سماج کے اشراف نے انہیں برابری کا درجہ نہیں دیا۔ قصاب، چُوی ہار، دھوبی، نَٹ، مداری، مہتر، میر یاسین، میر شکار، انصاری، رنگریز، رائین، ادریسی یا درزی، سائی جیسی ذاتیں پسماندہ مسلمان ہیں۔ منڈل کمیشن نے پسماندہ سماج کی درجنوں ذاتوں کو او بی سی ریزرویشن کے زمرہ میں شامل کر کے ایک انقلابی کام انجام دیا ہے۔ پسماندہ ذاتوں میں انصاری کی بڑی آبادی بہار، جھارکھنڈ اور اتر پردیش میں پائی جاتی ہے۔ اتر پردیش کی یوگی آدتیہ ناتھ حکومت نے انصاری سماج سے آنے والے دانش آزاد انصاری کو وزیر مملکت بنایا تھا تاکہ انصاری سماج اور دیگر پسماندہ جماعتیں بی جے پی کی طرف راغب ہوں۔ ۲۰۲۴ کے عام انتخابات کو دیکھ کر انہیں مزید لبھانے کے لیے بھاجپا کوشش کر رہی ہے۔

یاد رہے کہ پہلے بھی پسماندہ مسلمانوں کو بی جے پی سے جوڑنے کی بات اُٹھی تھی۔ سال ۲۰۱۷ء میں بھی شمالی بہار کے ایک بی جے لیڈر نے دہلی کے تال کٹورا اسٹیڈیم میں مسلمانوں کی ایک ریلی منعقد کی، جس میں بی جے پی کے بڑے مسلم چہرے مختار عباس نقوی کو بھی بلایا گیا تھا۔ اس ریلی میں پسماندہ مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے یہ دعویٰ کیا تھا کہ بیک ورڈ کمیشن کو آئینی درجہ ملنے کے بعد انہیں مزید حقوق فراہم کیے جائیں گے۔ مگر یہ وعدہ ابھی بھی وعدہ ہی ہے۔ تین طلاق کے خلاف قانون پاس کرانے کے بعد بی جے پی نے میڈیا کی مدد سے بڑی مہم چلائی تھی کہ مسلم خواتین بی جے پی کو ووٹ کر رہی ہیں۔ مگر اس بات کے پختہ ثبوت پیش نہیں کیے گیے۔ تضاد دیکھیے کہ جب پسماندہ مسلمانوں کو جوڑنے کے لیے یوپی بی جے پی اقلیتی مورچہ کام کرنے کا من بنا رہی ہے، اسی وقت ٹویٹر پر فرقہ وارانہ مہم چل رہی تھی کہ پنچر بنانے والے مسلمان کبھی غیر مسلموں کے دوست نہیں ہو سکتے ہیں! اگر بی جے پی واقعی پسماندہ مسلمانوں کو اپنی طرف لانے کے لیے سنجیدہ ہے تو وہ انہیں پارٹی کا ٹکٹ کیوں نہیں دیتی؟ آج بی جے پی کے پاس پارلیمنٹ میں بڑی اکثریت ہے، مگر اس کی پارٹی میں ایک بھی مسلم ایم پی نہیں ہے۔ آخر وہ پسماندہ مسلمانوں کو ہی ایم پی کیوں نہیں بنا دیتی؟ سوال یہ بھی تو ہے کہ کیسے وہ ہندو نسل پر مبنی اور اقلیت مخالف قومیت کے نظریہ کو اپنائے ہوئے مساوات کی بات کر سکتی ہے؟ کیا وہ پسماندہ مسلمانوں کو بھی ہندوؤں کی طرح سچا محب وطن مانتی ہے؟ کیا بی جے پی دلت مسلمان اور دلت عیسائی کو ایس سی زمرے میں شامل کرنے کو تیار ہے؟ کیا فرقہ وارانہ فسادات کی زد میں آنے والے پسماندہ مسلمانوں کو انصاف ملے گا؟ کیا دہشت گردی اور نام نہاد ملک مخالف سرگرمیوں میں قید کیے گیے پسماندہ مسلمان جیلوں سے رہا ہوں گے؟ لو جہاد، سی اے اے مخالف تحریک اور اہانت رسولؐ کے معاملے میں ہزاروں کی تعداد میں پسماندہ مسلمانوں کو مارا پیٹا گیا ہے، ان کو قید کیا گیا ہے، ان سے جرمانہ لیا گیا ہے اور ان میں سے بہت کے گھروں کو توڑا گیا ہے، کیا سب کو انصاف ملے گا؟ کیا ملک میں خوف کا ماحول کو ختم کیا جائے گا؟ پسماندہ مسلمانوں کے مفاد کو دھیان میں رکھتے ہوئے نجی کاری کی پالیسی روکی جائے گی؟ کیا بی جے پی کی سرکار ان سے اس بات کی ضمانت دے گی کہ اب سے پسماندہ مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت ہر صورت میں کی جائے گی؟ پسماندہ مسلمانوں کا ایک اہم مطالبہ ذات پات پر مبنی مردم شماری کا ہے۔ کیا بی جے پی مردم شماری کرانے کو تیار ہے؟ مدارس پر ہو رہے حملے اور مسلمانوں کے اقتصادی بائیکاٹ کی مذموم مہم کو روکنے کے لیے کیا سخت قدم اٹھائے گی؟ بھلا ان سوالوں کا جواب دیے بغیر بی جے پی اور پسماندہ جماعت کی دوستی کیسے کی ہو سکتی ہے؟ سوالات کے گھیرے میں صرف بھاجپا ہی نہیں بلکہ مسلم سماج کی سیکولر قیادت ہے جن سے بھی یہ پوچھا جانا چاہیے کہ کب تک وہ پسماندہ مسلمانوں کی حق ماری کرتی رہے گی؟ ■

مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں

debatingissues@gmail.com

سچا دیش بھکت کون ہے؟

عظیم انسان وہ ہے جو سماج میں مثبت بدلاؤ لانے کے جذبے سے کام کرتا ہے اور وہ معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کے لیے ظالموں اور ستم گروں پر چوٹ کرتا ہے

ابھے کمار

ان دنوں ارباب اقتدار اور ان سے وابستہ تنظیمیں دوسروں کو دیش بھکتی کا سند جاری کر رہی ہیں۔ کون محب وطن ہے، کون غدار وطن ہے، یہ وہی طے کرتی ہیں۔ جو ان کو پسند ہیں وہ دیش بھکت قرار دیے جاتے ہیں اور جن سے ان کی عداوت ہوتی ہے، انہیں غدار وطن کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے اور ضرورت پڑتی ہے تو ان کو گرفتار کر کے جیل بھی بھیج دیا جاتا ہے۔ لیکن کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ معمار آئین اور محکوموں کے مسیحا ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اگر آج ہمارے بیچ ہوتے تو ان حالات میں ان کا ردعمل کیا ہوتا؟ کیا وہ بی جے پی کی باتوں سے اتفاق کرتے اور کسی حکومت یا جماعت کی پالیسی کی تنقید کو ملک سے غداری سمجھ لیتے؟ یا پھر وہ بھگوا مخالف طاقتوں کے موقف کے ساتھ کھڑے ہوتے؟ ان سوالوں کا جواب دینے کے لیے بابا صاحب ہمارے بیچ زندہ واپس تو نہیں آسکتے، مگر جواب حاصل کرنے کے لیے ہم ان کے دور میں ضرور لوٹ سکتے ہیں۔ آیئے تاریخ کے اوراق پر سوار ہو کر ۸۰ سال پیچھے لوٹ چلتے ہیں۔

یہ بات ۱۹۴۰ء کی دہائی کی ہے جب ملک کے حالات بگڑنے شروع ہو گئے تھے۔ ملک کی آزادی کے لیے کل تک جو لیڈران مذہب اور دھرم سے اوپر اٹھ کر برطانوی حکومت سے لوہا لے رہے تھے، وہ اب خود ہی آپس میں لڑنے لگے۔ نوآبادیات سے مقابلہ کرنے کے بجائے ان کی آنکھیں مذہبی تعصب کے بخار سے سرخ ہو گئیں۔ ان کے دلوں میں سیکولر قومیت کی جگہ ہندو اور فرقہ پرستی کا جنون طاری ہونے لگا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مذکورہ لیڈروں کو اقتدار کی کرسی ان کی حدنگاہ میں داخل ہو گئی تھی۔ اقتدار پر براجمان بہت سارے قومی لیڈروں کا ایمان متزلزل ہونے لگا اور وہ اپنے ذاتی مفاد کو پورا کرنے کے لیے مذہبی کارڈ کھیلنے لگے۔ ان سب مذہبی گروہ بندی اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے بیچ ۱۸ جنوری ۱۹۴۳ء کو ڈاکٹر امبیڈکر کو 'گوکھلے میموریل ہال'، پونا، میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس سال جسٹس مہادیو گووند رانا ڈے کا ۱۰۱واں یوم پیدائش منایا جا رہا تھا۔ آج کل کے بہت سارے نوجوانوں کو یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ رانا ڈے کانگریس پارٹی کے اہم بانیان میں سے تھے۔ وہ نہ صرف ایک بڑے عالم اور مولف تھے، بلکہ انہوں نے سماجی اصلاح کے لیے بھی کافی کام کیا۔ جنسی برابری اور تعلیم کے شعبہ میں ان کی کارکردگی قابل ذکر ہے۔ وہ ہندو دھرم کے اندر موجود غیر برابری کو بھی دور کرنا چاہتے تھے۔ سماجی اصلاح پر زور دینے کی وجہ سے ان کو کانگریس کے بڑے لیڈر بال گنگادھر تلک اور دیگر قدامت پسندوں کی مخالفت جھیلنی پڑی۔ ۱۸۹۵ میں جسٹس رانا ڈے اور سماجی اصلاح کے دیگر پیروکار کانگریس کے اجلاس کے برابر سماجی اصلاح سے متعلق کانفرنسیں منعقد کروانا چاہتے تھے۔ مگر کانگریس کی اعلیٰ ذات کی لابی، جس کی قیادت تلک کر رہے تھے، ان پر ٹوٹ پڑے۔ اعلیٰ ذات کے کانگریس لیڈروں کی اولین ترجیح اقتدار کو انگریزوں کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھوں میں لینا تھا۔ سماجی اصلاح کے پروگرام سے وہ اس لیے ڈرتے تھے کہ اس سے ان کی برادری کے ذاتی مفاد پر چوٹ پہنچ سکتی تھی۔ ناسک کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہونے والے اسی مصلح جسٹس رانا ڈے کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے بابا صاحب پونا پہنچے تھے۔

اپنی تقریر میں امبیڈکر نے مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح کی زبردست تنقید کی۔ انہوں نے ان لیڈروں کو سیاسی تعطل پیدا کرنے کا ذمہ دار مانا۔ انہوں نے دونوں پر مذہبی بنیاد پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کا الزام بھی لگایا اور کہا کہ دونوں کے اندر بہت زیادہ انانیت اور خود پرستی پائی جاتی تھی۔ ملک کے مفاد سے کہیں زیادہ دونوں خود کے مفاد کے لیے کام کرتے تھے۔ گاندھی اور جناح کے برعکس رانا ڈے ذرہ برابر بھی انانیت کے شکار نہیں تھے اور وہ ایک دانشور تھے۔ امبیڈکر نے یہ بھی کہا کہ سیاست میں شخصیت پرستی کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ سیاست میں اندھ بھکتی کو بت پرستی سے تعبیر کرتے ہوئے، امبیڈکر نے کہا کہ 'میں بت کی پوجا نہیں کرتا۔ میں اسے توڑنے میں یقین رکھتا ہوں'۔ اگر شخصیت پرستی کی برائی دور کر دی جائے تو پھر کسے عظیم شخص ہونے کا شرف حاصل ہوگا؟ امبیڈکر نے خود اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ عظیم انسان وہ ہے جو سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لیے کام کرتا ہے۔ بقول امبیڈکر، ایک بڑا انسان وہ ہے جو سماج میں مثبت بدلاؤ لانے کے جذبے سے کام کرتا ہے اور وہ معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کے لیے ظالموں اور ستم گروں پر چوٹ کرتا ہے۔ بڑا انسان ایک سچا دیش بھکت ہے جو صفائی ملازم کی مانند سماج کی برائیوں کو صاف کرتا ہے۔ ان پہلوؤں کو دھیان میں رکھ کر جب امبیڈکر گاندھی، جناح اور رانا ڈے کا تقابلی تجزیہ کرتے ہیں تو رانا ڈے کو اپنے مشن کے قریب پاتے ہیں۔

امبیڈکر کا ماننا ہے کہ سماجی اصلاح کے لیے کام کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ جب سماج کی برائی کو دور کرنے کے لیے کوئی آگے آتا ہے تو اس کے خلاف پورا سماج کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں آتا۔ اس لڑائی میں اگر سماجی مصلح نے اپنی قربانی دے بھی دی تو اسے شہید کا درجہ نہیں دیا جاتا۔ اس سماجی مصلح کو ہر طرف سے نفرت ملتی ہے کیونکہ وہ سماج کے جڑوں میں بیٹھی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی پہل کرتا ہے۔ وہیں دوسری طرف جب کوئی کسی حکومت کو چیلنج کرتا ہے تو اس کی تعریف کرنے کے لیے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور اسے عظیم شخصیت کہہ کر نوازا جاتا ہے۔ یہ اس لیے کہ سماج کا ظلم حکومت کی زیادتی سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے۔ تبھی تو امبیڈکر کی نظروں میں سماجی اصلاح کے لیے کام کرنے والا شخص ہی سب سے بڑا اور سچا دیش بھکت ہے۔ امبیڈکر کہتے ہیں کہ 'زیادہ تر لوگ اس بات کو محسوس نہیں کر پاتے ہیں کہ سرکار کے مقابلے میں سماج کسی فرد کے اوپر کہیں زیادہ ظلم و زیادتی کرتا ہے'۔

امبیڈکر کی بات بالکل درست ہے۔ آج بھی دلتوں، مسلمانوں اور دیگر پسماندہ طبقات کے اوپر سماج زیادہ ظلم کرتا ہے۔ اگر پولیس کسی دلت اور مسلمان کو گرفتار کرتی ہے تو اس پر مقدمہ چلاتی ہے اور پھر اسی کو سزا دیتی ہے، مگر ذات پات پر مبنی سماج تو اسے برابر کا انسان بھی نہیں سمجھتا اور بغیر کسی قاعدہ و قانون کو مانے اسے سزا بھی دے دیتا ہے۔ آج بھی اعلیٰ ذات کے بہت سارے لوگ دلتوں کے ساتھ چھوت چھات برتتے ہیں اور مسلمانوں سے میل جول رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ یاد رکھیے ہجومی تشدد یا فرقہ وارانہ تشدد میں یہی سماج دلت اور مسلمانوں کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے اور ان کے قتل عام پر تالی بجاتا ہے۔ بابا صاحب امبیڈکر اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ سچی دیش بھکتی کا مطلب معاشرتی اصلاح ہے۔ سماجی اصلاح کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے اس زمانہ میں جسٹس رانا ڈے اور امبیڈکر کے خلاف لوگ کھڑے ہوئے تھے اور آج بھی سماجی اصلاح کی ہر کوشش کو آگے بڑھانے والے افراد پر پتھر برسائے جاتے ہیں اور ان کو غدار وطن کہا جاتا ہے۔ ارباب اقتدار ساری لڑائیوں کو سیاسی میدان میں لا کر محدود کر دیتے ہیں تاکہ اصل دشمن پر پردہ پوشی کی جائے۔ تبھی تو ساری لڑائیوں کو نیشنل بنام اینٹی نیشنل کے کھیل میں الجھا دیا جاتا ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

> آج بھی دلتوں، مسلمانوں اور دیگر پسماندہ طبقات کے اوپر سماج زیادہ ظلم کرتا ہے۔ اگر پولیس کسی دلت اور مسلمان کو گرفتار کرتی ہے تو اس پر مقدمہ چلاتی ہے اور پھر اسی کو سزا دیتی ہے، مگر ذات پات پر مبنی سماج تو اسے برابر کا انسان بھی نہیں سمجھتا اور بغیر کسی قاعدہ و قانون کو مانے اسے سزا بھی دے دیتا ہے۔ آج بھی اعلیٰ ذات کے بہت سارے لوگ دلتوں کے ساتھ چھوت چھات برتتے ہیں اور مسلمانوں سے میل جول رکھنے سے گریز کرتے ہیں۔ یاد رکھیے ہجومی تشدد یا فرقہ وارانہ تشدد میں یہی سماج دلت اور مسلمانوں کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے اور ان کے قتل عام پر تالی بجاتا ہے۔

اسلام کے متعلق پیریار کی انمول باتیں

سماجی عدم مساوات کو ختم کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ذات پات کو جڑ سے ختم کیا جائے

ابھئے کمار

سماجی مصلح، مجاہد آزادی، مفکر اور محکوموں کے مسیحا ای وی راماسوامی کا یوم پیدائش ہر سال ۱۷ ستمبر کو یوم سماجی انصاف کے طور پر منایا جاتا ہے۔ آج سے ۱۴۳ رسال پہلے ان کی ولادت مدراس پریسی ڈینسی کے کوئمبٹور کے قریب اِروڈ میں ہوا تھا۔ اپنی پوری زندگی وہ برابری، عزت نفس، تنوع، اخوت اور عقل اور دلیل پر مبنی ایک نئے معاشرے کی تشکیل کے لیے لڑتے رہے۔ ان کی تحریک ذات برادری اور توہم پرستی کے بالکل خلاف تھی۔ تبھی تو محبت سے عوام انہیں پیریار کہتے ہیں، جس کا مطلب بڑا انسان یا بزرگ آدمی ہوتا ہے۔ جنگ آزادی کے دوران پیریار کانگریس کی قیادت سے ناراض تھے کیونکہ یہ پارٹی سماجی انصاف کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں کم دلچسپی رکھتی تھی۔ وہیں پیریار اور دیگر محکوم طبقات کے لیڈروں کا ماننا تھا کہ بغیر معاشرتی مساوات کے سیاسی آزادی ادھوری ہے۔ پیریار کی سوچ یہ تھی کہ سماجی عدم مساوات کو ختم کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ذات پات کو جڑ سے ختم کیا جائے اور توہم پرستی اور مذہبی پیشواوں کے استحصال کو بند کیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تب ہی پچھڑوں اور دلتوں کو ان کے واجب حقوق مل پائیں گے۔ پھر آگے چل کر پیریار نے عزت نفس کے لیے تحریک چلائی۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک مذہب کے اندر موجود برائیوں کو پوری طرح سے ختم نہیں کیا جاتا، تب تک محکوموں کا بھلا نہیں ہوسکتا۔

۱۹۲۰ء کی دہائی میں تبدیلی مذہب کا معاملہ زور پکڑا۔ ایک طرف محکوم طبقات مساوات پانے کے لیے اسلام اور عیسائی مذہب کو قبول کر رہے تھے، وہیں دوسری طرف آریہ سماج کا شدھی آندولن مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے سرگرم تھا۔ دھرم اور مذہب بدلنے کے نام پر کئی مقامات پر تنازعات کھڑے ہوئے اور تشدد کی وارودات بھی رونما ہوئی۔ اس پس منظر میں پیریار بھی اس اہم موضوع پر عوام کو خطاب کر رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء کے آخری سالوں سے لے کر ۱۹۵۰ء کی دہائی تک انہوں نے اپنی تقریروں سے دلتوں اور پچھڑوں کو اسلام قبول کرنے اور نجات حاصل کرنے کی نصیحت کی۔ حالانکہ شرپسند اور فرقہ پرست عناصر اُس دور میں بھی اسلام کو ایک منفی چیز سمجھتے تھے مگر پیریار کی رائے ان سے بالکل الگ تھی۔ وہ اسلام کو تشدد پر مبنی مذہب نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسے اخوت کے اصول پر مبنی دین سمجھتے تھے۔ پیریار نے اس بات کو بھی سرے سے خارج کیا کہ اسلام کا پھیلنا کوئی منفی پیش رفت ہے۔

فرقہ پرستوں کے برعکس، پیریار کو اسلام کے اندر سے امید کی روشنی دکھتی تھی۔ انہوں نے اسلام کو اس کے نظریہ توحید، مساوات اور اخوت کے لیے خوب سراہا، جہاں ذات پات کے عدم مساوات کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی وہاں مذہبی پیشوا کا کوئی کلاس ہی موجود ہے۔ بار بار وہ اس بات پر تاکید کرتے تھے کہ اسلام کی پناہ میں جاؤ۔ اسلام کے بارے میں سچی اور مخلصانہ بات کہنے کے لیے شدت پسندوں نے ان کو نشانہ بنایا، مگر وہ ڈرے نہیں۔ بابا صاحب امبیڈکر کی طرح پیریار بھی مذہب کے سماجی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ پیریار کا کہنا تھا کہ جس مذہب میں سماجی بھلائی کا پیغام ہو، جہاں کا معاشرتی نظام اخوت اور بھائی چارہ پر مبنی ہو، جس مذہب میں توہم پرستی کی جگہ نہ ہو،

> پیریار کا ماننا تھا کہ اسلام کے اندر انسانیت اور برابری پائی جاتی ہے۔ اس لیے دلتوں اور دیگر محکموں کو اپنی نجات کے لیے اسلام قبول کرلینا چاہیے۔ مہاتما گاندھی دوسری طرف تبدیلئ مذہب کے مخالف تھے۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ سارے مذاہب کے اصول ایک ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے مذہب کو بدلنے سے اہم ہے کہ انسان اپنے قدیم مذہب کو مضبوطی سے پکڑے رہے۔ مگر امبیڈکر اور پیریار کی رائے گاندھی سے الگ تھی اور وہ تبدیلی مذہب کو ایک انقلابی قدم مانتے تھے۔

جہاں ذات، نسل، جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتا جاتا ہو، ایسا ہی مذہب محکوموں کو نجات دے سکتا ہے۔ ذات پات کا جو سماجی نظام سماج میں صدیوں سے چلا آرہا ہے اس کے بارے میں امبیڈکر اور پیریار کا ماننا تھا کہ اسے ختم کرنے کے لیے مذہبی اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

پیریار نے کہا کہ اسلام کے اندر انسانیت اور برابری پائی جاتی ہے۔ اس لیے دلتوں اور دیگر محکموں کو اپنی نجات کے لیے اسلام قبول کرلینا چاہیے۔ مہاتما گاندھی دوسری طرف تبدیلئ مذہب کے مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سارے مذاہب کے اصول ایک ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے مذہب کو بدلنے سے اہم ہے کہ انسان اپنے قدیم مذہب کو مضبوطی سے پکڑے رہے۔ مگر امبیڈکر اور پیریار کی رائے گاندھی سے الگ تھی اور وہ تبدیلی مذہب کو ایک انقلابی قدم مانتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں اپنے آبائی وطن اِروڈ میں پیریار نے کہا کہ جن دلتوں نے اسلام قبول کرلیا ہے ان کو آزادی مل گئی ہے۔ ان کو اب ذات پات کی بنیاد پر امتیاز نہیں جھیلنا پڑے گا۔ ان کو جہالت سے نجات ملے گی۔ اب ان کے ساتھ چھوت چھات کا سلوک نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی پانی پینے کے لیے انہیں اعلیٰ ذاتوں کے رحم وکرم پر رہنا ہوگا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد دلتوں نے نئی اجتماعی زندگی شروع کی ہے، جو مساوات اور اخوت پر مبنی ہے۔ اسلام میں داخل ہونے والے دلت نہ صرف اپنا سر اٹھا کر سڑکوں پر چل پائیں گے بلکہ ان کے روزگار کے مواقع بھی کھل گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی پسماندگی بھی دور ہوگی اور ان کی معاشرتی تنزلی بھی ختم ہوگی۔ ان کو مزید دھرم کے نام پر استحصال نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنے حقوق کے لیے لڑ بھی پائیں گے۔ امبیڈکر کی طرح پیریار بھی تبدیلئ مذہب کو نجات کا راستہ مانتے تھے۔ جہاں امبیڈکر نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے اپنے پیروکار کے ساتھ بدھ مت کو قبول کیا وہیں پیریار نے اسلام کو قبول کرنے کی بات بار بار دوہرائی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۴۷ کو ترچیرا پلی میں اسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے پیریار نے یہ واضح کردیا کہ ایک عاقل شخص ہونے کی وجہ سے وہ مذہبی رسومات کو مذہب کا اہم ترین حصہ نہیں مانتے تھے۔ امبیڈکر اور پیریار کے نزدیک دین کا سماجی پہلو اہم ترین ہے۔ پیریار کو اسلام اس لیے پسند تھا کیونکہ یہ انسانی فلاح اور بہبود پر زور دیتا ہے۔ جس طرح حضرت محمد صاحب کو اسلام کی باتیں کہنے کے لیے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، کچھ ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہورہا تھا۔ شدت پسند لوگ اسلام کے تئیں رائے رکھنے کے لیے پیریار کو مسلسل برا بھلا کہہ رہے تھے۔ پیریار نبی اسلام کے جشن ولادت میں بھی شریک ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ۲۳ دسمبر ۱۹۵۳ء کو چنئی میں ایسی ہی ایک میلاد النبی تقریب میں بولتے ہوئے پیریار نے کہا کہ محمد صاحب کا اہم پیغام مساوات کا ہے۔ آپ کا کہنا تھا کہ اللہ کی نظروں میں سارے انسان یکساں ہیں۔ جنم سے کوئی چھوٹا اور بڑا نہیں ہے۔ پیریار نے کہا کہ ان کا پیغام توحید اور اخوت کافی اہم ہے۔ پیریار نے یہ بھی کہا کہ محمد صاحب نے ہر بات پر فکر وغور کرنے کے لیے کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی عقل کا استعمال کرنا چاہیے اور کسی کی باتوں کو آنکھ بند کر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے جو کہا وہ زمین پر بھی دیکھا گیا جو محمد صاحب کی عظمت ظاہر کرتی ہے۔ حضورؐ کی شان میں پیریار نے کہا کہ آپ کے بعد کوئی بھی ایسا نہیں اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا، جس نے آپ سے بہتر نظریہ نوع انسان کو دیا۔ آج جس طرح سے مسلمان اور اسلام کے خلاف نفرت کا ماحول بنایا جارہا ہے، اس پس منظر میں پیریار کی یہ انمول باتیں کافی زیادہ معنویت رکھتی ہیں۔ آج تبدیلئ مذہب کے ذاتی عمل کو سیاسی رنگ دیا جارہا ہے اور یہ کہا جارہا ہے کہ اسلام قبول کرنے والا ہر انسان کے ساتھ زور زبردستی کی جاتی ہے۔ اسلام پھیلنے کے عمل کو منفی دکھایا جاتا ہے اور ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ بتایا جاتا ہے، جبکہ اگر کوئی مسلمان ہندو بنتا ہے تو اس کا جشن منایا جاتا ہے اور اسے گھر واپسی کا نام دیا جاتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ بے قصور مسلم مذہبی لیڈروں فریب کے ساتھ اسلام پھیلانے کے الزام میں جیل میں ڈالا جارہا ہے۔ ان حالات میں ہمیں پیریار کی ان انمول باتوں مزید جاننے اور انہیں گھر گھر پہنچانے کی ضرورت ہے۔ ■

اسلام کے متعلق پیریار کی یہ اَنمول باتیں

ابھے کمار

انقلاب، ۱۳ ستمبر ۲۰۲۲

سماجی مصلح، مجاہد آزادی، مفکر اور محکوموں کے مسیحا ای وی راماسوامی کا یوم پیدائش ہر سال ۱۷ ستمبر کو یوم سماجی انصاف کے طور پر منایا جاتا ہے۔ آج سے ۱۴۳ سال پہلے ان کی جنم مدراس پرسَی ڈینسی کے کوئمبٹور کے قریب اِروڈ میں ہوئی تھی۔اپنی پوری زندگی وہ برابری، عزت نفس، تنوع، اخوت اور عقل اور دلیل پر مبنی ایک نیے معاشرے کی تشکیل کے لیے لڑتے رہے۔ ان کی تحریک ذات برادری اور توہم پرستی کے بالکل خلاف تھی۔تبھی تو محبت

سے عوام انہیں پیریار کہتے ہیں، جس کا مطلب بڑا انسان یا بزرگ آدمی ہوتا ہے۔جنگ آزادی کے دوران پیریار کانگریس کی قیادت سے ناراض تھے کیونکہ یہ پارٹی سماجی انصاف کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں کم دلچسپی رکھتی تھی۔وہیں پیریار اور دیگر محکوم طبقات کے لیڈرو کا ماننا تھا کہ بغیر معاشرتی مساوات کے سیاسی آزادی ادھوری ہے۔ پیریار کی سوچ یہ تھی کہ عدم مساوات کوختم کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ ذات پات کو جڑ سے ختم کیا جائے اور اور توہم پرستی اور مذہبی پیشواوں کے استحصال کو بند کیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تب ہی پچھڑوں اور دلتوں کو ان کے واجب حقوق مل پائے گیں۔پھر آگے چل کر پیریار نے عزت نفس کے لیے تحریک چلائی۔ان کو کہنا تھا کہ جب تک مذہب کے اند ر موجود برائیوں کو پوری طرح سے ختم نہیں کیا جاتا، تب تک محکوموں کا بھلا نہیں ہو سکتا۔

۱۹۲۰ کی دہائی میں تبدیلی مذہب کا معاملہ زور پکڑا۔ایک طرف محکوم طبقات برابری پانے کے لیے اسلام اور عیسائی مذہب کو قبول کر رہے تھے، وہیں دوسری طرف آریہ سماج کا شدھی آندولن مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے سرگرم تھا۔دھرم اورمذہب بدلنے کے نام پر کئی مقامات پر تنازعات کھڑے ہوئے اور تشدد کی وارودات بھی رونما ہوئی۔اس پس منظر میں پیریار بھی اس اہم موضوع پر عوام کو خطاب کر رہے تھے۔ ۱۹۲۰ کے آخری سالوں سے لے کر ۱۹۵۰ کی دہائی تک انھوں نے اپنی تقریوں سے دلتوں اور پچھڑوں کو اسلام قبول کرنے اور نجات حاصل کرنے کی نصیحت کی۔ حالانکہ شر پسند اور فرقہ پرست عناصر اُس دور میں بھی اسلام کو ایک منفی چیز سمجھتے تھے۔ مگر پیریار کی رائے ان سے بالکل الگ تھی۔وہ اسلام کو تشدد پر مبنی مذہب نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اسے اخوت کے اصول پر مبنی دین

سمجھتے تھے۔ پیریار نے اس بات کو بھی سر ے سے خارج کیا کہ اسلام کا پھیلنا کوئی منفی پیش رفت ہے۔

فرقہ پرستوں کے برعکس، پیریار کو اسلام کے اندر سے امید کی روشنی دکھتی تھی۔ انہوں نے اسلام کو اس کے نظریہٴ توحید، مساوات اور اخوت کے لیے خوب سراہا، جہاں ذات پات کی عدم مساوات کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ ہی وہاں مذہبی پیشوا کا کوئی کلاس ہی موجود ہے۔بار بار وہ اس بات پر تاکید کرتے تھے کہ اسلام کی پناہ میں جاوٴ۔اسلام کے بارے میں سچی اور مخلصانہ بات کہنے کے لیے شدت پسندوں نے ان کونشانہ بنایا، مگر وہ ڈرے نہیں ۔بابا صاحب امبیڈکر کی طرح پیریار بھی مذہب کے سماجی پہلووٴں پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔پیریار کا کہنا تھا کہ جس مذہب میں سماجی بھلائی کا پیغام ہو، جہاں کا معاشرتی نظام اخوت اور بھائی چارہ پر مبنی ہو،جس

مذہب میں توہم پرستی کی جگہ نہیں ہو، جہاں ذات، نسل، جنس کی بنیاد پر امتیاز نہیں برتا جاتا ہو، ایسا ہی مذہب محکوموں کو نجات دے سکتا ہے۔ ذات پات کا جو سماجی نظام سماج میں صدیوں سے چلا آ رہا ہے اس کے بارے میں امبیڈکر اور پیریار کا ماننا تھا کہ اسے ختم کرنے کے لیے مذہبی اصلاح کی اشد ضرورت ہے ۔

پیریار نے کہا کہ اسلام کے اندر انسانیت اور برابری پائی جاتی ہے۔ اس لیے دلتوں اور دیگر محکوموں کو اپنی نجات کے لیے اسلام قبول کر لینا چاہیے۔مہاتما گاندھی دوسری طرف تبدیلیٔ مذہب کے مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سارے مذاہب کے اصول ایک ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے مذہب کو بدلنے سے اہم ہے کہ انسان اپنے قدیم مذہب کو زور سے پکڑے رہے۔مگر امبیڈکر اور پیریار کی رائے گاندھی سےالگ تھی اور وہ

تبدیلی مذہب کو ایک انقلابی قدم مانتے تھے۔اکتوبر ۱۹۲۹ میں اپنے آبائی وطن اِروڈ میں پیریار نے کہا کہ جن دلتوں نے اسلام قبول کر لیا ہے ان کو آزادی مل گئی ہے۔ان کو اب ذات پات کی بنیاد پر امتیاز نہیں جھیلنا پڑے گا۔ان کو جہالت سے نجات ملے گی۔اب ان کے ساتھ چھوت چھات کا سلوک نہیں برتا جائے گا اور نہ ہی پانی پینے کے لیے انہیں اعلیٰ ذاتوں کے رحم و کرم پر رہنا ہوگا۔اسلام قبول کرنے کے بعد دلتوں نے نئی اجتماعی زندگی شروع کی ہے، جو مساوات اور اخوت پر مبنی ہے۔ اسلام میں داخل ہونے والے دلت نہ صرف اپنا سر اٹھا کر سڑکوں پر چل پائیں گے بلکہ ان کے روزگار کے مواقع بھی کھُل گئے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی پسماندگی بھی دور ہوگی اور ان کی معاشرتی تنزلی بھی ختم ہوگی۔ ان کو مزید دھرم کے نام پر استحصال نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنے حقوق کے لیے لڑ بھی پائیں گے۔امبیڈکر کی طرح پیریار بھی

تبدیلیٔ مذہب کو نجات کا راستہ دیھتے تھے۔ جہاں امبیڈکر نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پہلے اپنے پیروکار کے ساتھ بدھ مت کو قبول کیا وہیں پیریار نے اسلام کو قبول کرنے کی بات بار بار دوہرائی۔ ۱۸ مارچ ۱۹۴۷ کو تریچیراپلی میں اسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے پیریار نے یہ واضح کر دیا کہ وہ ایک عاقل شخص ہونے کی وجہ سے وہ مذہبی رسومات کو مذہب کا اہم ترین حصہ نہیں مانتےتھے۔امبیڈکر اور پیریار کے نزدیک دین کی سماجی پہلو اہم ترین ہے۔پیریار کو اسلام اس لیے پسند تھا کیونکہ یہ انسانی فلاح اور بہبود پر زور دیتا ہے ہے۔جس طرح حضرت محمد صاحب کو اسلام کی باتیں کہنے کے لیے مخالفت جھیلنی پڑی، کچھ ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ شدت پسند لوگ اسلام کے تئیں رائے رکھنے کے لیے پیریار کو مسلسل برا بھلا کہہ رہے تھے۔ پیریار نبی اسلام کے جشن ولادت میں بھی شریک

ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ۲۳ دسمبر ۱۹۵۳ کو چنئی میں ایسی ہی ایک ملاد النبی کی تقریب میں بولتے ہوئے پیریار نے کہا کہ محمد صاحب کا اہم پیغام مساوات کا ہے۔ آپ کی کہنا تھا کہ اللّٰہ کی نظروں میں سارے انسان برابر ہیں۔جنم سے کوئی چھوٹا اور بڑا نہیں ہے۔ پیریار نے کہا کہ ان کا پیغام توحید اور اخوت کافی اہم ہے۔ پیریار نے یہ بھی کہا کہ محمد صاحب نے ہر بات پر فکر و غور کرنے کے لیے کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی عقل کا استعمال کرنا چاہیے اور کسی کی باتوں کو آنکھ بند کر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے جو کہا وہ زمین پر بھی دیکھا گیا جو محمد صاحب کی عظمت ظاہر کرتی ہے۔حضورؐ کی شان میں پیریار نے کہا کہ آپ کے بعد کوئی بھی ایسا نہیں اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا ، جس نے آپ سے بہتر نظریہ نوع انسان کو دیا۔آج جس طرح سے مسلمان اور اسلام کے خلاف نفرت کاماحول

بنایا جا رہا ہے،اس پس منظر میں پیریار کی یہ انمول باتیں کافی زیادہ معنویت رکھتی ہیں۔ آج تبدیلیٔ مذہب کے ذاتی عمل کو سیاسی رنگ دیا جا رہا ہے اور یہ کہا جا رہا ہے کہ اسلام قبول کرنے والا ہر انسان کے ساتھ زور زبردستی کی جاتی ہے۔ اسلام پھیلنے کے عمل کو منفی دکھیا جاتا ہے اور ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ بتایا جاتا ہے، جبکہ اگر کوئی مسلمان ہندو بنتا ہے تو اس کا جشن منایا جاتا ہے اور اسے گھر واپسی کا نام دیا جاتا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ بے قصور مسلم مذہبی لیڈروں فریب کے ساتھ اسلام پھیلانے کے الزام میں جیل میں ڈالا جا رہا ہے۔ ان حالات میں ہمیں پیریار کی ان آنمول باتوں کو مزید جاننے اور انہیں گھر تھر پہنچانے کی ضرورت ہے۔

مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔

debatingissues@gmail.com

پولیس میں مسلم نمائندگی: ماضی سے حال تک مسلسل گراوٹ

قانون و نظم و ضبط کی برقراری کا ایک کلیدی عنصر نظرانداز!

آج جب دلّی فسادات میں پولیس معصوم مسلمانوں کو دنگائیوں سے بچانے سے بھاگ جاتی ہے اور الٹے بے قصور مسلمانوں کو مارتی اور پیٹتی ہے اور ان کو فرضی مقدمات میں جیل میں ڈال دیتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کا اسکرپٹ آزادی کے وقت ہی تیار کرلیا گیا تھا

ابھے کمار، دلی

آزاد بھارت میں فسادات کے دوران پولیس مسلمانوں کو نشانہ بناتی آئی ہے۔یہ وہی دور ہے جب مسلمان کی نمائندگی پولیس محکمہ میں گرتی چلی گئی۔پولیس محکمہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ۶ فی صد کے آس پاس ہے حالانکہ ان کی آبادی ۱۴ فی صد سے زیادہ ہے۔ ایک ایسا دور بھی گزرا جب مسلمانوں کی حالت محکمہ پولیس میں اس قدر خراب نہ تھی۔دراصل آزادی ملنے تک اور اس سے قبل مسلمانوں کی پولیس اور فوج میں نمائندگی آج کے مایوس کن حالات سے کافی بہتر تھی۔اس مضمون میں ہماری گفتگو ۱۸۵۷ سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ پرختم ہوجائے گی۔ اگلے مضمون میں ہم آزادی کے بعد کی صورت حال اور فرقہ پرستوں کی مسلمانوں کے خلاف کی گئی سازش پر بات کریں گے۔

کوئی ہم سے یہ سوال پوچھ سکتا ہے کہ پولیس میں مذہب کی بنیاد پر نمائندگی کی بات کرنا کیوں ضروری ہے؟ دوسرے الفاظ میں اس طرح کے "گڑے مردے" اکھاڑ کے کیا حاصل ہوگا؟ اس سوال کا جواب ایک اہم سوال سے جڑا ہوا ہے۔ آخر کیوں پولیس اپنے نظم وضبط کے فریضہ کو انجام دیتے وقت فرقہ وارانہ ذہنیت سے کام کرتی ہے؟ بالخصوص فسادات اور دنگوں کے دوران ان کا چہرہ مسلم مخالف کیوں ہو جاتا ہے؟ حالیہ دہلی فسادات کے دوران بھی ہم نے یہ سب کچھ پڑھا، سنا، اور وائرل ہوئے ویڈیوز میں دیکھا تھا کہ مسلمان نہ صرف بلوائیوں سے لڑ رہے تھے بلکہ قانون اور نظم وضبط کی محافظ دلّی پولیس بھی ان کی جان کی دشمن بنی ہوئی تھی۔پولیس کی اس فرقہ وارانہ اور مسلم مخالف ذہنیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے پولیس محکموں میں تنوع اور تکثیریت کا فقدان ہے، جس کی وجہ سے فرقہ پرست سیاست دانوں اور افسروں کو اپنا ایجنڈا پورا کرنے میں کافی آسانی ہوتی ہے۔ سماج کے اندر موجود تنوع اگر ان اداروں میں بھی ہوتا تو ان کو کسی قوم یا فرقے کے خلاف کوئی ناانصافی کرنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑتا۔آج تنوع کی عدم موجودگی میں پولیس "ہندو" پولیس معلوم ہوتی ہے۔اس میں بھی دبدبہ غالباً ہندو اعلیٰ ذات کا ہی ہے۔

جس طرح ایک کامیاب جمہوری نظام میں ہر شعبے اور محکمے کا حال لینا اور اس کی کمیوں پر سوال کھڑا کرنا ضروری ہے اسی طرح پولیس بھی تنقید کے دائرے میں آتی ہے۔اسی جذبے کے تحت ان موضوعات پر گفتگو کی جا رہی ہے۔ان سوالات پر خاموشی اختیار کر لینے سے انسانی حقوق کی پامالی بند نہیں ہوگی۔ایک صحت مند جمہوریت میں ان سوالات کی معنویت ہے۔جیسا کہ باباصاحب امبیڈکر نے بھی کہا کہ قانون کتنا بھی اچھا کیوں نہ ہو اگر اس کو نافذ کرنے والے لوگ محکوم طبقات سے نہیں آئیں گے تو اس کا فائدہ محکوم طبقات تک نہیں پہنچ پائے گا۔

اس فرقہ وارانہ ذہنیت کی ایک وجہ پولیس تھانوں میں تنوع اور تکثیریت کی عدم موجودگی ہے۔جس ادارے میں سماج میں پائی جانے والی تکثیریت کی عکاسی نہیں ہوتی ہے وہ ادارہ تنگ نظری کے خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ پاتا ہے۔ مثال کے طور پر جہاں مختلف مذاہب اور ذات برادری اور علاقے سے تعلق رکھنے والے لوگ ایک ساتھ رہتے ہیں اور ایک ساتھ مل کام کرتے ہیں وہاں کسی فرقے کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہونے کے امکانات نسبتاً کم ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بہت سارے ملکوں میں اقلیتوں کو پولیس میں شامل کرنے کی بات پر زور دیا گیا ہے۔

جس ملک میں پولیس کے اندر اکثریتی طبقے کی غالب اکثریت ہوتی ہے وہ اکثر اقلیتوں کے خلاف ظلم و زیادتی کرتی ہے۔بھارت میں جہاں مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا رہا ہے وہیں افغانستان میں شیعہ، تاجک اور ازبک، پاکستان میں بنگالی مسلمانوں، سری لنکا میں تامل اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا ہے۔یوروپ اور امریکہ میں بھی سیاہ فام اقلیتوں کو ٹارگیٹ کیا جاتا رہا ہے۔اس لیے پولیس میں اقلیتوں کی واجبی نمائندگی کی بات کرنا کسی بھی طرح سے پولیس کے حوصلے کو پست کرنا نہیں ہے۔نہ ہی تکثیریت کی بات کرنا اکثریتی طبقے کی مخالفت کرنا ہے۔

اس کے علاوہ پولیس کے تربیتی کورسز میں بھی تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔سیکولرازم، ہندو مسلم اتحاد، رواداری اور مشترکہ تہذیب جیسے موضوعات کو پولیس والوں کو بہتر طریقے سے سمجھانے کی ضرورت ہے۔یہ بات ماہرین بھی قبول کرتے ہیں کہ ان کے اندر بیٹھے ہوئے فرقہ پرستی کے کیڑے کو نکال کر باہر پھینکنے کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی

پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی

سال	علاقہ	نمائندگی
1921	برٹش انڈیا	50%
1935	برٹش انڈیا	48%
1947	یوپی	40%

(حوالے: عمر خالدی کی کتاب "خاکی اینڈ ایتھنک وائلنس" تھری ایسیز کلکٹیو، نئی دلی، ۲۰۰۳، صفحہ ۷۲)

ہے۔اتر پردیش کے مختلف ضلعوں میں کام کرنے والے پولیس افسر وبھوتی نرائن رائے نے بھی اپنی کتاب "کمباٹینگ کمیونل کنفلکٹز (۱۹۹۹)" میں ان مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ "یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ نامور ماہر عمرانیات، نفسیات اور بشریات کو تربیتی کورس بنانے میں شامل کیا جانا چاہیے۔ سیکولرازم، بنیاد پرستی کے خطرات، رواداری کی اہمیت جیسے موضوعات کو پولیس ٹریننگ میں شامل کرنا چاہیے (ص۱۲۶)"۔

در حقیقت جس سماج میں اقلیتی حقوق کا احترام کیا جاتا ہے اور ان کو سماج کے ہر شعبے میں نمائندگی دی جاتی ہے وہ سماج زیادہ مضبوط ہوتا ہے اور اس کے اندر مشکلات سے لڑنے کی زیادہ طاقت پیدا ہوتی ہے۔ کسی بھی جمہوریت کی کامیابی اور انسانی حقوق کے تحفظات کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ اقلیتوں کو مضبوط کیا جائے اور ان کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ ان کو اکثریتی طبقے کی عددی تعداد سے مغلوب اور مرعوب نہیں کیا جائے گا۔ پولیس میں مسلم نمائندگی پر بحث اور اس کے اندر تنوع اور تکثیریت کا مطالبہ اسی جذبے کے تحت کیا جا رہا ہے۔ اس امر سے بہت ساری تفتیشی ایجنسیوں اور دانشوروں نے بھی اتفاق کیا ہے اور ان کا مطالبہ رہا ہے کہ مسلمانوں کی شرح نمائندگی کو بڑھانے کے لیے اقدام کیے جائیں۔

جیسا کہ گزشتہ ہفتے کے مضمون میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ سامراجی برطانوی حکومت نے پولیس کا ظالمانہ استعمال جنگ آزادی کے مجاہدوں کو نشانہ بنانے میں کیا۔ مگر انگریزوں کے دور حکومت میں پولیس کسی خاص مذہبی فرقے کو جان بوجھ کر ٹارگیٹ نہیں کیا کرتی تھی۔اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انگریزوں کے دور میں فرقہ وارانہ فسادات منصوبہ بند نہیں تھے۔۱۹ ویں صدی کی آخری دہائی کے بعد ایک کے بعد ایک فسادات رونما ہوئے اور ان میں کافی جانیں گئیں۔ہندو اور مسلمان دونوں اس کے شکار ہوے۔ان فسادات کا سب سے برا دور تقسیم ملک کا وقت تھا جب لاکھوں کی تعداد میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصانات ہوئے۔ مورخین ان سب کے لیے برطانوی حکومت کو بھی موردالزام ٹھیراتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ برطانوی پولیس فرقہ پرست تھی۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حکومت مذہب کے معاملے میں عموماً غیر جانب دار تھی۔ پولیس میں نہ تو ہندوؤں کی پوری طرح سے بالادستی حاصل تھی اور نہ ہی مسلمانوں کی۔یہ ضرور تھا کہ انگریزی حکومت کی پولیس اور فوج سے متعلق پالیسی بدلتی رہی اور اس کے اندر بھی ایک طرح کا تعصب پایا جاتا تھا۔ اس کی

۳۰ جون ۱۹۴۷ کو پولیس افسران کا تشکیلی جز

جملہ	516
یوروپینس	323
ہندو	130
مسلمان	63(12%)

(حوالے: عمر خالدی کی کتاب "خاکی اینڈ ایتھنک وائلنس" تھری ایسیز کلکٹیو، نئی دلی، ۲۰۰۳، صفحہ ۵۹)

پالیسی بھی وقت کے ساتھ زیادہ وسیع ہوتی گئی اور اس نے فوج اور پولیس کے اعلیٰ عہدوں میں ہندوستانیوں کے لیے دروازے بڑی دیر سے کھولے جس پر قومی تحریک کے لیڈروں نے خوب تنقیدیں کی تھیں۔

۱۸۵۷ کی بغاوت کے وقت انگریزوں کے خلاف بنگال رجمنٹ نے نمایاں رول ادا کیا جس میں اودھ اور بہار کے اعلیٰ ذات کے ہندو اور مسلمان شامل تھے۔دیگر رجمنٹ جیسے مدراس اور بامبے نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس وقت سکھ، دیگر پنجابی، گورکھا اور گڑھوالی جوانوں نے انگریزوں کی حمایت کی۔۱۸۵۷ کی بغاوت کے تجربات نے انگریزی پولیسی پر گہرا اثر چھوڑا اور انہوں نے فوج سے متعلق اپنی پالیسی بدلنی شروع کر دی۔اس نے "مارشَل ریس" یعنی لڑاکو نسل کی پالیسی کو اپنایا۔اس کے تحت متعدد نسل، مذہبی فرقہ کے لوگ، جن کا رنگ گورا، سینا چوڑا، اور جو دشواریوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، ان کو فوج میں ترجیحات دی گئیں۔توجہ طلب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے ۱۸۵۷ میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا وہ ان کی نظر میں مارشل ریس کہلائے اور ان کے لیے فوج کے دروازے کھول دیے گئے۔در حقیقت کسی بھی فرقے کو مارشل ریس میں شامل کرنا اور اس سے باہر رکھنا ایک قسم کی نسل پرستی تھی۔ ڈوگرا، گڑھوالی، گورکھا، جاٹ، مراٹھا، پٹھان، پنجابی (جن میں تمام مذہبی گروہ شامل ہیں)، راجپوت، دکنی، موپلا مسلمان اور کمایوں کے باشندوں کو مارشل ریس کہا گیا۔ وہیں گرم اور میدانی علاقوں میں رہنے والوں کو فوج کے لیے نااہل اور غیر صلاحیت مند قرار دیا گیا۔ان کو یہ کہہ کر بدنام کیا گیا کہ ان کا سیاہ رنگ اور موٹا بدن فوج کی ڈیوٹی کے لیے موزوں نہیں ہے۔۱۸۵۷ سے لے کر دوسری عالمی جنگ تک مارشل ریس کی پالیسی چلتی رہی۔ مگر اس پالیسی کی نسل پرستی دیکھیے کہ جب فوج میں اعلیٰ محکموں پر تقرری کی بات آتی تو وہاں جگہ انگریزوں کو ہی ملتی تھی۔ ہندوستانیوں کو بڑے عہدوں پر جگہ پانے کے لیے لمبا انتظار کرنا پڑا اور عالمی جنگ اول سے صورت حال بدلنی شروع ہوئی۔ انگریزوں کی ان پالیسوں کی کانگریس نے کھل کر مخالفت کی تھی۔

عمر خالدی نے اپنی کتاب "خاکی اینڈ ایتھنک وائلنس" (۲۰۰۳) میں ان پہلوؤں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور انہوں نے کانگریس لیڈران کی انگریزوں کی مارشل ریس پالیسی کی مخالفت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔"انڈین نیشنل کانگریس (اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی تنظیم) نے برٹش راج کی تقرری کی پالیسی کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ پالیسی وسیع نہیں ہے اور تعصب پر مبنی ہے اس نے اس بات پر زور دیا کہ فوج کے مواقع سب سماج کے ہر طبقے کے ہندوستانیوں کے لیے کھلے ہونے چاہیے (ص۔۶)"۔تضاد دیکھیے کہ جس پارٹی نے تنوع پر مبنی فوجی پولیسی کا مطالبہ انگریزوں سے کیا تھا وہ خود اسی کو نافذ کرنے میں قاصر ثابت ہوئی جب سرکار کی کمان اس کے ہاتھوں میں آگئی۔

انگریزوں کے دور حکومت میں مسلمانوں پر مشتمل کوئی خالص رجمنٹ نہیں تھا۔ مسلمانوں پر مشتمل پانچ یونٹ ضرور تھے، مگر کوئی رجمنٹ نہیں تھا جیسا کہ دوسرے فرقوں کے لیے بنایا گیا تھا۔اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ۱۸۵۷ کی بغاوت میں مسلمانوں نے نمایاں رول ادا کیا تھا اور اس کو انگریز یاد رکھے ہوئے تھے۔اس کے علاوہ برطانوی حکومت کو اس بات کا بھی شک تھا کہ بھارت کے مسلمان ملک کو آزاد کرانے کے لیے افغانیوں کی مدد لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر حالات نے کچھ اس طرح کروٹ لیا کہ انگریزوں کو فوج کے دروازے سب کے لیے کھولنے پڑے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران بڑی تعداد میں جوانوں کی ضرورت فوج میں تھی۔

۱۸۵۷ کی بغاوت کے چار سال بعد پولیس ایکٹ لایا گیا اور اس طرح جدید پولیس کا وجود سامنے آیا۔بسا اوقات پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب ان کی آبادی سے بھی زیادہ تھا۔۱۹ ویں صدی سے لے کر ۲۰ ویں صدی کی دوسری دہائی تک پنجاب، بامبے اور یونائٹید پروونسز (آج کا اتر پردیش) کی پولیس میں مسلمانوں کی شرح کُل پولیس تعداد کی ۵۰ فی صد تھی۔جہاں تک بات راجے رجواڑوں کی تھی تو وہاں جو راجا ہوتا تھا اس کے پاس ہی پولیس کی تقرری کرنے کا اختیار تو ہوتا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ جس مذہب یا فرقے سے راجا کا تعلق ہوتا تھا، پولیس بھی اسی مذہب سے بھرتی کی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر جموں اور کشمیر کے راجا نے پولیس میں ڈوگرا اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو بھرتی کر رکھا تھا اور اپنی متعصبانہ پالیسی کے تحت مسلمانوں کو اس سے باہر رکھا تھا۔ مسلمان جموں اور کشمیر میں اکثریت میں ہونے کے باوجود بھی پولیس محکمہ سے دور رکھے گئے تھے اور ان کو دیگر محکموں سے بھی باہر رکھا گیا تھا، جس کے خلاف شیخ عبداللہ کی قیادت میں مسلمان اپنے حقوق کے لیے سڑکوں پر اتر گئے

تھے۔حیدر آباد میں صورت حال اس کے مختلف تھی۔ وہاں کا حکمراں نظام ایک مسلمان تھا اور جنتا کی اکثریت ہندوؤں کی تھی۔حیدر آباد میں زیادہ تر پولیس مسلمان تھے، مگر غیر مسلمانوں کے لیے پولیس محکمے کے دروازے بند نہیں تھے۔

آزادی کے وقت مسلمانوں کی نمائندگی فوج اور پولیس میں بہتر تھی۔ کہیں کہیں وہ اپنی آبادی کے آس پاس نمائندگی پائے ہوئے تھے تو کہیں یہ نمائندگی ان کی آبادی سے بھی زیادہ تھی۔انگریزی فوج میں مسلمان ۳۰ سے ۳۶ فی صد تھے جبکہ سکھ ۸ فی صد تھے۔ باقی کی ۶۰ فی صد نمائندگی ہندو، عیسائی، گورکھا اور دیگر فرقے پر مشتمل تھی۔جب کہ ۳۰ جون ۱۹۴۷ تک ۵۱۶ انڈین پولیس افسروں میں ۶۳ مسلمان تھے جو کہ ان کی آبادی کا ۱۲ فی صد تھا۔ہندو افسروں کی تعداد مسلمانوں سے دُگنی یعنی ۱۳۰ تھی، جبکہ اس کا بڑا حصہ یعنی ۳۲۳ یوروپین ہڑپ کر بیٹھے تھے۔ آزادی کے بعد مسلمانوں کے بہت سارے افسران پاکستان چلے گئے جس سے ان کی شرح کم ہو گئی۔

debatingissues@gmail.com

پولیس میں مسلمانوں کی جگہ نہیں!

تعصب و مسلم مخالف ایجنڈہ کو تھوپنے کے لیے پولیس کا استعمال نیا نہیں

برٹش انڈیا سے آزادی کے بعد کے حالات کا ایک تحقیقی جائزہ

ابھے کمار، دلی

تقسیم ہند کے وقت ایک بڑی فرقہ وارانہ سازش رچی گئی۔ مسلمانوں کی ملک اور ریاست کے تئیں حب الوطنی اور وفاداری کو مشکوک قرار دے کر ان کی پولیس اور فوج میں تقرری پر پابندی عائد کی گئی۔ آج بھی ملک کے نظام میں یہ مسلم مخالف تعصب جڑ پکڑ کر بیٹھا ہوا ہے، جسے اکھاڑ پھینکنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔

آزادی کے وقت پولیس میں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں تھے۔ ۱۹ ویں صدی سے ۲۰ صدی کی دوسری دہائی تک برٹش انڈیا کے اہم صوبوں اتر پردیش، پنجاب اور بامبے میں مسلمانوں کی پولیس میں نمائندگی ۵۰ فی صد تھی۔ جہاں تک بات اتر پردیش کی ہے تو وہاں آزادی کے وقت تک شرح تھوڑی ضرور کم ہوئی، مگر پھر بھی یہ ۴۰ فی صد کے آس پاس تھی جو مسلمانوں کی آبادی سے زیادہ تھی۔ یہ بات ہندو فرقہ پرستوں کے دلوں میں ٹیس مار رہی تھی۔ ان کا مسلم مخالف ایجنڈا دن رات اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کو پولیس محکمے سے باہر کیا جائے اور ان کی شمولیت پر پابندی لگائی جائے۔ اس کے لیے وہ کوئی بہانہ تلاش کر رہے تھے۔ حالانکہ فرقہ پرست ۱۹۳۰ کی دہائی سے ہی مسلمانوں کی آبادی سے زیادہ نمائندگی کو ایشوز بنائے ہوئے تھے۔ مگر تقسیم ملک اور قیام پاکستان نے انہیں اپنے ایجنڈے کو نافذ کرانے کا موقع فراہم کر دیا۔

۱۹۴۰ کی دہائی سے ہی ماحول میں جو کشیدگی پیدا ہونی شروع ہوئی تھی وہ ۱۹۴۷ تک پہنچتے پہنچتے پھٹ پڑی۔ ہندو بنام مسلمان کی سیاست کی اونچی اونچی لپٹیں سب کچھ جلا رہی تھی۔ ان سب کے لیے بلاشبہ اس وقت کے سیاست داں ذمہ دار تھے۔ برطانوی حکومت، کانگریس، مسلم لیگ اور ہندو اور مسلم فرقہ پرست تنظیموں نے سب کو مایوس کیا۔ مگر سب سے زیادہ قصور وار شاید کانگریس اور مسلم لیگ تھیں، جن کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ مل بیٹھ کر فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تلاش کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو لاکھوں لوگوں کی جانیں بچالی جاتیں اور ان سے کہیں زیادہ لوگ زخمی اور بے گھر نہ ہوتے۔ تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی۔ جو بھی بڑے افسر تھے اور اثر و رسوخ رکھتے تھے ان میں سے ایک بڑی تعداد ان کو ایک طرح سے بے سہارا چھوڑ کر پاکستان چلی گئی۔ اگر کہا جائے کہ اس وقت مسلمان بہت حد تک بے یار و مدد گار تھے تو غلط نہیں ہوگا۔ ان کے خلاف تعصب ہر طرف کھلے طور پر برتا جانے لگا۔ ہندو فرقہ پرستوں نے ماحول ایسا بنایا کہ ہزاروں سال سے رہ رہے مسلمانوں کو اچانک سے ان ہی کے ملک میں ”غیر“ تصور کیا جانے

لگا۔ ان کی ملک کے تئیں حب الوطنی اور وفاداری پر سوالیہ نشان کھڑے کیے جانے لگے۔ اس تعصب کو پھیلانے میں ہندو فرقہ پرست طاقتیں ذمہ دار تھیں، مگر سیکولر طاقتوں نے بھی اسے دور کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی سیکولر قیادت مسلم مخالف جذبات کو دور کرنے کے لیے موثر اقدامات اٹھا پائی۔ بعض اوقات تو فرقہ پرست اور سیکولر طاقتوں کی ملی بھگت بھی سامنے آئی ہے۔ مثال کے طور پر ہندو فرقہ پرست سیاسی تنظیم ہندو مہاسبھا اور سیکولر کانگریس کے بہت سارے اہم لیڈروں نے مل کر کام کیا۔ یہ کڑوی سچائی ہندوستانی سیکولرازم کے اوپر ایک بڑا سوال کھڑا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے اسکالر ہندوستانی سیکولرازم پر اعتراضات ظاہر کرتے ہیں اور یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس کے اندر سے ہندو اکثریت پرستی کی بو آتی ہے۔ اسی ہندو اکثریت پرستی کے زیر اثر اس وقت بہت سارے سیکولر کانگریسی رہنما سرگرم تھے۔ اتر پردیش کے ٹاپ کانگریسی لیڈر اور پریمیم پرائم منسٹر وزیر اعلیٰ گوبند بلبھ پنت ایسے ہی ایک فرقہ پرست اور مسلم مخالف رہنما تھے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے بعد وہ اتر پردیش صوبے میں بنی حکومت کے پرائم منسٹر بنے۔ ان کے دور حکومت میں بہت سارے ایسے فیصلے لیے گئے جن کی وجہ سے صوبے کے مسلمانوں میں کانگریس کے تئیں خوف پیدا ہونا شروع ہونے لگا اور ان سے مسلم لیگ کے اس موقف کو تقویت ملی کہ کانگریس ایک ”ہندو“ پارٹی ہے۔

مثال کے طور صوبہ اتر پردیش کے پرائم منسٹر پنت نے ۱۹۳۹ میں پریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان اپنی آبادی سے کہیں زیادہ پولیس میں نمائندگی حاصل کیے ہوئے ہیں اور اس طرح وہ ہندوؤں کا حق مار کر بیٹھے ہیں۔ اس طرح واویلا کھڑا کرنے میں پنت کی یہ نیت تھی کہ وہ ہندو فرقے میں اپنی مقبولیت کو بڑھائیں۔ پریس کو انہوں بتایا کہ ”مسلمانوں کی آبادی ۱۴ فی صد ہے لیکن ان کی پولیس میں نمائندگی

ان کی آبادی سے کہیں زیادہ ہیں۔ مثال کے طور پر ۵۶ فی صد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس ہندو ہیں، جبکہ ۲۸ فی صد مسلمان ہیں۔ وہیں پولیس انسپکٹر کے عہدے پر ۶۴ فی صد ہندو ہے اور ۴۳ فی صد مسلمان ہیں (حوالہ: عمر خالدی، خاکی اینڈ اتھنک وائلنس، ۲۰۰۲، ص۔ ۷۲)۔

توجہ طلب ہے کہ جو اعداد و شمار پنت نے پریس کے سامنے پیش کی تھیں وہ کہاں تک صحیح تھیں یہ کہنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی فرقے کی بنیاد پر اطلاعات جمع کرنا ایک آسان کام نہیں ہے۔ مگر اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی نمائندگی ان ہندو فرقہ پرست لیڈروں کے لیے بالکل بھی قابل قبول نہیں تھی۔ ان کو اس بات کا ڈر تھا کہ وہ کیسے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ملک کی سلامتی کو سونپ سکتے ہیں؟

مگر ان کے سامنے کچھ دشواریاں بھی تھیں۔ اگر مسلمان بڑی تعداد میں پولیس اور فوج میں نوکری کر رہے تھے تو ان کو اچانک کیسے باہر کیا جا سکتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کوشش ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کی دہائی میں کامیاب نہیں ہوئی۔ آزادی کے وقت ان کو ایک کھلا میدان مل گیا تھا۔ مسلم لیگ آس پاس نہیں تھی۔ بڑے مسلم رہنما اور مسلم متوسط طبقہ کا ایک بڑا حصہ پاکستان ہجرت کر چکا تھا۔ ہر طرف مسلم مخالف ماحول بن چکا تھا۔ کانگریس بھی ہندو فرقہ پرستوں کے ساتھ سمجھوتا کرنے کو تیار تھی۔ ملک کی تقسیم نے فرقہ پرستوں کا کام بڑا اسان بنا دیا۔ ملک کی تقسیم کے لیے بھارت میں مسلم لیگ (مسلمان) کو قصور وار قرار دے دیا گیا۔ اس پروپگنڈے کو پھیلانے میں سیکولر جماعت کانگریس آگے تھی کیونکہ اس سے اس کی کمیاں ڈھکی جا سکتی تھیں۔ یہ وہی گوشہ تھا جہاں سیکولر اور کمیونل کا فرق مٹ جاتا تھا۔ بعد کے دنوں میں سرکاری پروپگنڈے سے ان باتوں کو درسی نصابوں سے لے کر عوام کے ذہنوں تک پھیلا دیا گیا۔ مگر اس کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ رائے عامہ میں مسلمانوں کی شبیہ مسخ کر دی گئی اور آج تک ان کی ملک کے تئیں وفاداری پر سوال اٹھائے جاتے ہیں۔ یہ بات سننے میں کڑوی لگتی ہے مگر یہ حقیقت ہے۔ ہندوستان کی سیکولر جمہوریت ان حقائق کو نظر انداز کر مضبوط نہیں ہو سکتی۔

ملک کی تقسیم ہونے سے کچھ ہی دن پہلے ہندو مہاسبھا نے اتر پردیش میں مسلمانوں کی آبادی سے زیادہ نمائندگی کا مسئلہ پھر چھیڑ دیا۔ اب اس کا رخ پہلے سے کہیں زیادہ جارحانہ تھا۔ صوبے کی کانگریس حکومت کو اس نے یہ دھمکی دے ڈالی کہ اگر اس کے مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا تو وہ یکم اگست ۱۹۴۷ سے ”ڈائریکٹ ایکشن“ احتجاج شروع کر دے گی۔ اس وقت کی کانگریس لیڈر شپ کا موقف بھی ہندو مہاسبھا سے میل کھاتا تھا۔ ہندو مہاسبھا کے مطالبات پر عمل کرنے کی یقین دہانی کے لیے خود حکمراں پنت سامنے ائے اور انہوں نے کہا کہ پولیس محکمے کی ”خامیوں“ کو دور کیا جائے گا۔ ہندو فرقہ پرستوں کی نظر میں پولیس محکمے میں مسلمانوں کی متناسب نمائندگی یا آبادی سے زیادہ نمائندگی ایک ”خامی“ تھی۔ اپنے جواب میں پنت نے کہا کہ ”جہاں بھی کمپٹیشن پر مبنی امتحان کے علاوہ انتخاب کیا جائے گا، آبادی کی بنیاد پر مختلف فرقوں کی تقرری کی جائے گی۔ خامیوں کو دور کرنے کے لیے ایک نئی پالیسی نافذ کی جا رہی ہے (عمر خالدی، ص۔ ۷۳)۔“

اسی دوران پنت نے ایک اور بیان جاری کیا اور کہا کہ پولیس محکموں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے اندر ملک کے تئیں ”وفاداری“ پائی جاتی

ملک کی تقسیم نے فرقہ پرستوں کا کام بڑا اسان بنا دیا۔ ملک کی تقسیم کے لیے بھارت میں مسلم لیگ (مسلمان) کو قصور وار قرار دے دیا گیا۔ اس پروپگنڈے کو پھیلانے میں سیکولر جماعت کانگریس آگے تھی کیونکہ اس سے اس کی کمیاں ڈھکی جا سکتی تھیں۔ یہ وہی گوشہ تھا جہاں سیکولر اور کمیونل کا فرق مٹ جاتا تھا۔ بعد کے دنوں میں سرکاری پروپگنڈے سے ان باتوں کو درسی نصابوں سے لے کر عوام کے ذہنوں تک پھیلا دیا گیا۔ مگر اس کا یہ نتیجہ سامنے آیا کہ رائے عامہ میں مسلمانوں کی شبیہ مسخ کر دی گئی اور آج تک ان کی ملک کے تئیں وفاداری پر سوال اٹھائے جاتے ہیں۔

ہے۔ اپنے ایک انتہائی فرقہ وارانہ بیان میں پنت نے کہا کہ ”ہم لوگوں نے ملٹری پولیس کو مضبوط کرنے کے لیے اقدامات اٹھانے شروع کر دیے ہیں، جن میں ابھی تک ۳۷ فی صد مسلمان ہیں۔ پولیس کی نئی کمپنیوں کی تشکیل دینے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اور بھی تقرریوں کا کام جاری ہے تاکہ سول ڈیفنس کو مضبوط کیا جائے۔ ریاست کے ساتھ وفاداری رکھنا اس سروس کے لیے بنیادی شرط ہوگی (عمر خالدی، ص۔ ۷۴)۔“

ریاست اور ملک کا وفادار کون ہوگا؟ اس کا جواب تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ یہ فرقہ وارانہ بیانیے کا حصہ ہے کہ ملک کے تئیں وفادار اکثریتی طبقے کو سمجھا جاتا ہے اور اقلیتوں اور دیگر محکوم طبقات کو ”وطن دشمن“ کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ ہندو مسلم تنازعہ پر دہائیوں سے تحقیق کرنے والے نامور مورخ گیانندر پانڈے نے اپنے ایک مضمون ”Can Muslim Be An Indian ?، ۱۹۹۹ (کیا مسلمان ہندوستانی ہو سکتے ہیں)“ میں انہی سوالوں کو اٹھایا ہے۔ پانڈے کی دلیل ہے کہ جب کبھی بھی کوئی ”نیشن“ یعنی قوم کا وجود کھڑا کیا جاتا ہے تو اس کا ایک ”Core“ یعنی لازمی، فطری پہلو یا حصہ گڑھا جاتا ہے۔ یہ کور اس قوم کی روح ہے اور مین سٹریم بھی اسی کور کے ہم معنی بتایا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کور میں کون شامل ہیں؟ یا پھر کن لوگوں پر یہ کور مشتمل ہے؟

قومیت کے نظریہ کے زیر اثر کور کسی بھی ”نیشن اسٹیٹ“ یعنی قومی ریاست میں بسنے والا اکثریتی طبقہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بھارت کے ”مین سٹریم نیشنلزم“ میں کور اکثریتی ہندو قرار دیا جاتا ہے۔ اس عمل کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ جب کور ہوگا تو کور سے باہر بھی ایک گوشہ ہونا لازمی ہے۔ کور سے باہر کا گوشہ کن لوگوں پر مشتمل ہے؟ اقلیت، محکوم طبقات، جو اکثریت فرقے سے باہر ہیں، ان کی جگہ اس باہری گوشہ میں ہے۔ اس تقسیم اور درجہ بندی کی وجہ سے اقلیت اور محکوم طبقات پر ہمیشہ اپنی وفاداری ثابت کرنے کے لیے دباو بنایا جاتا ہے۔ اسی نظریہ کے تحت اقلیتوں کو قومی ریاست میں رہنے تو دیا جاتا ہے، مگر وہ کبھی بھی اس کے کور نہیں بن پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی ہندوؤں سے ان کی حب الوطنی کی سند نہیں مانگے گا۔ نہ ہی ان پر ملک کے تئیں وفاداری ثابت کرنی کی ذمہ داری تھوپی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان کے لیے جاسوسی کرتے ہوئے جب کسی ہندو کو پکڑا جاتا ہے تو یہ ایک چھوٹی خبر بن کر دب جاتی ہے، مگر جب کوئی مسلمان اسی الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے تو اس بہانے کروڑوں مسلمانوں کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔

آر ایس ایس کے نظریہ ساز اور جن سنگھ کے سابق قومی صدر بلراج مدھوک نے بھی اپنی کتاب ”انڈیانائزیشن“ (۱۹۷۰) میں بھی مسلمانوں کی حب الوطنی پر سوالیہ نشان کھڑا کیا ہے اور ان کے سامنے بہت ساری شرائط رکھیں، جن کو پاس کرنے کے بعد ہی مسلمان سچے معنوں میں ہندوستانی قرار دیے جائیں گے۔ مدھوک مزید کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا وجود ”قوم کے ادھورے پن“ کی یاد دلاتا ہے۔ اس لیے اقلیتوں پر تب ہی یقین کیا جا سکتا ہے جب وہ پوری طرح سے ہندوستانی ہو جائے۔ مگر ہندوستانی کیسے بنا جا سکتا ہے؟ مدھوک کا سچا ہندوستانی بننے کا ٹیسٹ پاس کرنے کے لیے مسلمانوں کو اپنی مذہبی تشخص کی بہت ساری چیزوں کو ترک کرنا ہوگا۔ اگر مدھوک کی ان شرائط کو غور سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ ملک کے آئین میں دیے گئے مذہبی اور ثقافتی آزادی کے بنیادی حقوق کو غصب کرنے کی ایک بڑی سازش ہے۔

سال ۱۹۴۷ میں سر سیتارام کی قیادت میں ”پولیس ری آرگنائزیشن کمیشن“ کی تشکیل کی گئی۔ اس کمیشن کے سامنے ہندو مہاسبھا کے صدر مہنت دگ وجے ناتھ نے متناسب نمائندگی کی بنیاد پر ہندوؤں کے لیے نمائندگی کا مطالبہ رکھا اور یہ بھی کہا کہ ہندوؤں کی غیر متناسب نمائندگی کی وجہ سے ان کا پولیس پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر یہ بات آج مسلمان کہتے ہیں کہ ان کی نمائندگی پولیس میں نہیں کے برابر ہے اور پولیس اکثر مسلم مخالف ذہنیت سے کام کرتی ہے تو ان کو ”اینٹی نیشنل“ قرار دیا جاتا ہے۔ میڈیا بھی پولیس میں تنوع کی وکالت کرنے والوں پر ٹوٹ پڑتا ہے اور متناسب نمائندگی کی بات کہنے پر پولیس محکمے کو کمیونل بنانے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

مگر ان دنوں ہندو مہاسبھا کے صدر کچھ اسی طرح کی دلیل پیش کر رہے تھے اور ان کی دلیل کسی کو کمیونل یا ”ملک دشمن“ نہیں لگ رہی تھی۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مہاسبھا کے صدر نے بہت سے حقائق غلط

پیش کیے۔ اول یہ کہ پولیس میں مسلمانوں کی نمائندگی ۷۰ فی صد نہیں تھی، جیسا کہ کمیشن کے سامنے وہ بیان کر رہے تھے۔ دوسری بات یہ کہ مسلمان ہندوؤں کی واجب نمائندگی کے خلاف نہیں تھے۔ مگر جس طرح سے اس پورے مسئلے کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا وہ کافی خطرناک تھا۔ یہ بھی بات بالکل غلط ہے کہ ملک کی آزادی میں صرف ایک قوم نے اہم رول ادا کیا تھا اور دوسرے قوموں کے لوگ انگریزوں کے حامی بنے ہوئے تھے۔ در حقیقت انگریزوں کے معاون ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے متعدد لوگ شامل تھے اور ان کی مخالفت میں بھی انہی فرقوں سے لوگ سڑکوں پر اترے ہوئے تھے اور اپنی جان کی قربانیاں دے رہے تھے۔ ہندو مہاسبھا کے صدر مہنت دگ وجے ناتھ نے بڑی آسانی سے مسلمانوں کو انگریزوں کا معاون کہہ توڑالا، مگر انہوں نے کبھی اپنے گریبان میں جھانکنے کی زحمت نہیں کی کہ خود ان کی پارٹی تحریک آزادی سے الگ رہی تھی اور ان کی پوری کی پوری توانائی ہندو مسلم جھگڑے کو اور بڑھا کر چڑھا کر پیش کرنے میں لگ رہی تھی تاکہ قومی تحریک کو کمزور کیا جائے اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ پولیس کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فوج کے دروازے بھی مسلمانوں کے لیے بند کیے جا رہے تھے۔ فوج میں بھی ملک اور ریاست کے تئیں مسلمانوں کی وفاداری مشکوک قرار دی گئی تھی۔ فرقہ پرست، فوج میں بھی پوری کوشش کر رہے تھے کہ جتنی جلدی ہو سکے فوج سے مسلمانوں کی تعداد کو کم کیا جائے اور اس میں ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ بھرا جائے۔ ۱۹۵۳ میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ فوج میں مسلمانوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ ملک کے مختلف ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ کو خطاب کرتے ہوئے، نہرو نے کہا کہ ”ہماری ڈیفنس سروسز میں شاید ہی کوئی مسلمان بچ گیا ہے۔ اگر اسے روکا نہیں گیا تو آگے چل کر حالات اور بھی خراب ہوں گے۔

بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۱۳

دعوت ہفت روزہ نئی دہلی
DAWAT, NEW DELHI
www.dawatweekly.com

29/مارچ
تا 4/اپریل
2020

انسان کی ذاتی شناخت کی آفاقی حیثیت

متنازعہ شہریت ترمیمی قانون کے تناظر میں

سہرتھ پارتھ سارتھی

ایسا عہد حکومت جس میں شہریت کے خلاف پہلے سے کوئی مفروضہ موجود ہو، غیر ملکیوں سے متعلق قانون کمزور ترین افراد کو ان کے حقوق سے محروم کردیتا ہے۔

گزشتہ چند ہفتوں کے دوران گوہاٹی ہائی کورٹ کے ذریعہ سنائے گئے فیصلوں کی پوری ایک سیریز ہے جس سے آسام میں فارین ٹرائیبونلس کو چلانے والی حکومت کی انتہائی درجے کی سفاکی نمایاں ہوتی ہے۔ ان فیصلوں نے حکومت کا دفاع کرتے ہوئے غیر ملکی سمجھ لیے گئے انہیں لوگوں پر غیر معقول بوجھ ڈالنے کا کام کیا ہے جنہیں اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے ایسے معیار کے مطابق شواہد پیش کرنے کو کہا گیا، جو حتمی نتائج کے لحاظ سے پوری طرح سے غلط اور نامناسب ہے۔ بیشتر معاملوں میں حتمی نتائج ڈٹنشن کیمپوں کے لیے کھیپ تیار کرنے اور لوگوں کی شہریت سے محرومی کی صورت سامنے آئے۔ فیصلوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ درخواست دہندگان کے سامنے شہریت کے معاملے میں حصولِ شہرت کے لیے جو معیارات رکھے گئے وہ بہت ہی نامناسب تھے۔ درحقیقت ایسی صورت میں کامیابی کے امکانات بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ ہائی کورٹ کے ذریعہ ۲۰۱۰ سے ۲۰۱۹ کے درمیان دیئے گئے ۷۸۷ احکامات اور فیصلوں کا جائزہ لیا ہے دکش انڈیا کے لیہ ورگھیز اور شروتی نائک نے، جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ۹۷ فیصد معاملوں میں درخواست دہندگان کو غیر ملکی قرار دے دیا گیا۔

ایک شخص کو اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے جن دستاویزات کو موزوں سمجھا گیا ان کی لسٹ کافی حیرت انگیز ہے۔ انتخابی فوٹو شناختی کارڈ، ووٹر لسٹ جس میں درخواست دہندگان کے نام شامل ہوں، لینڈ ریونیو کی رسیدیں، مقامی پنچایت کی جانب سے جاری سرٹیفکیٹ، بینک پاس بک، پرمانٹ اکاؤنٹ نمبر (PAN) کارڈ اور راشن کارڈ جیسے ان میں سے کسی بھی دستاویز کو شہریت کا ثبوت نہیں مانا گیا۔ غور کیا جائے تو ان کے علاوہ اب بچا ہی کیا۔ کورٹ کے مطابق، ہر درخواست دہندہ کو دستاویزی شواہد کے ذریعہ یہ ثابت کرنا تھا کہ اس کے والدین یا آباء و اجداد ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ سے قبل ہندوستانی سرزمین میں موجود تھے۔ آسام کے معاملے میں ایک حتمی تاریخ بھی اس کے لیے دی گئی تھی۔ ساتھ ہی انہیں دستاویزات جاری کرنے والے حکام کی شہادت حاصل کرتے ہوئے آزادانہ طور پر ان کے جواز کو بھی ثابت کرنا تھا۔ مثال کے طور پر کسی خاتون نے اپنے رشتوں کی لڑی ثابت کرنے کے لیے اپنی شادی کی سرٹیفکیٹ پیش کی اور چاہا کہ ٹرائیبیونل اس کے اس سرٹیفکیٹ کو تسلیم کرلے تو درخواست دہندہ پر یہ بھی بوجھ ڈال دیا گیا تھا کہ وہ اس سب کے ساتھ ہی حکام کے سامنے سرٹیفکیٹ کی توثیق کے لیے بھی شواہد پیش کرے۔ ہم خود سے بھی یہ سوال کرسکتے ہیں کہ کیا اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز اور پیچیدہ عمل کوئی ہوسکتا ہے؟

بہ الفاظ دیگر "حقوق رکھنے کا حق" کو شہریت کے مسئلے میں اتفاق کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ایسا عہد حکومت جس میں شہریت کے خلاف پہلے سے کوئی مفروضہ موجود ہو، غیر ملکیوں سے متعلق قانون ہم میں سے کمزور ترین افراد کو حقوق رکھنے کے اس حق سے بھی محروم کردیتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کے ساتھ غیر مساوی انسانوں جیسا برتاؤ کرتا ہے۔

آسام اور ٹرائیبیونل

فارینرز ٹرائیبیونلز (ایف ٹی)، جو نیم عدالتی اداروں کے طور پر کام کرتے ہیں، اصل میں انہیں ۱۹۶۴ میں مرکزی حکومت کے ایک ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے تشکیل دیا گیا تھا۔ ان کا کام اس بارے میں رائے پیش کرنا تھا کہ آیا جن افراد کو ان کے پاس بھیجا گیا ہے وہ فارینرز ایکٹ ۱۹۴۶ کے تحت غیر ملکی ہیں یا نہیں۔ یہ قانون سازی جو درحقیقت نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ ہندوستان میں نقل مکانی کو ریگولیٹ کرنے کے نظریہ سے کی گئی تھی، اس کے تحت ایک غیر ملکی کی تشریح اس اس شخص کے طور پر کی گئی ہے جو ہندوستان کا شہری نہیں ہے۔ یہ قانون حکومت کو ملک کے اندر غیر ملکیوں کے آنے، جانے اور چلنے پھرنے کو کنٹرول کرنے کے لیے وسیع اختیار عطا کرتا ہے۔

آسام میں فارینرز ٹرائیبیونلز نے ریاست کی تاریخ میں ایک انوکھا کردار ادا کیا ہے۔ عام طور پر یہاں ٹرائیبیونلز دو طرح کے معاملات دیکھتے ہیں، ایک تو ایسے لوگوں کے جن کے بارے میں سرحدی پولس نے ریفرنس دائر کیا ہے اور دوسرے الیکٹورل لسٹ میں جن کے نام کے سامنے "ڈی" یا "ڈاؤٹ فل" یعنی مشکوک کا نشان لگا دیا گیا ہو۔ فارینرز ٹرائیبیونلز کے سامنے ۱۹۸۵ میں ہوئے آسام معاہدے کی بنیاد پر ریفرنس دائر کیا گیا۔ یہ معاہدہ ۲۶ مارچ، ۱۹۷۱ کو بنگلہ دیش کی آزادی کے اعلان کے بعد، ریاست میں داخل ہونے کے مسئلے پر دوسری چیزوں کے ساتھ طلبا تحریک کا نتیجہ تھا۔ اس نے متعدد شرائط مرتب کیں، جن میں حکومت کو یکم جنوری ۱۹۶۶ اور ۲۴ مارچ ۱۹۷۱ کے درمیان آسام میں داخل ہونے والے کسی بھی شخص کی شناخت اور غیر ملکی قرار دینے کی ہدایت بھی شامل ہے۔ معاہدے میں کہا گیا ہے کہ شناخت ہو جانے کے بعد ایسے افراد کا نام الیکٹورل رول سے ہٹا دیا جائے۔ مزید برآں، اس معاہدے میں حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ مذکورہ سال کی ۲۵ مارچ کو یا اس کے بعد آسام میں آنے والے افراد کی شناخت کی جائے اور ان کا نام ہٹا دیا جائے

اور انہیں باہر نکال دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ہی ۱۹۹۷ میں ریاست میں انتخابی فہرستوں پر نظر ثانی کی گئی اور تین لاکھ سے زیادہ افراد کو مشکوک رائے دہندگان کے طور پر نشان زد کیا گیا۔ یہ نظر ثانی بغیر کسی پیشگی اور آزادانہ تصدیق کے کی گئی تھی۔ باقی رہ جانے والوں میں سے، تقریباً دو لاکھ افراد کو پہلے ہی ایف ٹی کے پاس بھیج دیا گیا۔

ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری

عام طور پر ۱۸۷۲ کے انڈین ایویڈنس ایکٹ کے تحت، کسی بھی عدالت میں ثبوت کا بوجھ اس شخص پر پڑتا ہے جو دعویٰ کرنے یا کسی حقیقت پر زور دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت ہی ہے جو ایف ٹی کے سامنے کسی شخص کے غیر ملکی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے لہٰذا اسی پر ثبوت پیش کرنے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ لیکن فارینرز ایکٹ کی دفعہ ۹ اس ذمہ داری کو پلٹ دیتی ہے۔ اس میں ریاست کے ذریعہ کسی ایف ٹی میں بھیجے گئے شخص کی ہی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ٹرائیبیونل کے سامنے یہ ثابت کرے کہ وہ حقیقت میں ہندوستان ہی کا شہری ہے۔ ۱۹۸۳ میں، مرکزی حکومت نے، اس بوجھ کی جابرانہ نوعیت کو محسوس کرتے ہوئے، غیر قانونی تارکین وطن (ٹرائیبونل کے ذریعہ طے شدہ) ایکٹ متعارف کرایا۔ اس قانون نے فارینرز ایکٹ کو خارج کرتے ہوئے شہریت ثابت کرنے کی ذمہ داری پوری طرح سے فرد کی جگہ حکومت پر ڈال دی۔ لیکن جولائی ۲۰۰۵ میں سربانند سونووال بنام یونین آف انڈیا مقدمے میں سپریم کورٹ نے اس قانون سازی کو غیر آئینی قرار دے دیا۔ کورٹ نے تاریخ اور حقائق کا تقریباً سرسری جائزہ لیتے ہوئے پایا کہ آسام میں نقل مکانی اسٹیٹ کے خلاف بیرونی حملہ ہے اور اس طرح مرکزی حکومت نے آئین کے آرٹیکل ۳۵۵ کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس طرح سے کورٹ نے شہریت ثابت کرنے کا بوجھ ہمیشہ کے لیے پوری طرح سے فرد کے اوپر ڈال دیا۔

سربانند سونووال بنام یونین آف انڈیا مقدمہ کے اسی فیصلے کو بنیاد بناتے ہوئے گوہاٹی ہائی کورٹ نے فارینرز ٹرائیبیونلز کے فیصلوں کے خلاف دائر مختلف مقدمات میں فیصلے سنائے۔ لیکن فرد پر اپنی شہریت ثابت کرنے کی ذمہ داری کو تسلیم کرتے ہوئے ان فیصلوں سے ابھی تک کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا ہے، جیسا کہ مادھو کھوسلہ نے حالیہ دنوں ایک قابل فہم ٹسٹ کی بنیاد پر خاکہ کشی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ شہریت ثابت کرنے کی ذمہ داری کس سطح اور کس نوعیت کے شواہد کو پیش کرکے ادا کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر، جن افراد پر غیر ملکی ہونے کا شبہ ہے، انہیں اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے نہ صرف دستاویزی شواہد پیش کرنے ہوں گے بلکہ دستاویزات جاری کرنے والے حکام سے انہیں اٹیسٹ بھی کرانا ہوگا، اس طرح کورٹ نے درخواست گزاروں پر ایک ایسی شرط عائد کردی جس کو پورا کرپانا ناممکن ہے۔

گوتم بھاٹیہ نے اپنی ایک تحریر میں ہیومن اینڈ پیپلز رائٹس پر افریقی کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں شاید اس کا حل پیش کرنے کی کوشش ہے کہ اگر فارینرز ایکٹ کے تحت کوئی فرد اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے ایک بار دستاویزات پیش کردیتا ہے تو اب یہ ذمہ داری حکومت پر عائد ہوجاتی ہے کہ وہ فراہم کردہ شواہد کی تردید کا دعویٰ کرے۔ بالآخر، جیسا کہ گوہاٹی ہائی کورٹ نے خود فیصلہ دیا کہ افراد سے یہ امید نہیں کی جاتی ہے کہ وہ معقول شک سے پرے یہ ثابت کریں کہ وہ ہندوستان کے شہری ہیں۔ ان سے صرف یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ امکانات کے توازن پر ہی یہ دکھائیں کہ وہ باہری نہیں ہیں۔ اس طرح کے حالات میں معقول جواب یہی ہوسکتا ہے کہ جب لوگوں نے اپنی شہریت کے ابتدائی ثبوت فراہم کردیئے تو اب بقیہ ذمہ داری حکومت کے اوپر ڈال دی جانی چاہیئے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ہمارے جیسے ملک کے لیے بہت زیادہ پرفیکٹ حل نہیں ہے۔ جہاں غریب اور کمزور ترین افراد اکثر و بیشتر بنیادی چیزوں سے بھی محروم رہ جاتے ہیں وہاں لوگوں سے اپنی شہریت ثابت کرنے کے لیے دستاویزات پیش کرنے کا مطالبہ اپنے آپ میں ایک مشکل ترین مطالبہ ہے۔ عام طور پر ہم حقوق کو آفاقی تصور کرتے ہیں لیکن ماہر سیاسیات ہنّا ارینٹ کا دی اوریجن آف ٹوٹالیٹیریزم میں کہنا ہے کہ، حقیقت میں حقوق حاصل ہونے کے لیے افراد کا ایک سیاسی کمیونٹی سے ہونا ضروری ہے۔ بہ الفاظ دیگر "حقوق رکھنے کا حق" کو شہریت کے مسئلے میں اتفاق کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ایسا عہد حکومت جس میں شہریت کے خلاف پہلے سے کوئی مفروضہ موجود ہو، غیر ملکیوں سے متعلق قانون ہم میں سے کمزور ترین افراد کو حقوق رکھنے کے اس حق سے بھی محروم کردیتا ہے۔ یہ ایسے لوگوں کے ساتھ غیر مساوی انسانوں جیسا برتاؤ کرتا ہے۔ اس نقصان کی بھرپائی کے لیے ہمیں سائلہ بن حبیب کے اس مشورے پر عمل کرنا چاہیئے کہ ہمیں ہر انسان کی اس کی شہریت سے بالاتر اس کی ذاتی پہچان کی ایک آفاقی حیثیت کو تسلیم کرنا چاہیئے۔

(سہرتھ پارتھ سارتھی مدراس ہائی کورٹ کے ایڈوکیٹ ہیں)

***

پولیس میں مسلمانوں کی جگہ نہیں!

بسلسلہ صفحہ نمبر ۵ سے

جو بات مجھے پریشان کررہی ہے وہ یہ ہے کہ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے جارہے ہیں"۔ دریں اثنا مرکزی وزیر مملکت برائے دفاع مہاویر تیاگی نے بھی قبول کیا کہ فوج میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰ سے گر کر ۲ فی صد ہوگئی ہے۔ "تقسیم کے وقت فوج میں مسلمانوں کی نمائندگی ۳۰ فی صد تھی جو کم ہوکر ۲ فی صد ہوگئی ہے۔ ان حالات کو درست کرنے کے لیے میں نے حکم صادر کیا ہے اور مسلمانوں کی تقرری کے لیے ضروری اقدامات اٹھائے جائیں گے (خالدی، ص۔۱۱)۔"

مگر یہ افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے خلاف تعصب کو دور کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں ہوئی۔ سسٹم میں بیٹھے فرقہ پرست لوگوں نے ایسی سازش رچی کہ مسلمانوں کو فوج اور پولیس سے باہر رکھا گیا۔ کشمیر کے سرکردہ رہنما اور نیشنل کانفرنس کے لیڈر شیخ عبداللہ بھی اس بات پر حیران تھے کہ مسلمانوں کے لیے فوج کے دروازے آزاد اور سیکولر ملک میں بھی بند کردیے گئے ہیں۔ ان دنوں ان کے ہاتھ ایک ایسا خفیہ سرکولر آیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو فوج میں شامل نہیں کرنا ہے۔ اس پورے واقعے کو خود شیخ عبداللہ یوں بیان کرتے ہیں۔ "کشمیر کے بھارت میں انضمام کے بعد امیدیں بڑھی تھیں کہ مسلمانوں کے خلاف تقرری پر سابقہ پابندیاں اٹھالی جائیں گی اور وہ فوج میں واجب نمائندگی حاصل کرپائیں گے۔ مگر مجھے کافی حیرت ہوئی جب ایک خفیہ سرکولر میرے علم میں آیا جس میں افسروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو فوج میں شامل نہ کیا جائے۔ (خالدی، ص۔ ۱۲)"۔ بعد میں شیخ عبداللہ نے اس کے بارے میں بہت سارے افسران سے دریافت کیا۔ وزیر دفاع سے بھی بات کی، مگر انہوں نے بھی کہا کہ وہ اس طرح کے سرکولر کے بارے میں نہیں جانتے۔ مگر جب شیر کشمیر نے فیلڈ مارشل کے ایم کری اپا سے پوچھا کہ کیوں کارگل کے مسلمانوں کو فوج میں شامل نہیں کیا گیا ہے؟ تو ان فوجی سربراہ کا جواب یہ تھا کہ ان کی بھارت کی تئیں وفاداری مشکوک ہے!

یہ کسی بھی سیکولر ملک کے لیے بڑا سوال ہے کہ ملک کا سب سے بڑا فوجی افسر اقلیتوں کے خلاف اس طرح کے نفرت انگیز خیالات رکھتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ مسلمان ملک کے لیے قربانی دینے میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں؟ یہاں تک کہ جب وقت پاکستان کے خلاف جنگ لڑنے کا آیا تب بھی ہندوستانی مسلم فوجوں نے اپنا خون بہا کر ملک کا دفاع کیا۔ مگر ان تمام حقائق سے کری اپا جیسے فرقہ پرست ذہنیت والوں نے آنکھ بند کر رکھی ہے۔ کری اپا کا یہی فرقہ وارانہ ذہن انہیں آر

انڈین پولیس افسر اے کے داس نے نامور اسکالر سٹیون ولکنسوں کو دیے گئے ایک انٹرویو میں یہ تسلیم کیا تھا کہ اتر پردیش کی گوبند بلبھ پنت حکومت نے زبانی احکام جاری کیے تھے کہ مسلمانوں کو پولیس میں شامل نہ کیا جائے۔

ایس ایس کی ترجمان میگزین میں خود اپنے قلم سے مضمون لکھنے کے لیے آگے لاتا ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۴ کے روز اپنے ایک مضمون میں کری اپا نے مسلمانوں کی حب الوطنی پر سوال کھڑا کیا اور فرقہ پرست طاقتوں کی سیاست کو تقویت پہنچائی۔ ان سب حالات کو دیکھ کر اس وقت کے دیگر مسلم رہنما بھی پریشان تھے۔ مثال کے طور پر اتر پردیش کے مسلم لیگ کے رہنما چودھری خلیق الزماں نے مسلمانوں کے ساتھ ہورہے تعصب کے بارے میں نہرو کا دھیان مبذول کرایا۔ چودھری خلیق الزماں نے کہا کہ اتر پردیش میں ۸ ہزار نیشنل گارڈز کی تقرری ہونے جارہی ہے اور اس میں مسلمانوں کو شامل نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اگر ایسا ہوتا ہے تو مسلمانوں کی نمائندگی کافی کم ہوجائے گی۔ پنڈت نہرو نے خلیق الزماں کو یہ کہہ کر تسلی دلائی کہ وہ اس معاملے کو متعلقہ وزیر سردار پٹیل کے سامنے رکھیں گے۔ اس سمت میں سردار پٹیل اور نہرو کے درمیان کیا بات ہوئی یہ مزید تحقیق کا موضوع ہے۔ سردار پٹیل سے متعلق یہ بات بھی کہی جاتی رہی ہے کہ انہوں نے ایک ایسا خفیہ سرکولر جاری کیا تھا اور ریاستی وزرا داخلہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو پولیس محکمے سے دور رکھیں۔ پٹیل کے خلاف اس طرح کے الزامات مسلم لیڈران تب سے لے کر ۱۹۷۰ کی دہائی تک لگاتے رہے ہیں۔ اس بات میں کتنی سچائی ہے؟ انڈین پولیس افسر اے کے داس نے نامور اسکالر سٹیون ولکنسوں کو دیے گئے ایک انٹرویو میں یہ تسلیم کیا تھا کہ اتر پردیش کی گوبند بلبھ پنت حکومت نے زبانی احکام جاری کیے تھے کہ مسلمانوں کو پولیس میں شامل نہ کیا جائے۔

مسلمانوں کے خلاف تعصب اور بھید بھاو کی بات صرف شمالی ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھی۔ مدراس پرونس میں بھی آزادی کے بعد مسلمانوں کی پولیس میں تقرری پر پابندی لگادی گئی تھی۔ سال ۱۹۴۷ میں یہ معاملہ مدراس قانون ساز اسمبلی میں بھی اٹھایا گیا۔ جواب میں اس وقت کے وزیر داخلہ ڈاکٹر پی سُبرانیم نے کہا کہ یہ ریاست کی صوابدید کا حصہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو پولیس میں تقرری نہ کرے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۴۷ کے شمارے میں انگریزی روزنامہ "ٹائمز آف انڈیا" کے مطابق، جب مسلم لیگ کے لیڈر محمد اسماعیل نے پوچھا کہ آخر کیوں مسلمانوں کو پولیس سے باہر رکھا جارہا ہے، تو وزیر داخلہ کا جواب تھا کہ یہ معاملہ پوری طرح سے حکومت کی صوابدید کے تحت آتا ہے۔ پھر یہ بھی پوچھا گیا کہ جو "نیشنلسٹ" مسلمان ہیں کیا ان کو پولیس میں جگہ ملے گی؟ نیشنلسٹ مسلمان سے مراد اس زمانے کے کانگریسی مسلمانوں سے تھا جو مسلم لیگ کی سیاست کے مخالف تھے۔ مگر وزیر موصوف نے اس سوال کا جواب بھی ٹالتے ہوئے کہا کہ اس کا جواب وہ اس وقت نہیں دے سکتے ہیں۔

یہ بات ایک بار پھر مورخ گیان پانڈے کی دلیل کو تقویت دیتی ہے کہ ہندوستانی قوم کا کور اکثرت ہندو طبقہ ہی ہے اور اقلیت مسلمان اور دیگر محکوم طبقات کو باہری حاشیہ پر ڈھکیل دیا گیا ہے جہاں ان کو ہر وقت اپنی حب الوطنی اور ملک کے ساتھ وفاداری کا امتحان دینا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی کے وقت مسلمانوں کو جان بوجھ کر فوج اور پولیس سے باہر کردیا گیا اور اس وقت سے لے کر آج تک اس ناانصافی کو دور کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے۔

debatingissues@gmail.com

جذبات مجروح کرنے کے بہانے دلتوں پر حملہ

ہندو دھرم کے ان ٹھیکے داروں سے کوئی یہ کیوں نہیں پوچھتا ہے کہ ان کو کروڑوں ہندوؤں کی ترجمانی کرنے کا لائسنس کس نے دے دیا ہے؟

ابھے کمار

کیا یہ محض اتفاق ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر رتن لال . اور لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھانے والے روی کانت فرقہ پرستوں کے حملوں کے شکار بنے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ امبیڈکر نواز دانشوروں کو دانستہ طور پر ٹارگیٹ اس لیے کیا جا رہا ہے کیونکہ وہ ہندو بنام مسلمان کے فرقہ وارانہ کھیل کو ذات پات پر مبنی عدم مساوات اور سماجی انصاف کی بات کر کے بگاڑ دیتے ہیں۔ جب وہ ذات پات پر مبنی ہندو سماج کی بات کرتے ہیں اور مساوات کی لڑائی لڑتے ہیں تو یہ سب ہندوتو کی مسلم مخالف سیاست میں فٹ نہیں بیٹھتا۔ ہندو فرقہ پرست یہی چاہتے ہیں کہ بھارت اور ہندو سماج کی ساری برائیوں کے لیے مسلمانوں اور ان کے مذہب کو قصوروار ٹھہرا دیا جائے تاکہ ہندو سماج کے اندر قائم اعلیٰ ذاتوں کی بالادستی پر کوئی بات نہ ہو سکے۔ اس لیے ہمیں دلتوں کے سرگرم نمائندوں پر ہو رہے حملوں کو مذہبی جذبات کو مجروح کر دینے تک ہی محدود نہیں کرنا چاہیے۔ ہفتہ کی دوپہر کو ایک اچھی خبر آئی کہ دہلی یونیورسٹی کے ہندو کالج کے ایسوسی ایٹ پروفیسر رتن لال کو دہلی کی ایک عدالت نے ضمانت دے دی۔ انہیں جمعہ کی رات دہلی میں ان کی رہائش گاہ سے سوشل میڈیا پر ایک پوسٹ کرنے پر گرفتار کیا گیا تھا۔ ان پر اس بات کے لیے کیس درج کیا گیا کہ انہوں نے سماج میں فرقہ وارانہ کشیدگی کو پھیلایا اور لوگوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ مقدمہ دائر کرنے کے علاوہ رتن لال کو سوشل میڈیا پر جم کر گالیاں دی گئیں۔ فرقہ پرستوں نے ان کو جان سے بھی مارنے کی دھمکی دی، جس کی وجہ سے انہوں نے وزیر اعظم نریندر مودی کو خط لکھ کر بندوق کے لائسنس کا مطالبہ کیا۔ رتن لال کی پوسٹ بنارس کی گیان واپی مسجد کے فوارے سے متعلق تھی، جس کے بارے میں دائیں بازو کے ہندو گروپ نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ شیولنگ ہے۔ ۵۰ سالہ رتن لال بہار کے مظفر پور کے کرہانی تھانہ علاقے کے لڈورا گاؤں کے ایک دلت گھر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آنجہانی رام بلی پرساد محکمۂ انکم ٹیکس میں کام کرتے تھے۔ رتن لال 1991 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی آئے تھے۔ 2002 میں وہ ہندو کالج کے شعبہ تاریخ میں پروفیسر بنے۔ 2015 کے بہار اسمبلی انتخابات میں وہ ویشالی ضلع کے پاتے پور حلقہ سے آزاد امیدوار کے طور پر انتخابات میں اترے، مگر وہ ہار گئے۔

یاد رہے کہ تقریباً 70 فیصد دلت، جن کو صدیوں تک اچھوت مانا گیا، سماج میں کافی پسماندہ ہیں۔ یا تو ان کے پاس زمین نہیں ہے یا ان کے پاس زمین کا بہت ہی چھوٹا ٹکڑا ہے۔ وہ زیادہ تر زرعی مزدور اور شہروں میں ورکر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ قوانین ہونے کے باوجود ان کے ساتھ آج بھی اچھوت جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ وہ آج بھی ذات پات کے مظالم کے شکار ہوتے ہیں۔ کئی جگہوں پر آج بھی دلتوں کو مندروں میں داخل ہونے سے روکا جاتا ہے۔ گھوڑوں پر سوار ہونے یا اچھے کپڑے پہننے پر ان پر حملہ کیا جاتا ہے۔ دلتوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ اب پڑھ لکھ گیا ہے۔ رتن لال ان میں سے ایک ہیں۔ تعلیمی اداروں میں ریزرویشن کے سہارے کچھ دلت کالج اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر بن گئے ہیں۔ وہ ڈاکٹر امبیڈکر کے نظریہ سے متاثر ہیں اور وہ سماج کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے سماج میں اعلیٰ ذات کی بالادستی کو چیلنج بھی کر رہے ہیں۔ ایسی تبدیلی فرقہ پرست طاقتوں کو بالکل بھی پسند نہیں ہے۔ رتن لال کی پی ایچ ڈی کا مقالہ مؤرخ کے پی جیسوال (1881-1937) پر ہے۔ جیسوال ایک بہت

پروفیسر رتن لال پر حملے کے پیچھے ہندو جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا بہانا بنایا جا رہا ہے۔ اصل مقصد ایک امبیڈکر نواز ایکٹوسٹ کو خاموش کرنا ہے۔ اس طرح مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے نام پر ان جیسے دلت ایکٹوسٹ کو شخصی آزادی اور اظہار رائے کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ یہ خوش آئند ہے کہ عدالت نے انہیں ضمانت دے دی ہے، لیکن ایک آمرانہ ریاست اور جنونی فرقہ پرست طاقتوں کے بیچ امبیڈکر کے مشن کو آگے بڑھانا ایک بڑا چیلنج ہے۔

ہی بااثر تاریخ داں تھے، جنہوں نے کی کتاب 'ہندو پولیٹی' (1924) میں تحریر کی۔ ویدک اور دیگر کلاسیکی ادب کو پڑھ کر، جیسوال یہ دلیل دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ قدیم بھارت کے ہندو دور میں 'خود مختار اسمبلیاں' منعقد ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ قدیم دور میں 'ہندو جمہوریہ' اور 'ہندو امپیریل سسٹم' کے وجود کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ انہیں 2014 میں پی ایچ ڈی سے نوازا گیا۔ مؤرخ جیسوال کے کام کو قوم پرست رہنماؤں نے برطانوی نوآبادیاتی حکمرانوں کے بیانیے کا مقابلہ کرنے کے لیے استعمال کیا، جو ہندوستانیوں کی خود حکمرانی کی صلاحیت پر سوالیہ نشان لگاتے تھے۔ تاہم، جیسوال کے کام کی کمزوری یہ تھی کہ وہ برطانوی مؤرخ جیمس زمل کے فرقہ وارانہ تاریخ نویس کے دائرے سے باہر نہیں نکل پائے۔ جیسوال کا یہ کام 1920 کی دہائی میں شائع ہوا اور ان کی کتاب کو پڑھ کر ہندو فرقہ پرستی کی آگ مزید تیز ہو گئی، کیونکہ وہ ہندو دور کی حد سے زیادہ تعریف کرنے لگے اور بھارت کی تاریخ کو ہندو تاریخ کے طور پر پیش کرنے لگے۔ ایسی باتوں کو جان کر مسلم لیڈروں میں بھی مسلم دور کی جم کر تعریف کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھارت کی تاریخ کو سیکولر نظریہ سے دیکھنے کے بجائے فرقہ وارانہ لینس سے دیکھا جانے لگا۔ رتن لال کا کام اس طرح جدید ہندوستانی تاریخ کے ایسے نازک دور سے متعلق ہے۔

تحقیق اور تدریس کے علاوہ رتن لال صحافت بھی کرتے ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے ویڈیو کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ مشہور یوٹیوب چینل 'امبیڈکر نامہ' کی وجہ سے ان کو دور دور تک لوگ جانتے ہیں۔ اپنے چینل پر، وہ عصری مسائل پر بات چیت اور انٹرویوز کرتے ہیں۔ خاص طور پر وہ مسائل جو پسماندہ کمیونٹی جیسے دلت، آدی واسی اور او بی سی، اقلیت کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ وہ دلت بہوجن آئیڈیالوجی سے اپنی بات کو رکھتے ہیں۔ یہ سب ہندو دائیں بازو اور ان فرقہ پرست طاقتوں کو ہرگز بھی پسند نہیں ہے۔ فرقہ پرست یہ کبھی نہیں چاہتے ہیں کہ ذات پات پر مبنی غیر مساوی سماجی نظام کو موضوع بحث بنایا جائے۔ رتن لال دہلی یونیورسٹی کے ایک معزز کالج میں ایک مقبول استاذ کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کے مداحوں اور پیروکاروں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ان کو کھانا بنانے کا بھی بڑا شوق ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے اساتذہ کی کمیونٹی کے ایک فعال رکن کے طور پر جانے جاتے ہیں جو اکثر ترقی پسند تعلیمی پالیسیوں کے حق میں کھل کر بولتے ہیں۔ اس لیے رتن لال کی گرفتاری کو دلتوں کو خاموش کرنے کی سازش کے ساتھ جوڑ کر دیکھنا چاہیے۔ ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے بہانے، تمام بولنے والے دلتوں کو خاموش کرنے کا بڑا ہندوتو ڈیزائن ہے۔ اعلیٰ ذاتیں، جو ریاست کے اداروں، میڈیا پر قابض ہیں، بہوجن سماج کی ہر ایک تنقیدی آواز کو دبا دینا چاہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی پوسٹ کو جان بوجھ کر طول دیا گیا اور اسے ہندوؤں کے جذبات کو مجروح کرنے سے جوڑ دیا گیا۔ مگر کوئی ہندو دھرم کے ان ٹھیکے داروں سے یہ نہیں پوچھتا ہے کہ ان کو کروڑوں ہندوؤں کی ترجمانی کرنے کا لائسنس کس نے دے دیا ہے؟ اپنے کم وسائل کے باوجود رتن لال جیسے ایکٹوسٹ اسکالر نے اپنی بات دور دور تک پہنچائی ہے۔ سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز کے ذریعے انہوں نے سماج میں مساوات کے حق میں جنگ لڑی ہے۔ اس لیے پروفیسر رتن لال پر حملے کے پیچھے ہندو جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا بہانا بنایا جا رہا ہے۔ اصل مقصد ایک امبیڈکر نواز ایکٹوسٹ کو خاموش کرنا ہے۔ اس طرح مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے نام پر ان جیسے دلت ایکٹوسٹ کو شخصی آزادی اور اظہار رائے کے بنیادی حقوق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ یہ خوش آئند ہے کہ عدالت نے انہیں ضمانت دے دی ہے، لیکن ایک آمرانہ ریاست اور جنونی فرقہ پرست طاقتوں کے بیچ امبیڈکر کے مشن کو آگے بڑھانا ایک بڑا چیلنج ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

Inquilab 24.5.22

غیروں کی نظر میں حضرت محمد صاحب

گاندھی کے ملک میں پیغمبر اسلامؐ کی شان میں گستاخی کی جارہی ہے، مذہبی جذبات کو مجروح کیا جارہا ہے اور سیکولر آئین پر گہری چوٹ کی جارہی ہے

ابھے کمار

انگریزی میں شائع ہونے والے ہفتہ وار رسالہ 'ریڈئنس' کے مدیر اعلیٰ اعجاز احمد اسلم کا ایک پارسَل مجھے کچھ مہینے پہلے ملا۔ انہوں نے میرے لیے کچھ کتابیں بھیجی تھیں۔ حالانکہ ان سے میری جان پہچان بہت پرانی نہیں ہے۔ حالیہ دنوں میں ہی میں ان سے دہلی میں واقع پریس کلب میں ملا تھا۔ اردو صحافت کے جانباز سپاہی مولوی محمد باقر سے متعلق ایک پروگرام میں وہ تقریر کرنے آئے تھے۔ جب میں نے ان کو سُنا اور بعد میں ان سے گفتگو کی تو مجھے اس بات کا احساس ہوگیا کہ وہ بہت ہی پڑھے لکھے اور سنجیدہ آدمی ہیں۔ ہمارے اور ان کے درمیان قربت کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ شمالی بہار میں گزارا ہے، جو میرا وطن عزیز ہے۔ حالانکہ اعجاز اسلم کا تعلق جنوبی ریاست تمل ناڈو سے ہے، مگر درس و تدریس کی خاطر انہوں نے بہار میں کئی دہائیاں وقف کیں۔ اس دن کے بعد سے ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ جب میں نے اعجاز اسلم کا بھیجا ہوا پیکٹ کھولا تو اس میں ۵۷۷ صفحات پر مشتمل ایک کتاب نکلی۔ انگریزی کی اس کتاب کے مصنف کا نام ہے مائیکل ایچ ہارٹ۔ یہ کتاب تاریخ کی سو سب سے اہم ترین اور انتہائی متاثر کن شخصیات کی مختصر سوانح حیات پر مبنی ہے۔ تھوڑی تحقیق کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مصنف امریکہ میں سال ۱۹۳۲ میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق یہودی مذہبی سماج سے ہے۔ ہارٹ کی مذکورہ کتاب دنیا بھر میں کافی مقبول ہوئی۔ اس کی ہزاروں کاپیاں فروخت ہوچکی ہیں۔ دراصل یہ کتاب سال ۱۹۷۸ میں منظر عام پر آئی۔ اس کا دوسرا ریوائزڈ ایڈیشن بھی آچکا ہے۔ کتاب کی اہمیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اب تک اس کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ میں بار بار یہ سوچ رہا تھا کہ اعجاز اسلم نے اگر کوئی کتاب مجھے پڑھنے کے لیے عطیہ کی ہے تو اس میں علم کا کوئی نہ کوئی خزانہ ضرور چھپا ہوگا۔

ہارٹ نے اپنی کتاب میں دنیا کی ۱۰۰ بڑی شخصیات کا ذکر کیا ہے، جیسے آئزک نیوٹن، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، بدھ، کنفیوشیس، سینٹ پال، البرٹ آئن سٹائین، ارسطو، حضرت موسیٰ علیہ السلام، مارٹن لوتھر، کارل مارکس، نپولین بوناپارٹ، افلاطون، اشوک، مہاویر، ماوزیڈونگ، لینن، روسو۔ ان عظیم تاریخی ہستیوں کے افکار اور کارناموں کا ہارٹ نے تجزیہ کیا۔ مصنف کا نتیجہ یہ تھا کہ دنیا میں سب سے موثر شخصیت حضرت محمدؐ ہیں۔ یاد رکھیے کہ یہ بات کسی مسلمان نے اپنے عقیدہ کی وجہ سے نہیں کہی ہے، بلکہ ایک غیر مسلم یہودی نے اپنی سوچ اور اپنے مطالعہ کی بنیاد پر کہی ہے اور ہارٹ نے کس بنیاد پر یہ فیصلہ کیا؟ خود مصنف اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ دینی اور دُنیاوی دونوں معاملوں میں سب سے کامیاب ترین انسان تھے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ کئی بار دین کو دنیا سے الگ کرنے کی بھی کوشش ہوتی ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف عبادت کر لینے سے ہی وہ کامیاب ہوجائیں گے، وہیں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مال و دولت اور اقتدار و شہرت حاصل کرنے کا ہی دوسرا نام کامیاب زندگی ہے۔ مگر رسول کا طریقہ یہ تھا کہ دین اور دنیا میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ نماز کے ساتھ ساتھ غریبوں کی مدد بھی کی جائے۔ مطلب صاف ہے کہ دینی کام اور فلاحی کاموں میں دیوار پیدا نہیں کی جاسکتی ہے۔ ہارٹ مزید لکھتے ہیں کہ حضرت محمدؐ کا بیک گراونڈ بہت ہی معمولی تھا۔ مگر اس کے بعد بھی انہوں نے وہ کر دکھایا، جو مال اور دولت کے پہاڑ پر بیٹھنے والوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ چودہ سو سال گزر جانے

امریکہ سمیت مغربی ممالک پہلے سے ہی بھارت میں بڑھ رہے مسلم مخالف ماحول سے کافی افسردہ ہیں۔ بات تو اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ امریکہ نے اپنی ایک حالیہ رپورٹ میں ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی مقامات پر ہو رہے حملوں پر گہرے افسوس اظہار کیا ہے۔ دراصل یہ بات صرف ایک بیان یا پھر فرد واحد کا خیال کا نہیں ہے۔ یہ بات ایک پیٹرن کی ہے۔ ۲۰۱۴ کے بعد سے مسلمانوں کو وِلن بنا کر اور ان کے مذہب کا خوف دکھا کر اکثریتی طبقہ سے بھگوا سیاسی جماعت ووٹ مانگ رہی ہے۔

کے بعد بھی حضرت محمدؐ کا اثر پوری دنیا محسوس کر رہی ہے۔ آج اسلام ایک عالمی مذہب ہے، مگر ایک زمانہ تھا جب حضرت محمدؐ پر دین وحدت کی بات سمجھانے کے لیے حملے کیے جاتے تھے۔ ان کے دور کا عرب پسماندگی میں مبتلا تھا۔ محمد صاحب چھ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے، مگر آپؐ نے کبھی حوصلہ نہیں ہارا۔ آپؐ پڑھے لکھے نہیں تھے، مگر آپؐ نے خدا کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے دشمن بھی ان کی باتوں کو سُن کر اور ان کے اعمال کو دیکھ کر مسلمان بن گئے۔ آپؐ نے ایک خدا، جسے نظریۂ توحید بھی کہتے ہیں، پیغام دیا اور لوگوں کو توہم پرستی اور شرک کو ترک کرنے کے لیے ہدایت دی۔ کچھ ہی سالوں میں اسلام کی روشنی بھارت سے لے کر بحر اوقیانوس تک پھیل گئی۔ آخر میں ہارٹ لکھتے ہیں کہ 'مجھے لگتا ہے کہ حضرت محمدؐ انسانی تاریخ کی سب سے موثر واحد شخصیت تھے'۔

ہارٹ کے علاوہ، بابائے قوم مہاتما گاندھی کی ایک تقریر بھی میری آنکھوں سے گزری۔ یہ تقریر باپو نے ۲۳ جون ۱۹۳۴ کو انجمن فدائے اسلام کے جلسہ میں دی تھی۔ یاد رہے کہ گاندھی جی کو جنوبی افریقہ میں مقیم مسلمانوں نے بلایا تھا۔ جب وہ بھارت لوٹ کر آئے اور ۱۹۲۰ کی دہائی میں عدم تعاون تحریک کی آواز بلند کی تو ان کے ساتھ ملک کے مسلمان بھی جنگ آزادی میں کود پڑے۔ کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند کی قربت نے ہندو مسلمان اتحاد کو ایک نئی منزل دی۔ یہ سب دیکھ کر انگریز اور فرقہ پرست دونوں کے ہوش اُڑ گئے۔ گاندھی جی اپنی عبادت کے دوران ہندو دھرم کی کتابوں کے علاوہ قرآن کا بھی پاٹھ کرتے تھے۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ لوگوں کو دھرم کے نام پر نہیں لڑنا چاہیے کیونکہ سارے مذاہب کے راستے ایک ہی خدا کے پاس لے آتے ہیں۔ گاندھی جی نے اپنی مذکورہ تقریر میں اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ جیل کے دوران انہوں نے مولانا شبلی نعمانیؒ کی سیرت النبیؐ پڑھی اور حضورؐ کے بارے میں جانا۔ اپنے مطالعہ کی بنیاد پر گاندھی جی نے کہا کہ پیغمبر حق کی تلاش کرتے رہتے تھے۔ وہ خدا سے ڈرتے تھے۔ آپؐ نے بے پناہ ظلم و ستم کا سامنا کیا۔ آپؐ بہادر تھے، جو صرف خدا کے علاوہ اور کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ بغیر پروا کیے آپؐ نے وہی کیا جو صحیح تھا۔ آپؐ کے قول و فعل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ آپؐ فقیر تھے، آپؐ نے سب کچھ ترک کر دیا۔ اگر آپؐ چاہتے تو آپؐ کے پاس مال ہی مال ہوتا۔

آج اسی گاندھی کے ملک میں پیغمبر اسلامؐ کے خلاف گستاخی کی جارہی ہے۔ دن رات مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا جا رہا ہے اور بھارت کے سیکولر آئین پر گہری چوٹ کی جا رہی ہے۔ آج ملک اس حالت میں پہنچ گیا ہے کہ اقلیتوں کے عقیدہ کو فُٹ بال کی طرح ٹھوکر ماری جارہی ہے۔ پہلے تو بھاجپائیوں کو یہ لگ رہا تھا کہ بے سہارا مسلمان اور کمزور سیکولر اپوزیشن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہے۔ اس لیے بی جے پی حکومت زہر اُگلنے والے عناصر کی درپردہ حمایت کر رہی تھی۔ مگر بزرگ کہتے ہیں کہ 'پاپ کا گھڑا ایک نہ ایک دن بھر ہی جاتا ہے' اور ایسا ہی ہوا۔ عرب ممالک میں بی جے پی ترجمان نپور شرما کے بیان پر ہنگامہ برپا ہوگیا۔ امریکہ سمیت مغربی ممالک پہلے سے ہی بھارت میں بڑھ رہے مسلم مخالف ماحول سے کافی افسردہ ہیں۔ بات تو اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ امریکہ نے اپنی ایک حالیہ رپورٹ میں ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی مقامات پر ہو رہے حملوں پر گہرے افسوس اظہار کیا ہے۔ دراصل یہ بات صرف ایک بیان یا پھر فرد واحد کا خیال نہیں ہے۔ یہ بات ایک پیٹرن کی ہے۔ ۲۰۱۴ کے بعد سے مسلمانوں کو وِلن بنا کر اور ان کے مذہب کا خوف دکھا کر اکثریتی طبقہ سے بھگوا سیاسی جماعت ووٹ مانگ رہی ہے۔ نفرت انگیز سیاست نے بی جے پی کو اقتدار میں تو لا دیا ہے، مگر اس سے ملک کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ ملک کی سیکولر شبیہ خراب ہوگئی ہے۔ یہ بات برسر اقتدار بی جے پی جتنی جلدی سمجھ لے اتنا ہی سب کے لیے اچھا ہوگا۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

Inquilab 7.6.22

قرآن سے دوری مسلم معاشرے کے مسائل کا اصل سبب

اسلام امن وانسانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ دین اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں

دلّی میں ایک روزہ قرآن کانفرنس میں محمد اسلم پرویز کا اظہار خیال

نئی دلّی: (ابھے کمار) اتوار کو دلی کی سڑکیں دوسرے دنوں کی بہ نسبت کم مصروف ہوتی ہیں، مگر آئی ٹی او کے قریب واقع غالب انسٹیٹیوٹ آڈیٹوریم کی تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ حاضرین میں بڑی تعداد خواتین کی تھی۔ اس ایک روزہ قرآن کانفرنس کے مقرر خصوصی پروفیسر محمد اسلم پرویز تھے۔ اپنی تقریر کے دوران انہوں نے کہا کہ قرآن پاک کو ہر فرد کو پڑھنا چاہیے، کیونکہ اس مقدس کتاب کی باتیں سب کے لیے ہیں، جو سب کو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں اور یہی تو اس نازل شدہ کتاب کا حسن ہے۔ حاضرین ان کی تقریر کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔

پروفیسر اسلم پرویز صاحب کا تعلق مرزا غالب کے محلہ بلیماراں سے ہے۔ انہوں نے سائنس میں پی ایچ ڈی کی ہے۔ کچھ سال پہلے ان کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا گیا تھا۔ پروفیسر محمد اسلم پرویز نے تعلیم کے میدان میں بڑی بڑی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کے اندر صبر، تحمل اور رواداری جیسی اہم خصوصیات کہاں سے آئی ہیں، تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے ہمیشہ قرآن کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن پاک انسانوں سے کہتا ہے کہ وہ اس کتاب کو پڑھیں سمجھیں اور عمل کریں۔

پروفیسر محمد اسلم پرویز کا ماننا ہے کہ مسلم معاشرے کے مسائل اس وجہ سے ہیں کیوں کہ مسلمانوں نے اللہ کی کتاب کو براہ راست پڑھنے اور سمجھنے کی عادت چھوڑ دی ہے اور ایسے غیر معتبر اور غیر مستند ذرائع کو پکڑ لیا ہے جو ان کی گم راہی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ ان کی وجہ سے کئی بار قرآن پاک کی صحیح تشریح نہیں ہو پاتی، جو ہمارے درمیان اختلاف پیدا کرتی ہے۔

اپنے ذاتی تجربے کو بیان کرتے ہوئے، محمد اسلم پرویز نے کہا کہ جب وہ ابتدائی دنوں میں قرآن کو ترجمہ کی مدد سے پڑھتے تھے تو ان دقت محسوس ہوتی تھی۔ چونکہ وہ عربی زبان سے نابلد نہیں تھے، اس لیے انہوں نے خود سے قرآن کو پوری سنجیدگی سے پڑھنا شروع کیا اور خوب غور و فکر کرنے لگے۔ جو سلسلہ انہوں نے کئی سالوں پہلے شروع کیا تھا، وہ آج بھی جاری ہے۔ قرآن فہمی کی اس تحریک سے اب تک ہزاروں لوگ جڑ چکے ہیں۔ پورا سال محمد اسلم پرویز قرآن پاک پر لیکچر دیتے رہتے ہیں۔ کچھ سالوں سے وہ قرآن سے متعلق اپنے ویڈیو کو یوٹیوب پر اَپ لوڈ بھی کرتے ہیں۔ قرآن سے متعلق ان کے دو لیکچر ہر ہفتہ آتے ہیں اور ان کو لوگ بڑی تعداد میں پسند کر رہے ہیں۔ اتوار کے روز جس قرآن کانفرنس سے وہ خطاب کر رہے تھے، اس کا سلسلہ سال ۲۰۱۱ میں شروع ہوا اور ہر سال دہلی میں منعقد کیا جاتا ہے۔

دلّی میں ایک روزہ قرآن کانفرنس سے پروفیسر محمد اسلم پرویز خطاب کرتے ہوئے

اپنے بچپن کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے محمد اسلم پرویز کا کہنا ہے کہ وہ بھی عام مسلم بچوں کی طرح دین کو رسم و رواج کی علامت سمجھتے تھے۔ ان کو بھی دین کے بارے میں رَٹی رٹائی باتیں بتلائی جاتی تھیں مگر ان کے دماغ میں بہت سارے سوالات پیدا ہوتے تھے۔ ان کو لگتا تھا کہ آبا و اجداد کی ہر بات کو آنکھ بند کر کیسے مانا جا سکتا ہے۔ انسان کو اپنے عقل کا بھی استعمال کرنا چاہیے۔ جستجو اور تحقیق نے ان کو قرآن کے قریب کیا۔ قرآن پڑھنے کے بعد ایک سائنس داں کو اللہ کی عظمت کا اور بھی بہتر طریقے سے احساس ہوتا ہے۔ قرآن کانفرنس میں وہ اپنے انہیں تجربات کو بیان کر رہے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلم سماج میں جو بھی برائیاں قدم جما چکی ہیں، ان کی وجہ اللہ کی کتاب سے دوری ہے۔ محمد اسلم پرویز نے مزید کہا کہ قرآن پاک تمام انسانوں کی فلاح کی بات کرتا ہے، وہ لوگوں میں پیدائشی بنیاد پر تفریق کے خلاف ہے، وہ پوری دنیا کو ایک مانتا ہے، مگر افسوس کی بات ہے کہ مسلمان بھی مسلکی تنازعہ کے شکار ہو گئے ہیں۔

علاوہ ازیں، قرآن میں مردوں اور عورتوں کو برابر کے حقوق دیے گیے ہیں، مگر مردوں نے عورتوں پر ظلم کرنے کا سلسلہ آج بھی بند نہیں کیا ہے۔ جہاں قدیم زمانہ میں بیٹی کی پیدائش پر اس کو مٹی میں دفن کر دیا جاتا تھا، وہاں آج کے دور میں لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ اعمال پوری طرح سے غیر انسانی ہے اور ان کی سزا بہت بڑی ہے۔ محمد اسلم پرویز نے کہا کہ قرآن کا ایک اہم پیغام یہ بھی ہے کہ ہم سب صبر و تحمل اور رواداری کے ساتھ زندگی گزاریں۔ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں یا جو مسلم ہونے کے باوجود بھی سیدھے راستے سے بھٹک گئے ہیں ان سے نفرت کرنے یا انہیں مارنے کی بات قرآن کبھی نہیں کہتا بلکہ قرآن پاک نے ایسے لوگوں کو صحیح راہ پر واپس لانے کے لیے سچے مسلمانوں پر ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ ان کی محبت اور خلوص کے ساتھ اصلاح کریں۔

محمد اسلم پرویز نے مزید کہا کہ اسلام کا اصل پیغام انسان دوستی اور امن ہے۔ قرآن نے یہ بھی زور دے کر کہا ہے کہ علم اور سائنس کے حلقہ میں تحقیق ہوتی رہنی چاہیے۔ قرآن کے بارے میں یہ غلط پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کو سائنس سے دور کرتا ہے، جبکہ قرآن میں پڑھنے اور کائنات میں غور کرنے پر کافی زور دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جائے تو دین اور سائنس میں تضاد نہیں ہے، اور نہ ہی علم اور عبادت میں کوئی ٹکراو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ تیس سالوں سے محمد اسلم پرویز سائنس کے موضوع پر اردو میں ایک رسالہ شائع کرتے ہیں اور اردو داں طبقہ اور دینی قائدین کو سائنس کے حلقہ میں ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رکھتے ہیں۔ پورا سال ان کے لیکچر کالجوں اور یونیورسٹیوں سے لے کر مدرسوں تک منعقد کیے جاتے ہیں۔ ۶۸ سال کی عمر میں بھی وہ ایک نوجوان طالب علم کی طرح علم حاصل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کے لیے سرگرم رہتے ہیں۔

***

رام منوہر لوہیا: مزاحمت کا دوسرا نام

ڈاکٹر لوہیا شخصی آزادی اور سرکار کی آمرانہ پولیسی کے خلاف مرتے دم تک سڑکوں پر لٹتے رہے اور جیل جاتے رہے

ابھے کمار

۲۳؍ مارچ کو سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کا یوم پیدائش ہے۔ اگر آج وہ ہمارے درمیان ہوتے، تو ان کی عمر ۱۲۲؍سال ہوتی۔ یہ عوام اور ملک کے لیے بڑی بدقسمتی تھی کہ محض ۵۹؍سال کی عمر میں وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ جس ظلم اور زیادتی کے خلاف ڈاکٹر لوہیا اپنی پوری زندگی لڑتے رہے، آج وہ مزید بڑھ گئی ہیں۔ جہاں غیر برابری اور نفرت بڑھ رہی ہے، وہیں شخصی آزادی پر آمرانہ حکومت ہر روز حملہ کر رہی ہے۔ آج عوام پریشان اور بے چین ہیں۔ تبھی تو ان حالات میں ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی زندگی اور ان کے افکار کو یاد کرنا بے محل نہیں ہے۔ سوانح نگار اور مجاہد آزادی اِندو مَتی کیلکر کے مطابق، ڈاکٹر لوہیا کی پیدائش ۲۳؍مارچ، ۱۹۱۰ء کو اتر پردیش کے فیض آباد میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام ہیرالال اور ماں کا نام چندری تھا۔ گھر والوں کا خاندانی پیشہ لوہے کی تجارت کرنا تھا۔ ان کے گھر والے کانگریس کے حامی تھے۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی میں شروع ہونے والی سِول نافرمانی تحریک کے دوران، ان کے والد جیل گئے تھے۔

ڈاکٹر لوہیا کی تعلیم کاشی، کلکتہ اور جرمنی میں ہوئی۔ ان کی پی ایچ ڈی جرمنی کی ہمبولٹ یونیورسیٹی سے شعبہ اقتصادیات میں تھی۔ پڑھائی کے دوران ہی انہوں نے بھارت کی آزادی کے لیے طلبہ تحریک کی قیادت کی۔ سال ۱۹۳۳ء میں جب ان کی پی ایچ ڈی پوری ہوئی اور بھارت لوٹ آئے۔ پھر کلکتہ میں طلبہ سیاست میں شریک ہوئے۔ جرمنی میں ہی انہوں نے یہ طے کیا تھا کہ وہ اپنی زندگی سیاسی کاموں میں لگا دیں گے۔ اگلے سال انہوں نے کانگریس سے منسوب سوشلسٹ تنظیم کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اسی سال وہ کانگریس کی آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی بنے۔ پھر وہ طلبہ اور مزدور تحریکوں سے جڑے رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کلکتہ سے شائع ہونے والے جریدہ کانگریس سوشلسٹ کے مدیر کے فرائض انجام دئے۔ کانگریس کے اندر ان کی قربت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی سے تھی۔ مگر آزادی کے بعد وہ گاندھی کے افکار سے جڑے رہے، مگر نہرو اور کانگریس پارٹی کے وہ بڑے ناقد بن گئے اور انہوں نے کانگریس کے خلاف کمزور پڑی حزب اختلاف کی پارٹیوں کو نہ صرف ایک ساتھ لانے کی کوشش کی، بلکہ آئندہ کانگریس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے حکمت عملی بنائی۔

ایک بات کی یہاں وضاحت کرنا ضروری ہے کہ کئی دفعہ فرقہ پرست پارٹیاں کانگریس کے خلاف اپنے آپ کو صحیح ٹھہرانے اور اپنے کالے کرناموں کو سفید بنانے کے لیے ڈاکٹر لوہیا کا استعمال کرتی ہیں اور انہیں کانگریس کا جانی دشمن بنا کر پیش کرتی ہیں، تاکہ لوہیا کی وراثت کو وہ غصب کر لیں۔ مگر سچائی یہ ہے کہ لوہیا جی کے نزدیک فرقہ پرست طاقتوں اور ہندو مسلمان کو لڑانے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ مذہب کے نام پر ہو رہی سیاست اور توہم پرستی کے سخت مخالف تھے۔ لوہیا جی ریشنل خیال کے انسان تھے۔ ان کا یقین عقل اور دلائل پر تھا، نہ کہ اَندھ بھکتی پر۔ جب ان کا انتقال ہوا تو بغیر کوئی مذہبی رسم ادا کیے ان کے مردہ جسم کو بجلی کی آگ کی مدد سے راکھ میں تبدیل کر دیا گیا۔ دھرم کو وہ نہیں مانتے تھے، مگر دھرم کے مثبت اور منفی پہلو کو وہ سمجھتے تھے۔ وہ ہندوستانی ثقافت اور ہندو دھرم کو نہ پوری طرح سے خارج کرتے تھے اور نہ اس کی اشاعت آنکھ بند کر کے کرتے تھے۔

جہاں تک ان کے کانگریس مخالف ہونے کی بات ہے تو اس کا

کئی دفعہ فرقہ پرست پارٹیاں کانگریس کے خلاف اپنے آپ کو صحیح ٹھہرانے اور اپنے کالے کرناموں کو سفید بنانے کے لیے ڈاکٹر لوہیا کا استعمال کرتی ہیں اور انہیں کانگریس کا جانی دشمن بنا کر پیش کرتی ہیں، تاکہ لوہیا کی وراثت کو وہ غصب کر لیں۔ مگر سچائی یہ ہے کہ لوہیا جی کے نزدیک فرقہ پرست طاقتوں اور ہندو مسلمان کو لڑانے والوں کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ مذہب کے نام پر ہو رہی سیاست اور توہم پرستی کے سخت مخالف تھے۔

یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ بھگوا جماعت سے محبت کرتے تھے۔ در اصل وہ کانگریس حکومت کی مسلسل غلطیوں سے نالاں تھے، کیونکہ جو وعدے کانگریس کے لیڈروں نے جنگ آزادی کے دوران کیے تھے، ان کو وہ عملی جامہ پہنانے سے بھاگ رہے تھے۔ یاد رکھیے کہ وہ دَور ایسا تھا جب کانگریس کا دبدبہ ہر طرف تھا اور وہ انتخابات در انتخابات فتح یاب ہو رہی تھی۔ اقتدار میں لمبے وقت تک رہ کر کانگریس کے لیڈروں رابطہ عوام سے کٹ گیا تھا اور وہ اکثر سرمایہ داروں اور اعلیٰ ذاتوں کے مفاد کو پورا کرنے میں ہی ملک کی فلاح و بہبود سمجھتے تھے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کا وہ دور تھا جب اپوزیشن کافی کمزور تھی۔ اس دوران لوہیا جی نے وہی کیا جو کوئی بھی انقلابی شخص کرتا۔ انہوں نے طاقتور اور حاکم کے سامنے حق گوئی کی اور ان کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لیے تحریک چلائی۔ یہ بات کہنے میں کوئی ہچک نہیں ہونی چاہیے کہ لوہیا جی چاہتے تو کانگریس میں شامل ہو جاتے اور اپنے ذاتی مفاد کو پورا کر لیتے، مگر انہوں نے سرکار کی غلط پالیسی کے خلاف سڑکوں پر لڑنا زیادہ بہتر سمجھا۔

در اصل ڈاکٹر لوہیا کی سوچ غریب پرور تھی۔ وہ برابری میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ذات پات کے خلاف لڑائی اقتصادی لڑائی سے جدا نہیں تھی۔ اسی طرح وہ حقوق نسواں کے بھی بڑے علمبردار تھے۔ ان کو لگتا تھا کہ ناانصافی کے خلاف ہر محاذ پر لڑائی ہونی چاہیے۔ لوہیا جی بھی چاہتے تھے کہ سرکار صحت، تعلیم اور روزگار کے لیے کام کرے اور غیر برابری کو دور کرے۔ غیر برابری غریب ملک اور امیر ملک کے درمیان بھی دور ہونا چاہیے اور ملک کے اندر امیر اور غریب کی کھائی بھی پٹنی چاہیے۔ رنگ اور نسل کی بنیاد پر ہو رہے امتیاز سے بھی وہ افسردہ تھے۔ ان کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ سیاہ فام انسان کو سفید فام سماج کمتر سمجھا ہے۔ اس لیے انہوں نے رنگ کی بنیاد پر ہو رہی تفریق کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ ڈاکٹر لوہیا عورتوں کو اپنی مرضی کے ساتھ جینے کے حقوق کے بھی حامی تھے۔ وہ جہیز کے بھی سخت مخالف تھے۔ ان کے نزدیک مہابھارت کی ایک اہم کردار دروپدی کا بڑا مقام تھا، کیونکہ وہ بڑی بے خوف، بہادر اور ذی علم خاتون تھی۔ اسی طرح دہلی سلطنت کے دور میں حکمرانی کرنے والی رضیہ سلطانہ ڈاکٹر لوہیا کی نظروں میں پسندیدہ شخصیت تھی۔ بین الاقوامی امور میں بھی ڈاکٹر لوہیا کی بڑی دلچسپی تھی اور وہ دنیا کے مختلف ملکوں میں جا کر عالمی امن اور عالمی حکومت کے نظریہ کو فروغ دیتے تھے۔ ان کے نزدیک قومی ریاست کی تنگ نظری سے آزاد ہوئے بغیر انسانیت کا بھلا نہیں ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر لوہیا اور فرقہ پرست طاقتوں کے بیچ میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ فرقہ پرست جماعت سماج کے اندر ذات پات کو بنائے رکھنا چاہتی ہے اور اعلیٰ ذات کی بالادستی کو بچانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔ جہاں فرقہ پرست طاقتوں کو سرمایہ داروں کی خدمت کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے، وہیں ڈاکٹر لوہیا پوری زندگی سرمایہ داروں کے خلاف لڑتے رہے۔ ڈاکٹر لوہیا کا نہ تو کوئی مکان تھا اور نہ کوئی بینک کھاتہ۔ انہوں نے پوری زندگی محکوموں کی خدمت میں لگا دی۔ خاص کر ان کی وجہ سے ہی پسماندہ سماج کو ان کا حق مل پایا، جسے دینے کے لیے تب کی کانگریس سرکار بھی تیار نہیں تھی۔ دلت، آدی واسی، پسماندہ، خواتین اور اقلیتی سماج کے اندر موجود کمزور لوگوں کے لیے انہوں نے ۶۰؍ فیصد ریزرویشن کی بات کی تھی اور ان کی سوشلسٹ پارٹی نے اس کے لیے لڑائی بھی لڑی۔ ڈاکٹر لوہیا شخصی آزادی اور سرکار کی آمرانہ پولیسی کے خلاف مرتے دم تک سڑکوں پر لٹتے رہے اور جیل جاتے رہے۔ آج وہ سب کچھ ہو رہا ہے جن کے خلاف ڈاکٹر لوہیا تھے۔ بھگوا راج میں حالات اور بھی خراب ہو گئے ہیں۔ آج ملک کو ڈاکٹر لوہیا کی مزاحمت والی وراثت بے صبری سے انتظار ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

دی وائر

ہندو مسلم تنازعہ اور رام منوہر لوہیا

ابھے کمار 12/10/2017 • COMMENT 1

میں مسلمانوں کو الگ سے اہمیت نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے اندر زیادہ تر پچھڑے (پسماندہ) لوگ ہیں جیسے جلاہے، دھنیے۔ پانچ کروڑ میں یہ چار ساڑھے چار کروڑ پچھڑے مسلمان ہیں۔ میں ان کو اہمیت دیتا ہوں، پڑھائی لکھائی میں، غریبی میں، ہر معاملے میں۔

ڈاکٹر رام منوہر لوہیا

آج سے ٹھیک پچاس سال قبل سوشلسٹ لیڈر، مجاہد آزادی اور جدید ہندوستان کے ایک اہم مفکر رام منوہر لوہیا اس دنیا سے چل بسے، مگر ان کے افکار و نظریات آج بھی زندہ ہیں۔ شمالی ہند کی متعدد سیاسی اور سماجی جماعتیں لوہیا کے افکار و نظریات پر مبنی ہیں اور ایسی بہت سی سیاسی جماعتیں وقتاً فوقتاً اقتدار میں بھی رہی ہیں۔ لوہیا کی پیدائش اترپردیش کے ضلع فیض آباد میں 1910ء میں ہوئی تھی۔ لوہیا کے خاندان والوں کا پیشہ تجارت تھا اور ان کا عقیدہ ہندو مذہب کے ویشنو مسلک پر تھا۔ لوہیا لقب ان کے ساتھ اس لیے جڑا کہ ان کا خاندان لوہے کی تجارت سے وابستہ تھا۔ سانولے رنگ اور پستہ

قد کے لوہیا پوری طرح سے سبزی خور (Vegetarian) تھے۔ بھارت چھوڑو تحریک کے دوران لوہیا کے ساتھ متحرک رہی اندومتی کالکر نے رام منوہر لوہیا کی سوانح لکھی تھی جس میں انھوں نے لوہیا کو ملحد کہا ہے۔ لوہیا غیر شادی شدہ تھے۔

لوہیا کے خاندان والے کانگریس کے حمایتی تھے۔ ان کے والد صاحب کانگریس کے متحرک کارکن تھے جنھیں تحریک سول نافرمانی کے دوران گرفتار کیا گیا تھا۔ لوہیا بھی کچھ اسی طرح سیاست میں دلچسپی رکھتے تھے اور وہ اپنے گریجویشن کے دنوں سے ہی طلبا سیاست سے وابستہ تھے۔ 1934ء میں جب کانگریس سوشلسٹ پارٹی تشکیل دی گئی تب انھوں میں اس میں نمایاں کردار ادا کیا اور سوشلسٹ نظریے پر مبنی سیاست کو فروغ دینے میں اہم کارنامہ انجام دیا۔ لوہیا کے افکار پر کارل مارکس اور گاندھی کا زبردست اثر رہا ہے۔ حالانکہ انھوں نے کبھی بھی پوری طرح سے مارکسزم اور گاندھی ازم کو نہیں اپنایا۔ جہاں وہ مارکسزم کے طبقاتی جدوجہد کو جائز ٹھہراتے تھے وہیں مارکسزم کے نام پر ہو رہے تشدد پر مبنی طریقہ کار کو پوری طرح خارج کر رہے تھے۔ گاندھی کا نظریہ، اقتدار کی لامرکزیت پر ان کا پختہ یقین تھا مگر وہ ان کے گرام سوراج کے نظریے سے غیر متفق تھے۔

لوہیا نے تاریخ، سیاست، معیشت، تہذیب، کلچر جیسے بہت سے موضوعات پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ 1963ء میں حیدرآباد میں منعقد ایک تقریب میں لوہیا نے ہندو اور مسلم عنوان سے ایک پرزور مقالہ پڑھا تھا۔ یہ مقالہ آج بھی اپنی معنویت رکھتا ہے۔ مقالے کی ابتدا میں ہی رام منوہر لوہیا نے ہندو اور مسلمان کو ہندستانی تاریخ سے متعلق اپنی سوچ کو بدلنے کی دعوت دی۔ انھوں نے کہا کہ ہندو اور مسلم تنازعہ کی جڑیں گذشتہ 800-700 سال کی تاریخ ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو انتباہ کیا کہ جب تک وہ اپنی سوچ اور تاریخ کو دیکھنے کا نظریہ نہیں بدلیں گے اور دونوں ایک مشترکہ سیکولر تاریخ میں اپنا یقین نہیں رکھیں گے تب تک ہندو مسلم تعصب کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے ہندو اور مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ گذشتہ 800-700 سال کی تاریخ کو ہندو بنام مسلم کشمکش کے طور پر نہ دیکھیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اقتدار کے لیے مسلمانوں نے خود ہی مسلمانوں کا قتل کیا ہے۔ تیمور لنگ نے چار سے پانچ لاکھ لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جس میں تین لاکھ مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں میں پٹھان مسلمانوں کی تعداد نمایاں تھی۔ وہ آگے کہتے ہیں کہ مغل مسلمانوں کی لڑائی پٹھان مسلمانوں سے تھی۔ اس لیے عہد وسطیٰ کی تاریخ کو ہندو بنام مسلم کی عینک سے دیکھنا بالکل غلط ہے۔ لوہیا کے مطابق یہ لڑائی ہندو بنام مسلم کے بجائے دیسی بنام بدیسی عناصر میں تھی۔ انھوں نے آگے کہا کہ عرب مسلمان اور دوسری جگہوں کے مسلمان سب سے پہلے ہندستان میں آئے۔

اس طرح ہندستان میں آنے والے وہ پہلے اجنبی مسلم تھے۔ پچاس یا سو سال کے بعد وہ یہیں بس گئے اور وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ دوسرے مرحلے میں کچھ دوسرے ملکوں کے مسلمان حملہ آوروں نے ہندستان پر حملہ کیا اور انھوں نے ہندستان کے ہندو اور مسلمان دونوں کے خلاف جنگ لڑی۔ اس سے لوہیا یہ بات ثابت کرنا چاہتے تھے کہ لڑائی ہندو بنام مسلم کی نہیں بلکہ ملکی بنام غیر ملکی افراد میں تھی۔

''عام طور سے ہندو اور مسلمان دونوں طبقوں کی ذہنوں میں یہ وہم بیٹھا ہوا ہے۔ ہندو سوچتا ہے کہ گذشتہ 800-700 سال میں مسلمانوں کی حکومت رہی۔ مسلمانوں نے ظلم کیا اور مسلمان سوچتا ہے، چاہے وہ غریب سے غریب کیوں نہ ہو کہ 800-700 سال تک ہماری حکومت رہی اب ہمیں برے دن دیکھنے پڑ رہے ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں کے دلوں میں یہ غلط فہمی بیٹھی ہوئی ہے جو سچی نہیں ہے۔ اگر سچی ہوتی تو اس پر میں کچھ نہیں کہتا۔ اصلیت یہ ہے کہ گزشتہ 800-700 سال میں مسلمانوں نے مسلمانوں کو مارا ہے۔ مارا ہے، کوئی روحانی معنی میں نہیں جسمانی معنی میں مارا ہے۔ تیمور لنگ جب چار پانچ لاکھ آدمیوں کو قتل کرتا ہے تو اس میں تین لاکھ تو مسلمان ہی تھے۔ پٹھان مسلمان تھے، جن کا قتل کیا۔ قتل کرنے والا مغل مسلمان تھا۔ یہ چیز اگر مسلمانوں کے گھر گھر میں پہنچ جائے کہ کبھی مغل مسلمان نے پٹھان مسلمان کا قتل کیا ہے اور کبھی افریقی مسلمان نے مغل مسلمان کا، تو پچھلے سات سو سال کا واقعہ لوگوں کے سامنے اچھی طرح سے آجائے گا کہ یہ ہندو اور مسلمان کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ تو ملکی و غیر ملکی کا معاملہ ہے۔ سب سے پہلے عرب کے یا اور کسی دوسری جگہ کے مسلمان آئے وہ پردیسی تھے۔ انھوں نے یہاں کے راج کو ختم کیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے سو پچاس سال میں دیسی بن گئے، لیکن جب وہ دیسی بن گئے تو پھر دوسری لہر پردیسیوں کی آئی جس نے ان دیسی مسلمانوں کو اسی طرح سے قتل کیا جس طرح سے ہندوؤں کو۔ پھر وہ پردیسی بھی سو پچاس سال میں دیسی بن گئے اور پھر دوسری لہر

آئی۔ ہمارے ملک کی تقدیر اتنی خراب رہی ہے، پچھلے 800-700 سال میں، کہ دیسی تو رہا نامرد اور پردیسی رہا ہے لٹیرا یا سمجھو جنگلی ۔ یہ ہمارے ساٹ سو سال کی تاریخ کا نتیجہ ہے۔ ''(مست رام کپور، مرتبہ: رام منوہر رچناولی، جلد 8، ص: 46-144)

میرے خیال میں لوہیا کا یہ کہنا صحیح ہے کہ عہد وسطیٰ میں لڑائی اقتدار کے لیے تھی اور اسے کسی خاص مذہبی نقطہ نظر سے نہ دیکھا جائے۔ بھگوا فرقہ پرست عناصر کچھ اسی طرح کا فتنہ پھیلاتے ہیں اور عہد وسطیٰ کو مسلمانوں کی حکومت اور ہندوؤں کی غلامی اور قتل و غارت سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی فرقہ وارانہ سوچ کے پیچھے بہت سارے انگریز مؤرخوں کا ہاتھ ہے جنھوں نے مسلمان بادشاہوں کے خلاف جم کر زہر اگلا۔ اس کے پیچھے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ استعماری انگریزی حکومت کو صحیح ٹھہرائیں اور اس طرح کے تاثرات پیدا کریں کہ انگریزوں نے ہندستان میں اقتدار حاصل کر ہندوؤں کو مسلمانوں کے ظلم و ستم سے نجات دلائی ہے۔

آگے لوہیا ہندو اور مسلمانوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ تاریخ کے اوراق سے اپنے مشترکہ ہیرو چنیں، انھیں اپنائیں اور متعدد دوسرے ویلن کو ایک ساتھ خارج کریں۔ لوہیا کی نظر میں رضیہ، سیر شاہ سوری اور جائسی ہندوستانی عوام بشمول ہندو اور مسلمانوں کے اسلاف ہیں اور غزنی، غوری اور بابر لٹیرے۔

''آج ہندو اور مسلمان دونوں کو بدلنا پڑے گا۔ دونوں کے من بگڑے ہوئے ہیں... کتنے ہندو ہیں جو کہیں گے کہ سیر شاہ ان کے باپ داداؤں میں ہیں اور کتنے مسلمان ہیں جو کہیں گے کہ غزنی، غوری لٹیرے تھے؟'' (ص: 146)

کیا رضیہ، سیر شاہ، جائسی کو بطور ہیرو اور غزنی، غوری اور بابر کو بحیثیت ویلن پیش کرنا صحیح ہے؟ اس مضمون میں بھی لوہیا ان کرداروں کو اپنانے اور ترک کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ پیش نہیں کرتے ہیں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آر ایس ایس اور بھگوا تنظیموں نے بابر کو نشانہ بنا کر رام مندر تحریک کی راہ ہموار کی تھی۔ بابر کی اولاد مسلمانوں کے لیے ایک گالی کے طور پر استعمال کیا جانے لگا مگر تاریخ شاہد ہے کہ ان تمام کرداروں کا تعلق اقتدار سے تھا۔ اقتدار سے استحصال اور تعصب ہمیشہ جڑا رہا ہے۔ اس لیے کسی حکمران کو پوری طرح سے صحیح مان لینا اور کسی کو بالکل ہی غلط ٹھہرانا سنجیدہ رائے

نہیں ہے۔آزاد ہند کے مسلمانوں کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں بھی لوہیا ذکر کرتے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندر غریب اور نیچی ذات سے رکھنے والے ، محنت کش اور مزدوروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ لوہیا کہتے ہیں

"میں مسلمانوں کو الگ سے اہمیت نہیں دیتا۔ مسلمانوں کے اندر زیادہ تر پچھڑے (پسماندہ) لوگ ہیں جیسے جلاہے، دھنیے۔ پانچ کروڑ میں یہ چار ساڑھے چار کروڑ پچھڑے مسلمان ہیں۔ میں ان کو اہمیت دیتا ہوں، پڑھائی لکھائی میں، غریبی میں، ہر معاملے میں۔ " (ص: 146)

خیال رہے کہ ہندستان میں پسماندہ مسلمانوں کی سیاست 1990ء کی دہائی سے خاص طور سے ابھری جب منڈل کمیشن کی سفارشات لاگو ہوئیں اور پچھڑے طبقے سے تعلق رکھنے والے سیاسی رہنما سیاست کے میدان میں بڑی تیزی سے ابھرنے شروع ہوئے۔ پچھڑے مسلمانوں کو دلت مسلمان یا پسماندہ بھی کہا جاتا ہے۔ پسماندہ فارسی کا لفظ ہے جس کے معنی پیچھے چھوٹے ہوئے۔ کچھ پسماندہ ذاتیاں ہیں، لال بیگی، حلال خور، موچی، پاسی، بھٹیارہ، پمریا، نٹ، بکھو، ڈفالی، نل بند، دھوبی، سائیں، رنگ ریز، چیک، مرسیقار، درزی وغیرہ۔ آج کے پسماندہ مسلمانوں نے صدیوں پہلے ذات پات کے ظلم سے نجات پانے کے لیے اسلام مذہب کو اپنایا مگر مذہب بدلنے کے بعد بھی ان کے ساتھ ہو رہے ذات پات پر بنی تعصب پوری طرح سے ختم نہیں ہوا اور ان کے حالات میں کوئی بہتری نہیں آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام کا نظریہ مساوات، اخوت کا پیروکار ہے مگر میڈیا میں اس طرح کی خبریں آتی ہیں اور بہت سی تحقیقات اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ اعلیٰ ذات کے مسلمان نچلی ذات سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے ساتھ طرح طرح سے بھید بھاؤ برتتے ہیں۔ ان کے درمیان شادی بیاہ کے واقعات کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کئی بار نچلی ذات سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو اعلیٰ ذات کی نگرانی میں بنے قبرستانوں میں بھی دفنایا نہیں جاتا۔

لوہیا کی ایک تقریر میں آزاد ہندوستان میں تعصب جھیل رہے مسلمانوں کے درد کا بھی ذکر ملتا ہے۔ خاص کر انھوں نے کانگریس پارٹی اور نہرو کی حکومت کو نشانہ بنایا ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ نہرو کو مسلمانوں کی یاد تب آتی ہے جب انتخاب کا وقت قریب آتا ہے۔

''پچھلے کچھ سالوں میں پلٹن میں اور اسی طرح کے جو دلی کے محکمے ہیں ان میں بڑی نوکریوں میں مسلمانوں کو جتنا حصہ دینا چاہیے اتنا نہیں دیا گیا ہے۔ اسے بہت کم آدمی کہتے ہیں کیونکہ سچ بولنے سے آدمی ذرا جھجکتے ہیں، لیکن یہ سچ ہے۔ نہرو جی کبھی کبھی اس بات کو ذرا کہتے ہیں لیکن ان کی بات کو پکڑ لینا، محکمہ ان کا، سرکار ان کی، دلی سرکار کے وہ خود مالک ہیں، لگاتار پونے پانچ سال تک وہ مسلمانوں کو فوج اور دوسری بڑی جگہوں سے دور رکھتے ہیں اور پھر جب مسلمان بھڑکنے لگتے ہیں تو تین مہینے کے لیے اپنا سر بدل لیتے ہیں۔ کبھی کوئی جمعیت کا اجلاس بلوا لیتے ہیں، کہیں اور مسلمانوں کو اور کہنا شروع کرتے ہیں کہ اب میں یہ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میرے ملک کے باشندوں کو برابری کا درجہ ملنا چاہیے۔ طرح طرح کی باتیں کرکے وہ مسلمانوں کا دل موہ لیتے ہیں۔ نہرو قینچی یا کانگریس قینچی کیا ہے؟ آپ سمجھ لینا۔'' (ص: 147)

تقسیم کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کو نوکریوں میں زبردست تعصب جھیلنا پڑا۔ ان کی حالت دھیرے دھیرے خستہ ہونے لگی اور نوکریوں میں ان کی شرح کافی کم ہونے لگی۔ یہ سب سازش کے تحت کیا گیا اور سرکار اور سرکاری ادارے اس میں منسلک تھے۔ کہنے کے لیے ہمارے ملک میں سیکولر سرکاریں بنیں مگر انھوں نے پوری طرح سے مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ لوہیا کی دوراندیشی دیکھئے کہ جو بات 2005 میں سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد موضوع بحث بنی انھوں نے چار دہائی پہلے ہی کہہ دی تھی۔ انھوں نے اس وقت زیر اقتدار کانگریس حکومت کو نشانہ بنایا مگر یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ خود ان کے نظریے کی پیروکار سیاسی جماعتیں جب اقتدار میں آئیں تو انھوں نے بھی اپنی کارکردگیوں میں نفاق کا مظاہرہ کیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لوہیا ہندو و مسلم تنازعہ کو لے کر کافی سنجیدہ تھے اور تاعمر انھیں ختم کرنے کی تگ و دو کرتے رہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ لوہیا جب محض 57 سال کے تھے ان کی وفات ہوگئی ۔ ان کی وفات کے بعد خاص کر دنگوں کا ایک بڑا سلسلہ شروع ہوگیا جو ابھی تک تھما نہیں ہے۔

لوہیا کے پیروکاروں کو چاہیے کہ وہ ہندو و مسلم تنازعہ کو ختم کرنے کے لیے پھر سے پرعزم ہوں۔ یہ صحیح معنی میں ان کو ہماری طرف سے خراج عقیدت ہوگی۔

(ابھے کمار جے این یو کے شعبہ تاریخ میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔)

Related

مذہب پر سیاست: انسانی حقوق اور جمہوریت پر حملہ

مظلوم طبقات متحد ہو کر ظلم و ناانصافی کے خلاف لڑائی کریں

انسانی حقوق کے جہدکار پروفیسر رام پنیانی اور ڈاکٹر جان دیال سے بات چیت

ابھے کمار، دلی

نامور مصنف اور انسانی حقوق کے سرگرم جہد کار پروفیسر رام پنیانی اور ڈاکٹر جان دیال نے بھارت کے محکوم طبقات بشمول اقلیتوں کے انسانی حقوق کی پامالی پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوتوا فرقہ پرستی کا مقابلہ سیکولر طاقتوں کو مضبوط بنا کر ہی ہو گا۔ اس لیے ملک کی اقلیتوں اور دیگر محکوم طبقات کو ساتھ مل کر فرقہ پرستی کے خلاف اپنی لڑائی کو آگے تک لے جانے کی ضرورت ہے۔

گزشتہ دنوں رام پنیانی اور جان دیال نے یومِ انسانی حقوق کے موقع پر راقم الحروف سے طویل گفتگو کی۔ انسانی حقوق کو تاریخی پس منظر میں رکھتے ہوئے پروفیسر رام پنیانی نے کہا کہ اقوام متحدہ نے انسانی حقوق سے متعلق باتیں دوسری عالمی جنگ کے بعد کرنی شروع کی تھیں اس کی وجہ یہ تھی کہ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی میں ایک خاص طبقے کو نشانہ بنایا گیا۔ اس تشدد کے بعد پوری دنیا میں لوگوں کے اندر انسانی حقوق کے بارے میں بیداری پیدا ہوئی۔ جرمنی میں جو کچھ بھی ہوا اسے دیکھ کر لوگ اتنے غم زدہ تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس طرح سے پھر کسی کا خون بہایا جائے۔ اس طرح انسانی حقوق کا تصور جو ہمارے سامنے آیا اس سب کے پیچھے مقصد یہ تھا کہ ایسے انسانیت سوز واقعات دوبارہ رونما ہونے پائیں۔ اس لیے جینے کے حقوق عالمی طور پر تسلیم کیے گئے، جن کو کسی بھی حالت میں منسوخ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جہاں ایک طرف ان واقعات کو پروفیسر رام پنیانی نے مثبت قدم بتلایا وہیں ان کو اس بات کا بھی دُکھ ہے کہ دنیا میں جو رجحانات دیکھنے میں آرہے ہیں وہ جمہوریت کی مخالف سمت میں جا رہے ہیں۔ پروفیسر پنیانی نے کہا کہ "آج دنیا کے کئی ملکوں میں پیچھے کی طرف چلنے کا عمل جاری ہے۔ خاص کر اپنے ملک میں پیچھے چلنے والی بات بہت مضبوط ہے۔ میں مانتا ہوں کہ ۱۹۵۰ سے ۱۹۸۰ تک کا جو سفر تھا جس کو ملک نے طے کیا، وہ جمہوریت کی سمت میں ایک چھوٹا سا قدم تھا۔ اس کے بعد سے ملک میں جو چل رہا ہے اس کے نتیجے میں جذباتی اشوز، دھرم کی سیاست، رتھ یاترا، گائے، بیف، لَو جہاد جیسے واقعات سامنے آرہے ہیں، وہ ملک کو جمہوریت سے پیچھے کی طرف لے جا رہے ہیں"۔

انسانی حقوق کے دیگر بڑے جہد کار اور تجربہ کار صحافی جان دیال نے بھی موجودہ صورت حال پر گہری فکر کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ "آج کے زمانے میں بات کرنے کا موقع مل جائے تو بہت غنیمت ہے۔ سب جگہ خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ آدمی کی زبان کاٹ دی گئی ہے، ہونٹ سی دیے گئے ہیں، اخبار خرید لیے گیے ہیں، ٹیلیویژن غلام بن چکے ہیں، سوشل میڈیا پر پابندی کے پہرے ہیں"۔

جان دیال نے اس بات پر بھی گہرے دکھ کا اظہار کیا کہ ایک محکوم طبقے کو دوسرے محکوم طبقے کے خلاف کھڑا کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر اوڈیشا میں دلتوں کو آدی واسیوں کے خلاف کھڑا کیا جا رہا ہے جبکہ اتر پردیش میں دلتوں کو مسلمانوں کے مد مقابل لایا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۴ کے دوران بھی یہ دیکھا گیا کہ کس طرح دلتوں کو سکھوں کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اس لیے دلتوں کو یہ بتلانا ہو گا کہ جدید دور میں ایک نیا 'منو کا راج' آیا ہے جس کی پشت پر بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سالوں میں دلتوں کے حقوق پر زبردست حملہ ہوا ہے۔

آدی واسیوں کے حوالے سے بات کرتے ہوئے جان دیال نے کہا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جل، جنگل اور زمین کو لُٹتے ہویے دیکھ رہے ہیں۔ اس لیے ان کے درمیان استحصال کے خلاف بیداری آسکتی ہے۔ مسلم اور عیسائی طبقات کے بارے میں انہوں نے کہا کہ سسٹم ان کے خلاف اس قدر ناانصافی برت رہا ہے کہ جن کے اوپر حملے ہو رہے ہیں ان ہی کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ یعنی جو لوگ مجرموں کے نشانے پر ہیں ان کو ہی مجرم بنایا جا رہا ہے۔ جان دیال نے کہا کہ "حالت آج اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ عیسائی اپنے ہی گھر میں دعا نہیں مانگ پا رہا ہے"۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ اس ظلم و ناانصافی کا مقابلہ مل کر کیا جا سکتا ہے۔ تمام محکوم طاقتوں کو چاہیے کہ وہ سیکولر پلیٹ فارم پر آئیں۔ انہوں نے کہا کہ فرقہ پرستی کا مقابلہ کوئی اقلیتی طبقہ اپنے خود کے دم پر نہیں کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ ہر سال ۱۰ دسمبر کو یومِ انسانی حقوق منایا جاتا ہے۔ اس دن سال ۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ نے انسانی حقوق سے متعلق ایک قرارداد اپنائی تھی جس کو یوڈی ایچ آر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یوڈی ایچ آر کو "انسانی حقوق کا عالمی منشور" کہا جاتا ہے۔ یوڈی ایچ آر میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم سب یکساں حقوق کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور دنیا کے تمام لوگوں کو امتیازات سے آزادی کا حق حاصل ہے۔ اسی طرح لوگوں کو جینے کا حق ہے، انہیں آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق بھی حاصل ہے۔ تبھی تو کسی کو غلام نہیں بنایا جا سکتا نہ ہی کسی انسان کے ساتھ اذیت ناک اور ذلت آمیز سلوک کیا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی عوام کو قانونی تشخص کا بھی حق ہے۔ سب لوگ قانون کی نظروں میں برابر ہیں۔ اپنے حقوق پر حملہ ہونے کی صورت میں ہر انسان موثر قانونی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ اسی طرح عوام کو ناجائز قید یا جلاوطنی سے آزادی کا بھی حق حاصل ہے۔ یوڈی ایچ آر میں یہ بھی کہا گیا کہ سارے انسانوں کو بنیادی حقوق ملے ہوئے ہیں جن سے انہیں کبھی بھی محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں مساوات کی ہی بات کہی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سب انسان برابر ہیں ان کے درمیان نسل، رنگ، صنف، قوم یا دیگر چیزوں کی بنیاد پر تعصب نہیں برتا جا سکتا ہے۔ تبھی تو دنیا کے جتنے بھی جمہوری ممالک ہیں وہاں ۱۰ دسمبر کا دن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بھارت کا آئین بھی انسانی حقوق کی بات کہتا ہے۔ آئین نے تمام شہریوں کو برابر کے حقوق دیے ہیں۔ نسل، ذات، برادری، جنس، زبان، مذہب وغیرہ کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتا جا سکتا۔ الغرض، بھارت میں تمام شہریوں کو یکساں بنیادی حقوق دیے گئے ہیں جن کو کسی بھی صورت میں غصب نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے آئین کی تمہید یہ کہتی ہے کہ بھارت میں سب کو سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف دیا گیا ہے۔ آزادی خیال، اظہارِ عقیدہ اور عبادت کے علاوہ مساوات بھی دیے گئے ہیں۔

> ہر سال ۱۰ دسمبر کو یوم انسانی حقوق منایا جاتا ہے۔ اس دن سال ۱۹۴۸ میں اقوام متحدہ نے انسانی حقوق سے متعلق ایک قرارداد اپنائی تھی، جس کو یوڈی ایچ آر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یوڈی ایچ آر کو "انسانی حقوق کا عالمی منشور" کہا جاتا ہے۔ یوڈی ایچ آر میں یہ کہا گیا ہے کہ ہم سب یکساں حقوق کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں اور دنیا کے تمام لوگوں کو امتیازات سے آزادی کا حق حاصل ہے۔

مگر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اچھا قانون ہونے کے باوجود ملک میں لوگوں کو انصاف کیوں نہیں مل رہا ہے؟ ملک کی اقلیت اور دیگر محروم طبقات اپنے آپ کو غیر محفوظ کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ ان کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ پولیس اور انتظامیہ اکثر اوقات ان کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ ملک کی حکمراں جماعت "سب کا ساتھ سب کا وکاس" کا نعرہ تو دیتی ہے مگر جب پالیسی بنانی ہوتی ہے تو وہ اعلیٰ ذات اور بڑے سرمایہ داروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ اقلیتوں کے جذبات اور ان کے مسائل کو سننا تو دور کی بات ہے الٹا ہر روز ان کے اوپر حملے ہو رہے ہیں۔ پوری سیاست مذہب کے میدان میں کھیلی جا رہی ہے۔ اکثریت جماعت کے خلاف اقلیتی طبقات کو دشمن بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ان کو ملک کی ترقی میں روڑا بتلایا جا رہا ہے۔ یہ رجحانات، جس کی طرف پروفیسر رام پنیانی اوپر اشارہ کر رہے تھے، اقوام متحدہ کی یوڈی ایچ آئی اور بھارت کے آئین کی روح کے خلاف ہے۔

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔ اقلیتی حقوق اور سماجی انصاف ان کے خاص موضوعات ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

۱۸ دسمبر۔ اقلیتوں کے حقوق کا عالمی دن

۱۸ دسمبر کو دنیا اقلیتی حقوق کے عالمی دن کے طور پر مناتی ہے۔ یہ دن بھارت میں بھی منایا جاتا ہے۔ اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی فرد اپنے اوپر ہونے والے ظلم کے خلاف یا جہاں بھی اسے لگتا ہے کہ اس کے اقلیتی حقوق کی پامالی ہو رہی ہے، اس کی شکایت اقلیتی کمیشن میں کر سکتا ہے۔ اقلیتی کمیشن کا فرض ہے کہ وہ اقلیتی طبقے سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کی شکایت سنے اور یہ طے کرے

کہ مستقبل میں اس کے حقوق کی کسی بھی طرح کی پامالی نہ ہو۔ اقلیتی کمیشنز آئین میں مذکور اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ اور بہبود کے ذمہ دار ہیں۔

قومی اقلیتی کمیشن کا کام

قومی اقلیتی کمیشن کے من درجہ ذیل ۹ اہم کام ہیں جس کے لیے یہ کمیشن قائم کیا گیا تھا۔

۱۔ اقلیتوں کی ترقی اور اس کا جائزہ لینا۔

۲۔ آئین میں بیان کردہ اور پارلیمنٹ اور ریاستوں کی مقننوں / کونسلوں کے ذریعے نافذ کردہ قوانین کے مطابق اقلیتوں کے تحفظ سے متعلق کام کی نگرانی کرنا۔

۳۔ مرکزی حکومت یا ریاستی حکومتوں کے ذریعے اقلیتوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے، تحفظ کے موثر نفاذ کے لیے سفارش کرنا۔

۴۔ اقلیتوں کو حقوق سے انکار اور تحفظ سے متعلق خصوصی شکایات کا جائزہ لینا اور اس طرح کے معاملات کی رپورٹ متعلقہ حکام کو پیش کرنا۔

۵۔ اقلیتوں کے خلاف کسی بھی طرح کے امتیازی سلوک سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کی وجوہات کا پتہ لگانا اور ان کے حل کے لیے اقدامات کی سفارش کرنا۔

۶۔ اقلیتوں کی سماجی و اقتصادی اور تعلیمی ترقی سے متعلق مضامین کا مطالعہ، تحقیق اور تجزیے کا بندوبست کرنا۔

۷۔ مرکزی یا ریاستی حکومتوں کے سامنے اقلیتوں سے متعلق کوئی مناسب اقدام یا حل تجویز کرنا۔

۸۔ مرکزی حکومت کے لیے اقلیتوں سے متعلق کسی بھی معاملات، خاص طور پر ان کو درپیش مشکلات سے متعلق مقررہ وقت میں خصوصی رپورٹ تیار کرنا۔

۹۔ کسی بھی دوسرے معاملے کے لیے رپورٹ کی تیاری جو مرکزی حکومت کو پیش کی جا سکے۔

کیوں کھٹک رہا ہے تبلیغ مذہب کا بنیادی دستوری حق؟

یو پی لا کمیشن کی سفارش کے تناظر میں آئین ساز اسمبلی کے مباحث پر ایک نظر

ابھئے کمار، دہلی

گزشتہ برس ماہ نومبر میں اُتر پردیش لا کمیشن نے بی جے پی کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کو ایک رپورٹ پیش کی تھی، جس میں اس نے کہا تھا کہ موجودہ قانون ''جبری'' طریقے سے کروائے جانے والے تبدیلیٔ مذہب کو روکنے کے لئے ''کافی نہیں'' ہے، لہٰذا ایک نیا قانون بنانے کی ضرورت ہے۔ میڈیا کے سامنے بیان دیتے ہوئے لا کمیشن کے سربراہ جسٹس آدتیہ ناتھ مِتّل نے کہا کہ ''موجودہ قانونی توضیحات تبدیلیٔ مذہب کو روکنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ تبدیلیٔ مذہب جیسے سنجیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک نئے قانون کی ضرورت ہے جیسا کہ دیگر ۱۰ ریاستوں میں بنایا جاچکا ہے''۔ چنانچہ کمیشن نے یہ سفارش کی ہے کہ ''جبراً'' مذہب تبدیل کرانے والوں کے لیے سزا پانچ سال تک بڑھادی جائے۔ اگر کسی دلت (ایس سی) اور آدی واسی (ایس ٹی) کا جبراً مذہب تبدیل کرایا جاتا ہے تو اس میں ملوث ملزموں کو سات سال کی قید ہوسکتی ہے۔ اُتر پردیش کی یوگی سرکار اس رپورٹ کا مطالعہ کر رہی ہے اور وہ جلد ہی وہ اس بات کا اعلان کرے گی کہ وہ لا کمیشن کی ساری سفارشات کو نافذ کرے گی یا پھر اس کا ایک حصّہ نافذ کرے گی۔ لا کمیشن کی رپورٹ میں تبدیلیٔ مذہب کے خلاف ظاہری بے چینی کو دیکھ کر ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ہندو شدت پسند تنظیم آج بھی بھارت کے آئین میں فراہم کیے گئے مذہبی آزادی کے بنیادی حقوق اور سیکولرازم کے اقدار کو قبول نہیں کر پائی ہے! اپنے ناقدین پر وہ ''غدار وطن'' اور آئین کی توہین کا الزام دن رات لگاتی رہی ہے، مگر خود وہ آئین کی روح کے خلاف قانون بنانے کی وکالت کرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات وہ خود آئین کی تمہید ''آزادی خیال، اظہار رائے، عقیدہ، دین اور عبادت'' کی تائید کرتی نظر نہیں آتی۔ آئین ہند کے بنیادی حقوق کی آرٹیکل ۲۵ میں صاف طور سے لکھا گیا ہے کہ تمام لوگوں کو اس بات کی آزادی ہے کہ وہ اپنے مذہب پر چلیں اور اس کی تبلیغ اور اشاعت بھی کریں۔

اپنے مذہب پر چلنے اور اشاعت کرنے کی آزادی سیکولرازم کا ایک اہم ستون ہے۔ اگر لوگوں کو صرف مذہب پر چلنے کی آزادی دے دی جائے اور اس کی تبلیغ اور تشہیر کرنے کے حقوق نہ دیے جائے، تو وہ سماج سیکولر نہیں کہا جائے گا۔ اس کی ایک بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ اگر کوئی ریاست خود کو لبرل، آزاد اور جمہوریت پسند کہتی ہے تو اسے اپنے شہریوں کو اظہار رائے کی آزادی دینی ہوگی۔ یہ ہر انسان کے اظہار رائے کی آزادی کے حقوق کے اندر آتا ہے کہ وہ دوسروں کو بتلا سکے کہ وہ کیوں کسی ایک مذہب کو بہتر سمجھتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کو اس بات کی آزادی ہونی چاہیے کہ وہ مذہب کو مانے یا کسی اور مذہب کو قبول کرلے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہندو شدت پسند عناصر خود تو دن رات اپنے مذہب کی تشہیر کرتے رہتے ہیں، مگر دوسری طرف وہ اقلیتوں پر ''جبری'' طریقے سے لوگوں کا ''دھرم پریورتن'' کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ بعض اوقات اقلیتوں کو جھوٹے مقدموں میں پھنسایا جاتا ہے اور کچھ کو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ سب ان کے دلوں میں ڈر پیدا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ زور زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ آئین کی روح کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے؟ سماج میں اگر نابرابری ہوگی، اونچ نیچ کا نظام قائم رہے گا اور طبقاتی نظام پر لوگوں کو بانٹ کر رکھا جائے گا تو یہ ممکن ہے کہ جو لوگ استحصال کے بوجھ تلے دبے ہیں اور ذلت کی زندگی جی رہے ہیں، وہ اس سماج اور مذہب کی طرف اُمید بھری نظروں سے دیکھیں گے جہاں مساوات، برابری اور وقار کی روشنی دچمک رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو سماج کے بہت سارے کمزور اور محکوم طبقے کے لوگ تبدیلیٔ مذہب کو اپنی ''غلامی'' سے آزادی حاصل کرنا تصوّر کرتے ہیں۔ ہندو شدت پسند تنظیم اگر صحیح معنوں میں انسان کی آزادی کا پیرو کار ہے، تو اسے تبدیلیٔ مذہب کے خلاف سخت قانون بنانے کے بجائے لوگوں میں جذبہ اخوت پیدا کرنا چاہیے اور اس کی راہ میں پڑی رکاوٹ (جیسے ذات، برادری اور طبقاتی نظام) کو ختم کرنا چاہیے۔

حالانکہ تبدیلیٔ مذہب کو لے کر ہندو شدت پسند عناصر میں پائے جانے والی بے چینی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جنگ آزادی کے دوران بھی اس طرح کے مسئلے اٹھے تھے اور اسے لے کر خون بھی بہایا گیا تھا۔ اُس دور میں بھی بعض شدت پسند لوگوں کو لگتا تھا کہ اسلام اور عیسائیت سے جڑے لوگ ہندوؤں کا زبردستی دھرم تبدیل کروا چکے تھے۔ گاندھی جی بھی تبدیلیٔ مذہب کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ان کی رائے بابا صاحب امبیڈکر سے قدرے مختلف تھی۔ امبیڈکر تبدیلیٔ مذہب کو دلتوں کے لیے ہندو مذہب سے ''نجات پانے'' (Emancipation) سے تصوّر کیا اور اپنی وفات سے کچھ ہی مہینوں پہلے اپنے لاکھوں پیروکاروں کے ساتھ ہندو مذہب کو ترک کیا اور بدھ مذہب قبول کر لیا۔ اس کے برعکس گاندھی جی کا کہنا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب کی بنیادی تعلیم ایک جیسی ہے، اس لیے تمام مذہب کا احترام ہونا چاہیے۔

> ''جبر'' کا مسئلہ اٹھا کر فرقہ پرست طاقتیں ایسے قانون بنا تی رہی ہیں جو انسان اور اس کی مذہبی آزادی کے بیچ میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ کیسے ایک سرکاری افسر طے کرے گا کہ کس فرد نے اپنی مرضی سے کوئی مذہب اختیار کیا ہے؟ ایک سیکولر ملک کی سرکاروں کو ان سب باتوں سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی تو سیکولر اقدار کی پامالی ہے کہ جب کوئی فرد مسلمان یا عیسائی بن جاتا ہے تو سرکار، حکمراں اور سیاست دان پریشان ہو جاتے ہیں اور اس کو ہندو سماج کے لیے خطرہ قرار دے دیا جاتا ہے اور پھر فرقہ وارانہ سیاست شروع ہو جاتی ہے

تبدیلیٔ مذہب اور اس کی تشہیر پر آئین ساز اسمبلی میں بھی بڑی بحث ہوئی۔ حالانکہ بھارت کے آئین میں تبلیغ اور تشہیریوں کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے، مگر اس کی مخالفت اور دفاع میں بہت سارے ممبران نے تقریریں کیں۔ اس بحث کو پھر سے یاد کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس لیے کہ عوام بالخصوص نئی نسلیں، یہ جان سکے کہ آخر ہمارے بزرگوں نے کیا کیا دلیلیں دیں اور اُن سے کیا نصیحت لی جاسکتی ہے۔ کیا ان کی دلیلیں ہمیں سیکولرازم پر چھائے ہندوتوا کے خطروں سے نظریاتی طور سے مقابلہ کرنے کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں؟

کیا مذہب کی تبلیغ اور اشاعت سیکولرازم اور مذہبی آزادی کا حصہ ہونا چاہیے؟ اس موضوع پر ۶ دسمبر ۱۹۴۶ کو آئین ساز اسمبلی میں بحث چھیڑ گئی۔ اڈیشہ کے لوک ناتھ مسرا کا یہ ماننا تھا کہ مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کے حقوق آئین میں نہیں ہونے چاہئیں۔ اُن کی دلیل یہ تھی کہ تبلیغ اور اشاعت کا فائدہ اٹھا کر عیسائیت پچھلے دروازے سے ہندوؤں کی سماجی زندگی کے مضافات تک پہنچ چکی ہے اور اسے اگر روکا نہ گیا تو ہندو ثقافت فنا ہو جائے گی۔ مسرا کی تقریر بہت حد تک ہندو شدّت پسندوں کے نفرت انگیز پروپیگنڈوں سے مماثلت رکھتی ہے۔ حالانکہ مسرا ظاہری طور سے یہ بھی قبول کرتے ہیں کہ انھیں کوئی ''جھگڑا عیسیٰ یا محمد سے نہیں ہے اور نہ ہی ان باتوں سے ہے''۔ انہوں نے جو دیکھا وہی کہا۔ مگر اُن کو جو چیز ہندوتوا آئیڈیالوجی کے قریب لا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بھارت کو ہندو دھرم اور کلچر کی دوسری شکل سمجھتے تھے۔ تبھی تو اُن کو یہ بات ڈرا رہی تھی ہے کہ اگر آزاد بھارت میں تبلیغ اور اشاعت کو آئینی ضمانت مل گئی تو کہیں ہندو کلچر پر اسلام اور عیسائیت غالب نہ ہو جائے اور اس کی ہستی نہ مٹ جائے۔ تبھی تو وہ تبلیغ اور اشاعت کو آئینی تحفظات فراہم کرنا ایک بڑا ''خطرہ'' تصور کرتے تھے۔ اُنھوں نے مذہب کی تشہیر کے حقوق کو آئین ساز اسمبلی (ہندو سماج) کی ''ناجائز سخاوت'' سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ انصاف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس سرزمین کے قدیم (ہندو) عقیدہ اور ثقافت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے۔ مگر ہم قبائلی برادری ہزاروں سالوں کے ظلم اور استبداد کے بعد اس کو اس کا واجب مقام دینے سے قاصر ہیں۔

> سماج میں اگر نا برابری ہوگی، اونچ نیچ کا نظام قائم رہے گا اور طبقاتی نظام پر لوگوں کو بانٹ کر رکھا جائے گا تو یہ ممکن ہے کہ جو لوگ استحصال کے بوجھ تلے دبے ہیں اور ذلت کی زندگی جی رہے ہیں، وہ اس سماج اور مذہب کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھیں گے جہاں مساوات، برابری اور وقار کی روشنی د چمک رہی ہو۔

یہ فرقہ وارانہ تعصّب نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ آئین ساز اسمبلی کے ممبر مسرا غیر ہندوں کو اپنے مذہب کی تشہیر کے حقوق کو ملک کے لیے خطرہ سمجھ رہے تھے اور ہندوؤں کو وہ باخبر کرنا چاہتے تھے کہ تم مسلمانوں اور عیسائیوں کو تشہیر مذہب کے آئینی حقوق دینے کی ''ناجائز سخاوت'' مت دکھلاؤ، کیوں کہ یہ ہندو سماج اور کلچر کے لیے خطرناک ہے۔ کچھ اسی طرح کی متعصبانہ مشورہ اُتر پردیش حکومت کو لا کمیشن کی رپورٹ میں بھی دیا گیا ہے۔

خیال رہے کہ مسرا نے تشہیر مذہب کو ردِّ کرتے وقت جو دلیل پیش کی وہ کچھ حد تک گاندھی جی سے ملتی ہے۔ مسرا کا کہنا تھا کہ مذہب کی تشہیر لوگوں کو مختلف فرقوں میں بانٹ دیتی ہے اور اُن کو آپس میں لڑاتی ہے۔ مگر وہ اتنا کہہ کر چپ نہیں ہوئے بلکہ گاندھی جی کی مذہبی آہنگی کے پیغامات کے برخلاف وہ اسلام اور عیسائیت کے بارے میں غلط بیانی کرنے لگے: ''اسلام نے ہندو سوچ کے خلاف اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا ہے۔ عیسائیت نے پچھلے دروازے سے ہماری سماجی زندگی کے مضافات تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ ہندو دھرم نے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے راستوں میں رکاوٹیں نہیں ڈالیں۔ مگر ہندو سخاوت کا غلط استعمال کیا گیا ہے اور سیاست نے ہندو کلچر کو کچل ڈالا ہے۔ ہم سب کو اب اقلیتوں کی بات نہیں اُٹھانی چاہیے کیوں کہ یہ آنے والے دنوں میں اکثریت کو نگل جانے کی حکمت عملی ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ مذہب کی تشہیر کے توضیحات کسی بھی ملک کے آئین میں نہیں ہے۔ لہٰذا بھارت کا آئین بھی اسے آئینی تحفظ نہ دے۔ مسرا نے یہ بھی کہا کہ اُن کو اس بات سے زیادہ فرق نہیں پڑتا کہ عوام کسی مذہب کی تشہیر کر رہے ہیں۔ مگر تشہیر مذہب کو آئین کے اندر نہ لایا جائے اور نہ ہی ان کو بنیادی حقوق کے دائرے میں لایا جائے کیوں بنیادی حقوق کو کبھی چھینا نہیں جاسکتا ہے، بعد میں یہ تشدد پیدا کرے گا۔

مسرا کی دلیل سے اپنی نا اتفاقی ظاہر کرتے ہوئے، مدراس سے مسلم لیگ کے ممبر محمد اسماعیل نے کہا کہ جھگڑا یہ نہیں ہے کہ مذہب کی تشہیر ہو رہی ہے یا پھر لوگ مذہب پر چل رہے ہیں۔ جھگڑے کی وجہ مذہب کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمی ہے۔ میرے فہم کے مطابق اگر لوگ اپنے اپنے مذہب کو اچھی طرح سے سمجھ لیں اور اس پر صحیح طریقوں سے چلیں تو کوئی جھگڑا پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اگر کسی وجہ سے کوئی جھگڑا سامنے بھی آیا ہے تو یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ اس جھگڑے کی وجہ سے مذہب پر چلنے اور اس کی تشہیر کرنے کے بنیادی حقوق کو ہی ختم کر دیا جائے، تبھی تو اسماعیل صاحب نے کہا کہ یہ لڑائی مذہب کو ختم کرنے سے دور نہیں ہو جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ لڑائی دراصل مذہب کو غلط سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی ہے۔ ان کی دوسری اہم بات یہ تھی کہ اگر مذہب کے نام پر کبھی جھگڑا ہوتا بھی ہے تو اس کی وجہ سے لوگوں کو اپنے مذہب پر چلنے اور اس کی تبلیغ کرنے سے روکنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ اگر اسماعیل صاحب آج زندہ ہوتے تو اُتر پردیش کی یوگی سرکار سے یہی کہتے کہ اگر کوئی ہندوؤں کو غلط طریقے سے مذہب تبدیل کرا رہا ہے تو اس شخص پر کارروائی ہونی چاہیے نہ کہ اسلام اور عیسائیت کے خلاف یہ پروپیگنڈا پھیلایا جانا چاہیے کہ اقلیتوں کے مذاہب نے ''سادہ لوح'' دلتوں اور آدی وسیوں کو گمراہ کیا ہے اور پورے ماحول کو فرقہ وارانہ بنایا ہے۔ پھر مغربی بنگال سے ممبر پنڈت لکشمی کانت مترا نے تقریر کی اور کہا کہ مذہب کی تشہیر کے بنیادی حقوق کو ختم کیے جانے کا مطالبہ قطعی طور پر غلط ہے۔ ان کی دلیل تھی کہ تشہیر مذہب اس لیے ضروری ہے کہ بھارت کو مغرب کے مادہ پرست سماج کو روحانیت سکھلانی ہے۔ ''سوامی وویکانند کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی عزت اور اس کا احترام اس کے روحانی ورثہ کی وجہ سے ہے۔ اپنی طاقتور مادہ پرست تہذیب، سائنس کے علوم کی حصولیابی، دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے والی مغربی دنیا آج غریب ہے کیوں کہ اس کے پاس روحانی خزانہ نہیں ہے۔ اس صورت حال میں ہندوستان کا رول سامنے آجاتا ہے۔ ہندوستان، جہاں روحانی خزانوں کا خزانہ ہے وہیں اسے روحانیت کا درس مغرب تک پہنچانا ہے اور اپنے پیغامات وہاں بھیجنے ہیں''۔ تشویشناک بات یہ نہیں ہے کہ پنڈت لکشمی کانت مترا ہندو ثقافت اور روحانیت کی تعریف بڑھ چڑھ کر رہے تھے۔ کسی بھی شخص کو اپنے مذہب کی تعریف اور بڑائی کرنے کا پورا حق ہے۔ مگر فکر کرنے کی بات یہ ہے کہ مسرا جو تشہیر مذہب کی مخالفت کر رہے تھے اور مترا جو تشہیر مذہب کو درست قرار دے رہے تھے، بھارت کو ہندو کلچر کی دوسری شکل بتلانے کی غلطی کر رہے تھے۔ یہ غلطی ہندوستانی سیاست میں زیادہ تر مین اسٹریم کے لیڈر کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک بھارت اور ہندو کلچر اور مذہب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ وہی فرقہ وارانہ سوچ ہے جس کا استعمال آر ایس ایس اور بی جے پی کرتی آ رہی ہے۔

بھارت کو ہندو مذہب اور ثقافت سے جوڑنے کی غلطی برطانوی مورخوں اور مستشرقین نے کی تھی، جو آج بھی بڑی مضبوطی سے لوگوں کے ذہنوں کو جکڑے ہوئی ہے۔ جنگ آزادی کے دوران بھی قومی لیڈروں نے برطانوی حکومت کی مخالفت کی اور آزادی کا مطالبہ کیا، مگر اُنھوں نے کبھی اس بات پر زیادہ غور وخوض نہیں کیا کہ کس طرح اُن کی سمجھداری نو آبادیاتی اسکالروں کی تحریروں سے غلام بن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے قومی لیڈروں نے اسلام اور عیسائیت کو بھارت میں باہر سے آئے مذہب کے گروپ میں رکھا اور ہندو دھرم کو ہندوستان کا اصلی مذہب سمجھنے کی غلطی جانے انجانے میں کی ہے۔ بھلے ہی پنڈت لکشمی کانت مترا نے پارلیمنٹ اندر ہندوازم اور بھارت کا فرق مٹا دیا ہو، مگر اُن کے اندر دوسرے مذہب کے تئیں نفرت کا جذبہ نہیں تھا۔ انہوں نے ان دلیلوں کو خارج کیا جن میں عیسائیت کا خوف دکھایا گیا تھا۔ اُنھوں نے صاف طور پر کہا کہ جس طرح ہمارے دوست باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں، اس طرح کی شدت کے ساتھ بھارت کے عیسائیوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کی ہے۔ میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہر فرقے کو اپنے مذہب کی تشہیر کرنے کا حق دیا جانا چاہیے۔ ایک سیکولر ریاست میں بھی مذہب کی ضرورت ہوتی ہے۔

ملک کو آزاد ہوئے اور آئین کو نافذ ہوئے ۷۰ سال سے زیادہ وقت گزر گیا ہے۔ مگر آج بھی ملک میں اقلیتوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کے الزام میں بعض اوقات نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا سے آئے ہوئے گراہم اسٹوئرٹ اسٹینس اور اُن کے دو معصوم بچوں کو اس لیے زندہ جلا دیا گیا، کیونکہ اُن پر اڈیشہ میں ہندوؤں کا مذہب تبدیل کروانے اور عیسائیت پھیلانے کا الزام تھا۔ آسام سے آئین ساز اسمبلی میں ممبر روہنی کمار چودھری نے ذات برادری اور ''اچھوت'' دلتوں کی نظر سے تبدیلیٔ مذہب کے مسئلے کو دیکھا اور کہا کہ اس بات سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ جب کوئی اچھوت عیسائی بن جاتا ہے تو اس کو عیسائی سماج میں برابری مل جاتی ہے۔ اس کے لیے تو تبدیلیٔ مذہب ہی نجات کا راستہ ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بہت سارے لوگوں نے عیسائیت کو قبول کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت اُن کو برابری کا درجہ دیتی ہے۔ جو اچھوت عیسائی بن جاتا ہے وہ ہر اعتبار سے 'اعلیٰ ذات' ہندو کے برابر ہو جاتا ہے۔

ذات برادری اور تبدیلیٔ مذہب کا مسئلہ کافی جڑا ہوا ہے۔ بہت سارے مورخوں کا ماننا ہے کہ بھارت میں زیادہ تر مسلمان اور عیسائی بھی تبدیلیٔ مذہب کا راستہ اختیار کر کے مسلمان بنے ہیں۔ اسلام کے مساوات والے پیغام نے یہاں کی پسماندہ ذاتوں اور اچھوتوں کو اپنی جانب مائل کیا، اس طرح وہ دھیرے دھیرے اس کی آغوش میں آتی گئیں۔ یہ دلیل کہ تبدیلیٔ مذہب تلوار کے زور پر انجام دیا گیا اکثر ہندو شدت پسندوں کی طرف سے آتی ہے لیکن تاریخ ان دعووں کو تصدیق نہیں کرتی۔

امبیڈکر کا ماننا تھا کہ اچھوتوں پر چھوت چھات تھوپا گیا ہے اور اس ناانصافی کو دور کرنے کے بجائے ہندو مذہب اسی منافرانہ تعلیم پر عمل کرنے کو واجب قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اس سے نجات پانے کے لیے انہوں نے ہندو مذہب ترک کرنے کا اعلان کیا اور اپنے پیروکاروں سے بھی تبدیلیٔ مذہب کی اپیل کی۔ ''میں ایک ہندو نہیں مروں گا'' امبیڈکر کے اس اعلان کے بعد ان کے ناقدین ان پر ٹوٹ پڑے۔ قدامت پسند اور برہمنی نظریہ کے حامل لوگ سب سے زیادہ ناراض تھے اور اسے ہندو سماج پر بڑا خطرہ مان رہے تھے۔ بہت سارے دلت بھی امبیڈکر کے اس فیصلہ سے متفق نہیں تھے اور ان کا ماننا تھا کہ اچھوتوں کا مسئلہ ہندو سماج کے اندر ہی حل کیا جائے۔ گاندھی جی نے بھی امبیڈکر سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۱۳

نفرت کے سوداگروں کے ہاتھوں رسوا ہو رہی جمہوریت!

ذات پات اور مذہب کا زہر پھیلانے والی قوتوں نے انٹر نیشنل ڈیموکریسی انڈیکس میں ملک کو کافی نیچے لاکھڑا کیا

افروز عالم ساحل

صدیوں کی غلامی کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو ہمیں آزادی نصیب ہوئی۔ آزادی ملتے ہی ملک کی ذمہ داری پوری طرح سے ہم ہندوستانیوں کے کندھوں پر آگئی۔ آزادی کی لڑائی صرف منتخب رہنماؤں نے ہی نہیں لڑی تھی، بلکہ ملک کا ہر فرد اس میں شامل ہوا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ آزاد ہندوستان کی حکومت میں اس ملک کا ہر باشندہ حصہ دار ہو۔ اس نظریے سے اس وقت کے دانشوران اور آزادی کی تحریک میں حصہ لے چکے رہنماؤں نے ملک کے نظامِ حکومت کو صحیح طریقے سے چلانے کے لئے نئے قوانین وضع کئے۔ اس طرح ملک کا سیکولر آئین مرتب کیا گیا۔ ان تمام عمل کے دوران ملک کی تہذیبی و معاشرتی روایات کا خیال رکھا گیا۔

اب ہمارا ملک جمہوریت کے ۷۱ ویں سال میں داخل ہو رہا ہے۔ گزشتہ ۷۰ برسوں سے ملک میں ہر سال 'یوم جمہوریہ' منایا جاتا ہے اور وزیر اعظم ملک سے خطاب کرتے ہوئے حکومت کی حصولیابیوں اور ملک کے مسائل کا ذکر کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ گزشتہ کچھ برسوں میں مسائل کا ذکر کم اور وزیر اعظم اپنی پیٹھ آپ تھپتھپانے کا کام زیادہ کرتے رہے ہیں۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ آزادی کے اتنے سال بعد وجود میں آنے والی بی جے پی حکومت میں ہمارے ملک کے اندر جمہوریت مضبوط ہونے کے بجائے کمزور ہوتی نظر آ رہی ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے لئے اس سے بڑی شرم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ڈیموکریسی انڈیکس ۲۰۱۹ء میں ہم دس پوائنٹ نیچے چلے گئے ہیں۔ خیال رہے کہ سن ۲۰۰۶ میں برطانوی جریدے 'دی اکونامسٹ' گروپ کے تجزیاتی و تحقیقاتی ڈویژن 'اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ' کی جانب سے ہر سال عالمی سطح پر جمہوری اقدار اور اس کی حیثیت کی درجہ بندی کے مقصد سے 'ڈیموکریسی انڈیکس' جاری کیا جاتا ہے۔ یہ عالمی فہرست ۱۶۵ آزاد ممالک اور دو خطوں میں جمہوریت کی موجودہ حالت کا ایک نقشہ فراہم کرتی ہے۔ اس کے تحت صفر سے دس تک کے پیمانے پر درجہ بندی کی جاتی ہے۔ اس ڈیموکریسی انڈیکس میں بھارت کا مجموعی اسکور ۶ء۹۰ رہا، جبکہ سن ۲۰۱۸ میں یہ اسکور ۷ء۲۳ تھا۔ ڈیموکریسی انڈیکس کے آغاز سے اب تک بھارت کا یہ بدترین اسکور ہے۔ اس فہرست میں ہندوستان اب ۵۱ ویں پائیدان پر ہے۔ اس طرح سے ہندوستان ایک 'ناقص جمہوری ملک' کی فہرست میں نمایاں مقام پر آ گیا ہے۔ یعنی ہم چاہے ترقی کی راہ جتنی بھی طے کر چکے ہوں، لیکن ہمارے ملک میں جمہوریت کا مطلب بالکل بدل چکا ہے۔

واضح رہے کہ جب ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا، اس وقت آزادی کے دیوانوں نے یہ حلف لیا تھا کہ ہم اپنے ملک کو خوابوں کا وطن بنائیں گے۔ جہالت، غلامی، غریبی اور دوسرے مسائل کے حل کے لیے ایک ایسا معاشرہ قائم کریں گے جس میں ملک کے سبھی باشندوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ ملک کے ہر شہری کو اپنے مذہب، اپنی زبان و تہذیب کی دعوت و تبلیغ کی مکمل آزادی حاصل ہوگی، بلکہ حکومت بھی ان کے مذہب، زبان اور تہذیب کی حفاظت کرے گی۔ ملک کے تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوں گے، ان کے ساتھ کسی بھی طرح کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ہو گا۔ ملک کا ہر شہری آزادی کی کھلی فضا میں سانس لے سکے گا، ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے آئین ہند میں ان چیزوں کو شامل کیا گیا اور یقین دلایا گیا کہ آزاد ہندوستان میں عوام کی ترقی و خوشحالی میں حائل تمام رکاوٹوں کو ہٹا دیا جائے گا۔ ایسے میں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حقیقت میں ہمارے وطن میں وہ جمہوری نظام قائم ہو گیا ہے؟ کیا ہماری ترقی و خوشحالی میں حائل سبھی رکاوٹوں کو ہٹا دیا گیا ہے؟ کیا آئین بنانے والوں کی محنت کامیاب ہو گئی ہے؟ کیا ان کے خواب پورے ہو گئے؟ شاید نہیں! ہمارا معاشرہ آج جتنا بٹا ہوا ہے، اتنا پہلے کبھی نہیں رہا، آج مختلف حیلوں اور بہانوں سے ذات پات، رنگ و نسل اور مذہب کے نام پر فکر و ذہن میں گہری خلیج پیدا کی جا چکی ہے۔ آج ملک کی کئی ریاستوں میں لوگوں کو کھلی ہوا میں سانس لینے کی بھی آزادی نہیں ہے۔ پوری کی پوری ریاست ہی قید خانہ میں تبدیل کی جا چکی ہے۔ آسام کے ڈیٹینشن سنٹر میں لوگ مر رہے ہیں۔ پورے ملک میں این آر سی کرا کر دراندازی کے نام پر مسلمانوں کو دوسرے درجے کا شہری بنانے کی تیاری چل رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں نے جمہوریت کے لئے کچھ نہیں کیا تھا؟ ہر بار مسلمان سیاسی پارٹیوں کا مہرہ بنتے رہے ہیں۔ ہر دنگے کے بعد مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتے رہے ہیں۔ بھیونڈی ہو یا بڑودہ۔۔۔ میرٹھ ہو یا مراد آباد۔۔۔ جمشید پور ہو یا بھاگلپور۔۔۔ ایودھیا ہو یا گجرات یا پھر مظفر نگر۔۔۔ مسلمانوں کا خون ہر جگہ بہا ہے اور بہہ رہا ہے۔ آخر ہم کب تک شک وشبہہ کے سایے میں سہمے سہمے سے رہیں گے؟ اس سے بھدا اور گندا مذاق اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارا ہی ملک ہم سے ملک کا شہری ہونے کا ثبوت مانگ رہا ہے۔ مسلمانوں سے حب الوطنی کا سرٹیفیکیٹ طلب کیا جا رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ "وندے ماترم" گاؤ نہیں تو غدار قرار دیے جاؤ گے۔۔۔ غدار۔۔۔ جو اشفاق اللہ خاں وندے ماترم کہتا ہوا پھانسی کے پھندے سے جھول گیا، جو عبدالحمید پاکستانی توپ کے مہانے پر کھڑا ہو گیا۔۔۔ اس اشفاق اور حمید کی قوم کو کچھ کہو، پر غدار تو مت کہو۔ حد تو یہ ہے کہ آج کوئی یہ کہنے کی ہمت نہیں کرتا کہ جو بھی ہمیں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، جنوب، شمال، دیہی یا شہری، ہندی یا اردو زبانوں میں بانٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی جو لوگ بھی ملک کے اندر اتحاد کے خلاف کام کرتے ہیں وہ ملک کے دشمن ہیں۔ آج ذات پات کی بنیاد پر انتخابات لڑے جاتے ہیں اور جیتنے کے بعد انہیں پارلیامنٹ اور اسمبلی میں جگہ ملتی ہے، پھر سرکار بنتی ہے اور پارلیمانی حکومت چلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے ایک قومی نظریہ کی تعمیر اور مشترکہ ہندوستانی معاشرے کی پہچان بنانے کا ہمارا مقصد پورا نہ ہو سکا۔

نفسیات کے سائنسداں بتاتے ہیں کہ غلام کو اپنے مالک کی ہر بات بھلی لگتی ہے اور وہ ویسا ہی بننا چاہتا ہے۔ مغربی ملکوں کی غلامی میں صدیوں تڑپنے کے بعد فطرتاً یہ لازم تھا کہ ہم اپنے مالکوں کے طرز حکومت اور تنظیموں کی طرف مائل ہوتے اور انہیں ہی عمدہ و قابل عمل تصور کرتے۔ آزادی کی لڑائی کے دنوں میں بھی قومی مہم کے لیڈروں کی مانگ رہی تھی کہ ہندوستانیوں کو ہندوستان میں بھی وہ سبھی حقوق و مواقع ملیں جو انگریزوں کو اپنے دیش میں حاصل تھے۔ دراصل آزادی کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ ہر گاؤں میں پینے کا پانی، بھوک سے آزادی اور بیمار پڑنے پر طبی سہولیات میسر ہو، لیکن آزادی کے ۷۰ سال بعد بھی دیش میں بے شمار گاؤں ایسے ہیں جہاں پینے کے پانی کا انتظام نہیں ہے۔ آج بھی تقریباً ۳۰ سے ۴۰ فیصد ہندوستانی خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ لاکھوں لوگوں کو دو وقت کی روٹی بھی نصیب نہیں ہو رہی ہے۔ این سی آر بی کی تازہ رپورٹ بتاتی ہے کہ ہر دو گھنٹے میں تین لوگ بے روزگاری کی وجہ سے خودکشی کر رہے ہیں۔ آخر یہ کیسا مذاق ہے؟ جمہوریت کی بنیاد انسانی زندگی کی قیمت اور ہر فرد کے درمیان برابری کو مانا جاتا ہے، لیکن ہماری سماجی زندگی اور سوچ و فکر آج بھی آمریت پسند یعنی 'سامنت وادی' ہے۔

آج بھی انسانی زندگی کی الگ الگ قیمتیں لگتی ہیں۔ کہیں ایک بچے کا یومیہ خرچ ۵۰۰ روپئے ہے، تو کہیں صرف ۲۰۰-۳۰۰ روپے میں آدیواسی مائیں اپنے لخت جگر کو بیچ ڈالتی ہیں۔ ملک میں سیکڑوں لوگوں کو گائے کے نام پر لنچ کر دیا گیا۔ دیش میں مصیبت صرف سیاسی نظام کی خرابی ہی نہیں ہے، بلکہ معاملہ ملک کی عزت و وقار کا بھی ہے۔ اس سسٹم میں جو ان کی مرضی کے موافق کہتے ہیں انعام کے حقدار بنتے ہیں اور جو سچی بات کہنے کی ہمت کرتے ہیں وہ سزا کے مستحق قرار دیدیے جاتے ہیں۔ آج پیسہ، کرسی، اقتدار، عہدہ اور خطاب کی لڑائی ہی سب کچھ ہو گئی ہے۔ دیش کے ایم پی پیسے پر بکنے لگے ہیں۔ انہوں نے پارلیمنٹ تک کو اس کام کے لئے نہیں بخشا۔ حد تو یہ ہے کہ عوام کے سوالوں کو بھی پیسے لے کر پوچھتے ہیں، پیسوں پر ان کا بکنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سب کے سب پیسے و شہرت کے لالچی ہیں۔ سب کو اپنے اپنے مفادات اور نفع کی روٹی سینکنی ہے چاہے ملک کا تیاپانچا ہو جائے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی ہوتا رہا اور ہم اسی سیاسی نظام سے چپکے رہے تو یقیناً جلد ہی ہماری جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسے بچانا ہے تو اس ملک کا نظام اور اسے چلانے والے دونوں کو بدلنا ہو گا۔ عوام کو جگانا ہو گا۔

***

ڈیموکریسی انڈیکس ۲۰۱۹
ہندوستان ۱۰ درجہ نیچے پھسلا

اسکور	ملک		درجہ
6.90	بھارت		51
6.27	سری لنکا		69
5.88	بنگلہ دیش		80
5.30	بھوٹان		91
5.28	نیپال		92
4.25	پاکستان		108
2.85	افغانستان		141

- گزشتہ 70 برسوں سے ملک میں ہر سال 'یوم جمہوریہ' منایا جاتا ہے، اپنے خطاب میں وزیر اعظم حکومت کی حصولیابیوں اور ملک کے مسائل کا ذکر کرتے رہے ہیں، لیکن گذشتہ کچھ برسوں سے مسائل کا ذکر کم اور اپنی پیٹھ آپ تھپتھپانے کا کام زیادہ کیا جا رہا ہے۔
- آج بھی انسانی زندگی کی الگ الگ قیمتیں لگتی ہیں۔
- کہیں ایک بچے کا یومیہ خرچ 500 روپئے ہے۔
- صرف 200-300 روپے میں مائیں اپنے لخت جگر کو بیچنے پر مجبور ہیں۔
- ہر دو گھنٹے میں تین لوگ بے روزگاری کی وجہ سے خودکشی کر رہے ہیں۔
- آج بھی 30 سے 40 فیصد ہندوستانی خط افلاس سے نیچے جی رہے ہیں۔

کیوں کھٹک رہا ہے تبلیغ مذہب کا بنیادی دستوری حق؟

سلسلہ صفحہ نمبر ۲

بات کرتے ہیں، لہٰذا مذہب کیوں بدلیں؟ یہ بات گاندھی جی نے امبیڈکر کے سامنے بھی رکھی تھی۔ اس کا جواب امبیڈکر نے یہ دیا تھا کہ بھلائی کی بات تو سب مذہب کرتے ہیں، لیکن بھلائی کیا ہے اس پر تمام مذاہب متفق نہیں ہیں۔ امبیڈکر نے ہندو دھرم کی مثال دے کر سمجھایا کہ اس میں بھلائی کا تصور تو ہے، لیکن یہ بھلائی ذات پات، اونچ نیچ اور چھوت چھات کی مذمت کرنے کے بجائے ان سب کا دفاع کرتی ہے۔ اس لیے اچھوتوں کے لیے ہندو دھرم میں رہنا غلامی کے مترادف ہے۔ ان کی دوسری دلیل یہ تھی کہ مذہب کا اصل مقصد سماجی زندگی (Sociallife) سے جڑا ہوتا ہے نہ کہ فوق الفطرت (Supernatural) پہلوؤں سے اور جب انہوں نے ہندو دھرم کا تقابل دیگر مذاہب سے کیا تو پایا کہ یہاں تو اچھوتوں کے لیے ناانصافی ہی ناانصافی ہے۔ لہٰذا اچھوتوں کے لیے اس استحصال زدہ زندگی سے نجات پانے کو انہوں نے ہندو دھرم کو ترک کرنا ضروری قرار دیا اور کہا کہ ہندو دھرم سے باہر جو بھی مذہب سماجی مساوات اور اخوت کے نظریہ کو فروغ دیتا ہو، وہ اچھوتوں کے لئے مناسب ہے۔ تبدیلئ مذہب کا مسئلہ ہمیں ریزرویشن میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ آج بھی لاکھوں کروڑوں دلت مسلمان (پسماندہ مسلمان) اور دلت عیسائی کو ایس سی ریزرویشن سے باہر رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی گاؤں یا شہر میں کوئی ہندو دھوبی ہے تو اس کو ایس سی ریزرویشن دیا جاتا ہے۔ مگر اسی حال میں اگر اس کا کوئی پڑوسی مسلم یا عیسائی دھوبی رہتا ہے تو کو ایس سی کے مطابق اس کو ریزرویشن نہیں دیا جاتا۔ یہ تعصّب مذہب پر مبنی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ کیا یہ ہندوستانی سیکولرازم کی روح کی پامالی نہیں ہے؟

ایسا نہیں ہے کہ دلت مسلمان اور عیسائی کو کبھی ریزرویشن نہیں ملتا تھا۔ آزادی کے بعد اچانک ۱۹۵۰ میں ایک صدراتی فرمان لا کر دلت مسلم اور عیسائی دلتوں کو ایس سی ریزرویشن سے باہر کر دیا جاتا ہے۔ تب سے لے کر اب تک یہ لوگ ایس سی زمرے میں اپنی شمولیت کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک کسی سرکار نے اس ناانصافی کو ختم نہیں کیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد یہاں کے حکمرانوں نے یہ طے کیا کہ ریزرویشن جیسے پروگرام صرف ہندو دلتوں اور آدی واسیوں اور پچھڑوں کے لیے بنانے ہوں گے اور اقلیتوں جیسے مسلمان یا عیسائیوں کو اس منصوبہ سے دور رکھا جائے گا۔ جو حقوق مذہبی اقلیتوں کو فراہم ہیں وہ مذہبی آزادی اور ثقافتی حقوق سے متعلق ہیں۔ ان سب کے پیچھے جو تعصّب کام کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان اور عیسائی ہندو سماج سے الگ ہیں اور اگر دلت مسلمان اور دلت عیسائی کو ایس سی ریزرویشن دیا گیا تو اس سے تبدیلئ مذہب کو فروغ ملے گا اور بڑی تعداد میں پسماندہ ہندو مسلمان اور عیسائی بن جائیں گے۔ ممبئی سے رکن پارلیمنٹ کے ایم منشی نے مذہب کی تشہیر کے حق میں اپنی بات رکھی۔ اس وقت منشی کانگریس کے لیڈر تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کو قانون اور آئین کی اچھی سمجھ ہے۔ بعد میں منشی کانگریس چھوڑ کر سوتنتر پارٹی میں شامل ہو گئے اور اپنے آخری دنوں میں وہ جن سنگھ (جو بعد میں بی جے پی کہلانے لگی) میں چلے گئے۔ منشی نے بھی مذہب کی تشہیر کے بنیادی حق کی وکالت کی اور کہا کہ "جب کوئی کسی دباؤ میں آئے بغیر اپنی مرضی سے اپنی ضمیر کی آواز سن کر تبدیلئ مذہب کرتا ہے تو اس کو تسلیم کرنا ہو گا"۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ تبدیلئ مذہب کی حمایت کرنے والوں میں سے بعض نے "اپنی مرضی سے، ضمیر کی آواز سن کر" جیسی شرطیں لگائیں، جس کا غلط استعمال بعد میں ہوتا رہا ہے۔ یہ کتنے افسوس کی بات یہ کہ آئین ہمیں تبدیلئ مذہب کا بنیادی حق دیتا ہے، جس کو کسی بھی قیمت پر خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مگر "جبر" کا مسئلہ اٹھا کر فرقہ پرست طاقتیں ایسے قانون بناتی رہی ہیں جو انسان اور اس کی مذہبی آزادی کے بیچ میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ کیسے ایک سرکاری افسر طے کرے گا کہ کس فرد نے اپنی مرضی سے کوئی مذہب اختیار کیا ہے؟ ایک سیکولر ملک کی سرکاروں کو ان سب باتوں سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بھی تو سیکولر اقدار کی پامالی ہے کہ جب کوئی فرد مسلمان یا عیسائی بن جاتا ہے تو سرکار، حکمراں اور سیاست داں پریشان ہو جاتے ہیں اور اس کو ہندو سماج کے لیے خطرہ قرار دے دیا جاتا ہے اور پھر فرقہ وارانہ سیاست شروع ہو جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جب تک کوئی شخص خود یہ شکایت نہ کرے کہ فلاں شخص نے جبراً اس کا مذہب تبدیل کروایا ہے یا کروانا چاہتا ہے، تب تک سرکار ان سب باتوں سے دور رہے۔ مگر سیکولر حکومت اور سیکولر پارٹی بھی کسی ہندو کے مذہب بدلنے پر پریشان ہو جاتی ہے۔ کیا ان سب باتوں کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اقتدار میں قابض لوگ پوری طرح سے ہندو فرقہ ورانہ سوچ سے آج بھی باہر نہیں نکل پائے ہیں؟

(مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔)
debatingissues@gmail.com

تبدیلی مذہب پر پھر فرقہ وارانہ سیاست

یہ تشویشناک ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے نائب صدر تبدیلی مذہب پر اپنی بات رکھتے وقت غیر مصدقہ باتیں پیش کرتے ہیں

ابھے کمار

نائب صدر جمہوریہ جگدیپ دھنکھڑ نے تبدیلی مذہب سے متعلق ایک نہایت متنازعہ بیان دیا ہے۔ بدھ کے روز جے پور کی ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے، جناب دھنکھڑ نے دعویٰ کیا کہ ملک میں ایک منظم طریقے سے تبدیلی مذہب کا عمل جاری ہے، جو نہ صرف غیر قانونی ہے، بلکہ ملک کے لیے بھی انتہائی خطرناک ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مذہب تبدیل کرنے کی سرگرمی میں ملوث افراد عوام کو میٹھی باتوں اور لالچ میں مبتلا کر کے پھنساتے ہیں اور ایسے عناصر کی دراندازی ملک کے کمزور طبقات، خاص طور پر قبائل کے درمیان ہو رہی ہے۔ عوام کو مبینہ مذہبی تبدیلی کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے، انہوں نے کہا کہ ایسی سرگرمیاں معاشرتی اخلاقیات اور ملک کے آئینی اصولوں کے خلاف ہیں، لہٰذا عوام کو خبردار رہنا چاہیے اور انہیں تبدیلی مذہب کے ناپاک منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے کام کرنا چاہیے۔

دھنکھڑ نے یہ بیان اس وقت دیا ہے جب ہریانہ میں انتخابی سرگرمیاں زوروں پر ہیں۔ بی جے پی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے کہ اقتدار کانگریس یا دیگر پارٹیوں کے ہاتھ نہ جائے۔ دہلی کے سابق وزیر اعلیٰ اور عام آدمی پارٹی کے رہنما اروند کیجریوال کی جیل سے ضمانت کے بعد، ہریانہ کا اسمبلی انتخاب مزید دلچسپ ہو گیا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بی جے پی جو انتخاب میں پیچھے نظر آ رہی ہے، نے تبدیلی مذہب کا کارڈ کھیل کر ووٹروں کو پولرائز کرنے کی کوشش کی ہو۔ پہلے ہی بی جے پی کے رہنما گائے، بیف اور لو جہاد کے مسائل کو اچھال رہے ہیں اور جھارکھنڈ میں بنگلہ دیشی اور روہنگیائی مسلمانوں کی دراندازی کے خوف کو ہوا دے کر اکثریتی طبقے کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۷۳ سالہ جگدیپ دھنکھڑ ہندو جاٹ برادری سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا ہریانہ میں سیاسی تجربہ وسیع ہے۔ ۱۹۹۰ء میں سوشلسٹ لیڈر چندر شیکھر کی قیادت میں بننے والی مرکزی حکومت میں انہیں پارلیمانی امور کا وزیر بنایا گیا تھا۔ انتخابات سے قبل ان کے تبدیلی مذہب پر دیے گئے بیان سے بی جے پی کو سیاسی فائدہ ہونے کی توقع ہے۔

مذہب پر مبنی فرقہ وارانہ سیاست کسی مخصوص پارٹی کو کچھ ووٹ تو دلوا سکتی ہے، لیکن اس سے ملک کو بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ اپنی تقریر میں انہوں نے تاریخی اور سماجی حقائق کو پوری طرح نظرانداز کیا۔ نائب صدر، جو ایک آئینی عہدے پر فائز ہیں، نے یہ کہنا مناسب نہیں سمجھا کہ تبدیلی مذہب سے متعلق

حقوق ہمارے آئین کے بنیادی حقوق کا حصہ ہیں، جنہیں کسی بھی صورت میں واپس نہیں لیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو ملک میں جمہوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لبرل معاشرے کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ شہریوں کو شخصی آزادی دی جائے اور مذہبی آزادی بھی اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ شخصی آزادی اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ ریاست کسی بھی فرد کی انفرادی زندگی میں مداخلت نہیں کرے گی۔ یاد رہے کہ ایک آمرانہ نظام اور جمہوری نظام میں یہی فرق ہوتا ہے کہ جمہوری نظام کا آئین ہر فرد کو اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزارنے کی آزادی دیتا ہے۔ جمہوری نظام میں شہری پوری طرح آزاد ہیں کہ وہ کیا کھانا چاہتے ہیں، کیا پہننا چاہتے ہیں، کس سے شادی کرنا چاہتے ہیں، کہاں رہنا چاہتے ہیں، کیا کاروبار کرنا چاہتے ہیں اور کون سا مذہب اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اختصار یہ ہے کہ جمہوری ملک میں ریاست کو کسی شہری کی انفرادی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ریاست صرف ان اعمال پر روک ٹوک کرتی ہے جو دوسروں کے لیے نقصان دہ ہوں، جبکہ آمرانہ نظام میں حکمران اپنے شہری کی ہر سرگرمی پر نظر رکھتے ہیں اور شخصی زندگی میں مداخلت کرتے ہیں۔

> ”
> یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پسماندہ اور کمزور طبقات نے اسلام اور عیسائیت کو فریب میں نہیں، بلکہ ذات پات کے نظام سے نجات پانے کے لیے اپنایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بھارت میں آج مذہب کی تبلیغ میں سب سے زیادہ سرگرم بھگوا جماعت کے لوگ ہیں، لیکن مذہب پھیلانے کے نام پر بڑی تعداد میں معصوم مسلمان اور عیسائی جیلوں میں بند کیے جا چکے ہیں۔ بھارت جیسے جمہوری ملک میں اگر آئینی عہدے پر فائز شخص بھی فرقہ وارانہ بیان دینے لگے تو یہ انتہائی تشویشناک ہے۔

یہ تشویشناک ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے نائب صدر تبدیلی مذہب پر اپنی بات رکھتے وقت غیر تصدیق شدہ باتیں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تقریر سن کر ایسا لگتا ہے کہ اکثریتی طبقے کو اقلیت بنانے کی ایک بڑی سازش ہو رہی ہے اور اس کے پیچھے اقلیتی مبلغین کا ہاتھ ہے۔ جب نائب صدر نے کہا کہ ملک میں ایک منصوبہ بند طریقے سے مذہب تبدیل کیا جا رہا ہے، تو انہوں نے کوئی معتبر اعداد و شمار پیش نہیں کیے۔ ہندوتوا طاقتیں بار بار دعویٰ کرتی ہیں کہ ہندوؤں کا مذہب تبدیل کیا جا رہا ہے، لیکن آج تک انہوں نے کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کیا۔

بھگوا طاقتیں مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کا خوف بھی دکھاتی ہیں، لیکن وہ کبھی یہ نہیں بتاتیں کہ مسلم آبادی کی شرح نمو میں نمایاں کمی آئی ہے۔ دن رات پروپیگنڈا پھیلایا جاتا ہے کہ لالچ یا زور زبردستی سے ہندوؤں کا مذہب تبدیل کیا جا رہا ہے اور اس سے ملک کی سالمیت کو کمزور کیا جا رہا ہے۔ اس فرقہ وارانہ سوچ کے پیچھے سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ملک کو ایک مخصوص مذہب سے جوڑا جاتا ہے اور اسلام و عیسائیت کو غیر ملکی مذاہب کہا جاتا ہے۔ کچھ ایسی ہی باتیں جناب دھنکھڑ نے بھی کہیں اور ملک کو سناتن دھرم سے جوڑ دیا، حالانکہ آئین کہتا ہے کہ ریاست کا کوئی اپنا مذہب نہیں ہوگا۔

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ بھارت میں ہر مذہب کے لوگ صدیوں سے ساتھ رہتے آئے ہیں اور ان کے درمیان ہم آہنگی موجود ہے۔ بھارت کی مٹی کی یہی خصوصیت ہے کہ یہاں ایشور کی پوجا بھی کی جاتی ہے اور اللہ کی عبادت بھی۔ جہاں تک مذہب تبدیل کرنے کا سوال ہے، تو یہ کہنا کہ کمزور طبقات کو لالچ دے کر انہیں ہندو سے مسلمان یا عیسائی بنایا جا رہا ہے، نہ صرف اقلیتوں کے خلاف ہے بلکہ ان ہندوؤں کی شخصی آزادی کے بھی خلاف ہے جنہوں نے اپنی مرضی سے اپنا مذہب بدلا ہے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے تو تبدیلی مذہب کو دلتوں کے لیے نجات کا راستہ کہا، کیونکہ انہیں اپنے سماج میں اچھوت بنا کر رکھا گیا۔ انہوں نے بدھ دھرم کسی لالچ کی وجہ سے قبول نہیں کیا، بلکہ انہیں معلوم تھا کہ یہ مذہب دلتوں اور دیگر محکوم طبقات کو برابری دے گا اور ان کی ترقی کی راہ ہموار کرے گا۔ یہ بھی ایک بڑی غلط فہمی ہے کہ صرف ہندو ہی اپنا مذہب تبدیل کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے کچھ لوگ ہندو دھرم بھی اپنا رہے ہیں۔ آر ایس ایس آدی واسیوں کو ہندو بنانے کے لیے برسوں سے کام کر رہی ہے، وہیں بھگوا جماعت الٹے عیسائی مشنریوں پر تبدیلی مذہب کا الزام لگا رہی ہے۔ بعض اوقات آدی واسیوں کے درمیان تعلیم پھیلانے والے عیسائی پادریوں پر حملے کیے گئے ہیں اور ان میں سے کچھ کو زندہ جلا دیا گیا ہے۔ ان سب حملوں کے پیچھے کون ذمہ دار ہیں؟

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پسماندہ اور کمزور طبقات نے اسلام اور عیسائیت کو فریب میں نہیں، بلکہ ذات پات کے نظام سے نجات پانے کے لیے اپنایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بھارت میں آج مذہب کی تبلیغ میں سب سے زیادہ سرگرم بھگوا جماعت کے لوگ ہیں، لیکن مذہب پھیلانے کے نام پر بڑی تعداد میں معصوم مسلمان اور عیسائی جیلوں میں بند کیے جا چکے ہیں۔ بھارت جیسے جمہوری ملک میں اگر آئینی عہدے پر فائز شخص بھی فرقہ وارانہ بیان دینے لگے تو یہ انتہائی تشویشناک ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

جب آئین ساز اسمبلی نے مذہبی اقلیتوں کے درد کو در کنار کر دیا۔

حسب تناسب نمائندگی کے حق سے محرومی کا وبال مسلمان آج تک جھیل رہے ہیں

ابھئے کمار، دہلی

برطانوی حکومت نے ۱۶ مئی ۱۹۴۶ کو جب کیبنیٹ مشن پلان کے تحت آئین ساز اسمبلی کے لیے انتخابات کروائے تھے تو یہ طے کیا تھا کہ ہندوستانیوں کو اقتدار اُن ضابطوں کی بنیاد پر دیا جائے گا جو آئین میں خود انہوں نے بنائے ہوں گے۔ مگر شرط یہ تھی کہ آئین سازی کے وقت اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ اقلیتی طبقے سے مراد صرف مذہبی اقلیت (جیسے مسلمان، عیسائی، پارسی) نہیں تھے بلکہ اچھوت (دلت) آدی واسی اور پسماندہ برادری بھی اقلیت کے دائرے میں آتی تھی۔

انتخابات کے دوران مسلمانوں، سکھوں اور جنرل ہندوؤں اور دیگر نے اپنے اپنے نمائندے اُتارے۔ ان انتخابات کا انعقاد متناسب نمائندگی (سنگل ٹرانسفر ایبل ووٹ) کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے جنرل اور مسلم نشستوں پر زبردست کامیابی حاصل کی۔ تقسیم ملک کے بعد آئین ساز اسمبلی میں کانگریس کی بالادستی اور بھی مضبوط ہو گئی۔ کل سیٹوں کا ۸۲ فی صد اس کے پاس تھا۔

جب آئین ساز اسمبلی کی کارروائی ۹ دسمبر ۱۹۴۶ کو شروع ہوئی تو مسلم لیگ نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ اسکالر روچنا باجپئی کی تحریریں اس موضوع کو سمجھنے کے لیے کافی اہم ہیں۔ یہ برصغیر کی بد قسمتی ہے کہ دو سو سالوں کی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد جو آزادی ملی، وہ خون سے لت پت تھی۔ آزادی کا جشن فرقہ وارانہ فسادات کی چیخوں میں گم ہو گیا۔ اسی دوران آئین ساز اسمبلی کی بحث بھی چل رہی تھی۔ ظاہر ہے جو کشیدگی ایوان سے باہر محسوس کی جا رہی تھی اس کا اثر ایوان کے اندر بھی ہونا متوقع تھا۔ روچنا باجپئی آگے لکھتی ہیں کہ مسلمانوں اور سکھوں کی نمائندگی کا دعوی کرنے والی جماعتیں، مسلم لیگ اور سکھ پینتھک پارٹی، اس وقت بری حالت میں تھیں اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے کوئی متحدہ محاذ کھڑا کرنے میں ناکام رہیں۔ نتیجتاً اُن کو جو بھی حقوق برطانوی حکومت نے دیے تھے، ان میں سے بہت سارے چھین لیے گیے۔

۲۷ اگست ۱۹۴۷ کے روز سردار پٹیل کی قیادت میں ایک مشاورتی کمیٹی نے اپنی رپورٹ آئین ساز اسمبلی میں پیش کی۔ یہ رپورٹ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ سے متعلق تھی۔ دو دنوں تک اس موضوع پر خوب بحث ہوئی اور ارکان نے اپنا موقف رکھا۔ جب ایوان میں بحث ہو رہی تھی تو پنجاب سمیت برصغیر کے بعض حصے فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں جل رہے تھے۔ تقسیم کے لیے مسلم لیگ کو مورد الزام ٹھہرایا جا چکا تھا اور ان کے ارکان کروڑوں مسلمانوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تھے۔ لہذا آئین ساز اسمبلی میں موجود مسلم ارکان بڑے دباؤ میں تھے۔ بحث کی شروعات میں ہی سردار پٹیل نے کہہ ڈالا کہ ایک اتفاق رائے قائم ہو چکا ہے کہ آزاد ہندوستان میں "سپریٹ الیکٹوریٹ" (علاحدہ رائے دہندگان کی حمایت) کی جگہ نہیں ہوگی۔ اس کو انہوں نے ایک "بڑی کامیابی" سے تعبیر کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ انتخابات کے دوران اقلیتوں کے امیدواروں کو "ویٹیج" نہیں دی جائے گی۔ مگر اُنہوں نے یہ صاف طور سے کہا کہ "سپریٹ الیکٹوریٹ" کے تحت اقلیتی فرقوں کو متناسب نمائندگی دی جائے گی۔ مگر جب بھارت کا دستور حتمی شکل اختیار کر گیا تو اسے بھی خارج کر دیا گیا۔ ریزرویشن کی پالیسی صرف دلتوں اور آدی واسیوں کے لیے بنائی گئی۔

"سیپریٹ الیکٹوریٹ" (متناسب نمائندگی) اور ریزرویشن کی منسوخی اقلیتی طبقے پر بڑا حملہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس نے اقلیتوں کی کمر توڑ ڈالی تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ چار دہائیوں سے چلی آ رہی اس پالیسی کی منسوخی کے منفی اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ آج اقلیتوں کی سب سے بڑی جماعت مسلمان نہ تو پارلیمنٹ میں ہی کہیں نظر آ رہے ہیں اور نہ ہی وہ اپنی نمائندگی دیگر سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں ہی حاصل کر پا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کی عدم نمائندگی کی صورت حال اس قدر مایوس کن ہے کہ ۵۴۳ ممبران پر مشتمل لوک سبھا میں مسلم ارکان صرف ۲۰ کے قریب ہیں، جو تقریباً ۴ فی صد ہے۔ اگر مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے تو اُن کے حصے میں کم از کم ۷۵ ایم پیز آنے چاہئیں۔ اس طرح کی تشویشناک صورت حال جو آج دیکھنے کو مل رہی ہے، اگر آئین ساز اسمبلی نے ایسے فیصلے نہیں لیے ہوتے اور اگر کمیونیٹی کی بنیاد پر بنائی جانے والی پالیسی سے مذہبی اقلیتوں کو الگ نہیں کیا جاتا تو کیا مسلمان آج اس قدر مجبور ہوتے؟ یہ صحیح ہے کہ آئین میں اقلیتوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کی ضمانت بھی دی گئی اور بعد میں پسماندہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو او بی سی گروپ میں لا کر ریزرویشن بھی دیا گیا ہے، مگر یہ سب مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ تبھی تو آج مسلمان کئی حلقوں میں دلتوں سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں۔ کیا اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہبی اقلیتوں کے خصوصی حقوق کو کوئی متبادل پیش کیے بغیر اچانک سے ختم کر دیا گیا؟

کمیونیٹی کی بنیاد پر نمائندگی فراہم کرانے اور پالیسی بنانے کی تاریخ ہندوستان میں سو سالوں سے بھی پرانی ہے۔ یہ روایت انگریزی حکومت نے شروع کی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کو ان کی کمیونیٹی اور برادری کے ساتھ دیکھا اور اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی پالیسی بنائی۔ انہوں نے اقلیتوں کے لِے خصوصی پروگرام متعارف کیے، کچھ کو تو مذہبی اقلیت کہا مگر اقلیت کے زمرے میں اچھوت اور آدی واسی بھی تھے۔ دلتوں کو عرصے سے "اچھوت پرتھا" کا شکار بنایا گیا تھا۔ پسماندہ طبقات اچھوت پرتھا کے شکار نہیں تھے مگر وہ اقتصادی، سماجی اور تعلیمی طور سے کافی پیچھے تھے۔ آدی واسی تو اپنے ہی جل، جنگل، زمین اور دیگر وسائل سے محروم کیے جا رہے تھے۔ تبھی تو انگریزوں نے الگ الگ فرقوں کے لیے الگ الگ پالیسی بنائی۔ بہت سارے راجے رجواڑوں نے بھی محکوم طبقوں کو ریزرویشن دیا۔ مثال کے طور پر سال ۱۹۱۸ میں میسور رجواڑے نے غیر برہمن پسماندہ ذاتوں کے لیے نوکریوں میں ریزرویشن دیا اس سے قبل ۱۹۰۹ کے آئینی اصلاح کے تحت انگریزوں نے پہلی بار مسلمانوں کے لیے "سپریٹ الیکٹوریٹ" کی شروعات کی۔ ۱۹۱۹ اور ۱۹۳۵ میں لائے گئے آئینی اصلاح کے تحت مسلمانوں کے ساتھ سکھ، ہندوستانی عیسائی اور دیگر فرقوں کو بھی "سپریٹ الیکٹوریٹ" فراہم کیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے نوکریوں میں سب سے پہلے ریزرویشن ۱۹۲۵ میں انگریزوں نے قبول کیا، جسے ۱۹۳۵ میں باضابطہ طور سے نافذ کیا گیا جس میں مسلمانوں کے علاوہ دیگر فرقوں کو بھی شامل کیا گیا۔

مگر ملک کی آزادی اور پاکستان کے قیام نے ہوا بدل دی اور مذہبی اقلیتوں کے حقوق کی بات کرنا مشکل ہوتا چلا گیا۔ ماحول اس طرح سے فرقہ وارانہ سوچ سے متاثر ہونے لگا کہ اقلیتوں، خاص کر مسلمانوں کے لیے بنائی گئی "سپریٹ الیکٹوریٹ" اور ریزرویشن کی پالیسی کو انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور راج کرو" کی پالیسی سے جوڑ کر دیکھا جانے لگا۔ یہ بات تیزی سے بہت سارے ہندو سیاست دانوں کے ذہنوں میں بیٹھنے لگی کہ اگر یہ پالیسی نہیں بنی ہوتی تو ملک کب کا آزاد ہو گیا ہوتا اور پاکستان بھی نہیں بنتا۔ وقت کے ساتھ یہ خدشات کم ہونے کے بجائے بڑھتے چلے گئے ہیں۔ اور آج حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ مسلمانوں کی فلاح اور ترقی کے لیے کسی ٹھوس پالیسی کی بات کرنے سے نام نہاد سیکولر جماعت بھی گھبراتی ہے۔

وسطی صوبہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر پی سی دیش مُکھ نے آئین ساز اسمبلی میں اپنی بات رکھتے ہوئے کہا تھا کہ "میری رائے میں اقلیت جیسا خوفناک لفظ ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں نہیں رہا ہے۔ جب سے ہندوستان سیاسی طور سے بیدار ہوا ہے تب سے اقلیتوں کے مفاد کا شیطان ہمارے سامنے کھڑا ہے اور یہ ملک کی ترقی کو روکے ہوئے ہے۔ اگر تاریخی طور پر دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ انگریزوں نے اسے وجود میں لایا تھا۔ میرے نزدیک اقلیتوں کے شیطان نے اپنا کام کر دیا ہے اور سو سالوں سے متحد رہے ہمارے محبوب ملک کو ایک سے زیادہ حصوں میں تقسیم کر دیا ہے" دیش مُکھ صاحب کی تقریر آج کے فرقہ وارانہ پروپیگنڈے سے کافی ملتی جلتی ہے۔ ان کی تنگ نظری دیکھیے کہ انہوں نے تقسیم وطن کی ساری ذمّہ داری انگریزوں کے سر تھوپ دی جنہوں نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بعض پالیسیاں بنائی تھیں۔ مزید یہ غلط بیانی کہ اقلیت ہی زیادہ تر جگہوں پر اکثریت کے اوپر ظلم اور زیادتی کر رہی ہے۔

آسام کی نمائندگی کرنے والے سری وت روہنی کمار چودھری نے ایوان کو ڈرایا کہ اگر کانگریس پارٹی اسی طرح اقلیتوں کے لیے خصوصی پالیسی لاتی رہی تو دس سالوں کے اندر اقلیت اکثریت بن جائے گی۔ اتنا ہی نہیں اُنہوں نے سرکار پر بھی تنقید کی اور کہا کہ ایک طرف پاکستان اپنے اکثریت طبقے (مسلمان) کے بارے میں کام کر رہا ہے اور دوسری طرف ہندوستان، اقلیت (مسلمان) کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی پوری طاقت لگا رہا ہے۔

آج جو مسلم مخالف بھگوا پروپگنڈہ چل رہا ہے اس کی گونج چودھری صاحب کی تقریر میں بھی سنی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں اکثریتی طبقہ یعنی ہندو "مظلوم" ہے اور سیکولر پارٹیاں مسلمانوں کی "منہ بھرائی" کر رہی ہیں۔ مدراس کے ایس ناگپا نے بھی اپنی تقریر میں اقلیت مخالف جذبات کا مظاہرہ کیا اور کہا ہے کہ "اقلیتی فرقوں نے آزادی کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کیں"۔

ان باتوں کو سن کر آئین ساز اسمبلی میں بیٹھے مسلم ارکان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی اس درد کو بیان کرنا مشکل ہے۔ مالابار سے آئے ہوئے بی پوکر صاحب بہادر اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ اُن کو یہ بخوبی معلوم تھا کہ ملک کی صورت حال بدل چکی ہے اور ان کے لیے اقلیتوں کے حقوق کی تائید کرنا بڑا مشکل کام ہوگا۔ اقلیتوں کے وجود کو ختم کرنے کی بات کو خارج کرتے ہوئے پوکر صاحب نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کی اکثریت اور اقلیت کے درمیان "فرق" کو کم کیا جائے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ ہر سماج میں اقلیتی اور اکثریتی فرقے ہوں گے۔ ہندوستان جیسے بڑے ملک میں ایسا ہونا تو لازمی ہے۔ یہ بھی کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اقلیتوں کے وجود کو پوری طرح سے مٹا دے۔ اس لیے ہمیں اُن کے درمیان فرق کو کم کرنا چاہیے تاکہ اقلیتیں خود کو مطمئن محسوس کریں"۔ ملک کے حالات کو دیکھتے ہوئے پوکر صاحب کے پاس اپنی دلیل پیش کرنے کے لیے وہ الفاظ نہیں تھے جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے اکثریتی سماج سے اپیل کی کہ وہ "کشادہ دلی" کے جذبے کے ساتھ اقلیتوں کے مسائل کو دیکھیں۔ آگے انھوں نے "سپریٹ الیکٹوریٹ" کا دفاع کیا اور کہا کہ یہ نظام اس بات کو یقینی بنائے گا کہ اقلیتی سماج سے مناسب امیدوار منتخب ہو کر قانون ساز اسمبلی میں جائے گا اور ان کے مفاد کی صحیح ترجمانی کرے گا۔ اُنہوں نے "جوائنٹ الیکٹوریٹ" کی خامیوں کو بھی اجاگر کیا، جس کو آج ہم اور بھی بری حالت میں دیکھ رہے ہیں۔

جوائنٹ الیکٹوریٹ" کی پہلی ناکامی یہ ہے کہ اس میں اقلیتی طبقے حکومت سازی کی کاروائی سے باہر ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں اس سسٹم کے تحت اقلیتوں کو اپنی مستحقہ نمائندگی محفوظ رکھنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اقلیتی سماج سے امیدوار منتخب ہو بھی جائیں تو وہ اپنی کمیونیٹی کے مفاد کا تحفظ نہیں کر پاتے ہیں، کیونکہ ان کے اوپر اپنی پارٹی کا دباؤ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تین طلاق سے متعلق بل کے دوران مسلم ارکان پارلیمنٹ مسلم سماج کے مفاد کا تحفظ نہیں کر پائے۔

"اقلیتی فرقے کے سب سے قابل انسان کو اس فرقے کے خیالات کی ترجمانی کرنے کہ موقع ملنا چاہیے۔ یہ کام سپریٹ الیکٹوریٹ کے علاوہ کوئی اور دوسرا نظام نہیں کر سکتا" پوکر صاحب نے یہ بات صاف طور پر کہی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ سپریٹ الیکٹوریٹ گزشتہ ۴۰ سالوں سے نافذ تھا اور اس کو اچانک ختم کر دینا مسلمانوں کے لیے بہت مایوس کن فیصلہ ہوگا۔ کچھ ایسی طرح کی بات اُتر پردیش سے منتخب رکن چودھری خلیق الزماں نے بھی کہی۔ انہوں نے ممبران سے اپیل کی کہ اس مسئلے کو ماضی میں دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔

مگر اُتر پردیش کے ہی دوسرے رکن پنڈت گوبند بلبھ پنت نے خلیق الزماں کی بات کاٹی اور کہا کہ سپریٹ الیکٹوریٹ اقلیتوں کے لیے "خودکشی" کرنے کے مترادف ہوگا۔ اپنی دلیل میں انہوں نے کہا کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اس بات میں ہیں کہ وہ ریاست کے وجود میں ضم ہو جائیں۔

اس بات کا بھی ذکر کم ہی ہوتا ہے کہ آخر میں قانون ساز اسمبلی اور نوکریوں میں ریزرویشن صرف دلتوں اور آدی واسیوں کو دیا گیا اور مسلمانوں کو آخری لمحات میں اس پالیسی سے باہر کر دیا گیا۔ اس کے حق میں بھی جو دلیل دی گئی وہ یہ تھی کہ اس پالیسی سے دلتوں کے مین اسٹریم (ہندو سماج) میں ضم ہو جانے میں آسانی ہوگی!

آئین ساز اسمبلی کی تقریروں کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کی کہ مسلمانوں کی مخصوص مذہبی اور ثقافتی تشخص کی وجہ سے اُن کو ریزرویشن کی پالیسی سے دور رکھا گیا ہے، باوجود اس کے کہ سردار پٹیل کی قیادت والی مشاورتی کمیٹی نے مسلمانوں کے لیے پہلے متناسب نمائندگی پر مبنی ریزرویشن کی سفارش کی تھی۔ یہ سب دیکھ کر کسی بھی انساف پسند اور غیر جانب دار محقق کو یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ آزادی کے وقت مسلمانوں کے درد کو سنا نہیں گیا۔ اگر "سپریٹ الیکٹوریٹ" کو ختم کرنا ایک نئے ملک کے لیے اتنا ہی ضروری تھا تو کیا اس کی جگہ کوئی دوسرا میکنزم نہیں لایا جانا چاہیے تھا؟ آج جب کہ مسلمانوں کی پسماندگی کے مستند ریکارڈ خود حکومت شائع کر چکی ہے، تو کیا یہ انصاف کا تقاضا نہیں ہے کہ دیر ہی سے سہی اقلیتوں کے درد کو کم از کم اب تو سنا جائے؟

(مضمون نگار جے این یو میں ریسرچ اسکالر ہیں۔)

کمیونیٹی کی بنیاد پر نمائندگی فراہم کرانے اور پالیسی بنانے کی تاریخ ہندوستان میں سو سالوں سے بھی پرانی ہے۔ یہ روایت انگریزی حکومت نے شروع کی تھی۔ انگریزوں نے ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کو ان کی کمیونیٹی اور برادری کے ساتھ دیکھا اور اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی پالیسی بنائی۔ انہوں نے اقلیتوں کے لِے خصوصی پروگرام متعارف کیے، کچھ کو تو مذہبی اقلیت کہا مگر اقلیت کے زمرے میں اچھوت اور آدی واسی بھی تھے۔ دلتوں کو عرصے سے "اچھوت پرتھا" کا شکار بنایا گیا تھا

کسی بھی انساف پسند اور غیر جانب دار محقق کو یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ آزادی کے وقت مسلمانوں کے درد کو سنا نہیں گیا۔ اگر "سپریٹ ایلکٹوریٹ" کو ختم کرنا ایک نئے ملک کے لیے اتنا ہی ضروری تھا تو کیا اس کی جگہ کوئی دوسرا میکنزم نہیں لایا جانا چاہیے تھا؟

ریزرویشن پر سپریم کورٹ کا فیصلہ، سماجی انصاف کی آئینی روح مجروح

پسماندہ طبقات میں ناراضگی۔ تحفظات کو کمزور کرنے کی پالیسیوں کے سبب حکومت کی نیت پر سوال!

ابھے کمار

دہلی انتخابات کے شور میں سپریم کورٹ نے ریزرویشن سے متعلق ایک ایسا فیصلہ سنایا ہے جس سے محکوم طبقے میں زبردست ناراضگی پائی جاتی ہے۔ ۷ فروری کے اپنے فیصلے میں عدالت عظمیٰ نے کہا کہ ریاست اس بات کی پابند نہیں ہے کہ وہ تقرری یا ترقی میں ریزرویشن دے، کیونکہ ریزرویشن دینا اس کا اختیاری معاملہ ہے لازمی نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں ریاست اپنی صوابدید کا استعمال کر کے ریزرویشن دے بھی سکتی ہے یا دینے سے انکار بھی کر سکتی ہے۔

جسٹس ایل ناگیشور راؤ اور ہیمنت گپتا پر مشتمل سپریم کورٹ کی دو ارکان پر مبنی بینچ نے کہا ہے کہ ریزرویشن آئین ہند کے بنیادی حقوق کا حصہ نہیں ہے۔ لہٰذا اسے نافذ کرنا یا نہ کرنا ریاست کے فیصلے پر منحصر ہے۔

"دفعات ۱۶-۴ اور ۱۶-۴ الف ایسی توضیحات ہیں جو ریزرویشن دینے کے راستے کھول دیتی ہیں۔ یہ ریاست کو اس بات کا بھی اختیار مہیا کراتی ہیں کہ ضرورت پڑنے پر وہ ریزرویشن دے۔ یہ ایک طے شدہ قانون ہے کہ حکومت کو سرکاری آسامیوں کی بحالی میں ریزرویشن دینے کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح ریاست اس کی بھی پابند نہیں ہے کہ وہ ترقی میں درجہ فہرست ذات اور درجہ فہرست قبائل کے لیے ریزرویشن دے"۔

عدالت عظمیٰ نے یہ بھی واضح کیا کہ اگر ریاست اپنی صوابدید کا استعمال کرتے ہوئے ریزرویشن دینا چاہتی ہے تو اسے مقدار اور اعداد و شمار جمع کرنے ہوں گے اور یہ بتلانا ہوگا کہ ریزرویشن حاصل کرنے والوں کی نمائندگی ناکافی ہے۔ "اگر ریزرویشن دینے کے ریاست کے فیصلے کو چیلنج کیا جاتا ہے تو اس صورت میں متعلقہ ریاست کو عدالت کے سامنے قابل تعین ڈیٹا پیش کرنا ہوگا۔ ریاست عدالت کو اس بات کے لیے بھی مطمئن کرے گی کہ ایک خاص زمرے کی آسامیوں کی بحالی میں ریزرویشن دینے کی وجہ یہ ہے کہ درجہ فہرست ذات اور درجہ فہرست قبائل کی نمائندگی ناکافی ہے۔ اگر ریزرویشن دیا جا رہا ہے تو اس بات کا بھی دھیان رکھا جائے کہ ریزرویشن دینے کی پالیسی انتظامیہ کی موثر کارکردگی پر منفی اثر نہیں ڈال رہی ہے"۔

بھارت کے آئین کی دفعہ سولہ چار میں یہ کہا گیا ہے کہ "اس دفعہ کا کوئی امر تقررات یا عہدوں کو شہریوں کے کسی پسماندہ طبقہ کے حق میں جس میں مملکت کے تحت ملازمتوں میں کافی نمائندگی نہ ہو، محفوظ کرنے کے لیے کوئی توضیح کرنے میں مانع نہ ہوگا" وہیں ۱۶-۴ ایف میں کہا گیا ہے کہ "اس دفعہ کا کوئی امر ریاست کو ایسی درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے حق میں، جن کی نمائندگی ملازمتوں میں ناکافی ہے، کسی قسم کے عہدوں پر سینیارٹی کے ساتھ ترقی کے معاملوں میں تحفظ کے لیے توضیح کرنے میں مانع نہیں ہوگا"۔

اس فیصلے کے بعد دلت، آدی واسی اور پسماندہ ذاتوں میں کافی ناراضگی پائی جا رہی ہے۔ جگہ جگہ کورٹ کے فیصلے سے اختلاف ظاہر کرتے ہوئے جلسے بھی منعقد کیے جا رہے ہیں۔ "ریزرویشن کے خلاف حملہ نیا نہیں ہے۔ یہ حملہ تب تک چلتا رہے گا جب تک سماج میں اونچ نیچ پر مبنی ذات پات کا نظام قائم ہے"۔ مذکورہ باتیں انسانی حقوق کے ماہر اور امبیڈکر نواز اسکالر ڈاکٹر اُما کانت نے کہیں۔ اُما کانت نے بہار کے دلتوں پر جے این یو سے پی ایچ ڈی پوری کی ہے اور سماجی انصاف سے متعلق موضوعات پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس فیصلے کے بعد حزب اختلاف کی جماعتوں نے بھی سرکار کو گھیرنا شروع کر دیا ہے۔ کانگریس نے کہا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے غیر متفق ہے۔ اس نے یہ بھی الزام لگایا کہ بی جے پی کی حکومت میں ایس سی اور ایس ٹی کے حقوق خطرے میں آ گئے ہیں۔ کانگریس کے جنرل سیکرٹری مُکل وسنیک نے کہا "کانگریس پارٹی کا یہ یقین ہے کہ ایس سی اور ایس ٹی کی تقرری کا معاملہ حکومت کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جانا چاہیے۔ یہ معاملہ آئین کے بنیادی حقوق کا ہے"۔ حال میں بی جے پی چھوڑ کر کانگریس میں آئے دلت لیڈر اُدیت راج نے اسی پریس کانفرنس میں بولتے ہوئے کہا کہ "بی جے پی بنیادی طور سے دلت اور ریزرویشن کے خلاف ہے"۔ کانگریس کے سابق صدر راہل گاندھی نے بھی بی جے پی اور آر ایس ایس پر حملہ بولتے ہوئے کہا کہ "بی جے پی اور آر ایس ایس نے کبھی نہیں چاہا کہ دلت آگے بڑھیں"۔ صحافیوں سے بات کرتے ہوئے گاندھی نے کہا کہ "میں ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مودی جی اور بھاگوت جی کتنا بھی خواب دیکھ لیں، ہم ریزرویشن کو ختم نہیں ہونے دیں گے"۔ دیگر اپوزیشن پارٹیوں نے بھی اس مسئلے پر مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ آر جے ڈی کے ترجمان منوج جھا نے مرکزی حکومت سے "ریویو پٹیشن" داخل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ اُنہوں کے کہا کہ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو سماجی انصاف کے نظریہ کو دھکا لگے گا۔ سی پی آئی اور ڈی ایم کے نے بھی سپریم کورٹ کے فیصلے کو ریزرویشن کی روح کے خلاف بتلایا ہے۔

حزب اختلاف کے علاوہ حکمراں این ڈی اے کی معاون جماعتوں نے بھی اس مسئلے پر بولنا شروع کر دیا ہے۔ اُن کو بھی یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ اگر وہ ریزرویشن پر بھی خاموش رہتی ہیں تو اُن کی سماجی زمین نیچے سے کھسک جائے گی۔ لوک جن شکتی پارٹی اور جنتا دل یو نے بھی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ فیصلے کے بعد مرکزی وزیر رام ولاس پاسوان نے اپنی رہائش گاہ پر دلت ارکان پارلیمنٹ کی ایک میٹنگ بلائی۔ جنتا دل کے قومی جنرل سکریٹری اور پارٹی ترجمان کے سی تیاگی نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ پارلیمنٹ کے رواں اجلاس میں "آرڈیننس" لائے تاکہ ترقیات میں ایس سی، ایس ٹی ریزرویشن کو جاری رکھا جا سکے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مرکزی حکومت سے گزارش کی کہ وہ موجودہ بجٹ سیشن میں ایک قرارداد پاس کرے۔

ریزرویشن کا معاملہ پارلیمنٹ میں بھی اٹھایا گیا ہے۔ دس فروری کو وقفہ صفر کے دوران کانگریس ایم پی رنجن چودھری نے اس مسئلے کو اٹھایا اور کہا کہ کورٹ کا فیصلہ ریزرویشن کی روح کے خلاف ہے اور ریزرویشن ایس سی اور ایس ٹی کے لیے آئینی ضمانت ہے۔ ٹی ایم سی کے رکن کلیان بنرجی نے کہا کہ آئین کے تیسرے حصے کے دفعہ سولہ چار بنیادی حقوق کا حصہ ہے۔ اُنہوں نے مطالبہ کیا کہ اس فیصلے کی خامیوں کو صحیح کرنے کے لیے اقدامات اٹھانے ہوں گے۔ ڈی ایم کے رکن اے راجا نے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ سپریم کورٹ میں درخواست نظر ثانی داخل کرے یا پھر

امبیڈکر کی تصویروں پر پھول چڑھانے میں بی جے پی اور آر ایس ایس کے لوگ آگے رہتے ہیں مگر جب امبیڈکر سماج کے اور دیگر محروم طبقات کے حقوق کے تحفظ کی بات ہوتی ہے تو اس سے ان کا بہت زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔

ایک خصوصی قانون لائے۔ اس کے بعد سماجی انصاف کے مرکزی وزیر گہلوت نے کہا کہ ہم اس موضوع کا مطالعہ کر رہے ہیں اور معقول فیصلہ لیں گے"۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تقریباً تمام سیاسی پارٹیاں، خواہ وہ حزب اختلاف کی ہوں یا حکمراں جماعت سے تعلق رکھتی ہوں، سب عدالت کے فیصلے کے خلاف کھڑی نظر آتی ہیں۔ مگر سچ یہ بھی ہے کہ ریزرویشن پر حملے ابھی رکے نہیں ہیں۔ عدلیہ بھی ریزرویشن کی روح کو سمجھنے سے قاصر رہی ہے اور وہ 'ایفیشینسی' (استعداد) کے نام پر ریزرویشن فراہم کرنے کی راہ میں ایک کے بعد ایک شرط لگاتی جا رہی ہے۔ سپریم کورٹ کے علاوہ میڈیا اور سیول سوسائٹی کی طرف سے بھی ریزرویشن پر سوال اٹھایا جاتا رہا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان اداروں میں محکوم طبقوں کی نمائندگی بہت کم ہے یا نہیں کے برابر ہے۔ اُن اداروں میں اعلیٰ ذات کی بالادستی بڑی حد تک قائم ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ ریزرویشن کے ساتھ استعداد کا خیال رکھنا بھی ایک پہلو ہے۔ مگر کیا یہ سماجی انصاف کے نظریے کا گلا گھوٹنے کے مترادف نہیں ہے کہ استعداد کے نام پر دلتوں، آدی واسیوں اور سماجی اور تعلیمی طور سے پسماندہ ذاتوں کو ملک کی تعمیر و ترقی سے باہر رکھنے کی وکالت کی جاتی ہے؟ افسوس کہ اس ناانصافی کی کارروائی کو جواز دینے کے لیے میرٹ و موثر کارکردگی کا بہانہ بنایا جاتا ہے۔

میڈیا کا بڑا حصہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کرنے کے لیے آگے آیا ہے۔ کوئی اس فیصلے کا جشن سامنے آ کر منا رہا ہے تو کوئی اس پر اٹھنے والے سوالات کو مسترد کر کے اپنی ریزرویشن مخالف ذہنیت کا اظہار کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر اپوروا مندھانی نے ۱۲ فروری کے روز "پرنٹ" ویب پورٹل کے لیے "سپریم کورٹ کا فیصلہ کوئی نیا نہیں ہے" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور یہ دلیل پیش کی کہ ریزرویشن بنیادی حقوق کا حصہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کا مطالبہ کرنا درست ہے کیونکہ یہ طے شدہ قانون کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ انہوں نے اپنی دلیل میں کورٹ کے سابقہ فیصلوں کا ذکر کیا اور کہا کہ ماضی میں بھی اس طرح کے فیصلے کورٹ صادر کرتی رہی ہے۔ مضمون نگار نے پانچ ججوں کی بینچ پر مشتمل ایم آر بلا جی بنام اسٹیٹ آف میسور (۱۹۶۲) پانچ ججوں والی سی اے راجندر بنام یونین آف انڈیا (۱۹۶۷) نو ججوں والی اندرا ساہنی بنام یونین آف انڈیا (۱۹۹۲) پانچ ارکان پر مبنی ایم ناگراج بنام یونین آف انڈیا (۲۰۰۶) کا حوالہ دیا اور کہا کہ ان بڑے فیصلوں میں سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ دفعات (۴) ۱۵ اور (۴) ۱۶ خود بنیادی حقوق کا حصہ نہیں ہیں۔ اس فیصلے کے بعد "ٹائمز آف انڈیا" نے اپنے اداریہ (دس فروری) میں ریزرویشن کی پالیسی کو خوب نشانہ بنایا۔ اس نے کہا کہ ریزرویشن کی پالیسی سے برابری کے مواقع کے تصوّر پر مبنی مساوات کی پامالی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اس سے حکومت کے ہاتھ بندھ جاتے ہیں کہ وہ کوئی دوسری پالیسی لے کر آئے۔

خیال رہے کہ موجودہ تنازع کی شروعات اتراکھنڈ سے شروع ہوتی تھی۔ وہاں ایس سی، ایس ٹی اور او بی سی کو ریزرویشن اُتر پردیش پبلک سروسز (ریزرویشن فار شیڈول کاسٹس، شیڈول ٹرائیب اینڈ ادر بیکورڈ کاسٹس) ایکٹ ۱۹۹۴ کے تحت دیا جاتا تھا۔ اس قانون کا سیکشن (۷) ۳ یہ کہتا ہے کہ سرکار ترقی میں ریزرویشن دے گی۔ سال ۲۰۱۱ میں اتراکھنڈ ہائی کورٹ نے اپنے ایک فیصلے میں سیکشن (۷) ۳ کو غیر آئینی قرار دیا۔ سال ۲۰۱۲ کی اتراکھنڈ کی سرکار نے ریزرویشن نہ دینے کا فیصلہ کیا، جسے ہائی کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ حکمراں بی جے پی اسی بات کو پکڑ کر کانگریس پر حملہ کر رہی ہے اور یہ الزام لگا رہی ہے کہ کانگریس کی زیر قیادت اتراکھنڈ کی سرکار نے تب ریزرویشن مخالف فیصلہ لیا تھا اور آج وہ ریزرویشن حمایتی بن گئی ہے۔

اتراکھنڈ سرکار کے ریزرویشن نہ دینے کے فیصلے کو ہائی کورٹ نے گزشتہ ماہ اپریل میں خارج کر دیا۔ اس کے بعد ایک ریویو پٹیشن اتراکھنڈ ہائی کورٹ میں داخل کیا گیا، جس میں کورٹ نے کہا کہ دفعہ ۱۶(۴) میں اختیار مہیا کرنے سے متعلق ضوابط ہیں جس میں ریاستی حکومت کو یہ حکم دیا کہ ریزرویشن دینے سے قبل وہ ایس سی اور ایس ٹی کی نمائندگی سے متعلق ڈیٹا جمع کرے۔ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا، جس پر فیصلہ گزشتہ ہفتہ آیا ہے۔

ریزرویشن کے معاملے میں سیاسی جماعتیں ایماندار نہیں رہی ہیں۔ ایک بات تو صاف ہے کہ امبیڈکر تحریک کے بعد کے دور میں اصل دھارے کی سیاسی جماعتیں تحفظات کی مخالفت میں کھڑی ہوئی دکھائی نہیں دینا چاہتیں کیونکہ اُن کو بخوبی معلوم ہے کہ اعلیٰ ذات کے ووٹوں سے وہ اقتدار پر قابض نہیں ہو سکتی ہیں۔ جمہوریت میں پسماندہ سماج کے رائے دہندگان سرکار بنانے اور بگاڑنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اعلیٰ ذات اور سرمایہ دار طبقات ریزرویشن کو پسند نہیں کرتے۔ کانگریس نے بھی ریزرویشن نافذ کرنے میں اتنی ایمانداری نہیں دکھائی ہے جتنی محکوم طبقات نے اس سے اُمید لگائی تھی۔ مگر جہاں تک بات ہندو فرقہ پرست بی جے پی اور آر ایس ایس کی ہے تو یہ یقینی طور پر اُن کا حامی ایک بڑا طبقہ ریزرویشن کا سخت مخالف ہے۔ مودی کو ووٹ کرنے والوں میں ایک بڑا طبقہ، جو اعلیٰ ذات سے آتا ہے، یہ چاہتا ہے کہ سرکار جلد از جلد ریزرویشن کو ختم کر دے۔ مگر بی جے پی کی مجبوری یہ ہے کہ اعلیٰ ذات کے ۱۰ سے ۱۵ فی صد ووٹ اگر اسے سب ایک ساتھ بھی مل جائیں تب بھی وہ سرکار نہیں بنا سکتی۔ اس لیے بی جے پی ریزرویشن کے خلاف نہیں بول سکتی کیوں کہ اسے دکھانا ہے کہ وہ پسماندہ طبقات کی سب سے بڑی خیر خواہ ہے۔

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا ایجنڈا ریزرویشن کو کمزور کر دینا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن رات نوکریوں کو پرائیویٹ ہاتھوں میں بیچ رہی ہے اور کالج اور یونیورسٹی کو تباہ کر کے پرائیویٹ یونیورسٹی کو فروغ دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ نہ رہیں گے سرکاری ادارے اور نہ ملے گا محکوم طبقات کو ریزرویشن! سرکاری محکموں میں گروپ فور کی نوکریاں، جن میں دلت، آدی واسی اور پسماندہ سماج کے لوگ بہت تعداد میں تھے، اُن کو پرائیویٹ کیا جا چکا ہے اور اُن کی لاکھوں نوکریوں کو ختم کر دیا گیا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بی جے پی ریزرویشن کی مخالفت میں بیان نہیں دے گی مگر اس کی پالیسی ریزرویشن کو کمزور کرتی رہے گی!

آر ایس ایس ریزرویشن کے خلاف ماحول بنانے میں آگے رہی ہے کیوں کہ اس کی جواب دہی کسی کے تئیں نہیں ہے۔ ہمیں آر ایس ایس کے سربراہ موہن بھاگوت کے ریزرویشن مخالف بیانات کو اسی سیاق میں دیکھنا چاہیے۔ آر ایس ایس نے منڈل کمیشن کی سفارشات کی بھی مخالفت کی تھی۔ ۲۶ اگست ۱۹۹۰ کے شمارے میں آر ایس ایس کا ترجمان میگزین "آرگنائزر" یہ بات کہتا ہے کہ "یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ ریزرویشن کی پالیسی کس قدر سماجی تانے بانے کو توڑ رہی ہے۔ یہ نا قابل لوگوں کو فروغ دیتی ہے، برین ڈرین کو بڑھا دیتی ہے اور ذات پات پر مبنی دراڑ کو مزید بڑھا دیتی ہے"۔

جیسا کہ بابا صاحب امبیڈکر نے کہا ہے کہ اعلیٰ ذات کے لوگ اگر بڑے محکموں پر بیٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنے فرقے کا مفاد سب سے اوپر رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک دلتوں کے مفاد کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرٹ کے نام پر محکوم طبقات کو نوکری پانے اور قانون ساز اسمبلی میں جانے سے نہیں روکا جا سکتا کیونکہ اگر وہ ان اداروں میں نہیں ہوں گے تو ان کے مفاد کا کون خیال رکھے گا۔ یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ امبیڈکر کی تصویروں پر پھول چڑھانے میں بی جے پی اور آر ایس ایس کے لوگ آگے رہتے ہیں مگر جب امبیڈکر سماج کے اور دیگر محروم طبقات کے حقوق کے تحفظ کی بات ہوتی ہے تو اس سے اُن کا بہت زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ محکوم طبقات کورٹ کے فیصلے سے ناراض ہیں اور ان کی یہ ناراضگی بی جے پی سرکار کے لیے بھی بھاری پڑ سکتی ہے۔

(ابھے کمار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔)

Tuesday, January 18, 2022, New Delhi, www.inquilab.com

تعلیمی حقوق اور روہت ویمولا کی شہادت

روہت کی داستان صرف روہت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بھارت کے کروڑوں محکوم طبقات کے طلبہ کی دردناک کہانی ہے

ابھے کمار

آج روہت ویمولا کا چھٹا یوم شہادت ہے۔ محض ۲۶ر سال کی عمر میں حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی کا یہ طالب علم اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ پی ایچ ڈی اسکالر روہت نے خودکشی کی تھی۔ بعض تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کی خودکشی پر سیاست نہیں ہونی چاہیے، مگر حقیقت یہ ہے کہ روہت مرا نہیں، بلکہ اسے مرنے کے لیے مجبور کیا گیا تھا۔ زندگی جب ہر موڑ پر امتیاز، تعصب اور ذلت کا سامنا کرنے لگتی ہے اور انصاف کے لیے کی گئی ساری فریادوں کو اَن سنا کر دیا جاتا ہے، تب تھکی ہاری زندگی بعض اوقات موت کی پناہ لے لیتی ہے۔ شاید کچھ ایسی ہی دردناک داستان روہت کی بھی ہے۔

روہت کی پیدائش ۳۰ر جنوری ۱۹۸۹ء کو آندھرا پردیش کے گنٹور ضلع میں ہوئی۔ یہ علاقہ خلیج بنگال سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ان کی والدہ کا نام رادھیکا ومولا ہے، جو کہ محکوم طبقہ سے آتی ہیں۔ روہت کی زندگی جدوجہد اور دشواریوں سے بھری پڑی ہے۔ لمبے سفر کے بعد اس نے اپنا داخلہ حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی میں لیا۔ پڑھائی کرنے کے ساتھ ساتھ وہ سماجی اور سیاسی مسائل پر کھل کر بولتا تھا۔ اس کا رشتہ امبیڈکر کے نظریہ کی حامل طلبہ تنظیم سے تھا۔ یہ سب باتیں انتظامیہ اور بھگوا ارباب اقتدار کو پسند نہیں تھی اور وہ روہت کو خاموش کرنے کے لیے اسے طرح طرح سے پریشان کرنے لگے۔ روہت کی اسکالرشپ کو بھی روک دیا گیا اور ان کو ہر طرح سے اذیت دی گئی۔ حالانکہ ظلم اور زیادتی کے خلاف روہت نے بڑی لڑائی لڑی، مگر اس کا ساتھ دینے کے لیے تمام اداروں نے اپنے دروازے بند کر لیے۔

دراصل روہت کی داستان صرف روہت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بھارت کے کروڑوں محکوم طبقات کے طلبہ کی دردناک کہانی ہے۔ جو کوئی بھی طالب علم کالج اور یونیورسٹی میں داخلہ لینے، امتحان پاس کرنے، ہاسٹل اور ٹیوشن فیس ادا کرنے کے لیے لڑتا ہے، وہ سب روہت کی کہانی میں کردار ہیں۔ جو کوئی بھی پڑھائی کو صرف کلاس روم تک ہی محدود نہیں رکھتا، بلکہ اسے اپنی زندگی میں عملی طور پر اتارنا بھی چاہتا ہے وہ سب روہت ویمولا کی کہانی میں شامل ہے۔ بھارت میں جمہوری نظام کو ہمارے ارباب اقتدار نے اپنا تو لیا ہے، مگر اسے انہوں نے اپنے دلوں میں اتارا نہیں ہے۔ بھارت کے تعلیمی اداروں میں آج بھی مٹھی بھر اعلیٰ ذات کے لوگوں کا ہی قبضہ ہے، جبکہ محکوم طبقات سے آنے والے طلبہ کو ہر روز روہت کی طرح ستایا جاتا ہے۔ ساری ناانصافی اور آئین مخالف کاموں کو میرٹ کے نام پر چھپا لیا جاتا ہے۔ بھارت میں انقلاب صرف پارلیمنٹ پر قبضہ جما لینے سے نہیں پورا ہونے والا ہے۔ دراصل سیاست کے ساتھ ساتھ سماجی اور تعلیمی حلقوں میں بھی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس کہ یہ بات محکوم طبقات کے زیادہ تر سیاسی لیڈروں کو سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ کوئی بھی مثبت تبدیلی بغیر سماج بدلے نہیں آسکتی۔ سماج کو بدلنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اچھی سوچ کو پیدا کریں۔ اچھی سوچ کے لیے اچھے تعلیمی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر بھارت کے زیادہ تر تعلیمی اداروں میں اعلیٰ ذاتوں کا قبضہ بنا ہوا ہے، جو یہ نہیں چاہیے کہ جن کو انہوں نے صدیوں سے محکوم بنا کر رکھا ہے، وہ علم کی شمع جلا کر بیدار ہو جائیں۔

اس ظلمت کے دور میں روہت کی لڑائی اور قربانی ہمیں راستہ دکھا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں غیر برابری، ناانصافی اور تعصب کا گورکھ دھندہ چلتا رہے گا، تب تک روہت کو یاد کیا جائے گا۔ جب تک ذات پر مبنی بھید بھاو کا شیطانی راج قائم رہے گا، تب تک مظاہرین کی زبانوں پر روہت ویمولا زندہ باد کے نعرے میں گونجتے رہیں گے۔

مگر جب روہت جیسے بہادر طالب علم تمام مشکلوں کو پار کر کے یونورسٹی میں پہنچے ہیں تو ان کو پریشان کرنے کے لیے ارباب اقتدار کی لابی ہر کوشش کرتی ہے۔ ان کو طرح طرح سے سسٹم چھوڑ کر بھاگ جانے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے جو خط روہت نے چھوڑا اس میں انہوں نے ذات پر مبنی بھید بھاو کا ذکر کیا ہے اور کہا کہ کس طرح سے انسان کو اس کے ذات، نسل، مذہب اور دیگر تشخص تک لا کر محدود کر دیا جاتا ہے۔ کبھی انسان کی صلاحیت اور اس کی قابلیت کو کھلے من سے تسلیم نہیں کیا جاتا۔ ذات برادری کے اس نظام میں ترقی اس بات سے نہیں ملتی کہ فلاں نے کیا کام انجام دیا ہے، بلکہ پزیرائی اس بات سے ہوتی ہے کہ کہنے والے کی ذات اور دھرم کیا ہے۔

ناانصافی دیکھیے کہ آج کی تاریخ میں بھی تعلیمی اداروں اور سرکاری نوکریوں میں دلت، آدی واسی اور پچھڑوں کو ان کا حق نہیں مل پایا ہے۔ مثال کے طور پر مرکزی یونیورسٹی میں پسماندہ سماج کے پروفیسر ندارد ہیں۔ اعلیٰ ذات کی لابی ایک کے بعد ایک سازش کر کے محکوموں کو اُن کے آئینی حقوق سے محروم رکھنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ اعلیٰ ذات نے نجکاری کی پالیسی اپنا کر سرکاری اداروں کو اپنے ایجنٹوں کو بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔ نجکاری کی وجہ سے ریزرویشن پر بڑی مار پڑتی ہے، کیونکہ پرائیویٹ اداروں میں ریزرویشن نافذ نہیں ہوتا ہے۔ جو سرکاری ادارے بچے ہیں، وہاں بھی زیادہ تر نوکریاں ٹھیکے پر دی جا رہی ہیں، جہاں ریزرویشن نہیں ہے۔ تعلیمی اداروں میں فیس بڑھا کر محکوم طبقات کو باہر کا راستہ دکھایا جاتا ہے، کیونکہ زیادہ تر غریب لوگ دلت، آدی واسی، پسماندہ اور مسلمان ہیں۔ پھر انٹرویو کے دوران محکوم طبقات کے امیدواروں کو دانستہ طور پر بہت ہی کم نمبر دیے جاتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، جنرل کیٹگری کی تمام سیٹوں کو، جس پر سب کا حق ہے، صرف اعلیٰ ذاتوں کی جاگیر بنا دی گئی ہے۔ کئی بار دلت، آدی واسی امیدوار جنرل کیٹگری میں انٹرویو دینے جاتا ہے تو اس کو انٹرویو دینے سے پہلے کئی اعتراضات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبہ میں مسلمانوں کی حالت تو سب سے زیادہ خراب ہے۔ اگر مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی کو او بی سی ریزرویشن میں شامل نہیں کیا جاتا اور اے ایم یو اور جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے تعلیمی ادارے نہیں ہوتے تو آج کالج اور یونیورسٹی میں مسلمان چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتے۔ بھید بھاؤ صرف ریاستی یونیورسٹی میں نہیں ہو رہا ہے، بلکہ ملک کے معزز اور موقر کالج، یونیورسٹی اور تحقیقی اداروں میں بھی دیکھنے کو مل رہا ہے۔ حال کے دنوں میں دہلی میں واقع جے این یو میں محکوم طبقات کے طلبہ کو پی ایچ ڈی انٹرویو کے دوران بہت ہی کم نمبر دے کر داخلہ پانے سے روک دیا گیا، جبکہ پریاگ راج میں واقع جی بی پنت انسٹی ٹیوٹ میں جنرل کیٹگری کے امیدوار کو منتخب کر لیا گیا، جبکہ او بی سی امیدوار کو ساری ڈگری اور لیاقت کے باوجود بھی نااہل قرار دے دیا گیا۔

اس ظلمت کے دور میں روہت کی لڑائی اور قربانی ہمیں راستہ دکھا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہندوستان کے تعلیمی اداروں میں غیر برابری، ناانصافی اور تعصب کا گورکھ دھندہ چلتا رہے گا، تب تک روہت کو یاد کیا جائے گا۔ جب تک ذات پر مبنی بھید بھاو کا شیطانی راج قائم رہے گا، تب تک مظاہرین کی زبانوں پر روہت ویمولا زندہ باد کے نعرے میں گونجتے رہیں گے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

مسلمان آرایس ایس پر کیوں اعتبار کرے؟

دوستی کی شروعات تبھی ممکن ہے جب دوستی کی پہل صدق دل سے ہواور ایک دوست دوسرے دوست کو برابر سمجھے

ابھے کمار

آج کل یہ سوال بہت سارے مسلم ملی اور سیاسی لیڈروں کو پریشان کررہا ہے کہ کیا مسلمانوں کو آرایس ایس کی حمایت کرنی چاہیے۔ جولوگ آرایس ایس کے قریب جا چکے ہیں، ان کی دلیل کچھ یوں ہے: آرایس ایس سے دوری اختیار کرنا یا پھر اس کے خلاف سیاسی تحریک چلانا مسلمانوں کی بڑی نادانی ہے۔ آرایس ایس بھارت کی اکثریتی طبقہ کی نمائندگی کرتی ہے، لہٰذا اقلیتوں کو چاہیے کہ وہ اکثریتی سماج کے پیشوا سے قربت اختیار کریں، آرایس ایس کے ہاتھوں میں اس ملک کا اقتدار ہے اور صاحب اقتدار کے پاس جا کر ہی اور ان سے اپنے مسائل کو بتلا کر ہی اقلیت یا کوئی کمزور طبقہ اپنا بھلا کر سکتا ہے۔ آرایس ایس کو آزمانے میں کوئی نقصان نہیں ہے، کیونکہ سابقہ سیکولر حکومتوں نے مسلمانوں کا بھلا نہیں کیا ہے، فسادات تب بھی ہوئے جب سیکولر سیاسی جماعت برسر اقتدار تھی اور مسلمانوں کی حق تلفی کی گئی۔ جب ہندو مسلم اتحاد کے سفیر ملک کے حاکم تھے، مسلم نوجوانوں کو دہشت گردی کے جھوٹے الزامات میں جیل بھیجنے اور ان کا انکاؤنٹر کرنے کے مذموم اعمال سیکولر لیڈرشپ نے بھی خوب کیے ہیں، اقتدار میں بھی کبھی بھی مسلمانوں کو برابر کا شریک نہیں سمجھا گیا، جبکہ مسلمان سیکولر پارٹیوں کو جھولی بھر بھر کے ووٹ دیتے رہے اور ان کی حمایت میں گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے رہے، وہیں صورت حال اب بدلنے لگی ہے جب سے ملک میں نریندر مودی کی سرکار آئی ہے۔ ان کے دور میں مسلمان محفوظ ہیں، کوئی فساد رونما نہیں ہوا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کے آئینی حقوق کو واپس لیا گیا ہے۔ سرکار کی پالیسی کا فائدہ سب کو مل رہا ہے اور مسلمان بھی اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ آرایس ایس اور مودی جی مسلمانوں کے عقیدہ کا احترام کرتے ہیں اور مجموعی طور پر وہ ان کی ترقی کے خیر خواہ ہیں۔ ان تمام دعوؤں کا تجزیہ کرنا ایک چھوٹے سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ مگر کسی بھی دوستی کی شروعات تب ہی ہوسکتی ہے جب دوستی کی پہل سچے من سے ہو اور ایک دوست دوسرے دوست کو برابر سمجھے۔ حالانکہ آرایس ایس کے قول اور فعل میں بڑا تضاد پایا جاتا ہے۔ ان سب کے باوجود مسلمانوں کا ایک طبقہ آرایس ایس سے ہاتھ ملا چکا ہے اور دیگر مسلمان بھی آرایس ایس کی شمولیت اختیار کرنے کے لیے من بنا رہے ہیں۔ مگر بڑی سچائی یہ ہے کہ آج بھی آرایس ایس اور بی جے پی کو مسلمانوں کی غالب اکثریتی آبادی حمایت نہیں کرتی ہے۔ انتخابات کے دوران ان کا ووٹ سیکولر پارٹیوں کو ہی جاتا ہے۔

مسلمانوں کو قریب لانے کی آرایس ایس کی باتیں بے مقصد نہیں ہیں۔ آئندہ سال کے عام انتخابات کو دیکھتے ہوئے آرایس ایس کی پوری کوشش ہے کہ وہ مسلمانوں کی ایک آبادی کو اپنی طرف لائے اور ایک بڑی آبادی کو سیکولر پارٹیوں سے بدظن کردے۔ چونکہ آرایس ایس کے اشارے پر ملک کی حکومت چل رہی ہے، اس لیے ان کے تئیں اچھے خاصے لوگوں کے دلوں میں رغبت پیدا ہونا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے، کیونکہ اقتدار میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ کرسی اور مفاد کی خاطر پہلے بھی متوسط طبقہ راتوں رات اپنی وفاداری بدل چکا ہے۔ مسلمانوں کا ایک کاروباری اور پڑھا لکھا طبقہ حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے اور آرایس کی قصیدہ خوانی انہی لوگوں کی طرف سے پریس میں آرہی ہے۔ یہی لوگ ایسی باتیں اٹھا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو آرایس ایس اور بی جے پی سے دوری نہیں بنانی چاہیے اور جو مواقع مودی حکومت نے فراہم کیے ہیں ان کا جم کر فائدہ لینا چاہیے۔ مگر یہ لوگ آرایس ایس کی تاریخ، سیاست اور مودی حکومت کی اقتصادی پالیسی کا تنقیدی طور پر مطالعہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ عام مسلمان بھی جانتے ہیں کہ دوستی ہر

> ”
>
> مسلمان اور آرایس ایس دوست تبھی بن سکتے ہیں اور ان کے درمیان دوستی لمبی اسی وقت چل سکتی ہے، جب دونوں ایک دوسرے کے مسائل کو سنجیدگی سے سمجھیں اور اس پر کام بھی کیا جائے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ آرایس ایس مسلمانوں سے دوستی کی خواہش تو ظاہر کرتی ہے، مگر اس کا رویہ مسلمانوں کے متعلق تحکمانہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آرایس ایس کبھی اس بات پر غور کرنے کو تیار نہیں ہے کہ آخر اس کی کون سی پالیسیاں ہیں۔

اعتبار سے بہتر چیز ہوتی ہے، مگر مسلمان اور آرایس ایس دوست تب ہی بن سکتے ہیں اور ان کے درمیان دوستی لمبی تب ہی چل سکتی ہے، جب دونوں ایک دوسرے کے مسائل کو سنجیدگی سے سمجھیں اور اس پر کام بھی کیا جائے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ آرایس ایس مسلمانوں سے دوستی کی خواہش تو ظاہر کرتی ہے، مگر اس کا رویہ مسلمانوں کے تئیں تحکمانہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ آرایس ایس کبھی اس بات پر غور کرنے کو تیار نہیں ہے کہ آخر اس کی کون سی پالیسیاں ہیں، جن سے مسلمان افسردہ ہیں۔ ہندوستان کو ایک مذہب سے جوڑنا یا پھر اس کو ہندو راشٹر بنانے کے لیے کام کرنا اقلیتوں کے دلوں میں بیگانگی پیدا کرتا ہے۔ اگر آرایس ایس اپنی سابقہ فرقہ پرست تاریخ کو دفن کرنے اور ایک نئی شروعات کرنے کی خواہشمند ہوتی تو وہ بار بار مسلمانوں کی خامیاں نہیں گناتی بلکہ خود احتسابی کرتی۔ حال کے دنوں میں موہن بھاگوت نے پھر ہندو راشٹر کی بات دہرائی ہے۔ یہی نہیں انہوں نے مغلوں کو نشانہ بنایا اور مسلمانوں کا نام لیے بغیر انہیں حملہ آور کہا۔ ’ہندو سماج ہزار سال سے جنگ کی حالت میں ہے‘ کی بات کہہ کر انہوں نے ایسا پیغام دیا ہے کہ وہ اپنی جارحانہ مسلم مخالف پالیسی کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یاد رہے کہ گزشتہ سال ۲۲ اگست کے روز مسلم دانشور کے ایک وفد نے آرایس ایس سرسنگھ چالک سے ملاقات بھی کی تھی۔ اس وفد کے ایک اہم رکن نے ۲۶ ستمبر کو ’انڈین ایکسپریس‘ میں ایک مضمون لکھ کر یہ بتلایا تھا کہ موہن بھاگوت نے مذکوہ ملاقات کے دوران ان سے کہا کہ ہندو دو معاملوں کو لے کر کافی سنجیدہ ہیں۔ پہلا یہ کہ مسلمان گائے کا احترام کرے اور وہ لفظ کافر کا استعمال ہندوؤں کے لیے نہ کرے۔

اس مضمون کو پڑھ کر کوئی نادان انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ موہن بھاگوت نے مسلم دانشوروں کو مسائل کا حل کرنے کی نیت سے نہیں بلکہ مسلمانوں کو ان کے ذریعہ سخت پیغام دینے کے لیے بلایا تھا۔ ان کا پیغام شاید یہ تھا کہ اس ملک میں مسلمان ہندوؤں کے ماتحت رہ کر ہی زندگی گزار سکتے ہیں، جبکہ ملک کا آئین ہندو اور مسلمان کو برابر کا شہری مانتا ہے۔ موہن بھاگوت کو کیا یہ بات معلوم نہیں کہ ایک کثیر المذاہب معاشرہ میں، ہم آہنگی اور اتحاد تب ہی پیدا ہوسکتا ہے جب ہم مذہب کے فروعی اختلاف کو فراموش کر ان کے بنیادی پیغامات پر عمل کریں۔ کیا بھاگوت کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ نظریہ توحید مسلمانوں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی عبادت کریں۔ مگر اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ دین کے معاملہ میں زور زبردستی کی کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ مسلمانوں کو یہ اجازت دیتا ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے مذہبی عقیدہ کا احترام کریں۔ رہی بات گائے کے گوشت کی تو یہ بھی آرایس ایس کا بڑا پروپیگنڈا ہے کہ مسلمان ہی صرف بیف کھاتا ہے۔ معتبر اعداد وشمار کے مطابق، بھارت میں ۸۰ ملین افراد بیف کھاتے ہیں، جن میں ۱۲ ملین سے زیادہ ہندو ہیں۔ بھارت کی ایک بہت بڑی غیر مسلم آبادی، جو دلت اور آدی واسی ہے، بیف کھاتی ہے۔ بھارت کا آئین شہریوں کو شخصی آزادی دیتا ہے۔ جمہوری ریاست کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے کھان پان کو طے کرے۔ پھر ان باتوں کو آرایس ایس کس حیثیت سے طے کرسکتا ہے۔ جہاں تک بات کافر کی ہے تو اس لفظ کا استعمال ایک خاص تاریخی پس منظر میں ہوا تھا۔ ملک کے ہندو فرقہ کا اس سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں ہے۔ موہن بھاگوت کیا یہ نہیں جانتے ہیں کہ ہزاروں سال سے اس ملک میں ہندو اور مسلمان ایک ساتھ رہ رہے ہیں اور کبھی بھی کافر کے مسئلہ پر کوئی بڑا تنازعہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ مسلم دانشوروں کی مذکورہ ملاقات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آرایس ایس مسلمانوں سے دوستی اپنی شرطوں پر اور اپنے سیاسی مفاد کے لیے کرنا چاہتی ہے۔ آرایس ایس خود اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنے کو تیار نہیں ہے کہ کیسے ان کی تاریخ عوام اور آئین مخالف رہی ہے۔ اس بات کے تاریخی دستاویز ہیں کہ اقلیتوں کو نشانہ بنا کر ہی اس نے سیاسی ہندو اتحاد پیدا کیا ہے اور سیاست پر قبضہ جمایا ہے۔ جب ان باتوں کو نظروں کے سامنے رکھ کر سوچا جائے تو دل و دماغ یہی کہتا ہے کہ آرایس ایس پر اعتبار کیسے کیا جائے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)
debatingissues@gmail.com

سوچھ بھارت اَبھیان اور دلت سماج

۲؍اکتوبر کو سیاسی لیڈران اور مشہور شخصیات ہاتھوں میں جھاڑو لے کر تصویریں کھینچواتے ہیں لیکن اصل صفائی عملہ کبھی کیمرے کے سامنے نہیں آتا

ابھے کمار

۲؍اکتوبر کے روز آپ نے اخباروں میں سوچھ بھارت ابھیان کی کامیابی سے متعلق بہت سارے اِشتہار دیکھے ہوں گے۔ ٹی وی کیمرے کے سامنے ملک کے بڑے بڑے لیڈر جھاڑو پکڑے، صفائی کرتے نظر آ جائیں گے۔ پریس کی موجودگی میں بڑے بڑے فلم سٹار اور دیگر مشہور شخصیات صفائی کرتے ہوئے پوز دیتے رہتے ہیں۔ کچھ لمحات کے لیے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی عام انسان ہیں۔ بڑے عہدے پر پہنچ جانے کے بعد بھی، وہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ صاف صفائی کا کام خود کرتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے جو آپ کو دکھائی جاتی ہے۔

صفائی کرنے والا جو اصل انسان ہے وہ کبھی کیمرے کے سامنے نہیں آتا۔ سماج اور سرکار کبھی اُسے برابر نہیں سمجھتی۔ یہاں تک کی وہ اپنی تنخواہ وقت پر نہیں پاتا۔ صفائی کرنے کے لیے اسے ضروری ساز وسامان بھی اکثر نہیں دیا جاتا۔ ان صفائی عملہ میں سے، بہت سارے مزدور اپنی نوکری پوری بھی نہیں کر پاتے ہیں اور کچھ ہی سالوں میں زہریلی گیس اور دیگر بیماریوں سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ ان سب کے لیے ان کو شاید ہی کوئی معاوضہ ملتا ہے۔ کورونا وبا کے دوران جب ایک انسان دوسرے انسان کے پاس آنے سے بھی ڈر رہا تھا، تب یہی لوگ اسپتالوں میں صاف صفائی کا کام انجام دے رہے تھے۔ آج بھی جب آپ صبح سویرے آفس کے لیے گھر سے نکلتے ہیں، یا پھر دودھ یا سبزی لینے کے لیے گھر سے باہر آتے ہیں، تو یہی لوگ سڑک صاف کرتے، کوڑا اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ کیا آپ نے اشتہار یا کیمرے کے سامنے پوز دیتے کسی لیڈروں کو اصلی زندگی میں صاف صفائی کرتے ہوئے پایا ہے؟ نہیں، وہ تو صفائی کرنے کا ڈرامہ کرتے ہیں۔

یہ بات بھی درست ہے کہ صفائی عملہ کی ایک ذات ہوتی ہے۔ وہ اکثر دلت سماج سے آتے ہیں۔ دلت ایک مَراٹھی لفظ ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے ٹوٹا ہوا، ستایا ہوا۔ سرکاری زبان میں انہوں شیڈولڈ کاسٹ یعنی ایس سی کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں انہیں اَن ٹچ ایبل یعنی اَچھوت کہا جاتا تھا۔ لمبے وقت سے سماج نے ان اچھوتوں پر بہت ساری پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ مثلاً، وہ زمین نہیں خرید سکتے تھے۔ وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اسی طرح ان کو اسلحہ رکھنے اور مندر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ملک کے بعض علاقوں میں اچھوت لوگوں کو عالی ذات کی بستیوں سے گزرتے وقت اپنے چپل اور جوتے ہاتھ میں اٹھانے پڑتے تھے۔ اچھوت سماج کے خلاف ایسا ظلم وزیادتی کیا گیا تھا، جس کی مثال دنیا کے دیگر حصوں میں شاید ہی ملتی تھی۔ ان کو جانوار سے بھی بدتر سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ بھی بات صحیح ہے کہ دلت سماج نے ہر دور میں اپنے استحصال کے خلاف بغاوت کی ہے۔ ہر دور میں اس سماج نے بڑے بڑے مجاہد پیدا کیے ہیں۔ انہوں نے ذات پات پر مبنی سماج کے خلاف جدوجہد کی اور مساوات پر مبنی معاشرہ کی تعمیر کرنی چاہی۔ بدھ کے دور سے لے کر کبیر، پھولے اور امبیڈکر کے زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ مگر ذات برادری کو وہ پوری طرح سے تاریخ کو کوڑے دان میں ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ اس سمت میں بابا صاحب امبیڈکر نے بڑا کام کیا۔ اپنے وسیع مطالعہ اور تجربہ کی بنیاد پر امبیڈکر نے یہ بات کہی کہ ہندوستان میں مزدوروں کی ایک ذات بھی ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان میں کام کا بٹوارا نہیں دیکھا جاتا، بلکہ کام کرنے والے مزدوروں کا بٹوارہ ذات برادری کی بنیاد پر ہوتا ہے۔

> ”دلت سماج کے درمیان میں مہاتما گاندھی نے کام کیا۔ وہیں، بہت سارے امبیڈکر نواز اسکالر کا ماننا ہے کہ گاندھی دلت تحریک کی طاقت کو سمجھ چکے تھے اور ان کو محسوس ہو چکا تھا کہ اگر اعلیٰ ذات کے لوگ دلت سماج کے لیے کچھ کرتے نہیں دکھائی پڑے تو دلت سماج کانگریس کے ہاتھوں سے دور چلا جائے گا اور انہیں بڑا سیاسی نقصان جھیلنا پڑ سکتا ہے۔

یاد رہے کہ وزیراعظم نریندر مودی نے سوچھ بھارت اَبھیان کی شروعات ۲؍اکتوبر ۲۰۱۴ء میں کی تھی۔ یہ گاندھی جی کا یوم پیدائش بھی تھا۔ ذات پات کے سوال پر گاندھی جی اور امبیڈکر کے درمیان بہت سارے اختلاف تھے۔ امبیڈکر نے گاندھی کے بارے میں ذات برادری کے دفاع کرنے کا بھی الزام لگایا۔ مگر مہاتما گاندھی کا ماننا تھا کہ اَچھوت کے نظام کی ہندو مذہب میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اسے دور کرنے کے لیے اعلیٰ ذاتوں کو آگے آنا چاہیے۔ دلت سماج کے درمیان میں مہاتما گاندھی نے کام کیا۔ وہیں، بہت سارے امبیڈکر نواز اسکالز کا ماننا ہے کہ گاندھی دلت تحریک کی طاقت کو سمجھ چکے تھے اور ان کو محسوس ہو چکا تھا کہ اگر اعلیٰ ذات کے لوگ دلت سماج کے لیے کچھ کرتے نہیں دکھائی پڑے تو دلت سماج کانگریس کے ہاتھوں سے دور چلا جائے گا اور انہیں بڑا سیاسی نقصان جھیلنا پڑ سکتا ہے۔ کانگریس ہمیشہ سے یہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ وہ سارے ہندوستانیوں کی پارٹی ہے اور اس کو ہندو مسلمان، اعلیٰ ذات کے علاوہ دلت سماج کی بھی حمایت حاصل ہے۔ امبیڈکر کانگریس کو غیر دلت اور ہندو، خاص کر اعلیٰ ذاتوں کی پارٹی مانتے تھے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۳۰ کی دہائی میں گاندھی نے دلت سماج کے لیے اپنے طور سے کام کیا۔ گاندھی دلت سماج کے بالمیکی ذات، جو صاف صفائی کا کام انجام دیتے ہیں، کے علاقوں میں اپنا وقت گزارا اور وہاں پر تعمیری کام کیا۔ گاندھی جی نے اَچھوت پن کے خلاف آواز اٹھائی، جو کہ اس زمانہ میں کوئی چھوٹی بات نہیں تھی۔ گاندھی یہ بھی مانتے تھے کہ انسان کو اپنا کام خود کرنا چاہیے اور صاف صفائی کا کام بھی دوسروں سے کرانے کے بجائے خود ہی کرنا چاہیے۔ گاندھی کے اسی نظریہ کو دھیان میں رکھتے ہوئے، سوچھ بھارت کی شروعات ان کے یوم پیدائش پر کی گئی۔ تضاد دیکھیے کہ ہندوتو طاقتوں نے گاندھی جی کی طویل عرصہ تک مخالف کی اور ان پر مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہندو سماج کے مفاد کے ساتھ سمجھوتا کرنے کا الزام لگایا۔ اسی نظریہ کی نرسری سے نکلے والے گوڈسے نے ان کا قتل کیا۔ مگر اب ہندوتو سرکار ان کو اپنے بینر پر استعمال کر رہی ہے۔

سوچھ بھارت ابھیان کی کامیابی کیلئے جہاں حکومتیں لاکھوں کروڑوں روپیہ کا اشتہار اخبار میں دے رہی ہیں اور عوام کا کروڑوں روپیہ ٹی وی چینل، ہورڈنگ، پوسٹر پر خرچ کر رہی ہے، وہیں صفائی کرنے والے اصل عملہ، جو دلت سماج سے آتے ہیں، کو وقت پر تنخواہ نہیں ملتی۔ ان کو ضروری ساز وسامان جیسے دستانہ، جوتے اور دیگر سامان اکثر نہیں دیے جاتے۔ نجی کاری کا سب سے پہلا اور سب سے زیاد چوٹ کھانے والے دلت سماج کے لوگ ہی ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے بعد سے جب نجی کاری شروع کی گئی تو اس کے سب سے پہلے شکار صفائی ملازمین اور دیگر محروم طبقات ہی بنے۔

ایک پریس کانفرنس میں سپریم کورٹ کے وکیل اور مشنسیو کانسٹی ٹیوشن کے قومی کنوینر محمود پرچہ اور دہلی صفائی ملازمین کمیشن کے سابق صدر ہرنام سنگھ نے صفائی عملہ کے مسائل کو پھر سے اٹھایا۔ ہرنام سنگھ نے بہت سارے آر ٹی آئی اور اعداد وشمار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ صفائی عملہ کو ان کا حق نہیں مل رہا ہے، یہاں تک کہ جنہوں نے اپنی جان گنواں کر کورونا وبا کے دوران صفائی کا کام انجام دیا اور لوگوں کی جان بچائی، ان کو کوئی معاوضہ نہیں ملا۔ دوسری جانب، محمود پراچہ نے کہا کہ حکومت میں بیٹھے ہوئے لیڈران اور آفیسر کے خلاف صفائی عملہ کے حقوق کے ساتھ کھلواڑ کرنے کے جرم میں ایس سی، ایس ٹی کا مقدمہ بنتا ہے۔ انہوں نے اس بات پر بھی دکھ کا اظہار کہا کہ اسپیشل کورٹ کے جج صاحبان ایس سی، ایس سی ایکٹ کو صحیح سپرٹ میں سمجھنے اور فیصلہ دیتے وقت اس پر عمل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

بات تو صحیح ہے کہ جو معاشرہ اپنے ہی لوگوں کے ساتھ اس طرح کا غیر انسانی سلوک کرتا ہے، اسے سوچھ کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

ساورکر پر پھر اٹھے سوالات

فرقہ پرست طاقتیں ایک طرف بھارت کی اقلیتوں کی حب الوطنی پر سوال کھڑا کرتی ہیں تو دوسری طرف برطانیہ کی ایک اقلیت ہندو کی کامیابی پر جشن منارہی ہیں!

ابھے کمار

جیسے ہی یہ خبر آئی کہ رشی سونک برطانیہ کے نئے وزیراعظم کے منصب پر فائز ہو رہے ہیں، ویسے ہی بھگوا طاقتوں نے ان کے تعلقات کو ہند نژاد سے منسوب کرنا شروع کردیا۔ ۲۶؍ اکتوبر کو آر ایس ایس کے ترجمان ہندی ہفت روزہ 'پانچ جنیہ' میں شائع ایک مضمون میں سونک کی کامیابی کو کچھ یوں بیان کیا گیا: 'وزیراعظم کے طور پر ان کے پہلے خطاب میں ان کے ہاتھوں میں مقدس لال ہندو کلاوا دیکھ کر ہر ہندوستانی کا سرفخر سے بلند ہوگیا'۔ آگے کی سطر میں سونک کی ۲۰۱۷ء کی ایک تقریر کے چھوٹے سے اقتباس کو پیش کیا گیا ہے: اب میں برطانیہ کا شہری ہوں۔ مگر میرا مذہب ہندو ہے۔ میری مذہبی اور ثقافتی وراثت ہندوستانی ہے۔ میں فخر سے کہتا ہوں کہ میں ہندو ہوں اور میری پہچان بھی ہندو ہے'۔ غور کیجیے کہ ان چار جملوں میں تین بار 'ہندو' لفظ کا استعمال کیا گیا ہے، جبکہ صرف ایک بار 'ہندوستانی' لفظ آیا ہے۔ یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ سونک نے واقعی ایسا کوئی بیان دیا تھا، مگر 'پانچ جنیہ' نے ان جملوں کو بڑی ترجیحات کے ساتھ جگہ دی اور اپنی اصلی سوچ ظاہر کردی کہ ان کے نزدیک ہندو مذہبی تشخص بھارت کی قومی پہچان سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ حالانکہ جب بات اقلیتوں کی آتی ہے تو بھگوا جماعتیں اپنا رویہ بدل دیتی ہیں اور ان سے یہ سوال پوچھتی ہیں: 'آپ پہلے بھارتیہ ہیں یا مسلمان؟'

برطانوی سماج، جہاں کی غالب اکثریت عیسائیوں کی ہے۔ وہاں پر ایک ہندو کا وزیراعظم بننا ہندوتو کے نظریہ ساز ساورکر کی معنویت پر پھر سوالات کھڑے کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یوروپ میں جدید ریاست کے قیام اور نظریہ حریت پسندی کے عروج کے بعد تصور شہریت میں ایک زبردست تبدیلی آئی۔ قومی ریاست کے تمام شہریوں کو بنیادی حقوق فراہم کیے گئے، جس کا ضامن ملک کا آئین بنا۔ حریت پسندی میں شخصی آزادی کو مقدس مانا گیا اور ریاست کو اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ انسان کی نجی زندگی میں دخل دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ریاست ملک کے تحفظات کا بہانہ بنا کر اکثر شخصی آزادی پر حملہ کرتی ہے۔ جدید سیاست نے مذہب اور سیاست کو جدا کیا۔ پھر جدید ریاست کا تشخص سیکولر بن گیا۔ یہاں سیکولر کا مطلب مذہب سے عداوت نہیں تھی بلکہ حکومت پر یہ پابندی عائد کی گئی کہ وہ مذہب کی بنیاد پر کوئی پالیسی نہ بنائے اور اپنے تمام شہریوں کو یکساں حقوق فراہم کرے۔ پھر جدید سیاست میں شہریت کو خطہ سے منسوب کیا گیا۔ مطلب یہ کہ ملک میں مقیم تمام شہریوں کے حقوق یکساں دیے گئے کیونکہ وہ ایک ملک کے باشندہ ہیں۔ ذات، دھرم، نسل، جنس جیسے پیدائشی تشخص کو ریاست نے قانون کی کتاب میں نظرانداز کیا۔

برطانیہ کے نومنتخب وزیراعظم سونک کا مذہبی عقیدہ ہندومت کہا جارہا ہے، جبکہ برطانیہ کی اکثریت عیسائیوں کی ہے۔ چونکہ برطانوی ریاست نے شہریت سے وابستہ حقوق کو خطہ سے منسوب کیا ہے، اس لیے ایک ہندو کو اعلیٰ منصب پر فائز ہونے میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں آئی۔ مگر ہندوتوا کے نظریہ ساز وی ڈی ساورکر کا نظریہ شہریت خطہ اور حریت پسندی پر مبنی شہریت سے مختلف ہے۔ حالانکہ ساورکر کے نظریہ کو ثقافت سے جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے، مگر اصل میں ان کی سوچ نسلی اور مذہبی امتیازات سے متاثر تھی۔ تضاد دیکھیے کہ بھگوا طاقتیں دن رات بھارتی کی بات کرتی ہیں اور اپنے حریفوں پر یہ الزامات عائد کرتی ہیں کہ وہ بھارت کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کو اپنانے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ مگر خود ساورکر یوروپ بالخصوص جرمنی کی نسل اور مذہب پر مبنی قومیت کے بڑے قائل تھے۔ وہ برطانوی مفکر ہربرٹ اسپینسر کے پیروکار تھے۔

”
کیا فرقہ پرست جماعتوں کے پاس اس بات کا جواب ہے کہ اگر بھارت کی کوئی اقلیت مسلمان اور عیسائی شک کے دائرے میں اس لیے ہے کہ ان کے مقدس مقامات عرب اور فلسطین میں ہیں تو پھر کیسے ایک برطانوی ہندو شہری، جس کے مذہبی مقامات کاشی اور متھرا میں واقع ہیں، برطانیہ کا سچا دیش بھکت ہوسکتا ہے؟ مگر رشی سونک کو جس طرح برطانیہ کی اکثریت عیسائی آبادی نے گلے لگایا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ساورکر کا نظریہ شہریت اخوت کی راہ میں بڑا پتھر ہے۔

اسپینسر کی فکر کہیں سے بھی غریب پرور نہیں تھی، بلکہ وہ فرد اور سائنس کو مذہب پر فوقیت دیتے تھے۔ دوہری سیاست کی اور کیا مثال ہوگی کہ اسپینسر کے پیروکار کے وارثین بھارت میں دن رات مذہب کی اہمیت اور ہندوستانی ثقافت کی عظمت کا ورد کرتے رہتے ہیں۔ بی جے پی اپنے حریفوں پر بھارت مخالف ہونے کا الزام لگاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بانی کی فکر کا سرچشمہ خود یوروپ کے نسل پرستی کو فروغ دینے والے مفکرین سے ملتا ہے۔ ملک کی یہ بدقسمتی ہے کہ ساورکر نے نسل اور مذہب پر مبنی شہریت کے نظریہ کو یوروپ سے نقل کیا اور اس لعنت کو بھارت پر تھوپ دیا، جس کا نقصان ہمارا سماج آج بھی جھیل رہا ہے۔ یوروپ میں نسلی اور مذہبی تعصب پر مبنی شہریت اور قومیت نے دوسری عالمی جنگ کو جنم دیا، جبکہ بھارت میں ان امراض نے ملک کے دو حصے کیے۔ پھر ہزاروں لوگوں کی جانیں گئیں۔ تقسیم ملک کے بعد بھی یہ مذموم نظریات نفرت اور فسادات کے لیے زمین تیار کرتے رہے ہیں۔

حالانکہ بھارت کے آئین میں خطہ اور حریت پسندی پر مبنی شہریت کا تصور پایا جاتا ہے۔ ذات، دھرم، جنس اور علاقہ کے نام پر امتیازات قانون کی کتاب میں موجود نہیں ہیں، مگر ساورکر آئین کے نظریہ شہریت کے مخالف تھے۔ فرقہ پرست جماعتیں اس سچائی کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ ان کے بانی کا نظریہ شہریت نسل پرستی اور مذہبی امتیازات سے متاثر ہے۔ ساورکر کی فکر جمہوریت اور اقلیتوں کے مفاد کے بھی خلاف ہے۔ جہاں بھارت کا آئین تمام شہریوں کو یکساں حقوق فراہم کرتا ہے، جس کی وجہ سے ملک کے بڑے سے بڑے منصب پر اقلیتی برادری کے لوگ فائز ہوئے ہیں، وہاں ساورکر کا تصور شہریت فرقہ پرستی پر مبنی ہے۔ ساورکر کی اسی منفی سوچ سے بیمار فرقہ پرست جماعتیں مسلمانوں اور عیسائیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور یہ بات قبول کرنے کی ہمت نہیں رکھتیں کہ ملک کی تقسیم سے تین دہائی پہلے ہی ساورکر نے مذہب پر مبنی شہریت کی بات کی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں شائع کتاب 'ہندوتو' میں ساورکر نے خطہ اور سیکولر بنیاد پر مبنی شہریت کو پوری طرح سے خارج کرتے ہوئے نسل پرستی پر مبنی شہریت کا تصور ان الفاظ میں بیان کیا: ”مسلمان اور عیسائیوں کے 'مقدس مقامات یہاں سے بہت دور عرب اور فلسطین میں واقع ہیں۔ ان کے پیشوا، نظریات، ہیرو، اس سرزمین سے نہیں نکلے ہیں۔ اس طرح ان کے نام اور ان کے نقطہ نظر سے بیرونیت کی بو آتی ہے۔ ان کی حب الوطنی منقسم ہے“ (ص ۹۲)۔ یہاں ساورکر نے صاف لفظوں میں بیان کردیا ہے کہ جس شخص کے مقدس مقامات بھارت سے باہر ہیں، وہ بھارت کا سچا محب وطن یا شہری نہیں ہوسکتا۔ اس طرح ساورکر نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو دوئم درجہ کا شہری سمجھا ہے۔ جب فرقہ پرست طاقتیں اقلیتوں کو اپنی پارٹی کے بڑے منصب پر بیٹھانے سے گریز کرتی ہیں یا پھر ان کو سرکاری اداروں سے باہر رکھنے کی سازش کرتی ہیں تو ان کے دماغ میں ساورکر کی یہی باتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ بعض اوقات بھگوا جماعت کے بڑے لیڈر مسلمانوں سے حق رائے دہندگی کو واپس لینے کا بھی بیان جاری کرچکے ہیں۔ این آر سی اور سی اے اے کے پیچھے ساورکر کی یہی فکر کام کررہی تھی۔

بھگوا طاقتوں کی دوہری سیاست دیکھیے کہ ایک طرف وہ بھارت کے اقلیت مسلمان اور عیسائیوں کی حب الوطنی پر سوال کھڑا کرتی ہیں، وہیں دوسری طرف برطانیہ کے ایک اقلیت ہندو کی سیاسی کامیابی پر جشن منا رہی ہیں۔ تصور کیجیے کہ ساورکر کے نظریہ شہریت کو کوئی برطانوی عیسائی شہری استعمال کرے اور وہاں کے ہندوؤں سے حب الوطنی کی سند طلب کرے تو یہ کتنا برا ہوگا! کیا فرقہ پرست جماعتوں کے پاس اس بات کا جواب ہے کہ اگر بھارت کی کوئی اقلیت مسلمان اور عیسائی شک کے دائرے میں اس لیے ہے کہ ان کے مقدس مقامات عرب اور فلسطین میں ہیں تو پھر کیسے ایک برطانوی ہندو شہری، جس کے مذہبی مقامات کاشی اور متھرا میں واقع ہیں، برطانیہ کا سچا دیش بھکت ہوسکتا ہے؟ مگر رشی سونک کو جس طرح برطانیہ کی اکثریت عیسائی آبادی نے گلے لگایا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ساورکر کا نظریہ شہریت اخوت کی راہ میں بڑا پتھر ہے۔ یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ بھارت کے معماران آئین نے ساورکر کے نظریہ شہریت کو بھی قبول نہیں کیا اور ملک کی تشکیل سیکولر بنیاد پر کی۔ مگر خطرہ اس بات کا ہے کہ جو لوگ نسل اور مذہب کی سیاست میں یقین رکھتے ہیں وہ آج اقتدار پر قابض ہیں۔ ■

مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں
debatingissues@gmail.com

فرقہ وارانہ نفرت، سائنس اور آدی واسی سماج

وہ ہزاروں سالوں سے جنگل میں زندگی گزار رہے ہیں، مگر انہوں نے کبھی جنگل کو کاٹ کر اُسے بیچنے کی چیز نہیں سمجھا

ابھے کمار

ان دنوں میں جھارکھنڈ آیا ہوں۔ مجھے پہلی بار 'جھارکھنڈ سائنس فلم فیسٹول' میں آنے کا موقع ملا ہے۔ تین دنوں تک چلے اس فلم فیسٹول کا مقام لوہردگا کا ایک اسکول تھا۔ جھارکھنڈ کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں سے فلم ڈائریکٹر، سماجی کارکنان اور طلبہ اس پروگرام میں آئے ہوئے تھے۔ اس فلم فیسٹول میں اسکرین کیے گئے سینما میں بہت سارے آدی واسی سماج اور اُن کے مسائل کے بارے میں دکھایا گیا تھا۔ حالانکہ جھارکھنڈ ریاست اس صدی کے آغاز میں وجود میں آئی، مگر یہاں کے آدی وادسی ایک لمبے عرصے سے علیحدہ ریاست کا مطالبہ کر رہے تھے۔ آدی واسی مہاسبھا ۱۹۳۰ اور ۱۹۴۰ کی دہائی میں کافی سرگرم تھا اور کئی سارے پلیٹ فارموں سے اس نے آدی واسی علاقوں سے وسائل کی لوٹ کے خلاف آواز بلند کی۔ خصوصاً جے پال سنگھ منڈا کی قیادت میں آدی واسی مہاسبھا نے زبردست احتجاج کیا، جس کو دبانے کے لیے سرکار نے طاقت کا استعمال کیا۔

انگریز ہوں یا قومی تحریک کے لیڈر یا پھر آزاد بھارت کے حکمراں، سب نے آدی واسی علاقوں کے وسائل سے تو پیار کیا اور اسے لوٹنے میں پیش پیش رہے، مگر آدی واسی سماج کو کبھی برابر کا انسان نہیں سمجھا۔ مین اسٹریم کے اسکالر سے لے کر سیاست داں سب نے آدی واسی کو پسماندہ اور غیر مہذب کہہ کر ٹھوکر ماری۔ جہاں مہاجن نے سود کے نام پر اُن کا استحصال کیا، وہیں سرکاری ملازم اور محکمۂ جنگلات کے افسران نے ان کو جل، جنگل اور زمین سے بے دخل کیا۔ آدی واسی علاقوں میں ہی ڈیم بنیں اور کان کنی کی گئی اور جو کمائی ہوئی اس کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی آدی واسی سماج کی ترقی پر خرچ نہیں ہوا۔ صنعت اور کارخانوں کو لگانے اور ملک کی ترقی کے نام پر آدی واسی علاقوں کے وسائل لوٹے گئے اور یہاں کی نوکریوں کو مقامی لوگوں کو دینے کے بجائے باہر سے آئے غیر آدی واسیوں کو دے دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جھارکھنڈ کی ڈیموگرافی بدلنے لگی اور کم از کم شہروں میں غیر آدی واسی بڑی تعداد میں بس گئے اور کاروبار، ملازمت اور میڈیا پر قابض ہو گئے۔ حالات آج اس طرح بدل چکے ہیں کہ جھارکھنڈ کے علاقوں میں ایک 'سرنا پرچم' کے پیچھے تین بھگوا پرچم لہراتے دکھ رہے ہیں۔

اگر آپ آدی واسی سماج کی زندگی کو قریب سے مشاہدہ کریں گے تو پائیں گے کہ دراصل نام نہاد مہذب سماج، جو آدی واسیوں کو غیر مہذب کہتے نہیں تھکتا، خود ہی سب سے زیادہ غیر مہذب ہے۔ آدی واسی سماج کے زیادہ تر لوگ منافع خوری، سود خوری اور مسابقہ نام کے جراثیم سے دور ہیں۔ اُن کے اندر نفرت، عداوت، احساس برتری اور دوسروں کے تیئں نفرت بھی نہیں پائی جاتی ہے۔ اُن کی زندگی حقیقت اور قدرت سے زیادہ قریب ہے۔ وہ جنگل اور جنگل میں رہنے والے تمام جانوروں اور پرندوں کے ساتھ ہم آہنگی سے رہتے ہیں۔ وہ ہزاروں سالوں سے جنگل کے بیچ رہے ہیں، مگر انہوں نے کبھی جنگل کو کاٹ کر اُسے بیچنے کی چیز نہیں سمجھا۔ جھارکھنڈ کے زیادہ تر آدی واسی سرنا مذہب کو مانتے ہیں، جس کو مذہب کہنا بھی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ اُن کا عقیدہ دنیا کے دیگر بڑے مذاہب سے بہت جدا ہے۔ اُن کے پاس نہ تو کوئی مذہبی کتاب ہے اور نہ ہی ان کے مذہبی مقامات پر کوئی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اُن کی پوجا کی جگہ کھلے آسمان میں ہوتی ہے اور وہ نیچر کی عبادت کرتے ہیں اور اپنے بزرگوں سے دعا مانگتے ہیں۔ آدی واسی سماج کے مرکز میں خواتین ہوتی ہیں اور آدی واسی خواتین کو پوری آزادی اور مساوی حقوق حاصل ہیں۔ آدی واسی کتابوں میں طوطا ہرا ہوتا ہے پڑھنے کے بجائے وہ طوطے کو جنگل اور باغیچہ میں دیکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کھان پان کے معاملے میں بھی وہ مین اسٹریم سے آگے ہیں اور سب کچھ کھاتے ہیں، خواہ وہ گوشت ہو یا پھل یا سبزی۔ مجموعی طور پر آدی واسی سماج مین اسٹریم معاشرہ سے کہیں زیادہ مساوی اور سائنٹفک ہے۔

> آج دنیا ماحولیاتی آلودگی اور نیوکلیئر اسلحہ کی جمع خوری کی وجہ سے تباہی کے دہانے پر ہے، وہیں آدی واسی ہزاروں سالوں سے ہم آہنگی کے ساتھ جی رہے ہیں۔ آج مین اسٹریم سائنس کو آدیواسیوں سے بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ سائنٹسٹ کو بھی یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ کتابی علم اور لیب ٹیسٹ کے نتائج کبھی زمینی حقیقت سے بالاتر نہیں ہو سکتے۔

علی امام خان نے جنہوں نے اس فلم فیسٹول کو منعقد کرانے میں کافی اہم رول ادا کیا ہے، مجھ سے لوہردگا میں گفتگو کے دوران کہا کہ آدی واسی سماج سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ علی امام صاحب کا تعلق بہار کے گیا ضلع سے ہے، مگر وہ جھارکھنڈ کے مختلف حصوں میں گزشتہ چار دہائیوں سے سرگرم ہیں۔ پیشہ سے وہ ریاضیات کے پروفیسر رہے ہیں اور سبکدوش ہونے سے پہلے انہوں نے جھارکھنڈ کے کالج میں پرنسپل کے بھی فرائض انجام دیے ہیں۔ لمبے وقت سے انہوں نے عوامی تحریک میں حصہ لیا ہے اور ان کی کوشش ہے کہ فلم کے ذریعے سے سماج کے اندر سائنٹفک فکر کو فروغ دیا جائے۔ علی امام خان اس بات سے افسردہ ہیں کہ ملک میں بھگوا حکمراں توہم پرستی اور غیر منطقی باتوں کو آگے بڑھا رہے ہیں، جو کہ ایک خطرناک پیش رفت ہے۔ مثال کے طور پر، کورونا وبا کے دوران لوگوں سے تھالی بجوائی گئی۔ وبا کے پھیلاؤ کے لیے ایک خاص مذہب کے ماننے والوں کو کھلنایک بنا کر پیش کیا گیا۔ آج بھی اقلیتوں پر یہ الزام مین اسٹریم میڈیا تھوپ رہا ہے کہ وہ کھانے میں دوسروں کے دھرم کو ناپاک کرنے کے لئے دانستہ طور سے تھوکتے ہیں۔ اقلیتوں کو دن رات غیر مہذب، آئین مخالف اور ترقی، ملک اور سائنس کا دشمن بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، مگر غریبوں کو لوٹنے والے، دھرم کے نام پر فساد کرنے والے اور ذات برادری کو ماننے اور اس پر فخر کرنے والے عناصر خود کو سب سے زیادہ سائنس کے چمپئن کہہ رہے ہیں۔

جھارکھنڈ کے علاقوں میں بھی فرقہ پرستی کو ہوا دینے کے لیے پوری کوشش ہو رہی ہے۔ ان دنوں رام نومی کے مواقع پر ہر طرف بھگوا پرچم لہرایا گیا اور بھگوا ریلیاں نکالی گئیں۔ جہاں ایک سرنا پرچم تھا وہاں کئی کئی بھگوا پرچموں کو لہرایا گیا اور سرنا دھرم کو، جو کہ ایک علیحدہ دھرم ہے۔ کو بھگوا رنگ میں رنگنے کی کوشش ہوئی۔ جھارکھنڈ میں آدی واسیوں کے علاوہ پسماندہ گروپ مہتو اور اقلیت مسلم اور عیسائی اہم فرقہ ہیں۔ بی جے پی کی یہ پوری کوشش ہے کہ آدی واسیوں کو مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف متحد کیا جائے۔ اچھی بات یہ ہے کہ آدی واسیوں نے بہت ہی سوجھ بوجھ کے ساتھ کام لیا ہے اور وہ بڑی مضبوطی کے ساتھ اقلیتوں کے ساتھ کھڑے رہے، جس کی وجہ سے بھگوا طاقتوں کا ماحول خراب کرانے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ایک بار پھر آدی واسیوں نے اپنے سائنٹفک طرز فکر کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے عمل سے پھر ثابت کیا کہ مذہب سے اوپر انسانیت ہے۔

دراصل سائنس بھی ایک دو دھاری تلوار ہوتی ہے۔ اگر اس کا استعمال بھلائی کے لیے کیا جائے تو یہ نعمت ہے۔ لیکن اگر اس کا استعمال چند مٹھی بھر لوگوں کی کمائی کے لیے کیا جائے تو یہ تباہی کا دوسرا نام ہے۔ جہاں تک توہم پرستی، عدم مساوات اور ذات پات کے خلاف لڑائی کی بات ہے، یہاں سائنس ہماری دوست ہے۔ مگر جب سائنس کے نام پر کچھ نام نہاد ماہرین زمین سے جڑے ہوئے لوگوں کو یہ بتلانے لگتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط تو ایسی کوشش تباہی کی طرف لے جاتی ہے۔ طوطے کے بارے میں پڑھنے والا ماہر کبھی بھی طوطے کے ساتھ کھیلنے والے سے زیادہ جانکار نہیں ہو سکتا۔ ہونا یہ چاہیے کہ سائنس کے ماہرین عام لوگوں کے معاون بن کر کام کریں، نہ کہ وہ لوگوں کے بیچ میں حاکم بن کر جائیں اور عوام کو بیوقوف سمجھیں۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)۔

کیا سیکولر پارٹیاں اپنی اصلاح کرنا چاہتی ہیں؟

آج سیکولر اور سماجی انصاف کی جماعتوں کے پاس عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے کوئی خواب نہیں ہے

ابھے کمار

اسمبلی انتخابات ۲۰۲۲ء کے نتائج نے ایک بار پھر سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں کے سامنے یہ سوال کھڑا کیا ہے کیا وہ واقعی اپنی اصلاح کرنا چاہتی ہیں؟ یا اصلاح سے منہ موڑ کر، وہ خود کو تاریخ کی قبر میں دفن کرنے پر آمادہ ہو چکی ہیں؟ ان کی پیشانی پر پستی اور نا امیدی کی جو لکیریں دیکھی جا رہی ہیں، وہ زمینی حقیقت کے برعکس ہیں۔ آج بھی بھارت کے زیادہ تر لوگ سیکولر نظریہ میں یقین رکھتے ہیں اور عوام مہنگائی اور بے روزگاری سے بری طرح پریشان ہیں۔ کورونا کے دوران بھی بی جے پی حکومت نے عوام کو اکیلا چھوڑ دیا تھا اور رائے دہندگان کی اکثریت بری طرح سے جھیل گئی تھی۔ اگر سیکولر جماعت نرم ہندوتوا کا کارڈ کھیلنے سے گریز کرتی اور سیکولر اور سماجی انصاف پر یقین اور عمل کرتی، تو فرقہ پرست طاقتوں کی کوئی عیاری، سازش اور بدعنوانی چل نہیں پاتی۔ مگر افسوس کہ فرقہ پرستوں سے سیدھے مقابلہ کرنے کے بجائے، سیکولر اور سماجی انصاف کی جماعتوں کو یہ لگا کہ نرم ہندوتوا کی راہ پر چل کر ہی حکمرانی مل سکتی تھی۔ آج سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں کے جسم میں نہ تو توانائی دیکھی جا رہی ہے اور نہ ہی ان کی آنکھوں میں کوئی خواب ہی۔ ٹاپ لیڈرشپ پر کچھ ہی مٹھی بھر لوگ سالوں سے قبضہ بنائے ہوئے ہیں، جو اپنی نا اہلی سے الیکشن جیتنے کے بجائے، بھگوا طاقتوں کو کامیاب بنانے میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔

سیکولر پارٹیوں کی اسی ناقص حکمت عملی کا فائدہ بی جے پی کو ملا ہے، جس نے پانچ میں سے چار ریاستوں میں زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ بلاشبہ بی جے پی کے لیے سب سے بڑی کامیابی اتر پردیش کی جیت ہے۔ بھگوا اتحاد کو کل ۴۰۳ سیٹوں میں ۲۷۴ سیٹیں ملیں۔ اتراکھنڈ، گوا اور منی پور میں بھی بی جے پی نے اپنی امید سے زیادہ بڑی جیت حاصل کی ہے اور وہاں بھی بھگوا پرچم لہرانے جا رہا ہے۔ عام آدمی پارٹی کو پنجاب میں بڑی کامیابی ملی اور اس نے کل ۱۱۷ سیٹوں میں ۹۲ سیٹیں اپنی جھولی میں ڈالیں۔ جہاں تک کانگریس کا سوال ہے تو اس کی کارکردگی بہت ہی خراب رہی ہے۔ کسان تحریک کی وجہ سے پنجاب اسمبلی میں حزب اختلاف اکالی دل اور بی جے پی بیک فٹ پر تھی۔ کچھ مہینوں پہلے کانگریس نے ایک دلت سماج کے لیڈر کو وزیر اعلیٰ بنا کر محکوم طبقات میں اچھا پیغام بھی دیا تھا۔ سب کچھ کانگریس کے موافق نظر آ رہا تھا، مگر کانگریس کے لیڈروں کی آپسی لڑائی نے اس کا بیڑا غرق کر دیا۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ پنجاب کا ایک حصہ کانگریس اور اکالی بی جے پی کے راج سے دکھی تھا اور اسے یہ لگ رہا تھا کہ بدلاؤ ضروری ہے۔ مگر اس ناراضگی کو دور کرنے کے لیے کانگریس کی طرف سے کوئی سنجیدہ مہم نہیں چلائی گئی، جس کا فائدہ عام عادمی پارٹی کو مل گیا۔

اتر پردیش میں بھی اپوزیشن پارٹیاں مسلسل غلطی کرتی رہیں۔ اپوزیشن پارٹیاں یہ سمجھنے کو تیار نہیں ہیں کہ سیاست ایک بہت ہی سنجیدہ کام ہے۔ یہ فل ٹائم جاب ہے۔ سیاست پوری زندگی لیتی ہے، تب وہ کچھ دے پاتی ہے۔ سیاست کے ذریعہ ہی پالیسی سازی ہوتی ہے، جو یہ طے کرتی ہے کہ کس کو کیا ملے گا اور کس کو کس چیزوں سے محروم رکھا جائے گا۔ سیاست کا تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے جڑا ہوا ہے۔ سیاست کو ہلکے میں لینے کی غلطی کوئی نادان ہی کر سکتا ہے۔ سیاسی مفکر ارستو سے لے کر مہاتما گاندھی نے سیاست کی اہمیت پر زور دیا ہے اور اسے سیدھے طور پر معاشرتی زندگی سے جوڑا ہے۔ سیاست خود کو بڑا لیڈر بنانے کا نام نہیں ہے اور نہ ہی شخصیت پرستی کا دوسرا نام سیاست ہے۔ در اصل سیاست کے ذریعہ محکوم طبقات کے لیڈران اپنی باتوں کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ سیاست

اگر بھگوا طاقتوں سے مقابلہ کرنا ہے تو تمام سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں کو خود احتسابی کرنی ہوگی۔ جمہوری نظام میں کسی بھی ادارہ یا پارٹی کے سر پر ایک خاندان، ایک ذات اور ایک دھرم کے لوگوں کا بیٹھنا دوسروں کے دل میں شک اور ناراضگی پیدا کرتا ہے، جس کا فائدہ فرقہ پرست پارٹیاں اٹھاتی رہی ہیں۔ سیاست میں ہار سے گھبرانا نہیں چاہیے، بلکہ شکست سے سبق نہ لینا خودکشی کے مترادف ہے۔

کے ذریعہ وہ لوگوں کو سماج بدلنے والی تحریک سے جوڑتے ہیں۔ سیاست کے ذریعہ جو بات ناممکن سی لگتی ہے، اسے محکوم طبقات کے لیڈران ممکن بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر، سیاست کے ذریعہ بابا صاحب امبیڈکر نے محکوم اور مظلوم طبقات کے حقوق کو آئینی اور قانونی تحفظات فراہم کیے۔ مگر جب سیاست مظلوم طبقات کے بجائے ظالموں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے، تو غریبوں اور مظلوموں کی بھلائی نہیں ہوتی، بلکہ طاقتور کا ظلم اور بڑھ جاتا ہے۔ جب شدت پسند لوگ اقتدار میں آ جاتے ہیں تو وہ برابری کی جگہ غیر برابری کو پھیلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ، وہ عوام کو دھرم اور مذہب کے نام پر لڑاتے ہیں تاکہ روزی روٹی کا سوال دب جائے اور وہ بے روک ٹوک امیروں کے لیے کام کرتے رہیں۔

آج سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیاں کنفیوزڈ نظر آتی ہیں، عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی خواب نہیں ہے۔ جن اصولوں کی بنیاد پر ان پارٹیوں کی تشکیل ہوئی تھی اور جن اصولوں کے لیے لوگوں نے قربانیاں دی تھیں، آج انہیں اصولوں پر، ان سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں کے بڑے لیڈروں کا اعتماد ہل رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو سیکولر پارٹیوں کے لیڈران ہر روز مندر نہیں جاتے اور اس کا فوٹو وائرل نہیں کرواتے۔ یاد رکھیے میں کسی بھی انسان کے مذہبی عقیدہ کے خلاف نہیں ہوں۔ لوگوں کو اپنے مذہب اور عقیدہ کو ماننے اور اس کی اشاعت کرنے کا آئینی حقوق حاصل ہے اور میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ مگر ملک کا سیکولر آئین یہ بھی کہتا ہے کہ دھرم کا استعمال سیاسی فائدہ کے لیے نہ کیا جائے۔ اگر کوئی لیڈر مندر یا مسجد جاتا ہے، تو وہ جائے، مگر جب وہ اس کا پرچار کرتا ہے تو لوگوں میں یہ پیغام جاتا ہے کہ وہ کسی خاص دھرم کے لیے کام کر رہا ہے۔ بھگوان پرشورام کا بڑا مندر بنانے کے لیے بھی تو سماجی انصاف کی پارٹیوں میں مقابلہ چل رہا تھا، اگر ایسا مقابلہ انہوں نے اسپتال بنوانے کے لیے کیا ہوتا تو کتنے لوگوں کی جانیں کورونا وبا کے دوران بچائی جا سکتی تھیں۔ رام مندر تحریک کے نام پر جس طرح بھگوا طاقتوں نے ملک کو تشدد کی آگ میں جھونکا، آج اس مذموم سیاست کی مذمت کرنے کے بجائے سیکولر جماعت مندر میں سونے کی اینٹ بھیجنے کے لیے کل تک مقابلہ کر رہی تھی۔ امبیڈکر کے نظریہ پر مبنی پارٹی کے لیڈروں نے بھی اعلیٰ ذات کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے مندر کا کارڈ کھیلا اور امبیڈکر کے نظریہ کے ساتھ دھوکہ کیا۔ تضاد دیکھیے کہ جن اعلیٰ ذات کے لوگوں کو اپنی طرف لانے کے لیے سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں نے نرم ہندتوا کا کارڈ کھیلا، انہوں نے بی جے پی کو پھر ووٹ دیا اور جن مسلمانوں نے سیکولر طاقتوں کی پوری حمایت کی، انہوں نے مسلمانوں کے جائز ایشوز کو اٹھانے سے گریز کیا۔

یہ بھی بات صحیح ہے کہ بھگوا طاقتوں کی جیت میں ہندوتوا کارڈ کا رول رہا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ انہوں نے پورے الیکشن کے دوران رائے دہندگان کو مسلم مخالف ایجنڈے پر متحد کرنے کی کوشش کی۔ اس بات کے بھی خدشات ہیں کہ انتخابات کے دوران بھگوا طاقتوں نے نوکر شاہی اور سرکاری مشینری کا بے جا استعمال کیا اور کئی موقعوں پر دھاندلی کی۔ ان خطرات کے بارے میں کچھ خبریں سامنے بھی آئی ہیں۔ مگر ان سب کا مقابلہ تب ہو پائے گا جب سیکولر پارٹیاں پہلے اپنے گھر کو صاف کریں اور جن اصولوں کی بنیاد پر ان کا جنم ہوا ہے ان کو وہ دل سے مانیں اور ان پر عمل بھی کریں۔ کچھ نام نہاد مسلم پارٹیاں الیکشن کے وقت مسلمانوں کا ایشوز چھیڑتی ہیں اور ان کو یہ لگتا ہے کہ مسلمان ان کو اپنا سارا ووٹ دے دیں گے، مگر دوسروں پر سوال اٹھانے والی ان نام نہاد مسلم پارٹیوں کو بھی چاہیے کہ وہ الیکشن لڑنے سے پہلے اور لڑنے کے بعد بھی عوام کے درمیان کام کریں۔ اگر بھگوا طاقتوں سے مقابلہ کرنا ہے تو تمام سیکولر اور سماجی انصاف کی پارٹیوں کو خود احتسابی کرنی ہوگی۔ جمہوری نظام میں کسی بھی ادارہ یا پارٹی کے سر پر ایک خاندان، ایک ذات اور ایک دھرم کے لوگوں کا بیٹھنا دوسروں کے دل میں شک اور ناراضگی پیدا کرتا ہے، جس کا فائدہ فرقہ پرست پارٹیاں اُٹھاتی رہی ہیں۔ سیاست میں ہار سے گھبرانا نہیں چاہیے، بلکہ شکست سے سبق نہ لینا خودکشی کے مترادف ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

ہندوستان میں سیکولرازم کا تصور

جب تک کوئی حکومت لوگوں کو یکساں حقوق فراہم نہیں کرے گی، تب تک کسی بھی طرح کی جمہوریت کا تصور نہیں کیا جاسکتا

ابھے کمار

اکثر ہم سیکولرازم لفظ کو سنتے ہیں۔ اخبار، کتاب، سیاسی ریلی، پارلیمنٹ، عدالت اور میڈیا میں بار بار اس کا نام آتا ہے۔ ہمارے آئین کی تمہید میں بھی سیکولر، جو کہ سیکولرازم کی خوبی ہے، کا ذکر ہے۔ انگریزی لفظ سیکولرازم کا معقول ہندی یا اردو ترجمہ کیا ہونا چاہیے؟ اس پر ایک رائے نہیں ہے۔ کچھ لوگ اسے 'دھرم نرپیکشتا' کہنا پسند کرتے ہیں، تو کچھ لوگ 'پنتھ نرپیکشتا' کو زیادہ صحیح مانتے ہیں۔ دراصل سیکولر لفظ لاطینی سے آیا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے 'دنیاوی'۔ جو بھی چیز آخرت اور روحانیت سے تعلق نہیں رکھتی وہ سیکولر حلقہ کے اندر میں آتی ہے۔ سیکولرازم ایک معیاری تصور ہے، جو ریاست اور مذہب کے بیچ دیوار کھڑا کرنے کی بات کہتا ہے۔ جدید دور سے پہلے مذہب کا حلقہ وسیع تھا اور وہ دینی اور دنیاوی دونوں معاملوں میں اس کی بڑی مداخلت تھی۔ مگر جدیدیت نے سیاست اور دین کو الگ کرنے کی بات پر زور دیا۔ کسی فرد کو مندر جانا ہے، یا مسجد میں عبادت کرنی ہے، یہ اس کا ذاتی معاملہ قرار دیا گیا۔ اب مذہبی اداروں کو صرف مذہبی معاملوں میں ہی دخل اندازی کرنے کی اجازت دی گئی، جبکہ سیکولر اور دنیاوی امور کی ذمہ داری ریاست کے سپرد کی گئی۔ آج بھی جب کوئی پنڈت یا مولوی کسی لیڈر کے لیے ووٹ مانگتا ہے یا کسی پارٹی کی حمایت کرتا ہے تو اکثر اس کی مخالفت میں لوگ یوں کہتے ہیں: 'سیاست سے دور رہیے'۔

ریاست اور مذہب کے بیچ دیوار کھڑی کر دینا سیکولرازم کا ایک اہم جز ہے۔ سیکولرازم کا یہی تصور امریکہ میں پایا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ ۱۵ ویں اور ۱۶ ویں صدی میں یورپ میں بڑا بدلاؤ دیکھا گیا جب عہد وسطیٰ کا خاتمہ اور یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا۔ ادب و علم کے حلقہ میں ایک انقلاب محسوس کیا گیا۔ لوگوں کی سوچ و فکر بدل رہی تھی۔ مذہب کی جگہ انسان لے رہا تھا۔ آسمانی دنیا کی جگہ اس دنیا کی بات ہو رہی تھی۔ الوہیت، چرچ، مذہبی پیشوا کی جگہ سائنس لینے لگی۔ روز نئے نئے ایجاد ہونے لگیں، نئے نئے ملکوں کی جستجو ہونے لگی اور اس کے ساتھ نو آبادیات کی کالی تاریخ بھی شروع ہوئی۔ دین کو چھوڑ کر باقی سارے معاملوں میں ریاست فیصلہ لینے لگی۔ تجارت اور محصول پر ریاست کا قبضہ ہو گیا۔ تشدد کا استعمال کرنے کا واحد حق ریاست کو ہی ملا۔ مذہبی قانون جو پہلے انسان کے ہر شعبہ کو طے کرتا تھا وہ صرف ان کے ذاتی معاملوں کو طے کرنے لگا، جبکہ ریاست کے سیکولر قوانین تمام شہریوں کی عوامی زندگی کو متاثر کرنے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی زبانوں کی جگہ دیسی، عوامی یا مقامی زبان کو اہمیت دی جانے لگی۔ یورپ میں لاطینی کی جگہ انگریزی، فرنچ جیسی غیر کلاسیکی زبانیں ریاست کی سرپرستی پانے لگیں۔ قوم، زبان کی بنیاد پر قومی ریاست کا وجود سامنے آنے لگا۔ قومیت ایک بہت بڑا طاقتور نظریہ بن کر ابھری۔ شہریت کا بھی تصور سامنے آیا اور لبرل فلسفی اس بات پر زور دینے لگے کہ مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے اور ریاست کو اپنے تمام شہریوں کو یکساں دیکھنا چاہیے اور ان کے لیے یکساں قانون اور پالیسی بننی چاہیے۔

یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ یورپ میں عہد وسطیٰ میں مذہب کا رول بہت ہی بڑا تھا۔ اس زمانہ میں مذہبی ادارے ہی لوگوں کی تقدیر کا فیصلہ کرتے تھے۔ پہلے مذہب کے نام پر جنگیں بھی ہوتی تھیں۔ عیسائیت کے اندر بہت سارے فرقہ اور مسلک تھے، جن کے بیچ بہت خون بہا۔ اس لڑائی کو ختم کرنے کے لیے بین المذاہب اور مذہب کے اندر موجود مختلف مسلکوں کے درمیان امن و صلح کی بات ہونی شروع ہوئی۔ سیکولرازم کا تصور بھی اسی پس منظر سے نکلا ہے۔ لوگ مذہب کے نام پر نہ لڑیں، مذاہب کے درمیان میں ہم آہنگی پیدا کی جائے، ریاست اور مذہب کے بیچ میں دیوار کھڑی کر دی جائے، ریاست کا اپنا خود کا کوئی مذہب نہ ہو، ریاست کی نظروں میں تمام شہری برابری ہوں، ریاست مذہب کی بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیاز نہیں کرے گی، ایسی باتوں کو سیکولر نظریہ سے جوڑا جانے لگا۔ تجارت، کاروبار اور سرمایہ دارانہ نظام کے فروغ کے لیے بھی سیکولرازم کے نظریہ کو معقول سمجھا گیا۔ یہ اس لیے تجارت کے لیے ضروری ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگ پرامن طریقے سے رہیں اور آپس میں کاروبار کریں۔ جمہوریت کی کامیابی کے لیے بھی سیکولرازم کو اہم مانا گیا۔ جب تک ریاست لوگوں کو یکساں حقوق فراہم نہیں کرے گی، تب تک کسی بھی طرح کی جمہوریت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ مساوات اور جمہوریت تب ہی ممکن ہے جب ریاست کا کردار سیکولر ہو۔ سیکولرازم کے بہت سارے ناقدین بھی ہیں۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ سیکولرازم کی وجہ سے لادینیت پھیلی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب دین سے سیاست دور ہو جاتی ہے، اخلاقیات کی جگہ سیاست میں نہیں رہتی ہے، تب ایسی سیاست لوگوں کا بھلا کرنے کے بجائے نقصان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سارے لوگوں نے سیکولرازم کے نظریہ کو ہدف تنقید بنایا ہے اور کہا ہے کہ سیاست کو مذہبی کتابوں کی روشنی میں چلانا چاہیے تاکہ با اخلاق سماج وجود میں آسکے۔

بھارت میں سیکولرازم کا جو تصور ہے، اس پر اشوک، اکبر، گاندھی کے افکار، آزادی کی لڑائی، اور ہندوستانی تہذیب اور تمدن کا اثر ہے۔ بھارت میں سیکولرازم کا مطلب لادینیت نہیں ہے اور نہ ہی یہ دین کے تئیں منفی رخ رکھتا ہے۔ دراصل سیکولرازم کا ہندوستانی تصور یہ ہے کہ ریاست کا کوئی اپنا مذہب نہیں ہوگا۔ وہ تمام شہریوں کو یکساں حقوق دے گی ا اور وہ تمام مذاہب کا یکساں احترام کرے گی۔ ریاست کی نظروں میں کوئی مذہب چھوٹا یا بڑا نہیں ہے۔

بھارت میں بھی سیکولرازم کو لے کر کافی بحث ہوئی ہے۔ کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ یہ ایک بیرونی تصور ہے، جس کو بھارت کے ارباب اقتدار نے یہاں کے مذہبی لوگوں پر تھوپ دیا ہے۔ الزام یہ ہے کہ سیکولرازم کی آڑ میں ریاست اپنے ہاتھوں میں بے پناہ طاقت لے لیتی ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ارباب اقتدار فیصلہ لیتے وقت اپنے ذاتی مفاد کا زیادہ اور اخلاقی پہلوؤں کا کم دھیان رکھتے ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ جدید ریاست نے گزشتہ صدیوں میں کافی خون بہایا ہے۔ مگر یہ کہنا کہ سیکولرازم ایک بیرونی تصور ہے صحیح نہیں ہے۔ بھارت میں سیکولرازم کا جو تصور ہے، اس پر اشوک، اکبر، گاندھی کے افکار، آزادی کی لڑائی، اور ہندوستانی تہذیب اور تمدن کا اثر ہے۔ بھارت میں سیکولرازم کا مطلب لادینیت نہیں ہے، اور نہ ہی یہ دین کے تئیں منفی رخ رکھتا ہے۔ دراصل سیکولرازم کا ہندوستانی تصور یہ ہے کہ ریاست کا کوئی اپنا مذہب نہیں ہوگا۔ وہ تمام شہریوں کو یکساں حقوق دے گی اور وہ تمام مذاہب کا یکساں احترام کرے گی۔ ریاست کی نظروں میں کوئی مذہب چھوٹا یا بڑا نہیں ہے۔ فرنچ موڈل کی طرح بھارتی سیکولرازم دین کے تئیں منفی نظریہ نہیں رکھتا ہے اور نہ ہی امریکی ماڈل کی طرح یہ پوری طرح سے دین اور ریاست کے بیچ تقسیم کی بات کرتا ہے۔ بھارت کا سماج غیر مساوی ہے اور بہت سارے دلت، پسماندہ اور خواتین کو دھرم کے نام پر غیر برابر سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مذہب کی آڑ میں دلتوں کو مندر جانے سے روکا جاتا رہا ہے اور ان کو اچھوت سمجھا گیا ہے۔ مگر بھارت کا آئین ہندو دھرم کے کٹر مذہبی پیشوا کی بات کو ترک کرتے ہوئے، اچھوت پرتھا کو قانون کی نظروں میں ایک جرم قرار دیتا ہے۔ سیکولرازم کا ہندوستانی نظریہ ریاست کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ دھرم میں پائی جانے والی برائیوں کو ختم کرے اور سماج میں برابری کو فروغ دے۔ یہ بھی کہنا درست نہیں ہے کہ بھارت میں سیکولرازم قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے کیونکہ یہ ایک جدید تصور ہے۔ اسی طرح یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ بھارت میں سیکولرازم اس لیے ہے کیونکہ یہاں کا ہندو سماج لبرل رہا ہے اور اس کے خون میں رواداری دوڑتی ہے۔ دراصل ایسی باتیں ہندو شدت پسندوں کی طرف سے کی جاتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ بھارت میں ہندو ہی نہیں بلکہ مسلمان، عیسائی، سکھ اور دیگر سوشل گروپ ہم آہنگی، رواداری، صبر و تحمل میں یقین رکھتے ہیں۔ اس لیے سیکولرازم کی کامیابی کے لیے کسی ایک فرقہ کو کریڈٹ دینا فرقہ وارانہ سوچ کا نتیجہ ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

عزت نفس کی تحریک کے ۱۰۰ سال

پیریار کا ماننا تھا کہ جب تک مظلوم طبقات کو ریزرویشن نہیں ملتا، معاشرے میں مساوات ممکن نہیں

ابھے کمار

آج سے سو سال پہلے، عزت نفس کی تحریک کا آغاز 'مدراس پریذیڈنسی' میں ہوا تھا۔ اس تحریک کے بانی پیریار ای وی. راماسوامی تھے، جو ایک عظیم اقلیت پسند، سماجی مصلح، اور ذات برادری پر مبنی غیر مساوی نظام کے ناقد تھے۔ پیریار جدید دراوڑی تحریک کے بانی بھی تھے۔ شمالی بھارت میں اعلیٰ ذات کی لابی سیاسی حلقوں اور میڈیا میں اتنی مضبوط ہے کہ یہاں پیریار کو اکثر نظر انداز کیا جاتا ہے، لیکن جس تیزی سے ہندوستان کی سیاست میں دائیں بازو کا عروج ہو رہا ہے اور جس شدت کے ساتھ توہم پرستی، عدم مساوات، تعصب اور فرقہ واریت بڑھ رہی ہے، اس دور میں پیریار کی قیادت میں چلنے والی عزت نفس کی تحریک کو یاد کرنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے۔ اس تحریک کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ ہندوستانی قومیت کو تنقیدی نگاہ سے سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ سماجی اصلاحات کے بغیر سیاسی آزادی بے معنیٰ ہے۔ پیریار اور عزت نفس کی تحریک کے ساتھیوں نے اپنا موقف واضح طور پر پیش کیا کہ جب تک سماج میں چھوت چھات، ذات پات پر مبنی عدم مساوات اور اعلیٰ ذات کی بالادستی ختم نہیں ہوتی، اور جب تک سماج میں سب کو مساوی حقوق نہیں ملتے، تب تک محکوم طبقوں کے لیے سیاسی آزادی کا کوئی حقیقی مطلب نہیں ہوگا۔ چونکہ پیریار کی فکر اور سوالات براہ راست اعلیٰ ذاتوں کی مونوپولی کو چیلنج کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ پیریار کی باتوں اور عزت نفس کی تحریک کے مطالبات کو علیحدگی پسندی کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا، اور انہیں بدنام کرنے کی سازشیں کی گئیں۔ تاہم، وقت کے ساتھ پیریار کی انقلابی فکر جنوبی بھارت سے آگے پھیلنے لگی، اور آج انہیں ایک عظیم سماجی مصلح اور مفکر کے طور پر جانا اور پڑھا جا رہا ہے۔

عزت نفس کی تحریک شروع کرنے سے پہلے، پیریار کانگریس پارٹی کے ساتھ منسلک تھے۔ ۱۹۲۰ء کی دہائی میں شروع ہونے والی تحریک عدم تعاون میں پیریار نے بھرپور انداز میں حصہ لیا۔ اس وقت وہ مدراس پریذیڈنسی کانگریس کے ایک نمایاں لیڈر تھے۔ وہ مہاتما گاندھی سے کافی متاثر تھے اور اپنی خاندانی تجارت کو چھوڑ کر ملکی آزادی کی جدوجہد میں شامل ہوگئے۔ انہوں نے اپنے مہنگے ملبوسات کو ترک کر کے کھادی کے کپڑے پہننے شروع کیے۔ تحریک عدم تعاون کے دوران، پیریار نے ایروڈ میں دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی، جس کے نتیجے میں انہیں گرفتار کیا گیا۔ گاندھی کی درخواست پر انہوں نے شراب نوشی کے خلاف مہم بھی چلائی، جس کی وجہ سے انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک ماہ کی قید کی سزا سنائی گئی۔ وقت کے ساتھ، پیریار ریاستی کانگریس کے ایک اہم رہنما کے طور پر ابھرے اور تمل ناڈو کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوگئے۔ پیریار پورے جوش و جذبے کے ساتھ کانگریس کے لیے کام کر رہے تھے، لیکن انہیں جلد ہی اس حقیقت کا احساس ہوا کہ صوبائی کانگریس میں اعلیٰ ذاتوں کی لابی انتہائی مضبوط ہے۔ تروپور میں منعقد ہونے والی کانگریس کی صوبائی کانفرنس میں، پیریار نے ایک قرارداد پیش کی، جس میں اچھوتوں کو مندروں میں داخل ہونے اور عبادت کرنے کی اجازت دینے کی حمایت کی گئی۔ اچھوتوں کو عبادت گاہوں میں داخلے کا حق دینے کا مطالبہ اعلیٰ ذات کے رہنماؤں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ پیریار کی قرارداد کی شدید مخالفت کی گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب پیریار کو اندازہ ہوا کہ جس مقصد کے لیے وہ صوبائی کانگریس میں شامل ہوئے تھے، اِسے اس پلیٹ فارم سے حاصل کرنا مشکل ہے۔

”

پیریار کی قیادت میں چلنے والی عزت نفس کی تحریک کو یاد کرنا انتہائی ضروری ہوگیا ہے۔ اس تحریک کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ ہندوستانی قومیت کو تنقیدی نگاہ سے سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ سماجی اصلاحات کے بغیر سیاسی آزادی بے معنیٰ ہے۔ پیریار اور عزت نفس کی تحریک کے ساتھیوں نے اپنا موقف واضح طور پر پیش کیا کہ جب تک سماج میں چھوت چھات، ذات پات پر مبنی عدم مساوات اور اعلیٰ ذات کی بالادستی ختم نہیں ہوتی، اور جب تک سماج میں سب کو مساوی حقوق نہیں ملتے، تب تک محکوم طبقوں کے لیے سیاسی آزادی کا کوئی حقیقی مطلب نہیں ہوگا۔

دریں اثنا، صوبے میں جسٹس پارٹی کی حکومت نے سماجی انصاف سے متعلق بعض اہم فیصلے کیے، جن کی پیریار نے، جو اُس وقت کانگریس کے رکن تھے، بھرپور حمایت کی۔ ۱۹۲۱ء میں پاناگل کے راجہ کی قیادت میں جسٹس پارٹی کی حکومت نے مدراس ریاستی قانون ساز کونسل میں ایک بل پیش کیا، جس کے تحت ہندو مذہبی انڈومنٹ بورڈ کی تشکیل کا منصوبہ بنایا گیا۔ اس بورڈ کے ذریعے حکومت مندروں کے انتظامات کو بہتر بنانے اور بدعنوانی کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پیریار نے جسٹس پارٹی کے اس فیصلے کی بھرپور تعریف کی، خاص طور پر تعلیم اور ملازمت کے شعبے میں محکوم طبقات کے لیے ریزرویشن کی پالیسی کے نفاذ کو سراہا۔ پیریار نے کانگریس کے اندر بھی پسماندہ ذاتوں، دلتوں اور دیگر محکوم طبقات کے لیے ریزرویشن کے حق میں قرارداد پیش کی، لیکن اعلیٰ ذات کے رہنماؤں نے ان کی سخت مخالفت کی۔ تاہم، پیریار اپنی پوزیشن پر قائم رہے۔ ۱۹۲۴ء میں سالم میں منعقدہ جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے، پیریار نے واضح الفاظ میں کہا کہ جب تک مظلوم طبقات کو ریزرویشن نہیں ملتا، معاشرے میں مساوات ممکن نہیں ہوسکتی۔ جب پیریار کو یہ یقین ہوگیا کہ کانگریس کے اعلیٰ ذات کے رہنما سماجی انصاف کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں، تو انہوں نے اپنا الگ راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ، ۱۹۲۵ء میں پیریار نے اپنے حامیوں کے ساتھ مل کر ایک نئی غیر سیاسی تنظیم قائم کی، جس کا نام عزت نفس کی تحریک رکھا گیا۔ پیریار نے اپنی تنظیم کی باتیں عوام تک پہنچانے کے لیے کئی رسائل کی اشاعت کا آغاز کیا، جن میں تمل ہفت روزہ 'کڑی آرسو' اور انگریزی جریدہ 'ریولٹ' شامل تھے۔ سیاست میں درپیش چیلنجوں کے علاوہ، ذات پات کی بنیاد پر امتیازی سلوک جو پیریار نے اپنی ذاتی زندگی میں محسوس کیا، وہ بھی عزت نفس کی تحریک کے قیام کا ایک اہم سبب تھا۔

۱۷ ستمبر ۱۰۷۹ کو پیریار کی ولادت مدراس پریذیڈنسی کے شہر ایروڈ میں ہوئی۔ پیریار کے والد وینکٹا نائکر ایک مشہور تاجر تھے، اور ان کی والدہ، چنہ تھایمل عرف مٹھمل، ایک عقیدت مند خاتون تھیں۔ بچپن میں پیریار نے اپنے گھر میں بہت زیادہ پوجا پاٹ اور مذہبی رسوم دیکھی تھیں۔ لیکن شروعات ہی سے وہ ان رسوم پر سوال اٹھاتے تھے، جو ان کے خیال میں عقل و دلائل کی روشنی میں صحیح نہیں لگتے تھے۔ جب ان کا اسکول میں داخلہ ہوا، تو وہاں انہوں نے دیکھا کہ استاذ جو اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتے تھے، پسماندہ ذاتوں کے بچوں کے ساتھ تعصب کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسکول میں ذات پات کی بنیاد پر بچوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا تھا، اور نچلی ذات اور مسلمان بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ پیریار میں بچپن سے ہی انقلابی خیالات جنم لے چکے تھے، چنانچہ انہوں نے پسماندہ ذاتوں اور مسلمانوں کے ساتھ کھانا کھایا اور ان کے ساتھ وقت گزارا۔ اس بغاوت کے باعث انہیں معاشرتی ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ ذات پات کی غیر برابری کو نہ ماننے کی وجہ سے پیریار کو اسکول کی تعلیم جاری رکھنے سے روک دیا گیا، اور ۱۲ سال کی عمر سے پہلے ہی ان کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوگیا، جس کے بعد وہ اپنے والد کی تجارت سے منسلک ہو گئے۔ تاہم، کچھ سال بعد، ۱۹۰۴ میں انہوں نے اپنا خاندان چھوڑ کر کاشی کا رخ کیا۔ کاشی میں ان کے ساتھ ذات پات پر مبنی غیر انسانی رویہ اختیار کیا گیا، جہاں انہیں ایک مہمان خانے میں کھانا صرف اس لیے نہیں دیا گیا کیونکہ ان کا تعلق اعلیٰ ذات سے نہیں تھا۔ جب ان سے بھوک برداشت نہیں ہوئی، تو انہوں نے بچا ہوا جھوٹا کھانا کھایا۔ اسی دوران پیریار نے دیکھا کہ جس مہمان خانے سے انہیں نکالا گیا، وہ تامل ناڈو کے ایک تاجر کے پیسوں سے بنا تھا۔ کاشی کے تلخ تجربات اور سماج میں ذات پات کی بنیاد پر ہونے والی ناانصافیوں نے پیریار کو گہرائی سے متاثر کیا۔ انہوں نے کچھ ایسی ہی سماجی عدم مساوات مین اسٹریم سیاسی پارٹیوں میں بھی دیکھی، جس کے بعد انہوں نے عزت نفس کی تحریک کی بنیاد رکھی۔■

(مضمون نگار تاریخ کے اسکالر ہیں)

debatingissues@gmail.com

دعوت کی خصوصی پیش کش

مسلمان پھر آر ایس ایس اور بی جے پی کے نشانے پر

”آرگنائزر“ اور ”پنچ جنیہ“ مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنے میں مصروف

ابھے کمار

بی جے پی اور آر ایس ایس شہریت ترمیمی قانون (سی اے اے) کے خلاف ملک گیر تحریک کو بدنام کرنے کے لیے فرقہ وارنہ رنگ دینے کی کوششیں کر رہی ہیں۔ اس سازش کے تحت مسلمانوں کے خلاف جھوٹ اور نفرت پھیلائی جا رہی ہے۔ سچ کو جھٹلانے اور حقیقت کو دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو ملک اور اکثریتی ہندو فرقے کا دشمن بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ ملک کے تئیں اُن کی محبت اور وفاداری پر سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔ ان کے خلاف ملک مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کا بے بنیاد الزام عائد کیا جا رہا ہے اور ان کی ذہنیت کو ”جہادی“ کہہ کر گالی دی جا رہی ہے۔ آر ایس ایس کے ترجمان میگزین کے حالیہ کچھ شمارے ان پروپیگنڈوں اور نفرت انگیز مواد سے بھرے پڑے ہیں۔

آر ایس ایس اور بی جے پی کا ترجمان ہفت روزہ میگزین ”آرگنائزر“ (انگریزی) اور ”پنچ جنیہ“ (ہندی) مسلسل دو شمارے (۲ اور ۹ فروری) صرف سی اے اے مخالف احتجاج پر محیط تھے۔ جن کا اصل مقصد مسلمانوں کو نشانہ اور پورے ماحول کو کشیدہ بنانا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ دہلی اسمبلی انتخابات بھی تھے، جہاں بی جے پی اپنے حریف سے کافی پیچھے نظر آ رہی ہے۔ کمیونل کارڈ کھیلنا ہی بی جے پی کے لیے امید کی آخری کرن تھی۔ حالاں کہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس طرح کے پروپیگنڈوں نے ان کو کتنا فائدہ پہنچایا، مگر آر ایس ایس اور بی جے پی کے ترجمان میگزین نے فرقہ وارانہ زہر پر مشتمل مواد پیش کر کے صحافتی اصولوں اور قدروں کو حد سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔

مثال کے طور پر ۲ فروری کے شمارے میں ”آرگنائزر“ کی رپورٹوں اور اداریوں میں شہریت قانون کے خلاف چل رہے احتجاج کو صرف (شدت پسند) مسلمانوں کی طرف منسوب کر کے پیش کیا گیا ہے اور اسے دوسری ”خلافت“ قرار دیا ہے۔ ”آرگنائزر“ نے سی اے اے تحریک کو بدنام کرنے کے لیے اسے ”مسلم شدت پسندی“ اور ”ہندوؤں کے خلاف مظالم“ سے جوڑا ہے۔ دوسرے الفاظ میں آر ایس ایس کا یہ ترجمان ہندوؤں میں ”خوف“ پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ملک کے اکثریتی فرقے سے یہ کہہ رہا ہے کہ سی اے اے مخالف تحریک کے پیچھے ملک اور ہندو مخالف ایجنڈا کار فرما ہے۔ آر ایس ایس اور بی جے پی کے ترجمان رسالے ہندوؤں کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ جھوٹ پھیلا رہے ہیں کہ جس طرح مسلمانوں نے انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خلافت تحریک کے دوران ہندوؤں پر ظلم کیے تھے اور جبراً اُن کا مذہب تبدیل کروا کے مسلمان بنایا تھا، آج مسلم شدت پسند مذکورہ قانون کی مخالفت کے بہانے اپنی اسی منصوبے کو دہرا رہے ہیں۔

جبکہ سچائی یہ ہے کہ خلافت تحریک اور سی اے اے مخالف احتجاج میں کوئی مماثلت نہیں ہے یہ سراسر ایک بے بنیاد پروپیگنڈہ اور غلط بیانی ہے۔ خلافت تحریک جنگ آزادی کے دوران شروع ہوئی تھی، جس میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں نے شرکت کی تھی۔ اس تحریک میں گاندھی جی کے ساتھ ساتھ مسلم دانشور اور علماء بھی شامل تھے۔ اس میں کانگریس بھی شریک تھی اور پوری تحریک کا مقصد برطانوی حکومت کی مخالفت تھا۔ نامور مورخ وپین چندرا کے مطابق ”خلافت تحریک اور عدم تعاون تحریک (۱۹۲۲-۱۹۱۹)“ نے قومی تحریک میں ایک نئی لہر پیدا کر دی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب بڑی تعداد میں ہندو اور مسلمان لیڈران ایک پلیٹ فارم پر آئے۔ اس تحریک کی شروعات اس وقت ہوتی ہے جب سال ۱۹۱۹ میں دہلی میں کل ہند خلافت کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس وقت یہ کہا گیا تھا کہ اگر برطانوی سرکار نے اُن کے مطالبات کو نہ مانا تو وہ سرکار کے ساتھ اپنا تعاون بند کر دیں گے۔ خلافت تحریک میں علی برادران، مولانا آزاد، حکیم اجمل خان اور حسرت موہانی جیسے سرکردہ مجاہدینِ آزادی شامل تھے۔

گاندھی جی نے خلافت تحریک میں نمایاں رول ادا کیا تھا اور اس تحریک کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ساتھ لانے کی کوشش کی تھی۔ ممتاز مورخ سُمت سرکار نے خلافت تحریک کے تین اہم مطالبات درج کیے ہیں۔ پہلا یہ کہ ترکی کے سلطان یعنی ”خلیفہ“ کے اختیار میں مسلمانوں کے مقدس مقامات رہنے چاہئیں۔ دوسرا یہ کہ خلیفہ کے پاس وہ تمام علاقے ہونے چاہئیں جس سے کہ وہ دین اسلام کی حفاظت کر سکیں۔ تیسرا یہ کہ جزیرۃ العرب، جیسے سعودی عرب، سیریا، فلسطین اور عراق مسلمانوں کے زیرِ اقتدار رہنے چاہئیں۔

خیال رہے کہ خلافت تحریک ہندوستانی تاریخ میں کافی اہم اور متنازعہ باب رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک گروپ اسے ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے طور پر یاد کرتا ہے تو دوسرا گروپ یہ کہتے ہوئے اسے خارج کرتا ہے کہ اس دوران مذہبی شناخت کا استعمال سیاسی فائدے کے لیے کیا گیا۔ خود شرجیل نے اپنی وائرل ہوئی تقریر میں یہ سوال اٹھایا ہے کہ مذکورہ تحریک کو ”خلافت“ کا نام دینا مناسب نہیں تھا، کیونکہ سنی مسلمانوں میں جب یہ عقیدہ ہے کہ چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ کے بعد خلافت کا سلسلہ ختم ہو گیا تو پھر ترکی کے سلطان کو خلیفہ اور ان کی حکومت کو خلافت کیسے کہا جا سکتا ہے۔ بات جہاں تک خلافت تحریک کے دوران ہندوؤں کے خلاف حملوں کی ہے اور زبردستی ان کا مذہب تبدیل کرانے کی ہے تو یہ معاملہ بھی کافی متنازع ہے۔ مگر آر ایس ایس اور بی جے پی کو ان پیچیدگیوں سے کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ اس کا اصل مقصد تو ہندوؤں کو اس بات سے ڈرانا ہے کہ خلافت تحریک کے دوران مسلمان اسلام کے لیے متحد ہوئے تھے جو کہ حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے والی سازش ہے۔

تاریخی حقائق کو مسخ کرتے ہوئے آرگنائزر کے مدیر پربھُل کیتنکر (۲ فروری) ”نہ جمہوری اور نہ پر امن“ کے عنوان سے ایک اداریہ لکھتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خلافت تحریک کے بعد کیرلا کے موپلا مسلمانوں نے ہندوؤں کو مارا پیٹا اور طرح طرح کے ظلم کیے اور ایک لاکھ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا۔ آرگنائزر کے مدیر ہندوؤں پر ہوئے حملے کو جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں اس طرح کی بات تاریخ کی مستند کتابوں میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ مورخ سمت سرکار کے مطابق خلافت تحریک اور عدم تعاون تحریک کے بعد ہندوستان میں فرقہ پرستی کے خطرے سامنے آنے لگے تھے اور ہندو مسلم فسادات ہر طرف رونما ہونے لگے تھے۔ البتہ یہ حملے صرف ہندوؤں کے خلاف نہیں تھے بلکہ بہت سارے علاقوں میں مسلمانوں کو بھی نشانہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر سرحدی ریاستوں میں ہندوؤں پر حملے ہوئے۔ یہ فسادات کلکتہ، ڈھاکہ، پٹنہ اورر اولپنڈی میں بھڑکے تھے۔ مگر ان فسادات کے پیچھے اصل وجہ مسلمان اور ان کا مذہب نہیں تھا جیسا کہ آر ایس ایس اور بی جے پی ہمیں بتلاتی رہتی ہے، تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کا مقصد انتخابات میں فائدہ حاصل کرنا اور زمینی سطح پر سماجی اور اقتصادی امور کو سیاسی مفاد کے لیے فرقہ وارانہ وارانہ رنگ دے کر اصل مسئلے سے عوام کے ذہن کو بھٹکانا ہے۔ اس دوران ہندو فرقہ پرستی بھی پروان چڑھ کر سامنے آتی ہے۔ مسلمانوں پر لگے الزام کے علی الرغم آریہ سماج مسلمانوں کو زبردستی ہندو بنانے میں ملوث پایا گیا۔ چنانچہ ”شُدھی“ تحریک کے تحت اتر پردیش اور ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں پر ہندو بننے کے لیے دباؤ ڈالا جانے لگا۔ ہندو مہاسبھا ماحول کو بگاڑنے میں آگے تھی۔ آر ایس ایس کا چہرہ بھی سامنے آ چکا تھا۔ خود کانگریس کے بڑے بڑے لیڈران ’کمیونل کارڈ‘ کھیلنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ’گئو رکشا‘ کے نام پر شدت پسندی کو فروغ دیا گیا۔ ان حالات کو سامنے رکھ کر موجودہ دور کی فرقہ پرستی کو سمجھنے کے لیے وسیع تناظر میں ان تمام چیزوں کو دیکھنا ہوگا۔ مگر آر ایس ایس اور بی جے پی کا مقصد سچائیوں کو چھپا کر بے بنیاد اور جھوٹے حوالوں کے ذریعے سیاسی فائدہ حاصل کرنا ہے۔ سی اے اے مخالف تحریک کو دوسری "خلافت" کا نام دے کر آرگنائزر میگزین کے ۲ فروری والے شمارے میں "خلافت-۲" کے عنوان سے پرشانت ویدیہ راجا لکھتے ہیں کہ گزشتہ دنوں میں کیرالا کے ایک مسلمان نے ہندو دلتوں کو پانی سپلائی کرنے سے اس لیے انکار کر دیا کیونکہ وہ (ہندو) مسلمانوں کے بر عکس سی اے اے کی حمایت کر رہے تھے۔ "مالا پورم کے ہندوؤں کو پانی کی سپلائی مسلمانوں نے بند کر دی۔ مالا پورم مسلم اکثریت والا ضلع ہے جہاں ۷۲ فی صد آبادی اسلام کو اپنا دین مانتی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں ۱۹۲۱ میں دنگے پیش آئے تھے۔ یہاں کے مسلمان اس وقت خلافت کی حمایت کرتے تھے، جنہوں نے دس ہزار سے زیادہ ہندوؤں کو ہلاک کر ڈالا۔ تقریباً ایک صدی بعد مالا پورم کے مسلمان اسی خلافت کے دور میں لوٹ رہے ہیں اور اپنے جنوں کا اظہار ہندوؤں کو نشانہ بنا کر کر رہے ہیں۔ اسی جنوں کے تحت ۲۲ جنوری کے روز یہ دیکھنے کو ملا کہ پانی کی سپلائی اقلیت ہندوؤں کی کالونی میں روک دی گئی۔ مالا پورم کے کوٹی پورم کے (ہندو) باشندوں کو مسلمانوں کے ظلم کا شکار ہونا پڑا۔ جب سی اے اے کے خلاف مظاہرہ تیز ہو گیا اور ہندوؤں نے اس قانون کی مخالفت میں جانے سے انکار کر دیا تو ان کے لیے پانی کی سپلائی منقطع کر دی گئی"۔

”ہندو“ اخبار نے مقامی حکام کے حوالے سے کہا کہ پانی کی سپلائی روکے جانے کا کوئی تعلق سی اے اے احتجاج سے نہیں تھا، بلکہ سپلائی تکنیکی وجہ سے روکی گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق اس معاملے پر فرقہ وارانہ سیاست بھگوا طاقتوں نے کھیلنی شروع کی۔ سنگھ پریوار نے اس مسئلے کو سی اے اے سے جوڑ دیا۔ پھر بی جے پی نے یہ الزام لگایا کہ دلت ہندوؤں کو مسلمانوں نے پانی سپلائی کرنا بند کر دیا کیونکہ انہوں نے بی جے پی کے سی اے اے حمایتی جلسے میں شرکت کی تھی۔

یہ خبر کتنی سچی ہے؟ انگریزی کے مشہور اخبار "ہندو" (۲۴ جنوری) کی رپورٹ سی اے اے حمایت کی وجہ سے ہندوؤں کو پانی سپلائی نہ کرنے کی بات کو خارج کرتی ہے۔ ”ہندو“ اخبار نے مقامی حکام کے حوالے سے کہا کہ پانی کی سپلائی روکے جانے کا کوئی تعلق سی اے اے احتجاج سے نہیں تھا بلکہ سپلائی تکنیکی وجہ سے روکی گئی تھی۔ رپورٹ کے مطابق اس معاملے پر فرقہ ورانہ سیاست بھگوا طاقتوں نے کھیلنی شروع کی۔ سنگھ پریوار نے اس مسئلے کو سی اے اے سے جوڑ دیا پھر بی جے پی نے یہ الزام لگایا کہ دلت ہندوؤں کو مسلمانوں نے پانی سپلائی کرنا بند کر دیا ہے کیوں کہ انہوں نے بی جے پی کی سی اے اے حمایتی جلسے میں شرکت کی تھی۔ تب ماحول اور بھی فرقہ وارانہ ہو گیا جب بی جے پی کے ایک ممبر پارلیمنٹ نے ٹویٹ کیا اور کہا کہ مالا پورم پاکستان بننے کی راہ پر گامزن ہے!

ایک اور بات غور کرنے کی ہے کہ ملک میں مسلمان مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے اختلافات اُن کے پڑوسیوں سے بعض باتوں کی وجہ سے ہو سکتے ہیں۔ بعض مواقع پر اُن سے غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ مگر آر ایس ایس اور بی جے پی جیسی فرقہ پرست طاقتیں اس بات کی تاک میں رہتی ہیں کہ کسی بھی ہندو اور مسلمان کے ذاتی اور مقامی مسئلے کو ملک گیر اور ہندو بنام مسلم بنا کر پیش کیا جائے تا کہ وہ اس پر سیاسی روٹیاں سینک سکے۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے ہندو اور مسلمان کے ذاتی مسئلے کو ہم فرقہ پرستی نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس کا دائرہ کافی محدود ہے اور یہ چند لوگوں کو ہی متاثر کرتی ہے۔ آر ایس ایس اور بی جے پی اس فرق کو مٹا دینے کی کوشش کرتی رہی ہے اور دو لوگوں کے باہمی مسئلے کو دو فرقوں کے مسئلے کے طور پر پیش کرتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرقہ ورانہ سیاست کی شروعات مورخین دو صدی پرانا مسئلہ بتلاتے ہیں کیونکہ ۱۹ ویں صدی کے بعد سے ہندو مسلم جھگڑے کو مقامی سطح تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اسے قومی سیاست کا حصہ بنا دیا گیا۔ کچھ ایسی ہی تخریب کاری آر ایس ایس بی جے پی کیرالا میں بھی کرتی نظر آ رہی ہیں۔

یہی نہیں آرگنائزر کی رپورٹوں میں یہ دعویٰ بھی کیا جا رہا ہے کہ سی اے اے مخالف احتجاج میں مسلمان ”جناح کی حمایت“ میں اور ”کافروں کی مخالفت“ میں نعرے لگا رہے ہیں۔ یہ دعویٰ بھی کمزور نظر آتا ہے۔ الزام لگایا گیا ہے کہ ۱۰ جنوری کو شاہین باغ میں گاندھی، نہرو، بھگت سنگھ، اشفاق اور جناح حمایتی نعرے لگے۔ ذرا سوچیے کہ کیا کسی بھی انسان کے لیے یہ آسان ہے کہ وہ گاندھی، نہرو کی حمایت میں بھی نعرے لگائے اور اسی سانس میں ”جناح زندہ باد“ بھی بولے؟

یہ بات پہلے بھی دہرائی جا چکی ہے کہ فرقہ پرست طاقتیں اس بات میں زیادہ دلچسپی نہیں رکھتیں کہ آخر مظاہرین چاہتے کیا ہیں۔ وہ یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کرتیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ملک کی بہت بڑی آبادی، بالخصوص خواتین، مہینوں بھر سے سڑکوں پر بیٹھی ہوئی ہیں؟ آخر کیوں پولیس کی لاٹھی اور گولی اُن کے جذبے کو ختم نہیں کر پا رہی ہیں؟ آخر کیوں شاہین باغ سے نکلی چنگاری پورے ملک میں پھیل گئی ہے اور سی اے اے جیسے کالے قانون سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے؟

یہ آر ایس ایس اور بی جے پی کی ہٹ دھرمی نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ اس نے مظاہرین کی باتوں کو سننے اور اس پر غور نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے؟ وہ زمینی حقیقت کو کب تلک جھٹلائے گی؟ سرکار کے خلاف عوام کا غصہ بڑھ رہا ہے اور سی اے اے کے خلاف نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو اور دیگر مذہبی فرقے بھی ناراض ہیں۔ دلتوں میں بھی اس قانون کی وجہ سے ناراضگی پائی جاتی ہے کیونکہ جس کے پاس زمین اور مکان نہیں ہیں وہ کاغذات کہاں سے لائیں گے اور اپنی شہریت کیسے ثابت کر پائیں گے؟ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ شہریت ثابت کرنے اور حاصل کرنے کا تعلق جائیداد سے ہے۔ جو محکوم اور غریب ہیں انہیں شہریت ثابت کرنا بڑا مشکل امر ہے۔

آر ایس ایس اور بی جے پی حکومت ان حقائق سے بخوبی باخبر ہے۔ مگر وہ اسے تسلیم نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے اپنی ہندتوا آئیڈیالوجی کے تحت سی اے اے کی بنیاد مذہب کو بنا رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عوام کے احتجاج کو بدنام کرنے کے لیے اور لوگوں میں سی اے اے مخالف احتجاج کے خلاف ”خوف“ پیدا کرنے کے لیے وہ یہ افواہیں پھیلا رہی ہے کہ ان مظاہروں کا مقصد آئین بچانا نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد ”ملک کو توڑنا“ ہے۔ اسی پروپیگنڈے کے تحت آر ایس ایس اور بی جے پی مسلسل یہ جھوٹ پھیلا رہی ہے کہ ان احتجاج میں ”اسلام“ اور ”جناح حمایتی“ نعرے لگ رہے ہیں اور ہندوؤں کو ”کافر“ کہہ کر گالی دی جا رہی ہے!

دعوت کی خصوصی پیش کش

سب سے قابل اعتراض بات مظاہرین کو یہ لگی کہ وہ برقع پہن کر اپنی تشخص کو چھپا کر وہاں پہنچی۔ اگر وہ پکڑی نہ جاتی اور خود ہی اسلام/پاکستان/جناح حمایتی اور ملک اور ہندو مخالف نعرے لگاتی، تو اگلے دن اخبارات کی سرخی بنتی اور ویڈیو وائرل ہوتا کہ برقع پہنی ہوئی مسلم خواتین نے شاہین باغ میں اسلامی شدت پسندی کا مظاہرہ کیا۔

یہ بات چُھپی ہوئی نہیں ہے کہ سی اے اے کو لا کر بی جے پی حکومت بری طرح سے پھنس چکی ہے۔ اس کی مشکلیں ختم ہونے کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اس کالے قانون کو واپس لے لے۔ مگر اس کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔ وہ اب بھی پوری کوشش کر رہی ہے کہ اس قانون پر ہندو اور مسلمان کو تقسیم کر دیا جائے اور احتجاجوں کو بدنام کر کے ختم کرا دیا جائے۔ اس کو یہ نظر نہیں آتا کہ پورا آسام سی اے اے کے خلاف سڑکوں پر اُتر آیا ہے۔ جنوبی، شمالی اور مغربی بھارت سی اے اے مخالف تحریک میں شامل ہو گیا ہے۔ دلتوں سمیت لاکھوں عوام جن میں خاص طور پر خواتین شامل ہیں گھروں سے باہر مُٹھی تانے نکل پڑے ہیں؟ بین الاقوامی سطح پر بھارت کی مذمت ہو رہی ہے؟ خارجہ پالیسی کے ماہرین یہ چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ یہ قانون بھارت کو بین الاقوامی سطح پر الگ تھلگ کر سکتا ہے۔ ماہرین آئین یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ قانون ہندوستانی آئین کے بنیادی ستون سیکولرازم کے خلاف ہے۔ جن سیاسی جماعتوں نے شہریت ترمیمی بل کو پاس کرنے میں بی جے پی کا ساتھ دیا تھا انہوں نے بعد میں بی جے پی سے خود کو الگ کر لیا ہے اور سی اے اے سے متعلق اپنے اعتراضات ظاہر کر دیے ہیں۔ خود بی جے پی کی معاون جماعت جنتا دل (یو) میں اس کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور پرشانت کشور اور پون ورما جیسے سینئر لیڈروں کو سی اے اے کے خلاف کھل کر بیان دینے کے پر پارٹی سے نکال دیا گیا ہے۔ خود شرومنی اکالی دل، جو بی جے پی کی قدیم معاون جماعت ہے، اس نے سی اے اے میں مسلمانوں کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

آر ایس ایس اور بی جے پی ان سوالوں سے بھاگ رہی ہے۔ اُسے اس بات کا خوف ہے کہ وہ مذکورہ قانون کا جواز پیش کرنے میں کامیاب نہیں ہو پائے گی کیونکہ یہ قانون مذہب کی بنیاد پر شہریت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی غلطی سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے وہ مسلسل کمیونل کارڈ اور طاقت کا استعمال کر رہی ہے۔ آر ایس ایس کی اسی سازش کے تحت مسلمانوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اُن کی تحریک کو بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اُن کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ اُن کو ملک اور ہندوؤں کے لیے خطرہ بتلا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ لاٹھی اور گولی سے ان پر حملے کیے جا رہے ہیں اور پروپگنڈے کا سہارا لے کر ان کی شبیہ خراب کی جا رہی ہے۔

اسی حکمت عملی کے تحت یہ کہا جا رہا ہے کہ سی اے اے مخالف مظاہروں میں "جناح حمایتی" اور "کافر مخالف" نعرے لگائے گئے ہیں۔ مگر یہ کیسے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا کہ ایسے نعرے اگر لگے بھی ہو تو اسے مسلمانوں نے ہی لگایا ہے؟ آخر جناح حمایتی یا پاکستان حمایتی یا ہندو مخالف نعروں سے کس کو سیاسی فائدہ ملتا ہے؟ جناح حمایتی یا پاکستان حمایتی نعروں سے مسلمانوں کو فائدہ ملتا ہے یا پھر اُن کی سیاسی دکان چمکنے لگ جاتی ہے جن کا دن رات یہی دھندا ہے کہ وہ ملک کے اقلیتوں کو دیش کا "غدار" اور پاکستان کا "ایجنٹ" ثابت کریں! کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ نعرے اگر وہ لگے ہوں تو اس کے پیچھے انہی کا ہاتھ ہو جن کی پوری سیاست مسلمانوں کے خلاف ہے؟

اب آپ گنجا کپور کا حالیہ واقعہ دیکھ لیجیے۔ وہ ایک صحافی ہیں اور یوٹیوب پر حالات حاضرہ پر پروگرام بنا کر ڈالتی ہیں۔ اُن کے چینل کے سبسکرائبر میں خود وزیر اعظم نریندر مودی شامل ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ گنجا کپور بھگوا سیاست سے کس قدر قریب ہیں۔ اُن کے پروگرام اکثر آر ایس ایس اور بی جے پی کے موقف کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اس وقت بڑی خبر بنیں جب انہیں پولیس نے ۵ فروری کے روز دہلی کے شاہین باغ سے پکڑا اور ہجوم سے باہر نکالا۔ محترمہ برقع پہن کر شاہین باغ جا پہنچی تھیں اور مظاہرین خواتین کے مابین بیٹھ کے خفیہ طریقے سے پورے واقعے کا ویڈیو بنا رہی تھیں۔ مگر لوگوں کو ان پر شک ہو گیا اور ان کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا، مگر پولیس بیچ میں آکر وہاں سے انہیں باہر نکال لے گئی۔ اگر گنجا کپور بحیثیت صحافی شاہین باغ کی رپورٹنگ کرنا چاہتی تھیں تو اُن کو کوئی نہیں روک رہا تھا۔ اُن کو کوئی اس بات کے لیے بھی نہیں روک سکتا تھا اگر وہ اس معاملے کو بی جے پی کے نقطہ نظر سے پیش کرتیں۔ مگر سب سے قابل اعتراض بات مظاہرین کے نزدیک یہ تھی کہ وہ برقع پہن کر اپنی تشخص کو چھُپا کر وہاں پہنچیں۔ اگر وہ پکڑی نہ جاتی اور خود ہی اسلام/پاکستان/جناح حمایتی اور ملک اور ہندو مخالف نعرے لگاتیں تو اگلے دن یہ اخبارات کی سب سے سرخی بنتی اور ویڈیو وائرل ہوتا کہ برقع پہنی ہوئی مسلم خواتین نے شاہین باغ میں اسلامی شدت پسندی کا مظاہرہ کیا!

"آرگنائزر" نے یہ بھی الزام لگایا ہے کہ سی اے اے مخالف احتجاج کا کوئی تعلق آئین اور برابری سے نہیں ہے۔ اس کا اصل مقصد اسلامی تشخص کو اُبھارنا اور اسے مضبوط کرنا ہے۔ خود پولیس کی زیادتی کو فراموش کر دیا گیا ہے اور الٹا مظاہرین پر یہ الزام تھوپا جا رہا ہے کہ وہ تشدد کی راہ پر چل رہے ہیں جو قومی مالیات کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ "آرگنائزر" نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ کے اوپر اُلٹا پولیس کے خلاف تشدد کرنے کا الزام لگایا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پولیس نے جامعہ میں زیادتی اور بربریت کی ساری حدیں پار کر دی تھیں۔ مسلمانوں کو "شدت پسند" اور "جہادی" کہا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ آر ایس ایس اور بی جے پی کی حریف پارٹیوں (جیسے ممتا بنرجی کی ترینمول کانگریس، لیفٹ اور آل انڈیا کانگریس آئی) کو بھی نشانہ بنایا جا رہا ہے اور ان پر اور بھی ملک مخالف کارروائیاں کرنے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جس سی اے اے/این آر سی/این پی آر سے سب سے زیادہ خطرہ غریب دلتوں کو ہے انہی کے نام پر سی اے اے کو درست قرار دیا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ اس سے دلت پناہ گزینوں کو شہریت ملے گی۔ اس سے پہلے کے شمارے میں "آرگنائزر" اس طرح کے مضامین شائع کر چکا ہے جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ امبیڈکر اگر آج زندہ ہوتے تو سی اے اے کو دیکھ کر سب سے زیادہ خوش ہوتے۔

"آرگنائزر" کے ایک اور مضمون "ڈھال کی طرح خواتین کا استعمال" (۲ فروری) میں خواتین مظاہرین پر قابل اعتراض تبصرے کیے گئے ہیں اور اس میں اُن کی شبیہ مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ مصنفہ خود ایک خاتون ہیں اور خود کو خواتین کے حقوق کا پیروکار بھی بتلاتی ہیں، مگر ان کو یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوئی کہ خواتین مظاہرین غلط فہمی کا شکار ہیں اور اُن کا "استعمال" کانگریس اور لیفٹ پارٹیاں کر رہی ہیں۔ اُن کی تحریر کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک خواتین مظاہرین "نادان" ہیں اور ان کو بی جے پی کی حریف سیاسی جماعتیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر رہی ہیں۔ یہی نہیں وہ یہ بھی بے بنیاد الزام لگاتی ہیں کہ ان مظاہروں میں دہشت گرد تنظیم آئی ایس آئی حمایتی نعرے بھی لگ رہے ہیں! مصنفہ اتنا زہر اُگل کر ہی خاموش نہیں رہیں بلکہ انہوں نے بعض مسلم خواتین صحافیوں پر بھی نازیبا تبصرہ کیا اور کہا کہ وہ خود تو سج دھج کر اپنے بدن کی نمائش کرتی ہیں مگر جب بات تین طلاق کو ختم کرنے کی آتی ہے تو وہ اس کی مخالفت کرتی ہیں!

یہی نہیں وہ بغیر کسی سیاق کے یہ بھی الزام لگاتی ہیں کہ مدرسوں میں استاد طلبہ کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ ذرا آپ ہی سوچیے سی اے اے کی تائید میں اگر مصنفہ کو مضمون لکھنا ہی تھا تو اُن کو اس کے حق میں مضبوط دلیل پیش کرنا چاہیے تھا مگر ایسا وہ کچھ بھی کرتی نظر نہیں آتیں بلکہ اُن کی پوری کی پوری توانائی مسلمانوں کے خلاف گندے تبصرے کرنے میں ختم جاتی ہے۔ جہاں ایک طرف سی اے اے مخالف تحریک کو خلافت کی واپسی کہا جا رہا ہے وہیں ایسے بھی مضامین شائع ہوئے ہیں جن میں ان کے تار مسلم دنیا سے بھی جوڑے گئے ہیں اور دعویٰ کیا گیا ہے کہ "بہار عرب" کے طرز پر ہندوستان میں بھی اسلامک عناصر سرگرم ہیں۔ پتھی کریت پاین کا مضمون (۲ فروری کے شمارے میں) "آرگنائزر" اور "پنچہ جنیہ" دونوں میں ایک ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ شاہین باغ اور اس طرح کے سی اے اے مخالف احتجاج کے مراکز ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ ہیں، جو اسلامی شدت پسند نظریے سے متاثر ہیں جیسا کہ عرب ممالک میں دیکھنے کو ملا تھا۔ "بھارت میں 'عرب سپرنگ' کے طرز پر پردے کے پیچھے سازش کرنے والے عناصر نریندر مودی سرکار کے خلاف عوامی جذبے کو بھڑکا کر ملک میں بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس کے تحت شاہین باغ میں اشتعال انگیز بیانات دیے جا رہے ہیں تاکہ سازش کرنے والے عناصر کے لیے ملک میں مسلح بغاوت کا راستہ صاف ہو جائے" یہی نہیں بلکہ یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ "شہریت ترمیمی قانون کی مخالفت کے نام پر ملک بھر میں پھیلی بدامنی اور خلیجی ملکوں میں ہوئے سلسلہ وار احتجاجی مظاہروں میں بہت حد تک مماثلت دیکھی جا رہی ہے"

کیا سیڈیشن جیسے سنگین دفعہ کا ہر چھوٹی موٹی باتوں کے لیے بے جا استعمال نہیں کیا گیا ہے؟

چاہیے تو یہ تھا کہ مصنف سخت کارروائی کے بجائے سرکار سے یہ مطالبہ کرتیں کہ وہ مظاہرین سے مکالمہ شروع کرے اور اس تعطل کو ختم کرنے کے لیے راستہ تلاش کرے۔ مگر افسوس کی بات کہ مصنف آر ایس ایس اور بی جے پی کے ایجنڈے سے متاثر ہو کر سی اے اے جیسی عوامی تحریک کو پہلے مسلمانوں سے جوڑتی ہیں۔ اور پھر مسلمانوں کے تعلقات عرب ممالک سے جوڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ صرف ایک ہی مذہب کو ماننے سے عرب اور ہندوستان کے مسلمان ایک نہیں ہو جاتے ہیں اور ان کے درمیان سارے فرق مٹ نہیں جاتے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا بھر میں اسلام کے ماننے والوں کا ایک ہی ملک ہوتا۔ اپنی فرقہ ورانہ سوچ کی وجہ سے آر ایس ایس اور بی جے پی سے وابستہ مصنفین یہ بات نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جس طرح دنیا کے دیگر مذہبی فرقے زبان، علاقہ، طبقاتی درجہ بندی اور مسلک کے نام پر منقسم ہیں اسی طرح دنیا کے مسلمان بھی آپس میں بٹے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی شبیہ خراب کرنے کے مقصد سے یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ شاہین باغ میں بٹ رہی بریانی کا خرچ "شدت پسند" اسلامک جماعت پی ایف آئی اُٹھا رہی ہے۔ پنچ جنیہ (۲ فروری) میں میں ونے سنگھ کی ایک رپورٹ "پی ایف آئی کی 'زکوٰۃ' پر ٹکا شاہین باغ" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ "ای ڈی کی رپورٹ سے ایک سنسنی خیز خلاصہ ہوا ہے۔ مذہبی شدت پسند گروہ پاپولر فرنٹ آف انڈیا (پی ایف آئی) نے سی اے اے کے نام پر فساد بھڑکانے کے لیے صرف چند دنوں کے اندر ۱۲۰ کروڑ روپیے خرچ کر دیے۔" اتنا ہی نہیں یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ سی اے اے مخالف احتجاج کے لیے اور سارا پیسہ بھی غیر قانونی طور سے پہنچایا جا رہا ہے۔ "بہر حال، ۱۲۰ کروڑ روپیے دنگے میں لگے کل فنڈنگ کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے، جو بینک سسٹم کے تحت استعمال کیا گیا ہے۔ اصلی مال تو اس سے پانچ گنا زیادہ ہے۔"

غور کرنے والی بات یہ ہے کہ شاہین باغ کے مظاہروں کو دنگائی کہا جا رہا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دنگے بھڑکانے والے وہ فرقہ پرست عناصر ہیں جن کو حکومت اور پولیس کی پوری حمایت حاصل ہے۔ کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ شاہین باغ کے مظاہرین کو ڈرانے اور وہاں بھگدڑ مچانے کے مقصد سے نوجوانوں کو پستول دے کر بھیجا جا رہا ہے۔ جس دن پورا ملک بابائے قوم مہاتما گاندھی کی یوم شہادت پر انہیں خراج عقیدت پیش کر رہا تھا تب ایک بھگوا دہشت گرد نوجوان مظاہرین کے خلاف گولی چلا کر ماحول کو کشیدہ بنا رہا تھا۔ افسوس کی بات ہے کہ بھگوا لیڈران اور شر پسند عناصر سی اے اے مظاہرین، بالخصوص مسلمانوں پر حملے کرنے کی بات کر رہے ہیں اور آر ایس ایس اور بی جے پی کا ترجمان اخبار دنگے کے لیے اُلٹا شاہین باغ کو مورد الزام ٹھہرا رہا ہے۔ کیا میڈیا میں یہ بات سامنے نہیں آئی کہ مرکزی وزیر انوراگ ٹھاکر نے دہلی اسمبلی انتخابات کی ریلی میں سر عام ملک کے "غداروں" کو گولی مارنے کا نعرہ دیا تھا؟ اگر حقیقت میں کسی کے خلاف امن بگاڑنے کے لیے تادیبی کارروائی ہونی چاہیے تو وہ انوراگ ٹھاکر کے خلاف ہونی چاہیے کیونکہ اُن کی اشتعال انگیزی کے فوراً ہی بعد ایک بھگوا دہشت گرد پستول لے کر شاہین باغ کی طرف دوڑ چلا۔

یہ کہنا کہ پی ایف آئی شاہین باغ میں بریانی سپلائی کر رہی ہے سیاسی بیان ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ ای ڈی کی رپورٹ دہلی انتخابات سے تین روز قبل میڈیا میں لیک کی جاتی ہے۔ آخر یہ رپورٹ انتخابات کے بعد بھی تو سامنے آسکتی تھی؟ ایک اور مزیدار بات یہ ہے کہ اس رپورٹ میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ پی آئی ایف کے تعلقات کانگریس اور عام آدمی پارٹی سے ہیں۔ دہلی انتخابات میں بی جے پی کی حریف جماعتوں کو بھی پی ایف آئی سے جوڑنے کے پیچھے یہ مقصد نہیں ہو سکتا کہ سرکار مسلم "غدار وطن" کانگریس اور عام آدمی پارٹی کو آپس میں اتحادی دکھلانا چاہتی تھی تاکہ اس کا فائدہ بی جے پی کو مل سکے؟

پی ایف آئی سے متعلق خبر شائع کرنے میں "پنچ جنیہ" نے ایک اور بڑی غلطی کی ہے جس سے اس کے جھوٹ کی پول خود بخود کھلتی نظر رہی ہے۔ مذکورہ رپورٹ میں اس نے خواتین کی ایک تصویر شائع کی ہے جس میں اُن کو کھانا کھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کیپشن میں "بریانی کی دعوت" کی لکھا ہوا ہے، جس کا ذکر اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی نے بھی دہلی انتخابات کی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے کیا تھا، مگر مطبوعہ تصویر میں خواتین کی پلیٹوں میں بریانی کے بجائے پھل نظر آ رہے ہیں! ایسا لگتا ہے کہ افطار کرتی ہوئی خواتین کی فائل فوٹو پنچ جنیہ نے جلد بازی میں لگا دی ہے!

سی اے اے مظاہرے کو مزید بدنام کرنے کے لیے جے این یو کے طلبہ شرجیل امام کو بھی ٹارگٹ کیا گیا ہے۔ ۹ فروری کے شمارے میں پنچ جنیہ اور آرگنائزر دونوں نے اس پر کور اسٹوری بنائی ہے اور یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ "اسلام کی بالادستی" بھارت میں قائم کرنا چاہتا تھا۔ "شرجیل کے پیچھے کا ڈیزائن" کے عنوان سے وجے کرانتی نے آرگنائزر میں مضمون لکھا ہے اور یہ الزام لگایا ہے کہ شرجیل کے تعلقات پی ایف آئی سے ہیں۔ آسام میں "بلاکیڈ" کرنے کے اس کے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور اسے ملک کی سالمیت کے لیے خطرہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ "شرجیل کی کوشش کہ آسام کو بھارت سے الگ کر دیا جائے اتنا ہی سنجیدہ معاملہ ہے جتنا ماؤنواز باغیوں کی تحریک ہے۔ لہٰذا پالیسی ساز لوگوں اور سیکیورٹی کے ماہرین کو شرجیل معاملے کو اسی سنجیدگی سے لینا چاہیے۔" ایک طالب علم کی دلیل کو ملک کی سالمیت کے لیے اس قدر خطرہ بتایا جانا کہیں اس کی مذہبی شناخت کی وجہ سے تو نہیں ہے؟

جو بات شرجیل امام نے کی تھی وہ سیڈیشن کیس کے دائرے میں ہرگز نہیں آتی۔ اگر وہ مسلمان نہیں ہوتا تو کیا اس کو اس قدر پریشان ہونا پڑتا؟ مثال کے طور پر وجے کرانتی کی مذکورہ رپورٹ میں اس بات کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے کہ شرجیل کو اس کے گھر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ مگر اس کی تصویر کے نیچے دیے گئے کیپشن میں یہ لکھا جاتا کہ اُسے مسجد سے گرفتار کیا گیا ہے! کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک خاص مقصد کے تحت اس کی گرفتاری کا مقام مسجد بتلایا گیا ہے تاکہ عوام کے دل کے اندر یہ تاثرات پیدا ہوں کہ مسلمانوں کے مذہبی مقامات تشدد کے اڈے ہوتے ہیں!

"آرگنائزر" کے مدیر پرپھل کیتکر نے ایک مخصوص اداریہ (۹ فروری) شرجیل امام پر لکھا ہے۔ اس میں بھی شرجیل کے ساتھ انصاف نہیں برتا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ شرجیل کا بیان "کمیونسٹ اور جہادی ذہنیت" کی عکاسی کرتا ہے۔ جنہوں نے بھی شرجیل کی تحریروں کو پڑھا ہے اور اس کی تقریروں کو سنا ہے اُن کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ شرجیل ہندوستان میں تنوع اور تکثیریت پر مبنی جمہوریت کو پسند کرتا ہے اور وہ مسلمانوں کی بدحالی سے کافی مایوس ہے۔ اس کا مطالعہ کافی وسیع ہے اور وہ چیزوں کو وسیع تاریخی تناظر میں دیکھتا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ کہ جب وہ آسام میں "بلاکیڈ" کرنے کی بات کرتا ہے تو اس کا صرف یہی مقصد ہوتا ہے کہ احتجاج اس قدر اثر دار ہو کہ سرکار مظاہرین کی بات سننے کے لیے آئے۔ اس کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ پوری توانائی کو صرف پبلیسٹی پر خرچ کیا جائے اور اس کا نتیجہ کچھ حاصل نہ ہو۔ اسی سیاق میں شرجیل نے کہا تھا کہ اگر پانچ لاکھ لوگ اس کے ساتھ ہوں تو وہ آسام میں "بلاکیڈ" کر سکتا ہے اور سرکار کو اُن کی بات سننے کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ جن کو یہ لگتا ہے کہ "بلاکیڈ" کا راستہ غلط ہے تو اُن کو اس بات کا بھی جواب دینا ہو گا کہ جب سرکار پرامن طریقوں سے چل رہے احتجاج کی بات سننے کے بجائے اسے بدنام کرنے کا عہد کر لے تو مظاہرین کے پاس کیا متبادل بچ جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب "آرگنائزر" کے مدیر کیتکر نے نہیں دیا بلکہ خوف کا ماحول پیدا کرتے ہوئے کہا کہ شرجیل کا بیان جناح سے ملتا ہے۔

دوسری غلط فہمی یہ بھی پھیلائی جا رہی ہے کہ شرجیل بھارت کے آئین کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ شرجیل کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی بدحالی کے لیے صرف بی جے پی ذمّہ دار نہیں ہے جیسا کہ بہت سارے مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس نے اپنی تحریروں میں یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کی حالت گزشتہ ۷۰ سالوں سے خراب ہوتی چلی آئی ہے، جس کے لیے کانگریس اور بائیں بازو کی حکومتیں بھی ذمہ دار ہیں۔ اس لیے شرجیل یہ چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی لڑائی بی جے پی بنام کانگریس تک محدود نہ رکھیں بلکہ اس کی تاریخی پس منظر میں دیکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ شرجیل چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو آئین میں ترمیم کا مطالبہ بھی مسئلہ اٹھانا چاہیے تاکہ جو حقوق اُن کو آزادی سے پہلے ملتے تھے وہ پھر سے ملنے لگیں۔ شرجیل مسلمانوں کے لیے بھی ریزرویشن چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی مانتا ہے کہ مسلم نمائندگی اور مسلم اکثریت ریاستوں کو زیادہ سے زیادہ حقوق دیے جانے کے جناح کے مطالبات کو اگر کانگریس نے قبول کر لیا ہوتا تو ملک تقسیم نہیں ہوتا۔ کیا مسلمانوں کے حقوق، آئین میں ترمیم اور تنوّع پر مبنی ملک بنانے کی بات کرنا ملک سے غداری ہے؟

ایک اور بات کہی جا رہی ہے کہ شرجیل اسلامک شدت پسند ہے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی اسلامی شناخت کو کسی بھی قیمت پر باقی رکھنا چاہتا ہے اور مسلمانوں کے مسائل کو لے کر اس کے دلوں میں درد ہے۔ مگر کہیں سے بھی وہ تنگ نظر نہیں ہے۔ یہاں اس کے ایک مضمون کا مَیں ذکر کرنا چاہوں گا جس میں وہ اردو کے شاعروں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آزادی سے قبل اردو شاعر ہندو دیوی دیوتا جیسے کرشن کی تعریف میں شعر لکھا کرتے تھے جو آج کے دور میں لکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہر چیز کو مذہبی خانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ مذہبی شدت پسندی کو دیکھ کر نالاں ہے اور اس کی جگہ وہ رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا پیروکار ہے۔

(ابھے کمار نے جے این یو میں ریسرچ اسکالر ہیں۔)
debatingissues@gmail.com

شرجیل امام کے ساتھ میں کیوں کھڑا ہوں؟

سیاسی مفاد اور "آئین بچاؤ تحریک" کو بدنام کرنے کے لیے ایک مسلمان کو بلی کا بکرا بنایا گیا

ابھے کمار، دہلی

مجھے میرے دوستوں نے شرجیل امام کے معاملے میں خاموش رہنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ وقت مناسب نہیں ہے کہ شرجیل کے ساتھ میں اظہار یکجہتی کروں۔ ان کا یہ مشورہ ملک میں بگڑتے حالات کے مد نظر تھا، لیکن میں خاموشی کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟ اپنے تحفظ کی خاطر بھلا میں اپنے دوست کی حفاظت کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہوں؟

میرا ضمیر مجھے شرجیل امام کے ساتھ کھڑے ہونے کی تحریک دیتا ہے، جو لوگ ابھی تک شرجیل کے ساتھ گزرے سانحہ سے باخبر نہیں ہیں میں ان کے سامنے کچھ حقائق رکھنا ضروری سمجھتا ہوں۔ شرجیل امام دہلی میں واقع جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سنٹر فار ہسٹوریکل اسٹڈیز (سی ایچ ایس) کے ریسرچ اسکالر ہیں۔ رومیلا تھاپر، ہربنس مکھیا اور بپن چندر جیسے نامور مورخین کئی دہائیوں تک یہاں استاد رہے ہیں۔ شرجیل کی یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ جے این یو میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوا۔ سن ۲۰۱۳ میں وہ ایم اے (جدید تاریخ) کا طالب علم بن جاتا ہے۔ شرجیل شہریت ترمیمی قانون (سی اے اے) کے خلاف چل رہے مظاہرے میں حصہ لینے والا ایک اہم کارکن تھا۔ سی اے اے کی مخالفت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس قانون کے تحت افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آئے غیر مسلموں کو شہریت دینے کے لیے ساری رکاوٹیں ختم کر دی گئی ہیں۔ کہا یہ جارہا ہے کہ جو مذہبی اقلیتیں ان پڑوسی ممالک میں ظلم کی شکار ہیں ان کو بھارت میں پناہ دی جائے گی۔ مگر اس میں سب سے قابل اعتراض بات یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو شہریت حاصل کرنے سے محروم رکھا گیا ہے، جس سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان بھارت میں برابر کے شہری نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سی اے اے ہندوستانی آئین میں درج سیکولرازم کے اصول کے خلاف ہے۔

سی اے اے مخالف مظاہروں کے دوران شرجیل نے اپنی تقاریر میں ان باتوں کو وسیع تناظر میں واضح کیا ہے، لیکن پولیس نے اس کی تقریر کے ایک چھوٹے سے حصے کی اپنے منصوبے کے مطابق تنگ نظری کے ساتھ تشریح کی اور اسے قومی سلامتی اور یکجہتی کے لیے ایک خطرہ قرار دیتے ہوئے شرجیل پر 'سیڈیشن' کیس درج کیا۔ کچھ دن پہلے شرجیل کو ان کے آبائی شہر جہان آباد (بہار) سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اور اس وقت وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔

سب سے پہلے میں اس بات کا اعتراف کر دوں کہ میں شرجیل کو ذاتی طور پر نہیں جانتا، حالانکہ ہم ایک ہی شعبہ میں طالب علم ہیں، لیکن میں نے اس کے بارے میں بہت سنا ہے کہ اسے لکھنے کا بڑا شوق ہے اور وہ لکھتا بہت اچھا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ انگریزی، ہندی اور اردو زبانوں میں ملک کے مشہور اخبارات اور ویب پورٹلز کے لیے لکھتا ہے تو میرے دل میں اس کے لیے احترام بڑھ گیا۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ہی وہ کیمپس میں سیاسی اور سماجی تحریکوں میں بھی سرگرم رہا ہے۔ نجیب والے سانحہ میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس پر حملہ کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ کیمپس میں بہت سارے لوگ اسے پسند کرتے ہیں، مگر بعض دوستوں کو اس کی بے باکی سے چڑ بھی ہے، کیوں کہ اس سے ان کی فرضی سیاست کی پول کھل جاتی ہے۔ وہ کیمپس میں ایک الگ رائے رکھنے کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس کو کسی خانے میں قید کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ہاں اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلم اور اسلام مخالف جذبات اور مواد کو پیش کرنے اور اس پر بے باکانہ تبصرہ کرنے کی اس کے اندر زبردست صلاحیت ہے۔ اس کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ علم کی دنیا میں کوئی بڑا نام دیکھ کر مرعوب نہیں ہوتا، نہ خوف زدہ ہوتا ہے۔ اپنے ہی شعبے کے ممتاز مورخ ہربنس مکھیا جن کی درسی کتابیں کروڑوں بچے پڑھتے ہیں، عہد وسطیٰ کے مسلم حکم رانوں کے متعلق ان کے خیالات پر بھی شرجیل نے سوال کھڑے کیے جو کسی طور بھی معمولی بات نہیں ہے۔

اس کے علاوہ شرجیل سے میری نزدیکیوں کی اور بھی وجوہات ہیں۔ میرے اور شرجیل کے لیے جے این یو میں داخلہ لینا کسی خواب کی تعبیر حاصل کرنے' سے کم نہیں تھا۔ ذہن نشین رہے کہ شرجیل سائنس کا طالب علم تھا اور اس کے لیے تاریخ کا امتحان پاس کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ میرے لیے بھی بہت مشکل تھا کیوں کہ جے این یو کے معیار پر پورا اترنا مجھ جیسے 'اوسط درجہ' کے طالب علم کے لیے آسان نہیں تھا۔ مجھے جے این یو میں داخلہ حاصل کرنے میں کئی سال لگ گئے تھے۔ مگر شرجیل ایک ذہین و فطین اور محنتی طالب علم ہے۔ اس سے قبل اس نے آئی آئی ٹی ممبئی سے کمپیوٹر سائنس میں اپنی انجینئرنگ پاس کی اور کچھ دنوں تک اچھی تنخواہ والی نوکری بھی کی۔ اس کے پاس ایک بڑا کیریئر اور ایک خوشحال زندگی کے سارے وسائل موجود تھے، لیکن اس نے ان سارے مواقع کو نظر انداز کر کے جے این یو میں پڑھنے کا ارادہ کیا اور اس میں بھی جدید تاریخ یعنی ماڈرن ہسٹری کو اس نے اپنا موضوع بنایا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ملک و ملت کو در پیش بنیادی سوالات کو سمجھنا چاہتا تھا۔ شرجیل کی طرح میں نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنی نوکری چھوڑ دی تھی، میں اس وقت ملک کے ایک بڑے انگریزی اخبار میں رپورٹر کی حیثیت سے دہلی میں کام کر رہا تھا۔ شرجیل کی ہی طرح میں بھی ملک اور قوم کے پیچیدہ اور متضاد سوالات کا حل تلاش کرنے کی غرض سے جے این یو آیا تھا۔ شرجیل سے قربت کی دوسری اہم اور بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم دونوں کے علمی رجحانات کافی ملتے جلتے ہیں۔ ہم دونوں ملک کی اقلیتوں کے معاملات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ہم دونوں سیکولر اور فرقہ وارانہ 'بائنری' سے خوش نہیں ہیں۔ میں نے ان موضوعات پر اس سے کبھی تبادلہ خیال نہیں کیا، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میری اس رائے سے متفق ہوگا کہ جب تک خواتین اور اقلیتوں کی حالت تسلی بخش نہیں ہو جاتی تب تک کوئی بھی جمہوریت کامیاب نہیں ہو سکتی۔

> یہ ہندتوا سازش کا بنیادی ہدف تھا کہ پہلے کسی مسلمان کو بدنام کرکے اسے شاہین باغ کا ماسٹر مائنڈ بنا کر پیش کیا جائے۔ شرجیل کی گرفتاری سے چند روز قبل ہی اس کی شبیہ مسخ کی جاتی ہے اور 'گودی میڈیا' اسے ملک اور ہندوؤں کے لیے ایک 'خطرہ' بنا کر پیش کرتا ہے۔ شرجیل کے معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی دوسری بڑی وجہ دہلی میں ہونے والا اسمبلی انتخاب بھی ہے۔ دہلی اسمبلی انتخابات میں بی جے پی کی حالت پتلی تھی اور اس کی آخری امید کمیونل کارڈ کھیلنا تھا جو شرجیل کی گرفتاری کے بہانے کھیلا گیا۔

اسی جذبے کے پیش نظر شرجیل اپنی تقاریر میں ہندوستانی جمہوریت کے متعلق گہرے سوالات اٹھا رہا تھا۔ کسی بھی لبرل ڈیموکریسی میں اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ ایک دانشور اور ایکٹیوسٹ بغیر کسی خوف کے اپنی بات رکھ سکے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ بھارت جیسے جمہوری ملک میں آزادی اور رواداری کی زمین تیزی کے ساتھ تنگ ہوتی جارہی ہے۔ جو لوگ مسلم، دلت، آدیواسی اور دیگر محکوم طبقات سے تعلق رکھتے ہیں ان کے لیے اپنے دل کی بات رکھنے کی آزادی اور بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایک کے بعد ایک کالا قانون لا کر ملک کے 'جمہوری آئین' کی جڑیں کھودی جارہی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس بار متنازعہ سی اے اے کے خلاف لوگ بڑی تعداد میں سڑکوں پر نکل پڑے ہیں، ملک بھر میں پھیل رہے۔ ان مظاہروں اور احتجاجوں سے حکم راں بی جے پی پر خوف طاری ہو گیا ہے۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ کسی طرح بھی ان مظاہروں کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جائے۔ اسی حکمت عملی کو مد نظر رکھتے ہوئے بی جے پی یہ افواہ پھیلا رہی ہے کہ ان مظاہروں کے پیچھے مسلمانوں کا ہاتھ ہے۔ بس اسی منصوبہ کے خاکے میں رنگ بھرنے کے لیے بی جے پی حکومت کسی مسلمان کو بلی کا بکرا بنانے کی تاک میں لگی ہی ہوئی تھی۔ یہ ہندتوا سازش کا بنیادی ہدف تھا کہ پہلے کسی مسلمان کو بدنام کر کے اسے شاہین باغ کا ماسٹر مائنڈ بنا کر پیش کیا جائے۔ شرجیل کی گرفتاری سے چند روز قبل ہی اس کی شبیہ مسخ کی جاتی ہے اور 'گودی میڈیا' اسے ملک اور ہندوؤں کے لیے ایک 'خطرہ' بنا کر پیش کرتا ہے۔ شرجیل کے معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی دوسری بڑی وجہ دہلی میں ہونے والا اسمبلی انتخاب بھی ہے۔ دہلی اسمبلی انتخابات میں بی جے پی کی حالت پتلی تھی اور اس کی آخری امید کمیونل کارڈ کھیلنا تھا جو شرجیل کی گرفتاری کے بہانے کھیلا گیا۔

مختصر یہ کہ شرجیل کو اس مذہبی شناخت کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ اسے اس لیے ٹارگیٹ کیا جارہا ہے کیوں کہ اس کا تعلق اقلیتی طبقے سے ہے۔ وہ جیل میں اس لیے ڈال دیا گیا ہے کیونکہ اس کا نام شرجیل ہے، سنجیو نہیں!

افسوس کی بات ہے کہ لبرل اور لیفٹ کا ایک بڑا طبقہ ابھی تک اس لیے سچے دل سے اس کے ساتھ اظہارِ یکجہتی نہیں کر رہا ہے کیونکہ انہیں خوف ہے کہ شرجیل کے سوالات نہ صرف فرقہ پرستوں پر حملے بولتے ہیں، بلکہ ان جیسے لبرل اور لیفٹ جماعتوں سے بھی حساب مانگتے ہیں۔ اقلیتوں کے تئیں ان کی پالیسی اور ان کی ایمانداری بھی شرجیل کے سوالات کے کٹہرے میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ شرجیل کے خلاف سخت کارروائی کا مطالبہ کرنے والوں کی یہ دلیل ہے کہ اس کی تقریر سے ملک کی یکجہتی اور سالمیت کو خطرہ لاحق ہے، لیکن یہ دلیل مبنی بر حقائق نہیں معلوم ہوتی، بلکہ فقط ہندتوا کے پروپیگنڈے کا حصہ نظر آتی ہے۔ ایسا اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ شرجیل کے خلاف پولیس کی یہ دلیل کافی بھونڈی معلوم ہو رہی ہے کہ ایک نوجوان اسکالر کی تقریر سے دنیا کی ایک بڑی اور طاقتور ریاست خطرے میں پڑ گئی ہے۔ یہ قول و عمل کا تضاد نہیں تو اور کیا ہے کہ ملک کے صاحب اقتدار لوگ بھارت کو ایک 'سپر پاور' ملک کہتے نہیں تھک رہے ہیں، جس کے پاس دنیا کی دوسری سب سے بڑی فوج ہے اور وہ دنیا کے جدید ترین ہتھیاروں سے بھی لیس ہے، جبکہ یہی 'ہندتوا طاقتیں' ایک نوجوان اسکالر کی تقریر کو 'قومی سلامتی کے لیے خطرہ' بتا کر عوام کو ڈرانے لگتی ہیں؟ کیا ہندوستان کی طاقتور ریاست تاش کا پتّا ہے جو ایک جوشیلی تقریر سے ڈھیر ہو جائے گا؟

اقتدار میں موجود جماعت کے منہ پھٹ لیڈروں کو کون سمجھائے کہ کسی بھی آزاد اور لبرل جمہوریت میں اظہار رائے کا حق صرف کاغذ تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ عوام کو اس کا استعمال کرنے کے لیے کھلا ماحول بھی ہونا چاہیے۔ جو لوگ شرجیل کی فکر سے اتفاق نہیں رکھتے ان کو اس سے بات کرنی چاہیے، نہ کہ اسے جیل میں ڈال دینے کا مطالبہ کیا جائے۔ بات چیت کی راہ کو بند کرنے سے ہماری جمہوریت مضبوط نہیں ہوگی، بلکہ الٹا کافی کمزور ہو جائے گی۔ حکم راں بی جے پی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک اسکالر کا بیان خواہ وہ کتنا ہی 'متنازعہ' کیوں نہ ہو ملک کی سالمیت کے لیے خطرناک نہیں ہو سکتا لیکن کچھ لوگ یہ سوال اٹھا رہے ہیں کہ کیا شرجیل نے آسام کی 'بلاکیڈ' کی بات نہیں کی تھی؟ اس کا جواب ایک اور سوال میں پوشیدہ ہے کہ کیا شرجیل پہلا شخص ہے جس نے بلاکیڈ کی وکالت کی ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سن ۲۰۰۸ میں ہندتوا طاقتوں نے جموں کا بلاکیڈ کیا تھا؟ پھر اس وقت کسی نے بھی ان کے لیے 'سیڈیشن' کیس کا مطالبہ نہیں کیا تھا؟ اس حقیقت کے باوجود کہ ان کے طریق کار سے بہت سارے لوگ متفق نہیں تھے۔ اس طرح کی مثال تو انگریزوں کی حکومت میں بھی نہیں ملتی۔ جنگ آزادی کے دوران بہت سے مواقع آئے جب لوگوں نے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا، نوکریوں سے استعفے دیے، ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا، ریلیاں نکالیں، جیل بھی گئے اور تشدد کے واقعات بھی رونما ہوئے۔ ۱۹۴۲ کی بھارت چھوڑو تحریک کے دوران مجاہدین آزادی نے جب تشدد اختیار کیا تو گاندھی جی پر اس کی مذمت کرنے کے لیے انگریزوں کی جانب سے دباؤ ڈالا گیا۔ مگر گاندھی نے مجاہدین آزادی کے تشدد اقدامات کی مذمت کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

میں یہاں برطانوی سامراج اور بی جے پی حکومت کی بربریت کا موازنہ نہیں کرنا چاہتا، یہ فیصلہ آپ کریں، لیکن جب کوئی شرجیل کے لیے سخت سزا کا مطالبہ کرتا ہے تو کیا وہ اس سوال سے بھاگ سکتا ہے کہ آخر ملک کے اندر غیر مستحکم صورتحال کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ کیا شرجیل امام کی تقریر نے ہی ملک کو اس پریشانی میں لا کھڑا کیا ہے؟ کیا بی جے پی حکومت اور فرقہ پرست طاقتیں ان سب کے لیے کہیں زیادہ ذمہ دار نہیں ہیں؟ کیا اس سردی کے عالم میں اپنے بچوں کے ساتھ مہینوں سے سڑک پر بیٹھی شاہین باغ کی خواتین سے سرکار نے کبھی یہ پوچھا کہ آپ کا درد کیا ہے؟

جو بھی شرجیل امام کو قصوروار ٹھہرانے کی جلد بازی کر رہا ہے، اسے اپنے موقف پر دوبارہ غور کرنا چاہیے۔ جب تک شرجیل کے معاملے کو ایک بڑے تناظر میں نہیں دیکھا جائے گا، اس وقت تک پوری بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ذرا آپ بھی اس 'کرونولوجی' کو سامنے رکھیے اور پھر طے کیجیے کہ حکومت نے پہلے تو لوگوں پر سی اے اے تھوپا اور جب اس کے خلاف احتجاج شروع ہوا تو اسے کچلنے کے لیے پولیس کا استعمال کیا گیا۔ اس کے باوجود احتجاج ختم نہیں ہوا تو جھوٹ اور پروپیگنڈے کا سہارا لیا گیا کہ ان مظاہروں کی قیادت 'انتہا پسند' مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ وزیر داخلہ امیت شاہ اپنے آپ کو روک نہیں پائے اور مظاہرین کو دھمکی دے ڈالی کہ حکومت سی اے اے پر ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے گی۔ وزیر اعظم نے یہ کہتے ہوئے اپنے منصب کے وقار کا خیال نہیں رکھا کہ احتجاج کے پیچھے خاص قسم کے لوگ ہیں، جنہیں وہ ان کے کپڑوں سے سے پہچان سکتے ہیں۔ اگر شرجیل امام کی تقریر 'تلخ' تھی تو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ یہ تلخی کہاں سے آرہی ہے؟ پلک جھپکتے ہی کسی کو 'اینٹی نیشنل' اور 'ہندو مخالف' قرار دے دیا جاتا ہے۔ شرجیل کا دل یہ سب دیکھ کر اور پڑھ کر درد سے بھر گیا ہے اور یہی درد کبھی کبھی اس کی تقریر میں چھلک جاتا ہے۔

اگر ہم ملک کی سالمیت اور اتحاد کو لے کر واقعی سنجیدہ ہیں تو ہمیں شرجیل کے درد کو سمجھنا چاہیے اور اس کے سوالات پر غور کرنا چاہیے۔ اس کے سوالوں سے منہ موڑنا حقیقت سے دور بھاگنے کے مترادف ہے۔ یہ ہمارا جمہوری مطالبہ ہونا چاہیے کہ شرجیل کی جیل سے جلد رہائی ہو، جو لوگ اس کی باتوں سے اتفاق نہیں رکھتے ان کو بھی اس کی فوری رہائی کا مطالبہ کرنا چاہیے، کیونکہ اگر اسے جیل میں قید کر کے رکھا جائے گا تو اس سے مکالمہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟

(ابھے کمار، جے این یو میں ریسرچ اسکالر ہیں)

****

(مضمون نگار کے تمام خیالات سے "ادارہ دعوت" کا اتفاق رکھنا ضروری نہیں ہے۔ نیز ملزم ریسرچ اسکالر شرجیل امام کی بعض باتیں غلط اور قابل اعتراض ہو سکتی ہیں۔ لیکن موجودہ صورتحال کی سنگینی اور حالات کے تناظر میں ایک نقطہ نظر کے طور پر یہ مضمون پیش کیا جارہا ہے۔)

ہمارے قارئین اس سلسلے میں اپنی رائے، دلایل کے ساتھ ہفت روزہ دعوت کو روانہ کر سکتے ہیں۔

DawatWeekly@gmail.com

سیاسی

شرجیل سے وہ کیوں ڈرتے ہیں؟

مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کو دیکھ کر ان خدشات کو تقویت ملتی ہے کہ موجودہ نظام شرجیل نام سے کچھ زیادہ ہی ڈرا ہوا ہے۔ کتاب پڑھنے اور علم حاصل کرنے

تصویر سوشل میڈیا

قومی آواز بیورو

Published: 22 Jul 2020, 6:40 PM

ابھے کمار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا بی اے (سیاسیات) کا طالب علم شرجیل عثمانی کو یوپی پولیس نے گرفتار کر 14 دنوں کے لیے جوڈیشل کسٹڈی میں بھیج دیا گیا ہے۔ مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کو دیکھ کر ان خدشات کو تقویت ملتی ہے کہ موجودہ نظام شرجیل نام سے کچھ زیادہ ہی ڈرا ہوا ہے۔ کتاب پڑھنے اور علم حاصل کرنے کی عمر میں انہیں جیل کی کالی کوٹھری میں قید کیا جا رہا ہے۔ کیا اس ڈر کی وجہ کہیں شرجیل جیسے نوجوانوں کے ساتھ تشخص تو نہیں ہے؟ کیا شرجیل اور ان کے ساتھی ایک خاص کمیونیٹی میں پیدا ہونے کی سزا جھیل رہے ہیں؟

خبر یہ بھی آرہی ہے کہ گوہاٹی جیل میں بند شرجیل امام کورونا مثبت پائے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ اس جیل کے چار سو سے زیادہ قیدیوں کو بھی کورونا پوزیٹو پایا گیا ہے۔ مگر سرکار کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہے۔ اقوام متحدہ، ڈبلیو ایچ او اور بہت

اے ای کو 78 رنور سے شکست

بانسری سوراج کی جیت میں الیکشن کمیشن کے بدعنوان اہلکاروں کا ہاتھ: سومناتھ بھارتی

ہریانہ کے نوح میں ایک بار پھر انٹرنیٹ خدمات پر پابندی عا

کے بہت سارے ممالک جیسے چین، ترکی، انڈونیشیا اور ایران نے اپنے یہاں جیلوں کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ جان کی قیمت سبھی کی ایک ہے۔ پھر قیدیوں کو جیل میں رکھ کر انہیں کورونا کا شکار بننے کے لئے چھوڑ دینا غیر انسانی عمل ہے۔ حکومت ہند کو اس بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے۔ مگر ناقدین کا ماننا ہے کہ مرکزی حکومت عداوت اور انتقام کے جذبے سے کام کر رہی ہے اور اپنی مسلم مخالف پالیسی کو کورونا وبا کے دوران بھی ترک کرنے کے لیے تیار نہیں دیکھتی۔

مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں کے کئی وجوہات ہیں۔ پہلا یہ کہ شرجیل ایک پڑھا لکھا اور ذہین طلب علم ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اپنے مفاد سے زیادہ ملک اور ملت کے بارے میں سوچتے ہیں۔ تیسرا یہ کہ ان کی آنکھوں میں مساوات اور برابری پر مبنی سماج کا بنانے کا خواب ہے۔ چوتھا یہ کہ دونوں کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ پانچواں یہ کہ دونوں ناانصافی اور ظلمت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی ہمت رکھتے ہیں۔ سسٹم ان نوجوانوں سے ڈرا ہوا ہے کیونکہ یہ نوجوان سچ بولنا جانتے ہیں۔ چاہے وہ جے این یو کا شرجیل ہو یا علی گڑھ کا شرجیل ہو، دونوں حق کی بات کرنا جانتے ہیں۔

جنوری کے آخری مہینے میں جے این یو میں پی ایچ ڈی (تاریخ) کر رہے شرجیل امام کو ان کے آبائی وطن جہاں آباد (بہار) سے گرفتار کر جیل بھیج دیا گیا۔ ان کے اوپر

تبھی تو ابھی تک وہ جیل میں ہیں۔ ان کے خلاف ایک نہیں بلکہ کئی ریاستوں کی پولیس نے سیاسی دباؤ میں کیس درج کیا ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا ہی ہے کہ وہ شاہین باغ میں ان دنوں چل رہے سی اے اے مخالف مظاہرے میں حصہ لے رہے تھے۔

غور طلب ہے کہ سی اے اے کے خلاف احتجاج کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس قانون کے تحت افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آئے غیر مسلمانوں کو شہریت

اقلیتیں ان پڑوسی ممالک میں ظلم کی شکار ہیں ان کو بھارت میں پناہ دی جائے گی۔
مگر اس میں سب سے قابل اعتراض بات یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو شہریت حاصل کرنے سے محروم رکھا گیا ہے، جس سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان بھارت میں برابر کے شہری نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سی اے اے ہندوستانی آئین میں درج بنیادی اصول سیکولرازم کے خلاف ہے۔

شرجیل ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اسے پڑھنے کا بڑا شوق ہے اور وہ لکھتا بھی بہت اچھا ہے۔ اس کے مضامین انگریزی، ہندی اور اردو زبانوں میں ملک کے مشہور ویب پورٹلز میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنی تعلیم کے ساتھ ہی وہ جے این یو کیمپس میں سیاسی اور سماجی تحریکوں میں بھی سرگرم رہا ہے۔ نجیب والے سانحہ میں اس نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کیمپس میں بہت سارے لوگ اسے پسند کرتے

فرضی سیاست کی پول کھل جاتی ہے۔ وہ کیمپس میں ایک الگ رائے رکھنے کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس کو کسی خانے میں قید کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ہاں اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلم اور اسلام مخالف جذبات اور مواد کو پیش کرنے اور اس پر بے باکانہ تبصرہ کرنے کی اس کے اندر زبردست صلاحیت ہے۔

جے این یو آنے سے پہلے شرجیل امام نے آئی آئی ٹی (ممبئی) سے کمپیوٹر سائنس میں اپنی انجینئرنگ پاس کی اور کچھ دنوں تک اچھی تنخواہ والی نوکری بھی کی۔ اس کے

اس نے ان سارے مواقع کو نظر انداز کر کے جے این یو میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔

شرجیل عشمانی عمر میں شرجیل امام سے کافی چھوٹا ہے۔ شرجیل عشمانی علی گرھ میں بی اے کے آخری سال میں تھا۔ اس کا تعلق اعظم گرھ سے ہے جہاں سے اسے گزشتہ ہفتہ گرفتار کیا گیا ہے۔ عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود بھی شرجیل عشمانی کی باتیں بڑی لمبی ہیں۔ کھانے پینے سے کہیں زیادہ اسے چائے پسند ہے۔ اپنی نو عمری میں ہی اس نے علی گڑھ میں اپنی پہچان بنا لی ہے۔ شرجیل امام کی طرح شرجیل عشمانی بھی انجینئرنگ کا طالب علم تھا، مگر اس نے پڑھائی مکمل نہیں کی۔ سماجی اور سیاسی امور میں اس کی دلچسپی نے اسے سماجی علوم کے قریب لایا۔ اس نے سیاسیات پڑھنے کے ساتھ ساتھ، طلبہ سیاست کو بھی قریب سے دیکھنا شروع کر دیا۔ کلاس روم سے زیادہ اسے تحریکیں سکھانے لگیں۔ اسے اب یہ محسوس ہونے

کوشش کرنی چاہیے۔

دیش میں بڑھ رہے مسلم مخلاف ماحول سے شرجیل عثمانی بڑا پریشان رہا کرتا تھا۔ مختلف مظاہروں اور تحریکوں میں وہ اپنی بے چینی کو ظاہر کرتا تھا۔ بھارت میں مسلمانوں کی سماجی، اقتصادی یا تعلیمی پسماندگی، سسٹم میں موجود ان کے خلاف تعصب کے تلخ حقائق سے وہ روبرو ہونے لگا تھا۔ اسے یہ لگنے لگا تھا کہ ایک آزاد اور سیکولر ملک میں بہت بڑی آبادی کو ان کی شناخت اور تشخص کی وجہ سے دبایا

پسند لوگوں کی طرح بہت دکھی تھا۔ اس کی مخالف میں وہ تحریک میں شامل ہو گیا، مگر اس نے یا پھر اس کے ساتھیوں نے کبھی بھی امن اور جمہوری طریقے کو نہیں چھوڑا۔ مگر سسٹم کو یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ عوام کے اندر اپنے حقوق کے لیے کوئی شعور پیدا ہو۔ اس لیے اس نے اسے طاقت کے زور پر دبانے کے لیے ایک کے بعد ایک کوششیں شروع کر دیں۔ جامعہ، علی گڑھ پر پولیس کی زیادتی، سی اے اے مخالف مظاہرین پر حملہ اور شرجیل جیسے سماجی کارکنان کی گرفتاری اسی سازش کا حصہ ہے۔

جے این یو میں ایم اے (لسانیات) کی طالبہ اور طلبہ یونین کی کونسلر آفرین فاطمہ شرجیل عثمانی کی قریبی دوست ہیں۔ وہ شرجیل کو علی گڑھ سے ہی جانتی ہیں۔ دونوں کو پڑھنے لکھنے، ڈبیٹ اور سیاست میں بڑی دلچسپی تھی۔ آفرین علی گڑھ کی

اور کہتی ہہیں کہ 'شرجیل کی سیاسی امور کو لے کر بڑی دلچسپی ہے۔ وہ کشمیر اور فلسطین کے مسئلے کو بھی بڑے قریب سے جانتا ہے۔ ان موضوعات پر اس نے علی گڑھ میں کئی بار ڈبیت اور فلم اسکریننگ بھی کروائی ہے۔ اس کے علاوہ وہ خواتین کے سوال سے بھی اس کو بڑا سروکار رہے'۔ آفرین یاد کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ جب بی اچ یو میں کچھ خواتین کے خلاف قانوں پاس کرایا گیا، تو اس نے احتجاج لیا۔

جگھوں پر شائع ہو چکے ہیں۔ آفرین مزید بتاتی ہیں کہ بات چیت کے دوران شرجیل عثمانی اکثر اپنی ماں کا ذکر کرتا تھا۔ اس کے پاپا اس کی سیاست میں سرگرمی کو دیکھ کر کئی بار ناراض بھی ہوتے تھے، مگر اس کی ماں ہمیشہ شرجیل کی حمایت میں آجاتی۔ شاید اس کی طاقت اس کی ماں ہے۔ شاید جیل میں وہ اپنی ماں کو ہی سب سے زیادہ یاد کر رہا ہوگا۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ جو لوگ اصل معنوں میں تشدد اور دنگوں کے لیے ذمہ دار ہیں، انہیں سسٹم بچا ہی نہیں رہا ہے، بلکہ انعامات سے نوازا بھی جا رہا ہے۔ وہیں دوسری طرف جنھوں نے ملک کے سیکولرازم اور آئین کے لیے پرامن احتجاج لیا، ان کو گرفتار کیا جا رہا ہے اور ان کے خلاف کالا قانون تھوپا جا رہا ہے۔ مگر اس سے بھی افسوسناک ہے کہ حکومت وقت مسلم نوجوانوں کے خلاف زیادتی کا

ریاستی دمن کے شکار ہوئے ہیں، وہیں دنگا کرانے والوں کو ہیرو بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ عدالت اور میڈیا بھی اس نا انصافی کے خلاف خاموش ہے یا پھر حکومت کے ساتھ کھڑا معلوم پڑتا ہے۔ اس موقع پر مجھے 20 ویں صدی کے مشہور شاعر امیر قزلباش کا وہ شعر یاد آرہا ہے کہ

اسی کا شہر وہی مدعی وہی منصف

ہمیں یقیں تھا ہمارا قصور نکلے گا۔

(مضمون نگار ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں، اس مضمون میں ظاہر کئے گئے خیالات مضمون نگار کے ذاتی خیالات ہیں)

وہ فرد سے نہیں، فکر سے ڈرتے ہیں

فرقہ پرستوں کی یہ پرانی حکمت عملی رہی ہے کہ محکوموں کی بات سننے کی جگہ انہیں بدنام کردو، تاکہ ان کی باتیں بھی بے اثر ہوجائیں
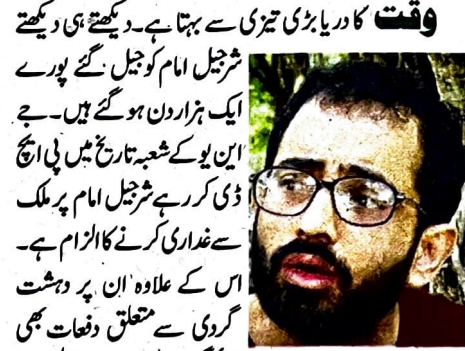
ابھے کمار

وقت کا دریا بڑی تیزی سے بہتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شرجیل امام کو جیل گئے پورے ایک ہزار دن ہو گئے ہیں۔ جے این یو کے شعبہ تاریخ میں پی ایچ ڈی کر رہے شرجیل امام پر ملک سے غداری کرنے کا الزام ہے۔ اس کے علاوہ ان پر دہشت گردی سے متعلق دفعات بھی لگائی گئی ہیں۔ سرکار اور پولیس کا ماننا ہے کہ اسے ملک و معاشرہ کے لیے ایک خطرہ بنا کر پیش کرتی رہی ہیں، جبکہ بہت سارے لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ جیل میں اس لیے قید ہے، کیونکہ اس نے موجودہ حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انصاف اور حقوق کی بات کی اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک بڑی تحریک چھیڑی، جسے دنیا آج شاہین باغ کے نام سے جانتی ہے۔ گزشتہ دنوں ایک شام جے این یو کے سابرمتی ڈھابا پر طلبہ، اساتذہ اور ملازمین جمع ہوئے اور انہوں نے شرجیل کو یاد کیا۔ ایک احتجاجی مظاہرہ کے دوران انہوں نے شرجیل کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ مقررین نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا ہے کہ ریاست اختلاف رائے کو کچل رہی ہے اور اس طرح جمہوریت کو کمزور کر رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ جو شخص موجودہ حکومت کی پالیسی کی مخالفت کرتا ہے یا اپنی ایک منفرد رائے رکھتا ہے، اسے دانستہ طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ پریشان تو عام لوگ ہیں، مگر سرکار کا رویہ محکوم طبقات کے تئیں اور بھی زیادہ سخت ہو چکا ہے۔ دلت، آدی واسی، پسماندہ، مسلمان، عیسائیوں کے شہری حقوق کی پامالی سرعام ہو رہی ہے۔ بائیں بازوں اور سیکولر نظریہ کے حامل افراد کو بھی ستایا جا رہا ہے۔ مقررین کا یہ بھی کہنا تھا کہ شرجیل کی گرفتاری اس کی مسلم تشخص اور اس کی انقلابی سوچ کی وجہ سے کی گئی ہے۔ مقررین نے زور دے کر کہا کہ شرجیل نے کوئی بھی ایسا کام نہیں کیا تھا کہ اس کے خلاف یو اے پی اے لگایا جائے۔

جے این یو کے طلبہ کی باتیں بے جا نہیں ہیں۔ سچ میں حالات آج اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ شرجیل کے دوستوں کی باتوں کو سُننے کے لیے میڈیا، پولیس، انتظامیہ اور ارباب اقتدار تیار نہیں ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ حکومت کے موقف کو قومی مفاد کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اور اپوزیشن کی آوازوں کو دبا دیا جا رہا ہے۔ آج مین اسٹریم میں کتنے ایسے صحافی ہیں جو شرجیل کے بارے میں کھُلے دل سے بات کرنا چاہتے ہیں؟ شرجیل کی رہائی کی بات کرنے والوں کی بات سُننا تو دور کی بات، انہیں شدت پسند کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ میڈیا نے شرجیل کے خلاف اتنا مواد پیدا کر دیا ہے کہ اس کی رہائی کی بات کرنے سے بھی بہت سارے لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ یہ گھبراہٹ اور خوف کا ماحول ہی جابر ریاست کو مزید ظلم اور زیادتی کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ مگر ان مایوسیوں کے درمیان، جے این یو کے طلبہ نے پھر سے شرجیل کے لیے امید کی روشنی جلائی۔ جے این یو کو سرکار اس لیے نشانہ بناتی رہی ہے، کیونکہ یہاں کے بچے یہ بات بار بار کہتے آ رہے ہیں کہ سرکار کی پالیسی کی تنقید کرنا ملک سے بغاوت نہیں ہے اور نہ ہی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ذریعہ بنائے گئے قانون کی مخالفت کرنا دہشت گری ہے۔ جے این یو کے طلبہ سچ ہی کہتے ہیں کہ ایک زندہ سماج وہ ہے، جہاں اختلاف رائے کی بھرپور جگہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح ایک کامیاب جمہوریت وہی ہے، جہاں سب کو بولنے کا حق دیا جائے۔ لوگوں کی بات سُنی جائے، نہ کہ احتجاج کو دبانے کے لیے لاٹھیاں اور گولیاں برسائی جائیں۔ میڈیا کو بھی کون سمجھائے کہ اسے اپنے مفاد کی خاطر سرکار کا ترجمان نہیں بننا چاہیے۔ اس کا دھرم تو محکوموں اور بے زبانوں کی زبان بننا ہے۔ مگر تضاد دیکھیے کہ شرجیل کو بدنام کرنے میں مین اسٹریم میڈیا خوب آگے رہتا ہے، مگر وہ اس کے خلاف لگائے گئے الزامات کی صداقت کو جانچنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔

”

جے این یو کو سرکار اس لیے نشانہ بناتی رہی ہے، کیونکہ یہاں کے بچے یہ بات بار بار کہتے آ رہے ہیں کہ سرکار کی پالیسی کی تنقید کرنا ملک سے بغاوت نہیں ہے اور نہ ہی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ذریعہ بنائے گئے قانون کی مخالفت کرنا دہشت گری ہے۔ جے این یو کے طلبہ سچ ہی کہتے ہیں کہ ایک زندہ سماج وہ ہے، جہاں اختلاف رائے کی بھرپور جگہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح ایک کامیاب جمہوریت وہی ہے، جہاں سب کو بولنے کا حق دیا جائے۔

آخر شرجیل کا قصور کیا ہے؟ یہی نہ کہ اس نے چکا جام کی بات کہی تھی۔ مگر چکا جام کی بات کرنا ملک سے بغاوت کیسے ہوسکتا ہے؟ کیسے شاہین باغ میں این آر سی اور سی اے اے مخالف تحریک کو جنم دینا دہشت گردی تھی؟ اگر شرجیل نے مبینہ طور پر کوئی جوشیلی تقریر بھی کی، تب بھی اس کے خلاف یو اے پی اے نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ اگر شرجیل کی باتوں سے سرکار کی شدید نا اتفاقی بھی تھی، تب بھی یہ کیسے اس کی گرفتاری کی بنیاد بن سکتی تھی؟ اگر شرجیل کو وہی بولنا چاہیے، جو سرکار صحیح سمجھتی ہے تو پھر جمہوریت اور آمریت میں کیا فرق رہ جائے گا! اصل مسئلہ کچھ اور ہے جو بتلایا نہیں جاتا۔ ڈر شرجیل سے نہیں ہے، نہ ہی اس کے جسم سے ہے، بلکہ خوف اس کی سوچ سے ہے۔ شرجیل امام صرف ایک فرد کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک فکر بھی ہے۔ ملک کے لاکھوں نوجوان شرجیل کو اپنا رہنما مانتے ہیں۔ پھولوں کو کچل کر، آمرانہ حکومت بہار کو آنے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرجیل کے خلاف ایک نہیں، کئی ریاستوں میں کیس درج ہیں۔ سچ میں فرقہ پرست طاقتیں شرجیل کی فکر سے ڈرتی ہیں۔ ان کو اس بات سے پریشانی ہے کہ کیسے ایک معمولی سا نوجوان ایک تحریک کو کھڑا کر سکتا ہے! یہ بات فرقہ پرستوں کو کھٹکتی ہے کہ شرجیل کی اپیل پر ہزاروں لوگ سی اے اے کے خلاف شاہین باغ میں جمع ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شاہین باغ کی تحریک کی تقلید کرتے ہوئے ہزاروں شاہین باغ کے پھول ملک بھر میں کھل گئے۔ شرجیل نے اپنی تقریروں میں بھگوا حکومت اور سابقہ سرکاروں کی پول کھول دی تھی۔ اس کی باتوں کا جواب دینے یا پھر پالیسی میں اصلاح کرنے کے بجائے، بھگوا حکومت نے شرجیل کی شبیہ خراب کرنے کی کوشش کی۔ فرقہ پرستوں کی یہ پرانی حکمت عملی رہی ہے کہ محکوموں کی بات سننے کی جگہ انہیں بدنام کردو، تاکہ ان کی باتیں بھی بے اثر ہوجائیں۔

جو لوگ آج شرجیل کو انصاف دینے سے منہ موڑ رہے ہیں، کیا ان کے پاس اس بات کا جواب ہے کہ اگر شرجیل نے چکا جام کی بات کہی تھی، تو کیا ایسا کہنے والا وہ بھارت کا پہلا شخص تھا؟ کیا احتجاج اور سول نافرمانی کا درس ہماری جنگ آزادی نہیں دیتی ہے؟ کیا اختلاف رائے ملک کے جمہوری نظام اور آئین کے دائرے سے باہر ہے؟ ایک ذمہ دار سرکار کو چاہیے کہ وہ اپنے ناقدین سے سیکھے اور اپنی پالیسی میں اصلاح کرے۔ مگر سرکار نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ مذہب کی بنیاد پر بنائی گئی کوئی بھی پالیسی بھارت کے سیکولر ڈھانچے کو مسمار کر سکتی ہے۔ شرجیل تاریخ کا طالب علم ہے اور اس کی ریسرچ تقسیم ملک اور فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر ہے۔ اس نے ہندو مسلمان، فرقہ پرستی، ریاست کے تشخص کے بارے میں خوب مطالعہ کیا ہے۔ شرجیل کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ بھارت کی سیاست کو بڑی تیزی سے فرقہ وارانہ زہر میں گھولا جا رہا تھا۔ شرجیل اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جو لڑتے ہیں وہ بھی حکومت کے ظلم و زیادتی کے شکار ہوتے ہیں اور جو خاموش بن کر ظلم و زیادتی کو دیکھتے رہتے ہیں وہ بھی کسی روز ظلم کے شکار بن جاتے ہیں۔

جے این یو کے طلبہ کا ماننا ہے کہ شرجیل صرف مسلمان ہونے کی وجہ سے جیل میں نہیں ہے، بلکہ اس لئے قید ہے کیونکہ وہ سوچنے، سمجھنے والا مسلمان ہے۔ بھگوا طاقتوں کو قیادت کرنے کی صلاحیت رکھنے والے مسلمان سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ شرجیل امام، عمر خالد، میران حیدر جیسے ذہین اور قیادت کی صلاحیت رکھنے والے طلبہ حکومت کے سیدھے نشانہ پر ہیں۔ ان کے خلاف ماحول اس لیے خراب کیا جا رہا ہے کیونکہ سرکار کو ڈر ہے کہ ان کی باتیں ظلم اور زیادتی کے خلاف لوگوں کو بولنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

مظلوموں کی فریاد کوئی سُن رہا ہے؟

کیا جمہوری ملک کے کمزور طبقوں کو اپنے اور ملک کے سیکولر آئین کیخلاف بننے والی پالیسی کی مخالفت کرنے کا بھی حق نہیں ہے؟

ابھے کمار

دو سال گزر گئے، مگر حالات نہیں بدلے۔ کچھ دن قبل جے این یو کے سابرمتی ڈھابے پر، جنوری کی اسی سرد شام میں 'سیاسی قیدیوں' کی رہائی کے لیے ایک بار پھر جلوس نکالا گیا۔ دو سال پہلے بھی اسی مقام پر اسی طرح کا جلوس منعقد کیا گیا تھا۔ ہر بار طلبہ اور سماجی کارکنان نے فریاد کی کہ شرجیل امام، عمر خالد، میران حیدر اور دیگر مسلم اور غیر مسلم سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے، کیونکہ پولیس نے انہیں دانستہ طور پر پھنسایا ہے۔ وہیں دوسری طرف جو اصل قصوروار ہیں، اُن کو نہ صرف تحفظ فراہم کیا گیا ہے، بلکہ انہیں ملک اور اکثریت ہندو طبقہ کا ہیرو بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ فریادی کی باتوں کو ابھی تک اَن سنا کر دیا گیا ہے۔ انصاف کی فریاد کرنے والے یہ نہیں کہتے کہ گناہ گاروں اور مجرموں کو بری کر دیا جائے۔ وہ تو یہ بھی مانگ نہیں کرتے کہ مسلمان اور دیگر محروم طبقات کے لیے کوئی خاص رعایت دی جائے۔ ان کی تو بس یہی اِلتجا ہے کہ ملک میں قانون کی بالادستی ہو اور سب کو قانون کے سامنے برابر سمجھا جائے۔ قانون کا راج ہو، نہ کہ ناگپور سے کوئی فرمان آئے اور اسے ہی قانون سمجھ لیا جائے۔ ملک کا محکوم طبقات یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ فیصلہ لیتے وقت یہ نہ دیکھا جائے کہ کون اکثریت ہے اور کون اقلیت ہے، بلکہ بڑا، چھوٹا، امیر، غریب، ذات، برادری، دھرم، مذہب، جنس اور نسل کے تعصب سے پاک ہو کر فیصلہ دیا جائے۔ اگر ایسا ہو جائے گا تو کوئی بھی بے گناہ جیل میں اپنی زندگی برباد کرنے کے لئے مجبور نہیں ہوگا۔

محکوم طبقات کے خلاف ہو رہے ظلم وستم کا رشتہ ان کی سماجی، تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی سے بھی ہے۔ سرکاری نوکری، کالج اور یونیورسٹی میں مسلمان اور دیگر کمزور طبقات کی نمائندگی اُن کی آبادی کے تناسب سے بہت ہی کم ہے، وہیں جیل اور پولیس تھانوں میں وہ اپنی آبادی کے تناسب سے بہت ہی زیادہ قید ہیں۔ مسلمان اس ملک میں ۱۴ فیصد کے آس پاس ہیں، جبکہ اُن کی نمائندگی اعلیٰ تعلیم میں اُن کی آبادی سے تین سے چار مرتبہ کم ہے۔ آخر کیوں آج سرکاری نوکری میں مسلمان چراغ لے کر بھی تلاش کرنے سے نہیں نظر آتے؟ کیا مسلمانوں میں میرٹ کی کمی ہے یا پھر مسلم امیدوار صلاحیت نہیں رکھتا؟ آخر بھارت کے مسلم نوجوان نوکری کے لیے کہاں جائیں؟ پڑھ لکھ کر جب ملازمت نہیں ملتی اور جب کوئی امیدوار کو انٹرویو میں اس لیے باہر کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اعلیٰ ذات میں پیدا نہیں ہوا تھا، تو اس سے بڑھ کر اور کیا ناانصافی ہو سکتی ہے؟ ایک تو مسلم امیدوار غریبی، فرقہ وارانہ تشدد اور تعصب کی وجہ سے کالج کا دروازہ نہیں دیکھ پاتا ہے، اور جس نے کسی طرح گریجویٹ، پوسٹ گریجویٹ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی، اُس کو بھی ہر روز دھکے کھانے پڑتے ہیں۔ پارلیمنٹ اور اسمبلی کا بھی حال وہی ہے، وہاں بھی کچھ ہاں میں ہاں ملانے والے لوگوں کو ٹکٹ مل جاتا ہے، سچ بولنے والوں کو کوڑے دان میں ڈال دیا جاتا ہے۔ آزادی سے پہلے مسلمانوں کو ریزرویشن ملتا تھا، اُن کی نمائندگی آج سے کہیں بہتر تھی۔ ملک کی یہ بد قسمتی تھی کہ یہ دو حصوں میں بٹ گیا اور بھارت کے متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی پاکستان چلی گئی اور آزاد بھارت کی سرکاری نے کبھی بھی مسلمانوں کو سچے من سے گلے نہیں لگایا۔ جہاں سرکاری اداروں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتا گیا، وہیں فرقہ وارانہ تشدد میں ان کی جانیں لی گئیں اور جو زندہ رہ گئے، ان کو ہر روز مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اقتدار میں بیٹھے لوگوں نے اقلیت کو برابر کا شہری نہیں سمجھا۔ بھگوا لیڈروں نے اپنی کتاب میں اس بات کو درج کیا ہے کہ مسلمان، عیسائی اور کمیونسٹ بھارت کی سالمیت کے لیے خطرہ ہیں اور وہ اندر چھپے ہوئے دشمن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے محکوں طبقات سرکاری نوکری اور اعلیٰ تعلیم میں اپنی آبادی سے کافی کم ہیں اور جو اہم عہدے ہیں، ان سے محروم طبقات کو دانستہ طور پر دور رکھا گیا ہے۔ دوسری طرف جیل میں وہ اپنی آبادی سے کہیں زیادہ ہیں۔ کیا یہ صرف اتفاق ہے؟ بالکل نہیں، آج اسی پسماندگی اور سرکاری تعصب کی وجہ سے مسلم نوجوانوں کو انصاف نہیں مل پا رہا ہے۔ اقلیتوں کے خلاف فرقہ وارانہ سوچ ہندوستان کی جمہوریت کے لیے خطرہ ہے۔ یہ ملک کو اندر سے کمزور کر رہی ہے۔ عدالتیں بھی مظلوم کے حق میں اکثر نہیں کر پاتی ہیں، کیونکہ مظلوم جب سماج میں کمزور ہے تو وہ عدالت میں برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ جو غریب ہے، جو کمزور ہے، جو دلت، پسماندہ، آدی واسی، مسلم، عیسائی، خواتین ہیں، وہ سماج کے وسائل سے محروم ہیں، اُن کے لوگ نہ عدالت میں بیٹھے ہیں اور نہ ان کا کوئی سیاسی نیٹ ورک ہے اور نہ ہی ان کے پاس پیسہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے وکیل کو اپنا کیس لڑنے کے لئے راضی کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کو طویل مدت تک جیل میں قید رہنا پڑتا ہے۔ سچ پوچھئے تو شرجیل، عمر، میران اور دیگر مسلم اور غیر مسلم سماجی کارکنان کے خلاف کوئی مضبوط کیس نہیں ہے۔ اُن کا صرف اتنا ہی قصور تھا کہ اُنہوں نے شہریت ترمیمی ایکٹ یعنی سی اے اے کی مخالفت کی اور مذہب پر مبنی اس قانون کو واپس لینے کے لیے احتجاج میں حصہ لیا۔ کیا جمہوری ملک کے کمزور طبقوں کو اپنے اور ملک کے سیکولر آئین کیخلاف بن رہی پالیسی کی مخالفت کرنے کا بھی حق نہیں ہے؟

سی اے اے کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے سرکار کے ترجمان بن چکے ٹی وی چینلوں نے شرجیل کے خلاف بہت زیادہ غلط فہمی پھیلائی تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ شرجیل نے کوئی غیر قانونی کام انجام دیا ہے، بلکہ بھگوا طاقتیں اور سیکولر گروہ میں بیٹھے کمیونل عناصر کو یہ ڈر محسوس ہونے لگا کہ شرجیل جیسے پڑھے لکھے، بے باک اور تحریک سے جڑے ہوئے مسلمان ان کے لیے مستقبل میں ایک چیلنج ہو سکتے ہیں۔ اس لیے شرجیل کی باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا اور اسے ملک کے لیے خطرہ بتایا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ شرجیل نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ سی اے اے کو واپس لینے کے لیے اور بے حس سرکار پر دباؤ ڈالنے کے لیے چکا جام ضروری ہے۔ کیا چکا جام کی کال دینا ملک سے غداری ہے؟ کیا چکا جام کی اپیل کرنے والا شرجیل ملک کا پہلا لیڈر تھا؟ اگر نہیں، تو اسے کیوں جیل میں بند کیا گیا ہے؟ اگر چکا جام کی کال دینا یا پھر پُرامن طریقے سے شاہین باغ کے دھرنے پر بیٹھنا ملک سے دہشت گردی ہے، تو نفرت انگیز تقریریں کر کے دہلی میں فسادات کو بھڑکانے والوں اور مظلوم کے خلاف حملہ کرنے والے بھگوا شرپسندوں کو کیا کہا جائے گا اور ان کے لیے کیا سزا ہونی چاہیے؟ ملک کی بد قسمتی دیکھیے کہ آج لوگوں کو اُن کا دھرم، مذہب اور ذات برادری دیکھ کر سزا اور انعام دیے جا رہے ہیں۔ ملک کے سچے محب وطن سے مظلوم طبقات کی یہ فریاد ہے کہ وہ سامنے آئیں اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کریں۔ یہ ملک ساجھی وراثت اور ساجھی شہادت کا ہے۔ اس ملک کو جتنا کمزور انگریز حکومت نے نہیں کیا، شاید اس سے بھی زیادہ دھرم اور مذہب کی لڑائی نے کیا ہے۔ اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے۔ بے گناہ قیدیوں کو انصاف ملنا چاہیے۔ کیا اس ملک میں مظلوموں کی فریاد کوئی سُن رہا ہے؟

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

ملک کی بد قسمتی دیکھیے کہ آج لوگوں کو اُن کا دھرم، مذہب اور ذات برادری دیکھ کر سزا اور انعام دیے جا رہے ہیں۔ ملک کے سچے محب وطن سے مظلوم طبقات کی یہ فریاد ہے کہ وہ سامنے آئیں اور ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کریں۔ یہ ملک ساجھی وراثت اور ساجھی شہادت کا ہے۔ اس ملک کو جتنا کمزور انگریز حکومت نے نہیں کیا، شاید اس سے بھی زیادہ دھرم اور مذہب کی لڑائی نے کیا ہے۔

سماج، سیاست اور ذات پات

اگر ذات برادری پر مبنی سیاست کو ختم کرنا ہے تو اس کی زہریلی جڑوں کو پہلے اکھاڑ پھینکنا ہوگا

ابھے کمار

آج سے ۳۲ سال پہلے اسی برسات کے موسم میں منڈل کمیشن کی سفارشات کو تب کی وی پی سنگھ سرکار نے نافذ کیا تھا۔ حالانکہ اپنی رپورٹ میں کمیشن نے پسماندہ طبقات کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے لیے بہت سارے مشورے دیے تھے، مگر زیادہ تر سفارشات کو آج بھی عملی جامہ نہیں پہنایا گیا ہے۔ صرف سرکاری اداروں کی نوکریوں اور درس گاہوں میں او بی سی کو ۲۷ رفیصد ریزرویشن دینے کا فیصلہ لیا گیا، جس کے خلاف ملک بھر کی اعلیٰ ذات کی لابی کھڑی ہوگئی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اعلیٰ ذات کی بالادستی کالج، یونیورسٹی اور تحقیقی اداروں سے لے کر میڈیا تک پائی جاتی ہے۔ اقتدار کے گلیاروں سے لے کر سرمایہ داروں کی کمپنیوں تک ان کا ہی راج چلتا ہے۔ فلم، کلچر اور ادب سے لے کر مذہبی مقامات تک ایک ہی طرح کے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کو یہ ڈر ستانے لگا کہ منڈل کمیشن کی وجہ سے ان کی بالادستی پر چوٹیں پڑ سکتی ہیں۔ اس لیے منڈل کمیشن اور سماجی انصاف کی سیاست کو بدنام کرنے کے لیے، اعلیٰ ذات کی لابی سیاست میں ذات پات کی دخل اندازی پر ماتم کرنے لگی۔ پسماندہ طبقات کے زیر قیادت والی سیاست کو منفی طور پر پیش کیا گیا۔ الزام لگایا گیا کہ منڈل کمیشن نے ملک کی سیاست میں ذات پات کو لا کر سماج میں درار پیدا کیا ہے۔ حالانکہ سچائی کچھ اور ہے۔ منڈل کمیشن نے ذات پات کو نہیں پھیلایا، بلکہ بھارت کی تقریباً آدھی آبادی کو ان کے حقوق دینے کی ایک چھوٹی سی پہل کی۔ ہمارے سماج میں اعلیٰ ذات اصل میں ایک اقلیت ہیں۔ وہیں اصل اکثریت دلت، آدی واسی، او بی سی، مذہبی اقلیت ہیں۔ مگر اعلیٰ ذات کی لابی نے ملک کی تاریخ اور سیاست کو ایک مصنوعی خطوط پر بانٹ رکھا ہے۔ ذات پات پر مبنی غیر برابری کو چھپانے کے لیے ہندو بنام مسلمان کی سیاست کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب منڈل سیاست سماجی انصاف کے سوالات کو سامنے لا رہی تھی، تب بی جے پی کے سرکردہ لیڈر لال کرشن اڈوانی نے رتھ یاترا نکالی اور فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے کا کام کیا۔

جو لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ سیاست میں ذات برادری کا 'گندا' کھیل منڈل سیاست کے بعد شروع ہوگیا، وہ کبھی اس بات پر منہ نہیں کھولتے ہیں کہ ذات پات کا اصل کھیل تو معاشرے میں دیکھا جاتا ہے۔ تمام خامیوں کے باوجود ملک کے بڑے عہدوں پر بعض دلت، آدی واسی، پسماندہ اور اقلیت کے لوگ پہنچ پائے ہیں، مگر آج بھی ہمارا سماج دلت، آدی واسی اور پسماندہ طبقات کو پوری طرح سے عزت اور برابری دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تضاد دیکھیے کہ جب حکومت کو چلانے والے لوگ اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور وہاں محکوم کو واجب جگہ نہیں مل پاتی ہے تب ذات پات کا رونا نہیں رویا جاتا ہے۔ مگر جیسے ہی دلت، آدی واسی، پسماندہ طبقات کے لوگ پارلیمنٹ اور اسمبلی پہنچے ہیں اور ان میں سے کچھ وزیر اعلیٰ یا وزیر بن جاتے ہیں تو ہر طرف ہائے توبہ مچ جاتی ہے۔ جب اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والا چیف منسٹر اپنی ذات اور برادری کے لوگوں کو اہم عہدوں پر بٹھاتا ہے تو میڈیا اور دانشوروں کو ذات پات نظر نہیں آتی ہے۔ مگر جب کوئی دلت یا پسماندہ وزیر اعلیٰ کی کرسی کے پاس پہنچ جاتا ہے یہ افواہ پھیلائی جاتی ہے کہ سماج کے اندر مین ذات برادری پھیل گئی ہے۔ جیسے جیسے پسماندہ طبقات کے لوگ سیاست میں آنے لگے ویسے ویسے سیاست بڑی خراب چیز بن گئی اور کہا جانے لگا کہ شریف لوگوں کو اس سے دور رہنا چاہیے۔

”
جو لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ سیاست میں ذات برادری کا 'گندا' کھیل منڈل سیاست کے بعد شروع ہو گیا، وہ کبھی اس بات پر منہ نہیں کھولتے ہیں کہ ذات پات کا اصل کھیل تو معاشرے میں دیکھا جاتا ہے۔ تمام خامیوں کے باوجود ملک کے بڑے عہدوں پر بعض دلت، آدی واسی، پسماندہ اور اقلیت کے لوگ پہنچ پائے ہیں، مگر آج بھی ہمارا سماج دلت، آدی واسی اور پسماندہ طبقات کو پوری طرح سے عزت اور برابری دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

آزاد بھارت کی سیاست میں ذات پات کا شعور روز اول سے کام کر رہا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر ہر طرف اعلیٰ ذات کے لوگ کیوں نظر آ رہے تھے، جبکہ سماج میں اکثریت بہوجن سماج کی ہے؟ دراصل ۱۹۷۰ء کے قریب تک، تمام بڑی پارٹیوں میں اعلیٰ ذات کے لوگ ہی قابض تھے۔ کانگریس ہو یا کمیونسٹ پارٹی یا پھر جن سنگھ، ہر طرف اعلیٰ ذات کے لیڈران ہی نظر آتے تھے۔ زرعی اصلاحات اور سبز انقلاب کی وجہ سے متوسط ذاتوں کو تھوڑا فائدہ ملا اور ان کے حالات کچھ بہتر ہوئے۔ پھر انہوں نے سیاست میں بھی اپنا حقوق مانگا شروع کیا۔ لمبے وقت سے اقتدار میں رہنے کی وجہ سے کانگریس پارٹی اپنی راہ سے کافی بھٹک چکی تھی۔ روایتی طور سے کانگریس کے اندر اعلیٰ ذات کی ہی قبضہ رہا ہے۔ اس لیے متوسط ذاتوں نے اپنا رخ اپوزیشن کی پارٹیوں کی طرف کیا۔ سوشلسٹ پارٹیوں نے ان کو ایک حد تک جگہ دی۔ اس زمانہ کے سوشلسٹ لیڈر رام منوہر لویا، جے پرکاش نرائن اور کرپوری ٹھاکر نے پسماندہ ذاتوں کے نوجوان کارکنان کی رہنمائی کی۔ لالو پرساد یادو، نتیش کمار، رام ولاس پاسوان جیسے لیڈر اسی سوشلسٹ تحریک سے نکلے ہیں۔ جب ۱۹۷۷ء میں کانگریس پارٹی کو بری طرح سے شکست دے کر جنتا پارٹی کی سرکار بنی، تب منڈل کمیشن کی تشکیل دی گئی تھی۔ حالانکہ کمیشن نے اپنی رپورٹ کچھ ہی برسوں میں جمع کر دی، مگر مرکز کی کانگریس سرکار نے اسے ٹھنڈے بستے میں ڈالے رکھا۔ ایک دہائی بعد جب جنتا دل کی سرکار آئی تب اسے نافذ کیا گیا۔

اعلیٰ ذات کے لیڈروں کو یہ بات بخوبی معلوم تھی کہ ملک میں پسماندہ طبقات کی تعداد اکثریت ہے۔ اس لیے اگر انہوں نے اس کی مخالفت سامنے آ کر کی، تو بھران سے پسماندہ طبقات کے ووٹر دور چلے جائیں گے۔ اس لیے انہوں نے پورے مسئلے کو ڈائیورٹ کرنے کی سازش رچی۔ جہاں بھاجپا کے لوگوں نے رام مندر کے نام پر لوگوں کو مذہبی خطوط پر متحد کرنے کی کوشش کی، وہیں لیفٹ کی اعلیٰ ذات کی لابی نے گول مول بولنا شروع کر دیا۔ کالج اور یونیورسٹی میں بیٹھے اعلیٰ ذات کے طلبہ اور پروفیسر منڈل کمیشن کی مخالفت میں سب سے زیادہ آگے تھے۔ مین اسٹریم میڈیا نے بھی اعلیٰ ذات کے مفاد کو بچانے کے لیے لکھنا اور بولنا شروع کر دیا۔ پھر سیاست میں ذات پات کی دخل اندازی پر ماتم کیا جانے لگا۔ ایسا ماحول بنایا جیسے منڈل کمیشن نے بھارت میں ذات پات کو جنم دے دیا اور بھائی چارے کو ختم کر دیا ہے۔ سیاست میں ذات پات کی دخل اندازی پر ہو رہے ماتم کو ہمیں اسی سیاق میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جب بھارت کی سیاست میں ہر طرف اعلیٰ ذات کے لوگ چھائے ہوئے تھے تب سیاست میں سب کچھ اچھا چل رہا تھا، مگر جیسے ہی محکوم طبقات کے لوگ سرکاری اداروں میں پہنچنے لگے، ہر طرف ذات برادری نظر آنے لگی۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک میں ایک سیکولر آئین ہے اور مساوات پر مبنی قانون بھی موجود ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ذات پات کی غیر برابری آج بھی سماج میں جڑیں جمائے ہوئے ہے۔ جس کے خلاف ارباب اقتدار خاموش رہتے ہیں۔ جب کوئی اپنی ہی ذات میں شادی کرتا ہے، جب وہ اپنے رسوئی خانہ میں دلت اور پسماندہ طبقات کو داخل ہونے نہیں دیتا ہے، جب کوئی ذات کو دیکھ کر کسی دوسرے کا فائدہ کرتا ہے یا اس کا حق مارتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ذات پات کا نظام چل رہا ہے۔ تبھی تو اگر سیاست سے ذات پات کو واقعی ختم کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ذات پات کی بنیاد پر ہو رہی غیر برابری کو تسلیم کیا جائے اور اس کو دور کرنے کے لیے موثر منصوبہ بنایا جائے۔ اگر ذات برادی پر مبنی سیاست کو ختم کرنا ہے تو اس کی زہریلی جڑوں کو پہلے سماج سے اکھاڑ پھینکنا ہوگا۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

فکر و نظر

مسلمانوں کی دل شکنی،یوگی کی تعریف: یہ کیسی ثالثی ہے روی شنکر جی؟

ابھے کمار 01/03/2018

کیا وجہ ہے کہ ایک خاص حکومت کو اقتدار سے باہر کرنے کے لئے روی شنکر بابا سے سیاست داں بن جاتے ہیں اور جب ان کی پسندیدہ سرکار اقتدار پر قابض ہو جاتی ہے، تو وہ پھر سے ''سنیاسی'' بن جاتے ہیں اور سیاست سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں؟

فوٹو: پی ٹی آئی

بدھ کی صبح جب میں اخبارات کے صفحات اُلٹ رہا تھا، تو میری نظر اچانک "آرٹ آف لیونگ" کے بانی شری شری روی شنکر اور اتر پردیش کے وزیر علیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کی ایک تصویر پر پڑی۔ روزنامہ دینک جاگرن میں یہ تصویر ایک رپورٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔ روی شنکر اور یوگی آدتیہ ناتھ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور دونوں کے چہرے پر مسکان تھی۔ مگر اس مُسکراتی تصویر کے اوپر جو موٹی سرخی لگائی گئی تھی، وہ مسلمانوں کو رلانے کے لئے کافی تھی: "کچھ دُریودھن تو ایک انچ بھی زمین نہیں چھوڑنا چاہتے ہیں: شری شری"۔

یہ سرخی روی شنکر کے بنارس والے بیان سے لی گئی، جو انہوں نے منگل کو دیا تھا۔ بنارس میں سادھو اور سنتوں کی ایک مجلس سے خطاب کرتے ہوئے، انہوں نے عدالت سے باہر بابری مسجد اور رام مندر تنازعہ حل کرنے کی بات پھر دوہرائی۔ ان کی دلیل تھی کہ عدالت میں کسی نہ کسی فریق کی ہار ہونی طے ہے، جو وہ یہ نہیں چاہتے۔ انہوں نے بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ بھی دعویٰ کیا کہ زیادہ تر لوگ ان کے ثالثی کو ماننے لگے ہیں، بس کچھ دُریودھن اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

جاگرن اخبار نے روی شنکر نے کی تقریر کا اختصار ان الفاظ میں کیا ہے کہ: رام مندر سے سو کروڑ لوگوں کا عقیدہ جڑا ہوا ہے۔ اس کا احترام ہونا ہی چاہئے۔ اس سے زیادہ قیمتی زمین کا ٹکڑا نہیں ہو سکتا۔ اس بات سے فریقین کے زیادہ تر لوگ راضی ہیں، لیکن، کچھ دُریودھن تو ہمیشہ ہوتے ہی رہتے ہیں جو ایک انچ زمین بھی نہیں دوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔ تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو ایسے لوگ مہابھارت کے دُریودھن کی ہی باتیں دوہرا رہے ہیں۔ اس سے تو نہ دھرم مانے گا، نہ جنتا اور نہ ہی اِیشور۔ (دینک جاگرن، راشٹریہ سنسکرن، 28 فروری، ص 4)

دیگر میڈیا نے بھی روی شنکر کے ذریعہ دُریودھن جیسے قابل اعتراض لفظ استعمال کرنے کی رپورٹ یا ویڈیو کو شائع کیا۔ "اے بی پی نیوز" کی رپورٹ کے مطابق، روی شنکر نے کہا کہ "کچھ دُریودھن نہیں چاہتے کہ سوہارد (ہم آہنگی) بنے"۔

ہندوستان" ہندی ویب سائٹ کی خبر اور ویڈیو سے بھی صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنے حریف کو دُریودھن کہہ کر للتاڑا۔

श्रीश्री बोले–कुछ दुर्योधन एक इंच भी जमीन नहीं छोड़ना चाहते

कहा– राम मंदिर से सौ करोड़ लोगों की आस्था जुड़ी है

जागरण संवाददाता, वाराणसी : काशी से अवध तक की ओम अनुग्रह यात्रा पर निकलने से पहले आर्ट ऑफ लिविंग के प्रणेता श्रीश्री रविशंकर ने राम मंदिर मुद्दे पर सहमति में रोड़ा बन रहे लोगों को निशाने पर लिया। कहा राम मंदिर से 100 करोड़ लोगों की आस्था जुड़ी है, इसका सम्मान होना ही चाहिए। इससे अधिक मूल्यवान जमीन का एक टुकड़ा नहीं हो सकता। इस बात से दोनों वर्ग के अधिकतर लोग राजी हैं, लेकिन कुछ दुर्योधन तो हमेशा होते ही हैं, जो एक इंच जमीन भी नहीं दूंगा, जैसी बातें कर रह रहे हैं। इसके लिए मर-मिटने के दावे कर रहे हैं। इतिहास उठाकर देखें तो ऐसे लोग महाभारत के दुर्योधन की ही बातें दोहरा रहे हैं। इसे न तो धर्म मानेगा, न जनता और न ही ईश्वर।

आध्यात्मिक गुरु श्रीश्री रविशंकर चौकाघाट स्थित सांस्कृतिक संकुल में संत समागम को संबोधित कर रहे थे। उन्होंने कहा कि हम आज एक विचित्र स्थिति में पहुंच गए हैं। कुछ संत कह रहे हैं कि रामजन्म भूमि मामले में न्यायालय का आदेश ही सर्वमान्य होगा, ऐसे विचार मुस्लिम समाज में कुछ लोगों के हैं। मेरा मानना है कि कोर्ट में एक पक्ष की हार तो एक की जीत होगी। इससे हारने वाले के मन में हमेशा के लिए द्वेष भावना बनी रहेगी जो अगले सौ-डेढ़ सौ वर्ष बाद भी जाग सकती है, जिसका खामियाजा समाज को भुगतना पड़ सकता है। ऐसे में इस समस्या को जड़ से समाप्त करने के लिए सौहार्दपूर्ण वातावरण में एक-दूसरे पर भरोसा करते हुए बातचीत से समाधान

दो संतों का मिलन : गोरखपुर आए श्रीश्री रविशंकर मंगलवार को गोरखनाथ मंदिर पहुंचे। वहां गोरक्षपीठाधीश्वर व उप्र के मुख्यमंत्री योगी आदित्यनाथ ने उनका स्वागत किया ● संगम दूबे

श्रीश्री का उद्घोष, 'जीवन को जानें'

हरिशंकर मिश्र, गोरखपुर : पूर्वांचल में निकली ओम अनुग्रह यात्रा में मंगलवार को आध्यात्मिक गुरु श्रीश्री रविशंकर ने लोगों के बीच गीत–संगीत और भजनों के साथ जीवन से जुड़ी बड़े सरोकारों की बातें तो छेड़ी ही, जीवन को विशाल नजरिये से देखने और उसे जानने का मंत्र भी दिया। लोगों के बीच मंदिर से जुड़े सवाल भी थे और श्रीश्री ने इस बात पर जोर दिया कि मंदिर दोनों पक्षों की सहमति से ही बनेगा। मऊ, देवरिया और गोरखपुर में उन्हें देखने–सुनने और आशीर्वाद हासिल करने के लिए भक्त आतुर रहे। पूर्वांचल में मंगलवार को काशी से लेकर गोरखपुर तक श्रीश्री के शब्दों के रूप में अध्यात्म और जीवन के मूल मंत्रों की सरिता बही। श्रीश्री के नेतृत्व में काशी में संत समागम के बाद एक हजार से अधिक लोगों के साथ चली विशेष ट्रेन के भीतर देश–विदेश से आए अनुयायियों ने भजन–कीर्तन के साथ माहौल को रास्ते भर आध्यात्मिक बनाए रखा। मऊ में बड़ी संख्या में श्रीश्री को सुनने आए किसानों को उन्होंने जैविक खेती का संदेश दिया। यह उनकी इस आध्यात्मिक यात्रा का मूल उद्देश्य भी था। किसानों को उन्होंने जैविक खेती का बालियां दिखाकर बताया कि इससे चार गुना अधिक फसल की पैदावार की जा सकती है। गुरु के जयकारों के बीच श्रीश्री ने दहेज न लेने और महिलाओं को सशक्त बनाने की शपथ भी दिलाई। देवरिया में स्टेशन पर ही सैकड़ों भक्त जमा थे। आध्यात्मिक गुरु ने उनके भावनात्मक पक्ष को केंद्र में रखते हुए अपनी बात शुरू की कि देवरहा बाबा ने उन्हें

دُریودھن کون تھا؟ اور دُریودھن لفظ کا استعمال کیوں قابل اعتراض ہے؟ دُریودھن مہابھارت (قدیم بھارت) کے ایک منظوم داستان کا ایک متنازعہ کردار ہے۔ مہابھارت کی کہانی کے مطابق، قدیم زمانہ میں دُریودھن ہستناپور ریاست کا راجہ دھرت راشٹر کا بڑا بیٹا تھا، جس کی اپنے چچیرے بھائیوں (پانڈوں) سے راج پاٹ کو لے کر اختلاف تھا اور ان کے مابین بعد میں چل کر ایک انتہائی خونی جنگ ہوئی۔ برہمنی تشریحات نے دُریودھن کے کردار کو کافی منفی دکھایا ہے، جو اپنے بھائیوں کی حق تلفی کرتا ہے، ان کے ساتھ طرح طرح کی سازش کرتا ہے اور پانڈوں کی بیوی دروپدی کی عزت کو بھی تار تار کرنے کی جرات کرتا ہے۔ جنگ روکنے کے مقصد سے ایک بار کرشن دُریودھن کے پاس پانڈو کا سفیر بن کر جاتے ہیں اور اس سے گزارش کرتے ہیں کہ امن اور صلح کی خاطر وہ سارا راج پاٹ اپنے پاس رکھ لے اور پانڈو کو صرف پانچ گاؤں دے دے تاکہ وہ بھی اپنی زندگی گزر بسر کرلے، مگر دُریودھن کرشن کی اس تجویز کو ٹھکرا دیتا ہے اور پانڈو کو سوئی کی نوک برابر زمین دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

دُریودھن کی مثال دے کر روی شنکر اپنے آپ کو کرشن اور مسلمانوں کو امن اور صلح کی راہ میں رکاوٹ ہونے کا الزام لگا رہے تھے۔ اس میں ان کی دھمکی بھی مضمر ہے کہ اگر مہابھارت یعنی جنگ (کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ) ہوتا ہے تو اس کے ذمہ دار مسلمان ہوں گے۔ اس بات کی وضاحت کرنا ضروری ہے کہ جب وہ اپنے حریفوں کو دُریودھن کہہ رہے تھے، تو انہوں نے مسلمانوں کا نام نہیں لیا۔ مگر کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ ان کا اشارہ عام مسلمان اور ان سے وابستہ ملی تنظیموں سے تھا۔

یہ بھی پڑھیں: پرسنل لاء بورڈ کی معتبریت کو 'سلمان ندوی کا چیلنج (http://thewireurdu.com/23705/babri-masjid-dispute-salman-nadwi-and-muslim-personal-law-board/)'

اس کے علاوہ مسلمانوں میں اس بات کی ناراضگی ہے کہ روی شنکر نے ابھی تک مسلم ملت کی بڑی تنظیم کو اس نام نہاد مکالمہ سے دور رکھا ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے تو ایسے لوگوں سے ملاقات کی جو کسی بھی طرح سے مسلم ملت کے نمائندہ نہیں مانے جاتے ہیں۔ آر ایس ایس، بھاجپا اور دیگر ہندوتوا تنظیمیں بار بار بین المذاہب مکالمہ کی بات تو کرتی ہے، مگر وہ ہمیشہ سے ایسے عناصر کو گفتگو کے لئے مدعو کرتی ہیں، جن کی پکڑ مسلم معاشرہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کچھ اسی طرح کا منظر گزشتہ سالوں میں دیکھنے کو ملا ہے جب برسر اقتدار مودی حکومت نے پوری طرح سے بڑی مسلم تنظیم کو نظر انداز کیا ہے اور اس کی جگہ ایسے عناصر کو مسلم سماج کا نمائندہ تسلیم کیا ہے جن کو مسلم معاشرہ میں لوگ جانتے تک نہیں ہیں۔

غور طلب ہے کہ روی شنکر مشرقی اترپردیش میں سہ روزہ "روحانی" سفر پر ہیں، جس کا آغاز 26 فروری کو سارناتھ اور بنارس سے ہوا۔ اس ٹرین میں روی شنکر کے علاوہ ان کے سینکڑوں بھکت بھی شامل ہیں۔ یہ ٹرین مشرقی اترپردیش کے کئی علاقوں سے ہوتے ہوئے لکھنؤ میں اختتام پذیر ہوئی۔ اسی دوران منگل کی شام روی شنکر گورکھپور پہنچے اور وزیر اعلیٰ یوگی سے ملاقات کی ان کی بھاجپا حکومت کی تعریف کرنے سے گریز نہیں کی۔

یہی وجہ ہے کہ سلمان ندوی اور ان کے بعض حمایتوں کو چھوڑ کر، ایک بڑی تعداد میں مسلمان اور دیگر سیکولر جماعت سے وابستہ لوگ روی شنکر کی نیت پر سوال اُٹھا رہے ہیں۔ ان کو لوگ ہندو سماج کا نہیں بلکہ بھاجپا سرکار کا نمائندہ مان رہے ہیں۔ ان لوگوں نے واجب سوال اٹھایا ہے کہ یہ کون سی ہندو مسلم ہم آہنگی پر مبنی ثالثی ہے، جس میں امن کا سفیر ایک

فریق کو لعن طعن کر رہا ہے اور بھاجپا کے لئے بیٹنگ کر رہا ہے۔ گورکھپور ضمنی پارلیمانی انتخابات کے لئے مہم جاری ہے اس بیچ روی شنکر کا اپنے حامیوں کے ساتھ اس علاقہ کا دورہ کرنا اور پھر بر سر اقتدار بھاجپا حکومت کی تعریف کرنا، کس طرح سے غیر جانبدارانہ ثالثی ہے؟

روی شنکر کا بھاجپا پریم کوئی نیا نہیں ہے۔ آپ سب کو یاد ہوگا کہ منموہن سنگھ کی قیادت والی گزشتہ حکومت کے خلاف بدعنوانی کا جو ماحول بنا تھا، اس میں روی شنکر نے بھی اپنا اہم رول ادا کیا اور کالا دھن کے خلاف آواز بلند کی۔ مگر جب موجودہ سرکار کے کالادھن معاملے میں روی شنکر نے کوئی مذمتی بیان نہیں جاری کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک خاص حکومت کو اقتدار سے باہر کرنے کے لئے روی شنکر بابا سے سیاست داں بن جاتے ہیں اور جب ان کی پسندیدہ سرکار اقتدار پر قابض ہو جاتی ہے، تو وہ پھر سے ''سنیاسی'' بن جاتے ہیں اور سیاست سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں؟

اگر روی شنکر بابری مسجد کا تنازعہ حل کرنے کے لئے واقعی سنجیدہ ہیں، تو کیا وہ اس بات کی ضمانت دیں گے کہ حکومت اس کے بعد کسی بھی مذہبی مقام کی مکمل تحفظ کی ذمہ داری لے گی؟ بابری مسجد اور رام مندر تنازعہ کی زد میں آنے والے سارے لوگوں کو انصاف ملے گا؟ کیا نفرت پھیلانے والے سارے لوگوں کو سزا ملے گی؟ کیا سرکار شدت پسند تنظیم اور اس سے وابستہ عناصر کو قانون شکنی کے جرم میں گرفتار کرے گی؟ کیا مسلمانوں کے فلاح اور بہبود کے مسائل جیسے ریزرویشن کو بھی سرکار کورٹ میں چیلنج نہیں کرے گی اور مل بیٹھ کر اس کی راہ ہموار کرے گی؟

Tuesday, June 28, 2022, New Delhi, www.inquilab.com

تیستا سیتلواڑ کی گرفتاری کے مضمرات

سیتلواڑ لمبے وقت سے فرقہ پرستی اور نفرت کے خلاف لڑ رہی ہیں، وہ سماجی انصاف کے اصول میں بھی یقین رکھتی ہیں

ابھے کمار

سماجی و انسانی حقوق کارکن، صحافی اور مصنفہ تیستا سیتلواڑ کو گجرات اے ٹی ایس نے گرفتار کر لیا ہے۔ ممبئی میں واقع ان کی رہائش گاہ سے انہیں اتوار کے روز تحویل میں لے لیا گیا۔ ان کے خلاف پولیس نے جعلسازی اور دھوکہ دہی سمیت کئی دفعات لگائی ہیں۔ وہیں پولیس پر سیتلواڑ نے یہ الزام لگایا ہے کہ انہیں گرفتار کرتے وقت زور زبردستی کی گئی اور اس دوران ان کو چوٹیں بھی آئی ہیں۔ یکم جولائی تک سیتلواڑ کو پولیس حراست میں بھیج دیا گیا ہے۔ سیتلواڑ کے علاوہ سابق پولیس ڈائرکٹر جنرل آر بی سری کمار اور سابق آئی پی ایس سنجیو بھٹ پر بھی مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ ان لوگوں پر بھی پولیس نے جعلسازی کرنے اور معصوم لوگوں کو پھنسانے سے متعلق مقدمہ دائر کیا ہے۔ اس پورے معاملہ کی جانچ کے لیے گجرات حکومت نے ایک ایس آئی ٹی بنائی ہے۔ ان سب کارروائیوں کے خلاف ملک بھر میں احتجاج ہو رہے ہیں اور انسان حقوق سے وابستہ تنظیموں نے اس بات پر گہری تشویش کا اظہار کیا ہے کہ انصاف کا مطالبہ کرنے والوں پر ہی پولیس اُلٹے کارروائی کر رہی ہے۔ بہت سارے انصاف پسند لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سیتلواڑ کو پریشان کرنے پیچھے ہندوتوا طاقتوں ایک سخت پیغام بھی دینا چاہتی ہیں۔ پیغام یہ ہے کہ انہیں چیلنج کرنے والوں کو ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ تیستا سیتلواڑ کی گرفتاری کے پیچھے ایک سیاق بھی ہے۔ ان کی گرفتاری سے ایک دن پہلے سپریم کورٹ نے گجرات فسادات سے متعلق ایک فیصلہ سنایا تھا۔ اس میں ذکیہ جعفری سے متعلق ایک عرضی کو خارج کر دیا گیا۔ یہ عرضی ایس آئی ٹی کی جانچ رپورٹ کو چیلنج کر رہی تھی، جس نے گجرات کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو کلین چٹ دے دی تھی۔ سپریم کورٹ نے نہ صرف عرضی خارج کی، بلکہ اس کیس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جن لوگوں نے بھی اس پورے معاملہ میں غلط طریقہ کار استعمال کیا ہے، ان کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی ہونی چاہیے۔ عدالت کے اس تبصرہ کے بعد گجرات پولیس نے سیتلواڑ اور دیگر کے خلاف نیا مقدمہ درج کیا اور ان کی دھر پکڑ شروع ہو گئی۔

پوری کارروائی کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ گجرات پولیس سیاسی دباؤ میں کام کر رہی ہے۔ المیہ دیکھیے حکومت اور انتظامیہ میں بیٹھے جن لوگوں پر فسادات کے دوران اپنے فرائض کو انجام نہ دینے کا الزام تھا، اب وہی لوگ عدالت کے فیصلے کا استعمال ان لوگوں پر کر رہے ہیں جنہوں نے مظلوموں کو انصاف دلانے کے لیے جدو جہد کی۔ سیاست داں تو اپنے مفاد میں طاقت کا غلط استعمال کرتے رہے ہیں، مگر عدالت کی یہ پوری ذمہ داری ہے کہ وہ ملک کے کمزور ترین لوگوں کے مفاد کو ترجیح دے۔ مگر پچھلے کچھ سال سے عدالت عظمیٰ کے بہت سارے فیصلوں نے لوگوں کو کافی مایوس کیا ہے۔ رام مندر بابری مسجد تنازع کا ہی معاملہ لے لیجیے۔ جس مسجد کو دن کی روشنی میں توڑا گیا، اس کی شناخت قبول نہیں کی گئی۔ ذکیہ جعفری کی عرضی کو مسترد کرتے ہوئے کورٹ نے جو تبصرے کیے ہیں وہ بھی کافی تشویشناک ہیں، کیونکہ عدالت نے انسانی حقوق کے لیے لڑنے والوں اور مظلوموں کی آواز بلند کرنے والوں کو ہی نشانہ بنایا ہے۔ عدالت کو یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اس فیصلہ کے انتظار میں بھگوا سیاست داں کافی لمبے وقت تھے۔ عدالت کے اس فیصلے کی اب وہ اپنے طریقے سے تشریح کر رہے ہیں اور ان لوگوں کو پکڑ رہے ہیں جنہوں نے ان کی سیاست کو کافی عرصہ سے چیلنج کیا ہے۔ سیتلواڑ بھی لمبے وقت سے فرقہ پرستی اور نفرت کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ وہ سماجی انصاف کے اصول میں بھی یقین رکھتی ہیں۔ بابا صاحب امبیڈکر کے افکار سے بھی وہ کافی متاثر ہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر میں ذات اور جنس کی بنیاد پر ہو رہے امتیاز کے خلاف بھی صدائے احتجاج ہے۔

> کیا یہ بات کسی سے پوشیدہ ہے کہ فسادات ہوتے نہیں، بلکہ کروائے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب تک پولیس جائے واردات پر نہ پہنچے، تب تک کچھ لوگوں کو کاٹ مار دیا جائے، مگر کیا فسادات کئی کئی دنوں تک چلتے رہیں گے، اگر اسے روکنے کے لیے پولیس اور انتظامیہ سنجیدہ ہو؟ بہت سارے سیاسیات کے ماہرین اور پولیس میں کام کرنے والے اعلیٰ افسران کا کہنا ہے کہ فسادات ہوتے نہیں، بلکہ کروائے جاتے ہیں۔

عدالت کو یہ بات سمجھنی چاہیے تھی کہ ریاست کی طاقت کے سامنے کسی فرد یا تنظیم کی طاقت کچھ بھی نہیں ہوتی ہے۔ اکثر ریاست اپنے مفاد کے لیے لوگوں کا استحصال کرتی ہے۔ جو بھی اس کے ظلم و زیادتی کے خلاف بولے، ریاست کچلنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لیے جب کوئی فرد یا کوئی تنظیم ریاست یا اقتدار میں بیٹھے لوگوں کے خلاف کیس درج کرتا ہے تو عدالت کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ دونوں کی طاقت ایک برابر ہرگز نہیں ہے۔ ریاست اور ارباب اقتدار کے پاس پوری مشینری ہوتی ہے، جس کی بنیاد پر وہ اپنے حریف کو ٹارگیٹ کرتی ہے۔ اعتدال پسند سیاسی افکار نے ہمیشہ ریاست کو شخصی آزادی کے لیے ایک خطرہ مانا ہے۔ ہمارے آئین میں بھی بنیادی حقوق کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ انسانوں کی شخصی آزادی کے ضامن ہیں۔ بنیادی حقوق شخصی آزادی پر ریاست کے حملوں کے خلاف ایک شیلڈ کا کام کرتا ہے۔ یہ بات کورٹ کئی بار فراموش کر دیتا ہے کہ ریاست ہمیشہ سالمیت اور قومی مفاد کے نام پر ہی لوگوں کو پریشان کرتی ہے اور ایسے ایسے قانون کو پارلیمنٹ سے پاس کرا لیتی ہے جو آئین کے بنیادی حقوق کے لیے خطرہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے عدالت کو چاہیے کہ کسی فرد اور ریاست کو ایک ہی ترازو میں نہ تولے۔ عدالت نے اپنے مذکورہ تبصرہ میں پولیس اور ریاست کو یہ موقع دے دیا ہے کہ وہ مظلوم لوگوں کی آواز بلند کرنے والے لوگوں کے خلاف کارروائی کر سکے۔

کیا یہ بات کسی سے پوشیدہ ہے کہ فسادات ہوتے نہیں، بلکہ کروائے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب تک پولیس جائے واردات پر نہ پہنچے، تب تک کچھ لوگوں کو کاٹ مار دیا جائے، مگر کیا فسادات کئی کئی دنوں تک چلتے رہیں گے، اگر اسے روکنے کے لیے پولیس اور انتظامیہ سنجیدہ ہو؟ بہت سارے سیاسیات کے ماہرین اور پولیس میں کام کرنے والے اعلیٰ افسران کا کہنا ہے کہ فسادات ہوتے نہیں، بلکہ کروائے جاتے ہیں۔ ہر حکومت کے پاس ایک خفیہ محکمہ ہوتا ہے، جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ کام کرتے ہیں۔ کیا ان کو اس بات کی خبر نہیں تھی کہ گجرات میں اتنا بڑا فساد ہونے جا رہا ہے؟ کیا انہوں نے سرکار کو خبردار نہیں کیا ہوگا؟ عدالتیں تو فیصلہ دیتی ہی رہتی ہیں، مگر اس کے سارے فیصلہ تنقید سے پرے بھی نہیں ہوتے۔ تاریخ نے ماضی کے کئی عدالتی فیصلوں کو کوڑے کے ڈھیر میں بھی ڈال دیا ہے۔ یاد رکھیے معصوموں کا خون اور ان کی آہ میں بڑی گرمی ہوتی ہے۔ وہ ظلم و زیادتی کے بڑے سے بڑے قلعہ کو پانی کی ترح پگھلا دیتی ہے۔ آج تیستا سیتلواڑ اور ان جیسے دیگر انصاف پسند لوگوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے، جو جمہوریت پر حملے کے مترادف ہے۔ آیئے، پر امن طریقے سے مظلوموں کی آواز بلند کرنے والوں کو خاموش کرنے کی کوشش کے خلاف ہم اپنی آواز بلند کریں۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

اور اب ’تھوک جہاد‘ کا نیا فتنہ

اس طرح کے حکم نامے ایک فرقہ وارانہ سازش کا حصہ ہیں، جو محکوم طبقات، بالخصوص مسلمانوں اور دلتوں کو معاشی طور پر مزید کمزور کر سکتے ہیں

ابھے کمار

گزشتہ دنوں بی جے پی کے زیر اقتدار ریاستوں نے کھانے پینے کی اشیاء میں ’تھوک‘ اور ’پیشاب‘ ملانے کے مبینہ واقعات کو روکنے کے لیے سخت حکم نامے جاری کیے ہیں۔ پولیس نے ہوٹل کے عملے کی لازمی تصدیق اور باورچی خانے میں سی سی ٹی وی کیمروں کی تنصیب کا بھی حکم دیا ہے۔

اتراکھنڈ کی پشکر سنگھ دھامی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ خوردنی اشیاء میں تھوکنے کے جرم پر ایک لاکھ روپے تک کا جرمانہ عائد کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے ہی، یوگی ادتیہ ناتھ کی حکومت نے اتر پردیش میں ایسی ہی سخت ہدایات جاری کی تھیں۔ یہ بھی حکم دیا گیا تھا کہ عملے کی صحیح شناخت کروائی جائے تاکہ ہوٹل یا ڈھابوں میں کوئی دراندازیا غیر قانونی غیر ملکی چھپ نہ سکے۔ انتظامیہ کی طرف سے دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ اقدامات کھانے پینے کی اشیاء میں انسانی فضلات یا کسی بھی قسم کی آلودگی کو روکنے کے لیے اٹھائے جا رہے ہیں۔ اگرچہ ان ہدایات پر مزید نکات تیار کیے جا رہے ہیں، لیکن یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ یہ اقدامات کس کے خلاف استعمال ہوں گے۔ ایسے حکم نامے ایک فرقہ وارانہ سازش کا حصہ ہیں، جو محکوم طبقات، بالخصوص مسلمانوں اور دلتوں کو معاشی طور پر مزید کمزور کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ فیصلہ سماج میں پہلے سے موجود تعصبات کو اور زیادہ ہوا دے گا اور چھوت چھات اور نسل پرستی کو بڑھاوا دے گا۔ یہ فیصلہ مساوات کی تحریک کو کمزور کرے گا اور رجعت پسند طاقتوں کو تقویت فراہم کرے گا۔

اگر بی جے پی حکومتوں کی نیت صاف ہوتی تو اسے ’تھوک جہاد‘ کے خلاف مہم نہ کہا جاتا۔ دراصل ’تھوک‘ اور ’جہاد‘ کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے۔ دینِ اسلام کے ماہرین آپ کو جہاد کے بارے میں بہتر طور پر سمجھا سکتے ہیں۔ تاہم، ہم میں سے اکثر اس بنیادی حقیقت سے واقف ہیں کہ جہاد کا نہ تو تشدد سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی یہ غیر مسلمانوں کے خلاف استعمال ہونے والا کوئی ہتھیار ہے۔ آسان الفاظ میں، جہاد کا مطلب کسی جائز اور نیک مقصد کے لیے کوشش کرنا ہے۔ ناانصافی اور ظلم کے خلاف جدوجہد کرنا ہی جہاد ہے۔ اسلام کے خلاف یہ پروپیگنڈا پھیلایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی مقدس کتاب انہیں غیر مسلموں اور "کافروں" کے خلاف پرتشدد جہاد کا حکم دیتی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر محمد صاحب نے غیر مسلمانوں سے دوستی اور معاہدات کیے اور جنگ کو ہمیشہ ٹالنے کی کوشش کی۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں بھی غیر مسلمانوں کو تحفظ فراہم کیا گیا اور انہیں اپنے دھرم پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔

سچائی یہ ہے کہ جہاد کے اعلان کے پیچھے کئی شرائط ہوتی ہیں۔ کوئی بھی شخص یوں ہی کسی دن اٹھ کر جہاد کا اعلان نہیں کر سکتا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ مسلمان ایسے ضرور ہوں گے، جنہوں نے تصورِ جہاد کی غلط تشریح کی ہوگی اور اس کا سیاسی استعمال کیا ہوگا، لیکن ہم انہیں کسی بھی طرح اسلام کا نمائندہ نہیں مان سکتے۔ ہر مذہب میں اچھے اور برے لوگ ہوتے ہیں، لہٰذا تمام مسلمانوں کو ’جہادی‘ کہنا سراسر غلط ہے۔ جہاں تصورِ جہاد کا ایک حصہ دنیاوی معاملات سے متعلق

> ایسے قوانین کا اصل مقصد صارفین کے تحفظ کو یقینی بنانا یا کھانے کو آلودگی سے بچانا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد پہلے سے ہی کمزور مسلم کمیونٹی اور دلتوں کی معاشی کمر توڑنا ہے۔ جس طرح پہلے حلال فوڈ پر حملہ کیا گیا تھا، اسی طرح یہ نئی ہدایات بھی سماجی دوریوں کو مزید بڑھانے کی ایک سازش ہیں۔

ہے، وہیں اس کا دوسرا اور اہم ترین حصہ نفس سے متعلق ہے۔ اسلام کا پیغام یہ ہے کہ دنیا کی اصلاح کرنے سے پہلے اپنے اندر جھانکیں اور اپنے اعمال کا جائزہ لیں۔ اگر ہمارے اپنے اعمال درست نہیں ہیں، تو ہمیں اپنی اندرونی برائیوں کے خلاف بھی جہاد کرنا ہوگا۔ مگر سیاسی فائدے کے لیے فرقہ پرست عناصر جہاد کا خوف پیدا کرتے ہیں۔ وہ غیر مسلموں کو مسلمانوں کے بارے میں گمراہ کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں نفرت پیدا کر دیتے ہیں، جس کی وجہ سے دنیا بھر میں اسلاموفوبیا میں اضافہ ہو رہا ہے۔

بھارت میں بھی صورتِ حال کچھ بہتر نہیں ہے۔ یہاں بھی مسلم مخالف تعصب بڑھتا جا رہا ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کی بات تو الگ ہے، سیکولر جماعتوں کے اندر بھی مسلم مخالف تعصب کا زہر موجود ہے۔ جب سے آر ایس ایس اور بی جے پی اقتدار میں آئی ہیں، انہوں نے بیرونِ ملک چلنے والے جہاد سے متعلق پروپیگنڈے کو نہ صرف اپنایا ہے بلکہ اس میں کچھ مزید باتیں بھی شامل کر کے اسے اور زیادہ خطرناک بنا دیا ہے۔ ملک کا میڈیا بھی فرقہ پرستوں کے اشارے پر جہاد سے متعلق بہت سے نفرت انگیز پروپیگنڈے کو پھیلانے میں شامل ہے۔ مثال کے طور پر، ایک معروف ہندی نیوز چینل کے اینکر نے جہاد پر ایک خصوصی پروگرام کیا تھا اور جہاد کی مختلف اقسام گنوائی تھیں۔ فرقہ پرست طاقتوں کے بیانیے کو دہراتے ہوئے، مذکورہ اینکر نے کہا کہ مسلمان معیشت، تاریخ، میڈیا، موسیقی، نغمے، سیکولرزم، آبادی، محبت، اور تعلیم جیسے کئی حلقوں میں جہاد کر رہے ہیں۔ اینکر کے مطابق، مسلمان جہاد کے ذریعے ہندوؤں کو ہر میدان میں کمزور کرنے اور ان کی شناخت مٹانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اب ’تھوک جہاد‘ کا شوشہ بھی اسی نفرت انگیز مہم کا ایک نیا حربہ ہے۔

یاد رہے کہ گزشتہ مہینوں مظفر نگر پولیس نے ایک نوٹس جاری کیا، جس میں دکانداروں اور کھانے پینے کی اشیاء فروخت کرنے والوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے نام ظاہر کریں تاکہ ہندو یاتریوں کے درمیان کوئی کنفیوژن نہ ہو۔ اسی دوران آگرہ میں بیان دیتے ہوئے، اتر پردیش کے ایک وزیر نے بھگوا طاقتوں کے تفرقہ انگیز ایجنڈے کو واضح طور پر پیش کیا اور کہا کہ ہندو عقیدت مندوں کو مسلمانوں کے ہوٹلوں میں بیٹھنے اور کھانے سے گریز کرنا چاہیے، اس لیے مسلمان دکانداروں اور عملے کو اپنے نام ظاہر کرنے چاہئیں۔ نسل پرستی اور مسلمانوں کے معاشی بائیکاٹ پر مشتمل اس فرمان کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔ ملک کی سب سے بڑی عدالت نے بھی اس فرمان کو ناقابلِ قبول قرار دیا اور اس پر پابندی لگا دی، کیونکہ ایک سیکولر ملک میں ایسی فرقہ پرست پالیسیوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ عدالتِ عظمیٰ کے فیصلے پر عمل کرنے کے بجائے، بی جے پی کی حکومتیں خوردنی اشیاء کی آلودگی کو روکنے کے نام پر مذہبی امتیاز پر مبنی پالیسیاں بنا رہی ہیں۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ ان دنوں بہت سی ایسی ویڈیوز وائرل ہوئی ہیں، جن میں کوئی نہ کوئی مسلمان دکاندار یا اسٹاف کھانے میں تھوکتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ طویل عرصے سے فرقہ پرست یہ افواہ پھیلاتے رہے ہیں کہ مسلمان غیر ہندوؤں کو کھانا کھلانے سے پہلے اس میں تھوک دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف ان کی نفرت، دلتوں کے ساتھ برتے جانے والے امتیاز جیسی ہی ہے، جن کے ساتھ کھانا پینا انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ ایسے قوانین کا اصل مقصد صارفین کے تحفظ کو یقینی بنانا یا کھانے کو آلودگی سے بچانا نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد پہلے سے ہی کمزور مسلم کمیونٹی اور دلتوں کی معاشی کمر توڑنا ہے۔ جس طرح پہلے حلال فوڈ پر حملہ کیا گیا تھا، اسی طرح یہ نئی ہدایات بھی سماجی دوریوں کو مزید بڑھانے کی ایک سازش ہیں۔ جمہوریت پسندوں اور سیکولر طاقتوں کو ایسی تفرقہ انگیز پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔ ■

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)

debatingissues@gmail.com

کاش، تریپورہ میں آج گاندھی جی ہوتے!

جس طرح بھگوا طاقتوں نے گاندھی کے خلاف افواہ پھیلائی اور انہیں ہندو مخالف کہا، اسی طرح وہ آج مسلمان اور سیکولر طاقتوں کو نشانہ بناتی ہیں

ابھے کمار

ان دنوں ہندوستان کی شمال مشرقی ریاست تریپورہ سے مسلم مخالف تشدد کی لپٹیں اٹھی ہیں۔ ریاست میں مسلمان اقلیت ہیں، جن کی آبادی ۸ رفی صد سے تھوڑا ہی زیادہ ہے۔ مسلمانوں کے گھروں، دکانوں اور عبادت گاہوں کو فرقہ پرستوں نے نقصان پہنچایا ہے۔ ماحول کو خراب کرنے میں بھگوا فرقہ پرست عناصر کا ہاتھ بتلایا جا رہا ہے۔ مگر سب سے تشویشناک بات یہ ہے کہ ریاستی حکومت، پولیس اور انتظامیہ یہ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے کہ ان کے علاقے میں کشیدگی پھیلی ہوئی ہے اور کئی دنوں تک سڑکوں پر غنڈوں کا راج تھا۔ شر پسند عناصر کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے اور مظلوم کو تحفظ اور انصاف دینے کے بجائے، ریاستی کی بھگوا سرکار یا تو خاموشی رہی ہے، یا پھر یہ کہہ کر اپنا پلہ جھاڑلی کہ ریاست کو بدنام کرنے کے لیے بعض شر پسند عناصر سوشل میڈیا کا استعمال کر رہے ہیں اور جھوٹی خبریں پھیلا رہے ہیں۔ سرکار، پولیس اور انتظامیہ کی اس بے حسی اور سرد رویہ کو دیکھ کر آج مجھے بابائے قوم مہاتما گاندھی کی یاد آ رہی ہے۔ کاش، وہ ابھی تریپورا میں ہوتے!

تریپورہ میں جو کچھ بھی ہوا ہے، کچھ ویسا ہی ماحول بھارت کی تقسیم کے وقت ہو رہا تھا۔ حالانکہ تقسیم ہند کے دوران بے شمار لوگوں کی جان و مال کو نقصان ہوا اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ بے گھر ہوئے، جبکہ تریپورہ میں کچھ ہی مسلم گھروں، دکانوں اور عبادت گاہوں کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ پھیر بھی ایک حد تک دونوں وارداتوں میں مماثلت ہے۔ دونوں ہی جگہ بھگوا طاقتیں انتقام کے جنون میں مبتلا ہو کر کمزور اقلیتوں پر حملہ کی۔ اس وقت دہلی کے مسلمانوں پر حملہ اس لیے کیسے جائز ٹھرائے جا رہے تھے کہ پاکستانی علاقوں میں ہندوؤں اور سکھوں کو مارا اور کاٹا جا رہا تھا، اِس وقت تریپورا کے مسلمانوں پر حملہ اس لیے صحیح ٹھرایا جا رہا ہے کہ مسلم اکثریت والا پڑوسی ملک بنگلہ دیش میں اقلیت ہندوؤں پر کچھ دن پہلے حملے ہوئے۔ آسان لفظوں میں کہیں تو حملہ آوروں کی خونی آنکھوں میں بدلہ لینے کا جنون سوار تھا۔

کہا جا رہا ہے کہ تریپورہ میں ماحول بھگوا شدت پسند تنظیموں کے ذریعہ نکالی گئی ریلی کے بعد سے خراب ہوا۔ شدت پسندوں نے مختلف علاقوں میں ریلی نکالی اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا۔ دراصل ان کا مقصد بنگلہ دیش کے مظلوم ہندوؤں کے لیے انصاف پانا کم اور تریپورہ کو مذہب کی بنیاد پر پولارائز کرنا زیادہ تھا۔ سال ۲۰۱۸ء میں بھگوا حکومت نے تریپورہ میں اقتدار سنگھالا تھا۔ انتخابی ریلی کو دوران بھگوا سیاسی جماعت نے رائے دہندگان سے بڑے بڑے وعدے کیے تھے، مگر ساڑھے تین سال گزر جانے کے بعد بھی عوام کو مایوسی ہی ہاتھ لگی ہے۔ کچھ ہی ہفتوں بعد، تریپورہ میں بلدیاتی انتخابات ہونے والے ہیں۔ بھگوا جماعتوں کو حریف جماعتوں سے بڑا چیلنج مل رہا ہے۔ اس پس منظر میں بنگلہ دیش میں اقلیت ہندوؤں پر ہوئے حملہ کو بھگوا تنظیموں نے دانستہ طور پر ہندو بنام مسلمان کا رنگ دے دیا۔

تقسیم ہند کے وقت بھی کچھ ایسے ہی حالات تھے۔ گاندھی جی اس بات سے کافی افسردہ تھے کہ دہلی کے مسلم علاقوں میں حملہ بڑھ رہے ہیں۔ یہ حملہ بھگوا شدت پسند عناصر کی طرف سے کرائے جا رہے تھے، جو بدلے کے جذبہ میں مبتلا تھے۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے اوپر ہوئے حملہ کا جواب دہلی کے مقیم مسلمانوں کے گھروں اور عبادت گاہوں پر حملہ بول کر لیا جا رہا تھا۔ مولانا آزاد اپنی کتاب 'انڈیا وِنز فریڈم' میں تب کے حالات کی منظر کشی کی ہے۔ بگڑتے حالات کو دیکھ کر گاندھی جے نے سردار پٹیل کو بلایا۔ سردار گاندھی جی کے کافی قریبی تھے اور اس وقت ہوم منسٹر تھے۔ اس طرح دہلی کی سیکورٹی کی ذمہ داری ان کی تھی۔ باپو نے سردار سے پوچھا کہ وہ دہلی میں قتل و غارت گری کو روکنے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ پٹیل نے جواب میں گاندھی جی سے کہا کہ دہلی کے حالات کے بارے میں جو کچھ بھی انہیں بتلایا جا رہا ہے وہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر پٹیل نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ مسلمانوں کو شکایت کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے! پٹیل کو بھی لگتا تھا کہ پاکستان میں ہوئے حملہ کے لیے کسی نہ کسی حد تک ہندی مسلمان ذمہ دار ہیں۔ فسادیوں کے خلاف معقول کارروائی کرنے کے بجائے سردار پٹیل اس بات پر زور دیتے رہے کہ دہلی کے چند علاقوں میں اس طرح کی خبر مل رہی ہے کہ مسلمان کسی بڑے حملہ کرنے کی تیاری میں ہیں۔ کچھ مسلمانوں کی گرفتاری بھی کی گئی اور ان کے پاس سے مبینہ طور پر خطرناک ہتھیار برآمد کئے گئے۔ جب مولانا آزاد اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان ہتھیاروں کو دیکھا تو پایا کہ یہ گھر میں استعمال ہونے والے چاقو سے زیادہ اور کچھ نہیں تھے۔ یہ پورا واقعہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سردار پٹیل مسلمانوں کے تئیں تعصب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ گاندھی جی کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ پٹیل مسلمانوں کو تحفظ دینے کیے لیے سنجیدہ نہیں ہیں۔ اپنی بزرگی اور کمزور صحت کا خیال نہ کرتے ہوئے باپو ۱۲ر جنوری ۱۹۴۸ء کو بھوک ہڑتال پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں پر حملہ بند کریں اور یہ عہد کریں کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ بھائی کی طرح رہیں گے۔ گاندھی کی ان باتوں سے بھگوا تنظیموں کو کافی پریشانی ہوئی، کیونکہ گاندھی ان کے ذریعہ جلائے گئے فرقہ وارانہ تشدد کی آگ میں پانی ڈال رہے تھے۔ فرقہ پرستوں نے گاندھی کو بھی نہیں چھوڑا اور ان کے خلاف مسلم نواز اور ہندو مخالف ہونے کا پروپیگنڈہ کیا۔ آخر کار انصاف کی بات کرنے کے لیے گاندھی جی کو اپنی جان قربان کرنی پڑی۔ کاش، تریپورہ کی سرکار جو خود کو سب سے بڑا گاندھی نواز کہتی ہے، گاندھی کے اس درس کو یاد رکھتی! کاش آج گاندھی جی تریپورہ میں ہوتے تو مسلمان اس قدر خود کو بے سہارا محسوس نہیں کرتے!

> ”
>
> **قصور وار چاہے جس دھرم اور مذہب کا ہو، جس بھی ملک میں رہتا ہو، اس کے لیے سزا کی مانگ ہونی چاہیے۔ دنیا کے کسی بھی حصہ میں رہ رہے ہندو جس طرح سے بھارتی مسلمانوں کے اوپر کیے جا رہے ظلم کے لیے ذمہ دار نہیں ہیں، اسی طرح مسلم اکثریت ملکوں میں ہندوؤں کے خلاف ہو رہے حملوں کے لیے ہندی مسلمان ہرگز قصوروار نہیں ہیں۔ اس لیے جمہوریت میں نفرت اور انتقام کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔**

جس طرح بھگوا طاقتوں نے گاندھی کے خلاف افواہ پھیلائی اور انہیں ہندو مخالف کہا، اسی طرح وہ آج مسلمان اور سیکولر فورسیز کو نشانہ بناتی ہیں۔ مگر فرقہ پرست کبھی اپنی سرکار سے یہ سوال نہیں کرتے کہ اس نے ہندوؤں کے لیے کیا کیا ہے؟ کیا کبھی کسی مسلم اور سیکولر تنظیم نے پڑوسی ملک کے اقلیتوں پر ہوئے حملہ کو جائز قرار دیا ہے؟ مگر بھگوا عناصر کی دوہری پالیسی دیکھیے کہ جب بھارت کے اندر اقلیتوں پر حملہ ہوتا ہے اور اس کے خلاف بیرون ملکوں میں آواز بلند ہوتی ہے تو یہی لوگ اپنی زبان بدل لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بھارت کا داخلی معاملہ ہے۔

انصاف اور جمہوریت کا تقاضا ہے کہ مظلوم چاہے جہاں بھی ہو اس کے حقوق کے لیے سب کو آواز اٹھانی چاہیے۔ قصوروار چاہے جس دھرم اور مذہب کا ہو، جس بھی ملک میں رہتا ہو، اس کے لیے سزا کی مانگ ہونی چاہیے۔ دنیا کے کسی بھی حصہ میں رہ رہے ہندو جس طرح سے بھارتی مسلمانوں کے اوپر کیے جا رہے ظلم کے لیے ذمہ دار نہیں ہیں، اسی طرح مسلم اکثریت ملکوں میں ہندوؤں کے خلاف ہو رہے حملوں کے لیے ہندی مسلمان ہرگز قصوروار نہیں ہیں۔ اس لیے جمہوریت میں نفرت اور انتقام کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کسی بھی معصوم کا خون نہ بہے، یہ سرکار کی پہلی ذمہ داری ہے۔ لوگوں کو ان کا مذہب، ذات اور دھرم دیکھے بغیر ریاست کو سب کے ساتھ برابر کا سلوک کرنا چاہیے۔ اگر لوگوں کے دل میں ایسے احساس پیدا ہوں گے کہ ان کے ساتھ ان کا دھرم اور مذہب دیکھ کر ناانصافی کی جا رہی ہے تو اس سے سماج میں بے چینی پیدا ہوگی، جو امن اور ترقی کے لیے بالکل بھی سازگار نہیں ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

دہلی فسادات: انصاف اب بھی دور

پولیس، انتظامیہ اور حکومت کی یہ آئینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو تحفظ فراہم کیا جائے

ابھے کمار

دوسال پہلے دہلی میں شر پسندوں نے مسلم مخالف فسادات کی آگ لگائی تھی، مگر وہ آگ اب بھی سُلگ رہی ہے۔ دہلی فسادات کے دوران ۵۰ سے زیادہ معصوم اور بے قصور افراد کو ہلاک کر دیا گیا تھا، مگر آج بھی قاتلوں کو سزا نہیں مل پائی ہے۔ انصاف پانے کے لیے متاثرین اب بھی منتظر ہیں۔ آج بھی ان کو ایک سرکاری دفتر سے دوسرے دفتر کا چکر لگانا پڑتا ہے۔ پولیس، انتظامیہ اور حکومت کی یہ آئینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو تحفظات فراہم کیے جائیں، مگر انہوں نے بھی اکثر مواقع پر دہلی فسادات کے مظلوموں کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ دہلی کے شمال مشرقی علاقوں میں فسادات کی زد میں آئے مظلوم لوگ آج بھی معاوضہ اور باز آباد کاری کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ یتیم بچے آج بھی اچھی خواک اور تعلیم کے لیے فریاد کر رہے ہیں۔ جہاں ملک کے سیاست دانوں کو بڑی بڑی ریلیاں کرنے لیے وقت ہی وقت ہے، وہیں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران زخمی یا ہلاک شدہ لوگوں کے گھر والوں سے ملنے اور ان کی حال پرسی کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔

جب ملک کی راجدھانی دہلی میں لوگوں کی جان و مال محفوظ نہیں رہ سکی اور انہیں انصاف نہیں مل پایا ہو، تو ملک کے دیگر حصوں میں کیا حالت ہوگی؟ دوسال پہلے اسی فروری کے آخری ہفتہ میں بھگوا شر پسندوں نے دہلی میں رہنے والے غریب، مزدور اور کمزور مسلمانوں کے گھروں پر حملہ شروع کر دیا تھا۔ اپنی مرضی سے شر پسندوں نے لوگوں کو مارا اور پیٹا۔ جب ان سب سے دل نہیں بھرا، تو معصوموں کا قتل کر دیا گیا۔ لوگ پولیس سے مدد کے لیے فریاد کرتے رہے اور پولیس کان میں تیل ڈال کر سوئی رہی۔ تضاد دیکھیے کہ ہمارے سیکولر ملک کی پولیس اکثر کمیونل ذہنیت کے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔ پولیس کے دلوں اور دماغ میں دلت، پچھڑا، آدی واسی، خواتین، اور مذہبی اقلیت کے تئیں تعصب اور غلط فہمی بھری پڑی ہے۔ قصور صرف پولیس کا ہی نہیں ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈروں نے پولیس کو پیشہ وارانہ بنانے کی نہ تو کبھی پہل کی اور نہ ہی ان کے اندر سیکولر خیالات کو فروغ دینے کے لیے کوئی تربیتی پروگرام چلایا۔ جب مسلم طالبات حجاب پہن کر کلاس روم میں پڑھنا چاہتی ہیں تو انہیں روکا جا رہا ہے، وہیں ملک کے بیشتر پولیس تھانوں کے احاطہ میں مندر بنے ہیں اور اس پر کوئی کچھ نہیں کہتا۔ پولیس محکمہ کے اندر سماج میں موجود تنوع کی بھی عکاسی نہیں دکھتی ہے۔ پولیس محکمہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی سے نصف ہے، وہیں پولیس تھانوں اور جیل میں قید کیے گیے مسلمان اپنی آبادی سے کہیں زیادہ ہے۔ ماضی میں بھی پولیس کا استعمال سیاسی طور پر ہوا ہے، مگر دہلی فسادات کے دوران سابقہ ریکارڈ ٹوٹتے ہوئے دکھے۔ عوام پولیس سے مدد کے لیے چیختی رہی اور پولیس خاموش تماشائی بنی رہی۔ گھروں، دکانوں اور عبادت گاہوں پر حملے ہوئے، مگر پولیس جائے واردات پر پہنچی اور لوگوں کی جان بچانے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔

پولیس اور مرکزی حکومت کی بات پوری طرح سے غلط ہے کہ دہلی فسادات کے پیچھے سی اے اے مخالف مظاہرین کا ہے۔ در اصل فرقہ پرست سیاست دانوں کو اس بات سے غصہ تھا کہ بڑی تعداد میں عام لوگ سی اے اے کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ سرکار کو پہلے ایسا لگتا تھا کہ وہ اس قانون کو بڑی آسانی سے پاس کرا لے گی کیونکہ اس کے پاس پارلیمنٹ میں مضبوط اکثریت ہے۔ حالانکہ جس طرح کی مخالفت حزب اختلاف کو کرنا چاہیے تھا ایسا انہوں نے نہیں کیا۔ شاید ان کو اس بات کا ڈر تھا کہ اس قانون کی مخالفت کرنے سے ان کی مقبولیت اکثریتی طبقہ میں گھٹ جائے گی۔ وقت نے یہ دکھایا کہ حکمراں جماعت اور حزب اختلاف دونوں خام خیالی کے شکار تھے۔ جہاں حکومت کو یہ خوش فہمی تھی کہ پارلیمنٹ سے سی اے اے کو پاس کرا لینے کے بعد وہ کامیاب ہو گئے ہیں، وہیں اپوزیشن کو یہ لگا تھا کہ سی اے اے کو قبول کر لینے یا اس پر خاموشی اختیار کر لینے سے ان کو ہندو ووٹ حاصل ہو جائے گا۔ چونکہ بی جے پی نے سی اے اے قانون کو ایک تاریخی قدم بتلایا تھا اور اسے بابا صاحب امبیڈکر کے افکار سے بھی جوڑ کر دکھایا تھا، اس وجہ سے بھی اپوزیشن دباؤ میں تھی۔ در اصل سی اے اے کا تعلق نہ تو امبیڈکر سے ہے اور نہ ہی یہ کوئی بہتر پالیسی تھی۔ در اصل بھاجپا سی اے اے کو لا کر ہندوؤں کو اپنی طرف راغب کرنا چاہتی تھی اور شہریت کی بنیاد پر کمزوروں کو مزید پریشان کرنا چاہتی تھی۔ یاد رکھیے کہ جو مالدار ہوتا ہے اور جس کے پاس ملکیت ہوتی ہے اسے ہی معزز شہری سمجھا جاتا ہے، جبکہ مزدور اور قبائل کو ہمیشہ سے ریاست کے لیے خطرہ سمجھا گیا ہے۔ کاغذ بھی اسی کے پاس ہوتا ہے جو زمیندار ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، سی اے اے کی آڑ میں بھاجپا اپنی مسلم مخالف سیاست کو مزید ہوا دے رہی تھی۔ اس قانون کے تحت پڑوسی ملک پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان کے پناہ گزینوں کو بھارت میں شہریت دینے کی بات کہی گئی تھی، مگر مسلم پناہ گزینوں کے لیے بھارت کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ حزب اقتدار نے خوب افواہ پھیلائی کہ جو بھی ہندو پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں کے ہاتھوں ظلم و زیادتی کے شکار ہیں انہی کو بھارت لا کر شہری بنایا جائے گا۔ بی جے پی پیغام یہ دینا چاہتی تھی کہ بھارت کے دروازے دنیا کے کسی حصے میں مظلوم ہندوؤں کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور مرکزی حکومت سابقہ سیکولر حکومت کی طرح نہیں ہے جو ہندوؤں کے مفاد میں کام کرنے سے پیچھے ہٹے! مقصد صاف تھا کہ بھارت کو ہندو راشٹر کی طرف دھکیلا جایا جا رہا تھا۔

> ”
> دہلی کے شمال مشرقی علاقوں میں فسادات کی زد میں آئے مظلوم لوگ آج بھی معاوضہ اور باز آبادکاری کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ یتیم بچے آج بھی اچھی خواک اور تعلیم کے لیے فریاد کر رہے ہیں۔ جہاں ملک کے سیاست دانوں کو بڑی بڑی ریلیاں کرنے لیے وقت ہی وقت ہے، وہیں فرقہ وارانہ فسادات کے دوران زخمی یا ہلاک شدہ لوگوں کے گھر والوں سے ملنے اور ان کی حال پرسی کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔

بھاجپا کا یہ پرانا راگ ہے کہ سیکولر لیڈر ہندو مخالف ہوتے ہیں۔ مسلم نواز اور ہندو مخالف ہونے کا الزام گوڈسے نے گاندھی جی پر لگا کر ان کا قتل کیا تھا۔ در اصل بھگوا طاقتیں یہ چاہتی ہیں کہ بھارت کے سیکولر آئین کی جگہ دھرم پر مبنی قانون چلے، جس میں ایک قوم، ایک دھرم اور ایک زبان کی بالادستی ہو۔ مگر آئین مخالف سی اے اے کو یہاں کی اکثریت سیکولر عوام نے سمجھ لیا۔ سی اے اے کے خلاف ملک کے نوجوانوں نے قیادت کی اور وہ سڑکوں پر اُتر آئیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جے این یو اور دیگر جگہوں سے صدائے احتجاج بلند ہونے لگیں۔ سرکار کو اس بات کا ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ جن مسلم خواتین کو وہ کمزور اور بے بس سمجھتی تھی، وہ سی اے اے مخالف تحریک میں پیش پیش تھی۔ ہندو، مسلمان، دلت، پچھڑا، آدی واسی، مرد، عورت، بچہ، نوجوان اور بوڑھے سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ملک کے اندر ایک نہیں بلکہ ہزاروں شاہین باغ بن کر تیار ہو گئے اور ان کے اندر انقلاب کے پھول کھلنے لگے۔ مرکزی حکومت نے مظاہرین کے خلاف ہر طرح کا ہتھکنڈا اپنایا، مگر ان کی ساری تدبیریں ناکام رہیں۔ آخر میں بزدل لوگوں نے پردہ کے پیچھے سے شر پسندوں کو مظاہرین اور کمزور لوگوں کے اوپر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

دکھ کی بات ہے کہ جن لوگوں نے معصوموں کی جان لی اور فرقہ وارانہ تشدد کو بھڑکنے کے لیے اشتعال انگیز نعرے لگائے اور تقریریں کیں ان کو پولیس بچا رہی ہے۔ دوسری طرف جن لوگوں نے پُر امن طریقہ سے غلط قانون کی مخالفت کی، ان کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ آج بھی متاثرین کو اپنے حال پر اکیلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ فسادات کے دوران جن علاقوں پر حملہ کیا گیا تھا، وہاں سیکورٹی دینے کے بجائے، زمین مافیا کو گدھوں کی طرح زمین ہڑپنے کے لیے کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو گھیٹو میں رہنے کے لیے دھکیلا جا رہا ہے۔ معاوضہ اور باز آباد کاری تو دور کی بات، سیاسی لیڈران مظلوم مسلمانوں کے پاس جا کر ان کا حال سُننے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ ملک کے لیے بے حد تشویش ناک ہیں، مگر حالات بدلنے کے لیے ہمیں ہی تو اپنے گھروں سے نکلنا ہوگا۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

کیا ہے یکساں سول کوڈ کا اصل کھیل؟

یکساں سول کوڈ کے آس پاس پھر ہندو مسلمان کا گیم شروع کیے جانے کی پوری کوشش ہو رہی ہے

ابھے کمار

۷ رجولائی ۲۰۲۱ء کے اپنے ایک فیصلہ میں، دہلی ہائی کورٹ نے مرکزی حکومت سے کہا ہے کہ وہ یکساں سول کوڈ (Uniform Civil Code) نافذ کرنے کے لیے ضروری اقدامات کرے۔ راجستھان کے آدی واسی مینا سماج کے ایک معاملے میں سماعت کرتے ہوئے، کورٹ نے یہ بات کہی۔ تنازع اس بات پر تھا کہ کیا ہندو میریج ایکٹ، کے تحت مینا خاندان کے مسئلے حل کیے جاسکتے تھے؟ اپنے تبصرے میں، جسٹس پرتبھا ایم سنگھ نے کہا کہ ذات برادری اور مذہبی دیواریں دھیرے دھیرے گر رہی ہیں۔ کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد، فرقہ پرست طاقتیں ایک بار پھر سرگرم ہوگئی ہیں۔ وہ دن رات مسلمانوں کو گالی دے رہی ہیں۔ ان کا الزام ہے کہ جب ملک میں سب کا ڈی این اے ایک ہے تو ایک قانون آنا ہی چاہیے۔

عدالت نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی کافی کمزور ہے۔ بھارت میں ذات برادری اور مذہبی دیواریں گر رہی ہیں، کورٹ کی اس دلیل سے بہت سارے لوگ اتفاق نہیں رکھتے۔ آزادی کے ۷۰ سالوں کے بعد بھی، ذات برادری برقرار ہے۔ ملک میں سیکولر اور جمہوری آئین ہے جو کہتا ہے کہ سب برابر ہیں، پھر بھی دھرم کے نام پر کاٹ مار چل رہی ہے۔ شادی بیاہ بھی تو اکثر لوگ اپنی ہی ذات برادری میں کرتے ہیں۔ ملک میں کتنے اعلیٰ ذات کے والدین ہوں گے جو اپنی بیٹی کی شادی کسی دلت یا مسلم نوجوان سے کرنے کے لیے خوشی خوشی راضی ہوجائیں گے؟ جو کہتے ہیں کاسٹ ختم ہو رہا ہے، ان سے پوچھیے کہ آخر عدالت، اعلیٰ نوکرشاہی، سیاسی جماعت، میڈیا، فلم انڈسٹری، کالج اور یونیورسٹی میں اعلیٰ ذات کی مونوپالی کیوں برقرار ہے؟ آخر کیوں ٹکٹ کی تقسیم کرتے وقت، سیاسی جماعتیں ذات پات اور مذہبی اعداد و شمار کا بڑا خیال رکھتی ہیں؟ کیا یہ بات غلط ہے کہ جیسے جیسے آپ ذات برادری کی سیڑھی پر اوپر چڑھتے ہیں، آپ کو لوگ نسبتاً زیادہ زمین اور پیسے والے ملتے ہیں، وہیں سیڑھی کے نیچے اترنے پر لوگ زیادہ غریب، تنگ حال اور ظلم کے ستائے ہوئے ملتے ہیں؟ یہ بھی بات حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی ہے کہ ملک میں مذہبی شناخت کمزور ہو رہی ہے۔ دراصل مذہبی سیاست، مذہبی تعصب اور مذہبی جنون کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہوا معلوم پڑ رہا ہے۔ رام مندر کے نام پر سیاست، ہجومی تشدد کی آڑ میں مسلم اور دلت نوجوانوں کو نشانہ بنایا جانا، میڈیا اور سوشل میڈیا کی مدد سے اقلیتوں کے مذہبی جذبات کو چوٹ پہنچانا یہ کچھ ایسی مثالیں ہیں، جو بتاتی ہیں کہ انسان بننے سے کہیں زیادہ لوگ ہندو اور مسلمان بننے میں یقین رکھتے ہیں۔

یکساں سول کوڈ کو ملک کی ترقی اور امن سے بھی جوڑا جا رہا ہے۔ یہ خیالی بات بھگوا تنظیم سے وابستہ ایک مسلم لیڈر نے کہی ہے۔ یکساں سول کوڈ کی حمایت کرتے ہوئے، حضرت نے فرمایا کہ ایسا قانون بن جانے سے ملک میں وکاس ہوگا اور امن کا ماحول قائم ہوگا۔ دراصل ترقی کا رشتہ عوام کی خوشحالی سے ہوتا ہے۔ لوگوں کی خستہ حالی کو دور کرنے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ سرکار روزگار اور فلاحی کاموں پر دھیان دے۔ امن قائم کرنے کے لیے لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا ہوگا اور پڑوسی ملکوں کے ساتھ مذاکرات بحال کرنے ہوں گے۔ بات چیت بھی تب ہی کامیاب ہوگی، جب فریقین اکڑ اور جھوٹے غرور کو ترک کر دیں، اور عوام کی جان و مال کی حفاظت اور ان کے انسانی حقوق کو سب سے اوپر رکھیں۔ بھگوا جماعت کے مذکورہ اقلیت لیڈر اپنی پارٹی کے تئیں اتنے وفادار نظر آئے کہ انہوں نے ان پیچیدگیوں کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔

تیسری دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ یکساں سول کوڈ کے آ جانے سے مسلمانوں کی کافی تیزی سے بڑھ رہی آبادی پر روک لگ جائے گی

> سب کو یکساں سول کوڈ کے نام پر مشتعل کیے جانے والے فرقہ پرستوں کے گیم کو سمجھنا ہے۔ یاد رکھیے یکساں سول کوڈ کی مار سب پر پڑے گی۔ آدی واسی، دلت، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، شمالی، جنوبی ریاستوں اور دیگر بھی اس کی مخالفت کریں گے۔ تبھی تو آج تک بھگوا سرکار یکساں سول کوڈ بل کا ڈرافت نہیں لا پائی ہے۔ لیکن اس پر سیاست کرنے میں وہ ضرور آگے رہتی ہے۔

اور اس طرح بھارت کی ہندو اکثریت ڈیموگرافی نہیں بدل پائے گی۔ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کا پروپیگنڈا گزشتہ سو سالوں سے بھی زیادہ سے چل رہا ہے، وہیں مسلمان آج بھی ملک میں اقلیت ہی ہیں۔ پروپیگنڈا میں بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے، مگر جو بڑی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کا گروتھ ریٹ، بڑی تیزی سے کم ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی دہائی کی گروتھ ریٹ مردم شماری ۲۰۱۱ میں، ۲۹ فیصد سے کم ہو کر ۲۴ فیصد ہوگیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھارت کی بڑی آبادی صرف پریشانی نہیں لاتی، بلکہ وہ بہت سارے مواقع کے دروازے بھی کھول دیتی ہے۔ اگر بڑھی آبادی کی وجہ سے سرکار سب کے لیے فلاحی کاموں کو انجام نہیں دے پا رہی ہے، تو اتنی بڑی آبادی سے لیا گیا محصولات کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ بھی ایک بڑا پروپیگنڈا ہے کہ ٹیکس صرف مالدار دیتا ہے، اور غریب صرف سرکاری بجٹ کو دیمک کی طرح چٹ کر جاتے ہیں۔ مگر یہ بات نہیں بتلائی جاتی کہ ایک رکشہ چلانے والا فرد جب راشن اور دوا خریدتا ہے، اپنا موبائیل ریچارج کراتا ہے تو وہ بھی ٹیکس ادا کرتا ہے۔ ماہر اقتصادیات بتاتے ہیں کہ امیر لوگ اکثر ٹیکس کی چوری کرتے ہیں اور سرکار سے بہت ساری سہولتیں لیتے ہیں اور کروڑوں کا قرض معاف کرواتے ہیں، مگر غریب اور عام آدمی کو ہر حال میں ٹیکس دینا پڑتا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بھارت میں بڑی آبادی کی وجہ سے ہی بہت ساری بیرونی اور بین الاقوامی کمپنیاں اپنا کاروبار یہاں لگاتی ہیں، کیونکہ یہاں ان کو بہت ہی سستے مزدور میسر ہیں۔ جس کام کے لیے لندن، دبئی اور نیویارک میں ۲ لاکھ سے بھی زیادہ دینے پڑ سکتے ہیں، وہی کام ہندوستان میں رہنے والا ایک مزدور ۲۰ ہزار میں کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ بھارت کے لیے بڑی آبادی فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔

کچھ لوگ یہ بھی افواہ پھیلا رہے ہیں کہ جب ملک میں سب کا ڈی این اے ایک ہے تو ایک قانون بھی آنا چاہیے۔ اگر ایک لمحے کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ بھارت میں سب کا ڈی اے این ایک ہے اور سب کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے، تو اس کی شروعات ایک اسکول سے ہونی چاہیے۔ رکشہ والے کا بچہ اور پی ایم کا بچہ بھی ایک ہی اسکول میں پڑھے۔ ٹرین اور رہائشی علاقوں کے اندر بھی درجہ بندی ختم ہو۔ امیروں کے پاس جو بے حساب پیسہ ہے، اسے غریبوں میں تقسیم کیا جائے۔ مگر فرقہ پرستوں کو ان مثبت باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

کچھ لوگ یکساں سول کوڈ کی حمایت میں آئین کی دوہائی دے رہے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ آئین کے حصہ چار میں مملکت کی حکمت عملی کے ہدایتی اصول، دیے گئے ہیں۔ اسی میں آرٹیکل ۴۴ کہتا ہے کہ مملکت یہ کوشش کرے گی کہ بھارت کے پورے علاقے میں شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کی ضمانت ہو۔ اگر ہدایتی اصولوں کو نافذ کرنا اتنا ہی ضروری ہے، تو کیوں نہیں آرٹیکل ۴۴ سے پہلے جو ہدایتی اصول ہیں، مثلاً مملکت لوگوں کی بہبود کے فروغ کے لیے سماجی نظام قائم کرے گی، سے ہی شروعات کیا جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے وقت قانون ساز اسمبلی میں بھی یکساں سول کوڈ پر کافی بحث ہوئی اور کچھ لوگ اسے ملک پر تھوپنا چاہتے تھے۔ تب بابا صاحب امبیڈکر نے متنبہ کیا کہ ریاست کو کوئی ایسا قانون نہیں لانا چاہیے، جس کے خلاف عوام بغاوت کر دے۔ اس وقت تنازع کو ختم کرنے کے لیے اسے ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا گیا۔ وہیں عوام کی مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کو بنیادی حقوق کا حصہ بنایا گیا، تا کہ اس پر کوئی حملہ نہ بول سکے۔ مگر فرقہ پرست ذہنیت بار بار یکساں سول کوڈ کے جن کو بوتل سے نکالتی رہی ہیں۔ اس کے پیچھے صرف سیاسی مفاد ہے۔ کورونا کے دوران بری طرح سے ناکام مرکزی اور یوپی سرکار کو دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے نے ایک نیا موقع دیا ہے۔ یکساں سول کوڈ کے آس پاس پھر ہندو مسلمان کا کھیل شروع کیے جانے کی پوری کوشش ہو رہی ہے۔ ہم سب کو یکساں سول کوڈ کے نام پر مشتعل کیے جانے والے فرقہ پرستوں کے گیم کو سمجھنا ہے۔ یاد رکھیے یکساں سول کوڈ کی مار سب پر پڑے گی۔ آدی واسی، دلت، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، شمالی، جنوبی ریاستوں اور دیگر بھی اس کی مخالفت کریں گے۔ تبھی تو آج تک بھگوا سرکار یکساں سول کوڈ بل کا ڈرافت نہیں لا پائی ہے۔ لیکن اس پر سیاست کرنے میں وہ ضرور آگے رہتی ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

مراسلات

یکساں سول کوڈ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں!

آدی واسی، ہندو، دلت، سکھ اور عیسائی سبھی مخالف۔شمالی و جنوبی ریاستوں میں زبردست اختلاف رائے

اقلیتوں کے اشتعال میں نہ آنے سے تفرقہ پرداز طاقتوں کو مایوسی

ابھے کمار، دلی

یکساں سول کوڈ کے نام پر پھر سے فرقہ پرست طاقتیں سرگرم ہو گئی ہیں۔ سوشل میڈیا اور ٹی وی چینلز پر مسلمانوں کو نشانہ بنا رہی ہیں مگر دانشور اور ملی رہنما اسے صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں مان رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ تنازع درحقیقت ملک کے تنوع اور جمہوریت سے منسلک ہے۔ اگر عوام کے اوپر یکساں سول کوڈ مسلط کیا جائے گا تو اس کی زد میں تمام ہندوستانی آئیں گے، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ، عیسائی ہوں یا آدی واسی۔

اچھی بات یہ ہے کہ دن رات لوگوں کو اکسانے کے باوجود بھی فرقہ پرست طاقتیں ناکام ہوتی دکھائی دے رہی ہیں کیونکہ سیکولر فورسیز اور اقلیتیں اس موضوع پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے دلائل کا استعمال کر رہی ہیں۔ زیادہ تر لوگ جذباتی بیان دینے سے گریز کر رہے ہیں۔ صبر و تحمل سے کام لیا جا رہا ہے، جس کی وجہ سے فرقہ پرست طاقتیں سماج کو فرقہ ورانہ خطوط پر بانٹنے میں ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ ملی رہنماؤں نے اس مسئلہ کو وسیع تناظر میں دیکھا ہے اور عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ یکساں

"سب کو تعلیم دینے کے علاوہ رہنمایانہ اصول حکومت پر یہ بھی ذمہ داری عائد کرتے ہیں کہ وہ سرمایہ کی جمع خوری کے خلاف قانون بنائے۔ مگر موجودہ حکومت اس کے خلاف کام کر رہی ہے اور اس نے مال و دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے میں اپنا تعاون دیا ہے"

ظفرالاسلام خان

سول کوڈ کے نام سے خوف نہ کھائیں۔ انہوں نے اپنے بیانات میں کہا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ کو لے کر نہ تو حکومت اور نہ ہی فرقہ پرست طاقتیں سنجیدہ ہیں۔ ایسے معاملوں کو چھیڑ کر وہ اپنی ناکامیوں کو چھپانا چاہتے ہیں، جو عوام کے غصہ سے بری طرح گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

اپنے پیغامات میں، ملی رہنماؤں نے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ جب ان سے یہ پوچھا جائے کہ مسلمان یکساں سول کوڈ کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں، تو ان کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ یکساں سول کوڈ کو صرف مسلمانوں سے نہ جوڑا جائے، کیونکہ یہ معاملہ ملک کی مذہبی آزادی، اقلیتوں کے حقوق اور جمہوریت سے جڑا ہوا ہے۔ ملی رہنماؤں نے کہا کہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ فرقہ پرست طاقتوں کی اصل طاقت ان کا ہندو بنام مسلمان کا کھیل ہے۔ اگر لوگ فرقہ پرست طاقتوں کو مذہب کے نام پر تقسیم کے کھیل میں ناکام کر دیں اور روٹی، کپڑا اور مکان کے موضوع پر لے آئیں تو ملک اصل معنوں میں ترقی کی راہ پر چل پڑے گا۔

ملی رہنماؤں کا یہ بھی کہنا ہے کہ بھگوا جماعتیں یونیفارم سول کوڈ کے تعلق سے خود بھی سنجیدہ نہیں ہیں کیونکہ ابھی تک اس تعلق سے کوئی بلیو پرنٹ یا ڈرافٹ پیش نہیں کیا گیا۔ بار بار یکساں سول کوڈ کے جن کو بوتل سے باہر نکالا جاتا ہے، مگر حکومت کے پاس کوئی تیاری نہیں ہے۔ بھگوا طاقتیں گزشتہ کئی دہائیوں سے اس موضوع پر سیاست کر رہی ہے، مگر آج تک انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یکساں سول کوڈ کے نام پر وہ کرنا کیا چاہتی ہیں۔ ملی رہنماؤں کے مطابق، یہ سب کچھ حکومت اپنی ناکامیوں کو چھپانے اور مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے لیے کر رہی ہے۔ ملی رہنماؤں نے حکومت سے پوچھا کہ اگر حکومت آئین کے حصہ چار میں مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول کو قانون بنانے اور اسے نافذ کرنے کے تعلق سے اتنی ہی سنجیدہ ہے تو وہ اسی رہنمایانہ اصول میں موجود دوسری پالیسی جو یکساں سول کوڈ سے زیادہ اہم ہے اس پر خاموش کیوں ہے؟ مساوات پر مبنی سماجی نظام کی تشکیل بھی رہنمایانہ اصول کا حصہ ہے، مگر اس پر حکومت کام کرنے کے بجائے ایسی پالیسی بنا رہی ہے جس سے امیری اور غریبی کے درمیان خلیج اور بڑھ رہی ہے۔

ایک ملاقات کے دوران، دہلی اقلیتی کمیشن کے سابق صدر، نامور صحافی و دانشور ڈاکٹر ظفرالاسلام خان نے حکومت کے منشا پر سوال اٹھایا ہے: "آئین کے رہنمایانہ اصول میں بہت ساری باتیں کہی گئی ہیں۔ سب کو تعلیم مہیا کرانے کی اپنی ذمہ داری، جو کہ رہنمایانہ اصول کا حصہ تھا، کو عمل میں لانے میں ساٹھ سال سے بھی زیادہ کا وقت لگ گیا۔ یاد رہے کہ آئین سازی کے دس سالوں کے اندر سب کو مفت تعلیم دینے کی بات کہی گئی تھی۔ سب کو مفت تعلیم دینے کا قانون بن جانے کے بعد بھی، ملک میں سب کو تعلیم نہیں مل پا رہی ہے کیونکہ بہت سارے دیہاتوں میں ابھی بھی اسکولس نہیں ہے۔ الغرض، حکومت عوامی فلاح کے ایشوز کو نافذ کرنے میں بے حس رہی ہے۔ سب کو تعلیم دینے کے علاوہ رہنمایانہ اصول حکومت پر یہ بھی ذمہ داری عائد کرتے ہیں کہ وہ سرمایہ کی جمع خوری کے خلاف قانون بنائے۔ مگر موجودہ حکومت اس کے خلاف کام کر رہی ہے اور اس نے مال و دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے میں اپنا تعاون دیا ہے۔ میڈیا میں خبر یہ بھی آئی ہے کہ کورونا وبا کے دوران اڈانی اور امبانی جیسے سرمایہ داروں کی دولت کافی بڑھ گئی۔ دوسری طرف، لوگ بھوکے ہیں، کاروبار ٹھپ پڑا ہے، وہیں چند مٹھی بھر لوگ مال بنا رہے ہیں۔ رہنما اصول کے اندر یہ بھی کہا گیا ہے کہ مزدور کو پیداوار کے کاموں میں حصہ داری ملے۔ ایک طرح کے کاموں کے لیے ایک طرح کی مزدوری بھی دینے کی بات رہنما اصولوں میں کہی گئی ہے۔ مگر فوج کے اندر بھی ایک کام کے لیے ایک مزدوری دینے کی پالیسی عمل میں نہیں ہے۔ ان اہم ترین ایشوز کو عمل میں لانے کے بجائے، موجودہ حکومت یکساں سول کوڈ کے تعلق سے بے چین ہے۔ اگر حکومت رہنما اصول کو لے کر اتنی ہی سنجیدہ ہے تو اسے رہنما اصولوں میں دی گئیں ان پالسیوں کو نافذ کرنا چاہیے جس سے ایک مساوات پر مبنی سماج قائم ہو"۔

'ملی گزیٹ' کے ایڈیٹر ڈاکٹر ظفرالاسلام نے مزید کہا کہ یکساں سول کوڈ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے مطابق، اس ملک میں دو سو تا تین سو پرسنل لاز ہیں۔ آدیواسیوں اور عیسائیوں کے بھی اپنے پرسنل لاز ہیں۔ ہندوؤں میں بھی کافی ڈائیورسٹی پائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے اندر بھی بہت سارے پرسنل لاز ہیں۔ میو مسلمان، بوہرہ، شیعہ، سنی کے اپنے پرسنل لاز ہیں۔ انہوں نے خبردار کیا کہ اگر یکساں سول کوڈ کو تھوپا گیا تو اس سے بہت سارے مسائل پیدا ہوں گے۔ مسائل صرف مسلمانوں میں ہی نہیں، بلکہ ہندوؤں میں بھی پیدا ہوں گے۔ انہوں نے یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنے والوں کی حمایت کرنے والوں سے یہ سوال کیا کہ وہ یہ بتلائیں کہ اس کی ملک میں ابھی اس کی کیا ضرورت آن پڑی ہے، جب کہ سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا ہے؟

ایک طویل انٹرویو میں، مسلم پرسنل لا کے سابق ترجمان اور ویلفیر پارٹی آف انڈیا کے صدر ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس نے کہا کہ "بھارت کے اندر بہت سارے مذہب اور کلچر کو ماننے والے لوگ رہتے ہیں۔ یہاں ایک دھرم کے ماننے والے لوگ نہیں رہتے۔ ہمارا آئین سب کو اپنے دھرم اور کلچر پر چلنے کی پوری آزادی دیتا ہے۔ مذہب کو ماننے اور اس کی تبلیغ کی بھی بات کہتا ہے۔ جہاں تک پرسنل لا کی بات ہے، ہمارے دیش میں ایک پرسنل لا نہیں ہے۔ بھارت میں بہت سارے کسٹمری لا، فیملی لا اور رواج ہیں۔ اس لیے ملک کو تنوع کے ساتھ آگے بڑھانے کی کوشش ہونی چاہیے۔ اگر ایسا ہوا تو سماج میں کوئی تناؤ اور کشیدگی پیدا نہیں ہوگی۔ 'افکار ملی' کے مدیر اور مشہور مصنف ڈاکٹر الیاس نے متنبہ کیا کہ "اگر یونیفارمٹی کے نام پر تمام کلچر اور پرسنل لا کو ایک بنانے کی کوشش کی گئی تو اس سے سماج میں پریشانی، شورش اور ہنگامہ پیدا ہوگا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نیشنل مین اسٹریم یا قومی دھارے میں لانے کے لیے یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ نیشنل مین اسٹریم کی بات کرنے والوں سے پہلے پوچھیے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ اگر نیشنل مین اسٹریم سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس دیش میں ایک ہی دھرم ہونا چاہیے، ایک ہی کلچر اور ایک ہی زبان ہونی چاہیے، تو اس کی مخالفت نہ صرف ہم کریں گے، بلکہ ملک کا ہر شہری کرے گا۔ بھارت کے لوگ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ ان کے دھرم اور کلچر کے معاملے میں مداخلت ہو۔ تبھی تو یہ بات صحیح نہیں ہے کہ صرف مسلمان ہی یکساں سول کوڈ کی مخالفت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں بھی یونیفارم سول کوڈ کو نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔"

کیمسٹری میں ناگپور سے پی ایچ ڈی کرنے والے ڈاکٹر الیاس نے مزید کہا کہ "جب ہندو کوڈ بل لایا گیا تھا تو وہ بھی پوری طرح سے یونیفارم نہیں تھا۔ ہندو کوڈ بل کے اندر بھی بہت سارے استثنیات دیے گیے ہیں۔ مثال کے طور پر رسم و رواج کو لے کر شمالی اور جنوبی ہند میں کافی فرق ہے۔ تمل ناڈو میں ماموں اور بھانجی کی آپس میں شادی ہوتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ماموں کا پہلا حق بھانجی پر ہے۔ مگر شمالی ہند میں ماموں اور بھانجی کی شادی کا کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ثقافت اور پرسنال لا کو لے کر ہمارے ملک میں بہت ہی زیادہ اختلاف اور تنوع پایا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ہندو اور مسلمان کے علاوہ آدی واسیوں کے اپنے فیملی لا ہیں۔ یاد کیجیے ناگالینڈ اور میزورم میں ایک لمبے وقت تک علیحدگی پسند تحریک چلی تھی۔ ملک کے خلاف وہاں لوگ ہتھیار لے کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے اس بات پر سمجھوتا کیا اور ہتھیار ڈالے کہ ان کے فیملی لا میں، مرکزی حکومت کوئی مداخلت نہیں کرے گی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان کا کوئی بھی قانون ان کے فیملی لا کے معاملے میں نہیں تھوپا جائے گا۔ انہوں نے یہ بھی شرط رکھی تھی کہ پارلیمنٹ کوئی بھی ایسا قانون نہیں لائے گی جو ان کے فیملی لا کے اوپر مسلط ہو جائے۔ آرٹیکل ۳۷۱ اے اور ۳۷۱ جی کے تحت، ایک باضابطہ معاہدہ ناگا اور کوکی سے ہوا اور اسے آئین میں لکھا گیا کہ حکومت ہند کوئی ایسا قانون نہیں بنائے گی جو ناگا اور کوکی کے فیملی لا کو رد کر دے۔ اس طرح فیملی لا کا احترام کرنے کا وعدہ آئین میں کیا جا چکا ہے"۔

بابری مسجد کمیٹی کے سابق کنوینر ڈاکٹر الیاس نے یاد دلایا "یونیفارم سول کوڈ کی بات رہنما اصول میں کہی گئی ہے جو کہ لازمی نہیں ہے۔ اس پالسی کے بارے میں حکومت سے کہا گیا کہ اس معاملہ پر بات چیت کرے اور پالیسی لے آئے۔ ایسا اس لیے ہوا کہ آئین سازی کے دوران بہت سارے معاملے ایسے تھے، جن پر کوئی اتفاق نہیں ہو پایا تھا اور اسے رہنما اصولوں کے تحت ڈال دیا گیا۔ رہنما اصول کے اندر یہ بھی کہا گیا کہ شراب کو پوری طرح سے ممنوع کیا جائے جسے ابھی تک پورا نہیں کیا گیا۔ یہ بھی کہا گیا کہ آجر اور مزدور کے بیچ میں بنی خلیج کو کم کیا جائے مگر اس طرف سے بھی کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ایک خاص ذہنیت کام کر رہی ہے، جو سمجھتی ہے کہ یونیفارم سول کوڈ ہونا چاہیے کیونکہ کہ یہ ملک کے اتحاد کے لیے ضروری ہے۔ یہ بھی بے سر پیر کی بات ہے۔ اس کی کوئی دلیل اور ثبوت نہیں ہے کہ یونیفارم سول کوڈ لانے سے امن اور انصاف قائم ہو جائے گا۔ یاد کیجیے وہ دور جب ہمارے ملک میں ہندی کو تھوپنے کی ایک مہم چلی تھی، مگر اس کی جنوبی ہند میں زبردست مخالفت ہوئی تھی۔ ایک کلچر اور ایک زبان اور ایک نیشن کی بات ہمارے ملک میں ہوتی رہی ہے مگر جنوبی ہند نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ ان تجربات سے یہ بات صاف ہے کہ اگر کسی کے مذہب، عقیدہ اور اس کے کلچر میں مداخلت کی کوشش ہوگی تو اس کا رد عمل کافی سخت آئے گا۔ اس سے معاشرہ کے اندر میں تناؤ پیدا ہوگا"۔

اسلام اور مسلم پرسنل لا کو اس سوال سے جوڑتے ہوئے ڈاکٹر الیاس نے کہا کہ "جہاں تک اسلام کی بات ہے تو وہاں پرسنل لا مذہب کا اٹوٹ حصہ ہے۔ پرسنل لا انسانوں کے ذریعہ نہیں بنایا گیا ہے کہ ہم نے جب چاہا اس میں چھیڑ چھاڑ کی یا بدل دیا۔ قرآن اور حدیث کے اندر یہ بات صاف طور سے لکھی گئی ہے کہ نکاح کیسے ہوگا، مہر کیسے ادا کیا جائے گا، طلاق، خلع کیسے ہوگا۔ یہ بات قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے کہ کوئی کہے کہ قرآن اور سنت میں جو لکھا گیا ہے اس پر مسلمان عمل نہ کریں اور جو قرآن اور سنت سے باہر ہے اس پر عمل کریں۔ اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ملک کا آئین سب کو اپنے مذہب پر چلنے کی ضمانت دیتا ہے"۔

ایک گفتگو کے دوران، ایس ڈی پی آئی کے نیشنل سکریٹری اور مسلم پولیٹکل کونسل آف انڈیا کے صدر ڈاکٹر تسلیم احمد رحمانی نے کہا ہے کہ یونیفارم سول کوڈ کی بات حکومتیں اپنی ناکامی کو ڈھکنے اور مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے لیے کرتی رہی ہیں۔ حکومت کی منشا پر سوال کرتے ہوئے ڈاکٹر رحمانی نے کہا "اگر سرکار یونیفارم سول کوڈ کو لے کر سنجیدہ ہے، تو اس کا بلیو پرنٹ لانا چاہیے۔ سب سے پہلے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جس دہلی ہائی کورٹ کے تبصرے کے بعد یونیفارم سول کوڈ کو لے کر ہنگامہ کھڑا کیا جا رہا ہے وہ مسئلہ مسلمانوں کا نہیں ہے۔ دہلی ہائی کورٹ کا فیصلہ آدی واسی مینا سماج کے

"اگر یونیفارمٹی کے نام پر تمام کلچر اور پرسنل لا کو ایک بنانے کی کوشش کی گئی تو اس سے سماج میں پریشانی، شورش اور ہنگامہ پیدا ہوگا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ نیشنل مین اسٹریم یا قومی دھارے میں لانے کے لیے یکساں سول کوڈ کی ضرورت ہے۔ مگر یہ بات درست نہیں ہے۔ نیشنل مین اسٹریم کی بات کرنے والوں سے پہلے پوچھیے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ اگر نیشنل مین اسٹریم سے ان کی مراد یہ ہے کہ اس دیش میں ایک ہی دھرم ہونا چاہیے، ایک ہی کلچر اور ایک ہی زبان ہونی چاہیے، تو اس کی مخالفت نہ صرف ہم کریں گے، بلکہ ملک کا ہر شہری کرے گا۔"

ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس

بارے میں تھا اور جو سوال تنازع کا موضوع تھا وہ یہ کہ کیا ہندو کوڈ بل کو آدی واسی مینا سماج کے اوپر نافذ کیا جا سکتا ہے؟ دراصل یہ سوال ہندو اور ان کے اندر جو مختلف سماجی گروپس ہیں ان کے فیملی لاز میں یکسانیت سے متعلق ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مذکورہ کیس کا تعلق مسلمانوں سے ذرہ برابر بھی نہیں ہے"۔

ڈاکٹر رحمانی نے حکومت کی نیت پر بھی سوال اٹھایا اور کہا کہ "یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یونیفارم سول کوڈ کو نافذ کرنے کی ذمہ داری حکومت کی ہے، عوام کی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ ذمہ داری کسی فرد یا کسی تنظیم کی ہے۔ پچھلے ستر سالوں میں کئی بار عدالت نے حکومت سے یونیفارم سول کوڈ کے بارے میں پوچھا لیکن کسی بھی حکومت نے اس کا جواب نہیں دیا۔ جب کبھی انتخابات قریب

آتے ہیں، جب کبھی حکومت کو اپنی ناکامی چھپانی ہوتی ہے، جب کبھی مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی سازش ہوتی ہے، تو یکساں سول کوڈ، طلاق اور اس طرح کے تنازعات کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمراں طبقہ ذرا بھی سنجیدہ نہیں ہے۔ اگر کوئی حکومت پرسنل لا کے تعلق سے سنجیدہ ہے تو پہلے اسے ایک بلیو پرنٹ تیار کرنا چاہیے۔

ملک میں موجود مشترکہ تہذیب اور مخلوط سماج کے بارے میں ڈاکٹر رحمانی نے کہا اس

"اگر سرکار یونیفارم سول کوڈ کو لے کر سنجیدہ ہے، تو اس کا بلیو پرنٹ لانا چاہیے۔ سب سے پہلے ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جس دہلی ہائی کورٹ کے تبصرے کے بعد یونیفارم سول کوڈ کو لے کر ہنگامہ کھڑا کیا جا رہا ہے وہ مسئلہ مسلمانوں کا نہیں ہے۔ دہلی ہائی کورٹ کا فیصلہ آدی واسی مینا سماج کے بارے میں تھا اور جو سوال تنازع کا موضوع تھا وہ یہ کہ کیا ہندو کوڈ بل کو آدی واسی مینا سماج کے اوپر نافذ کیا جا سکتا ہے؟ دراصل یہ سوال ہندو اور ان کے اندر جو مختلف سماجی گروپس ہیں ان کے فیملی لاز میں یکسانیت سے متعلق ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو مذکورہ کیس کا تعلق مسلمانوں سے ذرہ برابر بھی نہیں ہے"۔

—————— ڈاکٹر تسلیم احمد رحمانی

ملک میں بڑی تعداد میں پرسنل لاز ہیں۔ کچھ لوگ گوا کے یونیفارم سول کوڈ کی بھی مثال دیتے ہیں، مگر یہ بات نہیں ہوتی کہ گوا میں ہندوؤں کو ایک سے زیادہ شادی کی کچھ شرائط کے ساتھ اجازت ہے حالانکہ ہندوؤں کے یہاں ایک سے زیادہ شادی کرنے کا تصور نہیں ہے، پھر بھی وہاں ان کو ایسا کرنے کی آزادی ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یکساں سول کوڈ کوئی بہت اہم ایشو نہیں ہے۔ لا کمیشن آف انڈیا نے سال ۲۰۱۸ کی رپورٹ میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ یونیفارم سول کوڈ اس ملک میں لانا عملی طور پر ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کمیشن نے کہا کہ یونیفارم سول کوڈ سے بہتر ہوگا کہ جو مختلف پرسنل لاز ہیں، ان کا 'کوڈی فیکیشن' ہو جائے مگر حکومت نے اب تک کچھ نہیں کیا ہے اور میڈیا ان باتوں کو اٹھانے کے بجائے مسلمانوں کو ٹارگیٹ کر رہا ہے"۔

انسانی حقوق کے جہد کار، بزرگ صحافی، مصنف اور عیسائی سماج کے بڑے رہنما ڈاکٹر جان دیال نے بھی یونیفارم سول کوڈ کے تئیں حکومت کی غیر سنجیدگی پر سوال اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ وہ اب تک کوئی ڈرافت نہیں پیش کر سکی ہے، جبکہ سیاست کرنے میں ہندوتوا کے لوگ آگے آگے رہتے ہیں۔ "جس طرح سے اس مسئلہ کو ہندو بنام مسلمان کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے یہ مسئلہ ویسا ہے نہیں۔ دراصل یونیفارم سول کوڈ کے تھوپے جانے پر سب سے زیادہ اثر ہندوؤں پر پڑے گا۔ مثال کے طور پر، ہندوں کو مشترکہ فیملی کی بنیاد پر ٹیکس میں چھوٹ ملتی ہے، جو دوسرے مذہبی گروپس کو نہیں ملتی۔ اگر یونیفارم سول کوڈ نافذ ہوتا ہے، تو اس کی مخالفت سب سے پہلے ہندو کریں گے۔ اگر یونیفارم سول کوڈ نافذ ہوتا ہے، تو اس کی مخالفت کرنے ہندوؤں سب سے پہلے آئیں گے۔

گزشتہ دنوں ایک بات چیت کے دوران، ڈاکٹر جان دیال نے کہا کہ "جب اٹل بہاری باجپئی وزیر اعظم تھے اور اس وقت یونیفارم سول کوڈ پر بحث ہو رہی تھی، تب میں اس عیسائی وفد کا حصہ تھا جو ان سے ملاقات کرنے گیا تھا۔ میں نے اٹل بہاری باجپئی سے پوچھا تھا کہ ان کے خیال سے کامن سول کوڈ میں کیا ہونا چاہیے۔ میں نے ان سے ڈرافٹ دکھانے کی بات بھی کہی تھی۔ میں نے ان سے کچھ سوالات بھی کیے تھے کہ 'کیا آدی واسیوں کا فیملی لا، جس کی حفاظت کی ضمانت ہمارا آئین دیتا ہے، اسے ہٹا دیا جائے گا؟ منی پور اور میگھالیہ میں جو فیملی لا ہے اسے رد کر دیا جائے گا؟ کیا آپ تمل ناڈو میں ماموں اور بھانجی کی شادی روک دیں گے؟ کیا آپ لداخ، اترانچل میں کسی خاتون کے ذریعہ ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کے رواج کو ہٹا دیں گے؟ آپ ہندو کوڈ بل میں سے کیا کیا لانا چاہتے ہیں؟ تب سے لے کر پچیس سال گزر گئے، اب تک کسی نے ایک ڈرافت تک نہیں دکھایا۔ میرا یہ دعویٰ ہے کہ اگر انہوں نے یونیفارم سول کوڈ کا ڈرافٹ دکھایا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت ملک کا ہندو کرے گا"۔

یاد رہے کہ سات جولائی کے اپنے ایک فیصلہ میں، دہلی ہائی کورٹ نے مرکزی حکومت سے کہا ہے کہ وہ یکساں سول کوڈ کو نافذ کرنے کے لیے اقدامات کرے۔ راجستھان کے آدی واسی مینا سماج کے ایک معاملے میں سماعت کرتے ہوئے کورٹ نے یہ بات کہی۔ تنازع اس بات پر تھا کہ کیا 'ہندو میریج ایکٹ' کے تحت مینا خاندان کے مسائل حل کیے جا سکتے تھے؟ اپنے تبصرے میں، جسٹس پرتیبھا ایم سنگھ نے کہا کہ ذات برادری اور مذہبی دیواریں دھیرے دھیرے گر رہی ہیں۔ کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد، فرقہ پرست طاقتیں ایک بار پھر سرگرم ہو گئی ہیں۔ وہ دن رات مسلمانون کو گالیاں دے رہی ہیں۔ ان کا الزام ہے کہ جب ملک میں سب کا ڈی این اے ایک ہے تو ایک قانون آنا ہی چاہیے۔

عدالت نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی کافی کمزور ہے۔ بھارت میں ذات برادری اور مذہبی دیواریں گر رہی ہیں، کورٹ کی اس دلیل سے بہت سارے لوگ اتفاق نہیں رکھتے۔ آزادی کے ستر سالوں کے بعد بھی، ذات برادری کا تعصب برقرار ہے۔ ملک میں سیکولر اور جمہوری آئین ہے جو کہتا ہے کہ سب برابر ہیں، پھر بھی دھرم کے نام پر مار کاٹ چل رہی ہے۔ شادی بیاہ بھی تو اکثر لوگ اپنی ہی ذات برادری میں کرتے ہیں۔ ملک میں کتنے اعلیٰ ذات کے والدین ہوں گے جو اپنی بیٹی کی شادی کسی دلت یا مسلم نوجوان سے کرنے کے لیے خوشی خوشی راضی ہو جائیں گے؟ جو کہتے ہیں کاسٹ ختم ہو رہا ہے، ان سے پوچھیے کہ آخر عدالت، اعلیٰ نوکرشاہی، سیاسی جماعت، میڈیا، فلم انڈسٹری، کالج اور یونیورسٹی میں اعلیٰ ذات کی اجارہ داری کیوں ہے؟ آخر کیوں ٹکٹ کی تقسیم کرتے وقت، سیاسی جماعتیں ذات پات اور مذہبی اعداد و شمار کا بڑا خیال رکھتی ہیں؟ کیا یہ بات غلط ہے کہ جیسے جیسے آپ ذات برادری کی سیڑھی پر اوپر چڑھتے ہیں، آپ کو لوگ نسبتاً زیادہ زمین اور پیسے والے ملتے ہیں، وہیں سیڑھی کے نیچے اترنے پر لوگ زیادہ غریب، تنگ حال اور ظلم کے ستائے ہوئے ملتے ہیں؟ یہ بھی بات حلق سے نیچے نہیں اُتر رہی ہے کہ ملک میں مذہبی شناخت کمزور ہو رہی ہے۔ دراصل مذہبی سیاست، مذہبی تعصب اور مذہبی جنون کم ہونے کے بجائے بڑھتا ہوا معلوم ہو رہا ہے۔ رام مندر کے نام پر سیاست، ہجومی تشدد کی آڑ میں مسلم اور دلت نوجوانوں کو نشانہ بنایا جانا، میڈیا اور سوشل میڈیا کی مدد سے اقلیتوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانا یہ کچھ ایسی مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ انسان بننے سے کہیں زیادہ لوگ ہندو اور مسلمان بننے میں یقین رکھتے ہیں۔

یکساں سول کوڈ کو ملک کی ترقی اور امن سے بھی جوڑا جا رہا ہے۔ یہ خیالی بات بھگوا تنظیم سے وابستہ ایک مسلمان لیڈر نے کہی ہے۔ یکساں سول کوڈ کی حمایت کرتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ ایسا قانون بن جانے سے ملک میں وکاس ہوگا اور امن کا ماحول قائم ہوگا۔ دراصل ترقی کا رشتہ عوام کی خوشحالی سے ہوتا ہے۔ لوگوں کی خستہ حالی کو دور کرنے کی ایک ہی تدبیر ہے کہ حکومت روزگار اور فلاحی کاموں پر توجہ دے۔ امن قائم کرنے کے لیے لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا ہوگا اور پڑوسی ملکوں کے ساتھ مذاکرات بحال کرنے ہوں گے۔ بات چیت بھی تب ہی کامیاب ہوگی جب فریقین اکڑ اور جھوٹے غرور کو ترک کر دیں اور عوام کی جان و مال کی حفاظت اور ان کے انسانی حقوق کو سب سے اوپر رکھیں۔ بھگوا جماعت کے مذکورہ اقلیتی لیڈر اپنی پارٹی کے تئیں اتنے وفادار نظر آئے کہ

"جس طرح سے اس مسئلہ کو ہندو بنام مسلمان کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے یہ مسئلہ ویسا ہے نہیں۔ دراصل یونیفارم سول کوڈ کے تھوپے جانے پر سب سے زیادہ اثر ہندوؤں پر پڑے گا۔ مثال کے طور پر، ہندوں کو مشترکہ فیملی کی بنیاد پر ٹیکس میں چھوٹ ملتی ہے، جو دوسرے مذہبی گروپس کو نہیں ملتی۔ اگر یونیفارم سول کوڈ نافذ ہوتا ہے، تو اس کی مخالفت سب سے پہلے ہندو کریں گے۔"

—————— ڈاکٹر جان دیال

انہوں نے ان پیچیدگیوں کی طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔

تیسری دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ یکساں سول کوڈ کے آ جانے سے مسلمانوں کی 'کافی تیزی' سے بڑھ رہی آبادی پر روک لگ جائے گی اور اس طرح بھارت کی ہندو اکثریتی ڈیموگرافی نہیں بدل پائے گی۔ عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کی بڑھتی آبادی کا پروپیگنڈا گزشتہ سو سالوں سے بھی زیادہ عرصہ سے چل رہا ہے، جبکہ مسلمان آج بھی ملک میں اقلیت میں ہی ہیں۔ پروپیگنڈے میں بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی بڑھ رہی ہے، مگر جو بڑی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آبادی کی 'شرح نمو' بڑی تیزی سے کم ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں کی دہائی کی شرح نمو مردم شماری ۲۰۱۱ میں، ۲۹ فی صد سے کم ہو کر ۲۴ فی صد ہو گئی، اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بھارت کی بڑی آبادی صرف پریشانی نہیں لاتی، بلکہ وہ بہت سارے مواقع کے دروازے بھی کھول دیتی ہے۔ اگر بڑھتی آبادی کی وجہ سے حکومت سب کے لیے فلاحی کاموں کو انجام نہیں دے پا رہی ہے، تو اتنی بڑی آبادی سے لیا گیا ٹیکس کہاں چلا جاتا ہے؟ یہ بھی ایک بڑا پروپیگنڈ ہے کہ ٹیکس صرف مالدار دیتا ہے، اور غریب صرف سرکاری بجٹ کو 'دیمک' کی طرح چٹ کر جاتے ہیں۔ مگر یہ بات نہیں بتلائی جاتی کہ ایک رکشہ چلانے والا فرد جب راشن اور دوا خریدتا ہے، اپنا موبائیل ریچارج کراتا ہے تو وہ بھی ٹیکس ادا کرتا ہے۔ ماہر اقتصادیات بتاتے ہیں کہ امیر لوگ اکثر ٹیکس کی چوری کرتے ہیں اور حکومت سے بہت ساری سہولتیں لیتے ہیں اور کروڑوں کا قرض معاف کرواتے ہیں، مگر غریب اور عام آدمی کو ہر حال میں ٹیکس دینا پڑتا ہے۔

بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۶

صرف یکساں سیول کوڈ ہی کیوں؟ دیگر امور کیوں نہیں؟؟

کیا کہتا ہے بھارت کا آئین؟

مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول

۳۶۔ اس حصہ میں، بجز اس کے کہ سیاق عبارت اس کے خلاف ہو، "مملکت" کے وہی معنی ہیں جو حصہ ۳ میں ہیں۔

۳۷۔ اس حصہ میں مندرجہ توضیعات کو کوئی عدالت نافذ نہ کر سکے گی لیکن اس کے باوجود وہ اصول جو اس میں قلمبند کیے گئے ہیں، ملک کی حکمرانی کے لیے بنیادی ہیں اور مملکت کا فرض ہوگا کہ قوانین بنانے میں ان اصولوں کا اطلاق کرے۔

۳۸(۱) مملکت، ایسے سماجی نظام کو، جس میں قومی زندگی کے سب ادارے سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف سے بہرہ ور ہوں، جہاں تک اس سے ہو سکے، مکمل طور پر قائم اور محفوظ کر کے لوگوں کی بہبودی کو فروغ دینے میں کوشاں رہے گی۔

(۲) مملکت، خصوصی طور پر نہ صرف افراد کے مابین بلکہ مختلف علاقوں کے رہنے والے یا مختلف پیشوں میں کام کرنے والے اشخاص کے مابین آمدنی میں عدم توازن کم کرنے کی کوشش کرے گی نیز حیثیت، سہولتوں اور مواقع میں عدم توازن ختم کرنے کا اقدام کرے گی۔

۳۹۔ مملکت، اپنی حکمت عملی کو خاص طور سے اس امر کے اطمینان کے لیے عمل میں لائے گی کہ

(الف) مرد اور عورت سب شہریوں کو مساوی طور پر معقول ذرائع معاش حاصل ہو،

(ب) قوم کے مادی وسائل کی ملکیت اور ان پر نگرانی کی اس طرح تقسیم ہو جس سے حتی المقدور عام بھلائی مقصود ہو،

(ج) معاشی نظام اس طرح نہ چلایا جائے جس سے دولت اور پیداوار کے ذرائع ایک جگہ جمع ہو کر عوام کے لیے مضرت رساں ہوں،

(د) عورتوں اور مردوں دونوں کے لیے مساوی کام کے لیے مساوی یافت ہو،

(ہ) کام گر مردوں اور عورتوں کی صحت، طاقت اور بچوں کی کم سنی سے بے جا فائدہ نہ اٹھایا جائے اور شہری، معاشی ضرورت سے ایسے حرفے میں جانے پر مجبور نہ ہوں جو ان کی عمر یا طاقت کے لیے نامناسب ہوں،

(و) بچوں کو صحت مند طریقے سے اور آزاد و پر وقار ماحول میں پڑھنے کے مواقع اور سہولتیں فراہم کی جائیں اور بچپن اور جوانی میں استحصال اور اخلاقی و مادی بے اعتنائی سے انہیں محفوظ رکھا جائے۔

۳۹ الف۔ مملکت اس امر کو یقینی بنائے گی کہ قانونی نظام پر ایسے عملدر آمد ہو جس سے مساوی مواقع فراہم کرتے ہوئے انصاف کا فروغ ہو اور بالخصوص مناسب قانون سازی سے یا اسکیمیں مرتب کر کے یا کسی دیگر طریقے سے مفت قانونی امداد اس طرح فراہم کی جائے حس سے اس امر کا تیقن ہو کہ معاشی یا دیگر نااہلیتوں کی بنا پر کسی شہری کو انصاف حاصل کرنے کے حق سے محروم نہیں رکھا گیا ہے۔

۴۰۔ مملکت، گرام پنچایتوں کو منظم کرنے کے لیے تدابیر اختیار کرے گی اور ان کو ایسے اختیارات و اقتدار دے گی جو حکومت خود اختیاری کی اکائیوں کی حیثیت سے کار منصبی انجام دینے کے قابل بنانے کے لیے ضروری ہوں۔

۴۱۔ مملکت اپنی معاشی گنجائش و ترقی کی حدود میں، کام پانے، تعلیم حاصل کرنے نیز بے روزگاری، پیرانہ سالی، بیماری اور معذوری اور ناروا حاجت کی دوسری صورتوں میں سرکاری امداد پانے کا حق حاصل کرنے کی ضمانت دینے کے لیے موثر توضیع کرے گی۔

۴۲۔ مملکت، کام کرنے کے مناسب اور انسانیت پر مبنی حالات نیز امداد زچہ کی نسبت ضمانت دینے کے لیے توضیع کرے گی

۴۳۔ مملکت مناسب قانون سازی یا معاشی تنظیم کے ذریعے یا کسی دوسرے طریقہ سے، زرعی، صنعتی یا کوئی دوسرا کام کرنے والے سب کام گروں کے لیے کام اور قابل گزارہ اجرت دلانے اور کام کے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی جن سے بہتر معیار زندگی اور فرصت اور سماجی اور ثقافتی ترقی کے لیے ساز گار حالات سے پورا پورا استفادہ کرنے کی ضمانت ہو اور خاص طور سے مملکت گھریلو صنعتوں کو دیہی رقبوں میں انفرادی یا امداد باہمی کی بنا پر ترقی دینے کی کوشش کرے گی۔

۴۳ الف۔ مملکت مناسب قانون سازی کے ذریعے یا کسی دیگر طریقے سے، ایسے اقدامات کرے گی جن سے کسی صنعت سے وابستہ کاروباری اداروں، کارخانوں، یا دیگر تنظیموں کے انتظامیہ میں کام کرنے والے اشخاص کے اشتراک کی ضمانت ہو۔

۴۴۔ مملکت یہ کوشش کرے گی کہ بھارت کے پورے علاقہ میں شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کی ضمانت ہو۔

۴۵۔ مملکت، سبھی بچوں کے لیے چھ سال کی عمر پوری کرنے تک شروعاتی بچپن کی دیکھ ریکھ اور تعلیم دینے کے لیے توضیع کرنے کی کوشش کرے گی۔

۴۶۔ مملکت خاص توجہ کے ساتھ عوام کے زیادہ کمزور طبقوں اور خاص طور سے درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کے تعلیمی اور معاشی مفادات کو فروغ دے گی اور ان کو سماجی ناانصافی اور ہر قسم کے استحصال سے بچائے گی۔

۴۷۔ مملکت، اپنے لوگوں کی غذائیت کی سطح اور معیار زندگی کو بلند کرنا اور صحت عامہ کو ترقی دینا اپنے اولین فرائض میں شمار کرے گی اور خاص طور سے مملکت اس امر کی کوشش کرے گی کہ طبی اغراض کے شوانشہ آور مشروبات اور مضر صحت مفرد ادویہ کے استعمال کی ممانعت کرے۔

۴۸۔ مملکت، زراعت اور افزائش حیوانات کی جدید اور سائنسی طریقوں پر تنظیم کرنے کی کوشش کرے گی اور خاص طور سے گائیوں اور بچھڑوں اور دیگر دودھ دینے والے اور بار بردار مویشیوں کی نسل کو برقرار رکھنے اور بہتر بنانے اور ان کو ذبح کرنے کی ممانعت کرنے کے لیے اقدامات کرے گی۔

۴۸ الف۔ مملکت کی یہ کوشش ہوگی کہ ماحول کو ساز گار بنائے رکھے اور اس میں سدھار لائے نیز ملک کے جنگلات اور اس کے جنگلی جانوروں کا تحفظ کرے۔

میڈیا کے خلاف کارروائی شرمناک

آکسیجن کی کمی سے ہونے والی اموات کا ڈیٹا دینے والے بھارت سماچار اور دینک بھاسکر کے خلاف کارروائی سے محسوس ہوتا ہے کہ سچ دکھانا یا حکومت کی غلط پالیسوں پر آواز اٹھانا کسی جرم سے کم نہیں ہے، معلوم ہوا کہ ۲۰۱۴ کے بعد ملک کے انکم ٹیکس

ڈپارٹمنٹ کی جانب سے چھاپہ مار کارروائی میں بڑا اضافہ ہوا ہے جس سے اندازہ ہوتا کہ حکومت اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز دبانے کے لیے ایسی کارروائی انجام دیتی ہے۔ اب اس ملک کے عوام حکومت کی ساری مکاریاں سمجھ رہے ہیں۔ اب عوام کو مزید بے وقوف نہیں بنایا جاسکتا۔

عبد العلی، بنگلورو

کوکن میں سیلاب کی تباہ کاریاں

اس وقت ملک کی کئی ریاستوں میں سیلاب کی تباہ کاریوں کی خبریں تواتر کے ساتھ آرہی ہیں. جغرافیائی قربت کی وجہ سے ہماری توجہ خطہ کوکن پر مرکوز ہے جہاں سیلاب نے ماضی کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں. انسانی ہلاکتوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق

درجنوں میں نہیں بلکہ سینکڑوں میں ہے بلا مبالغہ لاکھوں لوگ تباہ و برباد اور بے گھر ہوگئے ہیں۔ حکومتی ادارے اور مذہبی وسماجی تنظیمیں حتی الامکان متاثرین کی مدد کررہے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تباہی و بربادی انسان کے لالچ اور حرص کا نتیجہ ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر عبد اللہ فیصل، ممبئی

حکومت کا سفید جھوٹ

حکومت نے کورونا سے ہونے والی اموات کا مذاق اڑایا ہے ۔ ایک طرف دہلی راجستھان، ممبئی، کرناٹک وغیرہ میں لوگ آکسیجن کی کمی سے مرتے رہے لیکن پوری بے شرمی کے ساتھ حکومت نے ایوان میں یہ کہا کہ آکسیجن کی کمی سے کسی کی موت ہونے

کا علم حکومت کو نہیں ہے۔ یہ سفید جھوٹ ہے جو بڑی بے شرمی کے ساتھ بولا گیا ہے، حالانکہ میڈیا نے کورونا کے دوران کئی دواخانوں میں آکسیجن کی کمی سے مرنے والوں کے اعداد و شمار بھی بتائے لیکن حکومت نے جس طرح سے ڈھٹائی کے ساتھ یہ بیان دیا ہے وہ انتہائی شرمناک ہے، اپنی ناکامی کو چھپانے کے لیے بی جے پی حکومت کا یہ رویہ انہی کے خلاف پڑے گا اور گنگا کے کنارے کی لاشیں انتخابات میں اپنی موت کی سچائی بتائیں گی۔

سید احمد تنویر، ابوظبی، متحدہ عرب امارات

جاسوسی ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ

پیگاسس سافٹ ویر کے ذریعہ جاسوسی کی خبر نے واقعہ اس ملک کے سماجی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ حکومت اپنے ہی شہریوں کی جاسوسی کرواتی ہے گویا ان کو انہی سے خطرہ ہے ۔ اسرائیلی سافٹ ویر کے ذریعہ صحافیوں، سماجی

جہد کاروں اور سپریم کورٹ کے ججوں کی جاسوسی بڑی خطرناک بات ہے، اگر یہی کام سابقہ حکومتوں میں ہوا ہوتا تو اپوزیشن پارٹیاں حکومت گرانے کی کوشش کرتیں لیکن یہاں اپوزیشن اگرچہ آواز اٹھا رہی ہے لیکن ابھی اس میں مزید طاقت جھونکنے کی ضرورت ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ معاملہ کیا رخ اختیار کرے گا

محمد امین ذہیب ، بھٹکل

باہمی خیر خواہی اسلامی معاشرہ کی روح

توحید اور رسالت، اسلامی تعلیمات اور احکامات کی روشنی میں رب العزت نے ایسی ایمانی روحانی اخلاقی اور اجتماعی قدریں فراہم کردیں ہیں جو انسانوں کیلیے امن وسلامتی کی ضامن ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کی دعوت، محنت، جدوجہد اور سعی پیہم سے ایسا صالح اور

مثالی معاشرہ وجود میں آیا جو اخوت ومودّت اور باہمی خیر خواہی وہمدردی کا نمونہ بن گیا۔ یہی وہ اسلامی معاشرہ ہے جس کے باہمی اتحاد کی بے پناہ قوت کی بنیاد پر چند برسوں میں ایسا انقلاب برپا ہوا جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ آپسی خیر خواہی وہمدردی میں للہ کی رحمت اور برکت شامل ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جب تک ایمان کی کیفیت عروج پر رہے گی اس وقت تک معاشرہ محبت اور اخلاص، باہمی خیر خواہی وہمدردی کی روح پرور فضا سے معمور رہے گا۔

مولانا محمد جمال الدین رشادی، بنگلور

میر اقبال علی صاحب کی رحلت

جماعت اسلامی ہند بسوا کلیان کرناٹک کے مقامی سکریٹری اسلامی معاشرہ، میر اقبال علی صاحب مختصر علالت کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے ۔ ان کے انتقال سے مقامی جماعت ایک پر عزم، مستعد، ہم تن مصروف شخصیت سے محروم ہو گئی۔ ان کی شخصیت اپنے آپ میں ایک انجمن تھی۔ ان کے پورے افراد خاندان تحریک سے وابستہ ہیں۔ ذریعہ معاش کے لیے وہ محکمہ صحت سے وابستہ رہے اور ہیلتھ انسپکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، سروس کے دوران ، برادران وطن اسٹاف سے دعوتی روابط تھے۔ موصوف نے اپنے خرچ پر کئی برادران وطن کو کنڑی زبان میں قرآن اور دعوتی لٹریچر تحفہ میں دیا۔ ان کے سماجی تعلقات بھی بہت وسیع تھے۔ مرحوم شرعی پنچایت کے ذریعہ گھریلو تنازعات کے حل کے لیے مستقل کوشش کرتے تھے۔ ان کے انتقال پر امیر مقامی بسوا کلیان کلیم عابد منصوری اور حلقہ کرناٹک کے ذمہ داروں نے بھی اہل خانہ سے تعزیت کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی۔ قارئین دعوت سے بھی دعاؤں کی درخواست ہے۔

محمد نعیم الدین، بسوا کلیان، کرناٹک۔

یکساں سول کوڈ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں!

بسلسلہ صفحہ نمبر ۳

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بھارت میں بڑی آبادی کی وجہ سے ہی بہت ساری بیرونی اور بین الاقوامی کمپنیاں اپنا کاروبار یہاں لگاتی ہیں، کیونکہ یہاں ان کو بہت ہی سستے میں مزدور مل جاتے ہیں۔ جس کام کے لیے لندن، دوبئ اور نیویارک میں دولاکھ سے بھی زیادہ دینے پڑسکتے ہیں، وہی کام ہندوستان میں رہنے والا ایک مزدور ۲۰ ہزار میں کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح بھارت کے لیے بڑی آبادی فائدہ مند ثابت ہوئی ہے۔

کچھ لوگ یہ بھی افواہ پھیلا رہے ہیں کہ جب ملک میں سب کا ڈی این اے ایک ہے تو ایک قانوں بھی آنا چاہیے۔ اگر ایک لمحہ کے لیے مان بھی لیا جائے کہ بھارت میں سب کا ڈی اے این ایک ہے اور سب کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے تو اس کی شروعات ایک اسکول سے ہونی چاہیے۔ رکشا والے کا بچہ اور پی ایم کا بچہ بھی ایک ہی اسکول میں پڑھے۔ ٹرین اور رہائشی علاقوں کے اندر بھی درجہ بندی ختم ہو۔ امیروں کے پاس جو بے حساب پیسہ ہے، اس میں غریبوں کا بھی حصہ ہو۔ مگر فرقہ پرستوں کو ان مثبت باتوں سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

کچھ لوگ یکساں سول کوڈ کی حمایت میں آئین کی دہائی دے رہے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ آئین کے حصہ چار میں 'مملکت کی حکمت عملی کے رہنما اصول' دیے گئے ہیں۔ اسی میں آرٹیکل ۴۴ کہتا ہے کہ 'مملکت یہ کوشش کرے گی کہ بھارت کے پورے علاقے میں شہریوں کے لیے یکساں سول کوڈ کی ضمانت ہو'۔ اگر ہدایتی اصولوں کو نافذ کرنا اتنا ہی ضروری ہے، تو کیوں نہیں آرٹیکل ۴۴ سے پہلے جو رہنما اصول ہیں، مثلاً 'مملکت لوگوں کی بہبود کے فروغ کے لیے سماجی نظام قائم کرے گی'، سے ہی شروعات کی جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے وقت قانون ساز اسمبلی میں بھی یکساں سول کوڈ پر کافی بحث ہوئی اور کچھ لوگ اسے ملک پر تھوپنا چاہتے تھے۔ تب بابا صاحب امبیڈکر نے متنبہ کیا تھا کہ ریاست کو کوئی ایسا قانون نہیں لانا چاہیے جس کے خلاف عوام بغاوت کردیں۔ اس وقت تنازع کو ختم کرنے کے لیے اسے ٹھنڈے بستے میں ڈال دیا گیا۔ وہیں عوام کی مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے مذہبی اور ثقافتی حقوق کو بنیادی حقوق کا حصہ بنایا گیا تاکہ اس پر کوئی حملہ نہ بول سکے۔ مگر فرقہ پرست ذہنیتیں بار بار یکساں سول کوڈ کے جن کو بوتل سے نکالتی رہی ہیں۔ اس کے پیچھے صرف سیاسی مفاد ہے۔ کورونا کے دوران بری طرح سے ناکام رہی مرکزی اور یوپی حکومتوں دہلی ہائی کورٹ کے فیصلے نے ایک نیا موقع دیا ہے۔ یکساں سول کوڈ کے آس پاس پھر ہندو مسلمان کا کھیل شروع کیے جانے کی پوری کوشش ہورہی ہے۔ ہم سب کو یکساں سول کوڈ کے نام پر اکسانے کے فرقہ پرستوں کے گیم کو سمجھنا ہوگا۔ یاد رکھیے کہ یکساں سول کوڈ کی مار سب پر پڑے گی۔ آدی واسی، دلت، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، شمالی وجنوبی ریاستیں اور دیگر طبقات بھی اس کی مخالفت کریں گے۔ تبھی تو آج تک بھگوا سرکار یکساں سول کوڈ بل کا ڈرافٹ نہیں لا پائی ہے۔ لیکن اس پر سیاست کرنے میں وہ ضرور آگے رہتی ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

ذات پات سے آزادی کب ملے گی؟

سیاسی طور پر جمہوریت کی بات کرنا تو ایک طرح سے آسان ہوتا ہے، مگر اصل امتحان تو معاشرتی غیر برابری سے لڑنا ہے

ابھے کمار

جب ملک بھر میں جشن آزادی کا ۷۵ رسالہ اُمرت مہوتسو منایا جا رہا تھا، تب راجستھان کا ایک چھوٹا سا بچہ اسپتال میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا تھا۔ ہفتے بھر سے زیر علاج، نو سالہ معصوم کی حالت بگڑتی ہی جا رہی تھی۔ ۱۳ راگست کو آخر کار اس کی زندگی کا چراغ بُجھ گیا۔ مقتول کا نام اِندر میگھوال تھا، جو جالور ضلع کے ایک مقامی اسکولؔ میں درجہ سوم میں پڑھتا تھا۔ اس معصوم کا صرف اتنا ہی قصور تھا کہ وہ ایک دلت سماج میں پیدا ہوا تھا، جس میں اس کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ ذات پات کا قانون توڑنے کی پاداش میں اس کے نازک سے جسم کو توڑ دیا گیا۔ اسے سخت ترین سزا دے کر اعلیٰ ذات سے تعلق رکھنے والے استاذ نے دوسرے دلتوں کو یہ سبق دیا کہ ذات پات کی غلامی کو چیلنج کرنے والے ہر شخص کا یہی انجام ہوگا۔ پوری بات یہ ہے کہ اِندر جالور ضلع کے سُرانا گاؤں کے ایک نجی اسکول سرسوتی ودیا مندر میں پڑھتا تھا۔ ۲۰ جولائی کے روز اس نے استاذ کے لیے رکھے گیے ایک مخصوص برتن سے پانی پینا چاہا۔ چونکہ وہ دلت سماج سے آتا ہے اس لیے مٹکا کے قریب جانا یا پھر اسے چھونا اعلیٰ ذات کے ٹیچر کو نا گوار گزرا۔ ٹیچر نے معصوم کی اس چھوٹی سی 'بھول' کے لیے زور سے مارا۔ پٹائی کے بعد بچہ کی حالت خراب ہونے لگی۔ تقریباً تین ہفتے تک اس کا علاج چلا، مگر احمد آباد کے ایک اسپتال میں وہ زندگی سے جنگ ہار گیا۔ حالانکہ ٹیچر کو بچہ کو مارنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس کے خلاف ایس سی ایس ٹی ایکٹ بھی لگایا گیا ہے۔ پولیس پورے معاملہ کی تفتیش بھی کر رہی ہے، مگر اس انسانیت سوز سانحہ نے پورے ملک، بالخصوص دلتوں کو، جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

آزادی کے بعد اس چھوت چھات کی سماجی برائی کو ایک قانونی جرم قرار دے دیا گیا۔ مگر زمینی حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ آج بھی چھوت چھات کی بیماری پوری طرح سے ختم نہیں ہو پائی ہے۔ گاؤں کی بات کون کرے، شہروں میں بھی چھوت چھات کا چلن ہے۔ آج بھی بہت سارے مندروں میں دلتوں کو جانے سے روکا جاتا ہے۔ بہت سارے ہوٹلوں میں ان کو کھانا دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے جس میس کو دلت سماج کے صفائی ملازم صاف کرتے ہیں، وہاں جب کھانا پک جاتا ہے تو ہاسٹل کے پلیٹ میں انہیں کھانا نہیں دیا جاتا۔ ذات پات پر مبنی سماج ان سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ خود کی پلیٹ لے کر آئیں اور دور کھڑے ہو کر انتظار کریں کہ کوئی ان کی تھالی میں کھانا ڈال دے۔ خود یہ سب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے جب یونیورسٹی مک کے ڈائننگ روم میں جانے اور طلبہ کے برابر بیٹھ کر کھانا کھانے سے وہاں کے صفائی ملازمین ڈرتے تھے۔ جس دفتر میں ہم کام کرتے ہیں یا جس اسپتال میں ہم علاج کروانے کے لیے جاتے ہیں، وہاں کی صفائی کون کرتا ہے؟ صفائی ملازموں کی غالب اکثریت دلت سماج کے لوگوں کی ہے، جو ہمارا کوڑا کچرا صاف کرتے ہیں، مگر ذات پات پر مبنی سماج ان کو آلودہ سمجھتا ہے۔ گاؤں میں تو حالات اور بھی برے ہیں۔ وہاں چھوت چھات کا برتاؤ کھلے عام کیا جاتا ہے۔ اعلیٰ ذات کے دروازے پر بہت ساری کرسیاں اگر خالی بھی ہوں تو دلت سماج کے لوگوں کو ان کے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ تضاد دیکھیے کہ جب دلت سماج کے لوگ کھیتوں سے غلہ پیدا کر کے اسے اعلیٰ ذاتوں کے گھروں تک پہنچا دیتے ہیں، تب تک وہ غلہ پاک رہتا ہے۔ مگر غلہ گھر پہنچے کے بعد پھر اسی دلت کو دوبارہ اسے چھونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اسکول میں بھی ذات پات اور چھوت چھات کا یہ نظام اسی طرح کام کرتا ہے۔ بچپن سے ہمیں کہا جاتا ہے کہ استاذ محترم کا احترام کرنا چاہیے، مگر میں یہ بڑے ہی افسوس کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ہمارے اسکول اور کالجوں میں درس دینے والے بہت سارے اعلیٰ ذات کے استاذ ذات پات کے تعصب میں مبتلا ہیں۔ کلاس روم کے اندر وہ اعلیٰ ذات کے طلبہ کو آگے بیٹھاتے ہیں، ان پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، ان کے ساتھ پیار سے پیش آتے ہیں، ان کو امتحان میں ٹاپ کراتے ہیں، جبکہ دلت اور محکوم طبقات کے بچوں کے ساتھ وہ سوتیلا سلوک کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ چھوت چھات بھی برتتے ہیں۔ انہیں پیچھے کے بینچ یا کلاس سے باہر بیٹھنے کو کہا جاتا ہے۔ ان کے لیے پینے کا پانی الگ ہوتا ہے۔ کئی اسکولوں میں ان کے نام کے ساتھ ان کی برادری بھی لکھ دی جاتی ہے تا کہ کسی کو کوئی غلط فہمی نہ رہے۔ محکوم طبقات کے بچوں کو بیوقوف اور کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اسکول کے شروعاتی دن سے ہی ان بچوں کے دل و دماغ میں خوف اور احساس کمتری بھر دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محکوم طبقات کے بچے بڑی تعداد میں ڈراپ آوٹ ہو کر جاتے ہیں۔ استاذ کی عزت کرنا اچھی بات ہے، مگر ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ

پولیس کی گولی سے مرنے والوں میں دلت سماج کے لوگوں کی بڑی تعداد ہے۔ تضاد دیکھیے کہ ایک طرف ملک میں جمہوری نظام ہے اور سب کو سیاسی اور شہری برابری حاصل ہے، وہیں دلت، پسماندہ ذاتوں کو ذات پات پر مبنی استحصال اور تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ذات پات پر مبنی معاشرہ کی بے رحمی دیکھیے کہ اس نے نو سالہ اِندر کو بھی نہیں بخشا اور اسے بڑی بے دردی سے ہلاک کر ڈالا۔ یہ وہی سماج ہے جس نے صدیوں سے محکوم طبقات اور خواتین کو تعلیم سے دور رکھا۔

اسی ملک کے ایک گرو نے ایک لویہ کا انگوٹھا کاٹ کر اس کی زندگی برباد کر دی تھی۔ ۹ سالہ اِندر میگھوال کے استاذ نے تو ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس کی جان ہی لے لی۔

اِندر کی موت کے بعد محکوم طبقات کے دلوں میں غم و غصہ کافی بڑھ گیا ہے۔ دلتوں، کمزوروں، محکوموں، دبے کچلے لوگوں کو ذات پات اور چھوت چھات سے کب آزادی ملے گی؟ قومیت کا جنون تو ارباب اقتدار پر طاری ہے، مگر وہ کبھی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جب تک سماجی برائیوں کو دور نہیں کیا جائے گا، تب تک قوم کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کی حب الوطنی کا امتحان تو ارباب اقتدار ہر وقت لیتے ہیں اور جن کی ملک سے محبت کو مشکوک سمجھتا ہے ان کو بدنام کرتے ہیں اور سزا بھی دیتے ہیں، مگر صاحب ثروت نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ حب الوطنی کا مطلب یہ بھی ہے کہ ہر پیٹ کو کھانا ملے اور ہر سر کو عزت۔ سیاسی طور پر جمہوریت کی بات کرنا تو ایک طرح سے آسان ہوتا ہے، مگر اصل امتحان تو معاشرتی غیر برابری سے لڑنا ہے۔ بقول ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر سب سے بڑا محب وطن وہ ہے جو سماج کا صفائی ملازم ہے، جو معاشرے کی برائیوں کو صاف کرتا ہے اور مساوات، آزادی اخوت پر مبنی ایک نئی کسوٹی کو تشکیل دیتا ہے۔ آج معمارِ آئین زندہ ہوتے تو اِندر کی موت کو دیکھ کر سب سے زیادہ افسردہ ہوتے۔

المیہ دیکھیے کہ ملک کو آزاد ہوئے ۷۵ برسال گزر گئے، مگر آج بھی محکوم طبقات کو برابری حاصل نہیں ہو پائی ہے۔ آج بھی دلت سماج کو اعلیٰ ذات کے ظلم و زیادتی سے نجات حاصل نہیں ہو پائی ہے۔ ہر منٹ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی دلت کو ذلیل کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ چھوت چھات برتا جاتا ہے۔ اس پر حملے ہوتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں دلت خواتین کی عزت و آبرو پر بھی حملہ کیا جاتا ہے۔ جیل میں بھی دلت سماج کے لوگ بھرے پڑے ہیں۔ پولیس کی گولی سے مرنے والوں میں دلت سماج کے لوگوں کی بڑی تعداد ہے۔ تضاد دیکھیے کہ ایک طرف ملک میں جمہوری نظام ہے اور سب کو سیاسی اور شہری برابری حاصل ہے، وہیں دلت، پسماندہ ذاتوں کو ذات پات پر مبنی استحصال اور تعصب کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ذات پات پر مبنی معاشرہ کی بے رحمی دیکھیے کہ اس نے نو سالہ اِندر کو بھی نہیں بخشا اور اسے بڑی بے دردی سے ہلاک کر ڈالا۔ یہ وہی سماج ہے جس نے صدیوں سے محکوم طبقات اور خواتین کو تعلیم سے دور رکھا۔ ان کو اَن پڑھ بنا کر رکھا۔ دلت بہوجن نظریہ کے حامل لوگوں کا ماننا ہے کہ تعلیم سے دور رکھا جانا ان کی غلامی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ اس لیے جیوتی راؤ پھلے سے لے کر امبیڈکر نے محکوموں کو تعلیم حاصل کرنے پر زور دیا ہے۔ آزادی کے بعد معماران آئین نے سب کو برابری کے حقوق دیے، مگر ذات پات کی جڑیں سماج میں اتنی گہری ہیں کہ وہ آج بھی محکوموں کو برابر کا انسان نہیں سمجھتا۔ اس لیے انصاف کا تقاضہ ہے کہ نہ صرف اِندر کے حملہ آوروں کو سخت ترین سزا ملے بلکہ تعلیمی نظام اور سماج میں موجود ذات پات پر مبنی غیر برابری، تعصب اور نفرت کے خلاف ملک گیر سطح پر جنگ چھیڑی جائے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

اردو نے کبھی خود کو مسلمان نہیں مانا

زبان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، مگر تعصب اس قدر دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ جب رام پرساد اردو لکھتے ہیں تو لوگوں کو یقین نہیں ہوتا

ابھے کمار

یہ صحیح ہے کہ اردو میں نے پہلی کلاس سے نہیں سیکھی اور نہ ہی میرے گھر میں کوئی اردو کا بڑا شاعر یا مصنف تھا۔ والد اور والدہ بھوجپوری زبان بولتے تھے۔ اسکول کی کتابیں ضرور ہندی میں تھیں۔ مگر اسکول میں بھی، ہم بڑی مشکل سے ہندی بول پاتے تھے۔ کئی بار ٹیچر ہمیں بھوجپوری میں بات کرتے ہوئے پاتے تو غصہ میں آ جاتے اور کہتے، گنوار ہو تم سب!۔

سچ پوچھئے تو ٹیچر کو خود ہندی کم اور بھوجپوری زیادہ آتی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم سب ہندوستانی بولنا سنیما اور سیریل دیکھ دیکھ کر سیکھے۔ اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے، دجے تم چاروطرف سے گھر گئے ہو، اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو، عدالت تمام گواہوں اور ثبوتوں کی بنیاد پر اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ رام سنگھ ولد شیام سنگھ نے اپنے دوست کا قتل کیا ہے، ایسی زبان میں نے گاؤں والوں کو کبھی بولتے ہوئے نہیں پایا۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہے کہ بھوجپوری میں بھی اردو کے کثیر الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً، میری ماں جب کبھی بیمار ہوتی اور دوا کھا لیتی تو وہ سر ہلا کار کہتی تھوڑی عافیت ہے۔ جب کوئی نازک سامان سے ہم بچپن میں کھیلتے تو گھر والے ڈانٹتے اور کہتے، اس سے مت کھیلو، یہ اپنا نہیں ہے، ٹوٹ جانے پر 'تاون' (تاوان) دینا پڑے گا۔

آج بھی بھارت میں ایک بڑی تعداد میں لوگ علاقائی زبان بولتے ہیں۔ جو زیادہ پڑھے لکھے ہیں، ان کے گھر میں خالص ہندی، اردو یا پھٹا پھٹ انگریزی بولی جاتی ہے۔ کیا آگرہ کے آس پاس رہنے والے آپس میں برج نہیں بولتے؟ لکھنؤ کے اطراف میں دکانوں میں اودھی نہیں بولی جاتی؟ پوروانچل اور مغربی بہار کے بازاروں سے بھوجپوری کی آواز نہیں آتی؟ دربھنگہ اور اس کے آس پاس کے اضلاع کے لوگ میتھلی میں نہیں بولتے اور لڑتے جھگڑتے ہیں؟ پٹنہ والے مگھی میں بات نہیں کرتے؟ یہی وجہ ہے کہ کسی زبان کو کسی دھرم یا مذہب سے جوڑنا بہت خطرناک کھیل ہے۔ کوئی بھی زبان خود کے دوسری لینگویج سے کاٹ کر نہیں زندہ رہ سکتی ہے۔ ہندوستان کی بیشتر زبانوں پر سنسکرت، فارسی، عربی کا گہرا اثر ہے۔ ہندی، اردو، بھوجپوری بولنے والے بہت سارے لوگ جب کرسی پر بیٹھتے ہیں اور کتاب پڑھنا شروع کرتے ہیں تو انہیں اس کا احساس نہیں رہتا کہ اس کی زبان سے نکلنے والے الفاظ کرسی اور کتاب، عربی زبان سے آئے ہیں۔ اسی طرح عربی، سنسکرت، فارسی، انگریزی زبانوں پر بھی دیگر زبانوں کی گہری چھاپ ہے۔

پھر کہنا چاہتا ہوں کہ زبان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر تعصب اس قدر دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ جب رام پرساد اردو لکھتے ہیں تو لوگوں کو یقین نہیں ہوتا۔ اسی طرح اصغر جب ہندی میں کویتا پڑھتا ہے اور ناول لکھتا ہے تو بہت تعجب میں پڑ جاتے ہیں۔ آج بھی مجھ سے کئی لوگ یہ پوچھتے ہیں آپ کا اردو والا مضمون ہندی سے ترجمہ ہوتا ہے نا؟ یہ سُن کر مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی آتا ہے۔ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اردو ہندوستان میں جنم لی، یہیں پلی بڑھی اور اس کے چاہنے والوں میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی تھے، سردار جی اور عیسائی اور پارسی بھائی بھی تھے۔ یہ بات تو اردو ادب کی تاریخ کے صفحۂ اول پر مل جائے گی کہ اردو کے بہت سارے نامور شاعر، ادیب اور ماہر لسانیات غیر مسلم رہے ہیں۔ مگر آزادی کے وقت تک اردو پر ایک خاص مذہب کی زبان ہونے کا کلنک لگا دیا گیا۔

آزادی کے وقت تک اردو کی کلاس میں بڑی تعداد میں سب پڑھتے تھے، مگر پھر اردو کی کلاس سے غیر مسلم نکلنے لگے۔ ہندو اور اردو نے مصنف نگار راہی معصوم رضا نے اپنی ناول 'ٹوپی شکلا' میں اس خطرناک بدلاؤ کو دکھایا ہے۔ ٹوپی شکلا، میں ایک اردو معلم کے کردار کے درد کو یوں بیان کرتے ہیں کہ اب جن مولوی صاحب کی آتما پر دو جوان بیٹیوں کے کنوارے پن کا بوجھ ہو وہ غالب کا 'پریم کا دیہ' بھلا کیا پڑھا سکتے تھے! مگر جب حاضری لینے لگتے تو اداس ہو جاتے۔ محمد،

> نفرت کی کھیتی کرنے والے سیاست دانوں نے اردو کو مسلمان اور ہندی کو ہندو کی زبان قرار دے دیا۔ پھر اردو کے ساتھ بھید بھاؤ اور تعصب برتا جانے لگا۔ ہر طرف افواہ پھیلائی گئی کہ اردو تو مسلمان اور پڑوسی ملک کی زبان ہے، جو ہمارے دشمن ہیں۔ فرقہ پرستوں نے اردو کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا، جو آج بھی جاری ہے۔ اسے آج بھی غیر ملکی زبان کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ اسے مسلم حملہ آوروں، سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے۔

حنیف، اکرم، بدر الحسن، نجف عباس، بقا اللہ، محمد عمر صدقی، حزب علی خاں ایک ہی طرح کے نام پکارتے وہ بور ہو جاتے۔ کہاں گئے وہ آشا رام، نربدا پرساد، ماتا دین، گوری شنکر سنہا، مادھو لال اگروال، مسیح پیٹر، رونق لال۔ یہ جان کار انہیں دکھ ہوا کہ ہندی کے پنڈت جی کا رجسٹر اب بھرپور ہوتا جا رہا ہے۔ ناموں کی رنگارنگی ان کے رجسٹر کو چھوڑ کر پنڈت جی کے رجسٹر میں بستی جا رہی ہے (ص۔ ۳۹)۔ اسی کتاب میں دوسری جگہ راہی معصوم رضا یہ بات صاف طور پر کہتے ہیں کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان، ہندوی کے دو نام ہیں (ص۔ ۲۳)۔

نفرت کی کھیتی کرنے والے سیاست دانوں نے اردو کو مسلمان اور ہندی کو ہندو کی زبان قرار دے دیا۔ پھر اردو کے ساتھ بھید بھاؤ اور تعصب برتا جانے لگا۔ ہر طرف افواہ پھیلائی گئی کہ اردو تو مسلمان اور پڑوسی ملک کی زبان ہے، جو ہمارے دشمن ہیں۔ فرقہ پرستوں نے اردو کے خلاف زہر اگلنا شروع کیا، جو آج بھی رکا نہیں ہے۔ اسے آج بھی غیر ملکی زبان کہہ کر بدنام کیا جاتا ہے۔ اسے مسلم حملہ آوروں، سے جوڑ کر دیا جاتا ہے۔ اسے ناچنے اور گانے والوں کی زبان کہی جاتی ہے اسے بعض اوقات شدت پسندوں کی زبان بھی کہی جاتی ہے۔ دوسری طرف ہندی میں سخت ترین سنسکرت کے الفاظ ٹھوس دیے گیے اور ابھی بھی ٹھوسے جا رہے ہیں۔ سرکاری ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ اسے لوگوں پر تھوپا گیا۔ خبروں میں خبر اور صداقت کم اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ پروسے جانے لگے۔ سنسکرت سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، بلکہ ہم تو یہ مانتے ہیں کہ یہ ایک قدیم اور بڑی زبان ہے اور اس کو ضرور پڑھا اور لکھا جانا چاہیے۔ مگر ہندی زبان کو سنسکرت سے آسامی نہیں سمجھی جانی چاہیے۔ ہندی کی اپنی ایک الگ پہچان ہے۔

جہاں ہندی کے لیے سرکاری مدد دی گئی اور اس کو ان علاقوں پر بھی تھوپا گیا جہاں لوگ اسے پڑھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہیں اردو کے ساتھ سوتیلا سلوک کیا گیا۔ اسے روزگار سے کاٹ دیا گیا۔ یہ دکھ کی بات ہے کہ جہاں بھارت اردو کے حلقہ میں پوری دنیا کی رہنمائی کر سکتا تھا، وہیں سرکاری پالیسی ہونے نہیں دیا۔ آج اردو کے متعلق سافٹ ویئر اور اچھی لغت پڑوسی ملک میں تیار ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں صلاحیت اور وسائل کہیں زیادہ ہے، اگر اردو کو اس کا واجب حق دے دیا جائے تو ہمارا مقابلہ کوئی نہیں کر پائے گا۔

اگر ہمیں یہ صورت حال بدلنی ہے تو محبان اردو کو ہی آگے آنا ہوگا۔ راقم الحروف نے بھی اردو کی خدمت کے لیے ایک چھوٹی سے پہل کی ہے۔ میں نے اردو کی پڑھائی ابتدائی کلاس سے نہیں کی۔ سکینڈری میں آکر میں نے اردو کو لکھنا اور پڑھنا جانا۔ صحافت کی شروعات میں نے اردو اخبار سے کی تھی، پھر بعد میں انگریزی اخبار میں آ گیا۔ اردو صحافت سے میرا رشتہ دو دہائی سے بھی زیادہ لمبا ہے۔ اپنے مطالعہ اور تجربہ کو بنیاد بنا کر، میں اردو سکھانے کا ایک آن لائن کورس شروع کیا ہے۔ دو مہینہ پر مشتمل اس کورس کے اب تک تین بیچ پورے ہو گیے ہیں۔ قلیل وقت میں طلبہ اردو پڑھنا لکھنا سیکھ لے رہے ہیں۔ میرے طلبہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شامل ہیں، مگر زیادہ بچے غیر مسلم ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اردو کے چاہنے والے کسی ایک خاص مذہب تک ہی محدود نہیں ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اردو اور ہندی کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے کی ضرورت ہے۔ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ دونوں زبانوں کو الگ الگ رسم الخط میں ہی لکھا جانا چاہیے۔ اسکرپٹ بدلنے کی میں حمایت ہرگز نہیں کرتا۔ میں اردو رسم الخط سیکھنا بہت مشکل نہیں ہے۔ اسے چند ہفتوں میں میرے طلبہ سیکھ لے رہے ہیں۔ اردو میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ابھی تک اردو کا ایک اچھا صوتی لغت نہیں ہے۔ تلفظ اور لفظوں کے استعمال کو دھیان میں رکھ کر ڈکشنری تیار کرنے کی ضرورت ہے، جیسا انگریزی میں پائی جاتی ہے۔ اچھی پرنٹنگ پر بھی دھیان دینے ہوگا۔ نئی ٹیکنالوجی سی فائدہ اٹھا کر اردو میں کنٹینٹ تیار کرنے ہوں گے۔ زبان بغیر سنے نہیں سیکھی اور بولی جا سکتی ہے۔ مگر مشکل ترین الفاظ سے گریز کرنے کی ضرورت ہے، تا کہ ہماری زبان عام زبان بنی رہے۔ یاد رہے ہندی نہ ہندوؤں کی داسی ہے اور نہ مسلمانوں کی کنیز ہے۔ ہندی و اردو تو ان کی بولنے والوں کی معشوقہ ہیں۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

دلت مسلم اتحاد کا مجاہد وی ٹی راج شیکھر

راج شیکھر کی زندگی کا پیغام ہے کہ مصلحت پسندی کی چادر میں چھپنے سے معاشرے میں مثبت تبدیلی نہیں آتی

ابھے کمار

دلت، آدی واسی، پسماندہ ذاتوں اور اقلیتوں کی آواز وی ٹی راج شیکھر اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ۲۰ نومبر کو ان کا انتقال منگلور کے ایک اسپتال میں ہوا۔ ان کی عمر ۹۳ سال تھی۔ ان کا صحافتی تجربہ ۶۰ برسوں پر محیط تھا۔ وہ ایک معروف صحافی تھے اور 'دلت وائس' نامی میگزین کے بانی و مدیر بھی۔ دو دہائیوں تک ملک کے بڑے انگریزی اخباروں میں کام کرنے کے بعد، راج شیکھر کو یہ احساس ہوا کہ یہ ادارے صرف طاقتور طبقات اور اعلیٰ ذاتوں کے مفادات کی ترجمانی کرتے ہیں، جبکہ کمزور، مظلوم اور دبے کچلے طبقات کے مسائل سے ان کا کوئی خاص سروکار نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ نام نہاد قومی میڈیا اعلیٰ ذاتوں کے زیرِ اثر ہے، جہاں دلت، آدی واسی، پسماندہ ذاتوں اور اقلیتوں کو مختلف طریقوں سے نظرانداز کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے میڈیا میں ملک کے سماجی تنوع کی عکاسی نہیں ہوتی۔ اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ ملک کے صدر جمہوریہ کے عہدے پر دلت، آدی واسی یا مسلمان تو فائز ہو چکے ہیں، لیکن آج بھی کوئی دلت، آدی واسی کسی قومی اخبار کا مدیر بننے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ملک کے اربابِ اقتدار میڈیا کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ جب تک وہ اخبارات اور نیوز چینلز پر مکمل کنٹرول نہیں رکھیں گے، ان کے مفادات محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یہی تلخ حقائق تھے جنہوں نے راج شیکھر کو بہوجن میڈیا کی طرف مائل کیا۔
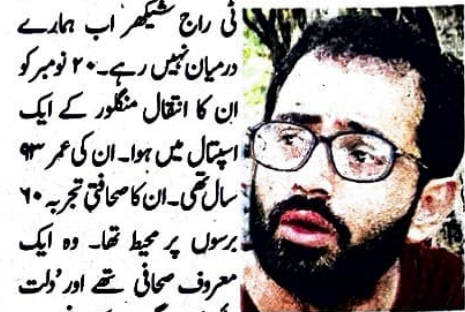
کچھ لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں کہ راج شیکھر کسی دلت خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق کرناٹک کی شیٹی برادری سے تھا، جو ایک پسماندہ ذات کے طور پر جانی جاتی ہے۔ ان کے والد ایک بڑے سرکاری افسر تھے، اور ان کو ابتدائی زندگی میں ذات پات کی بنیاد پر امتیازات کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ تاہم، قومی میڈیا میں قدم رکھنے کے بعد، انہوں نے نام نہاد انگریزی اخباروں کی 'لبرل' شبیہ کی حقیقت کو قریب سے دیکھا۔ اگرچہ اپنے کالج کے دنوں میں وہ مارکسی نظریات سے متاثر تھے اور ذات پات کی عدم مساوات کی بجائے طبقاتی غیر برابری پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اس دوران انہوں نے کپڑے کے کارخانوں میں مزدوروں کے درمیان کام کیا۔ وہ تب سمجھتے تھے کہ طبقاتی جدوجہد کے ذریعے ایک غیر مساوی سماج سے نجات ممکن ہے۔ لیکن صحافتی ادارے اور باہر کی دنیا میں ذات پات کی حقیقت کو قریب سے دیکھنے کے بعد ان کا نظریہ بدلنے لگا۔ انہیں یہ احساس ہوا کہ بھارت میں ذات پات کے خلاف جدوجہد ہی دراصل حقیقی طبقاتی جدوجہد ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ، وہ کارل مارکس کے نظریات سے سے زیادہ ڈاکٹر امبیڈکر، پیریار اور لوہیا کے خیالات کے قریب آنے لگے۔ اب وہ اپنی تحریروں کے ذریعے دبے کچلے طبقات کی آواز بلند کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے یہ خیالات اخبار کے مالکان کو ناگوار گزرے، اور ایک دن انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ اس وقت، جب وہ صحافت میں دو دہائیوں سے زیادہ کا تجربہ رکھتے تھے، کوئی بھی بڑا اخبار انہیں ملازمت دینے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن شاید دنیا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ برطرفی ان کی زندگی کا ایک نیا باب ثابت ہوگی۔

مشکل کے اس وقت میں، مشہور انگریزی ادیب ملک راج آنند ان کی مدد کو آئے۔ آنند نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ انگریزی میں 'دلت وائس' کے نام سے ایک میگزین شائع کریں۔ نہ صرف میگزین کا

"

راج شیکھر کی فکر کا محور یہ تھا کہ محکوم طبقات کے درمیان اتحاد قائم کیا جائے تاکہ ذات پات پر مبنی نظام کو جڑ سے ختم کیا جاسکے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے دلتوں اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت انہی دلتوں پر مشتمل ہے، جو صدیوں پہلے سماجی استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے مذہب تبدیل کرکے مسلمان بن گئے تھے۔ راج شیکھر کہا کرتے تھے کہ دلت اور مسلمان 'خونی بھائی' ہیں، کیونکہ ان دونوں کے کھانے پینے کے انداز، ثقافتی عادات، اور سماجی زندگی میں بے پناہ مماثلت ہے۔ اس کے علاوہ، دونوں طبقات ذات پر مبنی عدم مساوات کے شکار رہے ہیں۔ وہ اسلام کو غریبوں اور مظلوموں کا دین سمجھتے تھے۔ ایس کے بسواس کی کتاب (دلت اینڈ مسلم ایز بلڈ برادرز) کے مقدمے میں راج شیکھر نے لکھا کہ 'اسلام ایک انقلابی مذہب ہے۔ یہ امیروں کا مذہب نہیں ہے۔ یہ بنیادی طور پر غریب، مظلوم عوام کا مذہب ہے۔' تاہم، انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ سرکردہ مسلم قیادت نے دلتوں کو ساتھ لانے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کیں۔

عنوان آنند نے تجویز کیا، بلکہ مالی امداد بھی فراہم کی۔ ۱۹۸۱ میں 'دلت وائس' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ اگرچہ یہ جریدہ انگریزی میں شائع ہوتا تھا، لیکن اس کے مضامین دیگر ہندوستانی زبانوں میں بھی ترجمہ کیے جاتے تھے۔ محدود وسائل کے باوجود، اس میگزین کی مقبولیت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونِ ملک بھی تھی۔ خاص طور پر مسلم ممالک میں اس کے شمارے کا شدت سے انتظار رہتا تھا۔

راج شیکھر کی بے خوف صحافت اور سیاسی بصیرت اس کامیابی کی بنیادی وجہ تھی۔ وہ کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ 'دلت وائس' کس کو خوش یا ناراض کر رہا ہے۔ یہ جریدہ ایک عیسائی چرچ سے شائع ہوتا تھا، لیکن فرقہ پرست شرپسندوں نے چرچ کو دھمکیاں دیں اور دیگر پرنٹنگ پریس کو ڈرا دھمکا کر جریدے کی اشاعت روکنے کی کوشش کی۔ تین دہائیوں تک 'دلت وائس' کامیابی سے شائع ہوتا رہا، حالانکہ اعلیٰ ذات کی لابی نے اسے بدنام کرنے، مدیرِ اعلیٰ کے خلاف مقدمات درج کروانے، اور ریاستی مشینری کے ذریعے انہیں گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کا پاسپورٹ ۲۰ سالوں تک ضبط رکھا گیا تاکہ وہ باہر کے ملکوں میں جا کر دبے کچلے طبقات کے حق میں آواز نہ اٹھا سکیں۔ ان تمام مشکلات کے باوجود، راج شیکھر نے نہ صرف 'دلت وائس' کو جاری رکھا بلکہ اپنی ۱۰۰ سے زائد کتابوں کے ذریعے ایک عظیم فکری ورثہ چھوڑا۔

راج شیکھر کی فکر کا محور یہ تھا کہ محکوم طبقات کے درمیان اتحاد قائم کیا جائے تاکہ ذات پات پر مبنی نظام کو جڑ سے ختم کیا جاسکے۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے دلتوں اور مسلمانوں کو ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر لانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت انہی دلتوں پر مشتمل ہے، جو صدیوں پہلے سماجی استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لیے مذہب تبدیل کرکے مسلمان بن گئے تھے۔ راج شیکھر کہا کرتے تھے کہ دلت اور مسلمان 'خونی بھائی' ہیں، کیونکہ ان دونوں کے کھانے پینے کے انداز، ثقافتی عادات، اور سماجی زندگی میں بے پناہ مماثلت ہے۔ اس کے علاوہ، دونوں طبقات ذات پر مبنی عدم مساوات کے شکار رہے ہیں۔ وہ اسلام کو غریبوں اور مظلوموں کا دین سمجھتے تھے۔ ایس کے بسواس کی کتاب (دلت اینڈ مسلم ایز بلڈ برادرز) کے مقدمے میں راج شیکھر نے لکھا کہ 'اسلام ایک انقلابی مذہب ہے۔ یہ امیروں کا مذہب نہیں ہے۔ یہ بنیادی طور پر غریب، مظلوم عوام کا مذہب ہے۔' تاہم، انہیں اس بات کا افسوس تھا کہ سرکردہ مسلم قیادت نے دلتوں کو ساتھ لانے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کیں۔ وہ شکوہ کرتے تھے کہ مظلوموں کے ساتھ کھڑے ہونے کے اسلام کے پیغامات کو حقیقی روح کے ساتھ نہیں سمجھا گیا۔ راج شیکھر اس حقیقت کو تسلیم کرتے تھے کہ بعض مسلم مخالف فسادات میں فرقہ پرست طاقتیں دلتوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرتی ہیں۔ لیکن ان کا ماننا تھا کہ ان حالات میں دلتوں کو مکمل طور پر قصوروار ٹھہرانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ اس کے پیچھے فرقہ پرست عناصر کا کھیل ہوتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دلت۔ مسلم اتحاد کی راہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کی گئی ہیں، ان کو دور کرنے کی ذمہ داری محکوم طبقات کے رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے۔ مختصراً، راج شیکھر کی زندگی کا پیغام یہ ہے کہ طاقتور لوگوں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے یا آسان راستہ اختیار کرنے سے حقیقی تبدیلی ممکن نہیں۔ مصلحت پسندی کی چادر میں چھپنے سے معاشرے میں مثبت تبدیلی نہیں آتی ہے۔ ■

(مضمون نگار تاریخ کے اسکالر ہیں)

debatingissues@gmail.com

بلڈوزر راج میں بھارتی مسلمان کیا کریں؟

احتجاج ضرور کریں لیکن حکمت، احتیاط اور منصوبہ بندی ضروری

ابھے کمار، نئی دلی

بلڈوزر راج میں بھارتی مسلمان آج بے حد دکھ سہہ رہا ہے۔ وہ سب سے زیادہ اپنی زندگی اور سلامتی کے تعلق سے فکر مند ہیں۔ جب انسان اپنی جان کی فکر کرنے لگتا ہے تو پھر تعلیم، روزگار اور ترقی کے سوالات کافی دور چلے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کو درپیش ایک نہیں بلکہ بہت سارے مسائل ہیں۔ ریاست کا کردار پہلے سے اور بھی زیادہ مسلم مخالف نظر آرہا ہے۔ مرکز اور دیگر ریاستوں میں حکومت کرنے والے آئین سے زیادہ ہندوتو کے نظریہ پر کام کرتے نظر آرہے ہیں۔ ہندوتو کا نظریہ جمہوریت اور آئین مخالف ہے۔ یہ اقلیت، دلت، آدیواسی اور خواتین کو برابری نہیں دے سکتا کیونکہ یہ ذات پات کے سماجی نظام میں یقین رکھتا ہے۔ بھگوا نظریہ سازوں نے یہ بات صاف طور پر کہی ہے کہ جن لوگوں کے مقدس مقامات بھارت سے باہر واقع ہیں، ان کی حب الوطنی مشکوک ہے۔ اس طرح اقلیتوں کو بھارت کا سچا حب الوطن تب ہی مانا جائے گا، جب وہ اپنے مذہب کے اہم ستون کو ترک کر دیں، وہ نہ صرف ملک کے باہر موجود مذہبی مقامات سے اپنا رشتہ توڑ لیں بلکہ اپنے طور طریقوں میں بھارتی کلچر کے نام پر برہمنی رسومات کو اپنا لیں۔ مگر سچائی یہ ہے کہ ملک کی اقلیت اپنے دین اور وطن دونوں سے محبت کرتے ہیں اور جب ان سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ ان کو ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا تو سمجھ لیجیے کہ مطالبہ کرنے والے کا منشا ٹھیک نہیں ہے۔ انتظامیہ اور پولیس فرقہ واریت کا شکار ہو چکی ہے۔ عدلیہ اور انسانی حقوق کے ادارے بھی اب سیاسی دباؤ سے آزاد ہو کر کام نہیں کر رہے ہیں۔ میڈیا حقائق کو پیش کرنے اور سچائی کے تمام پہلوؤں کو ایمانداری کے ساتھ سامنے لانے کے بجائے، فرقہ وارانہ آگ کو بھڑکانے کے لیے دن رات نفرت پھیلا رہا ہے۔ آج حالات حد سے زیادہ خراب ہو گئے ہیں رائے عامہ بھی بڑی حد تک فرقہ واریت کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔

سیاسیات کی کلاسوں میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ فرقہ واریت کا تعلق ہندو مسلم تنازعہ سے ہے۔ یہ بات غلط نہیں ہے لیکن یہ تشریح پوری طرح سے چیزوں کو بیان نہیں کرتی ہے۔ فرقہ وارانہ نظریہ مذہبی اقلیتوں (خاص طور پر مسلمانوں) کے علاوہ دلتوں، آدیواسیوں، پسماندہ ذاتوں اور خواتین کے خلاف نفرت کا دوسرا نام ہے۔ ہندوتو طاقتوں کی کامیابی اس وجہ سے ہے کہ وہ اس نظریہ کا استعمال کر کے لوگوں کو آپس میں لڑا رہی ہیں اور لوگوں کے اندر سوچنے اور سمجھنے کی طاقت کو کمزور کر رہی ہیں۔ آج بھارت کے اندر ایک بڑی تعداد میں پڑھے لکھے لوگوں سے لے کر ان پڑھ تک بالواسطہ اور بالواسطہ اہانت رسولؐ کرنے والی نپور شرما کی حمایت کر رہی ہے۔ ایسا اس لیے ہو رہا ہے کہ جب بار بار زہر کو اَمرِت کہہ کر پکارا جائے تو اس زہر کو بہت سارے لوگ امرت ہی سمجھ کر پی جاتے ہیں۔ تبھی تو کچھ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ آج کے حالات تقسیم ملک سے بھی زیادہ تشویشناک ہو چکے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اُس وقت کم سے کم ایسے رہنما سیاست میں سرگرم تھے، جو سیکولر ذہن کے تھے اور جنہوں نے ملک کی آزادی میں حصہ لیا تھا اور ان کو ہندو اور مسلمانوں دونوں اپنا لیڈر مانتے تھے۔ تب مظلوموں کو کم از کم اُن لیڈروں میں امید کی ایک روشنی دکھائی دیتی تھی۔ لیکن آج ہندوستانی سیاست میں کوئی ایسا قد آور قائد نہیں ہے، جو مسلمانوں کے درد کو سمجھتا ہو اور ان کو انصاف دلانے کی طاقت رکھتا ہو۔ فرقہ پرست پارٹی کے لیڈر مسلمانوں کی توہین کرنے، ان کی تذلیل کرنے، ان پر تشدد کرنے اور ان کا قتل کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ مگر جن سیکولر پارٹیوں کو ملک کے مسلمان ووٹ دیتے ہیں، ان کو بھی مسلمانوں کی تکالیف پر زیادہ فکر نہیں ہے۔ سیکولر پارٹیاں خود سو بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اندرونی جمہوریت کے ساتھ وہ ایک مخصوص خاندان کی جاگیر بن گئی ہیں۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ سیکولر پارٹیاں درباری لیڈروں کو ترقی دے کر قانون ساز ایوانوں میں بھیجتی ہیں، جبکہ محنتی اور ایماندار لیڈروں کو پارٹی کے اندر درکنار کیا جاتا ہے۔ سیکولر پارٹیاں اس قدر ”سیکولر“ ہیں کہ وہ اپنی ہی پارٹی کے مسلم چہروں کو انتخابی مہم سے دور رکھتی ہیں، جبکہ ان کے ٹاپ لیڈر اپنی تقریر میں کسی مسلمان کا نام تک نہیں لیتے۔ مگر دوسری طرف ہر جلسہ سے وہ یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ جب ان کی سرکار بنے گی تو عظیم الشان مندر بنے گا۔ کیا سرکار کا کام پبلک کے پیسہ کو عوامی کاموں کے بجائے کسی دھرم کے لیے مذہبی مقامات بنانا ہے؟ بے حد افسوس کی بات ہے کہ یہ بھارت جیسے سیکولر جمہوریت کی اصل حقیقت ہے۔ اس مشکل کی گھڑی میں ہندوستانی مسلم کمیونٹی پریشان ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان حالات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے اپنی آزمائش سمجھیں اور پہلے سے بھی زیادہ صبر و تحمل سے کام لیں۔ نہ صرف اپنے درمیان اتحاد کو مضبوط کرنے کی کوشش کریں، بلکہ سیکولر جماعتوں سے بھی اپنے تعلقات کو مزید مضبوط کریں۔ اپنے احتجاج اور اپنی ریلیوں میں ان کو اپنے سیکولر بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔ مگر کامیابی تبھی حاصل ہوگی جب مسلم لیڈران اپنی کمیونٹی کے اندر اتحاد کو پیدا کرنے کے لیے کام کریں۔ اس کے لیے کئی محاذ پر کام کرنے کی ضرورت ہے، مگر جو کام اکثر نہیں کیا جاتا وہ یہ ہے کہ مسلم تنظیمیں پسماندہ، دبے کچلے طبقات کو زیادہ سے زیادہ نہیں جوڑ پاتی۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ ان کو واجب اور موثر نمائندگی سے اکثر محروم رکھا جاتا ہے۔

مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی پر بھی از سر نو غور کرنا ہوگا اور آج کے حالات کا ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کرنا ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ آج بھگوا طاقتوں کی یہ پوری کوشش ہے کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی بہانے سے مشتعل کیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان اپنے صبر و تحمل کو توڑ دیں اور پھر ان کو مسلمانوں کو دبانے کا ایک آسان سا موقع مل جائے۔ مگر مسلمانوں کو ان کے دام فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ بھارت کا آئین یہاں کے تمام شہریوں کو برابر کے حقوق فراہم کرتا ہے۔ ہمارے پاس پُر امن طریقے سے اپنے احتجاج کو درج کرنے کا آئینی حق حاصل ہے۔ جب یہ بالکل واضح ہے کہ ہندوتو طاقتیں فساد شروع کرنے کے لیے کسی متنازع مسئلے کی تلاش میں ہیں، تو کیا ان کی گالی گلوج کو نظر انداز کرنا دانشمندی نہیں ہے؟ مسلمانوں کو حضرت محمد صاحبؐ کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپؐ نے اس وقت ہجرت کی جب مکہ میں زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کی زندگی کا پیغام یہ ہے کہ حالات کو پڑھنا چاہیے اور صبر اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینا عقلمندی ہے۔ حالات سازگار نہ ہونے پر ایک قدم پیچھے ہٹ جانا کوئی بزدلی نہیں ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو بابا صاحب امبیڈکر اور ان کی دلت تحریکوں سے بھی سبق سیکھنا چاہیے۔ زیادہ تر مواقع پر امبیڈکر نے آئینی اور قانونی لڑائیوں کی پیروی کی۔ وہ جذباتی مسائل پر مبنی سیاست کے پیروکار نہیں تھے۔ انہوں نے سیاست میں شخصیت پرستی کے خطرات سے بھی متنبہ کیا۔ مگر بعض مسلم قائدین جذباتی تقریریں کرتے ہیں، مذہبی علامتوں کا ذکر کرتے ہیں اور کمیونٹی کو واحد مذہبی شناخت میں محدود کرنے کی غلطی کرتے ہیں۔ اکثریتی جماعت کی سیاست کرنے والا لیڈر مذہبی محاورے کا استعمال کرتا ہے کیونکہ اسے اکثریتی طبقے کا ووٹ حاصل کرنا اور اور الیکشن جیتنا ہوتا ہے۔ مذہبی علامت کا استعمال کوئی بھی کرے یہ اصولی طور پر پوری طرح سے غلط ہے اور اس طرح کی سیاست سے ملک کا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔ مذہبی علامات کی سیاست اقلیتی برادری کے رہنماؤں کو ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ اس کا استعمال اپنی پارٹی کو اقتدار میں بھی نہیں لا سکتے۔ اس لیے ان کو ہمیشہ سیکولر محاوروں کا استعمال کرنا چاہیے۔

مسلمانوں کو یہ سیکھنا چاہیے کہ پُر امن احتجاج کو کیسے منظم کیا جائے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی ریلی اور مظاہرے پُر امن نہیں ہوتے۔ یہاں صرف اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ چونکہ پولیس اور انتظامیہ میں بڑی تعداد میں افسران فرقہ وارانہ ذہن کے ہیں اور ان کے اوپر ایک فرقہ پرست سرکار اقتدار میں ہے تو ان حالات میں مسلمانوں کو اور بھی زیادہ خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کی چھوٹی سی بات کو طول دینے کے لیے لوگ انتظار کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی معمولی سی خطا سے ان پر لاٹھی اور گولی برسنے لگتی ہے۔ ان باتوں کی طرف جے این یو کی پروفیسر غزالہ جمیل نے بھی اشارہ کیا ہے۔ راقم الحروف کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر غزالہ جمیل نے کہا کہ جس طرح سے ریاست مسلمانوں کو کچل رہی ہے، اس حالت میں بھی مسلمانوں نے زبردست وقار کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اس بات سے افسردہ ہیں کہ بہت سارے لوگ، جن میں کچھ نامور مسلم شخصیتیں بھی شامل ہیں، مسلمانوں کو امن کا درس دیتے ہیں، مگر وہ ریاست کی جابرانہ کارروائی کو نظر انداز کر رہے ہیں وہ اس بات کو بھی فراموش کر رہے ہیں کہ ریاست اکثریت کی سیاست کر رہی ہے۔ مسلمانوں کے مظاہرے کے بعد جب اگنی ویر کو لے کر ملک بھر میں احتجاج ہوا اور بعض مقامات پر مظاہرین نے توڑ پھوڑ اور آگ زنی بھی کی، مگر ان کے خلاف پولیس کا رُخ مسلمانوں کے مقابلہ میں جارحانہ نہیں دیکھا گیا۔ یہ فرق مسلمانوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پولیس، انتظامیہ اور حکومت کے مسلم مخالف رویے کو دیکھتے ہوئے، مسلم رہنماؤں کو احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کسی بھی احتجاج کی مناسب تاریخ طے ہونے سے پہلے مشورہ لیا جائے اور اس کی پوری منصوبہ بندی کی جائے۔ نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے رضا کاروں کی ایک ٹیم تشکیل دی جائے، جس کی یہ ذمہ داری طے ہو کہ وہ احتجاج کے دوران یہ طے کریں کہ عوام کو کسی بھی حالت میں مشتعل نہ ہونے دیں۔ رضا کاروں پر اس بات کی بھی ذمہ داری ہونی چاہیے کہ وہ یہ بھی دیکھیں کہ کوئی سماج مخالف عناصر ان کی ریلی میں شامل ہو کر ریلی کو خراب نہ کریں اور قانون کو اپنے ہاتھوں میں لیں۔ ایسا کئی بار دیکھا گیا ہے کہ کسی بھی پُر امن طریقے سے چلنے والے احتجاج کو بدنام کرنے کے لیے ان کے درمیان کچھ ایسے شر پسند آجاتے ہیں جن کا مقصد فساد برپا کرنا ہوتا ہے۔ رضا کاروں کو انسانی زنجیر بنا کر احتجاج کے دوران نظم و ضبط برقرار رکھنے کی ذمہ داری دی جانی چاہیے۔ مسلم رہنماؤں کو انتظامیہ سے پہلے اجازت لینا کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ وہ مظاہرے کی ویڈیو ریکارڈنگ کرنے پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ تاہم سب سے مشکل کام مسلم تنظیموں میں باہمی تال میل برقرار رکھنا ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ مسلم قیادت ایک منقسم گھر ہے۔

اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک وسیع اتحاد قائم کرنا چاہیے۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندوتو انظام سے پریشان صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ دیگر مذہبی برادریاں، دلت، نچلی ذاتیں اور خواتین بھی بھگوا سیاست کا شکار ہیں۔ ۷۰ فیصد دلتوں کے پاس یا تو کوئی زمین نہیں ہے یا ان کے پاس اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ ان کو اب بھی اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ دلتوں کا کوئی ثقافتی سرمایہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے سے گریز کرتا ہے۔ معمول کی شادیاں ذات کے اندر ہی کی جاتی ہیں۔ ترقی کے ہر سماجی اشاریہ پر، آدیواسی، دلتوں کی طرح سب سے نیچے بیٹھے ہیں۔ آزادی کے بعد، بے گھر، زخمی اور مارے جانے والے آدیواسیوں کی تعداد فرقہ وارانہ فسادات میں مارے جانے والوں سے کم نہیں۔ پسماندہ طبقات کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا ان میں سے ایک اوپری طبقہ امیر نظر آتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ ہیں۔ آج کوئی بھی اقلیتی طبقہ خود اپنی طاقت سے حکومت نہیں بنا سکتا۔ اس لیے تمام مظلوم طبقات کے مابین اتحاد کی ضرورت ہے۔ مگر اس اتحاد کی کون قیادت کرے گا؟ یہ ایک مشکل سوال ہے لیکن اس کا ایک حل بھی ہے۔ اقتدار میں میں حصہ ان ذاتوں اور طبقات کو ملنا چاہیے جو سب سے زیادہ کمزور ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ عرب پر غیر عربوں کی برتری نہیں اور سیاہ فام سے برتر سفید فام نہیں ہے، اگر برتر کوئی ہے تو وہ صرف تقویٰ اور نیکی کے بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ اسلامی نظریہ مساوات پر یقین رکھتا ہے نسل پرستی پر نہیں۔ لیکن مسلم معاشرے کی حقیقت یہ ہے کہ بعض مسلمان بعض موقعوں پر اپنے آپ کو دوسرے بعض مسلمان سے برتر سمجھتے ہیں اور اپنی ذات کے اندر شادی کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسلم خواتین کے حالات اور بھی خراب ہیں۔ اقلیتی اداروں میں ان کی نمائندگی ندارد ہے۔ انہیں ہر طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ان کے علاوہ، مسلم کمیونٹی کو آج سے ہی مثبت ایجنڈوں پر توجہ دینا چاہیے۔ پہلا قدم ہر فرد کو لینا پڑے گا۔ صحت اور تعلیم پر کام کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔ کمیونٹی کو خواتین کی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ وہ ملک میں سب سے زیادہ ناخواندہ گروپ ہے۔ مدارس میں قرآن، عربی، فارسی اور دیگر روایتی مضامین کی تعلیم جاری رکھنی چاہیے لیکن جدید مضامین کو بھی شامل کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ انہیں اپنے انفراسٹرکچر کی ترقی کے لیے فنڈز بھی اکٹھے کرنے چاہئیں۔ انہیں اس کے لیے حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ مدارس کو بھی اپنے دراوزہ سب کے لیے کھول دینے چاہئیں۔ اگر کوئی مدرسہ یہ کہتا ہے کہ انہوں نے تعلیم حاصل کرنے سے کسی کو روکا نہیں ہے تو پھر یہ کیسے ہو گیا کہ ایک مکتب فکر کے لوگ ایک ہی مدرسہ تک محدود ہیں؟ میری رائے ہے کہ غیر مسلمان جو اسلامی تعلیمات اور عربی زبان کو سیکھنے کے خواہشمند ہیں، ان کو بھی مدارس میں داخل ہونے کی اجازت ہونی چاہیے۔ اگر اس کی اجازت ہے، تو اس بات پر غور ہونا چاہیے کہ جس طرح سے عیسائی مشنری کے تعلیمی اداروں میں سارے مذاہب کے لوگ پڑھنے کے لیے جاتے ہیں تو پھر وہ مدرسہ میں بڑی تعداد میں کیوں نہیں آتے؟ علم کے حصول پر کسی بھی قسم کی پابندی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ بات اسلام کے اصول کے بھی خلاف ہے۔ فرقے، مذہب یا پھر یا جنس کی بنیاد پر، تعلیم کے مساوی حقوق کو کیسے روکا جا سکتا ہے؟

ہندوستان مسلمانوں کا جتنا ہے، اُتنا ہی کسی اور مذہبی طبقے کا ہے۔ مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے لڑنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے آزاد میڈیا ہاؤسز، ریسرچ ادارے، انسانی حقوق کی تنظیمیں، قانونی سیل وغیرہ بھی کھولنے کی ضرورت ہے۔ جب بھی مسلمانوں کو کسی سیاسی احتجاج کے بارے میں کوئی پروگرام بنانا ہو تو ان میں ان کو پسماندہ برادریوں اور سیکولر اور ترقی پسند قوتوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو مساوات کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں۔ طویل مدتی اہداف کے طور پر وہ انتخابی اصلاحات کے بارے میں سوچ سکتے ہیں اور اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ فرسٹ پاسٹ دی پول سسٹم میں اقلیتی گروپ جیسے مسلمان یا دلت اپنے ووٹوں کے تناسب سے سیٹیں نہیں جیت پاتے ہیں۔ انتخابی نظام کی اصلاح پر سنجیدہ بحث شروع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پسماندہ طبقات کو موثر نمائندگی مل سکے۔

ایک مصنف کے طور پر میری اپنی رائے ہے، جو میرے مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ پر مبنی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میری ہر بات سے سب کو اتفاق نہیں ہوگا۔ میری باتوں کے کسی ایک جز پر بحث کرنے کے بجائے، اس پورے مضمون کو ایک جذبہ کے طور پر لیا جائے تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک مضمون میں سارے مسائل پر گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔ میرا خواب مسلمانوں سمیت تمام پسماندہ کمیونٹیز کو جمہوریت میں برابر کا شریک بنتے دیکھنا ہے۔ یہ اس لیے کہ کسی خاص شخص یا طبقے کی بالادستی قائم ہونا ہندوستانی جمہوریت کے لیے خطرناک ہے۔ میں عدلیہ اور فوج میں بھی اقلیت اور پسماندہ طبقات کے لیے ریزرویشن کا حامی ہوں، جہاں ان کی نمائندگی کم ہے۔ ذات پات کے معاشرے میں فیصلہ سازی کے عہدے پر بیٹھا ہوا شخص اپنے اور اپنی ذات کے مفاد کو سب سے اوپر سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک معاشرہ اور ملک کی فلاح زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس لیے ہمیں سب کے لیے برابری اور انصاف کے لیے لڑائی لڑنی ہوگی۔ اگر سماج میں مساوات، آزادی اور اخوت کی جڑیں مضبوط ہوں گی تو اس سے ہمارا ملک اور طاقتور ہوگا۔

❊❊❊

مسلم کمیونٹی کو آج سے ہی مثبت ایجنڈوں پر توجہ دینا چاہیے۔ پہلا قدم ہر فرد کو لینا پڑے گا۔ صحت اور تعلیم پر کام کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔ کمیونٹی کو خواتین کی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ وہ ملک میں سب سے زیادہ ناخواندہ گروپ ہے۔ مدارس میں قرآن، عربی، فارسی اور دیگر روایتی مضامین کی تعلیم جاری رکھنی چاہیے لیکن جدید مضامین کو بھی شامل کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ انہیں اپنے انفراسٹرکچر کی ترقی کے لیے فنڈز بھی اکٹھے کرنے چاہئیں۔ انہیں اس کے لیے حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے

مسلمان اب کیا کریں!

قوموں کی تقدیر ایک دن میں تو بنتی نہیں، مگر ایک پل کا جذباتی ردعمل بڑا نقصان کرسکتا ہے

ابھے کمار

یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگ مسلمانوں کی ترقی کو لے کر اس طرح سنجیدہ نہیں ہیں جیسا کہ ان کو ہونا چاہیے۔ بھارت کا آئین تمام شہریوں کو یکساں حقوق فراہم کرتا ہے، مگر زمینی حقیقت یہ ہے کہ سسٹم میں بیٹھے ہوئے بڑی تعداد میں افسران و لیڈر مذہب، ذات اور جنس دیکھ کر فیصلہ لیتے ہیں۔ قانون کے سامنے سب برابر ہیں اور سب کے ووٹ کی قیمت ایک ہی ہے، مگر یہ کڑوی سچائی ہے کہ چند مٹھی بھر لوگ ملک کے وسائل پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں، جبکہ اکثر آبادی کو فیصلہ سازی کے دائرے سے محروم رکھا گیا ہے۔ ایک اچھا دستور ہونے کے باوجود، ہمارے حکمرانوں کی بدنیتی کی وجہ سے کمزوروں کو انصاف نہیں مل پا رہا ہے۔ آج عوام کے اندر غم وغصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ کمزور طبقات کو یہ بات ستانے لگی ہے کہ ان کے مذہب اور ذات کو دیکھ کر ان کے خلاف زیادتی کی جا رہی ہے۔ جنہوں نے نفرت انگیز بیانات دے کر پورے ملک میں آگ لگائی، ان کو تمام تحفظات فراہم کیے جا رہے ہیں اور انہیں ہندو سماج کا پیشوا بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر جن لوگوں نے انصاف کے لیے لڑائی لڑی اور فسادات کی زد میں آنے والوں کے لیے راحت اور باز آبادکاری کے لیے جدوجہد کی ان کو انصاف دینے کے بجائے جیل بھیج دیا گیا ہے۔ جو دن رات فرقہ وارانہ ماحول پیدا کرنے والی خبروں کو چلا رہے ہیں، ان کو ہر طرح سے اشتہار اور دیگر مالی امداد دے کر آگے بڑھایا جا رہا ہے، مگر جنہوں نے حقیقت پر مبنی صحافت کو آگے بڑھایا اور حکومت کی نظروں میں آنکھ ملا کر بات کی، ان کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ اس پورے ماحول کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ ہندو قومیت کی بات کرنے والے قانون سے بالاتر ہیں، جبکہ محکوم طبقات کی بات کرنے والوں کے خلاف ریاست انتقام کے جذبے سے کام کر رہی ہے۔ مگر اس مشکل کی گھڑی میں صبر وتحمل کا دامن چھوڑ دینا بھی عقلمندی نہیں ہے؟

مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی پر بھی ازسرنو غور کرنا ہوگا اور آج کے حالات کا ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کرنا ہوگا۔ بھگوا طاقتوں کی یہ پوری کوشش ہے کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی بہانے سے مشتعل کیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان اپنے صبر وتحمل کے بندھن کو توڑ دیں اور پھر ان کو دبانے کا ایک آسان سا موقع مل جائے۔ مگر مسلمانوں کو ان کے دام فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ مسلمانوں کو حضرت محمد صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپؐ نے اس وقت ہجرت کی جب مکہ میں زندگی گزارنا مشکل ہوگیا تھا۔ ان کی زندگی کا پیغام یہ ہے کہ حالات کو پڑھنا چاہیے اور صبر اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینا عقلمندی ہے۔ حالات سازگار نہ ہونے پر ایک قدم پیچھے ہٹ جانا کوئی بزدلی نہیں ہے۔ مسلمانوں کو بابا صاحب امبیڈکر اور ان کی دلت تحریکوں سے بھی سبق سیکھنا چاہیے۔ زیادہ تر مواقع پر امبیڈکر نے آئینی اور قانونی لڑائیوں کی پیروی کی۔ وہ جذباتی مسائل پر مبنی سیاست کے پیروکار نہیں تھے۔ انہوں نے سیاست میں شخصیت پرستی کے خطرات سے بھی متنبہ کیا۔ مگر بعض مسلم قائدین جذباتی تقریریں کرتے ہیں، مذہبی علامتوں کا ذکر کرتے ہیں اور کمیونٹی کو واحد مذہبی شناخت میں محدود کرنے کی غلطی کرتے ہیں۔ مذہبی علامات کی سیاست اقلیتی برادری کے رہنماؤں کو ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ ایسا کر کے اپنی پارٹی کو اقتدار میں بھی نہیں لا سکتے۔ اس لیے ان کو ہمیشہ سیکولر محاوروں کا استعمال کرنا چاہیے۔

> مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی پر بھی ازسرنو غور کرنا ہوگا اور آج کے حالات کا ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کرنا ہوگا۔ بھگوا طاقتوں کی یہ پوری کوشش ہے کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی بہانے سے مشتعل کیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان اپنے صبر وتحمل کے بندھن کو توڑ دیں اور پھر ان کو دبانے کا ایک آسان سا موقع مل جائے۔ مگر مسلمانوں کو ان کے دام فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ مسلمانوں کو حضرت محمد صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپؐ نے اس وقت ہجرت کی جب مکہ میں زندگی گزارنا مشکل ہوگیا تھا۔ ان کی زندگی کا پیغام یہ ہے کہ حالات کو پڑھنا چاہیے اور صبر اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینا عقلمندی ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو ایک وسیع اتحاد قائم کرنا چاہیے۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ ہندوتوادی نظام سے پریشان صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ دیگر مذہبی برادریاں، دلت، نچلی ذاتیں اور خواتین بھی بھگوا سیاست کا شکار ہیں۔ ۷۰ فیصد دلتوں کے پاس یا تو کوئی زمین نہیں ہے یا ان کے پاس اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ ان کو اب بھی اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ دلتوں کا کوئی ثقافتی سرمایہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے سے گریز کرتا ہے۔ معمول کی شادیاں ذات کے اندر ہی کی جاتی ہیں۔ ترقی کے ہر سماجی اشاریہ پر، آدیواسی، دلتوں کی طرح سب سے نیچے بیٹھے ہیں۔ آزادی کے بعد، بے گھر، زخمی اور مارے جانے والے آدیواسیوں کی تعداد فرقہ وارانہ فسادات میں مارے جانے والوں سے کم نہیں۔ پسماندہ طبقات کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا اور ان میں سے ایک اوپری طبقہ مضبوط نظر آتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ ہیں۔ آج کوئی بھی اقلیتی طبقہ خود اپنی طاقت سے حکومت نہیں بنا سکتا۔ اس لیے تمام مظلوم طبقات کے مابین اتحاد کی ضرورت ہے۔ مگر اس اتحاد کی قیادت کون کرے گا؟ یہ ایک مشکل سوال ہے لیکن اس کا ایک حل بھی ہے۔ اقتدار میں حصہ ان ذاتوں اور طبقات کو ملنا چاہیے جو سب سے زیادہ کمزور ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے سماج کے اندر اصلاح کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ عرب پر غیر عربوں کی برتری نہیں اور سیاہ فام سے برتر سفید فام نہیں ہے، اگر برتر کوئی ہے تو وہ صرف تقویٰ اور نیکی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ اسلام مساوات پر یقین رکھتا ہے نسل پرستی پر نہیں۔ لیکن مسلم معاشرے کی حقیقت یہ ہے کہ بعض مسلمان بعض مواقع پر اپنے آپ کو دوسرے بعض مسلمانوں سے برتر سمجھتے ہیں اور اپنی ذات کے اندر شادی کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسلم خواتین کے حالات اور بھی خراب ہیں۔ اقلیتی اداروں میں ان کی نمائندگی ندارد ہے۔ انہیں ہر طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کو تعلیم یافتہ بنانے اور آگے لانے کے لیے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔ خاص کر تعلیم اور کاروبار کے حلقہ میں مسلمان دیگر جماعتوں سے کافی پیچھے ہیں۔ جنوبی بھارت کے مسلمان تو کچھ کرتے دکھ بھی رہے ہیں، مگر شمالی ہند کے مسلمانوں کی حالت کافی خراب ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ اگر تعلیم اور کاروبار کے میدان میں کوئی جماعت پیچھے چلی جائے، تو اس کو کوئی مددگار نہیں ملتا۔ یہ بات سچ ہے کہ کسی بھی تجارت کو آگے بڑھانے کے لیے ریاست کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور جب ریاست ہی مسلمانوں کے تئیں منفی سوچ رکھتی ہو تو مشکلیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ مگر دنیا میں موت کے سوا کوئی بھی ایسی بیماری نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو۔ مسلم ملی رہنماؤں کو ان چیلنجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور اس سمت میں سنجیدگی سے مل بیٹھ کر سوچنا چاہیے۔ تعلیم اور صحت کے حلقہ میں کیسے کام کرنا چاہیے، یہ وہ عیسائی سماج سے سیکھ سکتے ہیں۔

مسلم کمیونٹی کو آج سے ہی مثبت ایجنڈوں پر توجہ دینی چاہیے۔ پہلا قدم ہر فرد کو لینا پڑے گا۔ صحت اور تعلیم پر کام کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔ کمیونٹی کو خواتین کی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ وہ ملک میں سب سے زیادہ ناخواندہ ہیں۔ مدارس میں قرآن، عربی، فارسی اور دیگر روایتی مضامین کی تعلیم جاری رکھنی چاہیے لیکن جدید مضامین کو شامل کرنے میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔ انہیں اپنے انفراسٹرکچر کی ترقی کے لیے فنڈز بھی اکٹھے کرنے چاہئیں۔ انہیں اس کے لیے حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ مدارس کو بھی اپنے دروازے سب کے لیے کھول دینے چاہئیں۔ مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے لڑنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ جب بھی مسلمانوں کو کسی سیاسی اور سماجی احتجاج کے بارے میں کوئی پروگرام بنانا ہو تو ان میں ان کو پسماندہ برادریوں اور سیکولر اور ترقی پسند قوتوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو مساوات کے نظریے پر یقین رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے آزاد میڈیا ہاؤسز، ریسرچ ادارے، انسانی حقوق کی تنظیمیں، قانونی سیل وغیرہ بھی کھولنے کی ضرورت ہے۔ طویل مدتی اہداف کے طور پر وہ انتخابی اصلاحات کے بارے میں سوچ سکتے ہیں اور اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ فرسٹ پاسٹ دی پول سسٹم میں اقلیتی گروپ جیسے مسلمان یا دلت اپنے ووٹوں کے تناسب سے سیٹیں نہیں جیت پاتے ہیں۔ انتخابی نظام کی اصلاح پر سنجیدہ بحث شروع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پسماندہ طبقات کو موثر نمائندگی مل سکے۔ یہ سب کچھ ٹھنڈے دماغ سے کرنا ہوگا۔ قوموں کی تقدیر ایک دن میں بنتی تو نہیں، مگر ایک پل کا جذباتی ردعمل بڑا نقصان کرسکتا ہے۔■

مسلمان اب کیا کریں!

قوموں کی تقدیر ایک دن میں تو بنتی نہیں، مگر ایک پل کا جذباتی ردعمل بڑا نقصان کر سکتا ہے

ابھے کمار

یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ حکومت میں بیٹھے ہوئے لوگ مسلمانوں کی ترقی کو لے کر اس طرح سنجیدہ نہیں ہیں جیسا کہ ان کو ہونا چاہیے۔ بھارت کا آئین تمام شہریوں کو یکساں حقوق فراہم کرتا ہے، مگر زمینی حقیقت یہ ہے کہ سسٹم میں بیٹھے ہوئے بڑی تعداد میں افسران ولیڈر مذہب، ذات اور جنس دیکھ کر فیصلہ لیتے ہیں۔ قانون کے سامنے سب برابر ہیں اور سب کے ووٹ کی قیمت ایک ہی ہے، مگر یہ کڑوی سچائی ہے کہ چند مٹھی بھر لوگ ملک کے وسائل پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں، جبکہ اکثر آبادی کو فیصلہ سازی کے دائرے سے محروم رکھا گیا ہے۔ ایک اچھا دستور ہونے کے باوجود، ہمارے حکمرانوں کی بدنیتی کی وجہ سے کمزوروں کو انصاف نہیں مل پا رہا ہے۔ آج عوام کے اندر غم وغصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ کمزور طبقات کو یہ بات ستانے لگی ہے کہ ان کے مذہب اور ذات کو دیکھ کر ان کے خلاف زیادتی کی جا رہی ہے۔ جنہوں نے نفرت انگیز بیانات دے کر پورے ملک میں آگ لگائی، ان کو تمام تحفظات فراہم کیے جا رہے ہیں اور انہیں ہندو سماج کا پیشوا بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر جن لوگوں نے انصاف کے لیے لڑائی لڑی اور فسادات کی زد میں آنے والوں کے لیے راحت اور باز آبادکاری کے لیے جدوجہد کی ان کو انصاف دینے کے بجائے جیل بھیج دیا گیا ہے۔ جو دن رات فرقہ وارانہ ماحول پیدا کرنے والی خبروں کو چلا رہے ہیں، ان کو ہر طرح سے اشتہار اور دیگر مالی امداد دے کر آگے بڑھایا جا رہا ہے، مگر جنہوں نے حقیقت پر مبنی صحافت کو آگے بڑھایا اور حکومت کی نظروں میں آنکھ ملا کر بات کی، ان کو سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ اس پورے ماحول کو دیکھ کر ایسا لگ رہا ہے کہ ہندو قومیت کی بات کرنے والے قانون سے بالاتر ہیں، جبکہ محکوم طبقات کی بات کرنے والوں کے خلاف ریاست انتقام کے جذبے سے کام کر رہی ہے۔ مگر اس مشکل کی گھڑی میں صبر وتحمل کا دامن چھوڑ دینا بھی عقلمندی نہیں ہے؟

مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی پر بھی از سر نو غور کرنا ہوگا اور آج کے حالات کا ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کرنا ہوگا۔ بھگوا طاقتوں کی یہ پوری کوشش ہے کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی بہانے سے مشتعل کیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان اپنے صبر وتحمل کے بندھن کو توڑ دیں اور پھر ان کو دبانے کا ایک آسان سا موقع مل جائے۔ مگر مسلمانوں کو ان کے دام فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ مسلمانوں کو حضرت محمد صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپؐ نے اس وقت ہجرت کی جب مکہ میں زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کی زندگی کا پیغام یہ ہے کہ حالات کو پڑھنا چاہیے اور صبر اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینا عقلمندی ہے۔ حالات سازگار نہ ہونے پر ایک قدم پیچھے ہٹ جانا کوئی بزدلی نہیں ہے۔ مسلمانوں کو باباصاحب امبیڈکر اور ان کی دلت تحریکوں سے بھی سبق سیکھنا چاہیے۔ زیادہ تر مواقع پر امبیڈکر نے آئینی اور قانونی لڑائیوں کی پیروی کی۔ وہ جذباتی مسائل پر مبنی سیاست کے پیروکار نہیں تھے۔ انہوں نے سیاست میں شخصیت پرستی کے خطرات سے بھی متنبہ کیا۔ مگر بعض مسلم قائدین جذباتی تقریریں کرتے ہیں، مذہبی علامتوں کا ذکر کرتے ہیں اور کمیونٹی کو واحد مذہبی شناخت میں محدود کرنے کی غلطی کرتے ہیں۔ مذہبی علامات کی سیاست اقلیتی برادری کے رہنماؤں کو ہمیشہ نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ ایسا کر کے اپنی پارٹی کو اقتدار میں بھی نہیں لا سکتے۔ اس لیے ان کو ہمیشہ سیکولر محاوروں کا استعمال کرنا چاہیے۔

ہندوستانی مسلمانوں کو ایک وسیع اتحاد قائم کرنا چاہیے۔ انہیں

❞

مسلمانوں کو اپنی حکمت عملی پر بھی از سر نو غور کرنا ہوگا اور آج کے حالات کا ٹھنڈے دماغ سے تجزیہ کرنا ہوگا۔ بھگوا طاقتوں کی یہ پوری کوشش ہے کہ مسلمانوں کو کسی نہ کسی بہانے سے مشتعل کیا جائے۔ وہ چاہتی ہیں کہ مسلمان اپنے صبر وتحمل کے بندھن کو توڑ دیں اور پھر ان کو دبانے کا ایک آسان سا موقع مل جائے۔ مگر مسلمانوں کو ان کے دام فریب میں نہیں آنا چاہیے۔ مسلمانوں کو حضرت محمد صاحب کی زندگی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ آپؐ نے اس وقت ہجرت کی جب مکہ میں زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کی زندگی کا پیغام یہ ہے کہ حالات کو پڑھنا چاہیے اور صبر اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینا عقلمندی ہے۔

سمجھنا چاہیے کہ ہندوتووادی نظام سے پریشان صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ دیگر مذہبی برادریاں، دلت، نچلی ذاتیں اور خواتین بھی بھگوا سیاست کا شکار ہیں۔ ۷۰ فیصد دلتوں کے پاس یا تو کوئی زمین نہیں ہے یا ان کے پاس اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ ان کو اب بھی اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ دلتوں کا کوئی ثقافتی سرمایہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے سے گریز کرتا ہے۔ معمول کی شادیاں ذات کے اندر ہی کی جاتی ہیں۔ ترقی کے ہر سماجی اشاریہ پر، آدیواسی، دلتوں کی طرح سب سے نیچے بیٹھے ہیں۔ آزادی کے بعد، بے گھر، زخمی اور مارے جانے والے آدیواسیوں کی تعداد فرقہ وارانہ فسادات میں مارے جانے والوں سے کم نہیں۔ پسماندہ طبقات کو اچھوت نہیں سمجھا جاتا اور ان میں سے ایک اوپری طبقہ مضبوط نظر آتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ ہیں۔ آج کوئی بھی اقلیتی طبقہ خود اپنی طاقت سے حکومت نہیں بنا سکتا۔ اس لیے تمام مظلوم طبقات کے مابین اتحاد کی ضرورت ہے۔ مگر اس اتحاد کی قیادت کون کرے گا؟ یہ ایک مشکل سوال ہے لیکن اس کا ایک حل بھی ہے۔ اقتدار میں حصہ ان ذاتوں اور طبقات کو ملنا چاہیے جو سب سے زیادہ کمزور ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے سماج کے اندر اصلاح کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ عرب پر غیر عربوں کی برتری نہیں اور سیاہ فام سے برتر سفید فام نہیں ہے، اگر برتر کوئی ہے تو وہ صرف تقویٰ اور نیکی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ اسلام مساوات پر یقین رکھتا ہے نسل پرستی پر نہیں۔ لیکن مسلم معاشرے کی حقیقت یہ ہے کہ بعض مسلمان بعض مواقع پر اپنے آپ کو دوسرے بعض مسلمانوں سے برتر سمجھتے ہیں اور اپنی ذات کے اندر شادی کو ترجیح دیتے ہیں۔ مسلم خواتین کے حالات اور بھی خراب ہیں۔ اقلیتی اداروں میں ان کی نمائندگی ندارد ہے۔ انہیں ہر طرح کی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کو تعلیم یافتہ بنانے اور آگے لانے کے لیے ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے۔ خاص کر تعلیم اور کاروبار کے حلقہ میں مسلمان دیگر جماعتوں سے کافی پیچھے ہیں۔ جنوبی بھارت کے مسلمان تو کچھ کرتے دکھ بھی رہے ہیں، مگر شمالی ہند کے مسلمانوں کی حالت کافی خراب ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ اگر تعلیم اور کاروبار کے میدان میں کوئی جماعت پیچھے چلی جائے، تو اس کو کوئی مددگار نہیں ملتا۔ یہ بات سچ ہے کہ کسی بھی تجارت کو آگے بڑھانے کے لیے ریاست کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور جب ریاست ہی مسلمانوں کے تئیں منفی سوچ رکھتی ہو تو مشکلیں اور بڑھ جاتی ہیں۔ مگر دنیا میں موت کے سوا کوئی بھی ایسی بیماری نہیں ہے جس کا علاج نہ ہو۔ مسلم ملی رہنماؤں کو ان چیلنجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے اور اس سمت میں سنجیدگی سے مل بیٹھ کر سوچنا چاہیے۔ تعلیم اور صحت کے حلقہ میں کیسے کام کرنا چاہیے، یہ وہ عیسائی سماج سے سیکھ سکتے ہیں۔

مسلم کمیونٹی کو آج سے ہی مثبت ایجنڈوں پر توجہ دینی چاہیے۔ پہلا قدم ہر فرد کو لینا پڑے گا۔ صحت اور تعلیم پر کام کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔ کمیونٹی کو خواتین کی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ وہ ملک میں سب سے زیادہ ناخواندہ ہیں۔ مدارس میں قرآن، عربی، فارسی اور دیگر روایتی مضامین کی تعلیم جاری رکھنی چاہیے لیکن جدید مضامین کو شامل کرنے میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔ انہیں اپنے انفرااسٹرکچر کی ترقی کے لیے فنڈز بھی اکٹھے کرنے چاہئیں۔ انہیں اس کے لیے حکومت سے گرانٹ حاصل کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ مدارس کو بھی اپنے دروازے سب کے لیے کھول دینے چاہئیں۔ مسلمانوں کو اپنے حقوق کے لیے لڑنے میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ جب بھی مسلمانوں کو کسی سیاسی اور سماجی احتجاج کے بارے میں کوئی پروگرام بنانا ہو تو ان میں ان کو پسماندہ برادریوں اور سیکولر اور ترقی پسند قوتوں کا خیر مقدم کرنا چاہیے جو مساوات کے نظریے پر یقین رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے آزاد میڈیا ہاؤسز، ریسرچ ادارے، انسانی حقوق کی تنظیمیں، قانونی سیل وغیرہ بھی کھولنے کی ضرورت ہے۔ طویل مدتی اہداف کے طور پر وہ انتخابی اصلاحات کے بارے میں سوچ سکتے ہیں اور اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ فرسٹ پاسٹ دی پول سسٹم میں اقلیتی گروپ جیسے مسلمان یا دلت اپنے ووٹوں کے تناسب سے سیٹیں نہیں جیت پاتے ہیں۔ انتخابی نظام کی اصلاح پر سنجیدہ بحث شروع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ پسماندہ طبقات کو موثر نمائندگی مل سکے۔ یہ سب کچھ ٹھنڈے دماغ سے کرنا ہوگا۔ قوموں کی تقدیر ایک دن میں بنتی تو نہیں، مگر ایک پل کا جذباتی ردعمل بڑا نقصان کر سکتا ہے۔ ■

حقوق انسانی

کرنل پروہت کو ضمانت : دہشت گردی کے خلاف کاروائی اور حکومت کا دوہرا پیمانہ

ابھے کمار 27/08/2017

دہشت گردی کی کاروائی میں دوہرا پیمانہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ دہشت گردی کے جرم میں ملوث ہندو شدت پسندوں کو اکثر بے قصور مانا جا رہا ہے اور دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اکثریتی طبقہ سے متعلق لوگ قطعی اس طرح کی کاروائی انجام نہیں دے سکتے۔ وہیں دوسری جانب ان معاملوں میں بات جب کسی اقلیتی اور پسماندہ طبقات کے لوگوں کی آجائے تو انھیں فوراً ہی قصوروار مان لیا جاتا ہے۔
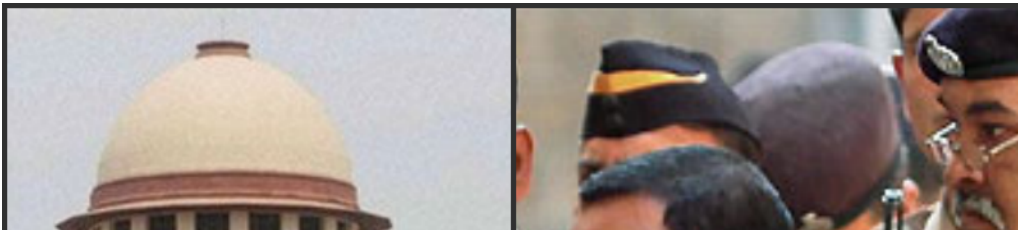
مالیگاؤں بم دھماکے کے لیفٹیننٹ کرنل شری کانت پروہت کو عدالت عظمیٰ نے ضمانت دے دی ہے ۔تشویش ناک بات یہ ہے کہ پروہت کو ایک "ہیرو" اور "دیش بھکت" کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ بھگوا شدت پسندوں کی طرف سے یہ بات کہی جارہی ہے کہ پروہت جیل میں اس لیے تھے کہ سابقہ نام نہاد سیکولر حکومت مسلمانوں کو خوش کرنا چاہتی تھی۔ سوشل میڈیا پر چل رہی بحث کو دیکھا جائے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بھگوا شدت پسندوں نے معاملے کی سماعت ختم ہونے سے قبل ہی پروہت کو "بے قصور" مان لیا ہے اور بہتیروں نے ان کو گرفتار کرنے والے پولیس افسران کے خلاف تادیبی کاروائی تک کرنے کا مطالبہ تک کردیا ہے۔

قانون کے مطابق جب تک کسی پر عدالت کی جانب سے جرم ثابت نہیں ہو جاتا تب تک ہر کسی کو اسے بے قصور سمجھنا چاہیے۔ اگر یہی منطق آج بھگوا شدت پسند کرنل پروہت کے معاملے میں استعمال کر رہے ہیں تو ان کو ان تمام قیدیوں کو بھی بے قصور ماننا چاہیے جو برسوں سے دہشت گردی کے کسی نہ کسی جرم میں ملزم بنا کر جیل میں بند کیے گئے ہیں۔ معتبر اعداد و شمار کو مانیں تو جیل میں قید زیر سماعت ملزموں کی تعداد مسلمان، دلت، آدی واسی اور دیگر پسماندہ طبقات سے ان کی آبادی کے تناسب کہیں زیادہ ہیں۔ جرم ثابت نہیں ہونے کی وجہ سے کرنل پروہت بے قصور ہیں تو کیا لاکھوں کی تعداد میں مقید ملزمین کو بھی بے قصور اور معصوم سمجھا جائے؟ کیا ان کے خلاف جھوٹے مقدمے دائر کرنے والے پولیس انتظامیہ کو بھی سزا نہیں ملنی چاہیے؟

حقیقت یہ ہے کہ دہشت گردی کی کاروائی میں دوہرا پیمانہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ دہشت گردی کے جرم میں ملوث ہندو شدت پسندوں کو اکثر بے قصور مانا جارہا ہے اور دلیل یہ دی جارہی ہے کہ اکثریتی طبقہ سے متعلق لوگ قطعی اس طرح کی کاروائی انجام نہیں دے سکتے ۔ وہیں دوسری جانب ان معاملوں میں بات جب کسی اقلیتی اور پسماندہ طبقات کے لوگوں کی آجائے تو انھیں فوراً ہی قصوروار مان لیا جاتا ہے۔ مسلمان اور دیگر کمزور طبقات کو گرفتار کرنے والے پولیس

افسران کی تعریف کی جاتی ہے اور ان پر تمغوں کی بارش کی جاتی ہے، وہیں ہندو دہشت گرد عناصر پر کاروائی کرنے والے پولیس افسران کو ایک خاص سیاست سے متعصب سمجھا جاتا ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ قومی کمیشن برائے انسانی حقوق نے بستر کے آئی جی پی کلوری کو آدی واسیوں کے خلاف زیادتی کرنے اور اپنی طاقت اور اختیار کا بیجا استعمال کرنے کے لیے سمن بھیجا تھا۔ آج کرنل پروہت کو گرفتار کرنے والے پولیس افسران کے خلاف تادیبی کاروائی کا مطالبہ کرنے والے یہی شدت پسند عناصر کلوری کو سچا دیش بھکت مان رہے ہیں۔

کرنل پروہت گزشتہ نو سالوں سے جیل میں تھے اور اس کی ضمانت کی عرضی کو بمبئی ہائی کورٹ نے مسترد کردیا تھا۔ اس کے بعد پروہت نے عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ پروہت پر الزام ہے کہ سال 2008 میں مہاراشٹر کے ناسک

ضلع کے مالیگاؤں میں بم دھماکے میں اس کا رول تھا۔ اس دھماکے میں 7 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ جب پولیس نے چارج شیٹ داخل کی تو اس نے کرنل پروہت کو آر ڈی ایکس مہیا کرانے کا قصوروار پایا۔ اس کی ساتھی پرگیہ ٹھاکر نے اپنی موٹر سائیکل کا استعمال دھماکہ کو انجام دینے کے لیے کیا تھا۔ نامور صحافی دھیریندر جھا نے اپنی حالیہ مطبوعہ کتاب ''شیڈو آرمیز'' (Shadow Armies) میں لکھا ہے کہ کرنل پروہت کا تعلق ساورکر کے نظریات پر مبنی تنظیم ابھنو بھارت سے ہے، جس سے منسلک اہم منتظم سمیر کلکرنی کا نام بھی مالیگاؤں بم دھماکے میں شامل ہے۔ کلکرنی آر ایس ایس سے تعلق رکھتا ہے اور اس طرح کرنل پروہت، ابھنو بھارت اور آر ایس ایس کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں؟

مالیگاؤں بم دھماکے کو لے کر جب اے ٹی ایس نے چارج شیٹ داخل کیا تو اس نے ایک بڑے تعصب کو اجاگر کیا۔ یہ تعصب کسی خاص مذہب اور کسی خاص مذہبی طبقے کے خلاف جڑا ہوا ہے جو دہشت گردی سے جڑے ہوئے تمام واقعات کو اسی طبقے کے سر پھوڑ دیتا ہے۔ اے ٹی ایس کے ذریعے مالیگاؤں معاملے میں داخل شدہ چارج شیٹ نے اس بات کا انکشاف کیا کہ دہشت گردی کے تار کہیں نہ کہیں بھگوا شدت پسند عناصر سے بھی جڑے ہوئے ہیں جو حکومت، پولیس اور فوج کی مدد سے تشدد اور غیر قانونی کاروائیوں کو ایک لمبے وقت سے انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح کچھ لوگوں نے بھگوا دہشت گردی (SaffronTerror) کی اصطلاح رائج کی، جس کے بعد آر ایس ایس، بی جے پی اور ان کے نظریے کے حامل میڈیا اور پولیس سے وابستہ افراد واویلا مچانے لگے۔ اکثریتی طبقے کا تعلق دہشت گردی کی کسی بھی کاروائی سے ہوسکتا ہے یہ بات ان کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی تھی۔

دہشت گردی کے الزامات میں بے قصور قیدیوں کے انسانی حقوق کی لڑائی لڑ رہی منیشا سیٹھی سے کرنل پروہت کی ضمانت سے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ وہ کسی بھی ملزم کو ضمانت دیے جانے کے خلاف نہیں ہے۔ انھوں نے افسوس ظاہر کیا کہ ایک بار کسی کا نام دہشت گردی سے جڑ جائے تو اسے عدالت ضمانت دینے سے کتراتی ہے جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد میں ملزمین سال در سال جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

یہ پوچھے جانے پر کہ کرنل پروہت نے عدالت میں یہ بیان دیا ہے کہ وہ فوج کے لیے جاسوسی کر رہا تھا اور اسی وجہ سے وہ کچھ خاص تنظیموں سے وابستہ تھا، منیشا سیٹھی نے کہا کہ پروہت کی یہ دلیل غیر منطقی ہے۔ کیوں کہ اگر ان تنظیموں کا پروہت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے تو پھر یہ تنظیمیں کرنل پروہت کو ہر طرح کی قانونی مدد کیوں دے رہی ہیں؟

مالیگاؤں بم دھماکے کا معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہے مگر انسانی حقوق سے وابستہ کارکنان اور ماہرین کا ماننا ہے کہ کرنل پروہت کو ملی ضمانت سے بھگوا شدت پسند تنظیموں کے حوصلے بلند ہوئے ہیں۔ سیاست میں بھگوا نظریے کے تسلط کا اثر دیگر ادارے پر بھی دکھتا ہے اور انھیں خدشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ تنظیمیں حکومت پر مزید دباؤ ڈالیں گی کہ وہ دہشت گردی کے الزام میں ملوث دیگر بھگوا شدت پسندوں کی رہائی کی راہ ہموار کریں گی۔

(مضمون نگار جے این یو کے شعبہ تاریخ سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔)

Related

سماجی انصاف کا خواب ابھی اَدھورا

اگر بھارت کو ایک مضبوط جمہوریت اور مساوی سماج بنانا ہے تو ارباب اقتدار کو صرف امیروں کی جھولی بھرنے سے گریز کرنا ہوگا

ابھے کمار

دنیا بھر میں ہر سال ۲۰ فروری کے روز عالمی یوم سماجی انصاف کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس سال بھی اقوام متحدہ سے لے کر مختلف تنظیموں نے ایک بہتر اور مساوی معاشرہ کی تشکیل دینے کے عہد کو دہرایا ہے۔ اس موقع پر سوشل میڈیا پر بہت سارے ایسی پوسٹیں نظر آئیں، جن میں غربت، تعصب، غیر مساوی نظام، بے روزگاری اور انسانی حقوق کی پامالی پر تشویش ظاہر کی گئی ہے۔ یہ بات بے حد افسوسناک ہے کہ گزشتہ دو سو سالوں میں دنیا نے ترقی کے سارے سابقہ ریکارڈ کو توڑ دیا ہے، مگر اسی دنیا میں آج بھی کروڑوں لوگوں کو ہر روز خالی پیٹ سونا بھی پڑتا ہے۔ ترقی اس قدر دیکھنے کو ملی ہے کہ انسان چاند پر پہنچ چکا ہے اور برق رفتاری سے دوڑنے والی بولیٹ ٹرین دنیا کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے جوڑ رہی ہے، وہیں انسان آج بھی صاف پانی پینے اور موزوں مکان میں رہنے کے لیے بھی جدوجہد کر رہا ہے۔ مشین کے حلقہ میں اتنی ترقی حاصل کرنے کے بعد بھی، انسان کے اوپر کام کا بوجھ گھٹنے کے بجائے، بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ جہاں سرمایہ داروں کی آمدنی بڑھتی ہی جا رہی ہے، وہیں مزدور کی مزدوری گھٹ رہی ہے۔ اقتصادی ترقی اور جدید تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی غیر مساوی سماجی نظام تبدیل نہیں ہوا ہے اور بڑی تعداد میں لوگ آج بھی ذات برادری، دھرم، نسل، جنس کے امتیاز کے شکار ہیں۔ گاؤں میں رہنے والوں کو کیا کہیں، جو لوگ شہر میں رہتے ہیں اور تعلیم یافتہ بھی ہیں، ان کی سوچ بھی بہت نہیں بدل پائی ہے۔ آزادی کے ۷۰ سال گزر جانے کے بعد بھی، ہمارا سماج ذلت برادری پر مبنی امتیاز کو پوری طرح سے ختم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ دھرم اور مذہب کے نام پر آج بھی سیاست کی جا رہی ہے۔ شاید مذہبی سیاست کم ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جہاں ملک کے کمزور ترین طبقات کو فسادات میں نشانہ بنایا جاتا ہے، وہیں اکثریتی طبقہ کو اقلیتوں کا ڈر دکھا کر، ووٹ حاصل کیا جاتا رہا ہے۔

تضاد دیکھیے کہ اپنی کارکردگی سے ہندوستانیوں نے آئی ٹی سیکٹر میں دھوم مچا دیا ہے، مگر اسی شعبہ سے بھاجپا کو بڑے پیمانہ پر حمایت بھی ملتی ہے۔ جہاں دنیا سیاروں پر بسنے کی بات سوچ رہی ہے، وہیں بھارت میں بڑی تعداد میں آج بھی لوگ چھوت چھات کے شکار ہیں اور اچھا کپڑا پہنے اور گھوڑا پر سوار ہو کر شادی کرنے پر اعلیٰ ذات کے لوگ دلت سماج کے لوگوں پر حملہ کرتے ہیں۔ بھارت میں جمہوریت کے قیام کے ۷۰ سال سے بھی زیادہ کا وقت گزر گیا ہے، مگر آج بھی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں مٹھی بھر اعلیٰ ذات کے لوگوں کا ہی قبضہ ہے، وہیں مزدور، کسان، دلت، آدی واسی، پسماندہ، خواتین، مذہبی اقلیت اور دیگر محکوم طبقات کو ان کی واجب حصہ داری سے محروم رکھا گیا ہے۔ حقوق کو غصب کرنے کے لیے ارباب اقتدار ہر روز ایک نئی چال چلتا ہے تا کہ ان کا یہ غیر مساوی نظام بدستور بنا رہے۔ ارباب اقتدار نہیں چاہتا کہ نیچے سے لوگ اوپر اُٹھ کر آئیں اور پالیسی سازی میں ان کے سامنے بیٹھیں۔

بھارت کی اقتصادی پالیسی ہمیشہ سے ہی امیر لوگوں کے مفاد کو پورا کرتی رہی ہے، مگر گزشتہ سات سالوں میں برسر اقتدار بھاجپا نے سرمایہ داروں کو اس طرح فائدہ پہنچایا ہے کہ ملک کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ ایسے عناصر کی سوچ ہمیشہ سے غیر مساوی رہی ہے اور انہیں ایسا لگتا ہے کہ مالدار لوگ جتنے ہی بالدار ہوں گے ملک اتنا ہی ترقی کرے گا۔ تبھی تو موجودہ حکومت نے جو بھی بچے ہوئے مزدوروں کے حقوق تھے، ان میں سے بہت سارے تحفظات کو ختم کر دیا ہے اور تاجر اور سرمایہ داروں کو کھلی چھوٹ دے دی ہے کہ وہ

> آزادی کے ۷۰ سال گزر جانے کے بعد بھی، ہمارا سماج ذات برادری پر مبنی امتیاز کو پوری طرح سے ختم کرنے میں ناکام رہا ہے۔ دھرم اور مذہب کے نام پر آج بھی سیاست کی جا رہی ہے۔ شاید مذہبی سیاست کم ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ جہاں ملک کے کمزور ترین طبقات کو فسادات میں نشانہ بنایا جاتا ہے، وہیں اکثریتی طبقہ کو اقلیتوں کا ڈر دکھا کر، ووٹ حاصل کیا جاتا رہا ہے۔

جو چاہیں کریں۔ مگر سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ ان سب باتوں پر عدالت بھی مزدوروں کی بات سننے کے بجائے سرمایہ داروں کے نقطۂ نظر سے فیصلہ سناتی ہے۔ آج حالات اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ زیادہ تر لوگ دو وقت کی روٹی کے لیے دن رات جدوجہد کر رہے ہیں، وہیں کورونا وبا کے دور میں بھارت کے سرمایہ داروں کی آمدنی کئی مرتبہ بڑھ گئی ہے۔

بہت سارے لوگوں کو ایسا لگتا ہے کہ سماجی انصاف کے لیے کام کرنا یا پھر لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے پالیسی بنانا وقت اور سرکاری پیسہ کی بربادی ہے۔ مگر یہ بات پوری طرح سے غلط ہے کہ سماج کے اندر غیر برابری پائی جاتی ہے۔ یہ غیر برابری کا نظام آسمان سے نہیں ٹپکا ہے، بلکہ کچھ مٹھی بھر لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے اسے بنایا ہے اور وہ اسے بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ سماج میں کوئی امیر گھر میں پیدا ہوتا ہے تو کوئی کھلے آسمان میں جنم لیتا ہے۔ کسی کو بچپن کے دنوں سے ہی اچھی خوراک اور بہترین تعلیم دی جاتی ہے، وہیں دوسری طرف دیگر ایسے بھی بچے ہیں، جن کے ماں باپ ان کو بھر پیٹ کھانا بھی نہیں دے پاتے ہیں۔ بہت سارے لوگ تو اپنے بچوں کو اسکول تک نہیں بھیج پاتے۔ اگر کچھ نے کوشش بھی کی تو ان کے بچوں کو سرکاری اسکول میں جانا پڑتا ہے، جہاں بنیادی سہولیات نہیں ہیں۔ اس طرح بچپن سے ہی دو سسٹم کام کرنے لگتا ہے۔ ایک کے لیے دنیا کی ساری سہولتیں ہیں اور دوسروں کے لیے تکلیفیں اور مشکلیں سامنے کھڑی ہیں۔ امیری غریبی کے علاوہ لوگوں کو ذات اور دھرم کے نام پر بھی امتیاز جھیلنا پڑتا ہے۔ اس بات کو ہمیں ہر وقت یاد رکھنا چاہیے کہ بھارت میں ۷۰ فیصد کے قریب دلتوں کو زمین میسر نہیں ہے۔ زیادہ تر دلت کھیت میں کام کرنے والے مزدور ہیں یا پھر فیکٹری یا شہر میں کام کرنے والے ورکر۔ چھوت چھات بھلے کسی قانون کی کتاب میں ایک جرم قرار دے دیا گیا ہو، مگر آج بھی بھارت سے یہ لعنت پوری طرح سے ختم نہیں ہو پائی ہے۔ آج بھی پڑھے لکھے لوگ بھی ذات اور دھرم کے تعصب سے اپنے آپ کو آزاد نہیں کر پائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سوشل نیٹ ورک کی بنیاد پر لوگوں کو کامیابی اور ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ سیاست سے لے کر کاروبار تک، میڈیا اور سینما سے لے کر یونیورسٹی اور عدالت تک آگے وہی آگے بڑھتا ہے جس کی ذات برادری کے لوگ پہلے ہی آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

اسی لیے ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے صاف طور پر کہا کہ ہندو سماج کے اندر جذبۂ اخوت کا فقدان ہے، کیونکہ یہاں لوگ اپنی ذات سے اوپر اٹھ کر نہیں سوچ پاتے ہیں۔ بھاجپا کے لوگ کھلے ہی دن رات قوم اور نیشن کی بات رٹتی رہتی ہیں اور قومیت کو سب سے اہم ترین نظریہ بنا کر پیش کرتی ہیں، مگر سچائی یہ ہے کہ بی جے پی میں بھی اعلیٰ ذاتوں کی ہی بالادستی ہے اور وہی سارے فیصلے لیتے ہیں۔ بقول سوشلسٹ نظریہ ساز ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، اگر آپ بھارت میں اعلیٰ ذات میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ انگریزی بولتے ہیں اور آپ مالدار بھی ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ ارباب اقتدار کے زمرے میں آتے ہیں۔ ذات، ملکیت اور کلچر کی بنیاد پر بھارت میں کچھ مٹھی بھر لوگ سارے وسائل پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں، جبکہ زیادہ تر لوگ آج بھی غربت اور عدم مساوات کے شکار ہیں۔

آج بھارت میں آزادی کے ۷۰ سال سے بھی زیادہ کا وقت گزر چکا ہے اور اب تو انگریز بھی آس پاس نہیں ہیں کہ ان کو ساری دقتوں کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت میں جو کچھ بھی برا ہو رہا ہے اس کے لیے سب سے زیادہ ذمہ دار خود بھارت کی حکمراں جماعت ہے، جس نے اکثر اپنی اور اپنی ذات کے مفاد کو آگے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت میں سب کچھ ہونے کے باوجود بھی ہم ترقی یافتہ ملک نہیں بن پائے ہیں اور دنیا کی ایک بڑی غریب اور بیمار آبادی یہیں بستی ہے۔ ہم پریشان ہیں کیونکہ ہمارے لیڈروں کے دل میں کھوٹ ہے اور وہ انصاف کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اگر بھارت کو ایک مضبوط جمہوریت اور مساوی سماج بنانا ہے تو ارباب اقتدار کو صرف امیروں کی جھولی بھرنے سے گریز کرنا ہوگا۔ ترقی کے تار انصاف سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں۔)

www.dawatweekly.com - www.dawatnews.net

Vol No:(41) Issue No:(19) 10 May to 16 May 2020 Pages:24 Rs:15/-

جلد نمبر:(۴۱) شمارہ نمبر:(۱۹) تاریخ ۱۶ تا ۲۲ ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ صفحات: ۲۴ قیمت: ۱۵ روپیے

اہم ترین

صفحہ 2-3

دستور زباں بندی!

اس شمارے میں

اس شمارہ میں مزید پڑھنے لائق:

اقلیتوں کی آواز کو خاموش کرنے کی سازش

دہلی اقلیتی کمیشن کے چیرمین ظفر الاسلام خان پر بغاوت کا کیس

ابھے کمار، دلی

سنیچر کی صبح جب آنکھ کُھلی اور موبائیل پر ایک دوست کا میسج دیکھا تو دل رنجیدہ ہو گیا۔ حالاں کہ جو کچھ بھی پڑھا اس کا خدشہ دل میں پہلے سے تھا۔ میسج "ہندوستان ٹائمز" ۲ مئی کی ایک خبر تھی جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوا کہ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے خلاف ملک سے بغاوت (sedition) اور دو فرقوں کے درمیاں منافرت پھیلانے کا کیس درج کیا گیا ہے۔ خبر پڑھ کر میں تھوڑی دیر کے لیے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

دل میں یہ سوال بار بار اٹھ رہا تھا کہ آخر یہ ملک کس سمت میں جا رہا ہے؟ جب آئینی منصب پر فائز کوئی شخص اپنی رائے دینے پر ملک کا "باغی" قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر عام لوگوں کی اظہار رائے کا دفاع کون کرے گا؟ اظہار رائے ہی نہیں ملک کا آئین اظہار اختلاف (dissent) کو بھی جمہوریت کا ایک اہم جز قرار دیتا ہے۔ اگر اقلیتوں کے حقوق کی بات کرنے کی "پاداش" میں اقلیت کمیشن کے سربراہ کو بغاوت کا ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور ان کی گرفتاری کے لیے راستے ہموار کیے جا سکتے ہیں تو عام انسان، بالخصوص محکوم طبقات کی بولنے کی آزادی کا کون محافظ ہوگا؟ یہ سوال بڑی دیر تک میرے دل ودماغ میں گشت کرتا رہا۔ یہ سوال ملک کے جمہوری اور انصاف پسند لوگوں کو بھی بے چین کیے ہوئے ہے۔ انہوں نے بھی ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے دفاع میں بیانات جاری کیے ہیں۔ یہ کتنی افسوس کی بات ہے کہ برسر اقتدار بھگوا طاقتیں اپنے مخالفین کے خلاف انتقامی جذبے سے کارروائی وبا کی حالت میں بھی کر رہی ہیں۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر ظفر الاسلام خان پر حملے کو اقلیتوں اور مظلوموں کے خلاف حملے سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اپنی پوری زندگی میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خان محکموں کے حق کے لیے آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ وہ عربی اور انگریزی کے بڑے صحافی بھی ہیں۔ وہ ۱۶ سالوں تک انگریزی کے مشہور میگزین "ملی گزیٹ" کے مدیر رہے ہیں۔ انہوں نے عربی، انگریزی، اردو میں ۵۰ بھی زیادہ کتابیں لکھی ہیں جو کئی یونیورسٹیوں میں درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہیں۔ انہوں نے ملک وملت کے اہم مسائل پر اہم کتابیں اور دستاویز بھی شائع کیے ہیں جن کا حوالہ خوب دیا جاتا ہے۔ ملی تنظیم "آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت" کے وہ سابق صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے اور بھی علمی وادبی کارنامے ہیں۔ وہ غریبوں اور مفلسوں کی مدد کے لیے بھی سرگرم رہے ہیں۔ اتنی بڑی شخصیت کے اوپر ہو رہے رکیک قسم کے حملے کو دیکھ کر بڑی کوفت ہو رہی ہے۔

میڈیا کی خبر کے مطابق ان کے خلاف ایف آئی آر جنوبی دہلی کے بسنت کنج پولیس تھانہ میں درج کیا گیا ہے۔ اب یہ کیس دہلی پولیس کی اسپیشل سیل کو بھیج دیا گیا ہے، جو انسداد دہشت گردی سے متعلق امور کی تفتیش کرتا ہے۔ دہلی اسپیشل سیل کے جوائنٹ کمشنر نیرج ٹھاکر نے اس بات کی تصدیق کی کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے خلاف تعزیرات ہند کی دفعہ A۱۲۴ (بغاوت) اور A۱۵۳ (دو فرقوں کے درمیاں منافرت پھیلانے) کے تحت مقدمہ درج کیا گیا ہے۔ تعزیرات ہند کی دفعہ A۱۲۴ کا جرم ثابت ہونے پر انہیں ۳ سال کی قید یا جرمانہ اور قید دونوں کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں تک کہ عمر قید کی سزا بھی مل سکتی ہے۔ A۱۵۳ میں ۳ سال کی قید، جرمانہ اور قید یا پھر ۵ سال کی قید ہو سکتی ہے۔

۲۸ اپریل کو پوسٹ کیے گیے ان کے ٹویٹ کے بعد سے ہی ہندو فرقہ پرست ان کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ ان کے موقف کو سچ بنانے کے لیے میڈیا کا ایک حصہ بھی ساتھ ہے۔ کئی دنوں سے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے خلاف زہر افشانی کی جا رہی ہے۔ ان کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹے اور غلط الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ ان کے مسلم تشخص کا "دیو" کھڑا کیا جا رہا ہے۔ ہندی کے بعض نیوز چینلوں نے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کی حب الوطنی پر بھی سوال اٹھائے ہیں۔ "کھائیں گے ہندوستان کا اور گائیں گے عرب کا" کے عنوان سے ایک مشہور ہندی چینل نے پروگرام نشر کیا۔ پھر ایک دوسرے ہندی چینل نے معاملے کو اسی طرح فرقہ وارانہ رنگ دیتے ہوئے کہا "مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ سیاست کیوں؟"

گزشتہ کئی سالوں سے یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ہندی چینل صحافت کے بجائے برسر اقتدار بھگوا طاقتوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن گیا ہے۔ سرکار سے فائدے حاصل کرنے کی خاطر اور ٹی آر پی بڑھانے کے لیے وہ ہر بات کو فرقہ پرستی کے زہر میں گھول دیتا ہے۔ وہ مسلم مخالف ایجنڈے کو مرچ مسالہ لگا کر ایسا پیش کرتا ہے کہ سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے ساتھ بھی دیکھا جا رہا ہے۔ اپنے فائدے کی خاطر یہ ہندی چینل اس بات کو فراموش کر چکا ہے کہ اس سب کا بڑا نقصان جمہوریت کا ہو رہا ہے۔ ان سب سے عوام کی رائے متعصب ہو رہی ہے اور ان کے اندر ایک خاص مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے خلاف بہت زیادہ غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا کہ جو کچھ بھی میڈیا دکھا رہا تھا اس کی تصویر فرقہ پرست طاقتوں نے پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔

در اصل ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے خلاف بھگوا طاقتیں کام کر رہی ہیں۔ یکم مئی کو "دینک جاگرن" میں چھپی خبر کے مطابق، دہلی بی جے پی کے ارکان اسمبلی نے ایل جی انیل بیجل سے ملاقات کی اور ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کو اقلیتی کمیشن کی چیرمین شپ کے عہدے سے برخاست کرنے اور ان کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے کا مطالبہ کیا۔ دہلی اسمبلی کے حزب اختلاف کے لیڈر رام ویر سنگھ ودوڑھی اور ایم ایل اے وجیندر گپتا نے راج نواس جا کر ڈاکٹر ظفر الاسلام کے خلاف تحریری شکایت کی اور کہا کہ انہوں نے بھارت سرکار کو مسلم مخالف بتا کر "راجدروہ" (بغاوت) کی ہے۔ بی جے پی کے ارکان اسمبلی نے یہ بھی الزام لگایا کہ انہوں نے سوشل میڈیا پر ملک کی شبیہ خراب کی ہے اور ملک کے امن وامان کو خطرے میں ڈالنے کی سازش کی ہے۔

سوشل میڈیا پر بھگوا شدت پسندوں نے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے خلاف آگ اگلنے میں ساری حدیں پار کر دی ہیں۔ "ہیٹ سپیچ" کے بہانے ڈاکٹر ظفر الاسلام کو نشانہ بنانے والے فرقہ پرست خود نفرت انگیز اور اشتعال انگیز پوسٹ ڈال رہے ہیں۔ ٹی وی شو میں بی جے پی کا چہرہ سمبیت پاترا نے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کو ذاکر نائک کو "ہیرو" کہنے کی مذمت کی ہے۔ بی جے پی سے وابستہ سپریم کورٹ کی وکیل مونیکا اروڑا نے ان پر ہیٹ سپیچ دینے کا الزام لگایا اور ان پر مقدمہ درج کرنے کا مطالبہ کیا۔ بی جے پی کی حامی "سواراج" نیوز ویب پورٹل کی سینئر ایڈیٹر اری ہنت پوریا نے ۳۰ اپریل کے لکھے ہوئے ایک مضمون میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے بہانے عام آدمی پارٹی اور کانگریس کو بھی نشانہ بنایا۔ پھر سوشل میڈیا پر بہت سارے ایسے پوسٹ بھی گھمائے گئے جس میں حکومت اور پولیس کو کھلے عام دھکی دی گئی کہ "ہندوستان میں رہ کر ہندوؤں کو ہی دھمکانے کی بات کرنے والوں پر کارروائی کب ہوگی"؟

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے آخر کیا کہہ دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے خلاف سخت ترین کارروائی کی بات کی جا رہی ہے؟ ۲۸ اپریل کے روز ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے ایک پوسٹ سوشل میڈیا پر ڈالا جس میں انہوں نے "ہندی مسلمانوں کے ساتھ کھڑا ہونے کے لیے کویت کا شکریہ ادا کیا"۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہندو شدت پسند (bigots) یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ ہندوستانی مسلمان عرب اور دنیا کے مسلمانوں کی نظروں میں دوست (goodwill) سمجھے جاتے ہیں کیونکہ انہوں نے ہزاروں سالوں سے اسلامی ادب، عربی زبان کی خدمت کی ہے۔ انہوں نے آخری جملوں میں شدت پسندوں کو متنبہ کیا کہ ابھی تک ہندی مسلمانوں نے اپنے اوپر ہو رہی فرقہ پرستوں کے نفرت انگیز مہم کی شکایت عرب اور مسلم دینا میں نہیں کی ہے۔ جس دن ایسا کرنے کے لیے مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے گا اس دن شدت پسند برفانی تودے کی کیفیت محسوس کریں گے۔ یہ پوسٹ عرب ممالک میں "اسلاموفوبیا" کے خلاف چل رہی مہم کے بہت بعد آیا۔ اسلاموفوبیا کے خلاف اس مہم کی زد میں ہندو شدت پسند عناصر اور ان کی تنظیمیں ہیں۔ سوشل سائنس کی اصطلاح میں اسلاموفوبیا کا مطلب ہے مسلمان اور اسلام کے خلاف نفرت انگیز خیالات یا تعصب کا اظہار کرنا جن کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں ہے۔ ہندوستان کی فرقہ فرست طاقتیں مسلسل مسلمانوں کے خلاف جھوٹے اور بے بنیاد الزامات لگا کر بدنام کرتی رہتی ہیں۔ وہ مسلمانوں کو بھارت کی ساری پریشانیوں کا قصوروار بھی گردانتی ہیں اور غیر مسلمانوں کو مسلمانوں کا ڈر دکھا کر ووٹ بٹورنا چاہتی ہیں۔ وہ یہ سب نادانی میں نہیں کرتیں بلکہ یہ ایک منصوبے اور سازش کے تحت ایسا کیا جاتا ہے۔

ایسا کر کے وہ اقتدار میں قابض تو ہو گئی ہیں مگر اس کا بڑا منفی اثر دیگر جگہوں پر نظر آ رہا ہے۔ بھارت کی شبیہ باہر کے ملکوں میں دن بدن خراب ہو رہی تھی۔ عرب کے مسلمان بھارت کو اپنا دوست سمجھتے ہیں مگر یہاں بڑھ رہی فرقہ پرستی اور اسلاموفوبیا کے واقعات کو دیکھ کر نالاں ہیں اور ایسا ہونا کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ یوروپ اور امریکہ بھی بھارت میں بڑھ رہی عدم رواداری پر اپنے اعتراضات ظاہر کرتے رہے ہیں۔ یہ سب کسی بھی محب وطن کے لیے دکھ کی بات ہے، مگر اس کا علاج باہر کے ملکوں کو برا بھلا کہنے سے پہلے ملک کے اندر جاری نفرت کی سیاست کو ختم کرنا ہے۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ ارباب اقتدار سماج میں پھیل رہی عدم رواداری اور فرقہ پرستی کو تسلیم کرنے سے ہمیشہ کتراتے رہے ہیں۔ عرب ملکوں میں اسلاموفوبیا کے خلاف مہم کی چنگاری لگانے میں فرقہ پرستوں کا ہی ہاتھ ہے۔ بی جے پی کے جنوبی بنگلور کے ایم پی تیجسوی سوریہ نے پانچ سال پہلے ایک بے حد گھٹیا ٹویٹ کیا تھا جس کو ان دنوں کھود کر نکال لیا گیا ہے۔ اس ٹویٹ نے عالم عرب کے غصے کو شعلے کی شکل دے دی ہے۔ یہ ٹویٹ تیزی سے شئیر ہوا اور بھگوا شدت پسند تنظیم پر اسلاموفوبیا کے چارج لگائے گیے۔ سوشل میڈیا پر سرگرم کویت کے عبد الرحمن النصار، مجمل الشارکہ نے اس مہم کی قیادت کی۔ پھر کچھ روز بعد ۱۹ اپریل کو آرگنائزیشن آف اسلامک کوآپریشن (او آئی سی) نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ وہ اسلاموفوبیا کے اٹھتی موج کو روکے اور مظلوم اقلیت، مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرے"۔

جو لوگ اس پروپیگنڈے کو سچ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے بھارت کو باہر کے ملکوں میں بدنام کیا ہے وہ دھیان دیں کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے متنازعہ پوسٹ سے تقریباً ۱۰ دن پہلے سے ہی اسلاموفوبیا کے خلاف مہم چل رہی تھی اس لیے یہ بات قابلِ یقین نہیں ہے کہ اگر ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کا پوسٹ سامنے نہیں آتا تو دنیا کو کچھ بھی خبر نہ ہوتی۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان سے پہلے کئی لوگوں نے بھارت میں جاری مسلم مخالف سرگرمیوں کو تسلیم کیا ہے۔ مثال کے طور پر انگریزی کی مشہور ناول نگار اور سماجی جہد کار اروندھتی رائے نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کے خلاف بھارت میں نفرت انگیز مہم چل رہی ہے۔ اس پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ سب کچھ فروری میں مسلم مخالف تشدد کے فوراً بعد اور اب کورونا وبا کے درمیان ہو رہا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ اروندھتی رائے کا یہ بیان ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے پوسٹ سے ۱۰ روز پہلے آیا تھا۔ خود آر ایس آیس کے سربراہ موہن بھاگوت نے بھی اشاروں اشاروں میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہے بھید بھاو کو تسلیم کیا اور اپنے کارکنان سے کہا کہ وہ بغیر بھید بھاو کے لوگوں کی مدد کریں کیونکہ "وہ ہمارے ہیں" ("جن ستا"، ۲۶ اپریل)۔

اس کے بعد یونائیٹڈ اسٹیٹ کمیشن فار انٹرنیشنل ریلیجیس فریڈم (یو ایس سی آئی ایف) نے اپنی رپورٹ میں دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت بھارت کو ۱۴ ایسے ملکوں کی فہرست میں ڈال دیا ہے جہاں مذہبی آزادی کو خطرہ ہے" ("دینک جاگرن"، ۲۹ مئی)۔ اس طرح آپ دیکھ سکتے ہیں کہ فرقہ پرستوں کی یہ دلیل سچ پر مبنی نہیں ہے کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے پوسٹ کی وجہ سے بھارت کا نام دنیا میں بدنام ہوا۔ عرب ممالک کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک بھی بھارت میں مسلمانوں کے خلاف ہو رہے تعصب اور تشدد کو نوٹ کر رہے ہیں۔ حالیہ دنوں میں مسلمان ایک کے بعد ایک پریشانی سے دوچار ہوئے ہیں۔ پہلے شہریت ترمیمی قانون کی مخالفت کرنے کے الزام میں ان کو بدنام کیا گیا اور ان پر پولیس کے ڈنڈے برسائے گئے۔ پھر فروری میں دہلی فسادات رونما ہوئے۔ سلسلہ صفحہ نمبر ۳

"نفرت کے ایجنڈے کے خلاف میری جدوجہد جاری رہے گی" ظفر الاسلام خان

Dawat Weekly Exclusive Interview

کیا آپ نے کبھی سوچا تھا کہ آپ کے خلاف بغاوت اور دو فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانے کا مقدمہ درج ہوگا؟

ج: میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ہم ایک آزاد ملک کے شہری ہیں جہاں محض کچھ کہنے پر کوئی بازپرس نہیں ہوتی بلکہ کسی غلط اور پر تشدد عمل کی بنیاد پر ہی کوئی قانونی کارروائی حکومت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ہمارے لب بھی آزاد نہیں ہیں۔ اس صورت حال میں ہم کو اپنے حقوق کے لیے لڑائی جاری رکھنی ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں ایک آزاد ہندوستان میں جی سکیں۔ ہر حق کے لیے لڑنا ہوتا ہے۔ لڑائی کے بغیر کوئی حق نہیں ملتا ہے۔

کیا آپ کو ایف آئی آر کی کاپی مل گئی ہے؟ آپ آگے کیا کرنے جا رہے ہیں؟

ج: نہیں مجھے ابھی تک سرکاری طور سے ایف آئی آر کی کاپی نہیں ملی ہے۔ جب بھی پولیس کی طرف سے مجھے بلایا جائے گا میں ان سے پورا تعاون کروں گا۔ اسی کے ساتھ اس کیس کو مضبوطی سے قانونی طور پر لڑا جائے گا۔ اس کام کے لیے ایک اچھے وکیل کا انتخاب ہو چکا ہے۔ مزید برآں جس نیوز چینل نے سب سے زیادہ گمراہ کن باتیں پھیلائی تھیں اس کے خلاف بھی قانونی نوٹس بھیجا جا چکا ہے۔

کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ ایک سازش کا شکار بنے ہیں؟

ج: کویت کا ایک ٹویٹ کے ذریعے شکریہ تو محض ایک بہانہ تھا۔ در اصل ایک لابی اور ایک خاص سوچ رکھنے والے لوگ کمیشن میں میرے کام سے پریشان تھے۔ ٹویٹ سے ان کو موقع مل گیا اور گودی میڈیا نے جھوٹ کا سہارا لے کر بات کا بتنگڑ بنا دیا اور اس پروپیگنڈے کو استعمال کر کے پولیس اور حکومت میں شکایت درج کرائی گئی۔ اگر ٹویٹ نہ بھی ہوتا تو اس لابی کو کوئی نہ کوئی چیز مل ہی جاتی کیوں کہ اس لابی کو خوف تھا کہ کہیں کمیشن کی موجودہ مدت کار اگلی جولائی میں ختم ہونے کے بعد دوبارہ مجھے ہی صدر نہ بنا دیا جائے۔ اس ہنگامے سے اب یہ امکان پوری طرح سے ختم ہو گیا ہے۔

جب آپ جیسے لوگ محفوظ نہیں ہیں تو ملک کے عام مسلمانوں کا کیا ہوگا؟

ج: عام مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک ہو رہا ہے وہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ لو جہاد، ماب لنچنگ، گھر واپسی، فسادات اور سماجی وتجارتی بائیکاٹ وغیرہ کی صورت میں اس کا عام مسلمان ہر روز سامنا کر رہا ہے۔ پھر بھی حکومت کے بھونپو کہتے ہیں کہ ہندوستان مسلمانوں کے لیے جنت ہے۔

آپ نے اپنے متنازعہ ٹویٹ کے لیے معافی بھی مانگ لی ہے مگر پھر بھی کچھ لوگوں کو یہ لگتا ہے کہ آپ نے آئینی منصب پر رہتے ہوئے ایک بڑی غلطی کی ہے۔ آپ ان سے کیا کہنا چاہیں گے؟

ج: میں نے اپنے ٹویٹ کے لیے کوئی معافی نہیں مانگی اور نہ ہی اس ٹویٹ کو اپنے ٹویٹر ہینڈل یا فیس بک سے ہٹایا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ موجودہ کورونا ایمرجنسی کے دوران مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی جبکہ ساری حکومتی اور عوامی توجہ اس وبا سے لڑنے پر لگی ہوئی ہے اور اسی لیے میں نے ایسے وقت میں یہ بات کہنے پر معافی مانگی ہے، ورنہ میں اپنی اصل بات پر اب بھی قائم ہوں اور نفرت کے ایجنڈے کے خلاف میری جدوجہد پہلے ہی کی طرح جاری رہے گی۔

آپ انصاف پسند، سیکولر طاقتوں اور ملی رہنماؤں کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

ج: آج ہمارے ملک پر ایک مشکل وقت آیا ہوا ہے۔ اگر ہمیں ملک میں سیکولرزم، رول آف لا اور انسانی حقوق کی حفاظت مطلوب ہے تو اس کے لیے بولنا ہوگا، قربانی دینی ہوگی اور قربانی دینے والوں کے ساتھ کھڑا ہونا ہوگا۔

***

ہندوستان، اسلاموفوبیا اور خلیجی ممالک

کون کس کی بھینٹ چڑھایا جارہا ہے؟

عبدالواحد

کوروناوائرس اور لاک ڈاؤن کے بعد اگر کوئی موضوع اس وقت میڈیا میں چھایا ہوا ہے تو وہ ہے اسلاموفوبیا سے متعلق سوشل میڈیا پر خلیجی ممالک میں مقیم ہندوستانیوں کے پوسٹ اور اس پر خلیجی ممالک کی با اثر شخصیات کا شدید رد عمل۔ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک طبقہ اس رد عمل سے اس قدر زیادہ پر جوش ہوا ہے کہ اس کے نتیجے میں دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ظفرالاسلام خان اس کی بھینٹ چڑھتے نظر آرہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مبینہ قومی غلام میڈیا نے ان کا باقاعدہ ٹرائل شروع کر رکھا ہے اور بی جے پی نے ان پر عہدے کا غلط استعمال کرنے کا الزام عائد کرتے ہوئے مستعفی ہونے تک کا مطالبہ کر ڈالا ہے۔ ٹرول آرمی کو بھی ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں کے پیچھے لگا دیا گیا ہے جو ان کے فیس بک پیج کی ٹائم لائن پر شر انگیزی برپا کیے ہوئے ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ تبلیغی جماعت کے معاملے کے بعد گودی میڈیا کو ایک نیا موضوع ہاتھ لگ گیا ہے۔ دراصل متعصب میڈیا ملک کے دیگر چینلوں اور اخبارات میں خلیجی ممالک کے افراد کے رد عمل کو ملنے والے کوریج سے پریشان تھا۔ خاص طور پر متحدہ عرب امارات کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والی شہزادی ہند القاسمی کے انٹرویوز۔

سوشل میڈیا پر جاری مباحثے نے جو سب بڑا کام کیا وہ یہ ہے کہ اس نے خلیجی ممالک میں کام کرنے والے اور اونچے عہدوں پر فائز اکثریتی طبقے

> متحدہ عرب امارات ایک چوٹی کے ہندوستانی تاجر بی آر شیٹی کے لاک ڈاؤن سے پہلے یعنی مارچ کے اوائل میں ہندوستان فرار ہونے سے شدید برہم ہے۔ اس پر تقریباً ۶ بلین ڈالر قرض لینے کا الزام ہے۔ جسکی واپسی میں بے انتہا تساہلی کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ فی الحال اماراتی حکومت نے این ایم سی ہیلتھ کیئر گروپ سمیت اسکے بیشتر اثاثے منجمد کردیے ہیں۔

سے تعلق رکھنے والے افراد میں بھی مسلمانوں کے تعلق سے پائی جانے والی نفرت کو اجاگر کیا ہے۔ اب تک یہ تصور تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد، بالخصوص بیرونی ممالک میں ملازمت یا دیگر وجوہات سے قیام پذیر افراد مذہبی انتہا پسندی سے پاک ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے۔ ایک بین الاقوامی حیثیت (عیسائیوں یا مسلمانوں کی طرح) نہ رکھنے کے باوجود ہندتوا نظریے کے علم بردار دنیا کے مختلف ممالک بشمول عالم عرب میں جڑیں مضبوط کر چکے ہیں۔ حالیہ دنوں میں جس کی رپورٹ میڈیا میں بھی آچکی ہے، متحدہ عرب امارات میں مہاراشٹرا کے ناسک سے تعلق رکھنے والے ایک صنعت کار سدھیر پربھاکر پجاری کی گرفتاری سے متعلق ہے۔ میڈیا ذرائع کے مطابق یہ شخص بظاہر صنعت کار ہے لیکن دراصل یہ وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس سے بہت گہری وابستگی رکھتا ہے۔ یہ متحدہ عرب امارات میں خلیجی ممالک میں ہندتوا علم برداروں کے لیے ایک مرکز کے قیام کے لیے کوشاں تھا۔ تاہم اس کی گرفتاری دیگر الزامات کے تحت ہوئی ہے۔ دبئی پولیس نے شاہی خاندان کے افراد کی شکایت پر اسے گرفتار کیا ہے۔ اس پر الزام تھا کہ یہ شاہی خاندان کے کچھ افراد سے روابط کی آڑ میں خطیر رقم اکٹھا کرتا تھا۔ حکومت ہند نے اس کی رہائی کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے یہاں تک کہ دبئی میں ہندوستانی قونصل خانے کے سربراہ وپل کو بھی اس کام پر لگا دیا، لیکن دبئی پولیس ٹس سے مس نہیں ہوئی ہے۔ متحدہ عرب امارات ایک چوٹی کے ہندوستانی تاجر بی آر شیٹی کے لاک ڈاؤن سے پہلے یعنی مارچ کے اوائل میں ہندوستان فرار ہونے سے شدید برہم ہے۔ اس پر شاہی خاندان کے افراد کے اثر ورسوخ کا حوالہ دے کر متحدہ عرب امارات کے مختلف بینکوں سے تقریباً ۶ بلین ڈالر قرض لینے کا الزام ہے۔ جس کی واپسی میں بے انتہا تساہلی کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ فی الحال اماراتی حکومت نے این ایم سی ہیلتھ کیئر گروپ سمیت اس کے بیشتر اثاثے منجمد کر دیے ہیں۔ یہاں تک کہ متحدہ عرب امارات کے مرکزی بینک نے اس سلسلے میں برطانوی حکومت کو بھی آگاہ کیا اور برطانیہ میں بھی شیٹی کی کمپنیوں کے خلاف کارروائی شروع کردی گئی ہے۔

حالیہ برسوں میں جس طرح سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بحرین وغیرہ نے مودی کو اپنے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا اس کے بعد اب عرب ممالک میں آر ایس ایس کے نظریات کے خلاف سوشل میڈیا پر سیلاب کو غیر متوقع ضرور کہا جاسکتا ہے۔

دراصل اس کا آغاز تبلیغی جماعت معاملے سے ہوا جب ہندوستانی میڈیا میں کوروناوائرس کے پھیلاؤ کے لیے تبلیغی جماعت کو مورد الزام ٹھیرایا گیا۔ خلیجی ممالک میں بڑی تعداد میں اور بعض مقامات پر مختلف کمپنیوں میں اہم عہدوں پر فائز افراد نے بھی ہندوستانی میڈیا کے سُر میں سُر ملاتے ہوئے نہ صرف تبلیغی جماعت بلکہ اسلامی اقدار کو بھی ہدف تنقید بنانا شروع کیا۔ اس پورے معاملے نے نیا رخ اس وقت اختیار کر لیا جب بنگلور سے بی جے پی کے ایک رکن پارلیمنٹ تیجسوی سوریہ کا ایک کئی برس پرانا ٹویٹ وائرل ہوا جس میں کینیڈا میں مقیم پاکستانی طارق فتح کو ٹیگ کرتے ہوئے سوریہ نے عرب خواتین کے تعلق سے انتہائی توہین آمیز ریمارک کیا تھا۔ اس کے بعد سے تو عرب سوشل میڈیا پر طوفان آگیا۔ کویت کی بار کونسل نے تو وزیر اعظم مودی کو ٹیگ کرتے ہوئے تیجسوی سوریہ کے خلاف کاروائی تک کا مطالبہ کر ڈالا۔ عرب ممالک میں یہ تقریباً ناممکن ہے کہ آپ ان ممالک کے خلاف کسی بھی قسم کی رائے زنی کریں جن سے حکومتوں کے وسیع تر مفادات وابستہ ہوں۔ اسی لیے ایسا لگ رہا ہے کہ خلیجی ممالک کی حکومتوں کی طرف سے اس طرح کی ٹویٹ کے لیے ہری جھنڈی دکھائی گئی ہے۔

> اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مختلف خلیجی ممالک سے ہندوستانیوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ ہندوستانی بحری بیڑوں کے علاوہ فضائیہ اور ایئر انڈیا کے تقریباً ۵۰۰ سے زائد ہوائی جہاز خلیجی ملکوں سے ہندوستانیوں کو نکالنے کے لیے کمربستہ ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ وزیر اعظم مودی سے لے کر وزیر خارجہ ایس جے شنکر تک کو متحرک ہونا پڑا۔ خلیجی رہنماؤں سے بات کرنی پڑی اور نہ چاہتے ہوئے بھی یہ کہنا پڑا کہ کوروناوائرس کے پھیلنے کا تعلق کسی خاص مذہب یا طبقے سے نہیں ہے۔ خلیجی ممالک میں موجود ہندوستانی سفیروں نے بھی وہاں مقیم ہندوستانیوں سے اپیل کی کہ وہ مذہبی منافرت سے دور رہیں اور کسی متنازعہ چیز کو پوسٹ نہ کریں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مختلف خلیجی ممالک سے ہندوستانیوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے۔ ہندوستانی بحری بیڑوں کے علاوہ فضائیہ اور ایئر انڈیا کے تقریباً ۵۰۰ سے زائد ہوائی جہاز خلیجی ملکوں سے ہندوستانیوں کو نکالنے کے لیے کمر بستہ ہو چکے ہیں۔ متحدہ عرب امارات کے علاوہ عمان نے بھی اپنے ہاں مقیم لاکھوں غیر ملکیوں بشمول ہندوستانیوں کو نوکریوں سے نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ متحدہ عرب امارات نے تو دھمکی بھی دی ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں موجود غیر ملکی افراد کو ان کے ممالک نے واپس نہیں لیا تو وہ ان سے ملازمتوں کے تعلق سے معاہدے ختم کرنے پر غور کرے گا۔

دراصل کئی برسوں سے جاری معاشی سست روی نے عالمی معیشت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ عرب ممالک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ وہ کئی برسوں سے غیر ملکیوں کو نکالنے اور اپنے شہریوں کو ملازمت کی

Princess Hend Al Qassimi
@LadyVelvet_HFQ
Anyone that is openly racist and discriminatory in the UAE will be fined and made to leave. An example:
Saurabh Upadhyay
Muslims must stop finding ways to defend tabligis, the damage has already been done the least you can do is accept and condemn it & not behave like religious fanatics,no hindu supports a criminal like asharam, similarly you should also stop licking terrorist maulana saads bottom.
Saurabh Upadhyay
What's with peaceful people and spitting ? New form of jiihaad custom made for 2020? I though they were still stuck 1400 years in past & dint

طرف مائل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ کوروناوائرس اور پھر اسلاموفوبیا سے متعلق پوسٹوں نے خلیجی ممالک کو ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد کو باہر کا راستہ دکھانے کا نادر موقع عنایت کر دیا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت ہند ان ممالک سے واپس آنے والے افراد کو کہاں کام پر لگاتی ہے۔ ابھی تو بہت سے افراد کو کوارنٹین میں رکھنا ہوگا۔ اس کے لیے متعدد ریاستوں سے مرکزی حکومت نے بات کی ہے۔

چونکہ گزشتہ کئی دہائیوں سے مسلمانوں پر ہو رہے مظالم چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہوں، عرب حکمرانوں کا رویہ مایوس کن رہا ہے اس لیے موجودہ حالات پر کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ ترکی، ملائشیا، ایران اور پاکستان جیسے جمہوری ممالک کے درمیان بڑھتی نزدیکیوں کو او آئی سی کے متبادل کے طور پر دیکھا جارہا ہو جس کی ایک میٹنگ چند ماہ قبل ملائیشیا میں ہوئی تھی اور جس نے عرب ممالک کے کان کھڑے کر دیے تھے جس سے انہیں عالم اسلام کے خود ساختہ لیڈر ہونے کا زعم بکھرتا ہوا نظر آیا ہو اس لیے اس طرح کا رد عمل سامنے آرہا ہو۔ بہر حال ہندوستانی مسلمانوں کو اس سلسلے میں محتاط حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

(مضمون نگار ڈی اے وی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں۔ مضمون نگار کی یہ ذاتی آراء ہیں۔ اس سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

***

بسلسلہ صفحہ نمبر۲

فساد کی آگ ابھی بجھی بھی نہ تھی اور مسلمانوں کی آہیں اور سسکیاں تھمی بھی نہ تھیں کہ کوروناوبا کو پھیلانے کا الزام ان پر تھوپ دیا گیا۔ پھر ان کو "وائرس" کہہ کر گالیاں دی گئیں۔ پھر حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ مسلمانوں کو بعض علاقوں میں داخل ہونے سے روکا گیا ان کا معاشی بائیکاٹ کیا گیا۔ افسوس کی بات ہے کہ بھگوا شدت پسند لیڈر بڑی بے شرمی سے لوگوں (ہندوؤں) سے یہ اپیل کر رہے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے سبزی نہ خریدیں۔ کیا اندھے بھکت یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا بھی ان کی طرح اندھی ہے اور ان واقعات سے نابلد ہے؟

اتنا ہی نہیں وبا کے درمیان جہاں دوسرے ملکوں کی حکومتیں قیدیوں کو جیل سے رہا کرنے کے اقدامات کر رہی ہیں، وہیں ہمارے ملک کی حکومت اپنے حریفوں سے جیلوں کو بھر رہی ہے۔ دہلی میں دنگا کرانے والے فرقہ فرست عناصر آزاد گھوم رہے ہیں۔ ان میں سے کئی کو تو ہندو سماج کا "ہیرو" بنا کر پیش کیا جارہا ہے مگر سیکولرازم اور آئین کی لڑائی لڑنے والے جہد کاروں کو جھوٹے مقدموں میں پھنسایا جارہا ہے۔ حکومت کی توانائی وبا سے لڑنے میں کم اور اپنے ناقدین سے لڑنے میں زیادہ خرچ ہوتی دکھائی رہی ہے۔ بغاوت اور یو اے پی اے جیسے کالے قوانین کا بے جا استعمال کیا جارہا ہے۔ خاص کر ابھرتے ہوئے نوجوان مسلم لیڈروں کی زندگی برباد کی جارہی ہے۔ حکومت کے نشانے پر وہ سبھی لوگ ہیں جو ان کی ہر بات پر تالی نہیں بجاتے۔ کیا ان باتوں کی خبر دنیا نہیں لے رہی ہے اور بھارت کی شبیہ خراب نہیں ہو رہی ہے؟ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کا مذکورہ پوسٹ اگر نہیں بھی آتا تب بھی دنیا کو بھارت میں مسلمانوں کی حال زار کی خبر تھی۔

مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کو ابھی بھی لگتا ہے کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کو یہ پوسٹ منظر عام پر لانے کا یہ معقول وقت نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس پوسٹ کے الفاظ کا انتخاب اور بہتر ہو سکتا تھا۔ ان باتوں سے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان شاید باخبر تھے۔ لہٰذا انہوں نے خود آگے آ کر معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا انہوں نے نیک نیتی سے کیا۔ وہ نہیں چاہتے کہ وبا کی حالت میں کوئی تنازعہ پیدا ہو۔ پھر انہوں نے بہت سارے پوسٹ ڈالیں اور اپنے موقف سے ایک حد تک رجوع بھی کیا اور جن کو ان کا پوسٹ ناگوار گزرا ان سے معافی بھی مانگ لی۔ انہوں نے فرقہ پرستوں کے پروپیگنڈے سے پیدا ہوئے تذبذب کو دور کرنے کے لیے یہ بات پھر دہرائی کی وہ ایک محب وطن ہیں اور ان کو ملک کے جمہوری نظام پر پورا یقین ہے۔ "میں نے اپنے ملک کے خلاف کبھی بھی کسی بیرونی حکومت سے شکایت نہیں کی ہے اور مستقبل میں ایسا کرنے کا میرے کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں ایک محب وطن ہوں اور میں نے اپنے ملک کا دفاع ہمیشہ باہر کے ملکوں میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ملک کے مسائل کو پر ہمیشہ بولتا رہا ہوں، مجھے ملک کے سیاسی نظام، آئین، عدلیہ میں پورا یقین ہے جو ان مسائل کا حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے"۔ انہوں نے یہ بھی یاد دلایا کہ کرگل جنگ، مسئلہ کشمیر اور دیگر ایشوز پر وہ عربی میڈیا میں بھارت کے موقف کا دفاع کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ہندی مسلمانوں نے کبھی بھی اپنے مسائل کی شکایت باہر کے ملکوں سے نہیں کی ہے اور وہ بھارت کے دیگر مسلمانوں کی طرح آئین ہند، ملک کی بہترین ادارے اور قانون کی بالادستی میں یقین رکھتے ہیں۔

آخر میں یکم مئی کے ایک بیان میں ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے اس بات کو بھی تسلیم کر لیا کہ ان کا ۲۸ اپریل والا ٹویٹ غلط وقت پر آیا۔ انہوں نے مزید کہا ملک میں طاری طبی ایمرجنسی کی صورت حال کے مد نظر یہ ٹیوٹ غیر حساس تھا۔ پھر انہوں نے اس کے لیے عوام سے معافی مانگ لی۔ ایسا کر کے وہ جلتی ہوئی آگ کو بجھانا چاہتے تھے مگر فرقہ پرستوں کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ حالاں کہ ۲۸ اپریل کے متنازعہ ٹویٹ میں ایسا کچھ تھا بھی نہیں تھا جس کے لیے اتنا بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ملک کی نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے وسیع النظری کا مظاہر کرتے ہوئے خود اس کے لیے معافی مانگ لی۔ اس سے ان کا قد اور بھی بڑھ گیا ہے۔ مگر بھگوا شدت پسند صلح کرنے سے زیادہ سیاست کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ یہ تنازعہ اتنی جلدی ختم ہو جائے۔ ان کو ایسا کرنے کے لیے اوپر سے اشارہ ملتا ہے۔

اربابِ اقتدار کوروناوبا کے دوران عوام کو راحت دینے میں ناکام رہے ہیں، مزدور اور غریب کے مسائل بڑھتے چلے جارہے ہیں جو کسی وقت بھی پھوٹ کر باہر آسکتے ہیں۔ اس لیے ان کی پوری کوشش ہے کہ رائے عامہ کو کسی طرح ہندو بنام مسلمان کے مسائل میں الجھا دیا جائے۔ یہ کام بہت دنوں تک تبلیغی جماعت کو "ویلن" بنا کر کیا گیا مگر اب اس کا بھی اثر کم ہونے لگا ہے۔ اسی دوران مسلم نوجوانوں کے خلاف سخت ترین دفعات لگائی جارہی ہیں اور ان کو گرفتار کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے خلاف چلائی جا رہی نفرت انگیز مہم بھی اسی سازش کا حصہ ہے، ان سب کا مقصد عوام کے سامنے ایک مصنوعی خطرہ بنا کر پیش کرنا ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے ایسا پوسٹ لکھ کر خود اپنے لیے مصیبت کو دعوت دی ہے۔ اس بات بھی درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر صرف ایک پوسٹ کی بات ہوتی تو فرقہ پرست شاید اس پر اتنا ہنگامہ کھڑا نہیں کرتے اور ہزاروں لاکھوں پوسٹ کی طرح یہ بھی نظر انداز ہو جاتا۔ ممکن یہ بھی تھا کہ ان کی معافی کے بعد معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ معافی مانگنے کے بعد بھی ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کے خلاف سخت ترین دفعات لگائے گئے ہیں۔ یہ سب اس لیے کیا گیا ہے تا کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کی آواز بند کیا جائے۔ وہ بہت دنوں سے بھگوا شدت پسندوں کی آنکھوں میں کانٹا بن کر کھٹک رہے تھے۔ فرقہ پرست یہ کبھی نہیں چاہتے کہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان جیسا باصلاحیت، تجربہ کار، معتدل، انصاف پسند، اور ایماندار شخص کسی اہم ادارے کی ذمہ داری سنبھالے۔ زندگی کے ہر شعبے میں مچی نا انصافی کے خلاف ڈاکٹر ظفر الاسلام خان آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ ان کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں ہے، اس لیے ان پر دباؤ ڈالنا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی پڑھائی، لکھائی اور علمی کاموں میں لگا دی ہے اور اس کی مدد سے وہ محکوم، بالخصوص مسلمانوں کے مسائل پر، پُرامن اور جمہوری طریقے سے آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ علمی کاوشوں کے علاوہ وہ سماجی اور سیاسی امور میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ صحیح معنوں میں وہ بھارت کے ایک بڑے پبلک انٹلیکچوئل ہیں۔

فرقہ پرستوں کو ان سے بیر اس لیے بھی ہے کیوں کہ انہوں نے دہلی اقلیتی کمیشن جیسے بے جان ادارے میں جان ڈال دی ہے۔ آج عوام اس ادارے کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے بڑی امید سے دیکھتے ہیں۔ لوگوں کا اعتماد بحال کرنے میں انہوں نے کافی محنت کی ہے۔ فروری میں ہوئے دہلی دنگوں کے دوران ڈاکٹر ظفر الاسلام خان نے اپنی طاقت سے کہیں زیادہ کام کیا اور فرقہ پرستوں کے بہت سارے منصوبوں کو ناکام کر دیا ہے۔ انہوں نے دہلی فساد کے متاثرین کی مدد کی اور باز آبادکاری میں بھی آگے رہے۔ پولیس کی نااہلی پر نوٹس بھیجا اور انسانی حقوق کی پامالی کے پیش نظر ان سے رپورٹ طلب کی۔ اگر ان کے ساتھ حکام نے اچھی طرح سے تعاون کیا ہوتا تو عوام کو اور بھی راحت ملی ہوتی۔ مگر اس کے باوجود ان کے حوصلے کبھی پست نہیں ہوئے۔ جب تبلیغی جماعت کے خلاف جم کر پروپیگنڈا ہو رہا تھا تب بھی انہوں نے مثبت طریقے سے مداخلت کی تھی اور تبلیغی جماعت کے نام سے شائع شدہ اعداد و شمار پر اعتراض ظاہر کیا تھا کیوں کہ اس سے مسلمانوں کے خلاف ہوا تیار ہو رہی تھی۔ ان کے ان اقدامات سے مسلمانوں کو بڑی راحت ملی اور فرقہ پرستوں کے بہت سارے ناپاک منصوبے ناکام ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھگوا شدت پسندوں کے نشانے پر تھے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان آج ملک اور ملت کی خدمت کرتے کرتے فرقہ پرستوں کے شکار بن گئے ہیں۔ کیا ہمیں ان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے؟ کیا تمام جمہوری طاقتوں کو ان کے ساتھ نہیں کھڑا ہونا چاہیے؟ کیا ڈاکٹر ظفر الاسلام خان کی آواز کو خاموش ہونے سے اقلیتوں کی آواز خاموش نہیں ہو جائے گی؟ اگر ایسا ہے تو پھر ملی رہنماؤں اور تنظیموں کو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے سامنے آنا چاہیے۔

(ابھے کمار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)
debatingissues@gmail.com

***

تبدیلیٔ مذہب!

جب امبیڈکر نے بدھ مت قبولا

فسانۂ دہر

ابھے کمار

جے این یو

"میں بطور ہندو نہیں مروں گا" آئین ہند کے خالق بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے یہ اعلان ہزاروں کے مجمع کے سامنے 13/اکتوبر 1935 کے دن ناسک سے متصل یلوا میں کیا۔ بمبئی اور دیگر صوبوں سے اچھوت مہار ذات کے پیروکار "ڈپریسڈ کلاسز" (Depressed Classes) کی طرف سے منعقدہ اس کانفرنس میں حصہ لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے امبیڈکر نے یہ صاف کردیا کہ ان کو اب ہندو دھرم سے کوئی امید نہیں ہے اور اچھوتوں کے لئے مذہب تبدیل کرنے اور مساوات پر مبنی کسی اور مذہب کو قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچا ہے۔

سال ہا سال کی جدوجہد اور ستیہ گرہ کے بعد، امبیڈکر یہ ماننے پر مجبور ہوئے کہ ہندو مذہب میں اصلاحات کی کوئی گنجائش نہیں بچی ہے۔ نہ صرف مندر تحریک ناکام ثابت ہو رہی تھی بلکہ اچھوتوں کو مندر میں داخلے کی اجازت کے لیے بنائے گئے بہت سارے قوانین کو بھی قانون ساز اسمبلی میں پاس ہونے نہیں دیا گیا۔ ہندو مذہب کے پیشوا اور پروہت اچھوتوں کو برابری کا حق دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ لہٰذا امبیڈکر کو یہ کہنا پڑا کہ ہندو مذہب چھوت چھات جیسے غیر انسانی رواج کو واجب قرار دیتا ہے، اس لئے یہ منفی چیز ہندو سماج کا بنیادی ڈھانچہ ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ اچھوتوں کی بدقسمتی ہے کہ انہیں ہندو کہا جاتا ہے۔ اگر وہ دوسرے مذہب میں پیدا ہوئے ہوتے تو انہیں چھوت کا کلنک نہیں جھیلنا پڑتا۔ بالآخر امبیڈکر نے اپنے پیروکاروں سے کہا کہ وہ کوئی بھی ایسا مذہب قبول کرلیں جو ان کو برابری کا درجہ دیتا ہو مگر جو بات ہندو قدامت پسندوں اور برہمنی نظریہ کے حامل لوگوں کو اپنے اوپر سب سے بڑی چوٹ محسوس ہوئی وہ یہ تھی کہ امبیڈکر نے اچھوتوں سے کہا کہ وہ اپنی "غلطی" دور کریں۔ یہ تب ہی ممکن تھا جب وہ کوئی اور دھرم اختیار کرتے۔ انہوں نے مزید کہا "میری یہ بدقسمتی رہی ہے کہ مجھے اچھوتوں میں پیدا ہونا پڑا ہے، جس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے مگر یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں بطور ہندو نہ مروں"۔

جب یہ بات گاندھی جی تک پہنچی، تو اس پر انہوں نے افسوس کا اظہار کیا۔ گاندھی جی کی رائے تھی کہ دنیا کے سبھی مذاہب ایک ہی درس دیتے ہیں، اس لئے مذہب تبدیل کرنا مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ مذہب بدلنے کے بجائے لوگوں کو اپنے مذہب کے عقائد اور تعلیمات پر عمل کرنا چاہیے۔ اس لئے وہ مذہب بدلنے کو چھوت چھات کے مسئلہ کا حل نہیں مانتے تھے۔ امبیڈکر گاندھی کی یہ دلیل ماننے کو تیار نہیں تھے کہ ہم سب کو اپنے آباء واجداد کے مذہب کو کسی بھی صورت میں ترک نہیں کرنا چاہئے۔ اپنے ناقدین کو جواب دیتے ہوئے امبیڈکر نے کہا کہ کسی بھی مذہب کا اصل مقصد سماجی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہوتا ہے، جس کا ایک سماجی مقصد اور سماجی رول ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہیں تو مذہب کا رول ایک اجتماعی زندگی سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سے ہندو مذہب کا اصل مقصد ہندو سماج سے جڑا ہوا ہے، اگر اچھوت ہندو ہیں، تو ان کو یہ سوال کرنے کا حق ہے کہ ان کو ہندو مذہب نے ہندو سماج میں کیا مقام دیا ہے؟ ان کو یہ سوال بھی کرنا چاہئے کہ اچھوت سماجی غیر برابری کیوں جھیل رہے ہیں؟ امبیڈکر کی نظر میں جس مذہب میں انسان کو برابری نہ ملے اور انسانوں سے بھید بھاؤ کر کے جانور جیسا سلوک ہو، اُسے ترک کردینے میں ہی نجات ہے۔ امبیڈکر نے ایک لمبے عرصہ تک مذہب بدلنے کی بات تو کھلے عام کہی، مگر اس پر کچھ نہیں کہا کہ اچھوتوں کو کس مذہب کو اپنانا چاہئے۔ کیا انہیں عیسائیت کو قبول کرنا چاہئے؟ کیا انہیں سکھ یا بدھ مت کے آغوش میں چلے جانا چاہئے؟ کیا انہیں دین اسلام پر ایمان لاکر اپنی زندگی گزارنی چاہئے؟

بے شک اسلام سے امبیڈکر بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے سال 1929 میں جالے گاؤں جلسے میں اچھوتوں کو نیا مذہب اختیار کرنے کی بات کہی تھی، اس کے بعد ایک مہینے میں کئی اچھوتوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اچھوتوں کو کون سا مذہب قبول کرنا چاہئے، اس موضوع پر بہت سارے اجتماعات منعقد ہوئے۔ مسلم داعیان اور علمائے اسلام نے اس طرح کے پروگراموں میں حصہ لیا اور امبیڈکر اور ان کے پیروکار کو دعوت اسلام دی۔ اسلامی دنیا بھی امبیڈکر کی اس تحریک پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔

اکتوبر 1935 میں ہی خلافت مرکزی کمیٹی کے نمائندہ مولانا محمد عرفان نے امبیڈکر سے ملاقات کی اور ان کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اگر وہ مشرف بہ اسلام ہوگئے تو ان کے ساتھ مسلمان نہ صرف برابری کا سلوک کریں گے بلکہ وہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کے رہنما بھی تسلیم کئے جائیں گے۔ اس دوران مولانا احمد سعید، جن کا تعلق انڈین ایسوسی ایشن آف علماء سے تھا، نے امبیڈکر کو تار بھیج کر اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ انہوں نے مزید کہا کہ اسلام ایک فطری دین ہے اور اس مذہب کو اپنانے کے بعد ان کی امیدیں پوری ہوں گی۔ عربی پریس نے بھی اس معاملے میں کافی دلچسپی دکھائی۔ یہی نہیں بلکہ قاہرہ کے مسلمانوں نے فنڈ جمع کیا اور امبیڈکر کی اس تحریک کی حمایت کی۔ یہاں تک کہ الازہر یونیورسٹی مصر کے ریکٹر نے اعلان کیا کہ اگر اچھوت طبقہ دین اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے لئے پردہ اور ختنہ لازم نہیں کیا جائے گا۔

دریں اثنا 21 سالہ ایک مسلم نوجوان، جو بعد میں چل کر ہندوستان کا ایک عظیم مورخ، عربی زبان کے ممتاز ادیب کے طور پر پوری دنیا میں مشہور ہوتا ہے، امبیڈکر کو دعوت اسلام دینے کے لیے سفر ممبئی پر نکل پڑتا ہے۔ یہ اکتوبر 1935 کی بات ہے، امبیڈکر اس وقت ممبئی میں مقیم تھے اور وہاں ایک کالج کے پرنسپل تھے۔ اس نوجوان کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی دعوت کو لوگوں تک پہنچائیں۔ یہ نوجوان انگریزی کی کچھ دعوتی تبلیغی کتابیں اور رسائل لے کر نکل پڑا۔ صبح سویرے دادری میں واقع امبیڈکر کے بنگلہ پر پہنچ گیا، مگر اسے یہ پتہ چلا کہ امبیڈکر ہوا خوری کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ انتظار کے بعد امبیڈکر نے نوجوان کو اپنے ریڈنگ روم میں بلایا۔ ان کے ریڈنگ روم میں بہت ساری کتابیں موجود تھیں، جن میں "ترجمان القرآن" بھی شامل تھا۔ اسلام کی دعوت دیتے ہوئے اس نوجوان نے ایک سیدھے سادے مسلمان اور خالص داعی کی حیثیت سے صاف صاف لفظوں کہا: "ڈاکٹر صاحب! آپ سے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے لوگ ملے ہوں گے اور انہوں نے اونچی اونچی باتیں کہی ہوں گی، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی برادری (commmunity) کی نجات کی فکر ہے اور خلوص کے ساتھ صحیح مذہب کی تلاش ہے تو میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔" یہ نوجوان سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی تھے جن کو دنیا علی میاں ندوی مرحوم کے نام سے جانتی ہے۔

امبیڈکر نے تبدیلی مذہب کے بارے میں حتمی فیصلہ لینے میں تقریباً 20 سال کا انتظار کیا۔ اپنی وفات سے دو مہینہ قبل وہ اپنے لاکھوں پیروکاروں کے ساتھ ناگپور میں جمع ہوئے اور پوری دنیا کے سامنے "بدھم شرنم گچھامی" الاپا اور اس طرح انہوں نے اجتماعی طور بدھ مذہب کو قبول کرلیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے حمایتیوں کے ساتھ بدھ مت کے اصولوں کو اپنی زندگی میں اپنانے کی قسم بھی لی۔ بدھ مت کی جو تشریح امبیڈکر نے کی، اس میں دیوی دیوتاؤں کے بت پوجنے سے ممانعت، خدا کے جنم اور اس کے پنر جنم سے انکار، برہمنی رسومات سے دوری، مساوات کے نظریہ میں یقین، جھوٹ بولنے، چوری کرنے اور شراب پینے سے پرہیز وغیرہ شامل ہیں۔ سب سے اہم بات جو امبیڈکر نے بدھ مذہب کے حوالے سے کہی وہ یہ تھا کہ بقول ان کے بدھ مت منطق پر مبنی مذہب ہے، جس میں ایشور کے وجود پر بھی سوال کیا گیا ہے۔ بابا صاحب کی تحریک کی وجہ سے بھارت میں بدھ مت کا احیائے نو ہوا۔ یہاں پچاسی لاکھ بدھ مت کے پیروکار رہتے بستے ہیں۔ ٹھیک 62 سال پہلے امبیڈکر کی وفات ہوئی تھی، تب بھی بڑی تعداد میں لوگوں نے بدھ مذہب کو قبول کیا تھا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

نوٹ: مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔

ویب رابطہ: abhaykumar.org

□□□□

گائے کی گردن میں کرسی کی رسی!

اندھیر نگری چوپٹ راج

اظہارِ خیال

ابھے کمار

اُتر پردیش کی یوگی ادتیہ ناتھ حکومت نے سال نو کی شروعات گئو ماتا کے تحفظ کی سیاست سے شروع کردی ہے۔

وزیر علیٰ یوگی نے کابینہ کی ایک میٹنگ کی صدارت کی اور اس فیصلہ پر مہر لگادی کہ گئو کے تحفظ کی خاطر عوام کی جیب سے 0•5 فیصد سیس لیا جائے گا۔اس ٹیکس کو واجب الادقرار دینے والوں کی دلیل ہے کہ اس سے جو رقم سرکاری خزانے میں جمع ہوگی، اس کا استعمال بے سہارا چھوڑے جارہے مویشیوں کے لیے ”شیلٹر ہاؤس“ بنایا جائے گا۔اس کے علاوہ یہ رقم مویشیوں سے متعلق دیگر فلاحی کاموں میں صرف کی جائے گی مگر ان سب کے پیچھے اصل مقصد خالص سیاست کرنا ہے۔ٹیکس کے بوجھ تلے دبی جنتا پر ایک اور عجیب وغریب ٹیکس لاد دیا گیا، جس کا نہ تو کوئی سروکار گئو ماتا کی دیکھ بھال سے ہے اور نہ کسی مویشی کے تحفظ سے بلکہ اس کا اصل ہدف یہ ہے کہ ہندوتوا ایجنڈے کے عین مطابق دھرم کے نام پر سیاسی محل تعمیر کیا جائے۔

تاریخ کے صفحات اس بات کی وافر گواہی دیتے ہیں کہ ہندو فرقہ پرست لیڈروں نے اول روز سے ہی یہ طے کرلیا تھا کہ پوری ہندو قوم کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر کسی نہ کسی جذباتی نعرے کے بل پر جمع کرنا ہے تو ان کے کھٹور دلوں اور بنجر دماغوں میں مسلمانوں اور دلتوں کے خلاف ازحد نفرت بھرنے کی سوجھی۔انہوں نے طے کیا کہ فرقہ پرستی کے پجاریوں کا آنکھیں بند کر کے ساتھ دینے والوں کے ذہنوں میں یہ جھوٹ بھی بٹھانا ہوگا کہ ’گئوماتا‘ کی بے حرمتی کے ذمہ دار اصل میں مسلمان اور دلت ہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ روز اول سے آر ایس ایس کا یہ کاذبانہ پروپیگنڈہ رہا ہے کہ بھارت میں گوشت کے حصول کے لئے گایوں کو ذبح کرنے کا ناپاک سلسلہ مسلم دورِ حکومت میں شروع ہوا تھا۔حالانکہ تاریخ کے ثبوت وشواہد ان کذب بیانیوں کو لغو اور بے معنی ٹھہراتے ہیں۔نامور تاریخ دان ڈی این جھا نے اپنی کتاب ”دی متھ آف ہولی کاؤ“ (The Myth of Holy Cow) میں یہ بات وضاحت کے ساتھ درج کی ہے کہ ویدک زمانہ اور اس کے مابعد زمانے میں گائے کا گوشت کھانے کا رواج عام تھا۔ انہوں نے مزید لکھا ہے کہ گائے ہمیشہ سے ہندوؤں کے نزدیک کوئی مقدس شئے نہیں رہی ہے۔ویدک اور اس کے بعد کے برہمنی دور میں بھی معاملہ یہ نہیں تھا، یہاں تک کہ قدیم ہندستان میں گائے کا گوشت اکثر مقامات پر لذیز کھانے کے طور پر شامل تھا۔اس کے علاوہ بھی تاریخ دانوں نے اس سلسلے میں ان گنت تاریخی شواہد پیش کئے ہیں۔عظیم تاریخ دان ڈی ڈی کوسمبی اپنے ایک ایک فکر انگیز مضمون ”ذات اور نسل“ (Cast and Race) میں کہتے ہیں کہ جس طرح ایک طرف ویدک دور کے برہمن گائے کا گوشت کھاتے تھے، اسی طرح کشمیری، بنگلہ اور سرسوت برہمن گوشت کھا بھی لیں تو بھی وہ اپنی ذات سے باہر نہیں ہوتے۔جیسا کہ سرکردہ تاریخ دانوں کا ماننا ہے کہ بعد کے زمانے میں گائے کے گوشت کو کھانے کے خلاف دھارمک لٹریچر تیار کیا جانے لگا مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ کوئی بھی ضابطہ اور قانون پوری طرح سے کسی بھی معاشرے میں نافذ نہیں کیا جاسکتا۔جہاں ایک طرف برہمنوں کے ذریعہ لکھے گئے مذہبی پُستکوں میں بیف کھانے سے منع کیا گیا ہے، وہیں سماج جس میں اتنے سارے مذہبی، ثقافتی وعلاقائی اختلافات کے باوجود لوگوں نے اپنے طریقے سے زندگی کو جیا کہ بہت سے خطوں میں بیف کھانے کو برا سمجھا گیا مگر دیگر علاقوں میں لوگ اسے کھاتے بھی رہے اور کھلاتے بھی رہے۔

گائے کے گوشت کا مسئلہ دلتوں کے ساتھ بھی جڑا ہوا ہے۔جیسا کہ آئین ہند کے خالق ڈاکٹر امبیڈکر نے لکھا ہے دلت ایک طبقہ کے طور پر چوتھی صدی (AD) میں سماج میں اُبھر کر سامنے آئے۔ ان کے وجود کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر مزید کہتے ہیں کہ ”جب بودھ مت کو برہمن مت کے ذریعہ شکست سے دوچار ہونا پڑا اور برہمنوں نے سبزی خوری کو فروغ دینا شروع کیا، جس کے تحت گائے کا گوشت کھانا ممنوعہ قرار دیا گیا ہے، گھومنتو قبیلہ (NomadicTribes) کے لوگ جو غریب و نادار تھے، ان کے لئے گائے کا گوشت ترک کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ان کی زندگی میں گائے کا بڑا مقام تھا۔وہ نہ صرف گائے کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرتے تھے بلکہ اس کی جلد اور مری ہوئی گائے کی دیگر اشیاء ان کی زندگی میں کافی مفید بھی تھیں۔اس کے مدنظر ان کے لئے گائے کا گوشت ترک کرنا اور پوری طرح سبزی خور ہونا بہت مشکل تھا۔بعد میں برہمنوں نے گائے کا گوشت کھانے والے ان قبیلوں کا اچھوت (Untouchables) کے طور پر سلوک کرنا شروع کردیا اور اس طرح سے ہندوستان میں اچھوت پرتھا 1500 سال پہلے وجود میں آیا، جو آج بھی پوری طرح سے ختم نہیں ہوا ہے۔اگرچہ آزادی کے بعد اچھوت پرتھا کو آئینی طور سے قانوناً ظلم قرار دیا گیا مگر آج تک کبھی بھی دلتوں کے ساتھ پوری طرح سے انصاف نہیں ہوا۔دلتوں کے ساتھ ساتھ بغض وعناد کی بنیاد پر گئو رکشا سمیتیاں مسلمانوں کو بھی اپنے جان لیوا حملوں کا شکار بناتی جارہی ہیں۔آج کے دور میں جس طرح سے ”ہولی کاؤ“ کے نام پر ہندوؤں کو لام بند کیا جاتا ہے، اسی طرح کی سیاست کی شروعات انگریزوں کے دور میں بھی شروع کی گئی تھی۔مثال کے طور پر 19ویں صدی کے اواخر میں ایک کے بعد ایک بڑے فرقہ پرستانہ فسادات گائے کے نام پر شروع کئے گئے۔ہندوؤں کے فرقہ پرست لیڈروں نے گائے کے جذباتی مدعے کا فائدہ اٹھا کر سیاسی روٹیاں سینکیں اور ہندوؤں کو اس بات پر اُکسایا جاتا رہا کہ گئو ماتا کے ’قاتل‘ مسلمان ہیں۔1870 کے آتے آتے گائے کشی کے نام پر فساد ہونے شروع ہوگئے اور 1882 میں گئو رکشا تنظیم کا قیام آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی کی قیادت میں ہوا۔دیانند سرسوتی نے ہندوؤں میں آپسی اتحاد پیدا کرنے کے لئے جہاں گائے کے خودساختہ تقدس کا سہارا لیا، وہیں انہوں نے مسلم مخالف سیاست کو ہوا دی۔وقت گذرنے کے ساتھ ہی گئو رکشا تحریک تیز ہوئی اور 1893 میں اعظم گڑھ میں گائے کے نام پر ہوئے فساد میں 100 سے زائد لوگ ملک کے مختلف حصوں میں مارے گئے۔1912-13 میں جہاں گائے کے نام پر اجودھیا کی زمین لال ہوئی، وہیں 1917 میں بہار کے شاہ آباد میں ایک تباہ کن فرقہ وارانہ فساد ہوا جس نے بہار کی سیاسی سرزمین کو ہندو اور مسلمان کے نام پر باٹنا شروع کردیا مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس وقت کی سیکولر سمجھی جانے والی کانگریس جسے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی حمایت اور شراکت حاصل تھی، اس معاملے میں انصاف نہیں کرسکی۔اس جماعت سے جڑے ہوئے کئی بڑے بڑے لیڈر خاص کر قصبہ اور ذیلی تنظیموں میں ہندو مہاسبھا کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف حملہ کرتے رہے۔آزادی کے بعد ایسا لگا تھا کہ شاید گئو کشی کا تنازعہ ختم ہوجائے گا اور نئے بھارت میں سیکولر سیاست سب کو انصاف کرے گی مگر آزاد بھارت کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہندوستان کا کوئی بھی ایسا صوبہ نہیں تھا جہاں گئو رکشا کے نام پر معصوموں کا خون نہ بہایا گیا ہو اور اس وقت کھلے عام انہیں سیاسی اور حکومتی سرپرستی حاصل ہے مگر یہ چیز ہمارے وشال دیس کی گنگا جمنی تہذیب کے لئے سم قاتل ہے۔

....

(مضمون نگار شعبہ تاریخ جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں)

Taasir, Patna, Jan 8, 2020, p. 6.

جے این یو میں فساد جیسے حالات کیلئے ذمّہ دار کون؟

ابھے کمار

جس طرح ملک کے اقلیتوں کے رہائشی علاقے فسادات کی زد میں رہے ہیں، ویسے ہی اتوار کی شام جے این یو بھی تھا۔ جس طرح ملک کے اقلیتوں کو "سبق" سکھنے کے لیے انتظامیہ، پولیس اور بلوائی ایک ساتھ مل کر حملے کرتے رہے ہیں، ویسے ہی جے این یو انتظامیہ، پولیس اور بھگوا شدت پسند پر مشتمل ٹیم ایسا ہی کچھ کرتی نظر آئی۔ سورج ڈھلنے کے آس پاس تشدد کا یہ رقص شروع ہوا۔ شر پسندوں نے کئی گھنٹوں تک طلبہ اور بعض پروفیسروں کو بڑی بے رحمی سے مارا پیٹا۔ حالات اس قدر دل کو دہلا دینے والے تھے کہ خود جے این یو طلبہ یونین کی صدر آئشی گھوش بری طرح زخمی ہوگئی۔ اُن کے سر اور ہاتھ پر شدید چوٹیں لگی ہیں اور کافی خون بھی بہا ہے۔ اُن کو سابرمتی ڈھابے کے پاس لوہے کے راڑ سے مارا گیا۔ بعد میں اُنہوں نے خود ہسپتال سے پریس کو بتایا کہ اُن کے سر پر 15-16 اسٹیچ لگے ہیں۔

کیمپس میں موجود طلبہ کو اس وقت سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی جان کیسے بچائیں۔ موصول ہوئی اطلاع کے مطابق، پہلے اسٹریٹ لائیٹ بجھادی گئی۔ پھر مین گیٹ بند کر دیا گیا جہاں پولیس بڑی تعداد میں تعینات تھی۔ پولیس کسی کو اندر نہیں جانے دے رہی تھی، وہیں اندر ٹیکس پیئر کے پیسے سے کروڑوں روپے تنخواہ پانے والی جے این یو کی خود کی سیکیورٹی تماشائی بنی ہوئی تھی۔ جہاں عام لوگوں کے لیے کیمپس کے دروازے بند کر دیے گئے تھے، بھگوا شر پسندوں کے لیے ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ان میں سے بہت ساروں کا تعلق بی جے پی کی طلبہ تنظیم اے وی بی پی سے بتایا جا رہا ہے، جو جے این یو انتظامیہ کی مدد سے اندر داخل ہو گئے۔ نقاب پوش شر پسند ہاسٹلوں میں گھس کر طلبہ کو راڈ اور ڈنڈے سے مار رہے تھے۔ اُنہوں نے پتھر بازی بھی کی اور ہاسٹل کو بری طرح سے نقصان پہنچایا۔

وحشت کا ایسا ماحول تھا کہ کچھ طلبہ اور طالبات نے تو اپنے کمروں کو اندر سے بند کر لیا تھا، تو کچھ افراتفری کے عالم میں اپنی بالکونی سے باہر کود گئے۔ کچھ تو اپنی جان بچانے کے لیے جھاڑیوں میں چھپے رہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ شر پسند طلبہ کو پیٹ پیٹ کر "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ زبردستی لگوا رہے تھے۔

جس حالات میں جے این یو آج پہنچ گیا ہے ویسا پہلے کبھی نہیں تھا۔ اپنے نو سال کے قیام کے دوران میں نے کبھی ایسی حالات نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی سینئر نے کبھی اس طرح کے ماحول پیدا ہونے کی بات کی تھی۔ آج جو کچھ ہوا ہے وہ جے این کی روایت کے بلکل اُلٹا ہے۔

جے این یو مکالمہ، بحث اور تکرار کے لیے جانا جاتا ہے۔ سیاسی باتیں تو یہاں کبھی ختم ہی نہیں ہوتی۔ "یار اب تو پولیٹکس چھوڑ دو"۔ حال میں ہی یہ نصیحت میرے ایک دوست نے پھر مجھے دی۔ اُن کی نصیحت بیجا نہیں تھی۔ جب وہ سابرمتی ڈھابے کے قریب الاؤ کے پاس بیٹھ کر نئے سال کی پارٹی منائے کے بارے میں منصوبہ بنا رہے تھے، تب بھی میں وہاں این آرسی پر تقریر کر رہا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہاں کی پر امن ڈیبیٹ اور ڈسکشن کبھی کبھی تنازعے کی بھی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مگر کبھی کیمپس کسی کے لیے غیر محفوظ نہیں بنا تھا۔ آدھی رات کو بھی طالبات لائبریری سے بڑے اطمینان سے لوٹتی تھی اور پھر گنگا ڈھابا چائے پینے جاتی تھی۔ مجموعی طور پر، لیفٹ اور رائٹ کے جہد کاروں کے آپسی نظریاتی اختلاف کے بعد بھی جے این یو سب کے لیے محفوظ رہا ہے۔ مگر اتوار کی شام سے صورت حال بدل چکی ہے اور یہاں طلبہ کو دنگا، لا قانونیت اور تشدد کا خوفناک چہرہ دیکھنے کو ملا۔ مگر سوال اٹھتا ہے کہ ان سب کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ ابھی بھی یہ پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس حملے کو کس نے انجام دیا۔ مگر اس میں بھگوا شر پسند، جے این یو انتظامیہ اور پولیس کی ملی بھگت معلوم پڑتی ہے۔

پولیس کی ناکامی کو دیکھ کر اس بات کا خدشہ ہے کہ کیا وہ پورے معاملے کی جانچ جانبدارانہ طریقے سے کر پائے گی؟ لہٰذا اس کی ایک جوڈیشل جانچ ہونی چاہیے، تاکہ حقیقت سامنے آپائے۔

مگر بہت سارے ایسے ثبوت، جن میں حملہ آوروں کی تصویر اور اُن کے میسج شامل ہیں، اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان سب کے پیچھے اے وی بی پی کا ہاتھ ہے اور اس پلان میں جے این یو انتظامیہ اور پولیس بھی شامل ہے۔ ایسا اس لیے معلوم پڑتا ہے کہ اتوار کی شام جو ہوا اس کا ٹریلر جے این یو کے طلبہ گزشتہ تین چار دنوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہاتھ میں ڈنڈے لیے اے وی بی پی کے ممبروں نے مظاہرین کو کئی بار مارا تھا۔ ان سب کے بیچ یونیورسٹی کی سیکیورٹی تماشائی بنی ہوئی تھی۔

یونیورسٹی میں فیس میں بے تحاشا اضافے کے خلاف گزشتہ دو مہینوں سے چل رہی تالا بندی کو اے وی بی پی کے ممبران انتظامیہ کے اشارے پر ختم کروانا چاہتے تھے۔ جب طلبہ نے اُن کی بات نہ مانی تو اے وی بی پی نے مظاہرین کو مارنا شروع کیا۔ بے حد افسوسناک بات یہ ہے کہ ایک سیکیورٹی گارڈ نے جے این یو طلبہ یونین کے صدر گھوش کے ساتھ بدسلوکی بھی کی۔ مگر اس سب سے زیادہ افسوناک بات یہ ہے کہ جے این یو کے بعض آر ایس ایس کے حامی پروفیسروں نے اے وی بی پی کے ساتھ مل کر مظاہرین کو مارا پیٹا۔

آج جو بھی صورت حال بنی ہے اس کے لیے اگر سب سے بڑا ذمہ دار کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یقیناً وائس چانسلر جگدیش کنار ہیں۔ اُن کے آنے کے بعد جے این یو میں صرف اور صرف طلبہ کے لیے مشکلیں ہی کھڑی کی گئی ہیں۔ پہلے "دیش دروہی" کا پروپگنڈہ پھیلا کر اُنہوں نے اپنے ہی طلبہ اور تعلیمی ادارے کو بدنام کروایا۔ پھر سیٹ کٹ کر کے ہزاروں طلبہ کو پڑھنے سے روکا۔ نجیب کے معاملوں میں بھی اُنہوں نے مجرمانہ خاموشی اختیار کی جس سے حملہ آوروں کے حوصلے بڑھے، وہیں اقلیتوں کے دلوں میں مایوسی اور بے چینی گھر کر گئی۔ اور اب فیس میں بے تحاشہ اضافہ کا منصوبہ لا کر وہ غریب اور محکوم بچوں کو یونیورسٹی سے باہر کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ فیس کے خلاف سب کچھ قربان کر کے لمبی ہڑتال لڑ رہے ہیں۔ اُنہوں نے نہ صرف پچھلے سیمسٹر کے امتحان کا بائکاٹ کیا بلکہ وہ نئے سیشن میں رجسٹریشن بھی نہیں کرا رہے ہیں۔ یہ سب وائس چانسلر کی کرسی کے لیے خطرہ بن رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ احتجاج کو کسی طرح ختم کروانا چاہتے تھے۔ اسے ڈائلاگ سے بھی ختم کیا جا سکتا تھا، جس کے لیے طلباء یونین ان سے روز اپیل کر رہی تھی۔ مگر طلبہ سے ڈائلاگ کرنا اُنہوں نے شاید اپنے وقار سے نیچا سمجھا اور ایک ایسا راستہ اختیار کیا جس کا خوفناک منظر ہر طرف رونما ہے۔

(مضمون نگار جے این یو کے ریسرچ اسکالر ہیں۔)

اے جی نورانی

فکر انگیز سجھاؤ بے باک تجزیہ

رُودادِ مجلس

ابھے کمار
جے این یو دلی

گزشتہ جمعہ کی شام ہندوستانی پارلیمنٹ سے متصل کانسٹی ٹیوشن کلب میں 12 ویں اصغر علی انجینئر یادگاری خطبہ کا انعقاد کیا گیا۔ بطور خطیب اے جی نورانی مدعو تھے۔ نامور ماہر آئین، سیاسی مبصر، کالم نگار، مورخ اور سپریم کورٹ اور ممبئی ہائی کورٹ کے بڑے وکیل، 88 سالہ نورانی صاحب کو سننے کے لیے دلی بے تاب تھی۔ شام ڈھلنے سے پہلے میں جے این یو کے اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ لیکچر ہال کے باہر لگے خوبصورت چشموں سے پانی کے پھوارے آسمان کو چومنے کی کوشش کررہے تھے۔ ایسا گمان ہو رہا تھا کی یہ بھی اس بے حد خاص مہمان کے استقبال میں آج کچھ زیادہ ہی مسرور تھے۔ یہ سرور آگیں مسرت بے جا نہیں تھی۔ نورانی صاحب جیسا عظیم دانشور ایک عرصہ کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی حق گوئی میں صرف کی ہے۔ ان کی حیدرآباد، کشمیر، بابری مسجد سے متعلق تحقیق اور اہم دستاویزوں کی تدوین، تاریخ کے شعبہ میں لافانی اور لاثانی خدمات کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحریریں زیادتی ڈھا رہی اور اپنے فرائض سے منہ موڑ رہی حکومت کے خلاف ایک بے باک آواز رہی ہے۔ الغرض نورانی صاحب کی زندگی سیکولر اور ترقی پسند نظریات کا بے حد خوبصورت مجسمہ ہے۔

جب میں ہال کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ نورانی صاحب وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب پہنچ کر میں نے ان کو سلام پیش کیا اور کہا کہ "میں آپ کی تحریروں کو پڑھتا ہوں اور میری آرزو ہے کہ میں آپ کی طرح بنوں"۔ سر ہلا کر انہوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ جب میں نے ان کو بتایا کہ میرا پی ایچ ڈی "آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ" کے موضوع پر حال میں ہی جمع ہوئی اور اس دوران اُن کی تحریروں سے کافی مستفید ہوا ہوں، تب نورانی صاحب نے خوشی میں سر ہلایا۔ خیال رہے کہ نورانی صاحب کی اس موضوع پر یہ رائے ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ کو روحِ شریعت کے مطابق حل کیا جائے، نہ کہ اینگلو محمڈن لاء، جو کہ انگریزوں کے دور حکومت میں وجود میں آیا، کو ہی شریعت سمجھ لیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے سخت مخالف ہیں۔ اپنی تحریروں میں وہ مسلسل لکھتے آرہے ہیں کہ بی جے پی یکساں سول کوڈ کا استعمال مسلمانوں کے خلاف ڈنڈے کے طور پر کر رہی ہے۔ جب میں نے ان سے یہ ساری باتیں دہرائیں اور کہا کہ اپنی پی ایچ ڈی مقالے میں نے یہ سب کچھ شامل کیا ہے، تو اس بار بھی انہوں اپنا شاباشی اور خوشی ظاہر کی۔ باتوں باتوں میں وہاں موجود کسی شخص نے ان کے ساتھ فوٹو لینے کی خواہش ظاہر کی، مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

اسی دوران سابق نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری بھی وہاں آ پہنچے۔ سب کو انہیں کا انتظار تھا۔ اپنے "غفور بھائی" کے اس خطبے کی صدارت اُن ہی کو انجام دینا تھی۔ پھر نورانی صاحب کو سہارے کے ساتھ سٹیج پر لے جایا گیا مگر جب انہوں نے بولنا شروع کیا تو اُن کی پیرانہ سالی ان پر ذرہ برابر بھی مغلوب نہ ہو سکی اور وہ کافی دیر تک بولتے رہے اور درجنوں سوالوں کا مدلل و مسکت جواب بھی دیا۔ موضوع خطبہ نہ صرف عصری معنویت رکھتا تھا بلکہ یہ نورانی صاحب کے سالہا سال طویل مطالعے سے براہ راست جڑا ہوا تھا۔ "بھارت کے مسلمان: ماضی اور حال" پر بولتے ہوئے نورانی صاحب نے وہ باتیں کہہ دیں جن کو حکومت وقت دبانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے، مگر نورانی صاحب جیسے حق گو کو کس بات کا ڈر؟ انہوں نے سابق نائب صدر جمہوریہ، سابق کابینی وزیر اور دہلی کے دانشور طبقہ کی موجودگی میں کہا کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سال 1857 اور 1947 سے بھی زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ 1857 کے انقلاب کے بعد انگریز تھے، 1947 میں تقسیم ہند کے بعد جواہر لال نہرو تھے، جن کی طرف مسلمان مدد کے لیے جا سکتے تھے مگر آج وہ بے سہارا اور بے یار و مددگار ہیں۔ آج مسلمان بغیر لیڈر کے ہیں، اُن کے خلاف بڑے پیمانے پر بھید بھاؤ برتا جا رہا ہے، نوکریوں میں وہ امتیازی سلوک جھیل رہے ہیں۔ ہاؤسنگ سیکٹر میں وہ تعصب کے شکار ہیں۔ اُن کی سیاسی نمائندگی پارلیمنٹ میں ابھی سب سے کم ہے۔ کیا مسلمانوں کی اس پسماندگی کے لیے صرف برسر اقتدار بھگوا تنظیمیں ہی ذمہ دار ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ان کی ترقی کے لیے سیکولر جماعتیں بھی پوری طرح سے ایماندار اور مخلص نہیں رہیں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ نہرو کے دور حکومت میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی گرتی چلی گئی؟ جب سوال جواب کی باری آئی تو میں نے اس پر نورانی صاحب کی رائے جاننی چاہی۔ میرے اس سوال کا مختصر جواب دیتے ہوئے نورانی صاحب نے کہا کہ نہرو کو اور بھی زیادہ کرنا چاہیئے تھا مگر نہرو ایسا کیوں نہیں کر پائے؟ نورانی نے اس سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا مگر نہرو کی مجبوری و بے بسی کا تذکرہ ضرور کیا۔ مولانا آزاد، رفیع احمد قدوئی کے علاوہ زیادہ تر بڑے کانگریسی رہنما جیسے راجندر پرساد، سردار پٹیل، جی بی پنت فرقہ وارانہ نظریہ کے حامل تھے اور نہرو کو اس طرح کا تعاون نہیں مل پایا جیسا وہ چاہتے تھے۔ نورانی صاحب کے مطابق اس وقت کے بڑے بڑے کانگریسی وزرائے اعلیٰ بدقسمتی سے مسلمانوں کے بارے میں منفی سوچ رکھتے تھے۔ آج جس رام مندر کے نام پر ملک کی سالمیت اور سیکولر نظریہ خطرے میں ہے، اس کے لئے نورانی صاحب نے جی بی پنت کو قصوروار ٹھہرایا۔ پنت اُس وقت اُتر پردیش کے کانگریسی وزیر اعلیٰ تھے۔

جہاں نورانی صاحب نے ملک کے پہلے وزیر اعظم نہرو کو سیکولر نظریہ کا حامل قرار دیا، وہیں انہوں نے موجودہ وزیر اعظم پر شدت پسند تنظیم آر آیس آیس کے ایجنڈے کو تھوپنے پر بے چینی ظاہر کی۔ جب 2014 میں انتخابات جیت کر مودی نے پہلی تقریر پارلیمنٹ میں کی، تب انہوں نے ہزار سال کی غلامی کی بات کہی جو کہ آر آیس کے موقف کی تائید ہے۔ ہزار سال کی غلامی کی افواہ اور نفرت انگیز پروپیگنڈا اچھیلا کر شدت پسند ہندوتوا عناصر مسلمانوں کو نشانہ بناتے رہے ہیں اور اس سازش کے پیچھے ان کی یہ منشا ہے کہ مسلمانانِ ہند اور اسلام کی پوری تاریخ اور اس کی خدمات کو نکارا جائے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ملک کے وزیر اعظم آئین کے مطابق بولنے اور کام کرنے کے بجائے آر آیس آیس کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہیں۔ تبھی تو موجودہ وقت کو نورانی صاحب نے مسلمانوں کے لئے سب سے بُرا وقت کہا۔ اس موقع پر نورانی صاحب نے مسلمانوں کے سامنے اپنی متعدد تجاویزات بھی رکھیں اور ان کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ "آئیسولیشن" (isolation) یعنی کنارہ کشی یا علاحدگی کی پالیسی سے گریز کریں اور وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ مل کر کام کریں اور "انوولومنٹ" (involvement) کی پالیسی اپنائیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے کہا کہ بابری مسجد سے متعلق جو سب سے اچھی تحقیق ہے، اُسے رومیلا تھاپر جیسے غیر مسلم مورخوں نے کی ہے۔ اس لئے مسلم تنظیموں کے دروازے تمام محکوم اور غیر مسلم کے لئے کھلے ہونے چاہیں۔ انہیں نے کہا کہ مسلمانوں کو دلتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہے مگر اس طرح کے تاثر دینے سے گریز کرنا چاہیئے کہ دلت مسلم اتحاد اکثریتی طبقہ کے خلاف بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ تحقیق اور ریسرچ کے میدان میں کام کریں۔ نورانی صاحب کی بیشتر باتیں فکر انگیز اور بالکل دُرست ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی کی ذمہ داری سرکار کی ضرور ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم اور آپ بھی اپنی ذمہ داری سے منہ نہ موڑیں۔ اسی لئے آج ملک کو ایک نہیں بلکہ بہت سارے اے جی نورانیوں کی ضرورت ہے۔

نوٹ: مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔
ویب سائٹ: abhaykumar.org

رام جی کے نام پر!

نفرت کی تجارت ہے سیاست کا فسانہ

کھری کھری سنئے
ابھے کمار
نئی دلی

9 دسمبر کے روز دارالحکومت دہلی میں زعفرانی وشو ہندو پریشد (وی ایچ پی) نے دھرم سبھا نامی ایک ریلی منعقد کی۔ اس میں شرکت کرنے کے لئے ہزاروں کی تعداد میں خود ساختہ رام بھکت جمع ہوئے۔ بھکتوں میں بڑی تعداد بے روزگار نوجوانوں کی تھی۔ میڈیا کے کیمرے دیکھ کر یہ اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر اچھل جاتے اور پھر زور سے کہتے "جے شری رام"۔ سب سارے رام بھکت رام لیلا میدان کی طرف مارچ کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھگوا "دھوج" (پرچم) تھا۔ ان میں سے بہت سارے بھکت چوٹ کرنے والا اسلحہ "گدا" بھی تھامے ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر ایسا گمان ہو رہا تھا کہ یہ کسی ریلی کی نہیں بلکہ کسی جنگ کی تیاری ہو۔ جب صحافیوں نے ان بھکتوں سے پوچھا کہ مندر کیوں بنانا چاہتے ہیں؟ تو انہوں نے اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا: بھگوان رام بغیر گھر (مندر) کے ہیں اور باقی لوگ محلوں میں رہ رہے ہیں۔ کیا دنیا کا "خالق" کسی گھر کا محتاج ہے؟ ان کو کون سمجھائے کہ بے گھر اگر کوئی ہے تو وہ بھگوان نہیں بلکہ اس کے غریب بندے ہیں۔ پھر جب پوچھا گیا کہ رام مندر بننے سے "وکاس" کیسے ہوگا؟ تو بھکتوں نے خالص سیاسی جواب دیا: "مودی جی نے وکاس کر دیا ہے اور اب مندر چاہیے"۔ رام مندر کا معاملہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے اور اس کا فیصلہ صادر ہونے تک سب کو انتظار تو کرنا ہی پڑے گا؟ اس سوال پر ان کا جواب بے حد ہی افسوس ناک تھا، جو ہندوستانی آئین کے منافی ہے اور عدالت عظمیٰ کی بے توقیری کرتا ہے۔ جواب یہ تھا "سپریم کورٹ سے بھی پرانے بھگوان رام ہیں اور جو ادارہ صرف ۱۰۰ سال پرانا ہو اس کی بات وہ کیوں مانیں؟" یعنی اس منہ میں رام بغل میں چھری کے مترادف بھکتوں کا اصل مقصد سیاسی ہے، خالص سیاسی۔ ان کی باتوں میں "آستھا" (عقیدت) کا نام ضرور لیا جاتا ہے، مگر اس کے پیچھے اصل مقصد سیاسی ہے اور بھگوا سیاسی جماعتوں کے لئے زمین تیار کرنا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو میڈیا سے بات کرتے ہوئے وہ بی جے پی کی حریف جماعت کانگریس پر جم کر نہیں برستے۔ انہوں نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ مودی پرتھوی راج چوہان کے بعد پہلا ہندو حکمران ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آزادی کے بعد غیر بی جے پی سرکاریں ہندو مخالف تھیں۔ اسی دوران بھکتوں نے پاکستان کو بھی بیچ میں لایا اور الٹا سوال کیا کہ اگر 125 کروڑ ہندوؤں کی آبادی والے بھارت میں رام مندر نہیں بنے گا تو کیا یہ پاکستان میں بنے گا؟ اگر پاکستان کا نام آیا تو مسلمانوں کا ذکر بھلا کیسے نہیں آتا؟ کئی جگہوں پر رام بھکتوں نے ایسے اشتعال انگیز نعرے بھی دئے جن کا واحد مقصد فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مشترکہ تہذیب اور ملکی سالمیت کو زک پہنچانا تھا۔ "ایک دھکا اور دو جامع مسجد توڑ دو" رام بھکتوں جیسے نعرے دیتے ہوئے بھگتوں کی ایک ٹکڑی مارچ کر رہی تھی۔ سوشل میڈیا پر وائرل ہوئے ویڈیو میں صاف صاف دیکھا جا سکتا تھا کہ یہ رام بھکت پورے ملک کے سامنے سرعام مسلم آبادی کے خلاف نفرت پیدا کر رہے تھے۔ اس پر ان کے خلاف قانونی کاروائی ہونی چاہیے مگر کرے گا کون؟ ان بھکتوں کو کون سمجھائے کہ 1857 کے انقلاب کے دوران جامع مسجد ہی انقلابیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ اسی جامع مسجد میں سر جوڑے ہندو اور مسلمان مل کر انگریزوں کے خلاف اپنا لائحہ عمل تیار کرتے تھے۔ دیس بھکتی کا دم بھرنے والے ان بھکتوں کو جامع مسجد کے خلاف واہیات بکنے سے پہلے یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ ان کے اس مذموم عمل سے ملک کی آزادی کے لئے مر مٹنے والے شہیدوں کا دل کتنا مجروح ہوا ہوگا۔ پیارے دیس کی بدقسمتی دیکھئے کہ یہ بھکت رام مندر تعمیر کے نام پر اپنے ہی بھائیوں اور ہم وطنوں کے تئیں عداوت کا جذبہ رکھتے ہیں۔ سیاسی و معاشی طور طور ملک کی سب سے کمزور مسلم کمیونٹی کو نشانہ بنا کر یہ ملک کی کس ہمہ جہت ترقی کی بات کرتے ہیں؟ "سب کا ساتھ سب کا وکاس" کا مطلب کیا ہے؟ وہ کمیونٹی جس کے حالات کئی معاملوں میں آج دلتوں سے بھی خراب ہیں، وہ کمیونٹی جو تعلیمی، سماجی، اقتصادی طور پر پچھڑتی ہی چلی جا رہی ہے، سرکاری اور نجی اداروں میں جس کے خلاف سرعام بھید بھاؤ برتا جاتا ہے، وہ کمیونٹی جس کی نمائندگی پارلیمنٹ میں آج آزادی کے بعد سب سے کم ہے، مگر جیلوں میں ان کا تناسب ان کی شرح آبادی سے کہیں زیادہ ہے، کیا اس کمیونٹی کو ٹارگیٹ بنا کر بھکت ملک کو پیچھے نہیں دھکیل رہے ہیں؟ ہاں، مگر یہ سب کچھ یہ لوگ ایک نفرت انگیز جادوئی سیاست کے زیر اثر کر رہے ہیں۔ اسی فرقہ وارانہ سیاست کے نشے میں یہ رام بھکت بھگوان رام کے نام پر سرعام اشتعال انگیزیاں کرتے جا رہے ہیں۔ ان کے خلاف حکومت کو فوراً کاروائی کرنی چاہیے اور جمہوریت نواز سول سوسائٹی کو ان کی جم کر مذمت کرنی چاہیے، مگر اس حکومت سے کیا امید ہو سکتی ہے، جس کے دکھانے کے دانت "وکاس" کے ہیں مگر کھانے کے دانت "وناش" کاری کے ہیں۔ اب تو مودی جی اور بی جے پی کا جادو پہلے جیسا ابھی نہیں رہا۔ حال ہی میں تین ریاستوں میں ان کی سرکار کو عوام نے شکست دی ہے۔ اس لئے اب ان کو صرف بھگوان رام پر سیاست کرنے میں اپنی کرسی محفوظ دکھ رہی ہے۔ جوں جوں پارلیمانی انتخابات قریب آتے جا رہے ہیں، توں توں رام مندر کا معاملہ اور زیادہ گرمایا جا رہا ہے۔ غالباً یہ وجہ ہے کہ وی ایچ پی پھر سے رام مندر بابری مسجد تنازعہ کے گڑے مردے کو اکھاڑ رہی ہے۔ یاد رہے کہ رام مندر کو وی ایچ پی نے 19 اگست 1984 کو چھیڑا اور کچھ ہی سال کے اندر اس نے بابری مسجد منہدم کرانے میں کلیدی رول ادا کیا تھا جس کی زد میں آکر سینکڑوں لوگ ہلاک ہو گئے۔ وی ایچ پی اس جن کو بوتل سے پھر سے نکالنے کی کوشش میں ہے۔ رام لیلا میدان کی ریلی کا مقصد ایک بار پھر ہندوؤں کو مذہب کے نام پر غیر ہندوؤں کے خلاف کھڑا کرنا ہے۔ تبھی تو وی ایچ پی کے لیڈروں نے رام لیلا میدان سے چیخ چیخ کر کہا کہ مندر تعمیر کا معاملہ 125 کروڑ ہندوؤں کی "آستھا" سے جڑا ہوا ہے۔ ہندو اب اور انتظار نہیں کر سکتے ہیں۔ سرکار کو چاہیے کہ وہ رام مندر تعمیر راہ کو ہموار کرنے کے لئے آرڈیننس لائے۔

قومی انتخابات سے عین قبل عدالت عظمیٰ میں زیر سماعت رام مندر جھگڑے کو پھر سے چھیڑنا ایک خالص سیاسی مہم بازی ہے جس کا "آستھا" یا عقیدہ سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ مدعا لوگوں کو بانٹنے اور آپس میں گتھم گتھا کرنے کی سازش ہے۔ خود بھاجپا کے سینئر لیڈر اور مودی حکومت میں وزیر خارجہ سشما سوراج نے 14 اپریل 2000 کو تسلیم کیا تھا کہ رام جنم بھومی آندولن خالص سیاسی ہے اور اس کا دین دھرم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میری حقیر رائے میں دھرم کو سچا ماننے والا دھرم کے نام پر کبھی سیاست نہیں کرتا۔ میرے نزدیک اگر کوئی سچے معنوں میں رام بھکت ہے وہ میری ماں ہیں جسے بچپن سے ہی میں نے بھگوان رام کی پوجا بڑے عجز و انکسار سے کرتے دیکھا ہے۔ آج تک کبھی بھی اس نے اکڑ کر "جے شری رام" نہ بولا۔ نہ ہمیں کبھی بھگوان رام کے نام پر تلوار یا ترشول اٹھانے کو کہا، نہ ہی کبھی اس بات کا بھولے سے ذکر کیا کہ بھگوان رام کا مندر کسی مسلمان بادشاہ نے توڑا ہے۔ ان کے جیسے سچے بھکتوں کے لیے رام ان کے دلوں کے تہ خانے میں بستے ہیں جسے لوگوں کی سیوا اور آدر سے پیار ہے۔ جب تک میری ماں جیسی مثبت سوچ اور حقیقی آستھا رکھنے والے ہندو ملک میں زندہ ہیں، تب تک نقلی بھکتوں کے منفی عزائم کبھی پورے نہیں ہوں گے۔ کالم ختم کرنے سے پہلے ہندی کے مشہور شاعر عدم گونڈوی کو یاد کرنا چاہوں گا، جن کے پیغام کو اگر شدت پسند عناصر اپنا لیں تو سارا جھگڑا ہی ایک پل میں حل ہو جائے۔

ہندو یا مسلم کے احساسات کو مت چھیڑئے
اپنی کرسی کے لیے جذبات کو مت چھیڑئے

نوٹ: مضمون نگار جے این یو، نئی دلی میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔

□□□□□

سلمان ندوی کی لن ترانیاں

ثالثی نہیں انصاف!

گستاخی معاف

ابھے کمار

جے این یو، نئی دلی

میں مولانا سلمان ندوی سے کبھی نہیں ملا اور نہ ہی ان کی کوئی کتاب پڑھی۔ ہاں ان کے بارے میں گذشتہ کئی سالوں سے ندوہ کے دوستوں سے سنتا ضرور آرہا ہوں۔ بسا اوقات میں نے ان کی جوشیلی تقریریں سوشل میڈیا پر سنتا رہا ہوں۔ چنانچہ ان کے بارے میں میری رائے یہ بنی کہ وہ اسلام کو زندگی کے ہر شعبہ میں اپنانے کے پیروکار ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مسلم معاشرہ اور مسلم مما لک کی پریشانیوں سے بھی کافی مایوس ہیں مگر حالیہ دنوں میں بابری مسجد۔رام مندر تنازعہ سے متعلق جس طرح کا موقف انہوں نے اختیار کیا ہے اس سے مجھے بہت مایوسی ہوئی اور میں اپنے تاثرات قلم بند کئے بغیر نہ رہ سکا۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ جب بابری مسجد کا معاملہ عدالت عظمیٰ میں زیر سماعت ہے، تو کورٹ سے باہر صلح کرنے کی بات کر کے سلمان ندوی کس فریق کی نمائندگی کر رہے ہیں؟ بابری مسجد زمین کی ادلا بدلی کرنے کا حق ان کو کس نے دے رکھا ہے؟ کیا انہوں نے اپنی پیش کش سامنے رکھنے سے پہلے کسی سے مشورہ کیا تھا؟ اگر یہ ساری بات وہ بطور ایک دانشور کر رہے تھے تو اس دانشوری پر بھی بہت سارے سوالات اٹھائے جاسکتے ہیں؟

جس طرح سے سلمان ندوی مسلمانوں کے نمائندہ نہیں مانے جاسکتے، اسی طرح سے شری شری روی شنکر ہندوؤں کے نمائندہ نہیں ہیں۔ آپ سبھی جانتے ہیں کہ روی شنکر ایک مخصوص پارٹی کے حمایتی ہیں اور اسے برسر اقتدار لانے میں انہوں نے چار سال پہلے کافی محنت کی ہے۔ آپ سب کو یاد ہوگا کہ منموہن سنگھ کی قیادت والی گزشتہ حکومت کے خلاف بدعنوانی کا جو ماحول بنا تھا، اس میں روی شنکر نے بھی اپنا اہم رول ادا کیا اور کالا دھن کے خلاف آواز بلند کی مگر جب موجودہ سرکار نے کالا دھن کے اپنے وعدے کو صرف ایک چناوی جملہ کہا، تو روی شنکر نے کوئی مذمتی بیان نہیں جاری کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک خاص حکومت کو اقتدار سے باہر کرنے کے لئے روی شنکر بابا سے سیاست دان بن جاتے ہیں اور جب ان کی پسندیدہ سرکار اقتدار پر قابض ہو جاتی ہے، تو وہ پھر سے سنیاسی بن جاتے ہیں اور سیاست سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں؟

یہ سب میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ سلمان ندوی نے روی شنکر کی اتنی تعریف کی گویا کہ وہ روی شنکر سے مکالمہ نہیں بلکہ ان سے اپنی بھکتی کا اظہار کر رہے ہوں۔ روی شنکر نے کچھ سال پہلے دہلی کے جمنا کنارے ایک بڑا پروگرام منعقد کیا تھا، جس کی وجہ سے ماحولیات کو کافی نقصان ہوا تھا اور ان پر جرمانہ بھی عائد کیا گیا تھا، اور روی شنکر بڑے پیمانہ پر تنقید کا نشانہ بھی بنے تھے۔ سلمان ندوی جب روی شنکر کی تعریف کے پُل باندھ رہے تھے، تو ان کو کم از کم یہ نہیں بھولنا چاہئے تھا کہ اسلام میں بھی ضرورت سے زیادہ کسی کی تعریف کو صحیح نہیں مانا جاتا ہے۔ میں نے روی شنکر سے جڑے بعض پہلوؤں کی طرف اس لئے اشارہ کیا کہ روی شنکر ایک خاص سیاسی جماعت اور نظریہ کی نمائندگی کرتے ہیں، وہ پورے ہندو سماج کے نمائندے نہیں ہیں۔ کورٹ سے باہر بابری مسجد کے تنازعہ کو حل کرنے کے پیچھے ایک خاص سیاسی مقصد ہے۔ تعلیم، روزگار، صحت اور دیگر فلاحی کاموں میں موجودہ حکومت کی بڑی ناکامی کو ڈھکنے کے لئے رام مندر کا مسئلہ اٹھایا جا رہا ہے تا کہ مذہب کے نام پر بھاجپا ووٹ لے سکے۔ رام مندر بنانے کا پلان تب ہی آسان ہوسکتا ہے، جب بابری مسجد کی زمین مسلمان دوسرے فریق کو دے دیں۔ انہیں سارے مقاصد کو دھابن میں رکھ کر آج عدالت سے باہر صلح کی بات ہو رہی ہے اور سلمان ندوی جیسے عالم دین اس پوری بات کو سمجھ نہیں پا رہے ہیں یا پھر کسی وجہ سے ان پر پردہ ڈال رہے ہیں۔
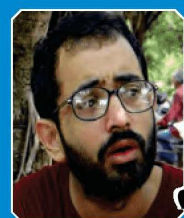
میرے کئی سارے مسلم احباب نے مجھ سے پوچھا کہ کورٹ سے باہر بابری مسجد کو سلجھا لینے میں دقت کیا ہے؟ کیا اس سے ملک میں ہندو۔مسلم اتحاد کو مضبوطی نہیں ملے گی؟ میں ان کے جذبے کی صداقت کو سلام کرتا ہوں اور ان ہی کی طرح میرا بھی یہی خواب ہے کہ ہمارے ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور ہم سب محبت، ہم آہنگی اور بھائی چارے کی فضا میں زندگی گزاریں مگر یہ سب خواب دیکھنے سے ہی صرف حاصل نہیں ہو جائے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے حق کی بات کرنا اور صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنا، مگر اس طرح کی حق گوئی نہ تو روی شنکر نے ہی کی اور نہ سلمان ندوی نے۔ سلمان ندوی اور روی شنکر کا جو ویڈیو وائرل ہوا ہے اس میں سلمان ندوی نے کہا کہ شدت پسندوں کے لیے اس سماج میں کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ جنگل میں چلے جائیں۔ سلمان صاحب کو تاریخ اور سماجی علوم کا اور زیادہ مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ہمارے سماج کے لوگوں نے اکثر ایسے غیر انسانی کام کیے ہیں جس کی کوئی تاریخ نام نہاد جنگلی لوگوں میں نہیں ہے۔ کیا کبھی جنگل میں رہنے والے لوگ نے سر عام کسی مقدس مقام کو شہید کیا ہے اور اس کے بعد ہزاروں لوگوں کو سیاسی مفاد کے لئے ہلاک کیا ہے؟ مگر ہمارے سیکولر ملک میں ایسا خوفناک واقعہ پیش آیا ہے۔ جو لوگ آج کورٹ سے باہر بابری مسجد کو سلجھا کر ہندو۔مسلم اتحاد کے خواہش مند ہیں وہ جب مسلمانوں کی فلاح اور بہبود پر مشتمل امور کی بات آتی ہے تو سب سے پیچھے کیوں چلے جاتے ہیں؟ سلمان ندوی جس طرح سے بابری مسجد کی زمین کو "ہم آہنگی" کے نام پر دوسرے فریق کو دینے کی وکالت کر رہے ہیں، انہوں نے بات کی شروعات مسلمانوں کی بدحالی اور اس کے اسباب اور تدابیر سے کیوں نہیں کی؟ اگر سلمان ندوی مسلمانوں کو بھائی چارگی کے نام پر اپنی مقدس سرزمین کو دوسروں کو دینے کی بات کر سکتے ہیں تو کم از کم روی شنکر سے ان کی بھی رائے لینی چاہیے تھی کہ وہ مسلمانوں کو انصاف دلانے کے لے کیا کریں گے؟ کیا وہ اس بات کی ضمانت دیں گے کہ حکومت اس کے بعد کسی بھی مذہبی مقامات کی مکمل تحفظ کی ذمہ داری لے گی؟ کیا بابری مسجد۔رام مندر تنازعہ کی زد میں آنے والے سارے لوگوں کو انصاف ملے گا؟ کیا نفرت پھیلانے والے سارے لوگوں کو سزا ملے گی؟ کیا سرکار شدت پسند تنظیم اور اس سے وابستہ عناصر کو قانون شکنی کے جرم میں گرفتار کرے گی؟ کیا مسلمانوں کے فلاح اور بہبودی کے مسائل جیسے ریزرویشن کو بھی سرکار کورٹ میں چیلنج نہیں کرے گی اور مل بیٹھ کر اس کی راہ ہموار کرے گی؟

قارئین کو بھی بخوبی معلوم ہے کہ بابری مسجد مسئلہ کو کورٹ سے باہر حل کرنے کی بات اس لئے ہو رہی ہے کیوں کہ موجودہ حکومت اسے اگلے پارلیمانی انتخابات میں ایک بار میدان مارنا چاہتی ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ عدالت میں بابری مسجد کے وجود کو نکارنا اتنا اسان نہیں ہے۔ سلمان ندوی جیسے عالم اگر ان سارے پہلوؤں کو نظر انداز کر صرف مسجد کی زمین دینے کی بات کرتے ہیں، تو وہ ایک خاص ایجنڈے کو جانے انجانے میں آگے بڑھا رہے ہیں، جو کہ نہایت ہی افسوس ناک ہے۔

نوٹ : مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں

بھارت چھوڑو تحریک: قومی تحریک آزادی کا اہم موڑ

انبھے کمار

بھارت چھوڑو تجویز کانگریس پارٹی نے اپنے بمبئی اجلاس میں ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو دی تھی۔ عام لوگوں کے درمیان اس تحریک کو "اگست کرانتی" یا "اگست انقلاب" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ کی فوج جاپان، جرمنی اور ان کی حمایتی قوتوں کے خلاف لڑ رہی تھی۔ جاپان کی فوج جو نازی کیمپ میں شامل ہو چکی تھی اور اس نے ایک ایک کرکے جنوبی مشرقی ایشیا کے کئی خطوں پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اور جاپانی فوج ہندوستان کے شمالی مشرقی سرحد کے قریب بھی پہنچ چکی تھی۔ اس نازک وقت میں برطانیہ حکومت ہندوستان کی مدد چاہتی تھی مگر کانگریس اس ضد پر آمادہ تھی کہ جب تک برطانیہ سے ہندوستان کو آزادی نہیں مل جاتی تب تک وہ انگریزی حکومت کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اسی درمیان برطانیہ حکومت نے اپنے کابینہ وزیر کرسپ کو، جو لیبر پارٹی کے نامور رہنما تھے اور ہندوستانی قومی تحریک کے ہمدرد بھی تھے، کانگریس پارٹی سے گفتگو کرنے کے لیے ہندوستان بھیجا۔ یہ میٹنگ بغیر کسی نتیجے کے ختم ہو گئی اور کانگریسی رہنما ایک تحریک چھیڑنے پر غور وخوض کرنے لگے۔ کانگریس نے 'کرسپ' کے سامنے اپنا موقف دہرایا تھا کہ برطانوی حکومت کو تعاون تبھی مل سکتا ہے جب ہندوستان کو آزادی ملے۔

کرسپ مشن کے ناکام ہونے کے بعد گاندھی نے مذکورہ بمبئی اجلاس میں "کرو یا مرو" کا نعرہ دیا۔ اس موقع پر گاندھی نے خطاب کرتے ہوئے لوگوں سے سر پر کفن باندھ کر انگریزی حکومت کے خلاف احتجاج کرنے کی اپیل کی۔ اگلے دن یعنی ۹/اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس کے تمام بڑے رہنما بشمول گاندھی، گرفتار کر لیے گئے، جس کے سبب عوام بھڑک اٹھی۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے برطانیہ حکومت کے تئیں عوامی غم و غصہ کے اور کئی وجوہات تھے جیسے مہنگائی اور ضروری اشیاء کی قلت جس نے لوگوں کی عام زندگی کو مفلوج کر دیا تھا اور ساتھ ہی زخمی ہندوستانی سپاہیوں کی واپسی جو برطانیہ حکومت کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ یہ سب دیکھ کر ہندوستانی عوام میں میں برطانیہ حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ شعلہ بن کر بھڑک اٹھا۔ برطانیہ حکومت نے اس تحریک کو دبانے کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا، عوام کے اوپر لاٹھیاں چلائی گئیں، پریس کی آزادی کو ختم کیا گیا اور ہر چیز کی جاسوسی کروائی گئی، مگر عوام بھی کہاں دبنے والی تھی۔ ہندوستان کے کئی صوبوں اور خطوں جیسے بہار، بنگال، بمبئی، گجرات، احمد آباد میں زبردست عوامی مظاہرے ہوئے۔ حالانکہ گاندھی اور کانگریس کی پالیسی عدم تشدد کی رہی ہے، لیکن کئی مواقع ایسے آئے جب عوام گاندھی کے نام پر متشدد بھی ہوئی۔ نتیجتاً سرکاری دفتروں میں آگ زنی کی گئی اور ساتھ ہی پولیس اسٹیشن، پوسٹ آفس، ڈاک گھر، تار گھر کو بھی نقصان پہونچایا گیا۔ رابطے کے جو سائل تھے جیسے پل، ٹیلیفون کے تار وغیرہ ان کو منقطع کر دیا گیا۔ اس طرح کئی علاقے انگریزی حکومت کی انتظامیہ سے باہر ہو گئے۔ کئی مقامات جیسے بلیا میں متوازی حکومتیں بھی قائم کی گئیں۔ ریل کی پٹریاں اکھاڑی گئیں، سرکاری عمارتوں پر قومی پرچم لہرایا گیا، انگریزی افسران اور سپاہیوں کے اوپر بھی حملے کیے گئے۔

لوگوں کی یہ تحریک اتنی شدید تھی کہ بہار کا ترہٹ ڈویزن، انگریزی اقتدار سے وقتی طور پر آزاد ہو گیا۔ کئی دنوں تک پٹنہ پر بھی باغیوں کا قبضہ رہا اور اس طرح عوامی غصے نے یہ دکھا دیا کہ انگریزی حکومت، اب ہندوستان میں چند دن کے مہمان ہیں۔

ایک طرف نیشنلسٹ نظریہ کے مورخین ۱۹۴۲ء کی "بھارت چھوڑو تحریک" کو ہندوستانی قومی تحریک کا ایک بڑا باب مانتے ہیں اور ان کی یہ دلیل ہے کہ انگریزوں کے خلاف یہ عوامی بغاوت ۱۸۵۷ء کی یاد تازہ کرتی ہے۔ دوسری طرف ہندوستانی قومی تحریک اور کانگریس کی پالیسی کے اوپر تنقیدی نظریہ رکھنے والے دیگر مورخین کا ماننا ہے کہ ۱۹۴۲ء کی بھارت چھوڑو تحریک ایک خاص حصے میں واقع ہوئی تھی، بلکہ خود کانگریس کے سرکردہ رہنما سی راجہ گوپالا چاری اس تحریک متفق نہیں تھے۔ راجہ گوپالا چاری کے ساتھ ساتھ جناح اور ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اس تحریک میں کانگریس کا ساتھ نہ دیا۔ اسی طرح بھارت کی کمیونسٹ

■ بھارت چھوڑو تحریک کو دبانے کے لیے انگریزوں نے پولیس اور فوج کا استعمال کیا۔ باغیوں کو پکڑا گیا، ان کے خلاف جرمانہ عائد کیے گئے اور انہیں قمچیوں سے پیٹا بھی گیا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس پورے تحریک کے دوران تقریباً دس ہزار افراد ہلاک ہو گئے اور چند مہینے کے اندر ہی برطانیہ حکومت اس تحریک کو دبانے میں کامیاب ہو گئی۔

پارٹی نے بھی اس تحریک میں کانگریس کی مخالفت کی، کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ اس وقت، جب فاشسٹ قوتیں جمہوریت کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھری ہیں اور ایک کے بعد ایک ملک پر قابض ہو رہی ہیں، اس لیے یہ وقت صحیح نہیں ہے کہ فاشزم سے لڑ رہی انگریزی حکومت کے خلاف تحریک چھیڑی جائے۔ حالانکہ کمیونسٹ پارٹی کے اس موقف کو آج تک کانگریس اور اس کے حمایتی ملک کے ساتھ غداری سے تعبیر کرتے ہیں اور کمیونسٹوں کی حب الوطنی پر سوالیہ نشان لگاتے رہتے ہیں۔ کمیونسٹ موقف کے خلاف نامور اور نیشنلسٹ نظریہ کے مورخ وپن چندرا نے دلیل دی ہے کہ کانگریس پارٹی نے ہمیشہ سے ہی فاشزم کے خلاف لڑی ہے اور وہ چاہتی تھی کہ جمہوریت کے تحفظ کے لیے عوام برطانوی حکومت کا ساتھ دے لیکن ساتھ ساتھ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ فاشزم کے خلاف لڑائی میں وہ اپنے ملک کی آزادی کا مسئلہ ترک نہیں کر سکتے۔ اپنی دلیل کو تقویت دینے کے لیے پروفیسر چندرا، گاندھی کے اس خط کا بھی حوالہ دیتے ہیں جسے انہوں نے ۱۹۴۰ء میں وائسرائے کو لکھا تھا۔ گاندھی اپنے اس خط میں ہندوستان کی آزادی کے مطالبہ کو پرزور طریقے سے اٹھاتے ہیں اور برطانیہ حکومت پر یہ واضح کر دیتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے نزدیک فاشزم اور مطلق العنان برطانوی حکومت میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔ اس لیے ہندوستان سے جنگ میں تعاون کی امید کرنا اور ساتھ ہی اسے غلام بنائے رکھنا کسی بھی طرح مناسب نہیں۔ جیسا کہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ کانگریس چاہتی تھی کہ برطانیہ حکومت اسے آزادی دے اور پھر وہ اس کا تعاون فاشزم کے خلاف لے، حالانکہ برطانیہ حکومت کانگریس پر یہ الزام لگاتی ہے کہ کانگریس نے اس وقت برطانیہ سرکار کے خلاف بغاوت کی، جب فاشزم کا خطرہ لاحق تھا اور یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کانگریسیوں کے فاشسٹ قوتوں کے ساتھ خفیہ تعلقات تھے۔ مگر اس انگریزی دلیل کو مارکسی مورخ سومت سرکار پوری طرح سے خارج کرتے ہیں اور ان کی دلیل ہے کہ برطانیہ حکومت کی کانگریس کے خلاف فاشسٹ طاقتوں کو مدد دینے کا یہ الزام اس کے ظالمانہ پالیسی پر پردہ ڈالنے کی کوشش تھی اور برطانیہ حکومت اس طرح کے الزامات سے اپنے غیر جمہوری اور ظالمانہ اقدامات کے لیے رائے عامہ ہموار کر رہی تھی۔

بھارت چھوڑو تحریک کو دبانے کے لیے انگریزوں نے پولیس اور فوج کا استعمال کیا۔ باغیوں کو پکڑا گیا، ان کے خلاف جرمانہ عائد کیے گئے اور انہیں قمچیوں سے پیٹا بھی گیا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس پورے تحریک کے دوران تقریباً دس ہزار افراد ہلاک ہو گئے اور چند مہینے کے اندر ہی برطانیہ حکومت اس تحریک کو دبانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس سے بڑے پیمانے پر عوامی احتجاج تو ختم ہو گیا لیکن خفیہ طور پر قومی تحریک کے بہت سے مجاہدوں نے اپنی کاروائی جاری رکھی۔

اس تحریک سے جڑا ہوا ایک تنازعہ تشدد اور عدم تشدد کے طریقۂ احتجاج پر تھا۔ مثال کے طور پر نامور مورخ گیان پانڈے اپنی تحریر میں حوالہ دیا ہے کہ غازی پور میں عوام گاندھی کے نام پر تشدد کے راستے پر چل نکلی تھی۔ غازی پور کے عوام نے اعتراف کیا کہ جہاں ایک طرف وہ گاندھی کے اپیل پر انگریزوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں وہیں دوسری طرف وہ بھگت سنگھ کے راستے پر چلتے ہوئے انگریزوں کو پرتشدد طریقے سے جواب بھی دے رہے ہیں۔ اس طرح کے واقعات کے ذکر کرنے کے پیچھے مورخ گیان پانڈے کا مقصد یہ ہے کہ آزادی کی تحریک صرف اور صرف کانگریس کے زیر قیادت میں ہی نہیں لڑی جا رہی تھی۔ کانگریس بلاشبہ ایک بڑی جماعت تھی مگر ملک کے مختلف حصوں میں عوام، کانگریس کی سیاست سے دور اپنے ہی طریقے سے انگریزوں کے خلاف اپنے حلقے میں لڑ رہی تھی۔ جہاں ایک طرف کانگریس بڑے سرمایہ داروں اور زمینداروں کے خلاف بغاوت کرنے سے ہچکچاتی تھی، وہیں عوام اسی گاندھی کے نام پر ان زمینداروں اور سرمایہ داروں کے اوپر وقتاً فوقتاً حملہ کرنے لگی تھی۔ دوسرے لفظوں میں آزادی کی تحریک صرف کانگریس اور کانگریس کے رہنماؤں کے اردگرد ہی نہیں گھوم رہی تھی بلکہ کانگریسی اور سماج کے امیر اور اشرافیہ طبقے کے حلقے سے دور، ایک دوسرے حلقے میں عوام جیسے مزدور، کسان، آدی واسی، دلت اور دیگر خود اپنی زندگی کے روزمرہ مسائل کے تناظر میں احتجاج کے مختلف طریقوں کو اپنا رہی تھی۔ بہرحال وقت کی قلت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان تاریخی واقعات پر مزید تجزیہ کیا جائے۔ ■■

(جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

Inquilab, May 23, 2019

آج ملک کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا

آخر کیا وجہ ہے کہ ایگزیٹ پولز اکثر محروم طبقات کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعتوں کے خلاف جاتے ہیں

ابھے کمار

آج کا دن ہندوستانی جمہوریت کے لیے کافی اہم ہے۔ آج ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ ہونا ہے۔ دیکھنا ہے کہ کیا آج فرقہ پرستی، بدامنی اور غریب مخالف سیاسی جماعت منہ کے بل گرتی ہے اور سیکولر اور عوام حامی پارٹیاں حکومت سازی کرتی ہیں؟ جس وقت میرا یہ مضمون آپ تک پہنچے گا تب تک آپ کے سامنے ٹی وی پر رجحانات آنے شروع ہو جائیں گے۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ عوام نے کیا فیصلہ دیا ہے۔ اب سب کچھ ووٹنگ مشین کے سینوں میں دفن ہے۔ مگر جو کچھ بھی سروے اور ایگزٹ پول کے نام پر دکھایا جا رہا ہے، اس پر میرا زیادہ بھروسہ نہیں ہے۔ عوام کی پریشانی اور ناراضگی کو محسوس کرتے ہوئے، مجھے نہیں لگتا کہ ایگزٹ پولز کی پیشن گوئی صحیح ہے اور برسر اقتدار جماعت ایک بڑے مینڈیٹ کے ساتھ دوبارہ آرہی ہے۔ ایگزیٹ پولز سروے نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ نریندر مودی کی زبردست واپسی ہورہی ہے۔ اتنا ہی نہیں بہت ساری ریاستوں میں جہاں بی جے پی کی حالت بہت بہتر نہیں ہے، وہاں اسے کلین سویپ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

آپ ہی سوچیے جب سماجوادی پارٹی، بہوجن سماج پارٹی اور راشٹریہ لوک دل مل کر ضمنی انتخابات میں بی جے پی کو گورکھپور اور کیرانا میں ہرا سکتی ہے تو پھر وہ بی جے پی کو اُتر پردیش میں کیوں نہیں روک سکتی ہے؟ کیا میڈیا اور سروے کرنے والے یہ بھول گئے کہ حالیہ انتخابات میں بی جے پی بہار، راجستھان، چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش میں اقتدار سے باہر کردی گئی تھی، مگر اب ان ریاستوں میں بی جے پی کو کلین سویپ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ کیا یہ سب معجزہ مودی جی کے پوجا ارچنا سے ہو رہا ہے؟

میڈیا کا مودی پریم دیکھیے کہ اُن کی قیادت والی این ڈی اے کو ۳۵۰ سیٹ حاصل کرتے ہوئے دکھایا جا رہا ہے۔ حالانکہ میڈیا میں ایسی بھی خبر آئی تھی کی آر ایس ایس کو یہ ڈر بیٹھ گیا ہے کہ مودی کی مقبولیت کم ہوتی جارہی ہے اور اس بار اُن کو واضح اکثریت حاصل ہوتے نہیں دکھ رہی ہے۔ لہٰذا آر ایس ایس نے نتن گنکری کو آگے کرنا شروع کردیا اور وہ اس بات کی تیاری میں لگ گئی کہ اگر مخلوط حکومت بنتی ہے تو مودی کی جگہ گنکری لیں گے۔ مگر ایگزٹ پولز نے کچھ اتنا اچھا کہا ہے جس کی اُمید مودی اور امت شاہ کو بھی نہیں تھی۔ کیا اس سب کے پیچھے کوئی اور وجہ تو نہیں ہے؟ یہ بھی افسوس کا باعث ہے کہ میڈیا تمام صحافتی ضابطوں کو طاق پر رکھ کر ایک خاص سیاسی جماعت کی ترجمانی کر رہی ہے۔ ایگزٹ پول کے روز ایک مشہور ہندی چینل پر ایک خاتون اینکر کچھ اس انداز میں سروے کے نتائج کو پڑھ رہی تھی گویا وہ خود اس پارٹی کی ترجمان ہو۔ ماحول کچھ ایسا بنایا جارہا ہے گویا مودی کے علاوہ ملک میں کوئی دوسرا کامیاب لیڈر نہیں ہے۔ یہی نہیں بی جے پی کو ایسی پارٹی بنا کر پیش کیا جارہا ہے گویا کوئی باقی سیاسی جماعت نکمی ہے۔ ٹی وی شو میں اینکر یہ کہنے سے گریز نہیں کر رہے ہیں کہ راہل گاندھی، تیجسوی یادو، اکھلیش یادو میں قیادت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ صرف ذات پات، برادری، اور مذہب کے نام پر لوگوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ ان کے برعکس، میڈیا مودی اور اُن کی سرکار پر مہربان بنی ہوئی ہے۔ میڈیا کے مودی پریم کی ایک بڑی وجہ شاید یہ بھی ہے کہ جتنا اُن کی

سروے کرنے والوں کو کون سمجھائے کہ ہندوستان میں زیادہ تر لوگ محروم طبقات سے آتے ہیں، وہ اعلیٰ ذاتوں کے خوف کی وجہ سے اپنی رائے میڈیا کے سامنے پیش کرنے سے کتراتے ہیں۔ میڈیا والوں کو چاہیے کہ وہ اُن کے دلوں میں بیٹھے درد کو سمجھیں۔ مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب اکثر ایک مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ انہی وجوہات سے مجھے لگتا کی انتخابات کے نتائج ان پیشن گوئیوں سے الگ ہوں گے۔

سرکار تشہیر کرنے پر پیسہ خرچ کرتی ہے وہ لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار میڈیا میں پیسہ لگائے ہوئے ہیں۔ ان میڈیا ہاؤس کی مدد سے یہ سرمایہ دار ایک خاص پارٹی کے حق میں ماحول بناتے ہیں۔ اور جب سیاسی پارٹیاں جب اقتدار میں پہنچتی ہیں تو پھر اپنی پالیسیوں سے سرمایہ داروں کی مدد کرتی ہے۔ سیاسی جماعت، سرمایہ دار اور میڈیا کے مابین اس گٹھ جوڑ کو سمجھے بغیر ہم سیاست کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ میں ایگزٹ پولز کو اسی سیاق میں دیکھتا ہوں۔ انتخاب کا نتیجہ جو بھی ہو، اُن کی طرف سے پوری کوشش کی جارہی ہے کہ مودی اور بی جے پی کو اپوزیشن سے کوسوں آگے دکھایا جائے۔ ہر وقت پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ مودی کی ٹکر میں کوئی نہیں ہے۔ اپوزیشن کو زیرو بنا کر پیش کیا جارہا ہے۔ ایسا ماحول بنایا جارہا ہے کہ مودی کے ہٹتے ہی پورا ملک تاش کے پتوں کی طرح بکھر جائے گا۔

حالت اس طرح خراب ہوگئی ہے کہ مودی کی حمایتی میڈیا کی تنقید کو مودی اور دیش پر حملے سے جوڑ کر دیکھا جارہا ہے۔ اگر کسی شخص نے ایگزٹ پولز کی پیشن گوئی سے عدم اتفاق ظاہر کیا تو کہا جا رہا ہے کہ وہ حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں۔ اگر کسی نے الیکٹرانک ووٹنگ مشین پر سوال اٹھایا تو اسے ملک کے ادارے پر حملے سے جوڑ کر دیکھا جارہا ہے۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر امریکہ میں بیلٹ پیپر پر انتخاب کیوں ہوتا ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ بھاجپا کے اعلیٰ سیاست دان نے بھی بیلٹ پیپر پر انتخابات کرنے کا مطالبہ کیا تھا؟ میرے بعض اعتراضات ایگزٹ پول جیسے سروے سے بھی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اکثر ان سروے میں بی جے پی اور اُن کے حمایتیوں کو فاتح کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے؟ کیوں اکثر مواقع پر اُن کی سیٹوں کو بڑھا چڑھا کر دکھایا جاتا رہا ہے، مگر جب حتمی نتائج کا اعلان ہوتا ہے تو تصویر کچھ اور ہی ہوتی ہے؟ مثال کے طور پر گذشتہ سالوں میں منعقد ہوئے بہار کے انتخابات کو ہی لے لیجیے۔ کئی موقعوں پر لالو اور رابری کی سرکار کو ایگزٹ پولز میں ہارتے ہوئے اور بی جے پی کو جیتتے ہوئے دکھایا گیا ہے، مگر جب نتائج سامنے آئے تو شکست بی جے پی کی ہوئی۔ کچھ ایسا ہی ۲۰۱۵ء کے اسمبلی انتخابات میں بھی دیکھنے کو ملا جب پھر سے بی جے پی کو انتخابات جیتتے پیش کیا گیا۔ مگر پھر جیت لالو کی ہوئی۔ ۲۰۰۴ء میں بھی اسی طرح بی جے پی کو ایگزیٹ پولز میں فاتح پیش کیا گیا، مگر نتیجہ کے اعلان کے بعد اسے منہ کے بل گرنا پڑا۔

آخر کیا وجہ ہے کہ ایگزیٹ پولز اکثر محروم طبقات کی نمائندگی کرنے والی سیاسی جماعتوں کے خلاف جاتے ہیں اور بی جے پی کے حق میں پیشن گوئی کرتے رہے ہیں؟ اس کا جواب ڈھونڈنا بہت مشکل نہیں ہے۔ ریسرچ اور سروے کا نتیجہ اُس بات پر بہت حد تک منحصر ہے کہ اس کی فنڈنگ کون کر رہا ہے اور اسے کنڈکٹ کون کر رہا ہے۔ کیا اس بات سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ ان سرویز کے پیچھے پیسہ سرمایہ داروں کا لگا ہوتا ہے؟ کیا اس بات سے منہ موڑا جاسکتا ہے کی اس ریسرچ کو کنڈکٹ کرنے والوں میں زیادہ لوگوں کا تعلق سماج کی اعلیٰ ذاتوں سے ہے اور محروم طبقات کے لوگوں کی واجب نمائندگی ندارد ہے؟ آپ پوچھیے سروے کرانے والی والی کمپنیوں سے کہ کیا اُن کے لوگ کتنی بار دور دراز علاقوں میں جاتے ہیں؟ کیا وہ کسی دلت، آدی واسی، پسماندہ کے دروازے پر جاکر اُن کی رائے لیتے ہیں؟

یہی وجہ ہے کہ انتخابات سے متعلق ان سرویز کو میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ ان سرویز کا بڑا مقصد کسی مخصوص پارٹی کے حق میں ماحول تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سرویز ٹی وی چینلوں کی ٹی آر پی اور منافع بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سروے اکثر رائے دہندگان کی نبض کو پکڑنے میں بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ سروے کرنے والوں کو کون سمجھائے کہ ہندوستان میں زیادہ تر لوگ محروم طبقات سے آتے ہیں، وہ اعلیٰ ذاتوں کے خوف کی وجہ سے اپنی رائے میڈیا کے سامنے پیش کرنے سے کتراتے ہیں۔ میڈیا والوں کو چاہیے کہ وہ اُن کے دلوں میں بیٹھے درد کو سمجھیں۔ مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب اکثر ایک مقصد کے تحت ہوتا ہے۔ انہی وجوہات سے مجھے لگتا کی انتخابات کے نتائج ان پیشن گوئیوں سے الگ ہوں گے۔

(مضمون نگار جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر ہیں)

وہ صبح کبھی تو آئے گی

نئے روزگار پیدا کرنے کی بات تو موجودہ سرکار خواب میں بھی نہیں سوچتی

ابھے کمار

دہلی میں واقع جواہر لال نہرو یونیورسٹی (جے این یو) کے مین گیٹ کے باہر ان دنوں چائے کی ایک نئی دکان ہر روز کھل رہی ہے۔ جہاں بھی نظر دوڑتی ہے، ریل کے ڈبے کی طرح ایک دکان دوسری دکان کے بغل میں کھڑی معلوم پڑتی ہے۔ یہ ساری دکانیں فٹ پاتھ پر پسر رہی ہیں۔ چائے کے علاوہ، پوڑی، موموز بھی خوب بک رہے ہیں۔ دارا سنگھ چابی والے سردار جی نے بھی اپنی دکان لگا لی ہے۔ حالانکہ دکان پر ایک بیوہ عورت بیٹھتی ہیں، جو خود تو چابی نہیں بناتی، مگر جب کوئی گاہک ان کے پاس آتا ہے، تو وہ اپنے بیٹے کو بلا لیتی ہیں۔ ان کے دو بیٹے چابی بنانے کا کام کرتے ہیں۔ ایک کے ہاتھ میں شدید زخم ہے، اس لیے وہ ان دنوں گھر پر آرام کر رہا ہے اور اس کی جگہ بیوہ عورت دکان پر رہتی ہیں۔ گاہک کو دیکھتے ہی وہ دوسرے بیٹے، جس کی چابی کی دکان کچھ دور پر واقع ہے، خبر دے دیتی ہیں۔ 'میرے بیٹا جب تک ٹھیک نہیں ہوتا تب تک میں ہی دکان پر رہوں گی۔ دو پیسے بن جاتے ہیں اس سے۔' کچھ روز پہلے بیوہ عورت کی دکان کے پاس سوکھی لکڑیوں کو اکٹھا کر کے میرے کچھ ساتھی آگ جلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چابی کی دکان والی عورت آس پاس سے گری پڑی گھاس اور پتے چن کر لا رہی تھی اور آگ جلانے میں ہماری پوری مدد کر رہی تھی۔ پاس میں پٹنہ ضلع کے ایک شرما جی چائے کی دکان چلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتلاتے ہوئے کہا کہ انھوں نے چائے کی دکان تو اپنے بچوں کی پڑھائی کے لیے شروع کی ہے، مگر ان کے پاس پٹنہ کے پاس دانا پور میں آدھا کٹھا زمین ہے جو کافی قیمتی ہے۔ شرما جی کی بات سن کر لگا کہ وہ زمین کی بات کر اپنی غریبی کو ڈھکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک سے آگ جل پڑی۔ پاس کھڑے جے این یو کے ساتھی بھی وہاں ہاتھ سینکنے کے لیے آ پڑے۔ کچھ لمحوں بعد میری ملاقات علی گڑھ سے تعلیم یافتہ ایک دیگر دوست سے ہوئی، جو کئی سال سے دہلی یونیورسیٹی میں شعبہ معاشیات میں تدریس کا کام انجام دے رہے تھے۔ مگر ان کی ان کی جاب چلی گئی ہے۔ ان کی بے روزگاری ان کے چہرے پر صاف پڑھی جا سکتی ہے۔ اچانک سے بھگدڑ اور شور سنائی دیا۔ 'ایم سی ڈی کی گاڑی آ رہی ہے۔' یہ سن کر فٹ پاتھ کے دکان دار اپنی اپنی دکان کو سمیٹ کر بھاگنے لگے۔ کچھ دیر بعد دکان پھر سج گئی۔ ایم سی ڈی کے بعد پولیس والوں کے آنے کے ڈر سے ہنگامہ مچ گیا۔ ڈر اس بات کا ہے کہ پولیس والے ان دنوں ماسک نہ لگانے کے جرم میں ۲ ہزار روپے کا جرمانہ لگا رہے ہیں، بھلے ہی آپ کی جیب میں ایک روپیہ نہ ہو۔ اگر پیسے نہ ہوں تو شاید چائے والے ادھار کی چائے پلا دیں، مگر پولیس والے بغیر پیسے لیے کسی کو نہیں بخشتے ہیں۔

دریں اثنا، ہمارے ایک ساتھی، جو جے این یو سے سیاسیات میں پی ایچ ڈی کر چکے ہیں، آگ میں پاس پڑی سکھی لکڑیوں کو توڑ توڑ کر ڈال رہے تھے۔ پھر انہوں نے کہا کہ 'نوکری کہیں نہیں ہے۔ روم کا کرایہ دینا بھی مشکل پڑ رہا ہے۔' جامعہ کے سوشیالوجی سے پی ایچ ڈی کر چکے دوسرے ایک ساتھی نے کہا کہ انہوں نے کئی مہینوں سے روم کا کرایہ نہیں دیا ہے۔ 'معلوم نہیں کہ ۳۵ ہزار روپے چکا پاؤں گا۔ کوئی جاب نہیں۔ مکان مالک روز کرایا مانگ رہا ہے۔' یہ حال جے این یو کے بین الاقوامی امور سے پی ایچ ڈی کرنے والے ایک دیگر دوست کا بھی ہے۔ بیچ میں چابی دکان والی عورت بول پڑی 'کوئی بھی گاہک صبح سے نہیں آیا۔ اب تو شام ہو چلی'۔ پھر اس نے پوچھا 'کتنا ٹائم ہو رہا ہے؟' بیوہ عورت لمبی تھی اور شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی۔ اس نے بتلایا کہ وہ آر کے پورم میں واقع ایک جھگی میں ۳۰ سال سے رہ رہی ہے۔ جے این یو کے آس پاس روم کرایہ پر لینے کی بات سن کر سہم گئی اور کہا کہ 'ادھر کرایہ تو بہت ہوگا۔' میں سوچنے لگا کہ بے روزگاری تو کئی سالوں سے بڑھ ہی رہی ہے، مگر گزشتہ سال جتنے لوگ بے روزگار ہوئے اور جتنا کاروبار کا نقصان ہوا، شاید اتنا پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ بے روزگاری بڑھنے اور معیشت کی خستہ حالی کے لیے سرکار کی پالیسی اور کورونا دونوں ذمہ دار ہیں۔ وہ دن آج بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہوگا، جب اچانک سے ملک کے سب سے بڑے حاکم نے یہ اعلان کر دیا کہ کورونا وبا سے لڑنے کے لیے ملک گیر سطح پر ۲۱ دنوں کے لیے لاک ڈاؤن لگایا جا رہا ہے۔ پھر یہ بڑھتا چلا گیا اور کئی مہینوں تک چلا۔ شہر میں رہنے والے لاکھوں مزدوروں کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جس مزدور نے شہر بنایا، اسے رہنے کے لیے جگہ نہ دی گئی۔ جو مزدور ہمارے لیے تمام اشیا کو پیدا کرتا ہے، اسے ضروری چیزوں سے بھی محروم کر دیا گیا۔ بس اور ریل کی سہولیات ختم کر دی گئی۔ لوگ کورونا سے زیادہ بھوک سے مرنے لگے۔

> وہ دن آج بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا ہوگا، جب اچانک سے ملک کے سب سے بڑے حاکم نے یہ اعلان کر دیا کہ کورونا وبا سے لڑنے کے لیے ملک گیر سطح پر ۲۱ دنوں کے لیے لاک ڈاؤن لگایا جا رہا ہے۔ پھر یہ بڑھتا چلا گیا اور کئی مہینوں تک چلا۔ شہر میں رہنے والے لاکھوں مزدوروں کو نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جس مزدور نے شہر بنایا، اسے رہنے کے لیے جگہ نہ دی گئی۔

کون نہیں جانتا کہ لاک ڈاؤن کا اعلان تو کیا گیا، مگر اس کے پیچھے کوئی تیاری نہیں ہوئی۔ سرکار کے گودام اناج سے بھرے رہے، مگر غریبوں کو ایک ایک دانے کے لیے ترسنا پڑا۔ گودام میں چھپے اناج کھالیں، یہ سرکار کو منظور تھا، مگر مزدور اور غریب کو اناج دے دیا جائے، وہ قابل قبول نہیں تھا۔ یونیورسٹی سے بھی طلبہ کو زبردستی ہاسٹل سے باہر کر دیا گیا اور اس کے تعلیمی اداروں کے دروازے بند کر دیے گئے۔ یہ دروازے آج بھی بند ہیں۔ مگر ایسی کوئی پابندی ریسٹورنٹ اور مال کھولنے، ریلی نکالنے، انتخابات جیتنے کے بعد جشن منانے، پوجا اور مندر بنانے کے نام پر بھیڑ جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جے این یو کے باہر جو دکانیں ان دنوں کھل رہی ہیں وہ اس لیے کہ طلبہ کو یونیورسٹی کے اندر ابھی تک جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہی نہیں، کورونا کا بہانہ بنا کر لاکھوں لوگوں کو نوکری سے نکال دیا گیا، جو خوش قسمت بچ بھی گئے، ان کی تنخواہ کم کر دی گئی۔ نئے روزگار پیدا کرنے کی بات تو موجودہ سرکار خواب میں بھی نہیں سوچتی۔

نوجوانوں کو تعلیم اور نوکری دینے کی بات کون کرے، سرکار نے اس سال ان کو جیل کی کالی کوٹھری میں ٹھوس دیا۔ ایک نہیں، بلکہ درجنوں نوجوانوں کے اوپر سخت ترین دفعات لگا کر ان کی زندگی برباد کر دی گئی۔ ان میں سے کچھ کا قصور صرف اتنا تھا کہ انہوں نے مذہب پر مبنی شہریت قانون کی مخالفت کی تھی۔ پرامن اور جمہوری طریقے سے انجام پزیر احتجاج کو بھی سرکار نے ملک مخالفت سے جوڑ دیا۔ گورکھپور کے ایک بچوں کے ڈاکٹر کو بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تقریر کرنے کے لیے کئی مہینے تک جیل میں ڈالا گیا۔ جیل جانے والوں میں وہ لوگ بھی تھے، جو خود کو سیاست سے دور رکھتے ہیں اور اپنی زندگی دین کی بنیادی باتوں کو بتلانے میں صرف کر دیتے ہیں۔ آج بھی تبلیغی جماعت کے بہت سارے ممبران کو کورٹ کا چکر لگانا پڑ رہے ہیں۔ ان میں سے بہت تو رہا کر دیے گئے، مگر بہت سارے ابھی بھی اندر ہیں۔ بھارت شاید دینا کی واحد ایسی جمہوریت ہے، جہاں حکمرانوں نے اور قومی میڈیا نے کورونا وبا کا تعلق ایک مخصوص مذہب سے جوڑ دیا۔ نوجوان، طلبہ اور اقلیتوں کے علاوہ اس سال ملک کے دلت، پسماندہ اور خواتین بھی ظلم اور زیادتی کا شکار ہوئیں۔ ہاتھرس کی ایک دلت بچی کی نہ صرف عصمت دری کی گئی، بلکہ جب زخموں کی تاب نہ لا کر مر گئی تو پولیس نے گھر والوں کے بغیر رات کے اندھیرے میں اس کی لاش کو جلا دیا۔ اتنا ہی نہیں نام نہاد لو جہاد کے خلاف قانون لایا گیا اور اس کی زد میں مسلمان نوجوان ہیں۔

یہ سب باتیں میں آگ کے پاس بیٹھے سوچ رہا تھا۔ اس دوران میرے دوست بھی کچھ باتیں آپس میں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک دوست نے کہ پوچھا کہ 'کیا تم سب دہلی بارڈر پر مقیم کسانوں کے احتجاج کو دیکھنے گئے تھے؟'۔ سوال پوچھنے والا دوست کچھ روز پہلے ہی دھرنے سے لوٹ کر آیا ہے۔ گفتگو کے دوران تیزی سے جل رہی لکڑی کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ کتنا اچھا ہوتا کہ لکڑی جلنے کی طرح ہمارے دکھ درد بھی جل کر راکھ ہو جاتے اور سال ۲۰۲۰ء کی کالی رات بھی۔ اسی بیچ ہمارے ایک ساتھی نے ساحر کے کلام کو گنگنانا شروع کیا: 'ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا، جب دُکھ کے بادل پگھلیں گے جب سُکھ کا ساگر چھلکے گا، جب عنبر جھوم کے ناچے گا، جب دھرتی نغمے گائے گی، وہ صبح کبھی تو آئے گی۔'

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

آفرین فاطمہ سے وہ کیوں ڈرتے ہیں؟

ہمیں سڑکوں پر بھی اترنے کی ضرورت ہے مگر اس بات کو پہلے طے کرنا ہوگا کہ کس طرح ہم پولیس اور حکومت کی جابرانہ کارروائی سے خود کو بچائیں گے

ابھے کمار

اتوار کے روز پریاگ راج میں جو کچھ بھی ہوا وہ بھارت کی جمہوریت کا ایک سیاہ دن تھا۔ اس دن اقتدار کا سراسر غلط استعمال کیا گیا۔ یہ کارروائی قانون اور آئین کا گلا گھونٹنے کے مترادف تھی۔ اب کھلے طور پر لوگوں کا دھرم، مذہب اور ذات دیکھ کر یو پی حکومت فیصلہ لے رہی ہے۔

جے این یو کی سابق طالبہ اور ایکٹوسٹ آفرین فاطمہ کے گھر کو جس طرح بلڈوزر کی مدد سے توڑ کر کچھ ہی گھنٹوں کے اندر ملبے میں تبدیل کر دیا گیا، وہ اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے کہ یو پی کی بی جے پی سرکار سیکولرازم کی جگہ ہندو راشٹر کے نظریہ کے مطابق کام کر رہی ہے۔ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ حکومت نے پوری طرح سے مسلم مخالف ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ عدالت بھی خاموش ہے۔ میڈیا دن رات نفرت پھیلا رہا ہے۔ محکوم طبقات کا یقین سسٹم سے اٹھنے لگا ہے۔ ایک سازش کے تحت یوگی سرکار بلند مسلم آواز کو خاموش کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر طرح سے ان آوازوں کو دبا دینا چاہتی ہے، جو اس کے ظلم و جبر کے خلاف بولنے کی ہمت رکھتی ہیں۔ یوگی کی آمرانہ حکومت کی اور کیا مثال ہوگی کہ اہانت رسولؐ کے معاملے میں جو لوگ ملوث ہیں ان کو پکڑنے کی بجائے وہ بے قصور مسلمانوں کو مار پیٹ رہی ہے، انہی کو گرفتار کر رہی ہے اور ان کے ہی گھروں کو منہدم کر رہی ہے۔ کیا اتر پردیش میں مظلوموں کو اپنے مسائل کو لے کر احتجاج کرنے کا بھی حق نہیں ہے؟ جو لوگ بھی مسلم سماج سے اپنے حق کی لڑائی کے لیے آگے آ رہے ہیں ان کو دانستہ طور پر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان کی پوری زندگی برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان کی شبیہ ایک شدت پسند اور ملک مخالف جرائم پیشہ کی بنا کر پیش کی جا رہی ہے۔ آخر ناانصافی کا یہ سلسلہ کب تھمے گا؟ مسلم سماج کے اندر ناخواندگی دیگر طبقات کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اس سماج سے آفرین فاطمہ اور ان کی جیسی دیگر لڑکیاں جب ساری مشکلات سے لڑتے ہوئے کالج اور یونیورسٹی پہنچتی ہیں اور اپنے ملک اور ملت کے مسائل کو لے کر آگے بڑھتی ہیں، تو ان پر ظلم و جبر کیوں ڈھایا جاتا ہے؟ کیا ان کو ایک ذمہ دار بھارتی شہری ہونے کے فرائض ادا کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے، صرف اس لیے کہ ان کا تعلق کسی خاص مذہب سے ہے؟ شرجیل امام، عمر خالد، میران حیدر، آفرین فاطمہ جیسے لیڈر آج اسی فرقہ پرست ذہنیت کے شکار ہیں۔ حکومت میں بیٹھے فرقہ پرست عناصر کی یہی کوشش رہتی ہے کہ جب بھی کوئی طاقتور آواز محکوم طبقات سے نکلے اس کو کسی نہ کسی بہانے عوام کی نظروں میں ملک مخالف ثابت کر دیا جائے اور پھر کسی نہ کسی کیس میں اس کا نام ڈال کر جیل بھیج دیا جائے تاکہ دبے کچلے سماج سے کوئی اپنے حقوق کے لیے لڑنے کی بات خواب میں بھی نہ سوچ سکے اور ظلم، جبر، استحصال اور ناانصافی کا یہ کاروبار یوں ہی چلتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آفرین فاطمہ کے پریاگ راج واقع مکان کو اچانک سے پولیس نے منہدم کر دیا۔ آج ان کا پریوار بے گھر ہو گیا ہے۔ ان کے والد پر تشدد بھڑکانے کا الزام لگایا گیا اور انہیں گرفتار کیا گیا۔ آفرین کی خطا یہی ہے کہ وہ بولنا جانتی ہیں، وہ باتوں کو سمجھتی ہیں، ان کے دلوں میں ملک اور ملت کا درد ہے اور وہ مسلمان بھی ہیں۔

آفرین فاطمہ کو میں جے این یو کے دنوں سے جانتا ہوں۔ وہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی تحریکوں میں کافی سرگرم رہی ہیں۔ کچھ ہی دنوں کے اندر آفرین کی مقبولیت کیمپس میں کافی بڑھ گئی۔ اس سے پہلے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لسانیات میں گریجویشن کی پڑھائی مکمل کی تھی۔ سال ۲۰۱۹ میں انہوں نے جے این یو طلبہ یونین کا انتخابات بھی لڑا تھا۔ حالانکہ طلبہ سیاست سے اُن کی آشنائی بہت پہلے ہو گئی تھی۔ سال ۲۰۱۸ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج کی طلبہ یونین کی وہ صدر بھی رہ چکی ہیں۔ آفرین کی فکر اور سرگرمی کی وجہ سے علی گڑھ کے اندر موجود دقیانوس مردوں اور کالج انتظامیہ کو بھی بڑی دقت ہوتی تھی۔ غلطی اس میں آفرین کی نہیں تھی بلکہ وہ وہاں مرد بالادستی کے خلاف آواز بلند کر رہی تھیں۔ بات یہ تھی کہ علی گڑھ کی لڑکیوں کو اپنے ہاسٹل سے باہر نکلنے پر بہت ساری پابندیاں عائد تھیں۔ اگر ہسپتال بھی جانا ہوتا تھا تو ان کو پہلے انتظامیہ سے اجازت لینی پڑتی تھی۔ ان سب پابندیوں کی وجہ سے علی گڑھ کی طالبات کافی ناراض تھیں۔ ان مسائل کو آفرین نے اپنے انتخابات کے دوران اٹھایا اور طالبات کے لیے برابر کے حقوق کا مطالبہ کیا۔ یہ بات صحیح ہے کہ آفرین اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائیں، مگر ان کی وجہ سے اور بدلے ہوئے ماحول کو دیکھتے ہوئے لڑکیوں کو علی گڑھ یونیورسٹی انتظامیہ نے تھوڑی بہت رعایت دی تھی۔ اس دوران انہوں نے علی گڑھ میں خواتین کی قیادت سے متعلق ایک بڑا پروگرام بھی کرایا، جس میں کچھ مردوں نے خلل ڈالنے کی کوشش کی۔ اگر صحیح طور سے دیکھا جائے تو بلند آواز والی مسلم خواتین کا دشمن فرقہ پرست اور مردوں کی بالادستی میں یقین رکھنے والا سماج دونوں ہوتا ہے۔ فرقہ پرست ان کو مظلوم، ان پڑھ، لاچار، بیمار، کمزور اور شدت پسند کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں جبکہ سماج کے مرد انہیں گھروں میں قید کر کے رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے اوپر حملہ دوطرفہ ہے۔

> اس ملک سے ہندو اور مسلمان دونوں محبت کرتے ہیں۔ جو لوگ شدت پسندی اور نفرت کی سیاست کرنے والے ہیں، ان کو کبھی بھی ان کے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام سیکولر طاقتیں اپنے سابقہ اختلافات کو بھلا کر ملک کو فرقہ پرستوں کے چنگل سے بچانے کے لیے آگے آئیں اور اس تحریک میں آفرین فاطمہ ایک بڑا اور مثبت رول ادا کر سکتی ہیں۔

جے این یو میں بھی ان کو فرقہ پرستوں کے ساتھ ساتھ دقیانوس طبقہ کی بھی مخالفت جھیلنی پڑی۔ مگر انہوں نے جواب دینے کی بجائے کام کرنے میں زیادہ یقین رکھا۔ بہت جلد ان کی شناخت کیمپس میں قائم ہو گئی اور آفرین نے اپنے قول و فعل سے طلبہ کا دل جیتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کونسلر کا انتخاب جیت کر یہ دکھلا دیا تھا کہ اُن کے اندر سیاسی قیادت کی بھرپور اہلیت ہے۔ جو لوگ جے این یو کو قریب سے جانتے ہیں اُن کو یہ بات معلوم ہے کہ یہاں کے طلبہ انتخابات میں کامیاب ہونے کے لیے کو لیفٹ یا رائٹ کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کی مدد کے بغیر کسی بھی طالب علم کے لیے انتخابات جیتنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ انتخابات کے دوران تقریر کر کے شاباشی بٹورنا ایک بات ہے اور انتخابات میں فتحیاب ہونا دوسری بات ہوتی ہے۔ اس لیے آفرین فاطمہ کی اس کامیابی کو غیر معمولی کارکردگی کہا جا سکتا تھا۔ جے این یو میں آفرین طلبہ کی تنظیم فرٹرنٹی کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں اور ان کی حمایت کرنے والوں میں مسلمانوں کے علاوہ دلت طلبہ کی بڑی تعداد شامل تھی۔ جے این یو ہی نہیں، کیمپس سے باہر بھی آفرین ان مسائل کو لے کر زیادہ فعال رہی ہیں، جو ملک کے کمزور طبقات کے مفاد سے منسلک رہے ہیں۔ جب بھی کوئی بات مسلمان، دلت یا کسی بھی محکوم طبقہ سے متعلق ہوتی تھی، آفرین فاطمہ اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ ہمیں یاد ہے کہ شہریت ترمیمی قانون کی مخالفت میں آفرین فاطمہ دیگر مسلم خواتین کی طرح ملک اور ملت کو بچانے کے لیے سڑکوں پر اتر آئی تھی۔ آج انہی سب خوبیوں کی وجہ سے وہ اور ان کا پورا خاندان فرقہ پرستوں کے نشانہ پر ہے۔ ان مشکل حالات کے وقت ہمیں اور بھی زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا ہے۔ ہمیں نہ صرف آفرین فاطمہ کی مدد کے لیے آگے آنا ہے، بلکہ ہمیں آفرین کی لڑائی کو ان تمام مسلمانوں کی گرفتاری سے بھی جوڑ کر دیکھنا ہے۔ ہمیں عدالتی اور قانونی راستہ کو بھی اپنانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں سڑکوں پر بھی اترنے کی ضرورت ہے مگر اس بات کو بھی پہلے طے کرنا ہوگا کہ ہم پولیس اور حکومت کے جابرانہ کارروائی سے خود کو کیسے بچائیں گے۔ اس ملک سے ہندو اور مسلمان دونوں محبت کرتے ہیں۔ جو لوگ شدت پسندی اور نفرت کی سیاست کرنے والے ہیں، ان کو کبھی بھی ان کے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام سیکولر طاقتیں اپنے سابقہ اختلافات کو بھلا کر ملک کو فرقہ پرستوں کے چنگل سے بچانے کے لیے آگے آئیں اور اس تحریک میں آفرین فاطمہ ایک بڑا اور مثبت رول ادا کر سکتی۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

Inquilab 14.6.22

آدی واسی طبقہ کے ساتھ پھر ناانصافی!

آدیواسیوں کی بات درست ہے کہ جنگلات کو جنگل میں رہنے والے لوگوں سے دور کر کے نہیں بچایا جا سکتا ہے

ابھے کمار

ملک میں قبائلی طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد کو آدی واسی بھی کہا جاتا ہے۔ آزادی کے ۷۰ رسال گزر جانے کے بعد بھی آدیواسی ہندستانی سماج کے حاشیہ پر ہے۔ تعلیم اور نوکری میں ریزرویشن ملنے کی وجہ سے ان کے اندر ایک چھوٹا سا متوسط طبقہ یعنی مڈل کلاس ضرور ابھرا ہے۔ مگر اس طبقہ کی حالت آج بھی دیگر کمیونٹیوں کے مقابلے میں کافی خستہ ہے۔ ہندستانی جمہوریت کا یہ ایک سیاہ پہلو ہے کہ قومی ترقی کے نام پر آدیواسی سوسائٹی کو سب سے زیادہ نقصان اٹھانے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اب ان کو ایک نیا خطرہ درپیش ہے۔ ۱۳ رفروری کے اپنے فیصلہ میں سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ ۱۶ رریاستوں میں مقیم ان تمام آدی واسیوں کو ۲۷ رجولائی تک بے دخل کیا جائے، جنہوں نے اپنی رہائش سے متعلق دستاویز پیش نہیں کیے ہیں۔ اگر یہ فیصلہ نافذ ہوتا ہے تو تقریباً ۱۱ رلاکھ آدی واسی اپنے ہی گھر سے اُجڑ جائیں گے۔

اپنے جل، جنگل اور زمین سے بے دخلی کا خطرہ دیکھ کر، آدیواسی سڑکوں پر اتر آئے ہیں۔ 'چھوڑب ناہی، جنگل چھوڑب ناہی' کے نعرے ملک کے مختلف حصوں میں گونج رہے ہیں۔ کیا آدیواسی سماج ایک نئی 'الگلان' تحریک چھیڑنے کا عہد کر چکا ہے؟ سنتھالی زبان میں اُل گلان کا مطلب ہوتا ہے بڑا ہنگامہ۔ آج سے ۱۲۰ رسال قبل رانچی کے جنوبی خطوں میں آدی واسیوں نے اپنے سردار برسا منڈا کی قیادت میں نوآبادکاروں کے خلاف لڑائی لڑی تھی۔ ان کی مزاحمت باہر سے آئے ہوئے 'دکو' کے خلاف تھی، جو ان کی زمین، جنگلات اور قدرتی وسائل کا استحصال کر رہے تھے۔ مورخوں کا ماننا ہے کہ نوآبادکاروں کے خلاف جتنی پرتشدد مزاحمت آدیواسیوں نے کی اتنی کسی اور طبقہ نے نہیں کی تھی۔ انگریزوں کے خلاف ان کی یہ لڑائی کانگریس کے قیام سے بھی پرانی ہے۔ برطانوی حکومت کے علاوہ آدیواسی شمالی خطہ سے آئے ہوئے دیگر مہاجن، تاجر، ٹھیکیدار کے بھی خلاف تھے۔ خیال رہے کہ اُس دور میں ان کے وسائل اور معدنیات کو لوٹنے کا سلسلہ تیزی کے ساتھ شروع ہوا تھا، جو آزاد بھارت میں بھی نہیں تھما ہے۔ ڈیم بنانے، کانوں کی تعمیر کرنے اور قدرتی وسائل کو حاصل کرنے کی خاطر ان کو ان ہی کی مٹی سے اجاڑا گیا ہے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جہاں ان کو اپنی زمین سے بے دخل کیا گیا ہے اور ان کو مجبوراً شہری صنعتی علاقوں میں اپنی لیبر کو بیچ کر زندگی گزر بسر کرنی پڑ رہی ہے۔ مگر دوسری طرف ان کے علاقوں میں بڑی تعداد میں باہر سے آئے ہوئے لوگ ان کے وسائل پر قبضہ کر بیٹھے ہیں۔ آج حالت اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ بہت سارے روایتی قبائلی علاقوں میں غیر قبائلی جا بسے ہیں اور وہاں کا جغرافیہ بدل دی گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج قبائلی علاقے لڑائی کے میدان میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ پولیس، آدیواسی اور ماؤنواز باغی اس خونی لڑائی کی زد میں ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ حکومت آدیواسیوں کے مسائل کو غربت اور اقتدار سے محرومی اور ان کی آٹونمی پر حملے سے نہ دیکھ کر صرف لاء اینڈ آرڈر کے زاویہ سے دیکھتی ہے۔

آدی واسی طبقہ کے ساتھ برتی جا رہی ناانصافی کی تازہ مثال سپریم کورٹ کا ۱۳ رفروری کا فیصلہ ہے۔ خیال رہے کہ اس فیصلہ کے پیچھے دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اس سے ماحولیات کو برباد ہونے سے بچایا جا رہا ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس سے غیر قانونی طور سے قبضہ کیے جا چکے جنگلات کو خالی کرایا

آدی واسیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے تمام سیاسی پارٹیاں ان کی ہمدرد ہونے کا دعوی کر رہی ہیں۔ مگر کیا یہ تلخ حقیقت نہیں ہے کہ اب تک کسی پارٹی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو آدیواسیوں کا شمار ملک میں ہی نہیں، پوری دنیا کے غریب ترین اور پسماندہ طبقات میں نہیں ہوتا۔ آج ان کی حالت دلتوں سے زیادہ خراب ہے۔ ان کے درمیان شرح خواندگی سب سے کم ہے، مگر اسکولوں میں ڈراپ آؤٹ ریٹ زیادہ ہے۔

جا رہا ہے۔ مگر آدیواسی سماج اس دلیل سے مطمئن نہیں ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ سرکار آرڈیننس لا کر سپریم کورٹ کے فیصلہ کو رد کرے۔ آدیواسیوں کی بات درست ہے کہ جنگلات کو جنگل میں رہنے والے لوگوں سے دور کر کے نہیں بچایا جا سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی سوال واجب ہے کہ کیا شہروں میں کام کرنے والے نام نہاد ماہر ماحولیات ان کو جنگلات کی حفاظت کا درس دیں گے؟ خیال رہے کہ کانگریس کی قیادت والی یو پی اے حکومت نے ۲۰۰۶ء میں 'فاریسٹ رائیٹ ایکٹ' بنایا تھا۔ اس قانون کو لانے کے پیچھے مقصد یہ تھا کہ قبائلی سماج اور جنگل میں رہنے والے لوگوں کو جنگلات کے وسائل کو استعمال کرنے کا قانونی حق دیا جائے۔ اس قانون کے حامی لوگوں کا ماننا ہے کہ آدیواسی صدیوں سے جنگلات پر منحصر زندگی گزار رہے ہیں اور ان کے اس حق کو حکومت کو تسلیم کرنا چاہیے۔ مگر اس قانون کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ اس کو نافذ کرنے کی ذمہ داری محکمہ جنگلات کے افسران کو دے دی گئی ہے۔ ان میں سے بہت سارے افسر آدیواسیوں کے تئیں منفی سوچ رکھتے ہیں اور ان کو یہ غلط فہمی ہے کہ آدیواسی جنگلات کے وسائل کے لیے خطرہ ہیں۔ مگر دوسری طرف ان افسران کو اس بات سے زیادہ پریشانی نہیں ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ دار، تاجر اور سیاستدان ان وسائل کو اپنے ذاتی مفاد کے لیے لوٹ رہے ہیں۔ ان کمیوں کا فائدہ اٹھا کر آدیواسیوں سے یہ ثابت کرنے کو کہا جا رہا ہے کہ فاریسٹ علاقہ میں وہ تین نسلوں سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سرکاری محکموں میں مختلف قسم کے کاغذات طلب کیے گئے۔ جن لوگوں نے بھی سرکاری دفتروں کا چکر لگایا ہے، ان کو اس بات کا تلخ تجربہ ہے کہ سرکار کے بنائے ہوئے ضابطوں کو پورا کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ کچھ اسی طرح کی پریشانی آسام کے مسلمان اور ہندو بھی جھیل رہے ہیں۔ ان کو بھی اپنی رہائش سے جڑی ہوئی دستاویز پیش کرنے کے لیے دربدر بھٹکنا پڑا ہے۔ وہاں بھی لاکھوں کی تعداد میں لوگ اپنے ہی گھر میں درانداز قرار دیے جا چکے ہیں۔ آسامی مسلمانوں پر بنگلہ دیشی ہونے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ دریں اثنا بعض غیر سرکاری تنظیمیں اس معاملہ کو سپریم کورٹ میں لے گئیں۔ مرکزی وزارت ماحولیات کو پارٹی بنایا گیا اور 'فاریسٹ ایکٹ' پر سوال اٹھایا گیا۔ آج بی جے پی صدر امت شاہ اپنے آپ کو آدی واسی سماج کا سب سے بڑا خیر خواہ ہونے کا دعوی کر رہے ہیں اور اپنے وزراء اعلیٰ کو سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف نظر ثانی کی عرضی داخل کرنے کا فرمان بھی جاری کیا ہے، مگر کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ان کی ہی سرکار کورٹ میں فاریسٹ ایکٹ کا صحیح سے دفاع نہیں کر پائی، جس کی وجہ سے کورٹ نے بے دخلی کا حکم صادر کیا ہے؟ ان غیر سرکاری تنظیموں کے موقف کی روشنی میں کورٹ نے حکم دیا ہے کہ جو آدیواسی اپنی رہائش سے متعلق دستاویز پیش نہ کر پائے ہیں، ان کو ان علاقوں سے باہر کیا جائے، کیونکہ ان کی موجودگی سے جنگلات اور ماحولیات کو خطرہ لاحق ہے۔

عام انتخابات ۲۰۱۹ء اب کچھ دنوں کی بات ہے اور ملک کی سیاست گرم ہونا شروع ہو گئی ہے۔ آدی واسیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے تمام سیاسی پارٹیاں ان کی ہمدرد ہونے کا دعوی کر رہی ہیں۔ مگر کیا یہ تلخ حقیقت نہیں ہے کہ اب تک کسی پارٹی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو آدیواسیوں کا شمار ملک میں ہی نہیں، پوری دنیا کے غریب ترین اور پسماندہ طبقات میں نہیں ہوتا۔ آج ان کی حالت دلتوں سے زیادہ خراب ہے۔ ان کے درمیان شرح خواندگی سب سے کم ہے، مگر اسکولوں میں ڈراپ آؤٹ ریٹ زیادہ ہے۔ خط افلاس کے نیچے زندگی بسر کرنے والے لوگوں میں آدیواسی سب سے زیادہ ہیں۔ صحت سے متعلق سہولیتیں ان سے میلوں دور ہیں۔ وہیں آدیواسی طبقہ کو بے دخلی کا خطرہ دیگر طبقوں کے مقابلے پانچ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ ان میں سیاسی نمائندگی بھی تشفی بخش نہیں ہے۔ آج تک مرکزی حکومت کے اہم محکمے ان سے دور رہے ہیں۔ اب تک کوئی بھی آدیواسی صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور چیف جسٹس نہیں بن پایا ہے۔ کیا آدی واسی سماج کو ان کا واجب حق دیے بغیر ہندوستانی جمہوریت مستحکم ہو پائے گی؟

(مضمون نگار جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہیں)

بھارت رتن لال کرشن اڈوانی؟

وزیر اعظم نے اڈوانی کو یوں ہی یاد نہیں کیا بلکہ ان کی امیج کا استعمال عام انتخابات سے پہلے کرنا مقصود ہے

ابھے کمار

سابق نائب وزیر اعظم اور بی جے پی کے بزرگ رہنما لال کرشن اڈوانی کو نریندر مودی حکومت نے ملک کے سب سے بڑے شہری اعزاز 'بھارت رتن' سے نوازنے کا اعلان کیا ہے۔ اس وقت اڈوانی کی عمر ۹۷ سال ہے۔ گزشتہ کئی سالوں سے وہ سرگرم سیاست سے دور ہیں۔ مگر اڈوانی وہی سیاست داں ہیں، جنہوں نے رام مندر بابری مسجد تنازعہ کو ہوا دی تھی۔ اڈوانی نے ہی ملک کی سیاست میں نام نہاد مسلم منہ بھرائی کا مسئلہ اٹھایا اور سیکولر لیڈروں کو اکثریتی طبقات میں بدنام کیا۔ انہوں نے ہی سیکولرزم پر تنقید کی اور آستھا کو قانون کے راج اور عدالت کے فیصلوں پر فوقیت دینے کی بات کہی۔ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ مودی حکومت نے اڈوانی کو یوں ہی یاد نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اڈانی کی امیج کا استعمال عام انتخابات سے پہلے کرنا چاہتی ہے۔ حالانکہ میڈیا بی جے پی کی جیب میں ہے، پھر بھی اسے اس بات کا خدشہ ہے کہ کہیں روزی، روٹی اور صحت عامہ سے متعلق موضوعات پر بحث نہ چھڑ جائے۔ اس لیے بی جے پی کی مسلسل کوشش ہے کہ کسی بھی طرح سے مندر اور مسجد کے نام پر ووٹ لیا جائے۔ ۲۲؍جنوری کو جس جلد بازی میں بھگوان شری رام کے مندر کا افتتاح ہوا، وہ اسی فرقہ وارانہ حکمت عملی کا حصہ تھا۔ رپورٹ تو اس وقت بھی آئی تھی کہ ایودھیا میں رام مندر پوری طرح سے تیار نہیں تھا، مگر عام انتخابات کے پیش نظر مندر کا افتتاح مودی سرکار نے بغیر کسی تاخیر کے انجام دے دیا۔ میڈیا نے صرف مودی کو مندر کے لیے کریڈٹ دیا۔ نہ تو اڈوانی کو یاد کیا گیا اور نہ ہی ان کو تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔ چونکہ اڈوانی نے ہی مندر تحریک کو اٹھایا تھا اور بی جے پی کے لیے ماحول سازی کی تھی، اس لیے ایسا لگتا ہے کہ ان کو ایوارڈ دے کر مرکزی حکومت اڈوانی کے حامیوں کو خوش کرنا چاہتی ہے اور مندر ایشوز کے آس پاس انتخاب لڑنا چاہتی ہے۔

بی جے پی کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو اڈوانی نے جس طرح سے اپنی پارٹی کو سیاسی فائدہ پہنچایا اور تنظیم کو مضبوط کیا، اس طرح شاید ہی کسی اور لیڈر نے کیا ہو۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم مودی کو پارٹی میں آگے بڑھانے اور گجرات فسادات کے بعد ان کی زیر قیادت حکومت کو بچانے میں اڈوانی کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ مگر وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ سال ۲۰۰۹ء کے بعد نریندر مودی کی طاقت بی جے پی میں بڑھتی چلی گئی اور دھیرے دھیرے اڈوانی کمزور پڑتے گئے۔ جن لوگوں کو اڈوانی نے اپنی پارٹی میں جوڑا تھا اور ان کو سیاست کی اے بی سی ڈی سکھائی تھی، وہی لوگ ڈوبتے ہوئے اڈوانی کے جہاز سے کود گئے اور نریندر مودی کو اپنا لیڈر قبول کر لیا۔ شاید اسی کا نام سیاست ہے، جہاں کوئی بھی ہمیشہ کے لیے دوست نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی دائمی دشمن ہوتا ہے۔ مودی حکومت نے بھلے ہی آج اڈوانی کو بھارت رتن دینے کا اعلان کر دیا ہو، مگر جس قدر گزشتہ سالوں میں ان کو نظر انداز کیا گیا ہے، وہ زخم اس اعزاز سے بھر جائیں گے، یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ بہت سے لوگوں کا ماننا ہے کہ اڈوانی وہ سب کاٹ رہے ہیں، جو انہوں نے خود بویا تھا۔ جس فرقہ پرستی پر مبنی سیاست کو انہوں نے قومیت اور ملک سے دوستی کا نام دے کر صحیح ٹھہرایا تھا، اسی سیاست سے نکلے ہوئے لیڈروں نے ان کی سیاسی زندگی کو وقت سے پہلے ہی ختم کر دیا۔

اڈوانی کی سیاست کو دیکھ کر نہیں لگتا ہے کہ ان کا تعلق ایک ایسے سماج سے رہا ہے، جہاں پر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا ماحول رچا بسا تھا۔ اڈوانی کا پورا نام لال کرشن اڈوانی ہے اور وہ ۸؍نومبر ۱۹۲۷ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ اڈوانی کا تعلق سندھی ہندو بنیا خاندان سے

> ❞
>
> وزیر اعظم مودی کو پارٹی میں آگے بڑھانے اور گجرات فسادات کے بعد ان کی حکومت کو بچانے میں اڈوانی کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ مگر وقت نے ایسی کروٹ بدلی کہ سال ۲۰۰۹ء کے بعد نریندر مودی کی طاقت بی جے پی میں بڑھتی چلی گئی اور دھیرے دھیرے اڈوانی کمزور پڑتے گئے۔ جن لوگوں کو اڈوانی نے اپنی پارٹی میں جوڑا تھا اور ان کو سیاست کی اے بی سی ڈی سکھائی تھی، وہی لوگ ڈوبتے ہوئے اڈوانی کے جہاز سے کود گئے اور مودی کو اپنا لیڈر قبول کر لیا۔ شاید اسی کا نام سیاست ہے، جہاں کوئی بھی ہمیشہ کے لیے دوست نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی دائمی دشمن ہوتا ہے۔

تھا۔ ان کے والد تجارت کرتے تھے۔ کراچی میں تمام مذاہب کے لوگ رہتے تھے۔ یاد رہے کہ اس وقت کراچی بمبئی پریزیڈنسی کا حصہ تھا۔ اڈوانی نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے بچپن کے دنوں میں ہندو، سکھ، مسلمان اور دیگر مذاہب کے پیروکار ایک دوسرے کے تہوار میں حصہ لیتے تھے۔ صوفی اور سنتوں کی درگاہوں پر ہندو، مسلمان، سکھ بھی جاتے تھے۔ اسی طرح گرو نانک کے کلام کو سبھی پورے احترام سے سنتے تھے اور مذہبی مقامات کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوتے تھے۔ اڈوانی کی تعلیم کراچی کے ایک عیسائی اسکول میں ہوئی تھی، جہاں سے پاکستان کے سابق صدر جنرل پرویز مشرف بھی پڑھے ہوئے تھے۔ جنتا پارٹی کی سرکار میں جب اڈوانی وزیر اطلاعات ونشریات بنے، تو وہ سالوں بعد اپنے مادر علمی سینٹ پیٹرک پہنچے اور وہاں ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ یہ آر ایس ایس اور بی جے پی کی دوہری سیاست ہے کہ جس عیسائی اسکول سے پڑھ کر اڈوانی ملک کے نائب وزیر اعظم بن سکتے ہیں اور اڈوانی کی حب الوطنی پر وہ سوال نہیں اٹھاتی، ویسے اسکول کو چلانے والی اقلیتوں کو شر پسند طاقتیں ملک مخالف کہتی ہیں۔ بعض مرتبہ عیسائیوں کے انہی اسکولوں اور چرچوں پر حملے کیے جاتے ہیں۔ شر پسندوں کے خلاف کارروائی کرنے کی جگہ، شر پسند عناصر ان کی پشت پناہی کرتے نظر آتے ہیں اور اس بیانیہ کو ہوا دیتی ہیں کہ عیسائی مشنریوں کی ملک مخالف سرگرمیوں کی جانچ ہونی چاہیے۔

سنت پیٹرک سے دسویں کی پڑھائی کرنے کے بعد اڈوانی سندھ میں واقع حیدر آباد آ گئے اور وہاں انہوں نے اپنے کسی دوست کی زبان سے سب سے پہلے آر ایس ایس کے بارے میں سنا۔ پھر وہ آر ایس ایس کے ساتھ جڑ گئے۔ آزادی سے پہلے ہی وہ پرچارک کے طور پر کام کرنے لگے۔ آر ایس ایس کے ساتھ آنے کے بعد ان کی فکر میں تبدیلی آنی شروع ہوئی اور وہ تاریخ کو مذہبی اور فرقہ وارانہ طریقے سے دیکھنے لگے۔ کراچی میں پیدا ہونے والا لال، جو کرکٹ اور فلم کا بڑا شوقین تھا اور جنہیں انگریزی ادب میں گہری دلچسپی تھی، رفتہ رفتہ بھگوا سیاست کا بڑا نظریہ ساز اور لیڈر بن کر ابھرنے لگا۔ آزادی کے بعد اڈوانی اپنے خاندان کے ساتھ بھارت آ گئے اور انہوں نے آر ایس ایس اور جن سنگھ کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ شروعاتی دنوں میں وہ آر ایس ایس کے ترجمان جریدہ آرگنائزر کے کارگزار مدیر بن گئے۔ اڈوانی کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق رہا ہے اور وہ پارٹی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ جب بی جے پی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں الگ تھلگ پڑ گئی تھی اور اس کے پاس صرف دو ہی سیٹیں تھیں، تب اڈوانی نے ہی بی جے پی کی کمان سنبھالی اور پارٹی میں مودی کے علاوہ پرمود مہاجن، راجناتھ سنگھ وینکیا نائیڈو جیسے نوجوان لیڈروں کو جوڑا۔ اڈوانی کو اس بات کا بھی کریڈٹ جانا چاہیے کہ انہوں نے پارٹی کی تنظیم کو مضبوط کیا اور اس کے دروازے ان کے لیے بھی کھولے، جن کا تعلق آر ایس ایس سے نہیں تھا۔ جنتا پارٹی میں کام کرتے ہوئے اڈوانی نے یہ محسوس کیا کہ صرف کیڈر کی بنیاد پر ہی پارٹی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ حالانکہ یہ بھی بات صحیح ہے کہ اڈوانی نے کبھی بھی آر ایس ایس کے ایجنڈے کو ترک نہیں کیا۔ مندر تحریک کا استعمال کر کے انہوں نے بی جے پی کو دلی کی گدی پر بیٹھا دیا۔ حالانکہ اس سیاست نے ملک کا بڑا نقصان کیا اور معصوموں کی جانیں گئیں۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں اڈاونی نے اپنی امیج کو بدلنے کی کوشش بھی کی اور خود کو سیکولر لیڈر کے طور پر پیش کرنا چاہا۔ اسی کوشش میں انہوں نے پاکستان کے بانی محمد علی جناح کی تعریف کی اور ان کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر بھی کہا۔ اتنا ہی نہیں اڈوانی نے جناح کی ۱۱؍اگست ۱۹۴۷ کی تقریر کی زبردست تعریف کی اور کہا کہ ان کی یہ باتیں سیکولر ریاست کی قیام کی تائید کرتی ہیں۔ مگر اس بیان سے اڈوانی کی شبیہ تو نہیں بدلی، ہاں اتنا ضرور ہوا کہ پارٹی کے اندر وہ مزید درکنار کر دیے گئے اور پھر اڈوانی کی سیاسی زندگی کا زوال شروع ہو گیا۔

(مضمون نگار نے جے این یو سے جدید تاریخ میں پی ایچ ڈی کی ہے)

debatingissues@gmail.com

اے. جی نورانی: ایک عظیم سیکولر و روشن خیال دانشور

ابھے کمار

گزشتہ جمعہ کی شام ہندوستانی پارلیمنٹ سے متصل کانسٹی ٹیوشن کلب میں، 12 ویں اصغر علی انجینئر یادگاری خطبہ کا انعقاد کیا گیا۔ بطور خطیب اے جی نورانی مدعو تھے۔ نامور ماہر آئین، سیاسی مبصر، کالم نگار، مورخ اور سپریم کورٹ اور بمبئی ہائی کورٹ کے بڑے وکیل، 88 سالہ نورانی صاحب کو سننے کے لیے دلی بے تاب تھی۔ شام ڈھلنے سے پہلے میں جے این یو کے اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ لیکچر ہال کے باہر لگے خوبصورت چشموں سے پانی کے پھوارے آسمان کو چومنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسا گمان ہو رہا تھا کی یہ بھی اس بے حد خاص مہمان کے استقبال میں آج کچھ زیادہ ہی مسرور تھے۔ یہ سرور و مسرت بے جا نہیں تھی۔ نورانی صاحب جیسا عظیم دانشور ایک عرصہ کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے، جنہوں نے اپنی پوری زندگی حق گوئی میں صرف کی ہے۔ ان کی حیدرآباد، کشمیر، بابری مسجد سے متعلق تحقیق اور اہم دستاویزات کی تدوین، تاریخ کے شعبہ میں لافانی اور لاثانی خدمات کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحریریں زیادتی ڈھا رہی اور اپنے فرائض سے منہ موڑ رہی حکومت کے خلاف ایک بے باک آواز رہی ہے۔ الغرض، نورانی صاحب کی زندگی سیکولر اور ترقی پسند نظریات کا بے حد خوبصورت مجسمہ ہے۔

جب میں ہال کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ نورانی صاحب وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قریب پہنچ کر میں نے ان کو سلام پیش کیا اور کہا کہ "میں آپ کی تحریروں کو پڑھتا ہوں اور میری آرزو ہے کہ میں آپ کی طرح بنوں"۔ سر ہلا کر انہوں نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ جب میں نے ان کو بتایا کہ میری پی ایچ ڈی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے موضوع پر حال میں ہی جمع ہوئی اور اس دوران ان کی تحریروں سے کافی مستفید ہوا، تب نورانی صاحب نے سر ہلایا۔ خیال رہے کہ نورانی صاحب کی اس موضوع پر یہ رائے ہے کہ مسلم پرسنل لاء کے مسئلہ کو روح شریعت کے مطابق حل کیا جائے، نہ کہ اینگلو -محمڈن لاء، جو کہ انگریزوں کے دور حکومت میں وجود میں آیا، کو ہی شریعت سمجھ لیا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کے سخت مخالف ہیں۔ اپنی تحریروں میں وہ مسلسل لکھتے آ رہے ہیں کہ بی جے پی یکساں سول کوڈ کا استعمال مسلمانوں کے خلاف "ڈنڈے" (stick) کے طور پر کر رہی ہے۔ جب میں نے ان سے یہ ساری باتیں دہرائیں اور کہا کہ اپنی پی ایچ ڈی مقالے میں میں نے یہ سب کچھ شامل کیا ہے، تو اس بار بھی انہوں اپنا سر ہلا کر اپنی خوشی ظاہر کی۔ اسی بیچ وہاں موجود کسی شخص نے ان کے ساتھ فوٹو لینے کی خواہش ظاہر کی مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"بھارت کے مسلمان: ماضی اور حال" پر بولتے ہوئے، نورانی صاحب نے وہ باتیں کہہ دیں جن کو حکومت وقت دبانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے، مگر نورانی صاحب جیسے حق گو کو کس بات کا ڈر۔ انہوں نے سابق نائب صدر جمہوریہ، سابق کابینی وزیر اور دہلی کے دانشور طبقہ کی موجودگی میں کہا کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سال 1857 اور 1947 سے بھی زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ 1857 کے انقلاب کے بعد، انگریز تھے، 1947 میں تقسیم ہند کے بعد جواہر لال نہرو تھے، جن کی طرف مسلمان مدد کے لیے جاسکتے تھے مگر آج وہ بے سہارا اور بے یار و مددگار ہیں۔ آج مسلمان بغیر لیڈر کے ہیں، ان کے خلاف بڑے پیمانے پر بھید بھاؤ برتا جا رہا ہے، نوکریوں میں وہ امتیازی سلوک جھیل رہے ہیں۔ ہاؤسنگ سیکٹر میں وہ تعصب کے شکار ہیں۔ ان کی سیاسی نمائندگی پارلیمنٹ میں ابھی سب سے کم ہے۔ کیا مسلمانوں کی اس پسماندگی کے لیے صرف برسر اقتدار بھگوا تنظیمیں ہی ذمہ دار ہیں؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ان کی ترقی کے لیے سیکولر جماعتیں بھی پوری طرح سے ایماندار اور مخلص نہیں رہیں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ نہرو کے دور حکومت میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی گرتی چلی گئی؟

جب سوال جواب کی باری آئی تو میں نے اس پر نورانی صاحب کی رائے جاننی چاہی۔ میرے اس سوال کا مختصر جواب دیتے ہوئے، نورانی صاحب نے کہا کہ نہرو کو اور بھی زیادہ کرنا چاہیے تھا، مگر نہرو ایسا کیوں نہیں کر پائے؟

جہاں نورانی صاحب نے ملک کے پہلے وزیر اعظم نہرو کو سیکولر نظریہ کا حامل قرار دیا، وہیں انہوں نے موجودہ وزیر اعظم پر شدت پسند تنظیم آر ایس ایس کے ایجنڈے کو تھوپنے پر بے چینی ظاہر کی۔ جب 2014 میں انتخابات جیت کر مودی نے پہلی تقریر پارلیمنٹ میں کی، تب انہوں نے ہزار سال کی غلامی کی بات کہی، جو کہ آر ایس ایس کے موقف کی تائید ہے۔ ہزار سال کی غلامی کی افواہ و نفرت انگیز پروپیگنڈا پھیلا کر شدت پسند ہندوتوا عناصر مسلمانوں کو نشانہ بناتے رہے ہیں اور اس سازش کے پیچھے ان کی یہ منشا ہے کہ مسلمانان ہند اور اسلام کی پوری تاریخ اور اس کی خدمات کو نکارا جائے۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ ملک کا وزیر اعظم آئین کے مطابق بولنے اور کام کرنے کے بجائے، آر ایس ایس کے ایجنڈے پر کام کر رہا ہے۔ تبھی تو موجودہ وقت کو نورانی صاحب نے مسلمانوں کے لئے سب سے برا وقت کہا۔

اس موقع پر نورانی صاحب نے مسلمانوں کے سامنے اپنی متعدد تجاویزات بھی رکھیں اور ان کو اس پر عمل کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ "آئیسولیشن" (isolation) یعنی کنارہ کشی یا علاحدگی کی پالیسی سے گریز کریں اور وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ مل کر کام کریں اور "انوولومنٹ" (involvement) کی پالیسی اپنائیں۔ مثال کے طور پر انہوں نے کہا کہ بابری مسجد سے متعلق جو سب سے اچھی تحقیق ہے اسے رومیلا تھاپر جیسے غیر مسلم مورخین نے کی ہے۔ اس لئے مسلم تنظیموں کے دروازے تمام مظلوم اور غیر مسلم کے لئے کھلے ہونے چاہیے۔ انہیں نے کہا کہ مسلمانوں کو دلتوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے مگر اس طرح کے تاثر دینے سے گریز کرنا چاہئے کہ دلت-مسلم اتحاد اکثریتی طبقہ کے خلاف بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ تحقیق اور ریسرچ کے میدان میں کام کریں۔

نورانی صاحب کی بیشتر باتیں بالکل درست ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی کی ذمہ داری سرکار کی ضرور ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم آپ بھی اپنی ذمہ داری سے منہ نہ موڑیں۔ اسی لئے آج ملک کو ایک نہیں بلکہ بہت سارے اے جی نورانی کی ضرورت ہے۔

abhaykumar.org

آئین سازی میں بابا صاحب کا کردار

اچھا قانون یا اچھا آئین بنا لینے سے ہی انصاف نہیں مل جاتا ہے، بلکہ اچھے دستور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اچھے لوگوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے

ابھے کمار

سالوں کی محنت کے بعد جب آئین بن کر تیار ہو گیا، تب بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر نے قانون ساز اسمبلی میں ۲۵ نومبر ۱۹۴۹ کے روز ایک بہت ہی اہم تقریر کی تھی۔ ان کی یہ تقریر آئین اور جمہوریت سے متعلق تھی، جس کو حکومتیں فراموش کر چکی ہیں۔ قانون ساز اسمبلی کے ذریعہ آئین کو اپنائے جانے سے ایک روز قبل، امبیڈکر نے آئین اور پارلیمانی جمہوریت کو درپیش چیلنجوں سے باخبر کیا تھا۔ ہر سال ۲۶ رجنوری کو یوم آئین منایا جاتا ہے اور بابا صاحب کو خراج عقیدت بھی پیش کیا جاتا ہے، مگر جو نصیحتیں انہوں نے سالوں پہلے کی تھیں ان پر توجہ نہیں دی جاتی۔ لہٰذا ان باتوں کو یاد کرنا اور ان پر عمل کرنا ہی انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ مذکورہ تقریر میں امبیڈکر نے بہت سارے پہلوؤں پر بحث کی تھی، مگر ہم یہاں ان کی چار باتوں کا ہی ذکر کریں گے۔ پہلی بات مسائل کو حل کرنے سے متعلق معقول طریقۂ کار سے متعلق ہے۔ امبیڈکر کا خیال تھا کہ محکوم طبقات کو اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے آئینی طریقۂ کار کا انتخاب کرنا چاہیے اور انہیں جمہوری اور قانونی لڑائی کا سہارا لینا چاہیے۔ وہ جذباتیت پر مبنی سیاست کے خلاف تھے۔ جوشیلی تقریر اور مذہبی گول بندی ان کے نزدیک ناپسندیدہ اعمال میں شامل ہے۔ وہ مسائل کو عقل، دلیل اور منطق کی روشنی میں حل کرنا چاہتے تھے۔ تشدد کے راستے مسائل کو حل کرنا انہیں قابل قبول نہیں تھا۔ سول نافرمانی، عدم تعاون اور ستیہ گرہ کی جگہ، انہوں نے عوام سے آئینی چارہ جوئی کرنے کی اپیل کی۔

مگر بڑا سوال یہ ہے کہ جب حکومتیں ہی خود قانون کا احترام نہ کریں اور لوگوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیں، تو پھر عوام کو کیا کرنا چاہیے؟ ٹھیک اسی طرح جب ارباب اقتدار ہی تشدد کے زور پر راج چلائیں اور لوگوں کا استحصال کریں تو محکوم طبقات کب تک امن وشانتی کا مجسمہ بنے رہیں گے؟ ایسے سوالات اکثر انقلابی مفکرین کی طرف سے اٹھائے جاتے ہیں۔ ان تضادات پر امبیڈکر کا جواب یہ تھا کہ جب تک آئینی طریقۂ کار دستیاب ہو، تب تک عوام کو آئینی راہ پر ہی چلنا چاہیے: 'جہاں بھی آئینی طریقۂ کار موجود ہو، وہاں غیر آئینی طریقۂ کار کا انتخاب کرنا واجب نہیں ہے۔ غیر آئینی طریقۂ کار ہمیں انارکی کی طرف لے جاتا ہے۔ بہتری کے لئے اسے جلد از جلد ترک کر دینا چاہیے۔' ملک کی بدقسمتی دیکھیے کہ حکومتیں طاقت کا بے جا استعمال کر کے لوگوں کو غیر آئینی طریقۂ کار کو اپنانے کے لیے مجبور کر رہی ہیں۔ مذہب اور ذات پات کو دیکھ کر انعامات اور سزائیں دی جا رہی ہیں۔ عوام کے مذہب کو دیکھ کر انہیں جیل میں ڈالا جاتا ہے اور ضمانت دی جاتی ہے۔ آج ہزاروں کی تعداد میں محکوم طبقات کے نوجوان قید ہیں۔ ان کی فریاد سننے کے لئے کئی تو بار عدالتیں بھی تیار نہیں ہوتیں۔ سرکاری اداروں کے جانبدارانہ رویہ کو دیکھ کر بہت سارے لوگ غیر آئینی طریقۂ کار کو اپنانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

امبیڈکر کی دوسری اہم بات سیاست میں بھکتی سے متعلق ہے۔ مذہب میں جس طرح سے بھگوان کے تئیں بھکتی کا اظہار کیا جاتا ہے، کچھ اسی طرح سیاست میں بھی تملق پسند لیڈر اپنے مفاد کی خاطر سیاسی آقاؤں کی بھکتی کرنے لگتے ہیں۔ امبیڈکر نے سیاسی لیڈروں کو متنبہ کیا کہ وہ سیاست میں کسی کو بھی آنکھ بند کر کے اپنا سردار نہ مانیں۔ لیڈرشپ پر بغیر سوچے سمجھے یقین کرنا جمہوریت کے لئے بڑا خطرہ ہے۔ اس طرح امبیڈکر سیاست میں کسی کو ہیرو بنانے اور اس کی عبادت کرنے کے سخت مخالف تھے: 'جس طرح بھارت کی سیاست میں کسی شخص کو ہیرو بنا کر پوجا جاتا ہے اسی طرح کی روایات دوسرے

> امبیڈکر اس بات سے فکر مند تھے کہ سماجی اور اقتصادی جمہوریت کے بغیر، سیاسی جمہوریت محکوموں کو انصاف نہیں دلا پائے گی۔ اس لئے ان کا ماننا تھا کہ شخصی آزادی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سماجی اور معاشی مساوات بھی دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ ہندوستانی سماج غیر برابری پر مبنی ہے اور یہاں کے وسائل پر اعلیٰ ذات کے مردوں کا قبضہ ہے۔ ذات پات کی غیر برابری کو دور کیے بغیر جمہوریت کی جڑیں کیسے گہری ہو سکتی ہیں اور نہ ہی سماج میں اخوت پیدا کی جا سکتی ہے۔

ملکوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مذہب میں بھکتی کی راہ پر چل کر روح کو نجات دلائی جا سکتی ہے، مگر سیاست میں بھکتی، پستی اور آمریت کی طرف لازمی طور پر لے جاتی ہے۔' امبیڈکر کی یہ باتیں آج کتنی معنویت رکھتی ہیں۔ ارباب اقتدار کی پوری جماعت آج ایک واحد لیڈر کو 'عظیم' بنانے میں اپنی ساری توانائی صرف کر رہی ہے۔ ہر طرف ایک ہی لیڈر کا فوٹو دکھتا ہے۔ ملک کی ساری کامیابی کا سہرا ایک ہی لیڈر کے سر باندھا جا رہا ہے، جبکہ ناکامی کے لیے تمام دوسروں کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ اگر امبیڈکر ہمارے درمیان ہوتے تو وہ یہ سب دیکھ کر بہت مغموم ہوتے۔

امبیڈکر کی تیسری اہم بات یہ تھی کہ اچھا قانون یا اچھا آئین بنا لینے سے ہی انصاف نہیں مل جاتا ہے، بلکہ اچھے دستور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اچھے لوگوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آئین کا نفاذ کون کر رہا ہے اور کس طرح سے اس کی تشریح کی جا رہی ہے یہ سب بہت اہم ہے۔ اچھا قانون اگر موجود بھی ہو مگر اسے نافذ کرنے والا شخص خراب نیت رکھتا ہو، تو محکوموں کو انصاف نہیں مل پائے گا۔ الغرض، اچھا قانون خود میں انصاف کا ضامن نہیں ہے۔ اگر سرکاری افسران اور لیڈروں کی نیت میں کھوٹ ہو، تو وہ اچھے سے اچھے قانون کو توڑ مروڑ کر محکوموں کا حق مار سکتے ہیں۔ ۷۳ سال پہلے امبیڈکر جن امراض کو لے کر فکر مند تھے، آج بھی وہ برقرار ہیں۔ تضاد دیکھیے کہ اچھے قانون کے باوجود ہمارے ملک کے غریب اور کمزور لوگوں کو مایوسی جھیلنی پڑتی ہے اور ان کو در در کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امبیڈکر نے، ذات پات کے خلاف آواز بلند کی تھی اور محکوموں کے لئے متناسب اور موثر نمائندگی کی بات کی تھی۔ ان کا ماننا تھا کہ جب ہر محکمہ میں محکوم طبقات کے لوگوں کو جگہ دی جائے گی، تب وہ آئین اور قانون کی صحیح تشریح کر پائیں گے اور اپنے اور اپنے سماج کے حقوق کا تحفظ کر پائیں گے۔ ریزرویشن کی پالیسی بھی اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ امبیڈکر کے نزدیک اچھے قوانین سے کہیں زیادہ اہمیت اچھی نیت والے عملہ کی ہے: 'اگر کوئی بے مقصد آئین بھی ہو، تب بھی وہ اچھا کام کر سکتا ہے، اگر اسے عملی جامہ پہنانے والے لوگ اچھے ہوں'۔

امبیڈکر کی چوتھی بات ملک کی جمہوریت اور سماج میں برقرار سماجی اور معاشی عدم مساوات سے متعلق ہے۔ ملک کی آزادی کا تحفظ کیسے کیا جائے اور کیسے پارلیمانی جمہوریت کو کامیاب بنایا جائے؟ ان سوالات سے امبیڈکر بھی پریشان تھے۔ وہ اس بات سے افسردہ تھے کہ اگر معاشرتی اور اقتصادی عدم مساوات کو دور نہیں کیا گیا، تو ایک دن مظلوم جمہوریت کو اکھاڑ پھینک دیں گے۔ انہوں نے تاریخی واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ماضی میں ملک غلام ہوتا رہا ہے، کیونکہ ہم نے اپنے سماج کے تضادات کو حل کرنے کے لیے کام نہیں کیا۔ امبیڈکر اس بات سے فکر مند تھے کہ سماجی اور اقتصادی جمہوریت کے بغیر، سیاسی جمہوریت محکوموں کو انصاف نہیں دلا پائے گی۔ اس لئے ان کا ماننا تھا کہ شخصی آزادی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو سماجی اور معاشی مساوات بھی دینے کی ضرورت ہے کیونکہ ہندوستانی سماج غیر برابری پر مبنی ہے اور یہاں کے وسائل پر اعلیٰ ذات کے مردوں کا قبضہ ہے۔ ذات پات کی غیر برابری کو دور کیے بغیر جمہوریت کی جڑیں کیسے گہری ہو سکتی ہیں اور نہ ہی سماج میں اخوت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ان تضادات کی نشاندہی کرتے ہوئے امبیڈکر نے ملک کو متنبہ کیا کہ '۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ ر کے روز ہم سب تضادات پر مبنی ایک معاشرے میں داخل ہوں گے۔ سیاست کے حلقہ میں سب کو برابری ہے، جبکہ سماجی اور معاشی زندگی غیر برابر پر مبنی ہے۔ کب تک یہ تضادات سماجی اور اقتصادی زندگی کو مساوات سے محروم رکھیں گے؟ اگر ہم نے برابری کا حق دینے سے انکار کر دیا تو ہماری سیاسی جمہوریت خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہمیں ان تضادات کو جلد از جلد دور کر دینا چاہیے، نہیں تو جو لوگ عدم مساوات کے شکار ہیں وہ اس سیاسی جمہوریت کے ڈھانچہ کو دھماکہ سے اڑا دیں گے، جن کو بنانے کے لئے اس اسمبلی نے اتنی محنت کی ہے۔' ۷۳ رسال گزر جانے کے بعد بھی امبیڈکر کی ان باتوں پر غور نہیں کیا جا رہا ہے۔ تضادات آج بھی برقرار ہیں: جہاں بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے، وہیں اس ملک میں دنیا کی سب سے زیادہ غریب، ناخواندہ اور بیمار لوگ بھی بستے ہیں۔

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

کیوں امبیڈکر نے ہندو دھرم ترک کیا؟

ابھے کمار

امبیڈکر کی پہلی دلیل یہ تھی کہ مذہب (Religion) کا اصل مقصد بھلائی (Good) ہوتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب بھلائی کی بات کرتے ہیں، تو پھر مذہب کیوں بدلے؟ یہی سوال گاندھی نے بھی امبیڈکر کے سامنے کھڑا کیا۔ اس کا جواب امبیڈکر نے یہ کہہ کردیا کہ بھلائی کی بات تو سب مذہب کرتے ہیں لیکن بھلائی کیا ہے اس پر سب متفق نہیں ہیں۔ امبیڈکر نے ہندو دھرم کی مثال دے کر سمجھایا کہ اس میں بھلائی کا تصور تو ہے، لیکن یہ بھلائی ذات پات واونچ نیچ اور چھوت چھات کی مذمت کرنے کے بجائے، ان سب کا دفاع کرتی ہے۔

اپنی وفات سے صرف دو مہینے قبل، دلتوں و پسماندوں کے مسیحا اور بھارتی آئین کے معمار بابا صاحب امبیڈکر نے ہندو دھرم کو ترک کر دیا۔

14 اور 15 نومبر 1956 کے روز ناگپور میں لاکھوں کی تعداد میں ان کے پیروکار جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں امبیڈکر کے ساتھ ان کے ہزاروں پیروکاروں نے ایک ساتھ "بدھم شرنم گچھامی" کہا۔ تب سے لے کر آج تک لاکھوں لوگ بودھ بن گئے ہیں۔ 2011 کی مردم شماری (Census) کے مطابق ملک میں 85 لاکھ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ اس طرح ان کی آبادی کا تناسب کل آبادی کا 0.7 فیصد ہے۔

آج جب کہ دیش و دنیا میں امبیڈکر کے 62 ویں یوم وفات کے موقع پر خراج عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ اس موقع پر ہم اگر ان کے مذہب سے وابستہ افکار ونظریات پر گفتگو کریں، تو یہ بے محل نہیں ہوگا۔

سال 1936 میں بمبئی میں منعقد ایک کانفرنس میں انہوں نے مذہب سے جڑی ہوئی تمام باتوں پر روشنی ڈالی۔ خیال رہے کہ یہ کانفرنس ناسک جلسہ کے ایک سال بعد منعقد ہوئی۔ ناسک کانفرنس میں امبیڈکر نے سرعام یہ علان کیا کہ وہ اچھوت کا یہ "کلنک" اب اور نہیں جھیلیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ان پر اور دیگر اچھوتوں پر، چھوت چھات تھوپا گیا ہے اور اس ناانصافی کو ہندو مذہب واجب قرار دیتا ہے۔ لہذا اس سے نجات پانے کے لئے وہ ہندو مذہب ترک کردیں گے اور اپنے پیروکاروں سے بھی تبدیلی مذہب (Conversion) کے لئے اپیل کریں گے۔

"میں ایک ہندو نہیں مروں گا"۔ امبیڈکر کے اس کھلیا علان کے بعد ان کے ناقدین ان پر ٹوٹ پڑے۔ قدامت پسند اور برہمنی نونظریہ کے حامل لوگ سب سے زیادہ ناراض تھے اور اسے وہ ہندو سماج پر بڑا خطرہ مان رہے تھے۔ بہت سارے دلت بھی امبیڈکر کے اس فیصلہ سے امبیڈکر سے نااتفاقی رکھتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ اچھوتوں کا مسئلہ ہندو سماج کے اندر ہی حل کیا جائے۔ گاندھی جی نے بھی امبیڈکر سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کی دلیل تھی کہ چھوت چھات پر تھا اور اچھوتوں کے دیگر مسائل کا حل تبدیلی مذہب ہرگز نہیں ہے۔ جب آمبیڈکر باہمے کانفرنس میں بول رہے تھے تو بلاواسطہ و بالواسطہ انہیں سارے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔

امبیڈکر کی پہلی دلیل یہ تھی کہ مذہب (Religion) کا اصل مقصد بھلائی (Good) ہوتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب بھلائی کی بات کرتے ہیں، تو پھر مذہب کیوں بدلے؟ یہی سوال گاندھی نے بھی امبیڈکر کے سامنے کھڑا کیا۔ اس کا جواب امبیڈکر نے یہ کہہ کردیا کہ بھلائی کی بات تو سب مذہب کرتے ہیں لیکن بھلائی کیا ہے اس پر سب متفق نہیں ہیں۔ امبیڈکر نے ہندو دھرم کی مثال دے کر سمجھایا کہ اس میں بھلائی کا تصور تو ہے، لیکن یہ بھلائی ذات پات و اونچ نیچ اور چھوت چھات کی مذمت کرنے کے بجائے، ان سب کا دفاع کرتی ہے۔ اس لیا چھوتوں کے لئے ہندو دھرم میں رہنا غلامی کے مترادف ہے۔

ان کی دوسری دلیل یہ تھی کہ مذہب کا اصل مقصد سماجی زندگی (life Social) سے جڑا ہوتا ہے، نہ کہ فوق الفطرت (Supernatural) پہلوؤں سے۔ اور جب انہوں نے ہندو دھرم کا موازنہ دیگر مذاہب سے کیا، تو پایا کہ یہاں تو اچھوتوں کے لئے ناانصافی ہی ناانصافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، امبیڈکر نے ہندو دھرم کو اچھوتوں کو ہندو سماج میں برابری دینے میں پوری طرح ناکام پایا۔ لہذا اچھوتوں کو اس استحصال شدہ زندگی سے نجات پانے کے لیے ہندو دھرم کو ترک کرنا ضروری قرار دیا۔ ہندو دھرم سے باہر جو بھی مذہب، جو سماجی مساوات اور اخوت کے نظریہ کو فروغ دیتا ہو، وہ اچھوتوں کے لئے مناسب ہے۔

ان کی تیسری دلیل یہ تھی کہ اگر اچھوت ہندو دھرم کو ترک کردیتے ہیں تو ان پر تھوپی گئی عزلت کی زندگی (Isolation) بھی ختم ہوجائے گی۔ یہ ذلت کی زندگی نہیں تو اور کیا ہے؟ جب ہندو سماج میں اچھوتوں کو تالاب سے پانی نہیں بھرنے دیا جاتا، ان کے گھر علی ذات کے گھروں سے دور بسائے جاتے ہیں، ان کے ساتھ کھانے پینے سے گریز کیا جاتا ہے، شادی بیاہ کی بات پر مار پیٹ اور قتل کی نوبت آجاتی ہے۔ اس الگ تھلگ کی زندگی کو الگ تھلگ کرنے کے لئے، امبیڈکر نے اچھوتوں کو ہندو دھرم سے کنارہ کشی کی بات کی۔

ان کی چوتھی دلیل یہ تھی کہ شہری حقوق)(rightsCitizenship) ضروری تو ہیں، مگر ملت (Community) میں شمولیت بھی ضروری ہے۔ ایک خوش حال اور کامیاب زندگی کے لئے لوگوں کے درمیان بھائی چارے کا ہونا بھی ضروری ہے، جو کہ ملت سے ہی مل سکتی ہے۔ ملت میں شمولیت کا جو راستہ ہے وہ مذہب کا راستہ ہے۔ لہذا امبیڈکر نے کہا کہ اچھوتوں کو ایسے مذہب میں داخل ہوجانا چاہئے جہاں یہ سارے اقدار پائے جاتے ہوں۔

مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔

ویب سائٹ: abhaykumarorg

سیاست The Siasat Daily
Sun, 16 December 2018
epaper.siasat.com/c/34902606

Thursday, December 03, 2020, New Delhi, www.inquilab.com

ڈاکٹر امبیڈکر اور دلت ادب

دلت ادب وہ ہے جس میں غیر برابری اور سماجی برائیوں کے خلاف لکھا جائے

ابھے کمار

دلتوں اور محکوموں کے مسیحا ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کا یوم وفات (مہا پری نروان) ۶ دسمبر کو ہے۔ پوری زندگی مساوات اور جمہوری اقدار کے لیے لڑنے والے بابا صاحب نے اپنی آنکھیں سال ۱۹۵۶ء میں موند لیں۔ حالانکہ ان کی زندگی اور ان کے افکار آج بھی ہمارے درمیان مشعل راہ کا کام کرتے ہیں۔ امبیڈکر جی کو لکھنے پڑھنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ محکوم طبقات سے جڑے مسائل پر انہوں نے خوب لکھا ہے۔ آپ کو یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ بابا صاحب ایک بڑے ماہر سیاسیات، تاریخ، عمرانیات، معاشیات اور قانون کے علاوہ ایک بڑے صحافی بھی تھے۔ انہوں نے بہت سارے رسالے شائع کئے اور ان میں خاموش کردیے گئے عوام کی ترجمانی کی۔ 'موک نائک'، 'سمتا' اور 'جنتا' ان کے اہم ترین رسالے ہیں۔ مراٹھی ادب کے مصنفین نے بعد کے دنوں میں بابا صاحب کی ادبی کاوشوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی آتے آتے مہاراشٹر کے دلت ادیبوں نے امبیڈکر جی کی تحریروں سے متاثر ہوکر لکھنا شروع کردیا۔ حالانکہ امبیڈکر کے نظریہ کے ماننے والے ادیب اور شاعر پہلے بھی سرگرم تھے، مگر ۱۹۷۰ء کے آس پاس دلت ادب ایک مخصوص صنف (Genre) کے طور پر مقبول ہوگیا۔ اس ادبی تحریک کو تقویت 'دلت پینتھر' تحریک بھی پہنچا رہی تھی۔ جے بی پوار دلت پینتھر تحریک سے خود جڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی کتاب 'دلت پینتھرز' میں رقم کیا ہے کہ مذکورہ تنظیم ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء کے روز تشکیل دی گئی۔ دلت پینتھر کے بارے میں پوار کہتے ہیں کہ 'ڈاکٹر امبیڈکر کی وفات کے بعد یہ امبیڈکرائٹ تحریک کا عہد زریں تھا'۔

نظریاتی اختلاف اور داخلی لڑائی کے سبب دلت پینتھر ٹوٹ کر بکھر گیا، مگر یہ دلت تنظیم اپنے پیچھے ایک انقلابی وراثت چھوڑنے میں کامیاب رہا۔ اس کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ دلت اصطلاح کو اس نے وسیع کیا اور دلت میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا جو جنم سے دلت نہیں تھے۔ مطلب یہ کہ اس میں ذات برادری (Caste) کے ساتھ ساتھ طبقاتی نظام (Class) پر بھی چوٹ کی گئی۔ اس تحریک نے جاگیردارانہ نظام کے ساتھ ساتھ سامراجیت پر بھی نشانہ سادھا۔ یاد رہے کہ امریکہ کے سیاہ فام شہریوں کے ذریعے چلائے جارہے 'بلیک پینتھر' کے نظریہ اور جدوجہد سے ہندوستان کی دلت پینتھر نے بہت کچھ سیکھا۔ دلت پینتھر کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے بڑے بڑے انقلابی مصنف اور شاعر پیدا کیے، جس نے سماج میں صدیوں سے جڑ جما چکی غیر برابری اور توہم پرستی پر یلغار کیا۔ بعد کے دنوں میں دلت پینتھر اور مراٹھی ادب کا اثر دیگر زبانوں میں لکھنے والے ادیبوں پر بھی پڑا۔ ۱۹۸۰ء کے بعد سے ہندی ادب میں بھی امبیڈکر کے نظریہ سے متاثر مصنفین نے ادب کے ٹھیکیداروں کی زبردست تنقید کی اور ذات برادری، چھوت چھات کے مسائل کو مرکز میں لایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دلت ادب (ساہتیہ) پروان چڑھنے لگا۔ آج دلت ادب کی جمالیات پر بہت ساری کتابیں آچکی ہیں اور یہ موضوع ادب کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکا ہے۔ کچھ دلت ادیبوں کی یہ بھی شکایت ہے کہ جس قدر ہندی ادب میں دلت ڈسکورس آگے بڑھا ہے ویسا اردو لٹریچر میں ہونا باقی ہے۔ اگر یہ شکوہ جائز ہے تو اردو ادب کو اس پر توجہ دینی چاہیے اور نوجوان ریسرچ اسکالرس کو اپنی تحریر اور تحقیق کے ذریعے اس خلا کو پاٹنا چاہیے۔ نامور مراٹھی مصنف شرن کمار لمبالے نے اپنی مشہور کتاب 'ٹووارڈس ان ایستھیٹکس آف دلت لٹریچر' میں دلت ادب اور اس کی جمالیات پر کافی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہ کتاب آج کل بہت سارے کالج اور یونیورسٹی میں نصاب کا حصہ بن چکی ہے۔ دلت ادب کا تعارف کراتے ہوئے لمبالے کہتے ہیں کہ دلت ادب وہ ہے جو دلت شعور اور احساس (consciousness) کے ساتھ لکھی گئی ہو۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ دلت ادب کا کام دلتوں کو ان کی غلامی کے بارے میں بتلانا ہے اور یہ کام انجام دینے کے لیے ہندو سماج کے اندر جھیل رہے دلت کے درد اور بدحالی کے بارے میں لکھنا ہوگا۔ دلت لٹریچر کا مرکز سماج میں موجود غیر برابری کو اجاگر کرنا ہوگا۔ یہ سماج میں مثبت بدلاؤ کے لیے کام کرے گا۔ یہ راجا، رانی، جن اور پریوں کی کہانی میں اپنا وقت ضائع نہیں کرے گا، بلکہ سماج کی موجودہ حالات کی عکاسی کرے گا۔ مختصراً، دلت ادب سماجی حقیقت کو بیان کرے گا۔ شرن کمار لمبالے نے یہ صاف طور پر کہہ ڈالا ہے کہ دلت ادب کی رہنمائی ڈاکٹر امبیڈکر کے افکار کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دلت ادب کی جمالیات امبیڈکر کے افکار پر مبنی ہونی چاہیے'۔ امبیڈکر کے ادبی افکار کے بارے میں بات کرتے ہوئے لمبالے کہتے ہیں کہ بابا صاحب ایسے ادب کو پسند کرتے تھے جو سماجی حقائق کو دکھلائے۔ امبیڈکر کے مطابق، ادب کا کام یہ ہے کہ وہ اخلاقی پہلوؤں کو بڑھائے اور انسانی ترقی کو فروغ دے۔ تبھی تو امبیڈکر نے منوسمرتی اور بید جیسی مذہبی کتابوں کی تنقید کی اور کہا کہ یہ سب غیر برابری کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ اس کے برعکس دلت ادب برابری اور انسانیت کے لیے کام کرے گا۔ آزادی، مساوات اور اخوت اس کا نظریہ ہوگا۔ امبیڈکر نے فرانس کے فلسفی والٹیر کی تعریف کی ہے اور اس روشن خیال انسان کی عظمت میں کہا ہے کہ اس نے سماجی اصلاح کے لیے آواز بلند کی اور جس کیتھولک عیسائی سماج میں پیدا ہوا تھا اس کی سماجی برائیوں کے خلاف کھل کر سامنے آیا۔ والٹیر کی مثال دینے کے پیچھے امبیڈکر کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی ادیب کو اپنے ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر سماجی اصلاح کے لیے آواز بلند کرنی چاہیے۔ الغرض، دلت ادب وہ ہے جس میں غیر برابری اور سماجی برائیوں کے خلاف لکھا جائے۔

دلت ادب کے حوالے سے یہ بات تو صاف ہے کہ اس نے بڑے بڑے ادیب پیدا کردیے ہیں جو ہمارے سماج کی برائیوں کے بارے میں نشان دہی کرتے ہیں اور ان کو ہم درکنار کر اپنے سماج کو مساوی نہیں بنا سکتے۔ شرن کمار لمبالے، اوم پرکاش بالمیکی، تلسی رام، شیوراج سنگھ بیچین، کنول بھارتی، موہن داس نیم شرایے جیسے دلت ادیبوں کی تحریروں سے نابلد رہنا ہماری بدقسمتی ہوگی۔

مشہور دلت شاعر، کہانی کار اور ناقد اوم پرکاش بالمیکی کی کتاب 'دلت ساہتیہ کا سوندریہ شاستر' یعنی دلت ادب کی جمالیات بھی کافی پڑھی جاتی ہے اور یہ بھی نصاب کا حصہ بن چکی ہے۔ موصوف بھی دلت ادب کو امبیڈکر کے افکار سے جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'دلت ادب کے جتنے بھی اصطلاحات ہیں ان کو امبیڈکر سے ہی قوت حاصل ہوتی ہے'۔ دلت ادب میں جو لفظ دلت ہے اس کا معنی بیان کرتے ہوئے بالمیکی کہتے ہیں کہ 'دلت لفظ کا مطلب ہے جس کا دمن ہوا ہے، دبایا گیا ہے، اچھوت، شوشت، ستایا ہوا، گرایا ہوا، اپیکشت، گھرنت، روندا ہوا، مسلا ہوا، کچلا ہوا، نشٹ، مردت، پست ہمت، ہتوآشا، وبحت، محروم وغیرہ دلت ادب کے ساتھ بہت سارے تنازعات بھی جڑے ہوئے ہیں۔ چونکہ دلت ساہتہ تجربہ پر مبنی ہے اس لیے سوال اٹھتا ہے کہ کیا ایسے ادیب جو دلت سماج میں پیدا نہیں ہوئے ہیں کیا ان کی تخلیق کو بھی دلت ادب کے دائرے میں رکھا جائے گا۔ اس سوال کو لے کر ایک رائے نہیں ہے۔ مثال کے طور ممتاز ہندی اردو کے ادیب پریم چند جنم سے دلت نہیں تھے مگر انہوں نے اپنی کہانی اور اپنے ناول میں دلت کے مسائل پر خوب لکھا ہے۔ کچھ ناقدین کا ماننا ہے کہ اگر کوئی ادب دلت مسائل کی عکاسی کرتا ہے تو ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ مصنف پیدائشی طور پر دلت ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر جھگی جھوپڑی میں رہنے والوں کے بارے میں لکھنے کے لیے کسی مصنف کو جھگی میں پیدا ہونا ضروری نہیں ہے۔ مگر دوسری طرف بہت سارے دلت ناقدین کا ماننا ہے کہ دلت ادب وہی ہے جو دلت مصنف لکھتے ہیں، کیونکہ دلت ہونے کا درد ایک دلت محسوس کر سکتا ہے ویسا اور کوئی نہیں۔ بہت سارے دلت مصنف یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ اعلیٰ ذات میں پیدا ہوئے ادیبوں نے کبھی دلت کے مسائل کو ادب کے مرکز میں نہیں لایا اور اب جب دلت ادب اپنا ایک بڑا مقام حاصل کرچکا ہے تو اب وہی لوگ دلت کے درد پر گھڑیالی آنسو بہانے کے لیے سامنے آگئے ہیں۔

اس بحث کو اس مختصر سے مضمون میں نہیں سمیٹا جاسکتا ہے۔ یہ سوال نہ صرف دلت ادب سے جڑا ہوا ہے، بلکہ ادب اور سوشل سائنس سے بھی متعلق ہے۔ کیا ریسرچ کرنے والے کسی محقق کا سماجی تشخص اہمیت رکھتا ہے؟ کیا مشرقی سماج کے بارے میں مغربی دنیا میں پیدا ہونے والا کوئی مصنف غیر جانبدارانہ طریقے سے تحقیق کرسکتا ہے؟ ان سوالوں پر بحث جاری ہے اور آگے بھی جاری رہے گی۔ مگر دلت ادب کے حوالے سے یہ بات تو صاف ہے کہ اس نے بڑے بڑے ادیب پیدا کردیے ہیں جو ہمارے سماج کی برائیوں کے بارے میں نشان دہی کرتے ہیں اور ان کو ہم درکنار کر اپنے سماج کو مساوی نہیں بنا سکتے۔ شرن کمار لمبالے، اوم پرکاش بالمیکی، تلسی رام، شیوراج سنگھ بیچین، کنول بھارتی، موہن داس نیم شرایے جیسے دلت ادیبوں کی تحریروں سے نابلد رہنا ہماری بدقسمتی ہوگی۔

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

THE INQUILAB New Delhi • Friday, April 14, 2017 P 10

اقلیتی حقوق اور بابا بھیم راؤ امبیڈکر

ابھے کمار

بھیم راؤ رام جی امبیڈکر کے یوم ولادت کے موقع پر ایک بار پھر سے ان کی عظمت واہمیت اور ان کی کارکردگی کے اعتراف میں بڑے بڑے پروگرام اور جلسے منعقد کیے جارہے ہیں۔ گزشتہ کچھ سالوں سے اس طرح کے سرکاری پروگراموں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے، کیونکہ ملک کے سیاست دانوں اور ارباب اقتدار میں اپنے آپ کو امبیڈکر کا سچا 'مقلد' کہلانے کی ہوڑ لگ گئی ہے۔ ایک لمبے عرصے تک ملک کی مین اسٹریم جماعتوں نے امبیڈکر کو نہ صرف نظرانداز کیا بلکہ ان افکار وخیالات کو دبانے کی کوشش کی، کیونکہ بابا صاحب امبیڈکر کے افکار ونظریات، مساوات، اور برابری کی تعلیم دیتے ہیں جو کسی بھی طرح برہمنی ذہنیت رکھنے والوں سیاستدانوں کے حلق کے نیچے نہیں اترے۔ جب سے محروم طبقوں میں سیاسی وسماجی بیداری بڑھی اور امبیڈکر کے افکار ونظریات ان کے درمیان مقبول ہوئے، تبھی سے ملک کی برسر اقتدار جماعتوں کی امبیڈکر کے تئیں اپنی عقیدت ومحبت اظہار مجبوری بن گئی۔

یہ دوسری بات ہے کہ آج ملک کے بیشتر سیاست داں اور حاکم اپنے آپ کو 'امبیڈکر وادی' کہتے تو ہیں مگر جب بات ان کے اصولوں کو اپنانے اور اس پر چلنے کی ہوتی ہے تو ان کے عمل میں نفاق صاف دکھائی دیتا ہے۔ امبیڈکر نے تو اپنے قلم اور ذہن کو تقریباً ہر ان مسائل کی طرف دوڑایا جن سے دلت، آدی واسی، محروم اور اقلیتی طبقات جوجھ رہے تھے اور انھوں نے ان کے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور مذہبی مسائل کو حتی الامکان سمجھنے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کی۔ مگر میری نظر میں بابا صاحب کا ایک بڑا مشن اقلیتی حقوق (Minority Rights) کے تحفظات تھے اور ان کا سب سے اہم مقصد اقلیتوں کو اقتدار میں برابری کی حصہ داری اور ساجھے داری دلانا تھا۔

بابا صاحب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اقلیتی طبقات کی رہنمائی صرف اور صرف اقلیتی طبقات ہی کر سکتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے آئین میں دلت، آدی واسی، پسماندہ اور مذہبی اقلیتی طبقوں کی حالت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لیے خصوصی حقوق کی پیروی کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ایک طبقہ یا پھر ایک سماجی گروہ کے اقتدار میں آنے کے بعد اکثر وہ اپنے ہی طبقے کے مفاد کا خیال رکھتا ہے اور دیگر طبقات کے حقوق یا مفادات ان کی نظروں میں کوئی معنی نہیں رکھتے۔

اگر ہم حکومت اور دیگر سرکاری شعبوں میں اقلیتوں اور دیگر محروم طبقات کی نمائندگی کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ ان کی نمائندگی ہر جگہ سے دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے۔ مرکز میں برسر اقتدار بی جے پی کو واضح اکثریت حاصل ہے مگر اس کے بینر تلے کوئی بھی مسلمان منتخب ہوکر پارلیمنٹ نہیں پہنچ سکا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مین اسٹریم سیاسی جماعتیں اقلیتی حقوق کے تحفظات کو لے کر بالکل غیر سنجیدہ ہیں۔ ابھی حال ہی میں اختتام پذیر ہوئے یوپی انتخابات کو ہی لے لیجیے جس میں زبردست کامیابی حاصل کرنے والی بی جے پی نے ایک بھی مسلمان کو ٹکٹ نہیں دیا تھا جو نہ صرف اس کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی غمازی کرتی ہے بلکہ یہ بابا صاحب کے اقدار واصول کے منافی بھی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ دلت اور آدی واسی کی حالت بھی قابل اطمینان نہیں ہے۔ انھیں بھی اکثر ریزورڈ سیٹ (Reserved Seat) ہی سے ٹکٹ دیا جاتا ہے جو کہ ان سیاسی جماعتوں کی آئینی 'مجبوری' ہے۔ اگر یہ سیاسی جماعتیں واقعی بابا صاحب کے افکار کے تئیں سنجیدہ ہوتیں تو ان کی نمائندگی صرف ریزروڈ سیٹوں تک ہی محدود نہیں رہتی۔

ڈاکٹر بھیم امبیڈکر کے یوم ولادت پر خصوصی مضمون

امبیڈکر بھی کانگریس کے اس منافقانہ رویے سے کافی نالاں تھے اور انھوں نے اپنی کتاب "Pakistan or the Partition of India" میں کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ: کانگریس ان طبقوں کے ساتھ اقتدار ساجھا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے جب تک وہ جماعت کانگریس کے تئیں اپنی وفاداری کا اظہار نہ کرے۔ کانگریس سے وفاداری ان کی پہلی شرط ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کانگریس نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ جب تک کوئی طبقہ ان کے تئیں وفاداری کا دم نہ بھرے تب تک وہ اسے اقتدار میں شامل نہیں کرسکتی۔ اور کانگریس کی یہ پالیسی ان کے دور اقتدار میں واضح طور پر سامنے آئی۔ اقتدار سے دور رکھنے کے بعد جب اقلیت اور دیگر پسماندہ طبقات اپنے حقوق کے لیے سامنے آتے ہیں اور کوئی مہم چھیڑتے ہیں تب بھی ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کرکے انھیں دبانے اور کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کچھ اسی طرح کے حالات 1930 کی دہائی میں بھی پیش آئے تھے۔ 1937 میں جب کانگریس نے ملک کے متعدد شعبوں میں اپنی حکومت قائم کی تو اس وقت نہ تو مسلمانوں کی واجب نمائندگی دکھائی دی اور نہ ہی ان کے بہت سے جائز مطالبات پورے کیے گئے۔ امبیڈکر بھی کانگریس کے اس منافقانہ رویے سے کافی نالاں تھے اور انھوں نے اپنی کتاب "Pakistan or the Partition of India" میں کانگریس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ: کانگریس ان طبقوں کے ساتھ اقتدار ساجھا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے جب تک وہ جماعت کانگریس کے تئیں اپنی وفاداری کا اظہار نہ کرے۔ کانگریس سے وفاداری ان کی پہلی شرط ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ کانگریس نے یہ تہیہ کرلیا ہے کہ جب تک کوئی طبقہ ان کے تئیں وفاداری کا دم نہ بھرے تب تک وہ اسے اقتدار میں شامل نہیں کرسکتی۔ اور کانگریس کی یہ پالیسی ان کے دور اقتدار میں واضح طور پر سامنے آئی۔ اقتدار سے دور رکھنے کے بعد جب اقلیت اور دیگر پسماندہ طبقات اپنے حقوق کے لیے سامنے آتے ہیں اور کوئی مہم چھیڑتے ہیں تب بھی ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کرکے انھیں دبانے اور کچلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ امبیڈکر نے اپنی ایک تحریر میں "State and Minority" میں اس جانب اشارہ کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب اقلیتی یا محروم طبقے کے لوگ اپنے جائز مطالبات کو لے کر احتجاج کرتے ہیں تو ان کی کارروائیوں کو فرقہ واریت کا رنگ دے کر اسے خارج کردیا جاتا ہے۔ وہیں دوسری جانب سماج کے اعلیٰ ذات ہندو کے مفاد کو ہی قومی مفاد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

امبیڈکر کی تحریروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بھی اس طرح کی فرقہ واریت بنام قومیت ڈسکورس (Discourse) کے شکار تھے۔ آزادی کے وقت ڈاکٹر امبیڈکر جب دلتوں اور دیگر محروم طبقات کی حمایت میں آواز بلند کررہے تھے تو ان پر بھی یہ الزام اس زمانے کے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے لگایا کہ وہ سماج کو بانٹنے کی کوشش کررہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ امبیڈکر نے کئی مواقع پر کانگریس کے زیر قیادت چل رہی تحریک آزادی پر بھی سوال اٹھایا۔ ان کی رائے میں کانگریس دیگر محروم طبقات کے ساتھ اقتدار ساجھا کرنے سے کتراتی رہی ہے اور دلت اور اقلیتوں کے مطالبات کو لے کر وہ سنجیدہ نہیں ہے۔

اپنی دلیل کو پیش کرتے ہوئے امبیڈکر اپنی کتاب "Mr. Gandhi and the Emancipation of the Untouchables" میں کہتے ہیں کہ "یہ غلط سوچ ہے کہ ایک خاص طبقہ (اکثریتی طبقہ) سماج کے ہر طبقے کی رہنمائی کرنے کا اہل ہے۔ کیونکہ اکثریتی طبقہ صرف اپنے طبقے کے لوگوں کے ہی مفاد کو پیش نظر رکھے گا۔ اس طرح سماج کے دیگر محروم طبقات پر ایک خاص طبقے کا تسلط قائم ہوجانا یقینی ہے۔ اسی طرح مختلف حلقوں سے منتخب اراکین پارلیمنٹ اور اسمبلی بھی صرف اپنے طبقوں کے مفادات کو ہی ذہن میں رکھ کر کام کریں گے اور دیگر طبقوں کے مفادات یا تو پس پشت ڈال دیے جائیں گے یا ان کی حیثیت محض ثانوی رہ جائے گی۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں ریزرویشن کی پالیسی بھی انھیں اقدار پر مبنی ہے۔ لیکن کئی بار ریزرویشن مخالف طاقتیں اسے غریبی ہٹانے کے پروگرام سے جوڑ دیتی ہیں اور دلیل دیتی ہے کہ اعلیٰ ذات کے لوگوں کو بھی غربت کی بنیاد پر ریزرویشن ملنا چاہیے۔ مگر ریزرویشن کا اصل مقصد غریبی دور کرنا نہیں بلکہ سماج کے مختلف طبقے کے لوگوں کو فیصلہ سازی کی کاروائی میں شامل کرنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ امبیڈکر نے آئین سازی کے عمل میں اپنی پوری طاقت وصلاحیت اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں جھونک دی اور آئین کے اندر دلت، آدی واسی، پسماندہ طبقات اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظات کے لیے بہت سے قوانین وضع کیے جن میں سے ایک ریزرویشن بھی ہے۔ آج جبکہ محروم طبقات بالخصوص مسلمانوں کی نمائندگی تعلیم، روزگار اور حکومت سازی سمیت دیگر شعبوں میں دن بدن گرتی جارہی ہے تو اس کی اصلاح کیے بغیر بابا صاحب امبیڈکر کو کیسے صحیح معنوں میں خراج عقیدت پیش کیا جاسکتا ہے؟

ابھے کمار جے این یو کے شعبہ تاریخ میں ریسرچ اسکالر ہیں۔
ای میل debatingissues@gmail.com

کیوں امبیڈکر نے ہندو دھرم ترک کیا؟

ابھے کمار

امبیڈکر کی پہلی دلیل یہ تھی کہ مذہب (Religion) کا اصل مقصد بھلائی (Good) ہوتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب بھلائی کی بات کرتے ہیں، تو پھر مذہب کیوں بدلے؟ یہی سوال گاندھی نے بھی امبیڈکر کے سامنے کھڑا کیا۔ اس کا جواب امبیڈکر نے یہ کہہ دیا کہ بھلائی کی بات تو سب مذہب کرتے ہیں لیکن بھلائی کیا ہے اس پر سب متفق نہیں ہیں۔ امبیڈکر نے ہندو دھرم کی مثال دے کر سمجھایا کہ اس میں بھلائی کا تصور تو ہے، لیکن یہ بھلائی ذات پات و اونچ نیچ اور چھوت چھات کی مذمت کرنے کے بجائے، ان سب کا دفاع کرتی ہے۔

اپنی وفات سے صرف دو مہینے قبل، دلتوں و پسماندوں کے مسیحا اور بھارتی آئین کے معمار بابا صاحب امبیڈکر نے ہندو دھرم کو ترک کر دیا۔

14 اور 15 نومبر 1956 کے روز ناگپور میں لاکھوں کی تعداد میں ان کے پیروکار جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں امبیڈکر کے ساتھ ان کے ہزاروں پیروکاروں نے ایک ساتھ "بدھم شرنم گچھامی" کہا۔ تب سے لے کر آج تک لاکھوں لوگ بودھ بن گئے ہیں۔ 2011 کی مردم شماری (Census) کے مطابق ملک میں 85 لاکھ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ اس طرح ان کی آبادی کا تناسب کل آبادی کا 0.7 فیصد ہے۔

آج جب کہ دیش و دنیا میں امبیڈکر کے 62 ویں یوم وفات کے موقع پر خراج عقیدت پیش کیا جارہا ہے۔ اس موقع پر ہم اگر ان کے مذہب سے وابستہ افکار و نظریات پر گفتگو کریں، تو یہ بے محل نہیں ہوگا۔

سال 1936 میں بمبئی میں منعقد ایک کانفرنس میں انہوں نے مذہب سے جڑی ہوئی تمام باتوں پر روشنی ڈالی۔ خیال رہے کہ یہ کانفرنس ناسک جلسہ کے ایک سال بعد منعقد ہوئی۔ ناسک کانفرنس میں امبیڈکر نے سر عام یہ علان کیا کہ وہ اچھوت کا یہ " کلنک "اب اور نہیں جھیلیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ان پر اور دیگر اچھوتوں پر، چھوت چھات تھوپا گیا ہے اور اس ناانصافی کو ہندو مذہب واجب قرار دیتا ہے۔ لہذا اس سے نجات پانے کے لئے وہ ہندو مذہب ترک کر دیں گے اور اپنے پیروکاروں سے بھی تبدیلی مذہب (Conversion) کے لئے اپیل کریں گے۔

"میں ایک ہندو نہیں مروں گا"۔ امبیڈکر کے اس کھلے اعلان کے بعد ان کے ناقدین ان پر ٹوٹ پڑے۔ قدامت پسند اور برہمنی نونظریہ کے حامل لوگ سب سے زیادہ ناراض تھے اور اسے وہ ہندو سماج پر بڑا خطرہ مان رہے تھے۔ بہت سارے دلت بھی امبیڈکر کے اس فیصلہ سے امبیڈکر سے نااتفاقی رکھتے تھے اور ان کا ماننا تھا کہ اچھوتوں کا مسئلہ ہندو سماج کے اندر ہی حل کیا جائے۔ گاندھی جی نے بھی امبیڈکر سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کی دلیل تھی کہ چھوت چھات پر تھا اور اچھوتوں کے دیگر مسائل کا حل تبدیلی مذہب ہرگز نہیں ہے۔ جب امبیڈکر باہے کانفرنس میں بول رہے تھے تو بلاواسطہ و بالواسطہ انہیں سارے سوالات کا جواب دے رہے تھے۔

امبیڈکر کی پہلی دلیل یہ تھی کہ مذہب (Religion) کا اصل مقصد بھلائی (Good) ہوتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ دنیا کے سارے مذاہب بھلائی کی بات کرتے ہیں، تو پھر مذہب کیوں بدلے؟ یہی سوال گاندھی نے بھی امبیڈکر کے سامنے کھڑا کیا۔ اس کا جواب امبیڈکر نے یہ کہہ کر دیا کہ بھلائی کی بات تو سب مذہب کرتے ہیں لیکن بھلائی کیا ہے اس پر سب متفق نہیں ہیں۔ امبیڈکر نے ہندو دھرم کی مثال دے کر سمجھایا کہ اس میں بھلائی کا تصور تو ہے، لیکن یہ بھلائی ذات پات و اونچ نیچ اور چھوت چھات کی مذمت کرنے کے بجائے، ان سب کا دفاع کرتی ہے۔ اس لیا چھوتوں کے لئے ہندو دھرم میں رہنا غلامی کے مترادف ہے۔

ان کی دوسری دلیل یہ تھی کہ مذہب کا اصل مقصد سماجی زندگی (life Social) سے جڑا ہوتا ہے، نہ کہ فوق الفطرت (Supernatural) پہلوؤں سے۔ اور جب انہوں نے ہندو دھرم کا موازنہ دیگر مذاہب سے کیا، تو پایا کہ یہاں تو اچھوتوں کے لئے نا انصافی ہی ناانصافی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، امبیڈکر نے ہندو دھرم کو اچھوتوں کو ہندو سماج میں برابری دینے میں پوری طرح ناکام پایا۔ لہذا اچھوتوں کو اس استحصال شدہ زندگی سے نجات پانے کے لیے ہندو دھرم کو ترک کرنا ضروری قرار دیا۔ ہندو دھرم سے باہر جو بھی مذہب، جو سماجی مساوات اور اخوت کے نظریہ کو فروغ دیتا ہو، وہ اچھوتوں کے لئے مناسب ہے۔

ان کی تیسری دلیل یہ تھی کہ اگر اچھوت ہندو دھرم کو ترک کر دیتے ہیں تو ان پر تھوپی گئی عزلت کی زندگی (Isolation) بھی ختم ہو جائے گی۔ یہ ذلت کی زندگی نہیں تو اور کیا ہے؟ جب ہندو سماج میں اچھوتوں کو تالاب سے پانی نہیں بھرنے دیا جاتا، ان کے گھر اعلی ذات کے گھروں سے دور بسائے جاتے ہیں، ان کے ساتھ کھانے پینے سے گریز کیا جاتا ہے، شادی بیاہ کی بات پر مار پیٹ اور قتل کی نوبت آجاتی ہے۔ اس الگ تھلگ کی زندگی کو الگ تھلگ کرنے کے لئے، امبیڈکر نے اچھوتوں کو ہندو دھرم سے کنارہ کشی کی بات کہی۔

ان کی چوتھی دلیل یہ تھی کہ شہری حقوق)(rightsCitizenship ضروری تو ہیں، مگر ملت (Community) میں شمولیت بھی ضروری ہے۔ ایک خوش حال اور کامیاب زندگی کے لئے لوگوں کے درمیان بھائی چارے کا ہونا بھی ضروری ہے، جو کہ ملت سے ہی مل سکتی ہے۔ ملت میں شمولیت کا جو راستہ ہے وہ مذہب کا راستہ ہے۔ لہذا امبیڈکر نے کہا کہ اچھوتوں کو ایسے مذہب میں داخل ہو جانا چاہئے جہاں یہ سارے اقدار پائے جاتے ہوں۔

مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں۔

ویب سائٹ: abhaykumarorg

سیاست The Siasat Daily
Sun, 16 December 2018
epaper.siasat.com/c/34902606

اے ایم یو پر پولیس کا قہر: تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟

مودی حکومت جب سے اقتدار میں آئی ہے تب سے مسلسل یونیورسٹیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے اور سرکار اپنے ہندوتوا اور تعلیم کی نجکاری کے ایجنڈے کو تھوپ رہی ہے

ابھے کمار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے طلبا پر گزشتہ سنیچر کو جس طرح پولیس نے لاٹھیاں برسائیں اس نے ظلم اور بربریت کی ساری حدیں توڑ دی۔ ان کا جرم محض یہ تھا وہ نجیب کی گمشدگی کے معاملے میں سی بی آئی جانچ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ پولیس اور حکومت کے اس ظالمانہ رویے کو ہم مسلمانوں کے خلاف تعصب نہ کہیں تو اور کیا کہیں؟ میری اس رائے سے شاید کچھ لوگ متفق نہ ہوں اور ان کی دلیل یہ ہوگی کہ پولیس مظاہرہ کر رہے لوگوں سے اسی طرح پیش آتی ہے۔ اے ایم یو ہی نہیں حیدرآباد سینٹرل یونیورسٹی اور جے این یو کے طلبا بھی ماضی میں پولیس کے ظلم وستم کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ اس لیے اے ایم یو کے اس معاملے کو مسلم مخالف ذہنیت کے زاویے سے نہ دیکھا جائے۔ میں اس دلیل کو پوری طرح خارج نہیں کر رہا ہوں۔ میرا ماننا ہے کہ حال کے دنوں میں خاص کر جب سے مرکز میں مودی حکومت برسراقتدار ہوئی ہے تب سے مسلسل یونیورسٹیوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے اور سرکار اپنے ہندوتوا اور تعلیم کے نجی کاری کے ایجنڈے کو تھوپ رہی ہے۔ اس کے باوجود میں یہ مانتا ہوں کہ پولیس کا رویہ ان اداروں میں کچھ زیادہ ہی جارحانہ اور متعصبانہ ہے جہاں مسلم طلبا کی ایک بڑی تعداد زیر تعلیم ہے۔

مسلمانوں کے خلاف تعصب کی اس جڑ کو نامور اسکالر ایڈورڈ سعید نے مستشرقین کی تحریروں میں تلاش کیا ہے۔ برطانیہ حکومت کی تعلیمی فکر بھی مستشرقین کی ان تحریروں سے کافی متاثر ہوئی اور اس طرح سے ہمارے ملک میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے خلاف نفرت و تعصب کا ایک ماحول بنایا گیا۔ نتیجتاً مسلمانوں کی شبیہ 'متشدد' اور 'غدار' کے طور پر پیش کی جانے لگی۔ جس کے سبب ان کے تعلیمی اداروں اور ان کے علاقوں کو شک کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ آزاد ہند میں بھی یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سچر کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں اس افسوسناک حقیقت کا اعتراف کیا اور کہا ہے کہ مسلم علاقوں میں پولیس تو اکثر دکھتی ہے مگر اسکول، اسپتال، بینک اور کارخانے شاید ہی کہیں!

مظاہرے سے قبل انتظامیہ نے یونیورسٹی کے آس پاس کے علاقے کو پوری طرح سے پولیس چھاؤنی میں تبدیل کر دیا۔ کئی مقامات پر بیری کیڈس کھڑے کیے گئے، جگہ جگہ واٹر کینن کا انتظام کیا گیا۔ سینکڑوں کی تعداد میں مسلح ریپڈ ایکشن فورس اور پی اے سی کے جوان تعینات کیے گئے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ ریپڈ ایکشن فورس کا قیام ۱۹۹۱ء میں ہوا جس کا کام فرقہ وارانہ دنگوں کو قابو میں کرنا تھا مگر حکومت ہمیشہ اس کا استعمال اقلیتوں، مزدوروں اور طلبا کی تحریکوں کو کچلنے کے لیے کرتی ہے۔ دوسری جانب پی اے سی کا محکمہ آزادی کے بعد اتر پردیش Armed Constabulary Act 1948 کے تحت قائم کیا گیا مگر جب سے اس پر میرٹھ کے آس پاس 117 مسلمانوں کے بہیمانہ قتل کا الزام لگا ہے تب سے عوام کی نظروں میں اس کی شبیہ ایک "مسلم مخالف فورس" کی بن گئی۔

اس ظالمانہ اور دل دہلا دینے والی کاروائی کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ آخر پولیس اے ایم یو کے تئیں اتنی متشدد اور جابر کیوں ہو گئی تھی؟ یونیورسٹی کے اندر ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا اور مظاہرہ کرنا کوئی جرم تو نہیں؟ جس طرح سے نجیب کے حق میں اے ایم یو کے طلبا نے ریلی نکالی اس طرح کی متعدد ریلیاں ملک کی دیگر یونیورسٹیوں اس سے قبل بھی نکالی جا چکی ہیں۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) کے طلبا بھی نجیب کی واپسی اور خاطیوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا مطالبہ شروع سے ہی کر رہے ہیں۔ جس کے لیے انہوں نے وائس چانسلر کے دفتر کا تقریباً 22 گھنٹے تک گھیراؤ کیا اور اسی سلسلے میں انہوں نے

نجیب کو ڈھونڈنے کے نام پر جو 'آپریشن' چل رہا ہے اس کا اصلی مقصد سیکولر فکر کے حامل افراد کو پریشان کرنا اور اس پورے معاملے کو کسی نہ کسی طرح فرقہ وارانہ رنگ دے دینا ہے۔ یوپی اسمبلی انتخابات کے عین قبل سنگھی طاقتیں اس پورے معاملے کو ہندو بنام مسلم کے طور پر پیش کر رہی ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف وہ علی گڑھ کے طلبا پر قانون شکنی کا الزام عائد کر رہے ہیں وہیں دوسری جانب پولیس کاروائی کے پس پشت وہ اپنی حریف سماجوادی پارٹی حکومت کو بھی نشانہ بنا رہی ہیں۔

وزیر داخلہ کے دفتر کے سامنے بھی مظاہرہ کیا۔ مگر کہیں پولیس، انتظامیہ اور حکومت کی بربریت کا ایسا نشان نہیں ملتا جیسا ہمیں اے ایم یو کے معاملے میں نظر آیا۔ تو اس سے ہم کیا سمجھیں؟

میرا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ جے این یو انتظامیہ یا پھر دیگر یونیورسٹی کے افسران طلبا کے تئیں نرم رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر جے این یو وی سی دفتر کے گھیراؤ کے معاملے میں بیس طلبا کو ایک پروکٹوریل جانچ کے بہانے سے مسلسل پریشان کیا جا رہا ہے۔ ابھی حال میں بھی سماجی انصاف کے مسئلے کو لے کر مظاہرہ کر رہے دلت، پچھڑے اور اقلیتی طبقے کے تقریباً ایک درجن طلبا کو یونیورسٹی انتظامیہ نے بغیر کسی جانچ کے برخاست کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ اب جے این یو کے اندر مزید سی ٹی وی کیمرے لگوائے جا رہے ہیں اور طلبا کو احتجاجی مظاہرے اور عوامی جلسے کرنے کے لیے ایک کے بعد ایک نوٹس دی جا رہی ہے۔ حال میں ہی جے این یو کی نامور پروفیسر نودیتا مینن کو طلبا کی ایک میٹنگ میں اپنی بات رکھنے کی وجہ سے انتظامیہ نے ایک نوٹس دی جس میں ان کے خلاف تادیبی کاروائی کرنے کی دھمکی تھی۔ حال میں ہی نجیب کی تلاش کے بہانے سینکڑوں کی تعداد پر مشتمل پولیس کا ایک دستہ جے این یو کے اندر داخل ہوا اور اس نے کئی ہاسٹلوں میں ریڈ ڈالا۔ انہوں نے طلبا کو اس حد تک پریشان کیا کہ ان سے ان کی الماری اور بیگ تک کھولنے کو کہا گویا نجیب وہیں پر چھپا ہوا! ان تمام زیادتیوں کے باوجود بھی میرا ماننا ہے کہ اے ایم یو معاملے میں پولیس اپنے تشدد میں تمام حدوں کو پار کر گئی۔

وہیں دوسری جانب میڈیا اور سول سوسائٹی بھی دوہرا رخ اپنا رہی ہے۔ جہاں ایک طرف جے این یو کے معاملے میں میڈیا اور سول سوسائٹی کا ایک بڑا حصہ ان کے حق میں کھڑا ہونے کے لیے ہمہ وقت تیار دکھائی دیتا ہے وہیں ان کی آواز اے ایم یو کے طلبا پر ظالمانہ کاروائی کے خلاف سنائی نہیں دے رہی ہے۔ اُڑی میں ہوئے دہشت گردانہ حملے کے تعلق سے فیس بک پر ایک تبصرہ لکھنے کی وجہ سے اے ایم یو کے ایک کشمیری طالب علم کو یونیورسٹی انتظامیہ نے برخاست کر دیا تھا۔ اے ایم یو جا کر میں نے کچھ کشمیری طلبا سے اس سلسلے میں بات چیت کی اور ان سے معلوم کیا کہ کیا وہ اس کاروائی کے خلاف مہم چھیڑیں گے جیسا کہ جے این یو کے طلبا نے کیا تھا۔ ان کا جواب میرے لیے بہت ہی مایوس کن تھا۔ جب انہوں نے کہا کہ ہمیں جے این یو کی طرح عوامی حمایت ملنی مشکل ہے۔

جہاں ایک طرف پولیس نے اے ایم یو کے طلبا پر قہر برپا کیا وہیں دوسری طرف نجیب پر حملہ کرنے والے آج بھی کھلے عام گھوم رہے ہیں۔ پولیس، انتظامیہ اور بھگوا حکومت ابھی تک نجیب کو ڈھونڈنے میں نہ تو کوئی دلچسپی دکھا رہی ہے اور نہ ہی ان کے حملہ آوروں کو سزا دلانے میں۔ نجیب کو ڈھونڈنے کے نام پر جو 'آپریشن' چل رہا ہے اس کا اصلی مقصد سیکولر فکر کے حامل افراد کو پریشان کرنا اور اس پورے معاملے کو کسی نہ کسی طرح فرقہ وارانہ رنگ دے دینا ہے۔ یوپی اسمبلی انتخابات کے عین قبل سنگھی طاقتیں اس پورے معاملے کو ہندو بنام مسلم کے طور پر پیش کر رہی ہیں۔ ان کی چالاکی دیکھیے کہ جہاں ایک طرف وہ علی گڑھ کے طلبا پر قانون شکنی کا الزام عائد کر رہے ہیں وہیں دوسری جانب پولیس کاروائی کے پس پشت وہ اپنی حریف سماجوادی پارٹی حکومت کو بھی نشانہ بنا رہی ہیں۔

ان تمام الزامات کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اے ایم یو مسلمانوں کی پسماندگی کو دور کرنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ آج مسلمانوں کی خستہ حالی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب بات جیلوں میں مسلمان قیدی کی آتی ہے تو ان کی شرح آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے مگر جب بات روزگار کی ہو تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ اس پس منظر میں اے ایم یو کا کردار اور بھی بڑا اہم ہو جاتا ہے۔ ذرا سوچیے اگر اے ایم یو ہر سال ہزاروں طلبا کو ڈاکٹر، انجینئر اور دانشور نہ بنائے تو مسلم معاشرے کی حالت اور کتنی خراب ہوتی؟ بھگوا طاقت کی آنکھوں میں اسی لیے اے ایم یو ہمیشہ کانٹے کی طرح چبھتا رہا ہے۔ تبھی تو ۲۰۱۵ میں 'ہندو یووا واہنی' جیسی فرقہ وارانہ تنظیم جس کی پشت پناہی بی جے پی کے ایم پی آدتیہ ناتھ کرتے ہیں، نے بیہودہ الزام لگایا کہ اے ایم یو دہشت گردی کی ایک نرسری ہے۔ یہ سب مسلمانوں کے خلاف ایک سازش اور تعصب نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

(مضمون نگار جے این یو کے شعبہ تاریخ میں ریسرچ اسکالر ہیں۔)

debatingissues@gmail.com

امریکہ میں ذات پات پر چوٹ

یہ حقیقت اس بات کی گواہ ہے کہ ذات پات کا نظام اب بھی زندہ ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ ذات پات کا نظام شہر میں آ کر ختم ہو جاتا ہے، وہ سچائی سے منہ موڑ رہے ہیں

ابھے کمار

ریاست ہائے امریکہ کے شہر سیٹل نے ذات پات پر مبنی امتیازات کو غیر قانونی قرار دیا ہے۔ گزشتہ ہفتے سیٹل شہری کونسل نے ذات پات پر مبنی امتیازات کو ختم کرنے سے متعلق ایک مسودہ پاس کیا ہے۔ سوشلسٹ نظریہ کی حامل اور ہندوستانی نژاد اور سیٹل شہری کونسلر رکشا ساونت نے مذکورہ مسودہ پیش کیا۔ جہاں اس مسودہ کی مخالفت میں صرف ایک ووٹ پڑا، وہیں چھ ووٹ اس کی حمایت میں آئے۔ اس طرح ۲۱ر فروری کے دن سیٹل امریکہ کا پہلا شہر بن گیا، جہاں ذات پات کے خلاف قانون بنایا گیا ہے۔ مساوات کی اس جنگ کو کامیاب بنانے میں دلت اور بائیں بازو کی تنظیموں کا بڑا رول رہا ہے۔ یہ بھی بات بڑی مثبت ہے کہ رکشا ساونت خود برہمن ذات میں پیدا ہوئی ہیں، مگر انہوں نے دلتوں اور دیگر محکوموں کے حقوق کی پاسداری کو اپنا مشن بنایا ہے۔ میڈیا میں آئی خبروں کے مطابق، ساونت کا تعلق مہاراشٹر سے ہے۔ ان کی پیدائش سال ۱۹۷۳ء میں پونے میں ہوئی تھی، مگر ان کی تعلیم ممبئی میں ہوئی۔ وہ یونیورسٹی آف ممبئی سے کمپیوٹر سائنس میں گریجویٹ ہیں۔ پھر انہوں نے بطور سافٹ ویئر انجینئر کام کرنا شروع کیا۔ بعد کے سالوں میں وہ اپنے شوہر وویک ساونت کے ساتھ امریکہ چلی گئیں۔ پھر ان کا جھکاؤ معاشیات کی طرف ہونے لگا اور انہوں نے سال ۲۰۰۳ء میں شمالی کارولینا ریاست سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تین سال بعد وہ سیٹل چلی گئیں اور وہاں وہ مارکسی نظریہ کی حامل سیاسی جماعت 'سوشلسٹ الٹرنیٹیو آل ٹینڈیو' سے جڑ گئیں۔ سال ۲۰۱۳ء میں وہ بطور سوشلسٹ امیدوار سیٹل شہری کونسل سے منتخب ہوئیں اور تاریخ رقم کی۔ ایک لمبے وقت سے وہ عدم مساوات کے خلاف تحریک چلا رہی ہیں اور ان کی کامیابی پوری دنیا کے لیے ایک بڑا پیغام ہے۔ پیغام یہ ہے کہ انسان کو اپنی ذات، دھرم، جنس سے اوپر اٹھ کر مظلوموں کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔

رکشا ساونت کو خراج تحسین دینے کا یہ ہرگز بھی مطلب نہیں ہے کہ اس کامیابی کے لیے صرف ایک ہی فرد ذمہ دار ہے۔ دراصل بہت ساری تنظیمیں امریکہ میں عدم مساوات کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ بہت سارے لوگ، اپنے آپ کو گمنام رکھ کر اور بڑی خاموشی سے، بابا صاحب امبیڈکر کے خوابوں کو پورا کرنے میں لگے ہیں۔ آج بڑی تعداد میں دلت بہوجن نظریہ کی حامل تنظیمیں امریکہ میں متحرک ہیں۔ امبیڈکر ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ، امبیڈکر انٹرنیشنل سینٹر، امبیڈکر انٹرنیشنل مشن، امبیڈکر کنگ اسٹڈی سرکل اور ایکوٹی لیب، جیسی امبیڈکر نواز تنظیموں کی اجتماعی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج امریکہ کا قانون ذات پات کی غیر برابری اور تعصب کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اعداد و شمار کی روشنی میں کہا جائے تو امریکہ میں ۵۴ر لاکھ جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والے لوگ زندگی گزارتے ہیں۔ ان لوگوں کے آباؤ اجداد بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، سری لنکا، بھوٹان سے ہیں۔ جنوبی ایشیائی نژاد کے امریکی باشندوں کی ایک بڑی تعداد دلتوں اور پسماندہ طبقات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ امریکہ میں ذات پات پر مبنی غیر برابری، بھید بھاؤ اور تعصب جھیل رہے ہیں۔ بیرونی ملکوں میں بھی ان کے ساتھ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کو پیچھے دھکیلنے کے لیے طرح طرح کی سازشیں کی جاتی ہیں، بالخصوص کام کاج سے متعلق جگہوں پر ان کے ساتھ امتیازات برتے جاتے ہیں۔ بہت ساری انسانی حقوق سے وابستہ تنظیمیں دلتوں اور پسماندہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والے امریکی شہریوں کی دردناک داستان کو اپنی رپورٹ میں شامل کر رہی ہیں۔

یہ ساری تلخ حقیقت اس بات کی گواہ ہے کہ ذات پات کا نظام اب بھی زندہ ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ ذات پات کا نظام شہر میں آ کر ختم ہو جاتا ہے، وہ سچائی سے منہ موڑ رہے ہیں۔ یہ بھی کہنا کہ صنعت کاری اور جدید کاری نے ذات پات کو پارہ پارہ کر دیا ہے، غلط ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ جس طرح سے ذات پات کا نظام گاؤں میں نظر آتا ہے، وہ شہروں میں کچھ الگ نظر آتا ہے۔ مگر ہر طرف ذات پات پر مبنی استحصال کا راج قائم ہے۔ امریکہ، یوروپ یا پھر بھارت کے باہر دیگر ملکوں میں ذات پات پر مبنی غیر برابری پائی جاتی ہے۔ جس طرح سے نسل پرستی میں انسان کو ایک خاص نسل یا خاندان میں پیدا ہونے یا پھر ایک خاص رنگ میں نظر آنے کی وجہ سے سماجی، معاشی اور ثقافتی طور سے کمتر سمجھا جاتا ہے، کچھ اسی طرح ذات پات کا بھی گندہ کھیل دلتوں اور پسماندہ طبقات کو مساوی حقوق نہیں دیتا۔ دیکھیے جب طاقتور طبقہ کسی مسئلہ کا حل نہیں چاہتا اور وہ کمزوروں کو ان کے حقوق دینے کو تیار نہیں ہوتا، تو وہ استحصال اور بھید بھاؤ سے چشم پوشی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ بار بار یہ جھوٹی بات پھیلائی جاتی ہے کہ ذات پات کا نظام کب کا ختم ہو گیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کا آئین کب کا مساوی حقوق بانٹ چکا ہے۔ مگر اس بات پر بحث ہوتی ہے کہ اچھا قانون تب تک کام نہیں کرے گا، جب تک اس کو نافذ کرنے والے لوگ محکوم طبقات سے نہ آ جائیں۔ یہ بھی افواہ پھیلائی جاتی ہے کہ ذات پات کی بات کرنا ذات پات کو دوبارہ زندہ کرنے کی ایک بھارت اور ہندو مخالف سازش ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے ماہر سماجیات نے بھی کاسٹ سسٹم ختم ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔

> سیٹل میں ذات پات پر مبنی تعصب کے خلاف پاس ہوئے قانون سے طاقتور لوگوں کو زک پہنچی ہے۔ اعلیٰ ذاتوں کی امریکی لابی دلتوں اور پسماندہ ذاتوں کی اس مہم کے خلاف بول رہی ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی اعلیٰ ذات کی امریکی لابی ہے، جو بھارت میں ہندوتو وادی تنظیموں کے کافی قریب ہے۔ امریکہ سے یہی لابی زعفرانی جماعت کے لیے موٹی رقم چندے کی شکل میں بھیجتی رہتی ہے۔ اس لابی کی سیاست مساوات کی نہیں، بلکہ زعفرانی قوم پرستی اور مذہبی احیا کی ہے۔

مگر سچائی یہ ہے کہ ذات پات کا نظام مختلف شکلوں میں موجود ہے۔ ذات پات صرف بھارت کا ہی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ کم و زیادہ یہ برصغیر اور دنیا کے مختلف حصوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ذات پات کی گندگی صرف ہندو معاشرے میں ہی نہیں دیکھی جاتی ہے، بلکہ مسلم، عیسائی اور سکھ سماج میں بھی موجود ہے۔ سچ یہ ہے کہ بہت سارے مذاہب میں ذات پات کو جائز نہیں قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اللہ یا ایشور نے سب کو برابر پیدا کیا ہے اور کوئی کسی سے بڑا یا چھوٹا نہیں ہے۔ اگر کوئی بڑا اور چھوٹا ہے تو صرف اپنے اچھے اور برے اعمال کی وجہ سے مگر جب ہم ان مذہبی کتابوں سے باہر نکل کر معاشرتی نظام کو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ بعض ذاتوں کے لوگ جھگی اور گندی بستیوں میں رہنے کو مجبور ہیں۔ کچھ ہی ذاتوں سے صفائی کا کام لیا جاتا ہے۔ وہیں، چند مٹھی بھر اعلیٰ ذات کے لوگ سارے وسائل پر قابض ہیں۔ کالج، یونیورسٹی، پارلیمنٹ، میڈیا، سنیما، مذہبی ادارہ، صنعت اور کھیت، سب جگہ اعلیٰ ذاتوں کا دبدبہ ہے۔ شادی بیاہ کی رسم بھی تو اکثر ذات پات کے دائرے میں ہی پوری کی جاتی ہے۔ کیا کھانا ہے، کیا نہیں کھانا ہے، کیا اچھا ہے، کیا برا ہے، یہ سب بھی تو ذات پات پر مبنی شعور ہی طے کرتا ہے۔ آسان لفظوں میں کہا جائے تو ذات پات کا نظام، محروم طبقات کے لیے سزا ہے، وہیں اعلیٰ ذاتوں کے لیے مراعات کا خزانہ ہے۔ جب اعلیٰ ذات کے لوگ ملک چھوڑ کر باہر چلے جاتے ہیں، تب بھی وہاں وہ ذات پر مبنی اپنے مراعات کو ترک کرنے کو تیار نہیں ہیں اور اس طرح ذات پات کی بیماری بھارت سے باہر بھی پھیل گئی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سیٹل میں ذات پات پر مبنی تعصب کے خلاف پاس ہوئے قانون سے طاقتور لوگوں کو زک پہنچی ہے۔ اعلیٰ ذاتوں کی امریکی لابی دلتوں اور پسماندہ ذاتوں کی اس مہم کے خلاف بول رہی ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہی اعلیٰ ذات کی امریکی لابی ہے، جو بھارت میں ہندوتو وادی تنظیموں کے کافی قریب ہے۔ امریکہ سے یہی لابی زعفرانی جماعت کے لیے موٹی رقم چندے کی شکل میں بھیجتی رہتی ہے۔ اس لابی کی سیاست مساوات کی نہیں ہے بلکہ زعفرانی قوم پرستی اور مذہبی احیا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ ذاتوں کی اس لابی نے مذکورہ قانون کو خارج کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ایک خاص مذہب پر حملہ ہے۔ انہوں نے اس قانون کو 'ہندوفوبیا' سے بھی جوڑ دیا ہے۔ یہاں تک بھی کہا جا رہا ہے کہ ذات پات کا بیانیہ بھارت اور ہندو سماج کے خلاف انگریزوں کی ایک بڑی سازش ہے۔ یہ سب بتلاتا ہے کہ ۲۱ ویں صدی میں بھی طاقتور طبقہ مساوات کی راہ پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہے، بھلے ہی وہ خود کو سب سے زیادہ تعلیم یافتہ یا ترقی یافتہ کہے۔ یہی تو اس بات کی علامت ہے کہ ذات پات کا نظام زندہ ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

حق گوئی ملک سے بغاوت نہیں ہے

آج مین اسٹریم میڈیا سرکاری کی چاپلوسی کرنے میں اتنا مصروف ہے کہ اسے انصاف کا گلا گھوٹنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگتا

ابھے کمار

دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال گزر گیا، مگر اب بھی جے این یو کا طالب علم شرجیل امام جیل سے رہا نہیں ہوا۔ ڈر کا ماحول اتنا زیادہ پھیلایا گیا ہے کہ بہت سارے انصاف پسند لوگ بھی شرجیل اور اس جیسے دیگر مظلوموں کو انصاف دلانے کے لیے بولنے سے کترا رہے ہیں۔ گزشتہ دنوں میں نے جے این یو کی ایک پروفیسر صاحبہ سے گزارش کی کہ وہ شرجیل کو انصاف دلانے کے لیے کچھ بولیں۔ ایسا کرنے کے پیچھے مقصد یہ ہے کہ شرجیل اور دیگر مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کے بارے میں لوگوں کو سچی بات بتلائی جائے۔ کوئی بھی لڑائی عوامی حمایت حاصل کیے بغیر نہیں جیتی جاسکتی ہے۔ آج مین اسٹریم میڈیا سرکار کی چاپلوسی کرنے میں اتنا مصروف ہے کہ اسے انصاف کا گلا گھوٹنے میں ذرا بھی وقت نہیں لگتا۔ شرجیل، عمر خالد، میران حیدر اور دیگر نوجوانوں کے خلاف جو ماحول خراب کیا گیا ہے اس میں انہیں کارپوریٹ میڈیا کا بڑا رول ہے۔

یاد رکھیے کہ ارباب اقتدار طاقت کے علاوہ پروپیگنڈا کے زور پر ٹکا ہوا رہتا ہے۔ اس کا پروپیگنڈا ہمیشہ یہی رہا ہے کہ وہ اپنے مفاد کو سب کا مفاد بتلائے۔ وہ خود کے مفاد کو ملک کا مفاد کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔ وہیں دوسری طرف غریب اور محکوم طبقات کے جائز حقوق کو وہ دن رات بدنام کرنے کے لیے اپنے پروپیگنڈا مشینری کو آگے کیے رہتا ہے۔ محکوموں کی آہ کو شدت پرستی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ حق کی لڑائی لڑنے والوں کو دیش دروہی، کہا جاتا ہے۔ اس لیے انصاف کی لڑائی بغیر پروپیگنڈہ کو دور کیے شاید نہیں جیتی جاسکتی۔ مگر کیا سرکاری مشینری سے لڑنا اتنا آسان کام ہے؟

یہ کام آسان تو نہیں ہے مگر ناممکن بھی نہیں۔ مایوسی ضرور ملتی ہے، مگر اس سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ جب مذکورہ پروفیسر صاحبہ نے کہا کہ میں شرجیل کے بارے میں نہیں بولنا چاہتی۔ شرجیل کے معاملے میں ڈسکشن سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے۔ تب مایوسی ضرور ملی۔ مگر ایک دیگر جے این یو کی پروفیسر نے شرجیل کے لیے بولنے پر رضامندگی ظاہر کی۔ اس لیے آج ضروری ہے کہ ہم ڈر اور خوف کے ماحول سے باہر نکلیں۔ ہمیں اپنی بات پرامن طریقے سے رکھنی ہوگی۔ ہمیں جمہوری نظام کے اندر دیے گیے حقوق کا استعمال کر کے مظلوم لوگوں کے لیے آواز اٹھانی ہوگی۔ ہمیں ان سے بھی بات کرنی چاہیے جو ہمارے نظریہ سے اتفاق نہیں رکھتے۔ مت بھولیے کہ جو حق کی بات کرتا ہے وہی سچا محب وطن ہے۔ جو انصاف کے لیے مزاحمت کرتا ہے وہی زندہ ہے۔ ہمیں دلیل کا سہارا لینا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بات کہنا جتنا آسان ہے اتنا کرنا مشکل کیونکہ ارباب اقتدار کے پاس سارے وسائل ہیں۔ بڑے بڑے نیوز چینلز سے لے کر سوشل میڈیا ان کے کنٹرول میں ہے۔ مگر ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنے ہوگی۔ اگر ہم نے اپنی بات پانچ لوگوں تک بھی پہنچادی تو یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

ایسا کر کے ہی، ہم دیش پر چھائے افواہ کے بادل کو دور کر سکتے ہیں۔ ہمیں شرجیل کے لیے نہیں اس ملک کے لیے حق کی بات کرنی ہوگی اور ناانصافی کے لیے لڑنا ہوگا۔ یہ ملک کسی کی جاگیر نہیں ہے۔ جو لوگ آج ہندو مسلمان کہہ کر لڑا رہے ہیں وہ ملک کے سب سے بڑے دیش دروہی ہیں۔ انتخابات جیتنے کے لیے وہ لوگوں کو مذہبی خطوط پر تقسیم کرر ہے ہیں، جس کو ہمیں روکنا ہوگا۔ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اس ملک کی ساجھی وراثت اور مشترکہ

مت بھولیے کہ جو حق کی بات کرتا ہے وہی سچا محب وطن ہے۔ جو انصاف کے لیے مزاحمت کرتا ہے وہی زندہ ہے۔ ہمیں دلیل کا سہارا لینا چاہیے۔ مجھے معلوم ہے کہ یہ بات کہنا جتنا آسان ہے اتنا کرنا مشکل کیونکہ ارباب اقتدار کے پاس سارے وسائل ہیں۔ بڑے بڑے نیوز چینلز سے لے کر سوشل میڈیا ان کے کنٹرول میں ہے۔ مگر ہمیں اپنی کوشش جاری رکھنے ہوگی۔ اگر ہم نے اپنی بات پانچ لوگوں تک بھی پہنچادی تو یہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔

قومیت کو ٹوٹنے سے بچائیں۔ اس لے شرجیل، عمر، میران کی لڑائی کسی مسلمان کی لڑائی نہیں ہے، بلکہ یہ ملک کو بچانے کی لڑائی ہے۔ یہ تاناشاہی اور فرقہ فرستی کے خلاف لڑائی ہے۔ یہ ملک کے دستور کو بچانے کی لڑائی ہے۔ ملک کا سیکولر آئین سب کے لیے برابری کی بات کرتا ہے۔ مذہب یا ذات پات دیکھ کر کسی کو قصور وار اور کسی کو دودھ کا دُھلا ہوا، نہیں کہا جاسکتا ہے۔ پولیس، انتظامیہ اور عدالت تعصب سے کام نہیں لے سکتی ہے۔

مگر آئین کی روح کے خلاف لوگوں کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر بھید بھاؤ کیا جارہا ہے۔ یہ بات ملک کے لیے ٹھیک نہیں ہے کہ جن لوگوں نے سرعام مارنے، پیٹنے کی بات کی اور اشتعال انگیزی سے کام لیا ان کو ہر طرح سے بچایا جارہا ہے اور انہیں دیش بھکت، کا خطاب دیا جارہا ہے۔ وہیں جو لوگ اپنے حقوق کے لیے لڑے اور ناانصاف کے خلاف آواز اٹھائی ان کو دیش دروہی، کہا جارہا ہے۔ ایک مخصوص مذہب میں جنم لینے کی وجہ سے، ان کے خلاف سخت ترین دفعات میں الجھا کر جیل میں بند گیا جا ہے۔ شرجیل کا کیس بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ گزشتہ سال شرجیل کو گرفتار کرنے سے پہلے ایک ویڈیو وائرل کیا گیا۔ کہا گیا کہ وہ شاہین باغ کا ماسٹر مائنڈ، ہے اور وہ ملک توڑنے کی بات کر رہا ہے۔ پھر اس کی گرفتاری کی گئی۔ اس کے خلاف کئی ساری ریاستوں میں کیس درج کیا گیا، جس کا مقصد صاف تھا کہ اسے باہر نہیں آنے دینا ہے۔ اس کے اوپر ملک سے غداری کرنے کا کیس (sedition) اور یو اے پی اے لگایا گیا۔ پروپیگنڈہ، خوب پھیلایا گیا اور اس کی شبیہ بگاڑنی کی پوری کوشش ہوئی۔

مگر میڈیا جو شرجیل کے بارے میں بتلا رہا تھا وہ پوری حقیقت نہیں تھی۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ کیوں میڈیا کبھی یہ نہیں بتلاتا کہ شاہین باغ احتجاج کی وجہ کیا تھی؟ کیوں سردی کی رات میں ہزاروں لوگوں کو اپنے گھروں سے نکل کر سڑک پر آنا پڑا؟ سردی کی رات میں بہت ساری ماں نے اپنے بچوں کو کھو دیا، آخر اس کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ احتجاج پر بیٹھے لوگ دن رات سرکار سے یہ مانگ کرتے رہے کہ شہریت ترمیمی قانوں (سی اے اے) کو واپس لیا جائے کیونکہ یہ قانون بھارت کے آئین اور سیکولرازم کے خلاف ہے۔ پڑوسی ملک افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کو بھارت میں شہریت دینے کے لیے بنایا گیا یہ قانون مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر باہر کر دیا۔ مظلوم کو سہارا دینا کوئی غلط بات نہیں ہے، مگر جب مظلوم کا مذہب پوچھ کر شہریت دینے کا سسٹم ایجاد کیا جائے تو کیسے یہ سیکولر ملک میں قابل قبول ہوگا؟ میڈیا نے کبھی یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیوں سرکار دوسرے فریق کی بات سننے سے انکار کرتی رہی؟ شرجیل، عمر، یا میران نے سی اے اے کی مخالفت کی جسے ملک اور دنیا کے بڑے بڑے ماہر قانون اور انسانی حقوق کے جانکاروں نے بھی غلط ٹھہرایا تھا۔ مثال کے طور پر دہلی ہائی کورٹ کے ایک سابق چیف جسٹس نے بھی سی اے اے کو ہندوستانی آئین کے بنیادی وصولوں کے خلاف قرار دیا۔ سرکار کو چاہیے تھا کہ وہ اس قانون کے خلاف ہورہے احتجاج کی آواز کو سنتی اور سب کو ساتھ لے کر چلنے کی پہل کرتی۔ مگر سرکار کا ایجنڈا تو بھارت کو ہندو راشٹر کی آگ میں جھونکنا تھا۔ اس نے کبھی بھی مذاکرہ کا سہارا نہیں لیا۔ اس کا عقیدہ پولیس کی لاٹھی میں تھا۔ ۱۵ دسمبر کی رات کو جامعہ پر لاٹھی برسائی گئی اور الٹے مسلمانوں پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ملک مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ دوبارہ نظام خلافت، لانا چاہتے ہیں اور اپنے احتجاج کے دوران مذہبی نعرے دیتے ہیں۔ ایسا کہہ کر مسلمانوں کا ڈر اکثریتی سماج کے اندر ڈالا گیا۔ شرجیل، عمر، میران، اور دیگر نوجوانوں کو پھر بلی کا بکرہ بنایا گیا۔

ہم سب کو یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ مظلوم جب بھی اپنے حقوق کی بات کرتا ہے اسے بدنام کرنے کے لیے اس پر تشدد کرنے اور ملک کے مفاد کے خلاف کام کرنے کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ دو دن پہلے دہلی میں ہوئی کسانوں کی ٹریکٹر ریلی میں بھی یہ دیکھا گیا۔ سارے اہم سوالوں کو درکنار کر کے ارباب اقتدار اور ان کا میڈیا مظاہرین پر یہ الزام لگا رہا ہے کہ انہوں نے قومی پرچم ترنگا کی توہین کی۔ مگر میڈیا اہم ترین سوال پوچھنے سے بھاگ رہا ہے کہ آخر سرکار کسانوں کے خلاف قانون پاس کیسے کرا سکتی ہے؟ جب دو مہینے سے کسان دھرنے پر بیٹھے ہوئے تھے تو بھلا سرکار بے حسی میں کیسے مبتلا رہ سکتی ہے؟ اس لیے ہمیں باتوں کو وسیع تناظر میں دیکھنا چاہیے اور حق گوئی کا ساتھ دینا چاہیے۔

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں۔)

عوام کا دشمن کون ہے؟

عوام کا دشمن وہ ہے جو سماج میں مذہب اور ذات پات کے نام پر لوگوں کو لڑا رہا ہے

ابھے کمار

ان دنوں پیاز کی قیمتوں میں زبردست اچھال دیکھنے کو ملا ہے۔ تہوار کے موسم میں اگر رسوئی گھر میں پیاز نہ ہو تو سارا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ لہٰذا عوام میں غصہ ہونا لازمی ہے۔ ایک طرف جہاں ضروری اشیاء کی قیمتیں ایکسپریس ریل گاڑی کی رفتار سے بڑھ رہی ہیں، وہیں عوام کی آمدنی پنچر ہوئی گاڑی کی طرح بیٹھی پڑی ہے۔ مگر افسوس اور مایوسی تب اور بھی بڑھ جاتی ہے جب روزی، روٹی اور مہنگائی جیسے بنیادی مسائل کو فرقہ وارانہ رنگ میں رنگ دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ حکومت کی ناکامی کو چھپانے کے لیے کیا جارہا ہے۔ برسر اقتدار جماعت اور ان سے وابستہ بھگوا طاقتیں یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ عوام کی پریشانی کے لیے حکومت وقت بھی ذمہ دار ہوتی ہے۔ دلیل یہ دی جارہی ہے کہ کسانوں نے پیاز کی کاشتکاری کم کی تھی، جو ضرورت کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ بارش اور سیلاب کا بھی بہانہ بنایا جارہا ہے اور کہا جارہا ہے کہ بہت سارے پیاز پانی سے برباد ہوگئے، جس کے لیے حکومت کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ایک مرتبہ میں نے بھگوا تنظیم سے وابستہ ایک رکن سے پوچھ لیا تھا کہ اگر پیاز کی قیمتوں میں اضافے کے لیے کسان، بارش اور سیلاب ذمہ دار ہے تو کانگریس کے دور حکومت میں احتجاج کیوں کیے گئے تھے؟ جواب دینے کے بجائے اُنہوں نے کہا کہ پیاز کھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو پاکستان چلے جایئے!

درحقیقت بھگوا طاقتوں کی اصل طاقت فرقہ پرستی ہے۔ جب اُن کے پاس سوال کا جواب نہیں ہوتا تو وہ مسئلے کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیتے ہیں۔ سب سے تشویشناک بات یہ ہے کہ ان پروپگنڈے کی وجہ سے، بہت سارے لوگ بھی بھگوا طاقتوں کی باتیں دوہرا رہے ہیں اور فرقہ پرستی کا کیڑا ہزاروں لاکھوں لوگوں کے دل ودماغ میں بٹھایا جارہا ہے۔ آج جو لوگ اپنے آپ کو بھگوا طاقتوں سے دور ہونے کا دعویٰ کرتے نہیں تھکتے وہ بھی جانے انجانے وہی باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے اب یہ یقین ہونے لگا ہے کہ بھگوا طاقتوں کا پہلا اور آخری ہتھیار فرقہ پرستی ہے۔ فرقہ پرستی کے مرکز میں مسلم، اسلام، پاکستان مخالف ایجنڈا ہے۔ فرقہ پرستی کی کہانی میں دیگر 'کھلنائک' بھی ہیں، جن کو وقتاً فوقتاً سامنے لایا جاتا ہے۔ یہ کھلنائک ہیں کمیونسٹ اور عیسائی۔ پوری ڈسکورس اس طرح سے تیار کی جارہی ہے جس میں ہندو کو مظلوم اور بے سہارا پیش کیا جا رہا ہے، جو اپنے ہی ملک میں مظلوم ہے۔ وہیں دوسری طرف مسلم، عیسائی کو جملہ ور تصور کیا جارہا ہے، جو اُن کی شناخت کو ختم کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ پروپگنڈے کا یہ بھی حصہ ہے کہ کمیونسٹ انقلاب کے نام پر ہندو دھرم، ہندو سماج کے دشمن ہیں اور وہ ملک کے امن وامان کو ختم کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ساری ڈسکورس کو ہندو بنام مسلم کر دیا جارہا ہے۔ یہ بھی پھیلایا جارہا ہے کہ بھگوا طاقتیں ہندو دھرم اور ہندو سماج اور دیش کے لیے لڑ رہی ہیں اور ان کے سارے مخالف ہندو، ہندو دھرم، دیش کے دشمن ہیں۔ مگر عوام کا اصل دشمن وہ ہے جو اُن کو غربت میں دھکیل رہا ہے۔ دشمن وہ ہے جو عوام کی روزی روٹی کے سوال کو مندر مسجد کے جھگڑے میں بدل رہا ہے۔ عوام کا دشمن وہ ہے جو سماج میں مذہب اور ذات پات کے نام پر لوگوں کو لڑا رہا ہے۔ فرقہ پرست طاقتیں اصل میں ملک اور عوام کی بڑی دشمن ہیں۔ اُن کی پوری اسٹریٹجی اپنے حریفوں کو ہندو مخالف اور مسلم پرست پیش کرنا ہے۔ اسی حکمت عملی کے تحت مہنگائی کے سوال کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا جاتا ہے۔

بدقسمتی دیکھیے کہ آج میڈیا اور حکمرانوں کی ساری توانائی پڑوسی ملک پاکستان پر حملے بولنے میں خرچ ہو جاتی ہے۔ یہ حملے صرف لفظی ہوتے ہیں اور ان سے کوئی مرتا نہیں ہے مگر اس سے دلوں کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے بہانے نشانہ مسلمانوں کو بھی بنایا جاتا ہے۔ صورت حال کشیدہ کرنے میں میڈیا کا بڑا ہاتھ ہے۔ دن رات پاکستان سے وابستہ منفی خبروں کو دکھایا جاتا ہے۔

بدقسمتی دیکھیے کہ آج میڈیا اور حکمرانوں کی ساری توانائی پڑوسی ملک پاکستان پر حملے بولنے میں خرچ ہو جاتی ہے۔ یہ حملے صرف لفظی ہوتے ہیں اور ان سے کوئی مرتا نہیں ہے، مگر اس سے دلوں کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے بہانے نشانہ مسلمانوں کو بھی بنایا جاتا ہے۔ صورت حال کشیدہ کرنے میں میڈیا کا بڑا ہاتھ ہے۔ دن رات پاکستان سے وابستہ منفی خبروں کو دکھایا جاتا ہے۔ کوشش یہ ہے کہ عوام کے دل ودماغ میں نفرت کا زہر ڈال دیا جائے، تاکہ عوام کو اپنی غریبی اور بیروزگاری کا خیال نہ رہے۔ آپ بھی اس بات پر اتفاق کریں گے کہ جتنا وقت ہندوستانی ٹی وی چینل اور اخبار پاکستان کی منفی خبروں کو دکھانے میں لگاتے ہیں، اس کا اگر ایک تہائی حصہ ہندوستان کی غریبی کے مسئلے کو سامنے لانے میں لگا دیں تو کروڑوں لوگ خط افلاس سے اوپر اٹھ جائیں گے۔ مثال کے طور پر مشہور صحافی سدھارتھ وردراجن نے ایک سیمینار میں ہندوستانی میڈیا پر بولتے ہوئے کہا کہ اُسے پاکستان سے متعلق منفی خبروں کو سامنے لانے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ اُنہوں نے اپنے ذاتی تجربے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ پاکستان میں ٹائمس آف انڈیا کے نمائندے تھے، تب اُنہوں نے پاکستان کی تعلیم سے متعلق ایک مثبت خبر شائع ہونے کے لیے دہلی بھیجی تھی۔ کئی دنوں تک جب یہ خبر اخبار میں جگہ نہیں بنا پائی تو اُنہوں نے ایڈیٹر سے دریافت کیا۔ جواب ملا کہ جب اخبار میں ہندوستان کی تعلیم کی بہت ساری خبریں نہیں شائع ہو پاتی ہیں تو پاکستان کی تعلیم کی صورت حال پر خبر لگانے کا وقت اور جگہ کہاں ہے!

پاکستان کو نشانہ بنانے کے بہانے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی ٹارگیٹ کیا جاتا ہے۔ فرقہ پرست پاکستان کو مسلمان اسلام سے جوڑ کر یہ دکھلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان مسلمان اور اسلام ہندو، ہندو دھرم، ہندوستان کے خلاف ہیں۔ یہ بات کھل کر کوئی نہیں بولتا ہے، مگر زمین کے نیچے بہنے والے فرقہ ورانہ کرنٹ کے اندر یہی سوچ کام کرتی ہے۔ کشمیر مسئلہ کے حل میں بھی یہی فرقہ وارانہ سوچ دکھ رہی ہے۔ کشمیریوں کے خلاف جو بھی ظلم وزیادتی ہورہی ہے، اس سے عوام کا دھیان ہٹانے کے لیے اس مسئلے کو ہندو بنام مسلم تنازعہ بنایا جارہا ہے۔ سرکاری اور بھگوا میڈیا کے ذریعے یہ پھیلایا جا رہا ہے کہ کشمیری عوام کا ایک بڑا حصہ متشدد ہے، جو ماحول کو بگاڑے ہوئے ہے۔ یہی لوگ ۵۰۰/روپے لے کر فوج پر پتھر مارتے ہیں۔ میڈیا اور سرکاری اسکالر یہ بھی پروپگنڈہ کر رہے ہیں کہ کشمیر میں چل رہے خون خرابے اور بدامنی کے لیے ایک مخصوص مذہب اور اس کے پیروکار ذمہ دار ہیں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ جہاں بھی ہندو اقلیت میں ہوتا ہے، وہاں اس کے اوپر مسلمان زیادتی کرتے ہیں، جیسا کہ کشمیری پنڈتوں کے ساتھ ہوا۔ مگر تاریخ اور ذاتی تجربات ان افواہوں اور پروپیگنڈوں کو مسترد کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تشدد کسی خاص مذہب یہ قوم سے وابستہ نہیں ہے۔ ہر قوم میں امن پسند اور فتنہ پرور لوگ موجود ہیں۔ اسی طرح کشمیر میں بھی مختلف ذہنیت کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ سب کو ایک ہی رنگ میں رنگنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ہندو مذہب میں امن اور عدم تشدد کی بات کرنے والے مہاتما گزرے ہیں تو اونچ نیچ اور تشدد کو جائز ٹھہرانے والے لوگ بھی سامنے آئے ہیں۔ ہندو دھرم کے ماننے والوں اور بدھ دھرم کے پیروکار میں بھی سانپ اور نیولوں کی طرح لڑائی ہوئی ہے۔

فرقہ پرست ان تاریخی حقیقتوں کو بھلا دینا چاہتے ہیں۔ اُن کی پوری کوشش ہے کہ ساری لڑائی کسی طرح بھی ہندو بنام مسلم کردی جائے۔ ان کو اس بات کی خوش فہمی ہے کہ ہندو مسلمان تنازعہ کو بھڑکا کر وہ اپنی سیاسی روٹی پکاتے رہیں گے اور ان کا راج ہمیشہ برقرار رہے گا۔ اُن کی پوری کوشش ہے کہ جو کوئی بھی ان کی ناکامی کی طرف اشارہ کرے گا، اُن کو ان وہ ہندو اور ملک مخالف قرار دے کر خارج کر دیں گے۔ اقتدار اور میڈیا کی طاقت سے وہ اپنے پروپگنڈے کو سچ ثابت کرنے میں بھی کامیاب ہو رہے ہیں۔ میڈیا کی مدد سے عوام کی ذہنیت کو بھی بدلا جارہا ہے۔ یہ سب رجحانات ملک کی صحت کے لیے کافی خطرناک ہے۔

(مضمون نگار جے این یو میں شعبہ تاریخ کے ریسرچ اسکالر ہیں)

debatingissues@gmail.com

Inquilab, Oct 24, 2019

پاکستان: جمہوریت پر فوج کا حملہ

ابھے کمار

پڑوسی

ملک پاکستان ایک بار پھر سیاسی بحران سے گزر رہا ہے۔ گزشتہ دنوں ملک میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جن سے وہاں فوج کی دوبارہ واپسی اور اس کا تسلط قائم ہونے کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے۔ مبصرین کا ماننا ہے کہ نواز شریف کی گرفتاری اور پاکستان میں بگڑتی صورتحال جمہوریت پر ایک نیا فوجی حملہ ہے۔ ان خیالات کے برعکس دوسرے ماہرین کا ماننا ہے کہ پاکستان میں اب سابقہ حالات نہیں رہے اور فوجی حکومت کی مقبولیت عوام میں ختم ہو گئی ہے، اس لیے 1958، 1977 اور 1999 کی تاریخ کو دہرانا فوج کے لیے اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کے پیچھے دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ وہاں جمہوریت کی جڑیں دھیرے دھیرے گہری ہو گئی ہیں اور وہاں فعال سول سوسائٹی فوج کی دوبارہ واپسی میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ خیال رہے کہ نواز شریف پر بدعنوانی کے معاملے درج ہیں اور گزشتہ ہفتے نیب (National Accountability Bureau) نے دس سال کی سزا مقرر کی تھی۔ ان کی 44 سالہ دختر مریم کو بھی 7 سال کی قید سنائی گئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نیب نے، جو انسداد بدعنوانی کے لیے قائم کی گئی ایک عدالت ہے، اپنا فیصلہ نواز شریف کی عدم موجودگی میں صادر کیا تھا۔

گزشتہ جمعہ پاکستان مسلم لیگ (ن) کے سرکردہ لیڈر اور تین بار وزیر اعظم رہ چکے نواز شریف لندن سے لاہور لوٹے۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی مریم نواز شریف بھی موجود تھیں۔ وہاں کے عوام اس پر حیرت زدہ ہیں کہ نواز شریف کینسر کے مرض سے لڑ رہی اپنی بیوی کو چھوڑ کر پاکستان کیسے واپس آئے؟ جہاں نواز شریف پاکستان آکر گزشتہ دنوں ہونے والے انتخابات سے قبل رائے دہندگان کی ہمدردی اپنی پارٹی کے تئیں حاصل کرنا چاہتے تھے وہیں دوسری طرف فوج ان کی گرفتاری کو عمل میں لاکر ان کو سیاست سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ فوج کو اس بات کا خطرہ ہے کہ نواز شریف اگر باہر رہیں تو وہ سیاست کو اثر انداز کر سکتے ہیں جس سے ان کی پارٹی کو دوبارہ اقتدار میں آنے میں مدد مل سکتی ہے۔

لندن کے پارک لین میں ایک پرتعیش اپارٹمنٹ کی خریداری کے معاملے میں نواز شریف پر بدعنوانی کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ شریف کے حامیوں کا ماننا ہے کہ فوج عدلیہ کی مدد سے نواز شریف کو سیاست سے دور رکھنا چاہتی ہے اور ان پر چلائے جا رہے مقدمات، سزائیں اور ان کو سرکاری محکمہ سے دور کرنے کے احکام کو ان ساری چیزوں سے جوڑ کر دیکھا جا رہا ہے، تبھی تو لاہور آمد کے وقت ہزاروں کی تعداد میں ان کے حامی اور مداح سڑکوں پر اتر آئے تھے جنہیں روکنے کے لیے فوج نے تقریباً دس ہزار پولیس کے جوان کو تعینات کیا تھا۔

نواز شریف کی گرفتاری بغیر کسی ناخوشگوار واقعہ کے عمل میں آ گئی۔ امید کی جا رہی ہے کہ وہ ضمانت کے لیے اپیل کریں گے مگر موجودہ صورتحال میں انہیں ضمانت ملے گی، اس کی امید بہت کم نظر آ رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے ہی فوج کی مداخلت، پاکستان کی سیاست میں براہ راست رہی ہے۔ وقفے وقفے سے فوجی حکومت بھی قائم ہوئی جس نے پاکستان میں جمہوریت کی جڑ مضبوط ہونے نہیں دی۔

فوج کے بارے میں لوگوں کی یہ رائے ہے کہ جمہوری نظام میں فوج سیاست سے دور رہتی ہے اور غیر جمہوری نظام میں براہ راست شامل رہتی ہے، یہ بات پوری طرح سے درست نہیں ہے۔ فوج ہمیشہ سے ہی اقتدار کا حصہ رہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ روز بروز کی سیاست میں براہ راست دخل نہیں دیتی۔ اگر جمہوری ڈھانچہ ہے تو فوج پردے کے پیچھے سے اپنے مفاد کو انجام دیتی ہے اور غیر جمہوری نظام میں فوج سامنے آنے سے نہیں ہچکچاتی۔ پاکستان میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ شروع سے ہی پاکستان میں پنجاب صوبے کے لوگوں کا دبدبہ رہا ہے۔ وہاں کے جاگیردار اور امرا پاکستانی فوج کے بڑے منصب پر فائز رہے ہیں۔ انگریزوں کے دور میں بھی فوج میں پنجاب صوبے کا دبدبہ تھا جو پاکستان کے قیام کے بعد بھی بنا رہا۔ اس وجہ سے پاکستان کے غیر پنجابی صوبے کے لوگوں میں ناراضگی رہی ہے۔ بنگلہ دیش کے قیام کے پیچھے بھی فوج میں پنجابیوں کی بالادستی ایک بڑی وجہ تھی۔ پاکستانی فوج اپنے آپ میں ایک انڈسٹری کے موافق ہے جہاں اس کے اپنے مفادات ہیں۔ اسلحہ کی خرید و فروخت میں ایک بڑا کمیشن فوج کو ملتا ہے۔ اگر پاکستان میں حالات غیر مستحکم ہیں تو اس سے فوج کی افادیت بڑھ جاتی ہے۔ فوج کو یہ بھی کہنے کا موقع مل جاتا ہے کہ جمہوری نظام اور اس کے لیڈران نے عوام کی توقعات کو پورا نہیں کیا ہے اور انہیں اقتدار میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ تمام تر کارروائی پاکستانی عوام کے مفاد کے مطابق بتائی جاتی ہے۔ فوج اپنا جواز ثابت کرنے کے لیے مذہب اور ملک کے مفاد کی دہائی دیتی ہے مگر اس کا اصل مقصد فوج کے بڑے مناصب پر فائز افسران کے مفاد کو پورا کرنا ہے۔

بین الاقوامی سیاست میں استعماری طاقتیں فوج کا استعمال کر کے اپنا مفاد پورا کرتی رہی ہیں، کیونکہ سیاسی لیڈران کے لیے عوام مخالف پالیسیوں کا دفاع کرنا مشکل امر ہوتا ہے۔ فوج کو اس طرح کی مجبوریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے، کیونکہ فوجی حکومت مطلق العنان رہی ہے جس میں میڈیا اور سول سوسائٹی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ عوام کی پریشانی کو ایک خارجی دشمن کے نام پر دبایا جاتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فوج کے نہیں رہنے پر نااہل سیاست داں ملک کے مفادات کو پورا نہیں کرتے۔

یہ چیز ملٹری ڈکٹیٹر ضیاء الحق کے زمانے میں بھی دیکھنے کو ملی جب انہوں نے جمہوریت پر حملے کو پاکستان اور اسلام کے نام پر جائز ٹھہرایا۔ ان کے دور میں سیاست اور معاشرت میں قدامت پسند اور شدت پسند عناصر کو فروغ ملا۔ لوگوں کو مذہب کے نام پر الجھایا گیا جبکہ اصل مسائل حل نہیں ہوئے۔ وہ دور بھی پاکستانی عوام کو راحت نہیں دے پائے اور ان کی مشکلیں مزید بڑھ گئیں۔ بعد کے دور میں جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں مگر پرویز مشرف نے اس دور کو بھی ختم کر دیا اور اس دہائی کے آخر میں پاکستان میں ایک بار پھر فوجی حکومت قائم ہو گئی۔
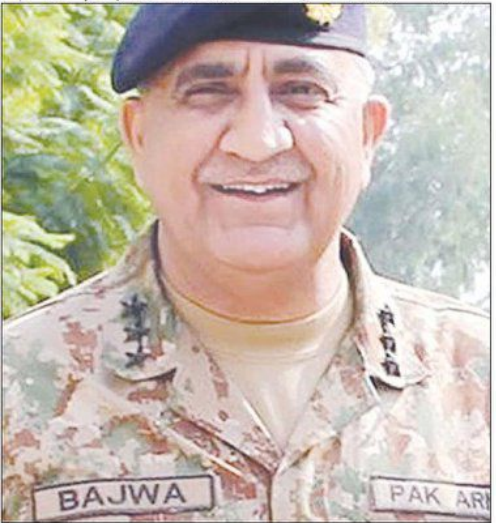
گزشتہ کچھ برسوں سے پاکستان میں جمہوریت پھر سے ابھر رہی تھی مگر نواز شریف کی گرفتاری اور ملک کے بگڑتے حالات اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ ایک بار پھر سے پاکستانی فوج اقتدار حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ یہ سب کچھ تبھی ممکن ہو پائے گا جب نواز شریف جیسے مقبول سیاست داں کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اسی پس منظر میں ان کے خلاف طرح طرح کے مقدمے عائد کیے جا رہے ہیں اور انہیں سزا سنائی جا رہی ہے۔

اس مشکل حالات میں روشنی پاکستان کی نئی نسل ہے جو یہ سمجھ چکی ہے کہ فوجی حکومت جمہوریت کا متبادل نہیں ہے۔ وہاں کی فعال سول سوسائٹی فوج کو سیاست میں دخل دینے سے دور رکھنے کے لیے کافی کوشش کر رہی ہے۔ پاکستان میں ایک مستحکم جمہوری حکومت، امن و آشتی سے ہندوستان کا مفاد بھی وابستہ ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی موجودہ حکومت بھی فوج کے نام پر سیاست کر رہی ہے اور فوج کو بالائے تنقید سمجھتی ہے جیسا کہ مذکورہ بالا سطروں ذکر کیا جا چکا ہے کہ فوج کبھی بھی غیر سیاسی ادارہ نہیں رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں وہ برائے راست اثر انداز ہوتی ہے اور کہیں پردے کے پیچھے اپنا کام کرتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی مداخلت غیر جمہوری ڈھانچے میں جمہوری طرز حکومت کے مقابلے بہت زیادہ ہو مگر یہ کہنا کہ فوج کی تنقید کرنے سے ملک کی سالمیت کو خطرہ ہے، یہ بالکل بھی درست نہیں۔ امید کی جانی چاہیے کہ پاکستان میں فوج کے ناپاک عزائم کامیاب نہ ہو پائیں گے اور وہاں کا جمہوری ڈھانچہ اپنی خامیوں کو دور کرتے ہوئے ایک مستحکم اور پائیدار حکومت کی تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔ ■

غلط فہمیوں کو دور کیے بغیر امن ممکن نہیں

گائے کے تحفظ کی مہم میں پورا ملک اس کا ساتھ دے گا مگر یہ مہم اقلیتوں کو نشانہ بناتی ہے اور اکثریتی طبقے میں ان کے تئیں نفرت پیدا کرتی ہے

ابھے کمار

جنید اور ناصر کے بہیمانہ قتل سے ہم سب غم زدہ ہیں، مگر دکھ کی بات یہ ہے کہ پولیس اور انتظامیہ اور سیاست داں قصور واروں کو پکڑنے اور مظلوموں کو انصاف دلانے کی جگہ سیاسی محرکات پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں۔ انسانی جان سے زیادہ عزیز ان کے نزدیک اکثریتی ووٹ بینک ہے۔ 'گئو رکشا مہم' اگر گائے کی فلاح و بہبود کے لیے چلائی جائے تو پورا ملک اس کا ساتھ دے گا۔ مگر یہ مہم اکثر اقلیتوں کو نشانہ بناتی ہے اور اکثریتی طبقے میں اقلیتوں کے تئیں نفرت پیدا کرتی ہے۔ حالانکہ اس نفرت انگیز مہم کا مقابلہ چند لوگوں کو جیل میں ڈال دینے سے پورا نہیں ہوگا، بلکہ ماضی کی گئو رکشا تحریک کو بھی سمجھنا ہوگا۔ مثال کے طور پر ۱۹ ویں صدی میں تشکیل شدہ آریہ سماج نے بھی گئو رکشا مہم چلائی تھی۔ اس مہم کا منفی اثر یہ ہوا کہ اکثریتی سماج کے ایک بڑے حصے کو یہ بتایا گیا کہ غیر ہندو، بالخصوص مسلمان اور عیسائی، گئو کشی کے لیے ذمہ دار ہیں۔ آج بھی یہ فکر کام کر رہی ہے۔ آریہ سماج کا اثر پنجاب، مغربی اور شمالی ہندوستان پر زیادہ رہا ہے اور یہی وہ علاقے ہیں جہاں ۱۹ ویں صدی کے بعد ہندو، مسلمان، سکھ، اور عیسائی سماج کے لوگوں کے بیچ دوریاں بڑھائی گئیں۔ انہیں علاقوں میں مذہبی تشخص پر خوب زور دیا گیا۔ مشترکہ تہذیب کی جگہ فرقہ پرستی کی بات چل پڑی۔ کیا یہ صرف اتفاق ہے کہ آج بھی انہیں علاقوں میں بڑی تعداد میں 'گئو رکشا آندولن' چل رہا ہے اور مسلمانوں، عیسائیوں اور دلتوں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے؟

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند سرسوتی تھے۔ مؤرخ کینتھ ڈبلیو جونس کے مطابق، سوامی جی ایک زاہد (سنت) تھے۔ ان کا تعلق مغربی بھارت کے کاٹھیاواڑ سے تھا۔ یہ ایک جزیرہ نما علاقہ ہے، جو آج گجرات میں واقع ہے۔ سوامی جی کا مقصد روایتی ہندومت کا احیاء تھا۔ ان کا پیغام تھا کہ ہندوؤ، وید کی طرف لوٹو۔ انہوں نے آریہ سماج نامی تنظیم کی تشکیل راجکوٹ میں ۱۸۷۵ء میں کی تھی۔ آریہ سماج سے وابستہ ہونے والے زیادہ تر لوگ پڑھے لکھے اور مغربی تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ سوامی جی مناظرہ میں بھی شرکت کرتے تھے۔ دیگر مذاہب کے پیشواؤں کے سامنے، وہ ویدوں کی اہمیت بیان کرتے تھے۔ اس تنظیم کی اہم بات یہ تھی کہ وہ مورتی پوجا کی مخالف تھی۔ یہ بہت ساری روایتی ہندو رسوم کو ترک کرنے کو بھی کہتی تھی۔ ایک حد تک یہ ذات پات کی بھی مخالفت کرتی تھی۔ خواتین کی تعلیم پر بھی زور دیتی ہے۔ سوامی جی کی کتاب 'ستیارتھ پرکاش' یعنی حقیقت کی روشنی نے ویدوں کی اہمیت بتائی۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک زمین پر نظر آنے لگی۔ آج آریہ سماج سے وابستہ بہت سارے مذہبی، تعلیمی اور سماجی ادارے بھارت کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مشہور ڈی اے وی اسکول اور کالج بھی اسی تحریک کی کوکھ سے نکلے ہوئے ہیں۔ مگر اس تحریک میں بہت ساری ناقابل قبول باتیں بھی تھیں۔ ایک حد تک آریہ سماج کی فکر میں مسلم اور عیسائی مخالف تعصب پایا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس تنظیم نے غیر برابری کے خلاف بولنا کم کیا اور اپنی طاقت گئو رکشا مہم پر لگا دی۔ یہ بھی دیکھیے کہ آج آریہ سماج کی دکانوں میں سماجی اصلاح سے زیادہ مسلم مخالف لٹریچر نظر آتا ہے۔ حالانکہ اس تحریک کا ایک دیگر منفی پہلو یہ بھی تھا کہ اس نے جارحانہ طریقے سے اقلیتوں کے بعض عقائد کو خارج کیا۔ 'شدھی' نام سے اس نے غیر ہندوؤں کو ہندو بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ دراصل یہ آریہ سماج کی ناقص سوچ تھی کہ جو بھی مسلمان یا عیسائی ہندو بن جائے گا وہ 'شدھ' یعنی پاک ہو جائے گا۔ آج بھی ہمارے سماج میں یہ فرقہ وارانہ سوچ جڑ پکڑ چکی ہے کہ جب کوئی غیر ہندو اپنا مذہب تبدیل کر کے ہندو بنتا ہے، تو اس کو 'گھر واپسی' کہا جاتا ہے اور اس پر مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے، وہیں جب اقلیتی سماج کے پیشوا اپنے دین کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تو ان کو جبری تبدیلیٔ مذہب کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ تضاد دیکھیے کہ جو اپنی مرضی سے اسلام یا عیسائیت قبول کرتا ہے، اس کے خلاف پولیس طرح طرح کی جانچ کرنے آ جاتی ہے۔ اس کی نئی تشخیص کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہیں جب کوئی غیر مسلم ہندو بنتا ہے تو اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ بہت سارے دانشوروں کا کہنا ہے کہ آج کے کمیونل اور اقلیت مخالف تعصب کے پیچھے آریہ سماج کا لٹریچر بھی ذمہ دار ہے۔

جب کوئی غیر ہندو اپنا مذہب تبدیل کر کے ہندو بنتا ہے، تو اس کو 'گھر واپسی' کہا جاتا ہے اور اس پر مسرت کا اظہار کیا جاتا ہے، وہیں جب اقلیتی سماج کے پیشوا اپنے دین کی خوبیاں بیان کرتے ہیں تو ان کو جبری تبدیلیٔ مذہب کے جرم میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ تضاد دیکھیے کہ جو اپنی مرضی سے اسلام یا عیسائیت قبول کرتا ہے، اس کے خلاف پولیس طرح طرح کی جانچ کرنے آ جاتی ہے۔ اس کی نئی تشخیص کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، وہیں جب کوئی غیر مسلم ہندو بنتا ہے تو اس کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ بہت سارے دانشوروں کا کہنا ہے کہ آج کے کمیونل اور اقلیت مخالف تعصب کے پیچھے آریہ سماج کا لٹریچر بھی ذمہ دار ہے۔

سوامی دیانند سرسوتی نے سال ۱۸۸۰ء میں ایک چھوٹا سا پرچہ 'گو کرونا ندھی' نام سے قلم بند کیا تھا، جس میں انہوں نے نہ صرف گئو کشی کی مخالفت کی تھی، بلکہ کسی بھی جانور کا گوشت کھانے کو بھی غلط ٹھہرایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سبزی خوری ہی درست ہے۔ حالانکہ سبزی خوری کو جائز کہنے والے دنیا میں بہت سے لوگ ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ مچھلی، انڈا، یا گوشت کو انسان پوری طرح سے ترک کر دے۔ مگر سوامی جی اتنا ہی کہہ کر نہیں رکے بلکہ انہوں نے گوشت خوروں کو 'ہنسک' یعنی متشدد بھی کہا۔ سوامی جی کو یہ بات بھی قابل قبول نہیں تھی کہ جو گوشت کھانا چاہے اسے کھانے کی اجازت ہونی چاہیے۔ وہ گوشت خوری کو معاشرتی تشدد سے جوڑ کر دیکھتے تھے۔ اپنی تحریر میں انہوں نے ایک مقام پر گئو کشی کے لیے ۷۰۰ سال پہلے ملک میں داخل ہونے والے 'غیر ملکی لوگ' کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ ۷۰۰ سال قبل آنے والے غیر ملکی لوگ کی بات کہہ کر انہوں نے نام لیے بغیر، مسلمانوں کو نشانہ بنایا اور ان کو گئو کشی کے لیے ذمہ دار ٹھہرایا۔ سوامی جی کے 'گو کرونا ندھی' سے بعض اقتباسات آپ کے سامنے پیش ہیں۔ 'آریہ لوگ جانوروں کے قتل کو گناہ سمجھتے تھے۔ جو گوشت نہ کھائے تو جانور کبھی نہ مارا جائے۔ مذہبی معزز لوگ، آپ ان جانوروں کی حفاظت ہر طرح سے کیوں نہیں کرتے؟ ۷۰۰ سال پہلے اس ملک میں گائے اور ان کی نسل کے جانوروں کو مارنے والے گوشت خور غیر ملکی لوگ آ کر بس گئے۔' اپنی تحریر میں یہ بات سوامی جی نے دبا دی کہ گوشت کھانے والے صرف بیرونی نہیں ہیں، بلکہ بھارت کی ایک بڑی اکثریت گوشت کھاتی ہے۔ بیف بھی مسلمان اور عیسائی کے علاوہ ہندو سماج کا ایک بڑا طبقہ کھاتا ہے۔ بڑی تعداد میں دلت اور آدی واسی سماج کے لوگ بیف کو غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پنڈت لیکھ رام، جو کہ آریہ سماج کے بڑے لیڈروں میں سے ایک تھے، انہوں نے سوامی جی کے بعد گئو رکشا اور ہندی کو آریہ سماج تنظیم کا ایک اہم ایشو بنایا اور فرقہ پرستی کو ہوا دی۔

حالانکہ گئو کشی کے موضوع پر سوامی جی کی کتاب آنے سے پہلے بھی تنازعات سامنے آنے لگے تھے۔ مگر سوامی جی کی مذکورہ کتاب اور پنڈت لیکھ رام کی بعد کے دنوں کی مہم نے غلط فہمیوں کو دور کرنے کے بجائے انہیں مزید بڑھایا۔ پنجاب، جہاں آریہ سماج کی تحریک بڑی مضبوط ہوئی وہیں سکھ احیاء پرستوں نے گئو کشی کا مسئلہ اٹھایا تھا۔ 'نام دھاری' تحریک سکھوں کی ایک اصلاحی تحریک تھی، جو ۱۸۵۰ء میں وجود میں آئی۔ یہ سب کچھ آریہ سماج کے قیام سے پہلے کی بات ہے۔ اس تحریک کے بانی بالک سنگھ تھے۔ ۱۸۶۲ء میں اسی تحریک کے ایک قاعد بالک سنگھ نے سکھ گرو گوبند سنگھ جی کی دوبارہ ولادت کی پیشین گوئی کی اور سکھ سلطنت کی تشکیل کی بات کہی۔ یہی وجہ تھی کہ نام دھاری تحریک انگریزی حکومت کی آنکھوں کا کانٹا بن گئی۔ نام دھاری تحریک نے 'گائے رکشا' کی بات بھی زور شور سے اٹھائی۔ اس تحریک سے وابستہ بعض شدت پسندوں نے ۱۸۷۱ء میں امرتسر اور لدھیانہ ضلعوں کے کچھ مسلم قصابوں کو ہلاک کر ڈالا۔ نام دھاری تحریک نے انگریزوں سے اسلحہ لوٹنے کی کوشش بھی کی۔ مگر انگریزی حکومت نے اس تحریک کو دبا دیا۔ رام سنگھ کو گرفتار کیا گیا اور ان کو قید کر کے برما بھیج دیا گیا۔ حالانکہ یہ تحریک کمزور ہو گئی، مگر اس تحریک نے جو زمین گئو رکشا سے متعلق تیار کی تھی اس پر آریہ سماج نے بعد میں کھیتی کی۔ آج کہیں نہ کہیں آریہ سماج نے جو زمین تیار کی ہے، اس کا استعمال آج کے گئو رکشک کر رہے ہیں۔ کیا سیکولر دانشوروں کو ان تاریخی غلط فہمیوں کا جواب نہیں دینا چاہیے؟ کیا ان غلط فہمیوں کو دور کیے بغیر امن قائم کیا جا سکتا ہے؟ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

عتیق کا نہیں، قانون کا خون ہوا ہے

ایسا محسوس بھی ہو رہا ہے کہ عتیق قتل کے شور میں ستیہ پال ملک کا بیان ایک حد تک دب کر رہ گیا ہے

ابھے کمار

میڈیا نے عتیق احمد کے بارے میں جو شبیہ بنائی تھی، ہم بھی اس سے متاثر رہے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ ان کی اِمیج ایک گینگسٹر کی تھی۔ کہا گیا کہ ان کے تار بڑے بڑے سیاست دانوں سے تھے۔ الزام تھا کہ تشدد کے کئی معاملوں بھی ان کا رول تھا۔ سچائی جو بھی ہو، قانون سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ جو بھی قانون توڑے اس کے خلاف کاروائی ضرور ہونی چاہیے۔

عتیق احمد بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے اور عدالتیں ان کے خلاف مقدموں کی سماعت کر رہی تھیں۔ مگر غم و غصہ کی بات یہ ہے کہ عدالت کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر، عتیق اور ان کے بھائی اشرف کا بہیمانہ طریقہ سے قتل کر دیا گیا ہے اور ان کے بیٹے اسد احمد کا انکاؤنٹر دو روز قبل کر دیا گیا تھا۔ حملہ آوروں نے گولی چلانے کے بعد 'جے شری رام' کے نعرے بھی لگائے۔ سوشل میڈیا پر فرقہ پرست طاقتیں اس وحشیانہ قتل کا جشن منا رہی ہیں۔ مگر افسوس کہ جمہوریت کا ستون میڈیا بھی قتل اور انکاؤنٹر کلچر کو ڈھکی چھپی زبان میں صحیح ٹھہرا رہا ہے۔ مباحثہ میں انسانی حقوق کی پامالی اور بدامنی کی صورت حال پر بات نہیں ہو رہی ہے، بلکہ میڈیا اس معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہا ہے۔ یہ سب دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ گولیاں بھلے ہی عتیق اور ان کے بھائی پر چلی تھیں، مگر خون قانون کا بہا ہے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ پولیس کی تحویل میں موجود عتیق اور ان کے بھائی پر حملے ہوئے تو اب اتر پردیش پولیس کی موجوگی میں کوئی محفوظ نہیں ہے، تو ریاست میں نظم و ضبط کے کیا حالات ہوں گے؟ قومی میڈیا کے کیمرے کے سامنے گولی چلائی گئی اور فائرنگ کا ویڈیو کیمرے میں قید ہوا۔ اب یہ سوشل میڈیا پر وائرل ہو گیا ہے۔ قتل کی واردات پہلے بھی ہوئی تھی، مگر اس بار فرق یہ ہے کہ اس خوفناک منظر پر جشن منایا جا رہا ہے۔ دنیا کی سب بڑی جمہوریت میں انکاؤنٹر کی تعریف ہو رہی ہے! پل بھر میں انصاف دینے کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے! ایسی دلیل دینے والے کبھی یہ نہیں سوچتے کہ اگر ایسا رواج چل پڑے، تو پھر عدالتیں کیا کریں گی؟ جب عدالتیں بند ہو جائیں گی تو پھر جمہوریت زندہ رہ پائے گی؟

آخر کیوں حملہ آوروں نے گولی چلانے کی بعد 'جے شری رام' کے نعرے لگائے؟ پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے بھگوان کا نام اپنی گندی زبان سے لے کر ان کی بے حرمتی کی۔ نگر جب اور ہم سوچتے ہیں، تو ایسا لگتا ہے کہ فرقہ فرست طاقتوں نے یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت انجام دیا ہے۔ عتیق ایک مسلمان تھا اور اس کے تعلقات غیر بی جے پی پارٹیوں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر گولی چلانے کے بعد، قاتلوں نے مذہبی نعرے لگائے۔ وہ شدت پسندوں تک یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ ایک 'مسلم' جرائم پیشہ کو مار دیا گیا ہے اور اس طرح ہندو سماج کے درپیش خطرہ کو ختم کر دیا گیا! بار بار بی جے پی خود کو ہندو سماج کا واحد نمائندہ کہتی ہے اور اپنی حریف پارٹیوں کو 'مسلمانوں کی جماعت' کہہ کر ہندوؤں کی نظروں میں بدنام کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ عتیق کے کیس میں بھی سماجوادی پارٹی پر خوب حملہ کیا جا رہا ہے۔ فرقہ پرست طاقتیں یہ افواہ پھیلا رہی ہیں کہ عتیق کو بچانے میں سابقہ سیکولر جماعتوں کا بڑا رول رہا ہے، جبکہ موجودہ حکومت نے اس کو سزا دی ہے۔ اس طرح سے عتیق کے خاندان والوں کو انصاف دینے کی جگہ، پورے معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیا گیا ہے۔ شاید اس کا مقصد اگلے سال ہونے والے عام انتخابات بھی ہیں، جس سے عین قبل شدت پسند عناصر کو یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ حکومت ہندتو کے منصوبے کو تیزی سے نافذ کر رہی ہے۔ خود بی جے پی سرکار جانتی ہے کہ وہ فلاحی کاموں کو انجام دینے میں ناکام رہی ہے۔ اس لیے اس کی یہ مجبوری ہے کہ وہ فرقہ واریت کی آگ کو جلتی رکھے۔ بہت سارے سیاسی مبصرین نے عتیق قتل کی ٹائمنگ پر بھی سوالات اٹھائے ہیں۔ قتل کے ایک ہی روز قبل جموں و کشمیر کے سابق گورنر ستیہ پال ملک نے بزرگ صحافی کرن تھاپر کو ایک انٹرویو دیا تھا، جس میں انہوں نے ۲۰۱۹ کے پلوامہ حملہ سے متعلق اہم بات کہی تھی۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ یہ حملہ حکومت کی ناکامی کی وجہ سے ہوا تھا۔ سابق گورنر نے مزید کہا کہ وزیر اعظم نریند مودی کو بدعنوانی سے نفرت نہیں ہے۔ مبصرین کا دعویٰ ہے کہ اپنے ہی گورنر کے بیان سے مودی سرکار گھبراہٹ میں تھی اور اس کے چہرے لال ہو گئے تھے۔ اس سنسنی خیز انکشاف کو حکومت ہر حال میں عوام کی نظروں سے دور لے جانا چاہتی تھا۔ ایسا محسوس بھی ہو رہا ہے کہ عتیق قتل کے شور میں ستیہ پال ملک کا بیان ایک حد تک دب کر رہ گیا ہے۔ مین اسٹریم میڈیا پہلے ہی اس انٹرویو پر خاموشی اختیار کیے ہوئے تھی۔

> ”
>
> یہ کسی بھی حکومت کی بڑی ناکامی ہے کہ شہری اپنی جان اور زندگی کو لے کر ہر وقت فکرمند رہیں۔ اگر کوئی فرد اپنی زندگی کو لے کر اس قدر خوفزدہ رہے گا، تو وہ کیسے ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنی خدمات ادا کر پائے گا؟ خوف کی وجہ اتر پردیش میں موجود 'بلڈوزر راج' ہے، جس کی مذمت کرنے کی جگہ اس پر جشن منایا جا رہا ہے۔ ملک کے بیشتر لوگ اپنی پوری زندگی ایک چھت نہیں بنا پاتے، مگر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی ادتیہ ناتھ کے راج میں کمزوروں کے گھر مسلسل گرائے جا رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کو ان کے بھکت 'بلڈوز بابا' کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ بلڈوزر کسی مکان کو توڑ سکتا ہے، بنا نہیں سکتا۔ یعنی ریاست کے سب سے بڑے لیڈر کی پہچان گھر توڑنے والے شخص کی بنتی جا رہی ہے۔

عتیق اور ان کے بھائی کے قتل کا خوفناک منظر محکوم طبقات اور اقلیتوں کے دلوں میں زبردست ناراضگی اور غصہ بھر چکا ہے۔ آج وہ خود کو اپنے ہی ملک میں تنہا محسوس کر رہے ہیں۔ انہیں اپنی جان و مال کی فکر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہر ماں اور باپ دروازے پر نظر جمائے بیٹھے ہیں کہ کب ان کی بیٹی اور بیٹا سلامتی کے ساتھ گھر لوٹ آئیں گے۔ قتل بھلے ہی عتیق اور اس کے بھائی اور بیٹے کا ہوا ہے، مگر گولیوں کی آواز اور مقتول کی چیخ ہر طرف گونج رہی ہے۔ یہ کسی بھی حکومت کی بڑی ناکامی ہے کہ شہری اپنی جان اور زندگی کو لے کر ہر وقت فکرمند رہیں۔ اگر کوئی فرد اپنی زندگی کو لے کر اس قدر خوفزدہ رہے گا، تو وہ کیسے ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنی خدمات ادا کر پائے گا؟ خوف کی وجہ اتر پردیش میں موجود 'بلڈوزر راج' ہے، جس کی مذمت کرنے کی جگہ اس پر جشن منایا جا رہا ہے۔ ملک کے بیشتر لوگ اپنی پوری زندگی ایک چھت نہیں بنا پاتے، مگر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ کے راج میں کمزوروں کے گھر مسلسل گرائے جا رہے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کو ان کے بھکت 'بلڈوزر بابا' کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ بلڈوزر کسی مکان کو توڑ سکتا ہے، بنا نہیں سکتا یعنی ریاست کے سب سے بڑے لیڈر کی پہچان گھر توڑنے والے شخص کی بنتی جا رہی ہے اور اس پر خوشی کا بھی اظہار کیا جا رہا ہے! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اتر پردیش میں ذات اور مذہب دیکھ کر بلڈوزر چلتا ہے؟ جہاں پولیس کمزور طبقات کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام ہے، وہیں ایک خاص ذات اور دھرم سے تعلق رکھنے والے مافیا، دنگائی اور جرائم پیشہ افراد کو اقتدار کی سرپرستی حاصل ہے۔ تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ ریاست میں انسانی حقوق کی مسلسل پامالی ہو رہی ہے۔ ایک خاص مذہب میں پیدا ہونے والے لوگوں کو مسلسل نشانہ بنایا جا رہا ہے اور ان کے خلاف ہو رہے انکاؤنٹر پر تالیاں بجائی جا رہی ہیں۔ یہ جمہوریت کے لیے مضر ہے کہ عاملہ بے لگام ہو جائے، اور شہری حقوق کے تحفظ کی اپنی ذمہ داری کو عدالتیں نبھانے میں ناکام ہو جائیں۔ میڈیا کا حال تو اور بھی برا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ 'گودی میڈیا' اب 'گولی میڈیا' بنتا جا رہا ہے۔ ٹی وی چینل کا اسٹوڈیو 'کینگرو کورٹ' میں بدل چکا ہے۔ حزب اختلاف کی اس بات میں دم ہے کہ ہندوستانی سیاست شاید آزاد بھارت میں اپنے برے دور سے گزر رہی ہے۔ جہاں قانون یہ کہتا ہے کہ جب تک کسی ملزم کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے، تب تک اسے قصوروار نہیں سمجھا جا سکتا ہے، وہیں سزا ملنے سے پہلے ہی انکاؤنٹر کر دیا جا رہا ہے۔ مہاتما گاندھی کے قاتل ناتھو رام گوڈسے کے خلاف بھی مقدمہ چلا، پھر ان کو سزا ملی۔ ان کا انکاؤنٹر نہیں کرایا گیا تھا۔ مگر اتر پردیش کے بلڈوزر راج میں عدالت اور قانون کو بائی پاس کیا جا رہا ہے۔ ریاست کا سب سے بڑا لیڈر، جس نے آئینی منصب پر بیٹھتے وقت، آئین کی قسمیں لی ہیں، وہ مافیا کو مٹی میں ملا دینے کی بات کہہ کر انکاؤنٹر کلچر کو جانے انجانے بڑھاوا دے رہا ہے۔ کیا ان کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ خود ان کی پارٹی کے اندر بڑی تعداد میں 'مجرمانہ شبیہ' کے لیڈر موجود ہیں؟ کیا وہ ان کو بھی مٹی میں ملانے کے لیے تیار ہیں؟ مگر ملک کا شہری کسی کے خلاف غیر قانونی کاروائی کی حمایت نہیں کرتا۔ انکاؤنٹر کلچر کی تو ہرگز بھی نہیں، خواہ اس کا استعمال کسی کے خلاف ہو۔ یاد رہے کہ انکاؤنٹر کلچر جمہورت کو لاقانونیت، بربریت اور آمریت کی طرف لے جاتا ہے۔ ■

(مضمون نگار جے این یو سے تاریخ میں پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

اورنگ زیب متعصب، تھے یا متقی؟

تاریخ میں اورنگ زیب اور ان کے دور حکومت کے بارے میں بہت سی بے بنیاد باتیں مقبول عوامی حافظوں میں جڑ جما چکی ہیں۔

ابھے کمار

مغلیہ سلطنت کے آخری حدود کو وسعت دینے والے اور ہندوستان پر ۴۹ سال تک راج کرنے والے اورنگ زیب (متوفی ۱۷۰۷) کیا متعصب، متشدد اور ہندو مخالف، تھے؟ کیا وہ ایک جابر اور غیر انسانی بربریت آمیز جرائم کے مرتکب تھے؟ کیا وہ کٹر مذہبی اور خطرناک رجعت پسند، تھے؟ کیا انہوں نے لاکھوں ہندوؤں کو قتل اور ہزارہا مندروں کو منہدم، کروایا تھا؟ ایسے سوالات کبھی نہ کبھی آپ کے ذہن میں اٹھے ہوں گے۔ وجہ یہ ہے کہ تاریخ میں اورنگ زیب اور ان کے دور حکومت کے بارے میں بہت سی بے بنیاد باتیں مقبول عوامی حافظوں میں جڑ جما چکی ہیں۔ بہت سارے لوگوں کو لگتا ہے کہ اورنگ زیب نے تفرقہ انگیز پالیسی کو عوام پر تھوپا تھا۔ اس کے برعکس کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو اورنگ زیب کو مسلم بالادستی کی علامت سمجھتے ہیں۔ یہ بھی دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک متقی مسلمان تھا۔ کئی بار اورنگ زیب کی تاریخ نویسی کے دوران قصیدہ خوانی ہونے لگتی ہے اور ایسا تاثر پیش کیا جاتا ہے گویا اس نے زندگی میں کوئی غلطی کی ہی نہیں۔ ایسی تاریخ نویسی بھی سود مند نہیں ہے۔ کئی مرتبہ یہ فرقہ پرستوں کو تقویت فراہم کرتی ہے۔ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اورنگ زیب ایک بادشاہ تھا۔ کوئی بھی بادشاہ محصولات حاصل کرنے کے لیے رعایا کا استحصال کرتا ہے۔ جب تک سماج میں طبقاتی نظام ہوگا تب تک ریاست اور بادشاہ ہوں گے۔ طبقاتی نظام کا دوسرا نام ہی غیر برابری ہے۔ ریاست کا وجود بغیر زور زبردستی اور طاقت کے قائم نہیں رہ سکتا ہے۔ تبھی تو اورنگ زیب نے شورش اور بغاوت کو دبانے کے نام پر اپنے مخالفین کو بغیر کسی رحم کے کچل ڈالا۔ اقتدار کی لڑائی میں اورنگ زیب نے اپنے والد شاہجہاں کو قید کیا اور اپنے بھائیوں کا قتل کیا۔ مگر یہ یاد رہے کہ ایسا کرنے والا وہ نہ تو تاریخ میں پہلا بادشاہ تھا اور نہ ہی آخری۔ اقتدار کی لڑائی میں اگر اس کا بھائی دارا شکوہ فتحیاب ہوتا تو وہ بھی اورنگ زیب کے ساتھ وہی سلوک کرتا۔ اقتدار کے لیے اورنگ زیب نے دیگر غیر مسلم اور مسلم دونوں سے لڑائی کی۔ ۱۶۸۰ کی دہائی میں بیجاپور اور گولکونڈہ کا محاصرہ کرنے سے بھی وہ پیچھے نہیں ہٹا۔ لہٰذا اورنگ زیب کو متعصب اور ہندو مخالف کہنا جائز نہیں ہے، مگر ان کی قصیدہ خوانی کرنا بھی تاریخ نویسی نہیں ہے۔

شاہجہاں کے تیسرے فرزند اورنگ زیب کی شخصیت اور ان کے دور حکمرانی سے متعلق بہت سارے گرد و غبار اور کنفیوژن کو دور کرنے کی ایک علمی پہل امریکہ کی رٹگرز یونیورسٹی، نیوجرسی میں جنوبی ایشیائی تاریخ کی پروفیسر آڈری ٹروشکی (Truschke Audrey) نے کی ہے۔ ٹروشکی مغلیہ سلطنت کی تاریخ کی ایک بڑی جانکار اسکالر ہیں اور اس سے قبل انہوں نے اورنگ زیب کے دربار میں سنسکرت زبان کے مقام سے متعلق تحقیقی کام کیا تھا۔ تین سال پہلے انہوں نے اورنگ زیب کی زندگی اور ان سے جڑے تنازعات کو ایک مخصوص کتاب بعنوان اورنگ زیب: دی مین انڈ دی متھ (Aurangzeb: The Man and the Myth) لکھا ہے۔ اس اہم کتاب کو اردو قارئین تک پہنچانے کا بڑا کام جامعہ ملیہ اسلامیہ سے فارغ التحصیل اور معلم اقبال حسین اور دہلی یونیورسٹی میں علم عمرانیات میں پی ایچ ڈی کرنے والے ریسرچ اسکالر فہد ہاشمی نے کیا ہے۔ 'اورنگ زیب: ایک شخص اور فرضی قصے' کے عنوان سے یہ کتاب بازار میں پہنچ گئی ہے۔ مترجمین نے کتاب کا شاندار ترجمہ کیا ہے۔ کتاب پڑھتے وقت ایسا محسوس ہی نہیں ہوتا ہے کہ یہ کتاب اصلاً انگریزی میں لکھی گئی ہے۔ انہوں نے انگریزی کے اصطلاحات کے لیے معقول اردو الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ اقبال اور فہد کا تعلق سوشل سائنس سے ہے، جو اردو کی خدمت کے لیے سامنے آئے ہیں۔ اردو دنیا کو بھی دوسرے ڈسپلن اور موضوع کے اسکالرز سے مکالمہ کرنا چاہیے اور ان کی صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کیونکہ کوئی بھی ڈسپلن اور موضوع خود میں مکمل نہیں ہے۔ خیال رہے کہ مطبوعہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، (نئی دہلی) سے آئی ہے، مگر آج بھی اردو زبان میں سوشل سائنس کی کتابیں شائع کرنے کے سمت میں بہت سارے ناشر توجہ نہیں دیتے۔ یہ بات مایوس کن ہے کہ اردو پڑھنے اور جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے، پھر بھی اتنی بڑی آبادی کو سوشل سائنس کے حلقے سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ دوسری زبان جیسے بنگلہ میں ایسی حالت نہیں ہے، جہاں انگریزی کے تراجم بہت ہوتے ہیں۔ انگریزی دور میں اورنگ زیب کی شبیہ خراب کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ انگریزی حکومت نے اپنا اقتدار مغلیہ سلطنت کی قبر پر ہی کھڑا کیا تھا۔ جب وہ یہاں پر حاکم بن گئے، تو انہوں نے نہ صرف ہندوستانیوں کا استحصال کیا اور محصولات کی شکل میں غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کا خون چوسا، بلکہ تاریخ نویسی کا کام شروع کرکے اپنی بالادستی محکوم ذہنوں پر تھوپا۔ اسکول، کالج، یونیورسٹی، کتاب، اخبار اور میڈیا کے ذریعہ انگریزی بالادستی رگوں میں دوڑائی گئی۔ نوآبادیاتی تاریخ نویسی میں ہندوستان کی شبیہ کو مسخ کرکے پیش کیا گیا اور ہندو اور مسلم کو ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کیا گیا۔ ہندوستانی تاریخ کو تین عہدوں میں کمیونل، بنیاد پر تقسیم کر دیا گیا اور عہد قدامت کو ہندو، دور کہا گیا، جبکہ قرون وسطیٰ کو مسلم دور۔ شروع کے دور میں چونکہ مسلم حکمراں سے انگریزوں کا تصادم براہ راست تھا۔ اس لیے انگریزوں نے مسلم بادشاہوں اور قائدین کی امیج، کو کچھ زیادہ ہی خراب کیا اور انہوں متعصب، متشدد، کٹر، جابر، غیر رواداد، شہوت پرست، جنونی، مذہبی اور ہندو مخالف، بنا کر پیش کیا۔ اورنگ زیب مغلیہ سلطنت کے ایک بڑے کامیاب بادشاہ تھے اور ان کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت تیزی سے انتشار کا شکار ہوئی۔ بعد میں جو سیاسی خلا پیدا ہوا اس کو پورا کرنے میں انگریز کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کو نوآبادیاتی تاریخ نویسی نے سب سے زیادہ نشانہ بنایا ہے۔ جو ماحول اورنگ زیب کے خلاف بنایا گیا، اس کا فائدہ بہت سارے ہندو احیا پرست لیڈران اور قومی تحریک سے جڑے قائدین نے اٹھایا۔ مختصراً، جو سلسلہ نوآبادیاتی دور سے شروع ہوا وہ آج ہندوتوا کے راج میں انتہا تک پہنچ گیا ہے۔ اورنگ زیب کے نام پر رکھی ایک سڑک کو سال ۲۰۱۵ میں بدل دیا گیا اور اسے سابق صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام سے منسوب کر دیا گیا۔ اگر کھلے دماغ سے مذکورہ کتاب کو پڑھا جائے، تو اورنگ زیب کے بارے میں گشت کر رہی بہت ساری غلط فہمی، پروپیگنڈہ اور تعصب دور ہو جائے گا۔ اورنگ زیب کے منفی کردار سے متعلق ڈسکورس کی تنقید کرتے ہوئے مصنفہ آڈری ٹرشکی کہتی ہیں کہ مقبول عام تصور کے برعکس اورنگ زیب نے بڑے پیمانے پر تبدیلیٔ مذہب کی مہم کی کبھی تائید نہیں کی، جس کے تحت غیر مسلموں کے پاس اسلام اور تلوار میں سے کسی ایک کا انتخاب لازمی ہو۔ اورنگ زیب نے ہزارہا ہندو مندروں کو منہدم نہیں کیا (بلکہ منہدم منادر کی تعداد زیادہ سے زیادہ کچھ ہی درجن تھی)۔ انہوں نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا جسے ہندوؤں کے جینوسائڈ (نسل کشی) کے زمرے میں شامل کیا جا سکے۔ اورنگ زیب نے درحقیقت اپنی حکومت میں ہندوؤں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا تھا۔ انہوں نے ہندو مذہبی گروہوں کے مفادات کی بھی حفاظت کی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے ہم مذہب مسلمانوں کے ذریعے برہمنوں کو پریشان کرنے کے خلاف حکم بھی صادر کیا تھا۔ انہوں نے اپنی تمام رعایا کے لیے محفوظ سڑکیں اور بنیادی نظم ونسق دستیاب کروایا (ص۔ ۱۳)۔ اورنگ زیب کی صحیح شخصیت کی بازیافت کرنا ایک بڑا چیلنج ہے۔ یہ سوال ہندو مسلم ہم آہنگی سے بھی جڑا ہوا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اورنگ زیب کے بارے میں مورخین ایک حد تک یوروپی سیاحوں کے سفرنامے کو مآخذ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان سیاحوں نے اورنگ زیب یا مغلیہ سلطنت کی حقیقت کو اپنے زاویے سے رقم کیا ہے جو تعصب سے پرے نہیں ہے۔ اطالوی سیاح جیمیلی کیریری، نکولی منوچی، فرانکو برنیر اور دیگر کی تحریروں کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے لیے (ماقبل) یوروپی زبانوں کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوآبادیاتی دور میں فارسی مواد کا جو ترجمہ ہوا ہے، اس میں بھی بہت ساری گڑبڑیاں ہیں۔ مغلیہ دور کے درباری شاعر اور تاریخ نویس کی تحریروں میں مبالغہ آرائی اور بادشاہ کی قصیدہ خوانی کا بھی تنقیدی مطالعہ ہونا چاہیے۔ جدو ناتھ سرکار جیسے بڑے مورخ کی تحریر کے اندر پائے جانے والے فرقہ وارانہ مواد پر بھی مدلل تنقید کرنے کی ضرورت ہے۔ ان سب کے لیے صلاحیت اور وقت ہی نہیں بلکہ وسائل کی بھی ضرورت ہے۔■

> انگریزوں نے مسلم بادشاہوں اور قائدین کی امیج، کو کچھ زیادہ ہی خراب کیا اور انہوں متعصب، متشدد، کٹر، جابر، غیر رواداد، شہوت پرست، جنونی، مذہبی اور ہندو مخالف، بنا کر پیش کیا۔ اورنگ زیب مغلیہ سلطنت کے ایک بڑے کامیاب بادشاہ تھے اور ان کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت تیزی سے انتشار کا شکار ہوئی۔ بعد میں جو سیاسی خلا پیدا ہوا اس کو پورا کرنے میں انگریز کامیاب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اورنگ زیب کو نوآبادیاتی تاریخ نویسی نے سب سے زیادہ نشانہ بنایا ہے۔

(مضمون نگار جے این یو سے پی ایچ ڈی ہیں)

debatingissues@gmail.com

Inquilab, Nov 21, 2019

آر ایس ایس کی زبان بولتے ہیں رام دیو

اگر بابا میں تھوڑی بھی ایمانداری ہوتی تو وہ اس پر بھی بات کرتے ملک کی آزادی میں آر ایس ایس کا کیا رول رہا ہے؟ ملک کو متحد کرنے میں بھگوا طاقتوں نے کیا قربانی دی ہیں؟

ابھے کمار

یوگ گرو اور تاجر بابا رام دیو آج کل پھر تنازعات میں گھرے ہیں۔ جیسے ہی سپریم کورٹ نے بابری مسجد رام جنم بھومی کیس پر فیصلہ سنایا ویسے ہی یہ تنازع سامنے آیا۔ کورٹ کا فیصلہ آیا کہ متنازع زمین پر رام مندر بنایا جائے اور مسجد کے لیے جگہ کہیں اور دی جائے گی۔ اس فیصلے نے بہت سارے لوگوں کو مایوس کیا جن میں اسدالدین اویسی بھی شامل تھے۔ اویسی نے اوروں کی طرح اپنی رائے پریس کے سامنے رکھی اور پھر بابا رام دیو اویسی کی 'اوقات' بتانے کے لیے میڈیا کے سامنے نمودار ہو گئے۔

اویسی ہی کیا تمام انصاف پسند اور سیکولر لوگوں میں اس بات کا دکھ ہے کہ اقلیتوں کی ایک قدیم عبادت گاہ کو دن کے اجالے میں منہدم کر دیا گیا۔ رام کے نام پر ہزاروں لوگوں کا خون بہایا گیا۔ جب فیصلہ آیا تو ان سوالوں پر خاموشی اختیار کر لی گئی اور جن کی عبادت گاہ کو توڑا گیا اُن کو کہیں اور جانے کو کہا گیا۔ یہ سوالات صرف اویسی کے ہی نہیں ہیں، مگر ٹارگیٹ پر اویسی تھے۔ آخر اس کی بڑی وجہ ان کا ایک خاص مذہب میں پیدا ہونا تو نہیں تھا؟

بابا رام دیو میڈیا کے سامنے آ پہنچے۔ انٹرویو لینے والا کوئی اور نہیں بلکہ ریپبلک چینل کا مدیر اعلیٰ اور مودی حامی ارنب گوسوامی تھا۔ ۹۰ منٹ چلے اس انٹرویو میں بابا رام دیو نے وہ باتیں کہہ ڈالیں جو ایک صحت مند جمہوریت میں قابل قبول نہیں ہونی چاہیے۔ انٹرویو کے دوران بابا رام دیو کہیں سے بھی ایک ہندو پیشوا نظر نہیں آ رہے تھے۔ نہ ہی ان کے الفاظ ایک روحانی لیڈر کے تھے۔ نہ ہی ان کا انداز ایک بابا اور سادھو کا تھا۔ وہ ایک پکے آر ایس ایس کے کیڈر کی زبان بول رہے تھے، جس میں صرف اور صرف ہندوتو کا زہر نکل رہا تھا۔

اویسی پر جارحانہ حملے کرتے ہوئے بابا رام دیو نے کہا کہ وہ نفرت کی سیاست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اویسی کو ملک کو توڑنے والوں کا 'سرغنہ' کہا۔ اویسی پر حملے آر ایس ایس ایک منصوبہ کے تحت کرتا ہے۔ اُن کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ اویسی کا خوف ہندوؤں کو دکھلایا جائے اور کہا جائے کہ ملک میں ایک اور 'جناح' موجود ہے جو ملک اور ہندوؤں کی ترقی کا مخالف ہے۔ بابا رام دیو اویسی کو نفرت کی سیاست کرنے والا بتلا کر آر ایس ایس کی پوزیشن کو دوہرا رہے تھے۔

اگر بابا رام دیو ایک ہندو پیشوا ہوتے اور آر ایس ایس کے کیڈر نہیں ہوتے تو وہ یہ بھی سوال اٹھاتے کہ آخر جن لوگوں نے بھگوان رام کے نام پر سیاست کی ان لوگوں نے ملک سے نفرت ختم کیا یا پھر نفرت کی کھیتی کی۔ آخر اتنے لمبے وقت تک مندر مسجد کے فساد کو ابھار کر کیا حاصل ہو گیا؟ بابا رام دیو جس آر ایس ایس کی سرکار کی تعریف کرتے نہیں تھک رہے تھے اس کی کیا تاریخ رہی ہے؟

اگر بابا رام دیو میں تھوڑی بھی ایمانداری ہوتی تو وہ اس پر بھی بات کرتے ملک کی آزادی میں آر ایس ایس کا کیا رول رہا ہے؟ ملک کو متحد کرنے میں بھگوا طاقتوں نے کیا قربانی دی ہیں؟ کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کے لیے ہندوتو طاقتوں نے کیا کیا ہے؟ ہندو کوڈ بل اور خواتین کے حقوق کے تحفظ کے لیے آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا نے کون سا مثبت قدم اٹھایا ہے؟ آخر ملک کی فکر کس کو ہے؟

انٹرویو میں آر ایس ایس کے دیگر ناقدین بھی بابا رام دیو کے نشانے پر تھے۔ جے این یو کا نام لیے بغیر اُسے ٹکڑے ٹکڑے گینگ کہہ کر مذاق اڑایا گیا اور ان کی آزادی کو ختم کرنے کی وکالت کی گئی۔ لیفٹ پر حملہ کرتے ہوئے انہیں نے کہا کہ مارکس، لینن اور ماؤ کے نظریات بھی ملک کے لیے خطرہ ہے کیوں کہ یہ سب باہر کی آئیڈیالوجی ہے، جس کی ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے اور یہ بھی بے چینی کا سبب ہے کہ سیکولرزم پر سرے عام حملہ کیا جا رہا ہے اور ہندو راشٹر کی تائید کی جا رہی ہے۔

بابا رام دیو کو ان سوالوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُن کا مقصد تھا کہ مودی، بی جے پی اور آر ایس ایس کے ناقدین کو ملک مخالف اور غدار ثابت کیا جائے۔ اویسی کو ٹارگٹ کرنا اسی گیم پلان کا حصہ ہے۔ کانگریس، لیفٹ، دلت، آدی واسی اور پسماندہ ذاتوں کی تحریک کو بھی خارج کرنا اسی سازش کا حصہ ہے۔

آر ایس ایس کے مسلم مخالف ایجنڈا کا یہ حصہ رہا ہے کہ ان کی طاقتور سیاسی قیادت کو بدنام کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ فلاں مسلم لیڈر، فلاں مسلم جماعت ملک کے وکاس میں رکاوٹ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کے مسلمان بھی ہندو تھے اور ان کا خون ایک ہے۔ بابا رام دیو کی ہوشیاری دیکھیے کہ انہیں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون اور ڈی این اے کو ایک بتایا مگر یہ نہیں کہا کہ جب ہندو اور مسلمان ایک ہیں تو ان کے ساتھ ایک سا سلوک کیوں نہیں برتا جاتا۔ آخر کیوں بی جے پی مسلم امیدواروں کو ٹکٹ نہیں دیتی اور جب دوسری پارٹی ان کو کچھ سیٹیں دے بھی دیتی ہیں تو اسے مسلم اپیزمنٹ کہہ کر ہنگامہ کھڑا کرتی ہے۔ آخر کیوں مودی کی حکومت میں مسلم ایم پی ندارد ہیں؟ آخر کیوں مسلمانوں کے خلاف حملے اور متعصبانہ پالیسی پر سرکار خاموش رہتی ہے؟

آخر کیوں انہیں ہندوستانی سماج کا حصہ نہیں سمجھا جاتا ہے؟

پسماندہ سماج سے آنے والے کچھ لوگوں کو یہ خوش فہمی تھی کہ بابا رام دیو پسماندہ سماج میں پیدا ہوئے ہیں اور ان کے مفادات کا تحفظ ہر حال میں کریں گے۔ مگر اب کوئی شک کی گنجائش نہیں رہی اور سب کچھ سامنے آ گیا۔ مذکورہ انٹرویو میں بابا رام دیو نے دلتوں اور پسماندہ ذاتوں کو بھی ٹارگیٹ کیا اور آر ایس ایس کی ترجمانی کی۔ مودی بھی پسماندہ سماج سے آتے ہیں اور انتخابی ریلی میں ووٹ کی خاطر اس بات کا ذکر بھی کرتے ہیں مگر آر ایس ایس کا موقف بالکل نہیں بدلا ہے۔

بابا رام دیو نے جب کہا کہ امبیڈکر اور پیریار کے حامی اور پیروکار نظریاتی دہشت گردوں کو فروغ دے رہے ہیں تو وہ آر ایس ایس کے دل کی دبی باتوں کو بول رہے تھے۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے مودی سرکار سے اپیل کی کہ سرکار ایک ایسا قانون لائے، جس سے ان نظریات پر پابندی لگائی جا سکے۔ افسوس کی بات ہے کہ بابا رام دیو امبیڈکر اور پیریار کے مساوات، سماجی انصاف اور اخوت کے نظریہ پر پابندی لگانے کی وکالت کرتے رہے ہیں، جو اُن کے سماج کے لاکھوں کروڑوں لوگوں کو نجات کا راستہ دکھلاتا ہے۔

آر ایس ایس کے دیگر ناقدین بھی بابا رام دیو کے نشانے پر تھے۔ جے این یو کا نام لیے بغیر اُسے ٹکڑے ٹکڑے گینگ کہہ کر مذاق اڑایا گیا اور ان کی آزادی کو ختم کرنے کی وکالت کی گئی۔ لیفٹ پر حملہ کرتے ہوئے انہیں نے کہا کہ مارکس، لینن اور ماؤ کے نظریات بھی ملک کے لیے خطرہ ہے کیوں کہ یہ سب باہر کی آئیڈیالوجی ہے، جس کی ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ بے حد تشویشناک بات ہے کہ رام دیو اور آر ایس ایس اُن تمام نظریات کو ختم کرنا چاہتی ہے جو اُن کے ساتھ متفق نہیں ہیں۔ یہ بھی بے چینی کا سبب ہے کہ سیکولرزم پر سرے عام حملہ کیا جا رہا ہے اور ہندو راشٹر کی تائید کی جا رہی ہے۔ یہ سب رجحانات ملک کی جمہوریت کے لیے کافی خطرناک ہے۔

(مضمون نگار نے حال ہی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے مطالعات برائے تاریخ میں اپنی پی ایچ ڈی جمع کی ہے۔)

debatingissues@gmail.com